
آپ بیتی نمبر
نگراں
کالیداس گپتا رضا
مدیر
صابر دت

سرپرست اعلیٰ

سلیم جاوید

سرپرست:

اندر کمار گجرال (ماسکو)

کنہیا لال پوسوال

قرۃ العین حیدر

سنیل دت

رامانند ساگر

نرگس دت

کملیشور

کالی داس گپتا رضا

سرپرست:

سلمیٰ صدیقی

جے دیو

پریم جی

احسن خان

آنند بخشی

سرورق:

امروز

•

حُسن کار:

ساجد رشید

رسالہ "فن اور شخصیت" ہر سال آپ کی خدمت میں دو شمارے پیش کرتا ہے۔ اُن فنکاروں اور شخصیتوں کے بارے میں جنہوں نے ادب، فلم، سائنس، سیاست، مصوری یا زندگی کے کسی بھی شعبے میں انسانیت کی فلاح و فروغ کے لئے کوئی کارنامہ انجام دیا ہے۔

(ادارہ)

جلد ۴ شمارہ ۷ ستمبر ۱۹۸۰ء
اشاعت: مارچ ۱۹۸۰ء

ماہنامہ

فن اور شخصیت

جلد اول

آپ بیتی نمبر

مدیر:
صابر دت

معاون مدیر:
کلیم راہی

موجودہ شمارہ
۵۰ روپے

عام شمارہ
۱۰ روپے

سول ڈسٹری بیوٹرز ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ آفس نمبر ۲۳۲ دوسری منزل
"پنچ رتن" اوپیرا ہاؤس بمبئی نمبر ۴ ۴۰۰۰۰۴

حرفے چند

تاریخی اعتبار سے "آپ بیتی" کہنے کا رجحان آج کل ہی کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا سبب شاید یہ ہے کہ آج کا انسان قدیم انسان سے زیادہ خود شناس، خود آگاہ اور باوقوف ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں[1] کہ اگلے وقتوں کے لوگ اپنی ذات کا وقوف نہیں رکھتے تھے، بس اتنا ہے کہ اُن میں تمام تر کریڈٹ اپنے پلّے باندھنے کی ہوس آج کل کے انسان کی نسبت بہت کم ہوتی تھی۔ اُپنشدوں کے فلاسفر رِشیوں کی موشگافیاں تمام دُنیا سے خراجِ تحسین وصول کرتی آئی ہیں مگر آج تک اُن میں سے بیشتر کے نام تک سے کوئی واقف نہیں ہو سکا۔ انہوں نے اپنا ذکر کیا ہی نہیں۔ قدیم تحریروں (عہد نامہ عتیق و جدید وغیرہ) میں خود احتسابی کے آثار تو مل جاتے ہیں مگر ایسا کچھ نہیں ملتا جو "آپ بیتی" کے زمرے میں آسکے۔ "آپ بیتی" کہنے کے لئے اپنی ذات کے تجزیۂ محض سے کہیں زیادہ حکایتی طرزِ بیان کی ضرورت ہوتی ہے۔

جہاں اگلے لوگ ڈھنڈورا پیٹنے کو عیب خیال کرتے تھے وہاں آج کا ذہن اُسے حُسن جانتا ہے۔ پراپیگنڈا اب ایک باقاعدہ انڈسٹری بن گیا ہے۔ تاہم یہ بھی ماننا پڑے گا کہ "آپ بیتی" کا رجحان بیکار کی ہائے دہو نہیں ہے۔ اس کا ایک فائدہ تو خود "آپ بیتی" کہنے والے کو ہوتا ہے جبکہ وہ آپ بیتی کہہ کر کھلے بندوں یا اشارتاً پڑھنے والے پر اپنے ماضی کے رازہائے سربستہ آشکار کر دیتا ہے اور اپنے لئے اپنے مستقبل کے رجحانات کی سمت متعین کر لیتا ہے۔ دوسرا فائدہ خود ادب کو ہوتا ہے کیونکہ اپنی زندگی کے اہم واقعات کو محفوظ کر دینے کی زبردست خواہش کسی بھی زبان کے ادب میں بیش بہا اضافے کی باعث ہو سکتی ہے۔ واقعاتی لحاظ سے اس طرح جو باتیں پڑھنے کو ملتی ہیں اکثر اُن پر سچائی کے علاوہ تجربے کی مہر ثبت ہوتی ہے۔

---

[1] بعض — مصنّف زیبِ داستان کے لئے بھی بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ بعض اوقات حافظہ بھی دھوکا دے جاتا ہے۔

بزبانِ انگریزی ماضی قریب میں لکھی ہوئی ہنری ایڈمز، جی. کے. چیسٹرٹن، ڈبلیو. ایچ. ہڈسن، ہنری جیمز، مارک ٹوین، ایچ. جی. ویلز، جواہر لال نہرو، مہاتما گاندھی وغیرہ کی آپ بیتیاں ادب میں اچھا اضافہ تسلیم کی جاتی ہیں۔ لارڈ ھالڈین اپنی آپ بیتی کے آخری باب میں مروّجہ رائے سے اختلاف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کسی بھی انسان کی کارکردگی کے لئے ایک زندگی کافی ہے کیونکہ انجام کار جس چیز کا احتساب کیا جاتا ہے وہ انسان کی کام کرنے کی لگن اور کام کی خوبی اور عمدگی ہے نہ کہ کامیابی اور مقدار۔ ظاہر ہے بالآخر یہ نتیجہ ہمارے نامے کیلئے خود اپنی زندگی سے اخذ کیا ہے۔ اردو میں قرۃ العین حیدر کی تصنیف کارِ جہاں دراز ہے کے علاوہ اگرچہ ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر یوسف حسین خان کی ایسی اچھی سوانح عمریاں نکلی ہیں مگر ہمارے بیشتر لکھنے والوں نے اختصار کے ساتھ اکا دکا واقعات ہی کو معرضِ تحریر میں لانا کافی سمجھا ہے۔ ایسی تحریریں واقعہ نگاری کے کٹہرے میں زیادہ زیب دیتی ہیں۔ وہ باقاعدہ آپ بیتی کے زمرے میں نہیں آتیں۔ مگر اب اردو میں یہی روش مستحسن سمجھی جاتی ہے۔ اور مقبول ہے۔ شاید مختصر "آپ بیتی" کی اسی مقبولیت نے مجتبیٰ صابر دت کو ادارہ فن اور شخصیت کی طرف سے آپ بیتی نمبر نکالنے پر اکسایا ہے۔

جیسا کہ مجھے بتایا گیا ہے اس نمبر میں وہی آپ بیتیاں شامل ہیں جو ایک محدود عرصے میں دستیاب ہو سکیں۔ جو سوانح عمریاں "آپ بیتی" کی حد میں نہیں آتی تھیں انھیں سرگذشت اور سوانح عمری کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

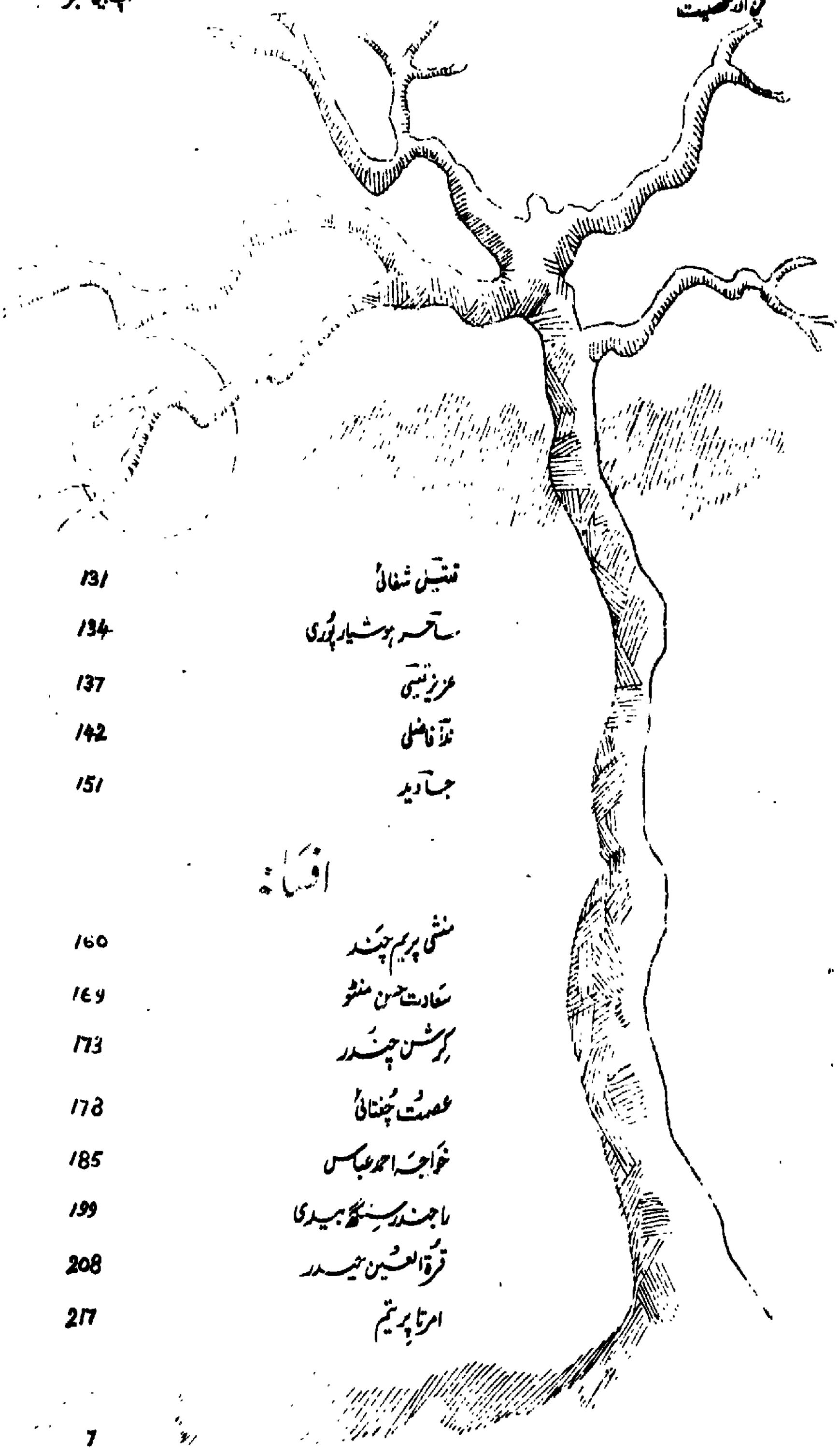
میری ان چند سطروں سے زیرِ مطالعہ نمبر کا پیش لفظ لکھنا یا محاسبہ کرنا مقصود نہیں بلکہ بہت معمولی حد تک اس ذمہ داری کا نباہنا مقصود ہے جو بطور نگران میرے کمزور کندھوں پر ڈال دی گئی ہے۔ کبھی کبھار کے صلاح مشورے اور اپنے کتب خانے سے کتابیں مہیا کرنے کے علاوہ تمام کام مجتبیٰ صابر دت اور ان کے رفقائے کار ہی کا کیا ہوا ہے۔ پر ماتما حسنِ قبول عطا فرمائے۔

کالی داس گپتا رضا

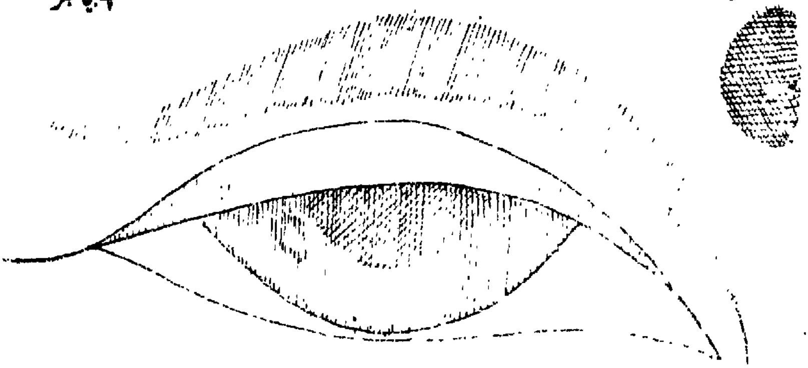
ترتیب

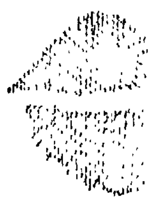
آپ بیتی نمبر

شعر

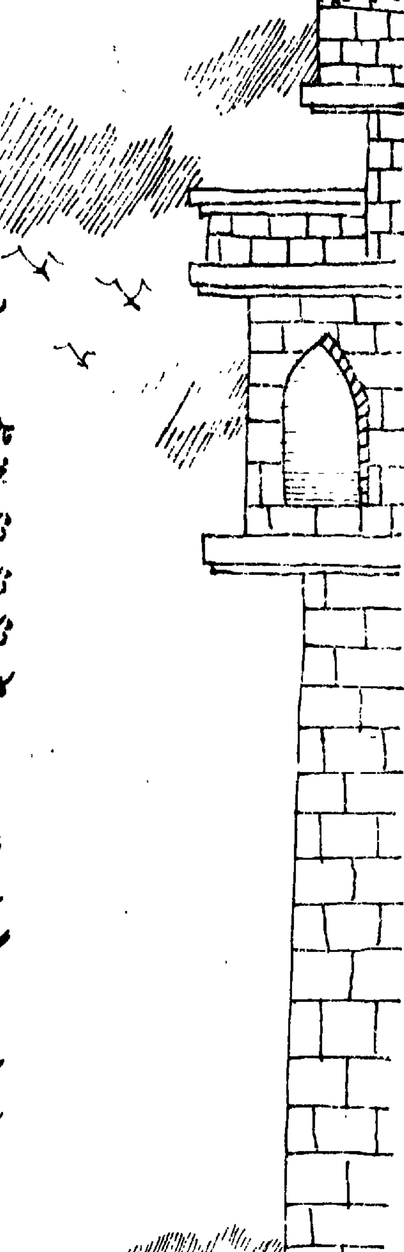


افسانہ



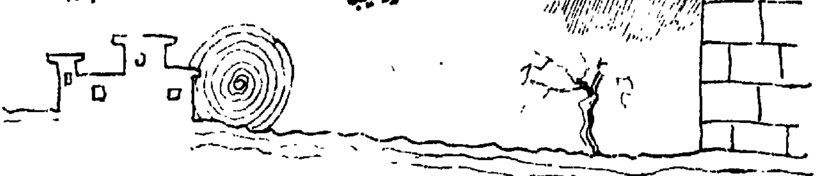


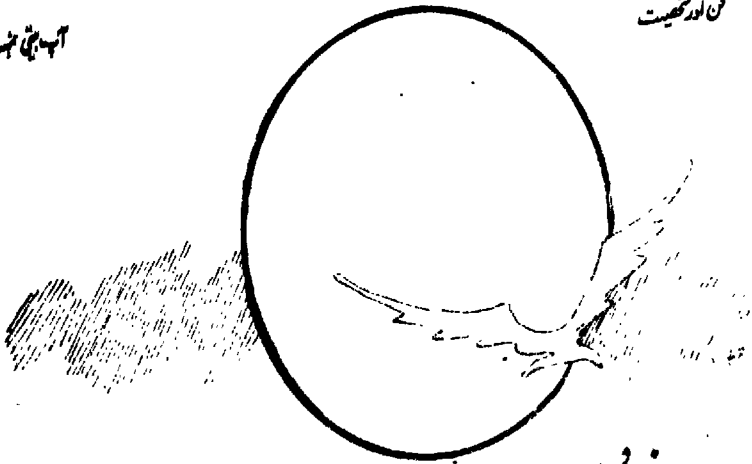
طنز و مزاح



تحقیق و تنقید

صحافت





فلم

چہرے

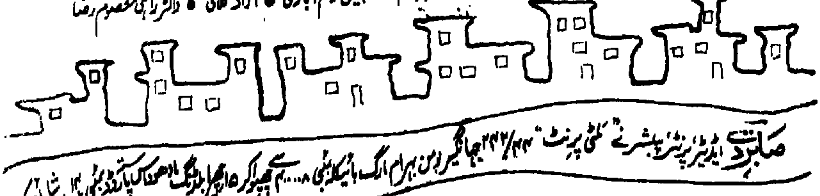
آواز

موسیقی

کینویس

زبانِ خلق

غزل نمبر کے بارے میں : • شری اندر کمار گجرال (ماسکو) • فکر تونسوی • اختر جمال • ڈاکٹر گوپی چند نارنگ • ڈاکٹر قمر رئیس • وارث علوی • پرکاش پنڈت • شمس الرحمٰن فاروقی • جیلانی بانو • نگار صہبائی (کراچی) • بانی • احمد ندیم قاسمی • ندا فاضلی • مظہر امام • سہیل عظیم آبادی • آزاد گلاٹی • ڈاکٹر راہی معصوم رضا



صابر دت ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے "کلمی پرنٹ" ۴۴/۲۴۲ جہانگیر دین بہرام مارگ ہائیکلا بمبئی ۸ سے چھپوا کر ۱۵ اپسرا بلڈنگ ۱ کڈ کاس پاترنڈ بمبئی ۱۴ سے شائع کیا



پڑھنے والوں کے نام !

"غزل نمبر" آپ نے ایسا ہاتھوں ہاتھ خریدکر بڑھاکر "فن اور شخصیت" کا یہ شمارہ "آپ بیتی نمبر" آپ کی خدمت میں آفسیٹ پر پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

جریدے کو آفسیٹ پر پیش کرنے کی رائے تو سلیم جاوید نے دی لیکن اسے اس منزل تک پہونچانے کے ذمہ دار بہر حال آپ ہیں اگر آپ "فن اور شخصیت" کا غزل نمبر پسند کرکے چالیس روپے کا پرچہ نہ خریدتے تو میں آج تک کاغذ والوں کے اُدھار چکانے ہی کی فکر میں ہوتا۔

مگر میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔

اب آپ کہیں گے کہ "فیض احمد فیض نمبر" سے پہلے یہ "آپ بیتی نمبر" کیونکر بیچ میں آن ٹپکا۔؟

ہوا یوں کہ میں "فیض نمبر" پر کام شروع کر چکا تھا کہ فیض صاحب ہندوستان تشریف لائے۔ میں ان سے ملا۔ انہوں نے مکمل اور بھرپور تعاون دیا۔ کچھ چیزیں ملیں لیکن کچھ چیزیں سیاسی صورتحال کی وجہ سے نہ مل سکیں۔ "فن اور شخصیت" کے سابقہ شماروں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ابھی چونکہ "فیض نمبر" پر بہت سا کام باقی تھا ——— اور یہ خیال بھی تھا کہ فیض صاحب پر پاکستان میں تین بڑے ضخیم نمبر نکل چکے ہیں اس لئے ہندوستان میں کام اُن کے شایانِ شان ہونا چاہیئے بقول نگر تونسوی :

"مقابلہ ہندوستان کا پاکستان سے نہیں 'فیض' کا فیض سے ہے"۔

اپنی آبرو بچ جائے ——— اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ ایک شام' ایک بڑے نامور نقاد کے گھر ویسے ہی چلا گیا جیسے اکثر چلا جاتا ہوں۔

انہوں نے چھوٹتے ہی کہا :

"صابر ! واقعی' تم نے خوبصورت غزل نمبر نکالا ہے" ———

حالانکہ "غزل نمبر" نکالنے سے پہلے یہی موصوف کہہ چکے تھے کہ جاں نثار کے مسودے کو کتابی صورت دے دیں،

چھاپ دو تو بہتر ہے۔ "غزل نمبر" تو "نقوش" نکال چکا ہے۔۔۔"

ان کی یہ بات اس وقت میرے ذہن میں آگئی۔

میں نے اُن سے دریافت کیا

"نقوش کا اور کونسا نمبر آپ کو بہت زیادہ پسند ہے ـــــ؟"

اُنہوں نے چھوٹتے ہی کہا:

"آپ بیتی نمبر"

میں نے کہا:

"ذرا دکھایئے تو سہی ـــــ؟"

اُنہوں نے اپنی ذاتی لائبریری سے نمبر نکال کر مجھے اس کی جھلک دکھا دی۔ میں نے وہیں بیٹھ کر اس نمبر کی ورق گردانی کی اور عرض کیا کہ وہ یہ نمبر دو تین روز کے لئے مجھے دے دیں۔

اُنہوں نے فوراً کہا

"نہیں نہیں، آپ اسے یہیں بیٹھ کر دیکھ لیجئے IT IS A RARE BOOK"

مجھے خیال آیا کہ اگر مجھے یہ نمبر ہندوستان میں دیکھنے کو نصیب نہیں ہو سکتا تو میرے قاری تو اس کی زیارت سے بھی محروم رہیں گے۔؟

دوسری شام کسی حوالے کے سلسلے میں مشورہ کرنے کی غرض سے میں گپتا جی (کالی داس گپتا رضا) کے پاس پہنچا، جو اس نمبر کے نگراں بھی ہیں۔ بہت اچھے شاعر ہیں اور آنجہانی جوش ملسیانی صاحب کے شاگردِ رشید ہیں۔ گپتا جی کا اپنا ذاتی کتب خانہ ہے جو اتنا بڑا ہے کہ میں نے آج تک کسی بڑے سے بڑے ادیب کے پاس نہیں دیکھا۔ گپتا جی کی شاعری کے علاوہ تحقیق پر بھی بڑی گہری نظر ہے اور میرے خیال میں ـــــ

"HE IS THE ONLY LIVING SCHOLAR OF URDU AND PERSIAN IN THE SUB-CONTINENT, WHO IS HELPING THE CAUSE OF URDU LANGUAGE A GREAT DEAL BUT HAS NOT GAINED ANY PECUNIARY BENEFITS."

ویسے اس شہر بمبئی میں جب بھی مجھے علمی اور ادبی نوعیت کی کوئی دشواری پیش آتی ہے تو میں ان دو شخصیتوں میں سے کسی ایک کے پاس چلا جاتا ہوں۔ ایک ہیں قرۃ العین حیدر (جنہیں میں عینی آپا کہتا ہوں) اور دوسرے ہیں گپتا جی۔

تو میں گپتا جی کے پاس پہنچا۔

"آپ کے پاس "نقوش" کا آپ بیتی نمبر ہے ــــ؟"

"ہاں یہ ہے لے جاؤ ــــ"

تعجب ہے کہ گپتا جی نے مجھ سے یہ کیوں نہ کہا کہ " IT IS A RARE BOOK "

میں نے اس نمبر کا مطالعہ کرنے کے بعد گپتا جی سے کہا۔

"سوچ رہا ہوں کہ آنکھوں میں بھی "آپ بیتی نمبر" نکال دوں۔ یہ نمبر مجھے کچھ زیادہ اچھا نہیں لگا ــــ"

دراصل مجھے اس نمبر کو دیکھنے کے بعد ایک شاعر کا قول یاد آ گیا جب کسی خاتون نے اپنی آٹوگراف بک اس کی جانب بڑھائی تو اس نے بک کو دیکھتے ہی کہا ــــ "اس پر تو گدھے گھوڑے سب سوار ہیں" ـــ۔

ویسے میں طفیل صاحب کی دل سے عزت کرتا ہوں وہ اس کام میں "پائنیر" PIONEER ہیں ــــ انہی سے مجھے انسپریشن (INSPIRATION) ملا ہے ــــ ورنہ آج "شب خون" میں نہ ہوتا ــــ

"اچھا خیال ہے، میرا تخلیقی مذاق اس کو نا پسند کرتا ہے ــــ" گپتا جی بولے

میں نے کہا۔

"ایک شرط پر کہ آپ اس کے نگراں ہوں گے ــــ"

"نگراں تو میں بن جاؤں گا پر ویسا نہیں ــــ؟"

میں نے کہا "مطلب" ــــ؟

کہنے لگے "جیسے غزل نمبر کے جعفری صاحب تھے" ــــ

میں نے کہا ــــ

"نہیں گپتا جی ایسا نہیں اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں نے پورا کتابت شدہ مسودہ جعفری صاحب کو دکھایا تھا مگر وہ اکثر اس زمانے میں ہندوستان سے باہر ہی ہوتے تھے۔ انہوں نے صرف ترقی پسند شعراء کے بارے میں کہا کہ اسے چھاپنے سے پہلے سب کو دکھا دو۔ چونکہ سب اسی شہر میں رہتے ہیں۔ تو اس چکر میں غالب کی پانچ غزلیں آئیں اور مجروح سلطانپوری صاحب کی دس ــــ ایسے کنفیوژن (CONFUSION) میں میں اپنی بھی پانچ غزلیں دے گیا۔ پرچہ چھپنے کے بعد دیکھا تو بڑی ندامت ہوئی۔

رہی بات جدید شعراء کے باب کی ــــ تو اس سلسلے میں میں باقر مہدی صاحب کے پاس کئی بار گیا کہ بھائی مجھے اپنی غزلیں دے دو۔ لیکن انہوں نے کہا کہ میں اس "غزل نمبر" میں اپنی غزل بالکل نہیں دوں گا جس کے نگراں علی سردار جعفری ہوں۔ ان کا جدید غزل سے کیا تعلق ــــ؟ تو اس چکر میں جدید شعراء کے باب میں کئی شاعر چھوٹ گئے۔

"مگر آپ کم از کم ایکبار "آپ بیتی نمبر" کا پورا مسودہ دیکھ لیجئے گا ــــ"

گپتا جی رضامند ہو گئے ــــ

یوں "آپ بیتی نمبر" کا پلان تیار ہوا اور اب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

آپ بیتی نمبر کا کینوس بہت وسیع ہے۔ ظاہر ہے اس کی ایک ہی جلد میں خواہ وہ کتنی بھی ضخیم کیوں نہ ہو سبھی کو شامل نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے کوئی پندرہ سو صفحے کتابت کروائے ہیں ـــــ میں ان کو تین جلدوں میں کچھ وقفے سے پیش کر دوں گا۔

اس نمبر میں میں نے اُردو ادیبوں کے علاوہ فنونِ لطیفہ کے دیگر شعبوں سے بھی چند شخصیتوں کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔

اب آپ سے "فیض نمبر" میں ملاقات ہوگی ـــــ اور وہ نمبر بھی اُردو زبان کے اسی رسم الخط میں ہوگا جسکے فروغ کے لئے ڈھیروں اُردو اکیڈمیاں قائم ہوئی ہیں۔ میں فلمساز اور ہدایت کار جناب راج کھوسلہ اور جناب منوج کمار کا دلی طور پر ممنون ہوں کہ انہوں نے میرے ساتھ ہر ممکن تعاون و اشتراک کیا۔ ـ اور ساتھ ہی میں ان ادب نواز دوستوں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مجھے اس مقام تک پہنچایا۔ اور ان کرم فرماؤں کا بھی جنہوں نے میری مخالفت کی ـــــ

یار زندہ صحبت باقی ـــــ

آپ کا مخلص!

صابر دت

نوٹ: اس آپ بیتی نمبر میں چند ایسے نام رہ گئے ہیں جنہیں میں شامل کرنا چاہتا تھا اور کر بھی سکتا تھا، لیکن چند وجوہات، کی بنا پر انہیں شامل نہ کر سکا ـــــ چند آپ بیتیاں مجھے "نقوش" سے بھی لینی پڑیں چونکہ دونوں ملکوں کے درمیان خط و کتابت میں دشواریاں حائل تھیں۔ ملک دو سہی مگر رسم الخط تو ایک ہی ہے ـــــ اور میرے یہاں زبان کے معاملے میں سیاسی سرحدوں کی تقسیم نہیں ـــــ

اس "نمبر" میں شامل جان نثار اختر کی "آپ بیتی" ادھوری ہے ـــــ دمِ آخر نے اُن کے ہاتھ سے قلم چھین لیا ـــــ جناب سہیل عظیم آبادی کی "آپ بیتی" اُن کی آخری دستاویز ہے۔ یہ انہوں نے ہمیں اپنے انتقال سے ایک ماہ قبل ارسال کی تھی ـــــ میں نریندر کسیم، عباس صاحب، حسن کمال (ایڈیٹر اردو بلٹز) اور خاتون افسانہ نگار مہ جبیں نبی کا شکرگزار ہوں جنہوں نے مجھے اس نمبر کے لئے کئی تصویریں عنایت کیں۔

(صابر دت)

انتساب

بچپن ہی سے
میرے ذہن کے آکاش میں
پانچ ستارے روشن رہے تھے
یہ عمر لوریاں سننے اور راجہ رانی کے قصے کہانیاں سن سن کر
گھومنے پھرنے کی ہوتی ہے
اسی سن میں
ان ستاروں کی طرف تکتا رہا
انہی کی جگمگاہٹ میں
میری جوانی سنہروں کا خواب بنی رہی اور
میرا یہ خواب
بتدریج اپنی تعبیر کی طرف
بڑھتا رہا
...... میں نے
★ جواہر لال نہرو کی عظیم شخصیت
★ قرۃ العین حیدر کی تہذیبی محافظت
★ دلیپ کمار کی دلوں کو تسخیر کرنے کی مہارت
★ نرگس دت کی قدم قدم پر شفقت
اور
★ ساحر لدھیانوی کی شاعرانہ وضعداری
سے جو کچھ حاصل کیا ہے
وہ اب میرے انفرادی مزاج کے ساتھ
”فن اور شخصیت“ کے روپ میں
ظاہر ہے
میں اپنی یہ حقیر کاوش
انہی پانچ ستاروں کے نام
معنون کرتا ہوں ـــــ !

صابر دت

فون : 412888
غالب کالونی ، سمن آباد
لاہور

برادرم صابر دت

سلام شوق!

" وہ تم ہی ہو ' جو ہند و پاک کے ادیبوں اور شاعروں کے درمیان ایک پل کی حیثیت اختیار کر گئے ہو۔ " مہندرناتھ " جاں نثار اختر " کملیشور اور غزل نمبر تمہاری وہ ادبی کاوشیں ہیں جن کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی نہ کرنا بڑی غیر منصفانہ بات ہوگی۔

بلاشبہ تم ہی نے کملیشور جیسے ہندی ادیب کا مکمل تعارف پاکستان کی اردو دنیا سے کروایا ہے اور مجھے یقین ہے کہ " آپ بیتی نمبر " اور " فیض نمبر " بھی تمہاری روایات کے شایانِ شان ہوں گے۔

آپ کا

قتیل شفائی





مرزا اسد اللہ خاں غالب

"...... زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا۔ دنیا میں نامور ہوئے تو کیا اور گمنام جیے تو کیا۔ کچھ وجہ معاش ہو اور کچھ صحت جسمانی، باقی سب وہم ہے ......"

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے　　　　کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

میں اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ غالب تخلص، قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ سلطان برکیارق سلجوقی کی اولاد میں سے۔ میرا نام و

میرا جد و نسب بیں بہیں، سمرقند میں رہ جا ریاست تپاق میں سو دو سو برس گزرے کہ ہندوستان آ گیا جن میں

میرا دادا قوقان بیگ خاں ماوراء النہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان میں آیا۔ سلطنت ضعیف ہو گئی تھی۔ صرف پچاس گھوڑے، نقارہ نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ حاصل جاگیر۔ سرکار سے ملتا تھا۔ میرا اصل ذات کی تنخواہ اور رسالے کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اس کے جو طوائف الملوک کا ہنگامہ گرم تھا، وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر دلی کی ریاست چھوڑ کر اکبرآباد میں جا رہا۔ لکھنؤ جا کر آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدرآباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں بڑی بہادری سے مارا گیا۔

نصر اللہ بیگ خاں میرا حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد کا صوبہ دار تھا۔ اس نے مجھے پالا۔ ۱۸۰۶ء میں جب جنرل لیک صاحب کا عمل ہوا تو نصر اللہ بیگ خاں نے شہر سپرد کر دیا اور اکبرآباد کی صوبہ داری کمشنری ہو گئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا۔ میرے چچا کو جنرل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سوار کا بریگیڈیر ہوا۔ اس نے اپنے زور بازو سے "سونک" اور "سونسا" دو پرگنے بھرت پور کے قریب ہو کر کے سواروں سے چھین لئے۔ جنرل صاحب نے وہ دونوں پرگنے بہادر موصوف کو جاگیر عطا فرمائے۔ ایک ہزار سات سو روپیہ ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر بن حیات مشاہرہ۔ سال بھر مرزبانی کے کہ دس مہینے بعد ہاتھی پر سے گر کر مرگ ناگاہ مر گیا۔ رسالہ برطرف ہو گیا۔ ملک کے عوض نقدی مقرر ہو گئی۔

عالم دو ہیں: ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے: لمن الملک الیوم؟ اور پھر آپ جواب دیتا ہے: للہ الواحد القہار۔ ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گناہ گار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ (۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء) یک شنبہ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔

تاریخ ولادت حضرت غالب مد ظلہ
ہم شورش شوق آمد و ہم بسط غرب

۱۳ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا۔ اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔

پانچ برس کا تھا جو باپ مر گیا۔ آٹھ برس کا تھا جو چچا مر گیا۔ ایام دبستان نشینی میں شرح مأۃ عامل تک پڑھا۔ بعد اس کے لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور و عیش و طرب میں منہمک ہو گیا۔ فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری و طبعی تھا۔ ناگاہ ایک شخص کہ ساسان پنجم کی نسل میں سے تھا، معہذا منطق و فلسفہ میں مولوی فضل حق مرحوم کا نظیر اور مومن موحد اور صوفی صافی تھا، میرے شہر میں وارد ہوا۔ اور اکبر آباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا۔ خرام فارسی آمیختہ بعربی اس سے میرے حالی ہوئے۔ سونا کسوٹی پر چڑھ گیا۔ ذہن معوج نہ تھا۔ زبان دری سے پیوند ازلی اور استاد بے مبالغہ جاماسپ عہد و بزرجمہر عصر تھا۔ حقیقت اس زبان کی دل نشین و خاطر نشان ہو گئی۔ اب مجھے اس امر خاص میں ... نفس مطمئنہ حاصل ہے مگر دعویٰ اجتہاد نہیں۔ بحث کا طریقہ یاد نہیں۔

شعراء میں فردوسی، اور فقراء میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں۔ یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے۔ فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے ہم کو یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو کھاؤ مزے اڑاؤ، مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے، اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجا منہ کو آتا ہے، ہے ہے، وہ حور اجیرن ہو جائیگی، طبیعت کیوں نہ گھبرائیگی، وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ، چشم بد دور، وہی ایک حور۔

زن نو کن اے دوست در ہر بہار
کہ تقویم پارینہ ناید بکار

مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں اسے مار رکھتے ہیں، میں بھی مغل بچہ ہوں، عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ چالیس بیالیس برس کا واقعہ ہے، با آنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا، اس فن سے بیگانۂ محض ہوں۔ لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔

سعدی اگر عاشقی کنی در جوانی
عشق محمد بس است و آل محمدؐ

اللہ بس، ما سویٰ ہوس۔

میرا قد درازی میں انگشت نما ہے۔ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کچھ
اب جو کبھی مجھکو اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ پھر جاتا ہے ؎

تا دسترسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

جب ڈاڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے

ے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسّی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔ مگر یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام۔ مُلّا۔ بساطی۔ نیچہ بند۔ دھوبی۔ سقّہ۔ بھٹیارا۔ جولاہا۔ کنجڑا۔ منہ پر داڑھی۔ سر پر بال۔ فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اُسی دن سر منڈوا دیا۔ لاحول ولا قوۃ الّا باللہ العلی العظیم کیا بک رہا ہوں۔

دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی۔ سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔ بادشاہ دہلی نے پچاس روپیہ مہینہ مقرر کیا۔ ان کے ولی عہد نے چار سو روپے سال۔ ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔

جب بادشاہ دہلی نے مجھ کو نوکر رکھا اور خطاب دیا اور خدمتِ تاریخ نگاری سلاطین تیموریہ مجھ کو تفویض کی تو میں نے ایک غزل طرح تازہ پر لکھی۔ مقطع اس کا یہ ہے

غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے۔ بخشی، ناظر، حکیم کسی سے توقیر کم نہیں مگر فائدہ بہت قلیل۔ اب وہ بات گئی گزری بلکہ وہ کتاب اب چھپانے کے لائق ہے، نہ چھپوانے کے قابل۔ اجرائے خطاب کا لکھنا نامناسب بلکہ مضر ہے۔

میں موحدِ خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الٰہ الّا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الّا اللہ، لا مؤثر فی الوجود الّا اللہ سمجھے ہوئے ہوں۔ انبیاء سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعۃ تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے ثم حسن ثم حسین اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام؛

بریں زیستم ہم بریں بگذرم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت و زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا تاکہ مشرکین و منکرین نبوت مُصطفوی و امامت مرتضوی اس میں جلیں۔ نہ مجھے خوفِ مرگ نہ دعویٰ صبر ہے۔ میرا مذہب بخلافِ عقیدۂ قدریہ جبریہ ہے۔ صاحب، بندہ اثنا عشری ہوں۔ ہر مطلب کے خاتمہ پر ۱۲ کا ہندسہ کرتا ہوں۔ خدا کرے میرا بھی خاتمہ اسی عقیدے پر ہو ۱۲۔

میر نصیر الدین اولاد میں سے ہیں۔ شاہ محمد اعظم کی۔ وہ خلیفہ تھے مولوی فخر الدین صاحب کے اور میں مرید ہوں اس خاندان کا صوفی صافی ہوں اور حضرات صوفیہ حفظِ مراتب ملحوظ رکھتے ہیں؛

گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی

میں بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں دوسرا مانے یا نہ مانے۔ رہی وہ عزیزداری جس کو اہلِ دنیا قرابت کہتے ہیں۔ اس کو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے۔ اور اس کے مدارج و مراتب ہیں۔ میں جھوٹ سے بیزار ہوں اور جھوٹے کو ملعون جانتا ہوں۔ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔

میں کالے صاحب کے مکان سے اٹھ آیا ہوں۔ مارچ ۱۸۵۹ء سے بلّی ماروں کے محلے میں ایک حویلی کرائے کو لے کر اس میں رہتا ہوں یہاں کا میرا رہنا تحویف کرنے کے واسطے نہ تھا صرف کالے صاحب کی محبت سے رہتا تھا۔ حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں رہتا ہوں۔ وہ حویلی غلام نقی خاں نے مول لے لی۔ آخر جون ۱۸۶۰ء میں مجھ سے کہا کہ حویلی خالی کر دو۔ دس بارہ برس سے اس تنگ نانے میں رہتا تھا۔ سات برس تک ماہ بماہ چار روپیہ دیا گیا۔ اب تین برس کا کرایہ کچھ اوپر سو روپیہ یک مشت دیا گیا۔ مالک نے مکان بیچ ڈالا جس نے لیا ہے اس نے مجھ سے پیام بھیجا یہ کہا کہ مکان خالی کر دو۔ مکان کہیں ملے تو اٹھوں۔ بے درد نے مجھ کو عاجز کیا اور مدد لگا دی۔ دو صحن بالا خانے کا جس کا دو گز کا عرض اور دس گز کا طول ہے اس میں پاٹ بندھ گئی۔ رات کو وہیں سویا۔ گرمی کی شدت، پاڑہ کا قرب، گمان یہ گذرتا تھا کہ گلگھر ہے اور صبح کو مجھ کو پھانسی ملے گی۔ تین راتیں اسی طرح گذریں۔ اب مجھے فکر پڑی کہ کہیں دو حویلیاں قریب ہم دگر ایسی ملیں کہ ایک محل سرا اور ایک دیوان خانہ ہو۔ نہ ملیں۔ چاہا کہ بلی ماروں میں ایک مکان ایسا ملے کہ جس میں جا رہوں۔ نواب علاؤالدین خاں علائی کی چھوٹی پھوپی بیگم کی خواری کی ٹکڑوا والی حویلی مجھ کو رہنے کو دی ۹ جولائی ۱۸۶۰ء ہر چند وہ رعایت مرعی نہ رہی کہ محلسرا سے قریب ہو، مگر خیر دور بھی نہیں۔

میرا مکان گھر کا نہیں ہے۔ کرائے کی حویلی میں رہتا ہوں۔ جولائی ۱۸۶۱ء سے مینہ شروع ہوا۔ شہر میں سیکڑوں مکان گرے اور مینہ کی نئی صورت۔ دن میں دو چار بار برسے۔ اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہہ نکلیں۔ بالاخانے کا دیوان جو میرے اٹھنے بیٹھنے سونے جاگنے مرنے جینے کا محل ہے۔ اگرچہ گرا نہیں، لیکن چھت چھلنی ہو گئی کہیں لگن، کہیں چلمچی، کہیں اگالدان رکھ دیا۔ قلمدان کتابیں اٹھا کر توشے خانے کی کوٹھری میں رکھ دیئے۔ مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں۔ کشتیٔ نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔

دیوان خانے کا حال محلسرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدانِ راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیوں کر کرے۔ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثنائے مرمت میں میں بیٹھا کس طرح رہوں۔

نامور آدمی کے واسطے محلے کا پتہ ضروری نہیں۔ میں غریب آدمی ہوں، مگر فارسی انگریزی خط جو میرے نام کے آتے ہیں، تلف نہیں ہوتے بعض فارسی خط پر محلے کا نام نہیں ہوتا۔ انگریزی خط پر تو مطلق پتا ہوتا ہی نہیں۔ شہر کا نام ہوتا ہے۔ تین چار خط انگریزی ولایت سے مجھ کو آئے جانے ان کی بلا، بلی ماروں کا محلہ کیا چیز ہے۔ میرے نام کا لفافہ جس شہر سے چلے، اسی شہر کے ڈاک گھر میں رہ جائے تو رہ جائے ورنہ دلی کے ڈاک خانے میں پہنچ کر کیا امکان ہے کہ تلف ہو جائے۔

بی وفادار باہر نکلتی ہیں، سودا تو کیا لائیں گی مگر خلیق اور ملنسار ہیں، رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں، جب وہ محل سے نکلیں گی، ممکن نہیں کہ اطراف شہر کی سیر نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں، ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لے جا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ "یہ پھول تمھارے چچا کے بیٹے کی کانی کے ایں" (تمہارے چچا کی کیاری کے ہیں)

میں لم یلد ولم یولد ہوں، اکہتر برس کی عمر تک سات بچے پیدا ہوئے۔ لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی۔ اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہ ہوئی۔ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا اور اب اس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں۔ وہ میرے پاس آ رہے ہیں اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں۔ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے، ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں۔

کہیں پانی لڑھاتے ہیں، کہیں خاک اڑاتے ہیں، میں تنگ نہیں آتا۔

اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دوبار اُن کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں، ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، نہ تو پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم نکلتا ہے۔

وبائی کیا پوچھتے ہو، وبا تھی کہاں جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ؟ ایک چھیاسٹھ برس کا مرد، ایک چونسٹھ برس کی عورت، ان دونوں میں سے ایک بھی مرتا تو ہم جانتے کہ ہاں وبا آئی تھی۔ تف بریں وبا۔

در اندازِ قضا کے ترکش میں یہ بھی ایک تیر باقی تھا۔ قتل ایسا عام، لوٹ ایسی سخت، کال ایسا پڑا، وبا کیوں نہ ہو؟ لسان الغیب نے دس برس پہلے فرما دیا تھا: ؎

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

میرا حقیقی بھائی کل ایک تھا۔ وہ تیس برس دیوانہ رہ کر مر گیا۔

میرا ایک بھائی۔ ماموں کا بیٹا نواب ذوالفقار بہادر کا حقیقی خالہ کا بیٹا ہوتا تھا اور مسند نشیں حال باندہ کا چچا تھا۔ وہ میرا شیر بھی تھا یعنی میں نے اپنی نانی اور اس نے اپنی پھوپھی کا دودھ پیا تھا۔

علی بخش مرحوم (میرا برادر نسبتی) مجھ سے چار برس چھوٹا تھا۔ اس نے ۶۶ برس کی عمر پائی۔ نئی تحریر و تقریر کا آدمی تھا۔ اکبر آباد میں میور صاحب سے ملے۔ اثنائے مکالمت میں کہنے لگے کہ میں چچا جان کے ساتھ لارڈ لیک کے لشکر میں موجود تھا اور ہولکر سے جو محاربات ہوئے ان میں شامل رہا ہوں۔ بے ادبی ہوتی ہے ورنہ اگر قبا و پیرہن اتار کر دکھاؤں تو سارا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہے۔ جا بجا تلوار اور برچھی کے زخم ہیں۔ وہ ایک بیدار مغز اور دیدہ ور آدمی۔ ان کو دیکھ کر کہنے لگا کہ نواب صاحب ہم ایسا جانتے ہیں کہ تم جرنیل صاحب کے وقت میں چار یا پانچ برس کے ہو گے۔ یہ سن کر آپ نے کہا "درست بجا ارشاد ہوتا ہے!"

خدایش بیامرزاد و بدیں داد خواہانے بے نمک بگزراد

اللہ اللہ اب بھی ہندوستان میں ایسے لوگ ہیں کہ میں نے ان کو دیکھا نہ انھوں نے مجھ کو دیکھا، نہ میرا کوئی حق ان پر ثابت، نہ اُن کو کوئی خدمت مجھ سے لینی منظور۔ خیر فقیر ہوں، جب تک جیوں گا دعا دوں گا، تمام عمر ممنون اور شرمندہ رہوں گا۔

نواب مصطفیٰ خاں بہ میعاد سات برس کے قید ہو گئے تھے۔ سو اُن کی تقصیر معاف ہوئی اور اُن کو رہائی ملی۔ جہانگیر آباد کی زمینداری اور دلی کی املاک اور پنشن کے باب میں کچھ حکم نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ ہی میں ہیں۔ ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ میں مجرد استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا۔ ان کو دیکھا، چار دن وہاں رہا۔ پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔ تاریخ آنے جانے کی یاد نہیں۔

حضرت جناب مولوی صدر الدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبان کورٹ نے جان بخشی کا حکم دے دیا، نوکری موقوف، جائداد ضبط، ناچار خستہ و تباہ لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لفٹیننٹ

گورنمنٹ نے ازراہِ ترحم نصف جائداد واگزاشت کی۔ اب نصف جائداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں۔ کرایے پر معاش کا مدار ہے۔ اگرچہ یہ امداد اُن کے گزارے کو کافی ہے۔ کس واسطے کہ ایک آپ اور ایک بی بی۔ تیس چالیس روپیہ مہینے کی آمد۔ لیکن چونکہ امام بخش کی اولاد ان کی عزت ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں؛ لہٰذا فراغ بالی سے نہیں گزرتی۔ ضعفِ پیری نے بہت گھیر لیا ہے۔ عشرۂ ثامنہ کے اواخر میں ہیں۔ خدا سلامت رکھے غنیمت ہیں۔

مولانا فضل حق خیرآبادی کا مرافعہ میں حکم دوام حبس بحال رہا۔ بلکہ تاکید ہوئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ ان کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے۔ کیا ہوتا ہے؟ جو ہونا تھا سو ہولیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہائے میجر جان جاکوب کیا جوان مارا گیا۔ سچ اس کا شیوہ یہ تھا کہ اردو کے فکر کو مانع آتا۔ اور فارسی زبان میں شعر کہنے کی رغبت دلاتا۔ یہ بھی انہی میں سے ہے جن کا میں ماتمی ہوں۔ ہزارہا دوست مر گئے۔ کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں۔ جیوں تو کوئی غم خوار نہیں، مروں تو کوئی عزا دار نہیں۔

وبائی آنچ مدھم ہوگئی اور میں بھی دبا ہے۔ یاں سات دن بڑا شور رہا۔ الگزنڈر ہیڈلی مشہور بہ الک صاحب مر گیا۔ واقعی بے تکلف وہ میرا عزیز اور ترقی خواہ اور راج میں اور مجھ میں متوسط تھا۔ اس جرم میں ماخوذ ہو کر مرا۔ خیر یہ عالم اسباب ہے۔ اس کے حالات سے ہم کو کیا؟

آم مجھ کو بہت مرغوب ہیں۔ انگور سے کم عزیز نہیں۔ مالدے کا آم یہاں پیوندی اور ولایتی کر کے مشہور ہے۔ اچھا ہوتا ہے۔ یہاں دیسی آم انواع و اقسام کے بہت پاکیزہ، لذیذ، خوشبو افراط سے۔ پیوندی آم بھی بہت ہیں۔ رامپور سے نواب صاحب اپنے باغ کے آموں سے اکثر بسبیل ارمغان بھیجتے رہتے ہیں۔

شیخ محسن الدین مرحوم سے بطریق تمنا کہا گیا تھا کہ جی یوں چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں۔ اب وہ دل کہاں سے لاؤں۔ طاقت کہاں سے پاؤں۔ آموں کی طرف رغبت نہ معدے میں اتنی آموں کی گنجائش۔ نہار منہ میں آم نہ کھاتا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد میں آم نہ کھاتا تھا۔ رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں جو کہوں: بین العشائین۔ ہاں آخر روز بعد ہضم معدی آم کھانے بیٹھ جاتا ہوں۔ بے تکلف عرض کرتا ہوں۔ اتنے آم کھاتا تھا کہ پیٹ بھر جاتا تھا اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں۔ مگر دس بارہ۔ اگر پیوندی آم بڑے ہوئے تو پانچ سات ؎

دریغا کہ عہدِ جوانی گذشت
جوانی مگو زندگانی گذشت!

دو قسم کی انگریزی شراب، ایک تو کاس ٹیلن اور ایک اولڈ ٹام، یہ میں ہمیشہ پیا کرتا تھا۔ اور یہ دونوں قسم بیس روپے حد چوبیس روپے درجن آتی تھی۔ اب یہاں پہلے تو نظر نہیں آتی اب پچاس روپے اور ساٹھ روپے درجن آتی ہے۔ یہ گڑ چھال کی شراب میں نہیں پیتا۔ یہ مجھ کو مضرت کرتی ہے اور مجھے اس سے نفرت ہے۔ لیکور ایک انگریزی شراب ہوتی ہے، قوام کی بہت لطیف اور رنگت کی بہت خوب اور طعم کی ایسی میٹھی جیسا قند کا قوام پتلا۔

بیس برس آگے کی یہ بات تھی کہ ابر و باراں میں بابتش از طعام یا قریب شام تین گلاس پی لیتا تھا اور شرب شبانہ معمولی میں خرابہ نہ لیتا تھا۔ اس بیس برس میں بیس برساتیں ہوئیں۔ بڑے بڑے مینہ برسے، بینا ایک طرف دل میں خیال بھی نہ گزرا بلکہ رات کی شراب کی مقدار کم ہوئی۔

بہتر برس کا آدمی، پھر رنجور دائمی۔ غذا یک قلم مفقود۔ چھ برس میں ایک بار آب گوشت پی لیتا ہوں۔ نہ روٹی، نہ بوٹی، نہ پلاؤ، نہ خشکہ۔ صبح کو قند اور شیرۂ بادام مقشر، دوپہر کو گوشت کا پانی، سر شام گوشت کے تلے ہوئے چار کباب۔ سوتے ہوئے پانچ پے بھر شراب اور اسی قدر گلاب۔ خرف ہوں۔ پوچ ہوں۔ عاصی ہوں۔ فاسق ہوں، رو سیاہ ہوں، میر تقی کا یہ شعر میرے حسب حال ہے ؎

مشہور ہیں عالم میں، مگر ہیں بھی کہیں ہم
القصہ نہ در پے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

آنکھ کی بینائی میں فرق، ہاتھ کی گیرائی میں فرق۔ رعشہ مستولی۔ حافظہ معدوم۔ مشہور یہ بات ہے کہ جو کوئی اپنے عزیز کی فاتحہ دلاتا ہے، مولیٰ کی روح کو اس کی بو پہنچتی ہے۔ ایسے میں سونگھ لیتا ہوں غذا کو۔ پہلے مقدار غذا تولوں پر منحصر تھی۔ اب ماشوں پر ہے۔ زندگی کی توقع آگے مہینوں پر تھی۔ اب دنوں پر ہے۔ سترا بہترا اردو میں ترجمہ پیر خرف ہے۔ میری تہتر برس کی عمر ہے۔ پس میں "اخرف" ہوا۔ گویا حافظہ کبھی تھا ہی نہیں۔ سامعہ باطل بہت دن سے تھا۔ رفتہ رفتہ وہ بھی حافظے کی طرح معدوم ہو گیا۔ اب مہینے بھر سے یہ حال ہے کہ جو دوست آتے ہیں، رسمی پرسش مزاج سے بڑھ کر جو بات ہوتی ہے وہ کاغذ پر لکھ دیتے ہیں۔

میں مشق فنا میں مستغرق ہوں۔ بو علی سینا کے علم کو اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا۔ دنیا میں نامور ہوئے تو کیا اور گمنام جیے تو کیا۔ کچھ وجہ معاش ہو اور کچھ صحت جسمانی، باقی سب وہم ہے اے یار جانی۔ ہر چند وہ بھی وہم ہے، مگر میں ابھی اسی پائے پر ہوں۔ شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جائے اور وجہ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گزر جاؤں۔ عالم بے رنگی میں گزر جاؤں۔ جس سناٹے میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتا نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے جاتا ہوں اور جس سے جو معاملہ ہے اس کو ویسا ہی برت رہا ہوں۔ لیکن سب کو وہم جانتا ہوں، یہ دریا نہیں، سراب ہے۔ ہستی نہیں پندار ہے۔ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور رہیں گے۔ ان کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم کو ہوگا۔

ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا۔ ضعف، سستی، کاہلی، گراں جانی، گرانی۔ رکاب میں پاؤں ہے۔ باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور و دراز درپیش ہے۔ زاد راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر۔ اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے، دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے　　مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

میں مریض نہیں ہوں، بوڑھا ہوں اور ناتواں۔ گویا نیم جان رہ گیا ہوں۔ ایک بڈھا کسی گلی میں جاتے جاتے ٹھوکر کھا کر گر پڑا اور کہنے لگا: "ہائے بڑھاپا"۔ ادھر اُدھر دیکھا جب جانا کوئی نہیں ہے، کہتا ہوا بڑھا کہ "جوانی میں کیا پتھر پڑتے تھے"۔ "ایک کم ستر برس دنیا میں رہا۔ کوئی دم زندہ کا گھر کیا۔ افسوس! ہزار افسوس!!"

ضعف، نہایت کو پہنچ گیا۔ رعشہ پیدا ہوگیا۔ بینائی میں بڑا فتور پڑا۔ حواس مختل ہوگئے۔ پاؤں سے اپاہج، کانوں سے بہرا۔ ضعف بصارت، ضعف دماغ، ضعف دل، ضعف معدہ، ان سب ضعفوں پر ضعف طالع!!

گویند ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ پیش رفت کہ چہ حال داری؟ فرمود! "کدام حال خواہد بود کسے را کہ خدا از وے فرض طلبد و پیمبر سنت و زن نان خواہد و ملک الموت جان۔"

جہاں تک ہو سکا، احباب کی خدمت بجا لایا۔ اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ اچھی طرح سوجھے نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں۔ شاہ شرف علی بوقلندر کو سبب کبرسنی خدا تعالیٰ نے فرض اور پیمبر نے سنت معاف کر دی تھی۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست خدمت اصلاح اشعار مجھ پر معاف کریں۔ خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہو سکے گا لکھ دیا کروں گا۔

کیا کروں، ایک برس سے عوارض فساد خون میں مبتلا ہوں۔ بدن پھوڑوں کی کثرت سے سرو چراغاں ہوگیا ہے۔ طاقت نے جواب دیا۔ دن رات لیٹا رہتا ہوں۔ حاجتی پلنگ کے پاس لگی رہتی ہے۔ اٹھ کر پیشاب کیا جاتا ہے۔ بیت الخلا جانا ایک مصیبت ہے۔ تشت چوکی نہیں، اگر کوئی تھم جانا پھر آنا کیا ایسا آسان ہے؟ آگے میں لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا۔ اب وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہاتھوں میں رعشہ، آنکھوں میں ضعف بصر۔ کوئی متصدی میرا نوکر نہیں۔ دوست آشنا کوئی آجاتا ہے تو اس سے جواب لکھوا دیتا ہوں۔ میں تو کوئی دن کا مہمان ہوں اور اخبار والے میرا حال کیا جانیں۔ ہاں اکمل الاخبار اور اشرف الاخبار والے کہ یہاں کے رہنے والے ہیں اور مجھ سے ملتے رہتے ہیں۔ سو ان کے اخبار میں میں نے اپنا مفصل حال چھپوا دیا ہے اور اس میں میں نے عذر چاہا خطوں کے جواب اور اشعار کی اصلاح سے۔ اس پر کسی نے عمل نہیں کیا۔ اب تک ہر طرف سے خطوں کے جواب کا تقاضا اور اشعار واسطے اصلاح کے چلے آتے ہیں اور میں شرمندہ ہوتا ہوں۔



اقبال

ڈاکٹر محمّد اقبالؒ

"...... میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصوّر کرتا ہوں۔ فنِ شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصدِ خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لیئے اس مُلک کے حالات و روایات کی رُو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ ورنہ ......"

مری زندگی میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں جو اوروں کے لئے سبق آموز ہو سکے۔ ہاں خیالات کا تدریجی انقلاب البتہ سبق آموز ہو سکتا ہے۔

م، فرصت ہوگی؟ تو لکھوں گا ...ا احال اس کا وجود محض عزائم کی فہرست میں ہے۔ (اقبال نامہ۔ جلد اوّل۔ ص ۴۲۶)

کردہ خیالات جو میری روح کی گہرائیوں میں طوفان بپا کئے ہوئے ہیں۔ عوام پر ظاہر ہو جائیں تو پھر مجھے یقین واثق ہے کہ میری موت
د میری پرستش ہوگی۔ دنیا میرے گناہوں کی پردہ پوشی کرے گی اور مجھے اپنے آنسوؤں کا خراجِ عقیدت پیش کرے گی (بنام عطیہ بیگم فیضی)

پس از من شعرِ من خوانند و دریابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردے خود آگاہے

میرے آباؤ اجداد برہمن تھے۔ انہوں نے اپنی عمریں اس سوچ میں گذار دیں کہ خدا کیا ہے؟ میں اپنی عمر اس سوچ میں گذار رہا
ہ انسان کیا ہے۔

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی،
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز ست

(کشمیر میں ہمارے خاندان کی رہائش موضع چکو پرگنہ اڈون (تحصیل کولگام) میں تھی، وہاں سے ہجرت کرکے سیالکوٹ آئے)

میری ولادت (۹ نومبر ۱۸۷۷ء) سے چند روز قبل میرے والد نے ایک خواب دیکھا کہ ایک بڑا ہی عجیب و غریب پرندہ فضا میں
ے کے قریب اُڑ رہا ہے اور بڑی کثرت سے لوگوں کا ہجوم ہے۔ اس ہجوم میں میں بھی ہوں۔ وہ پرندہ کسی کی کوشش سے ہاتھ نہیں آتا لیکن خودبخود
ے دامن میں آگرا اور میں نے اسکو پکڑ لیا۔ اس کے بعد میں پیدا ہوا تو انہوں نے اس خواب کی یہ تاویل کی کہ وہ بااقبال پرندہ میں ہی تھا۔
ال کامل ص ۳)

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

جب میں سیالکوٹ میں پڑھتا تھا تو صبح اٹھ کر روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کرتا تھا۔ والد مرحوم اپنے اوراد و وظائف سے فرصت
تے اور مجھے دیکھ کر گزر جاتے۔ ایک دن صبح کو میرے پاس سے گذرے تو مسکرا کر فرمایا کہ کبھی فرصت ملی تو میں تم کو ایک بات بتاؤں گا۔ میں نے
ار دو بتانے کا تقاضا کیا تو فرمایا کہ جب امتحان دے لو گے تب۔ جب امتحان دے چکا اور لاہور سے مکان آیا تو فرمایا جب پاس ہو جاؤ گے تب۔
، پاس ہو گیا اور پوچھا تو فرمایا بتاؤں گا۔

ایک صبح کو جب حسب دستور قرآن کی تلاوت کر رہا تھا تو وہ میرے پاس آگئے اور فرمایا "بیٹا! جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ یہ
ہ تم ہی پر اترا ہے یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے۔"

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب،
گرہ کشا ہیں نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

اُن کا یہ نقرہ میرے دل میں اُتر گیا۔ اور اس کی لذت دل میں اب تک محسوس کرتا ہوں۔

یکدن، والد مرحوم نے مجھ سے کہا کہ میں نے تمہارے پڑھانے لکھانے میں جو محنت صرف کی ہے، میں تم سے اس کا معاوضہ چاہتا ہوں۔ میں نے بڑے شوق سے پوچھا کہ وہ کیا ہے۔ والد مرحوم نے کہا کسی موقعہ سے بتاؤں گا۔ چنانچہ انہوں نے ایک دفعہ کہا کہ "بیٹا! میری محنت کا معاوضہ یہ ہے کہ تم اسلام کی خدمت کرنا"۔ بات ختم ہوگئی۔ اس کے بعد میں نے امتحان وغیرہ دے کر اور کامیاب ہوکر لاہور میں کام شروع کیا۔ ساتھ ہی میری شاعری کا چرچا پھیلا اور نوجوانوں نے اس کو اسلام کا ترانہ بنایا اور دوسری نظمیں لکھیں اور لوگوں نے ان کو ذوق و شوق سے پڑھا اور سُنا۔ اور سامعین میں ولولہ پیدا ہونے لگا تو ان ہی دنوں میرے والد مرض الموت میں بیمار ہوئے۔ میں ان کے دیکھنے کو لاہور سے آیا کرتا تھا۔ لیکن میں نے اُن سے پوچھا کہ والد بزرگوار! آپ سے جو میں نے اسلام کی خدمت کا عہد کیا تھا وہ پورا کیا یا نہیں! باپ نے بستر مرگ پر شہادت دی کہ جانِ من! تم نے میری محنت کا معاوضہ ادا کر دیا۔

حضرت مولوی سید میر حسن صاحب پروفیسر عربی سکاچ مشن کالج سیالکوٹ ..... بڑے بزرگ عالم اور شہر ہیں۔ میں نے انہیں سے اکتسابِ فیض کیا ہے (۲۹ اگست ۱۹۰۸ء اقبال نامہ حصہ دوم ص ۳۰۰)

جب میں ولایت گیا تو کچھ اپنا روپیہ میرے پاس موجود تھا لیکن زیادہ تر رقم میرے بھائی صاحب نے مجھ کو دی تھی۔ ولایت کے قیام کے دوران بھی وقتاً فوقتاً مجھ کو روپے بھیجتے رہتے تھے۔ جب میں نے کیمبرج سے بی۔ اے کر لیا تو انہوں نے لکھا کہ اب بیرسٹری کا کورس ختم کرکے واپس آجاؤ۔ لیکن میرا ارادہ پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری لینے کا تھا اس لئے میں نے جواب دیا کہ کچھ رقم بھیجئے تاکہ جرمنی جاکر ڈاکٹری کی سند لے لوں۔ انہوں نے مجھ کو مطلوبہ رقم بھیج دی۔ انہی دنوں میں وہ ایک روز سیالکوٹ میں اپنے بے تکلف دوستوں کی صحبت میں بیٹھے تھے کہ کسی شخص نے پوچھا:

"کیوں شیخ صاحب سُنا ہے اقبال نے ایک اور ڈگری لی ہے؟"

بھائی صاحب نے جواب دیا۔

"بھئی کیا بتلاؤں، ابھی تو وہ ڈگریوں پہ ڈگریاں لئے جا رہا ہے۔ خدا جانے ان ڈگریوں کا اجرا کب ہوگا؟" (آثارِ اقبال۔ ص ۲۶)

جرمنی کے متعلق میری معلومات اب (۱۰ اگست ۱۹۲۲ء) پُرانی ہو چکی ہیں۔ تیرہ برس گزرے ہیں میں اس ملک میں تھا۔ اس کے بعد اس ملک کو تاریخ عالم کی ایک عظیم ترین جنگ سے دوچار ہونا پڑا۔ اور اس وقت وہ ملک دُنیائی معاشی تاریخ کے ایک عدیم المثال مالی بحران میں مبتلا ہے میرا خیال ہے کہ جرمنی کی درسگاہوں میں بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ میں تو صرف اسقدر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنا مقالہ (ایران میں فلسفۂ الٰہیات کا ارتقاء) میونک یونیورسٹی میں پیش کیا تھا۔ جس کے اربابِ اختیار نے مجھے یونیورسٹی میں قیام کی شرط سے مستثنیٰ کر دیا اور مجھے اپنا مقالہ انگریزی میں لکھنے کی اجازت بھی مرحمت فرمائی۔

جرمن یونیورسٹیاں بالعموم تین سال یا ڈیڑھ سال کے لئے لیکچروں پر، حاضری پر اصرار کرتی ہیں۔ حاضری کی مدت کا تعین امیدوار کی اہلیت پر ہوتا ہے اور عام طور پہ مقالہ جرمنی زبان میں مرتب کرنے پر اصرار کیا جاتا ہے مجھے اپنے کیمبرج کے استادوں کی سفارش کی بنا پر

اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ پی۔ایچ ڈی کا امتحان زبانی جرمن زبان میں ہوا جو میں نے دوران قیام تھوڑی بہت سیکھ لی تھی (اقبال نامہ جلد اوّل ص ۲۲۹۔۲۲۸)

میں نے یورپ کی آب و ہوا اور تہذیب و تمدن کا مطلق اثر قبول نہیں کیا؎

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی،
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی

بندۂ روسیاہ کبھی کبھی تہجد کے لئے اٹھتا ہے اور بعض دفعہ تمام رات بیداری میں گزر جاتی ہے۔۔ ....اس وقت عبادت الٰہی میں لذت حاصل ہوتی ہے ع

"نماز بے حضور از من نیاید"

انگلستان میں میں نے اسلامی مذہب و تمدن پر لیکچروں کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ ایک لیکچر ہو چکا ہے دوسرا اسلامی تصوف پر فروری ۱۹۰۸ء کے تیسرے ہفتہ میں ہوگا۔ باقی لیکچروں کے عنوان یہ ہوں گے۔ "مسلمانوں کا اثر تہذیب یورپ پر" ـ "اسلامی جمہوریت"۔ "اسلام اور عقل انسانی" وغیرہ (۱۰ فروری ۱۹۰۸ء اقبال نامہ حصہ دوم ص ۳۵۰)

انگلستان میں طالب علمی کے زمانے میں میں بھی تقریروں کے شغل میں کچھ عرصہ کے لئے منہمک رہا۔ لیکن بعد میں، میں نے اسے بالکل ترک کر دیا۔ (انبیاء اور مصلحین اقوام کو چھوڑ کر) جو لوگ بے ضرورت اٹھتے بیٹھتے تقریریں کرتے رہتے ہیں ان میں روحانیت کا فقدان ہوتا ہے۔

۱۵ اپریل ۱۹۲۰ء کو اخبار نجم دکن سے معلوم ہوا کہ حیدرآباد ہائیکورٹ کی ججی کے لئے چند نام حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ کے سامنے پیش کئے گئے ہیں جن میں ایک نام خاکسار کا بھی ہے۔ اس خیال سے کہ میرا نام اور ناموں کے ساتھ پیش ہوا ہے اور یہ ایک قسم کا مقابلہ ہے چند امور آپ کے گوش گزار کرنا ضروری ہے ... اس جگہ کے لئے فلسفہ دانی کی چنداں ضرورت نہیں تاہم یہ کہنا ضروری ہے کہ اس فن میں میں نے ہندوستان اور یورپ کے اعلیٰ ترین امتحان انگلستان (کیمبرج)، جرمنی (میونک) یونیورسٹیوں کے پاس کئے ہیں۔ انگلستان سے واپس آنے پر لاہور گورنمنٹ کالج میں مجھے فلسفے کا اعلیٰ پروفیسر مقرر کیا گیا تھا۔ یہ کام میں نے ۱۸ ماہ تک کیا۔ اور یہاں اعلیٰ ترین جماعتوں کو اس فن کی تعلیم دی۔ گورنمنٹ نے بعد ازاں یہ جگہ مجھے آفر بھی کی مگر میں نے انکار کر دیا۔ میری ضرورت گورنمنٹ کو کس قدر تھی؟ اس کا اندازہ اس سے ہو جائے گا کہ پروفیسری کے تقرر کی وجہ سے میں صبح کچہری نہ جا سکتا تھا۔ چنانچہ ہائی کورٹ کو گورنمنٹ کی طرف سے ہدایت کی گئی کہ میرے تمام مقدمات دن کے پچھلے حصہ میں پیش ہوا کریں چنانچہ ۱۸ ماہ تک اسی پر عملدرآمد ہوتا رہا۔ مگر اس عہدے کے لئے جو حیدرآباد میں خالی ہوا ہے، غالباً عربی دانی کی زیادہ ضرورت ہوگی۔ اس کے متعلق برامر سرکار کے گوش گزار کرنا ہے کہ عربی زبان کے امتحانات میں میں پنجاب میں اوّل رہا ہوں۔ انگلستان میں مجھ کو عارضی طور پر چھ ماہ کے لئے لندن یونیورسٹی کا عربی کا پروفیسر مقرر کیا گیا تھا۔ واپسی پر پنجاب اور الٰہ آباد کی یونیورسٹیوں میں عربی اور فلسفہ میں بی۔اے اور ایم اے کا ممتحن مقرر کیا گیا اور اب بھی ہوں۔ امسال الٰہ آباد یونیورسٹی کے ایم۔اے کے دو پرچے میرے پاس تھے۔ پنجاب میں بی۔اے کی فارسی کا ایک پرچہ اور ایم۔اے

فلسفے کے دو پرچے میرے پاس ہیں۔ علاوہ ان مضامین کے میں نے پنجاب گورنمنٹ کالج میں علم اقتصادیات، تاریخ اور انگریزی بی اے اور ایم اے کی جماعتوں کی پڑھائی ہے۔ اور حکام بالادست سے تحسین حاصل کی ہے۔

تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی ایک عرصے سے جاری ہے۔ علم الاقتصاد پر اُردو میں سب سے پہلے مستند کتاب میں نے لکھی۔ انگریزی میں چھوٹی چھوٹی تصانیف کے علاوہ ایک مفصل رسالہ فلسفۂ ایران پر بھی لکھا ہے جو انگلستان میں شائع ہوا تھا۔ میرے پاس اس وقت یہ کتابیں موجود نہیں ورنہ ایصالِ خدمت کرتا۔

فقۂ اسلام میں اس وقت ایک مفصل کتاب بزبان انگریزی زیر تصنیف ہے۔ جس کے لئے میں نے مصر و شام و عرب سے مسالہ جمع کیا ہے۔ جو انشاءاللہ بشرط زندگی شائع ہوگی اور مجھے یقین ہے کہ اپنے فن میں ایک بے نظیر کتاب ہوگی۔ میرا ارادہ ہے کہ اس کتاب کو بلحاظ تفصیل مسائل کے اعتبار سے ایسا بناؤں جیسی کہ امام سرخسی کی مبسوط ہے جو ساٹھ جلدوں میں ہے۔ (خطوط اقبال)

لاہور ایک بڑا شہر ہے لیکن میں اس ہجوم میں تنہا ہوں۔ ایک فرد واحد بھی ایسا نہیں جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے۔ ؎

طعنہ زن ہے ضبط اور لذت بڑی افشا میں ہے
ہے کوئی مشکل سی مشکل رازداں کے واسطے

لارڈ بیکن کہتے ہیں جتنا بڑا شہر ہو اتنی ہی بڑی تنہائی ہوتی ہے۔ سو یہی حال میرا لاہور میں ہے۔ اس کے علاوہ گذشتہ ماہ بعض معاملات کی وجہ سے سخت پریشانی رہی اور مجھے بعض کام اپنی فطرت اور طبیعت کے خلاف کرنے پڑے۔ درحقیقت طبع سلیم میرے لئے شکنجے کا کام دیتی ہے۔ کیا خوب کہہ گیا ہے عرفی ؎

گر رستم ز مدعی بہ قبول غلط وے
در تابم از شکنجۂ طبع سلیم خویش

(اقبال نامہ جلد ۲ ص ۴۵)

ایک مرتبہ فارمن کرسچن کالج لاہور کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس نے مجھے بھی اس میں دعوتِ شرکت دی۔ اجلاس کا پروگرام ختم ہونے کے بعد چائے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ہم لوگ چائے پینے بیٹھے تو ڈاکٹر لوکس میرے پاس آئے اور کہنے لگے "چائے پی کے چلے نہ جانا، مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" ہم چائے پی چکے تو ڈاکٹر لوکس آئے اور مجھے اپنے ساتھ ایک گوشے میں لے گئے اور کہنے لگے ——— "اقبال! مجھے بتاؤ کہ تمہارے پیغمبر پر قرآن کا مفہوم نازل ہوا تھا اور چونکہ انہیں صرف عربی زبان آتی تھی، انہوں نے قرآن کریم عربی میں منتقل کر دیا یا یہ عبارت ہی اس طرح اُتری تھی؟" ——— میں نے کہا "یہ عبارت ہی اُتری تھی۔"

ڈاکٹر لوکس نے حیران ہو کر کہا "اقبال! تم جیسا پڑھا لکھا آدمی بھی اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ یہ عبارت ہی اس طرح اُتری ہے؟" میں نے کہا "ڈاکٹر لوکس! یقین! میرا تجربہ ہے۔ مجھ پر شعر پورا اترتا ہے تو پیغمبر پر عبارت کیوں نہیں اُتری ہوگی؟" ———

جب شعر کہنے کی کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے تو یوں سمجھو کہ ایک ماہی گیر نے مچھلیاں پکڑنے کے لئے جال ڈالا ہے۔ مچھلیاں اس کثرت سے جال کی طرف کھنچی چلی آرہی ہیں کہ ماہی گیر پریشان ہو گیا ہے۔ سوچتا ہے کہ اتنی مچھلیوں میں سے کسے پکڑوں اور کسے چھوڑ دوں!"

یہ کیفیت تو مجھ پر سال میں زیادہ سے زیادہ دو بار طاری ہوتی ہے لیکن فیضان کا یہ عالم کئی کئی گھنٹے۔ رہتا ہے اور میں بے تکلفی سے شعر کہتا جاتا ہوں۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ جب طویل عرصے کے بعد یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو پہلی کیفیت میں کہا گیا آخری شعر دوسری کیفیت کے پہلے شعر سے مربوط ہوتا ہے گویا اس کیفیت میں ایک قسم کا تسلسل بھی ہے، یا یوں کہنا چاہئے کہ یہ فیضان کے لمحے دراصل ایک ہی زنجیر کے مختلف کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو میں ایک قسم کی تکان، عصبی اضمحلال اور پژمردگی سی محسوس کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ چھ سات سال تک مجھ پر کیفیت طاری نہ ہوئی تو میں یہ سمجھا کہ خدا تعالیٰ نے مجھ سے یہ نعمت چھین لی ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں میں نے نثر لکھنے کی طرف توجہ کی۔ یک بیک ایک روز پھر یہی کیفیت طاری ہو گئی۔ ان لمحوں میں میری طبیعت ایک عجیب لذت محسوس کر رہی تھی۔ بس ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اشعار کا ایک بحرِ مواج ہے کہ امڈا چلا آتا ہے۔ یہ کیفیتِ سرور و نشاط اتنی دیر تک قائم رہی کہ اس نے چھ سات سال کے جمود و تعطل (قبض) کی تلافی کر دی۔

مشہور جرمن شاعر گوئٹے کے متعلق ایک کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ جب اس نے جرمن زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ پڑھا تو اپنے بعض دوستوں سے کہا کہ میں یہ کتاب پڑھتا ہوں تو میری روح میرے جسم میں کانپنے لگتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شاعر کو بھی ایک قسم کا الہام ہوتا ہے اس لئے جب وہ کوئی کتاب پڑھتا ہے تو اپنی روح کو اس کی معنویت سے ہم آہنگ پاتا ہے اور اس کی طبیعت ایک خاص اہتزاز محسوس کرتی ہے۔ یہ چیز دوسروں کو نصیب نہیں ہو سکتی (روزگار فقیر ص ۳۸-۴۰)

مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور
عطا ہوا ہے مجھے ذکر و فکر و جذب و سرور

میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فن شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصدِ خاص رکھتا ہوں۔ جن کے بیان کے لئے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے ورنہ ؎

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست
کہ بر من تہمت شعر و سخن بست　　　(زبور عجم)

(اقبال نامہ حصہ اول۔ ص ۱۹۵-۱۹۶)

میں اول اپنے کلام کو خاص لوگوں کے اندر محدود رکھنا چاہتا تھا اور اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ پہلے یہ لوگ میرے پیغام کو دیکھیں اور غور کر کے صحیح طور پر سمجھیں۔ پھر اس کو عوام تک پہنچائیں کیونکہ میرے خیال میں جب باریک باتیں عوام کے سامنے بلا کسی واسطے کے پیش ہوتی ہیں تو کچھ لوگ سمجھتے ہیں اور کچھ نہیں سمجھتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کہنے والے کا مطلب کچھ کا کچھ مان لیا جاتا ہے

(۱۹۳۱ء میں پہلی گول میز کانفرنس کے موقع پر ہندوستانی طلباء کے ایک اجتماع سے خطاب)

جب میں پہلے پہل لکھنؤ گیا تو وہاں کے مشہور شاعر پیارے صاحب رشید زندہ تھے۔ لکھنؤ کے بعض شاعری سے دلچسپی رکھنے والے دوستوں نے میری آمد پر شعر و سخن کی ایک مجلس منعقد کی، جس میں پیارے صاحب رشید بھی تشریف لائے۔ حاضرین سے نام بنام ملانے کے بعد میر مجلس نے فرمائش کی کہ میں اپنا کلام سناؤں۔ چنانچہ ان کے ارشاد کی تعمیل میں میں نے اپنی چند نظمیں سنائیں۔ میں وہ منظر اب تک نہیں بھولا کہ میں اپنا کلام سنا رہا تھا اور میرے ہر ہر شعر پر پیارے صاحب رشید کے چہرے سے حیرت اور کوفت کے ملے جلے جذبات کا اظہار ہو رہا تھا۔ کبھی ان کی بھنویں تنتی تھیں اور کھنچ جاتی تھیں، کبھی آنکھیں کھلی کی کھلی تھیں اور کبھی بند ہو جاتی تھیں۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ جب میں کلام سنا چکا تو ان کے پاس بیٹھ کر میں نے ادب سے پوچھا کہ آپ کے سامنے شعر پڑھنا ہے تو گستاخی، لیکن میں نے جو کچھ عرض کیا آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ انہوں نے قدرے تامل سے جواب دیا "ہاں صاحب! سنا ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو ایسی اردو ہم نے آج تک پڑھی ہے نہ سنی ہے۔ حیران ہوں کہ یہ فارسی ہے یا اردو ہے یا کوئی اور زبان ہے۔" (کچھ کسی قدر تبسم کے ساتھ) اب دلی اور لکھنؤ کے وہ لوگ رخصت ہوتے جا رہے ہیں جن کے دم سے اردو شاعری کے ان دو مرکزوں کی خصوصیتیں قائم تھیں، اور چند سال کی بات ہے کہ لکھنؤ، دلی، لاہور اور حیدرآباد دکن ایک سطح پر آ جائیں گے۔

زبان کو میں ایک بت تصور نہیں کرتا جس کی پرستش کی جائے بلکہ اظہار مطالب کا ایک ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ زندہ زبان انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے اور جب اس میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو مردہ ہو جاتی ہے۔ ہاں تراکیب کے وضع کرنے میں مذاق سلیم کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے۔ (۹ اگست ۲۳ء اقبال نامہ حصہ اول ص ۵۶)

زبانیں اپنی اندرونی قوتوں سے نشوونما پاتی ہیں اور نئے نئے خیالات و جذبات کے ادا کر سکنے پر ان کے بقاء کا انحصار ہے۔

(۹ ستمبر ۳۶ء اقبال نامہ حصہ دوم ص ۸۵)

اگرچہ میں اردو زبان کی بحیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تاہم میری لسانی عصبیت دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں (۲۷ ستمبر ۱۹۳۶ء اقبال نامہ حصہ دوم ص ۷۸، ۷۹)

میں نے کچھ دنوں پروفیسری کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ہندوستانی کالجوں کی پروفیسری میں علمی کام تو ہوتا نہیں، البتہ ملازمت کی ذلتیں ضرور سہنی پڑتی ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ طالب علموں کی حاضری کے متعلق گورنمنٹ کالج کے پرنسپل سے کچھ جھگڑا ہو گیا اور پرنسپل نے مجھ سے کچھ اس طرح گفتگو کی جیسے کوئی کلرک سے باتیں کرتا ہے۔ اس دن سے طبیعت ملازمت سے ایسی کھٹی ہوئی کہ جی میں ٹھان لی کہ جہاں تک ہو سکے گا ملازمت سے گریز کروں گا۔ (آثار اقبال ص ۲۲۔۲۳)

میں علی گڑھ کالج کی پروفیسری بھی نامنظور کرنے سے ہدف ملامت ہو رہا ہوں مگر ؎

شادم ز طعن خلق کہ مرغان باغ عشق
شاخ کہ سنگ می رسدش آشیاں کنند		(اقبال نامہ حصہ دوم ص ۳۵۹)

میں سیدھی سادی دیانتدارانہ زندگی بسر کرتا ہوں۔ میرا دل اور میری زبان ایک دوسرے کے ساتھ کلیتاً ہمنوا ہیں۔ لوگ

ریاکاری سے عقیدت رکھتے ہیں اور اسی کا احترام کرتے ہیں۔ میں ریاکاری اور منافقت سے کوسوں دور بھاگتا ہوں۔ اگر ریاکاری اور منافقت ہی میرے لئے وجہ حصولِ عزت و شہرت ہو سکتی ہے تو خدا کرے میں اس دنیا سے ایسا بے تعلق اور بیگانہ جاؤں کہ میرے لئے ایک بھی آنکھ اشکبار اور ایک بھی زبان نوحہ خواں نہ ہو۔ پبلک کے بہت سے پیروں والے عفریت کو اپنے احترام کا فضلہ دوسروں کو دینے دیجئے جو مذہب اور اخلاق کے بارے میں جھوٹے مطامحِ نظر کی مطابقت میں عمل کرتے ہوئے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ میں اُن کے رسوم و رواج کا احترام کرنے کی غرض سے جو انسانی دماغ کی فطری آزادی کو دباتے ہیں۔ اپنے آپ کو جھکا نہیں سکتا۔ بائرن، گوئٹے اور شیلے کا ان کے زمانہ کے لوگوں نے مطلق احترام نہیں کیا اور اگرچہ میں شاعرانہ اعتبار سے ان سے کہیں کم ہوں، تاہم فخریہ کہہ سکتا ہوں کہ اس بارے میں مجھے ان کی رفاقت حاصل ہے۔ (اقبال از عطیہ بیگم)

دنیوی نقطۂ نگاہ سے خطاب بھی ایک عزت ہے مگر ہر عزت فقط اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔

جینا وہ کیا جو ہو نفسِ غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے

میں ایک فقیر آدمی ہوں مجھے جو کچھ اعلیٰ حضرت (نواب صاحب بھوپال) دیتے ہیں۔ میری ضروریات کے لئے کافی ہے۔
(رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۱۰۴۱)

اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال کی پنشن قبول کرنے کے بعد کسی اور طرف نگاہ کرنا آئینِ جواں مردی نہیں ہے۔

(اقبال نامہ ص ۳۶۸)

امارت، عزت، آبرو، جاہ و حشم عام ہے۔ مگر دل ایک ایسی چیز ہے کہ ہر امیر کے پہلو میں نہیں ہوتا۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے جو رقم میرے لئے مقرر فرمائی ہے وہ میرے لئے کافی ہے، اور کافی نہ بھی ہو تو میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا روپیہ کا لالچ ہے جو کسی طرح بھی کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہے (اقبال نامہ ص ۳۷۴)

میں خود تو یہاں تک احتیاط کرتا ہوں کہ جو لوگ کتاب کو پڑھ نہیں سکتے وہ اسے خرید بھی کریں؟ کیونکہ ان کو خریداری کی ترغیب دینا ایک قسم کی ناانصافی ہے۔ باقی رہا میں تو میری طرح امتِ مرحوم میں سینکڑوں آدمی آگے گزر گئے ہیں جنہوں نے رکاوٹوں کے ہوتے ہوئے کام کیا ہے۔ مجھ سے جہاں تک ہو سکے گا انہیں کی تقلید کروں گا (۲۵ جون ۱۹۳۶ء بنام خان نیاز الدین خان)

کہاں سے تو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی
کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

ہر شاعر، ادیب اور آرٹسٹ کا فن اس وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک وہ زندگی کی تگ و دو میں شریک ہے۔ جو لوگ دنیا کے ہنگامے سے کٹ کر گوشۂ عافیت اختیار کر لیتے یا بغیر مشقت کے آرام و راحت کی زندگی بسر کرنا شروع کر دیتے ہیں وہ اس الہام سے محروم ہو جاتے ہیں جو صرف زندگی کے اتار چڑھاؤ میں براہ راست شریک ہونے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ ایک آرٹسٹ

کا نقطۂ نگاہ اور نصب العین قوم کے نقطۂ نگاہ اور نصب العین سے مختلف ہوتا ہے۔ اس ندرتِ ذوق و نظر کے باعث فرد اور سوسائٹی میں تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اور بعض اوقات اس تصادم سے ایسی چنگاریاں پھوٹتی ہیں جن سے آرٹسٹ کا فن حیاتِ تازہ حاصل کر لیتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میرے اوقات کا بیشتر حصہ فکرِ معاش اور دنیوی مکروہات میں ضائع ہو جاتا ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ اگر میں زندگی کی کشمکش سے علیحدہ ہو جاؤں تو میری شاعری بھی اس تڑپ سے محروم ہو جائے گی جس کا سب سے بڑا منبع خود زندگی ہے۔

(رسالہ ادبی دنیا اگست ۱۹۲۴ء ص ۱۲ ' اقبال کامل ص ۸۲)

(۳ جون ۱۹۳۶ء) دو سال سے اوپر ہو گئے۔ جنوری کے مہینے میں عید کی نماز پڑھ کر واپس آیا۔ سویاں دہی کے ساتھ کھاتے ہی زکام ہوا۔ بعد ازاں پیہم زکام بند ہوا تو گلا بیٹھ گیا۔ یہ کیفیت دو سال سے جاری ہے۔ بلند آواز سے بول نہیں سکتا۔ اسی وجہ سے مجھے بالآخر بیرسٹری کا کام چھوڑنا پڑا۔ انگریزی اور یونانی اطبا دونوں کا علاج کیا مگر کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ مجھے کسی قدر دمہ کی شکایت ہو گئی۔ حکیم نابینا صاحب نے فرمایا کہ تمہاری بیماری ایک ہلکا سا دمہ ہے۔ کھانسی اس شدت سے آتی تھی کہ میں بیہوش ہو جاتا تھا۔ اب یہ کیفیت نہیں ہے۔ صبح بلغم نکلتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس کھانا کھانے کے بعد بھی سفید بلغم نکلتی ہے جس کے نکلنے سے آواز نسبتاً بہتر ہو جاتی ہے۔ انگریزی اطبا کی تشخیص یہ ہے کہ ایک رگ جسے AORTA کہتے ہیں اور جو قلب کے قریب ہے۔ ایک مقام سے پھیل گئی ہے۔ اس کا دباؤ ووکل کارڈ پر پڑتا ہے۔ جس کے سبب سے بولنے میں دقت ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ان کی تشخیص یہ بھی ہے کہ طویل بیماری سے قلب کی رگیں کمزور ہو گئی ہیں۔ اس واسطے عام کمزوری ہو گئی ہے اور مجھے کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیئے جس میں EXCITEMENT پیدا ہو۔ ذرا سی محنت کرنے سے دم پھول جاتا ہے۔ یہاں تک کہ غسل کرنے میں اپنے ہاتھوں سے اپنا بدن بھی اگر ملوں تو دم چڑھ جاتا ہے۔ عام کمزوری بھی ہے۔ یہ مختصر کیفیت میری بیماری کی ہے۔

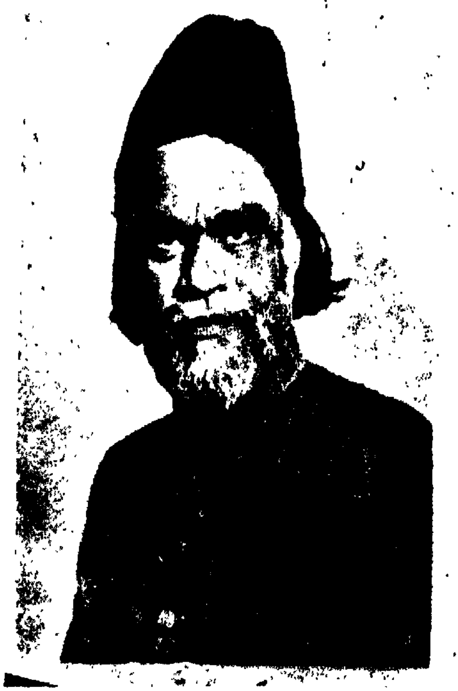
۳ اپریل ۱۹۳۶ء کی رات ۳ بجے کے قریب میں نے سر سید علیہ الرحمۃ کو خواب میں دیکھا۔ پوچھتے ہیں' تم کب سے بیمار ہو' میں نے عرض کیا' دو سال سے اوپر مدت گزر گئی۔ فرمایا حضور رسالت مآبؐ کی خدمت میں عرض کرو۔ میری آنکھ اسی وقت کھل گئی اور اس عرضداشت کے چند شعر جو اب طویل ہو گئی ہے' میری زبان پر جاری ہو گئے۔ انشاءاللہ ایک مثنوی فارسی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" نام کے ساتھ یہ عرضداشت شائع ہوگی۔ ۴ اپریل کی صبح سے میری آواز میں کچھ تبدیلی شروع ہوئی۔ اب پہلے کی نسبت آواز صاف تر ہے۔ اور اس میں وہ رنگ (RING) عود کر رہا ہے جو انسانی آواز کا خاصہ ہے۔ گو اس ترقی کی رفتار بہت سست ہے۔ جسم میں بھی عام کمزوری ہے۔

(اقبال نامہ جلد اول ص ۴۱۲-۴۱۴)

بینائی میں فرق آگیا ہے۔ اختلاج بہت بڑھ گیا ہے۔ پرہیز کا میں قائل نہیں۔ معلوم ہو رہا ہے کہ امتحان کا وقت آگیا۔ تقریب نصیب ہو رہا ہے۔ ہم آغوشی بھی مل جائے گی۔ انشاءاللہ (۲۰ مئی ۱۹۳۶ء) (اقبال نامہ جلد اول ص ۲۹۸)

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید

زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی



جگر مرادآبادی

"......... مجھے اپنے شعر و ادب پر سب سے بڑا فخر یہ ہے کہ میری زندگی اور میری شاعری میں بالکل مطابقت ہے۔ تضاد نہیں۔ نقالی اور استادانہ مشاقی میرے لئے ننگ رہی ہے اور انشاءاللہ ننگ سمجھتا رہوں گا........."

مسلسل دو سال علیل رہنے کے بعد میرے برادرِ نسبتی داغِ مفارقت دے گئے۔ میری اہلیہ کا خاندان بہت ہی مختصر سا ہے۔ لے دے کے دو بھائی بہنیں۔ اب ایک ہی بھائی رہ گئے ہیں۔ بیان نہیں کیا جا سکتا کہ گھر بھر کا کیا عالم تھا۔ بمشکل یہ مرحلے طے ہوئے تھے کہ دو ڈھائی سنہ بعد بارہ ہزار کی چوری ہو گئی۔ واقعہ یوں ہوا کہ میں اور میری "رفیقۂ زندگی" ۲۹/۳۰ نومبر کو مرادآباد کے لئے سفر کر رہے تھے کہ لکھنؤ اور بریلی کے درمیان ان کا ٹرنک چرا لیا گیا۔ نکلس طلائی، دست بند طلائی، کرن پھول نقرئی کا طلائی، اور بھی چند زیورات ٹرنک میں رکھ دیئے گئے تھے۔ چاندی کا سامان بھی بہت کافی تھا۔ نقد بھی موجود تھا اگرچہ صرف تھوڑا روپیہ۔ کپڑا خریدنے کا مجھے جنون نہیں۔ اپنے لئے بہت کم، بیوی کے لئے خاص طور پر بہت زیادہ اور نہایت اعلیٰ درجہ کا۔ اس کی بھی ایک خاص وجہ ہے جسے ان شاء اللہ کبھی بیان کروں گا۔ زیور اور روپیہ سے زیادہ اہم تر کپڑوں کا سرمایہ تھا۔ بہرحال خلافِ توقع میری بیوی نے بھی اس معاملے میں جرأت و محبت کا کافی ثبوت دیا اور مجھے تو ایک گونہ اس تصور سے اب تک مسرت محسوس ہونے لگی ہے کہ صدمہ ہوا ہی نہیں اور اگر تھوڑا بہت ہوا بھی تو اپنی "شریکِ زندگی" کے خیال سے۔ (۱۹۴۴ء)

میں اس صورت میں گونڈہ پہنچا کہ اضمحلال انتہائی حد تک پہنچ چکا تھا۔ "ایگزیما" کے علاوہ بظاہر کوئی دوسری بیماری بھی نہ تھی۔ ڈاکٹری معائنہ کے بعد معلوم ہوا کہ "بلڈ پریشر" بہت گر چکا ہے۔ بہرحال میں نے اپنا علاج خود شروع کر دیا۔ یعنی غذا، دودھ اور شہد۔ بحمداللہ کہ تجویز کامیاب ثابت ہوئی۔ اب حالت بہت کچھ رو بہ اصلاح ہے۔ (۱۹۴۵ء)

عام طور پر ہر عورت خصوصاً مرد کے متعلق بے حد ذہین، ذکی اور ماہرِ نفسیات ہوتی ہے۔ میری "محترمہ" اس حیثیت سے بہت بلند درجہ رکھتی ہیں اور اگر آپ مبالغہ تصور نہ فرمائیں تو واقعہ یہ ہے کہ وہ ذکی اور ذہین ہونے کے ساتھ صحیح معنوں میں ایک بلند درجہ شریف عورت اور شریف ترین بیوی ہیں۔ مجھ سے انھیں قدرتاً محبت ہے۔ سچی، گہری، بے غرض اور دینی ہمدردیوں کے ساتھ۔ حضرت قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت بھی ہیں اور حضرت اصغر کے تمام و کمال فیوض و برکات سے معمور۔ میں ڈرتا تھا کہ اگر ان کے علم میں تمام حالات آ گئے تو ان کی صحت پر گہرا اثر نہ پڑ جائے۔ وہی ہوا اور ایک حیثیت سے بہت ہی اچھا ہوا۔

انھوں نے ایک خواب دیکھا جسے میں کبھی آپ سے بیان بھی کروں گا۔ اس خواب نے تمام "طلسم" توڑ کر رکھ دیا۔ مختصراً یہ کہ ان کے علم میں ہر چیز آ گئی۔ جس کا لازمی نتیجہ بے ہوشیوں کی شکل میں ظاہر ہوا۔ یہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری اہلیہ محترمہ عام عورتوں کی طرح مطلق آزردہ نہیں ہوئی ہیں۔ ان تمام حالات میں صداقت ہی صداقت اور محبت ہی محبت کارفرما تھی۔ اگرچہ حالات نہایت درجہ دل شکن اور اندوہناک تھے۔ لیکن میں سمجھوں گا کہ منجانب اللہ بہت سی حقیقتیں بھی صحیح معنوں میں نہ صرف دماغ بلکہ پوری زندگی پر منکشف ہو گئیں اور اس طرح میں اس عذاب کو رحمت سے تعبیر کرتا ہوں۔ اب میں نے عہد کر لیا ہے کہ "افرادِ معلومہ" سے کسی طرح کا کوئی تعلق نہیں رکھوں گا کہ اس صورت میں

خطرات ہی خطرات ہیں۔ دینی اور دنیوی دونوں۔ "ایمان و آبرو" ایک طرف۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس طرح کی صورت پھر پیدا ہوئی تو مجھے اپنے آپ کو "قاتل" کی حیثیت سے بھی محسوس کرنا پڑے گا۔[1] (۸/۹ نومبر ۱۹۴۵ء)

شعلۂ طور منصۂ شہود پر آ چکا جس اہتمام اور سلیقے کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔ غالباً اب تک کوئی دیوان اس بلند معیار کے ساتھ شائع نہیں ہوا۔ مجھے کچھ جلدیں دی گئی تھیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ایک کثیر الاحباب انسان کتنے گھاٹے میں رہا کرتا ہے۔ خصوصاً جب کہ وہ صاحبِ مروت بھی ہو۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

طفیل صاحب مالک ادارۂ فروغِ اردو جو شعلۂ طور کے ناشر ہیں۔ چاہتے تھے اور اب بھی چاہتے ہیں کہ "آتشِ گل" بھی وہی شائع کریں اس دیوان کے لئے وہ اپنی سعی و کاوش کو اور بھی زیادہ صرف کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کا تقاضا ہے کہ میں اپنے مختصر لیکن اہم حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی نظریات علمی و ادبی لکھتا جاؤں تاکہ جلد از جلد انھیں ایک مقالے کی صورت میں شامل مجموعۂ کلام کیا جا سکے

خیر یہ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ صرف آٹھ ہزار پیش کرنا چاہتے ہیں اور دس ہزار جلدوں کی اجازت۔ وہ پورا دیوان "بلاک" کے ذریعہ چھپوانے پر مصر تھے اور دس بارہ اشعار کو مصور صورت میں بھی پیش کرنا چاہتے تھے۔ میں نے اولاً تو آمادگی ظاہر کی لیکن تفصیلات تمام حالات بیان کر دئے جانے (سے پہلے) ارادہ تھا کہ نیاز محمد خاں[2] صاحب کو صورتِ حال سے مطلع کر دیا جاتا اور ان کی اجازت حاصل کرنے کے بعد اس طرف قدم اٹھایا جاتا۔ لیکن .... اب معاملہ ختم کر دیا گیا۔ نیاز صاحب کو لکھنے کی نوبت ہی نہ آ سکی۔ (اپریل ۱۹۵۲ء)

یہ میں فخر یہ نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ انتہائی درد کے ساتھ کہ میری زندگی کا ہر شعبہ سخت پریشان اور کج نج واقع ہوا ہے۔ خدا جانے کس قدر سرمایۂ کلام ضائع ہو گیا اور کس قدر اغیار نے فائدہ حاصل کیا۔

شعر و ادب کے متعلق نثر میں متعدد طویل و مختصر مضامین لکھے جو میرے ذاتی تفکر و تدبر کا نتیجہ تھے۔ افسوس کہ سب ضائع ہو گئے۔

اولاً تو میرے لئے لکھنا لکھانا ہی مصیبت سے کچھ کم نہیں۔ اس پر بار بار کی شدید جگر کاویوں کے نتائج کا اس آسانی سے محو ہو جانا خصوصاً میرے لئے کس قدر اندوہناک سانحہ ہو سکتا ہے۔

ارادہ تھا "شعلۂ طور" پر خود کوئی مقدمہ لکھوں۔ چنانچہ کئی بار لکھا لیکن ہر بار کسی نہ کسی طرح ضائع ہی ہوتا چلا گیا۔ اور مشیت الٰہی شاید مجھ سے یہ کام لینا نہیں چاہتی یا کسی آنے والے وقت تک منتظر رکھنا چاہتی ہے۔ انشاء اللہ العزیز "شعلۂ طور" کی دوسری اشاعت میں اس کمی کو پورا کر دیا جائے گا۔

---

[1] شخصیات کی تصریح اور واقعہ کی نوعیت و تفصیل دونوں غیر ضروری ہیں۔ "توبہ" کے بعد "آزمائش و ابتلا" کا دور ضرور آتا ہے۔ پھر توبہ جس قدر راسخ و صادق ہوتی ہے اور "تائب" جتنا بلند مرتبت ہوتا ہے اس کی آزمائش بھی اتنی ہی صعب و سخت ہوتی ہے۔ جگر صاحب کو بھی اس دورِ ابتلا سے گزرنا پڑا اور وہ خدا کے فضل سے توبہ کی عظمت و تقدیس کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ [2] نیاز محمد خاں صاحب چاٹگام میں اس وقت کمشنر تھے اور شاید پاکستان کوآپریٹو بک سوسائٹی (ڈھاکہ) کے سرپرست بھی تھے۔ "آتشِ گل" کا پہلا ایڈیشن آپ کی تجویز و تحریک پر وہیں سے شائع ہوا تھا۔

سرسری طور پر اپنے کلام کے متعلق کچھ کہہ دینا چاہتا ہوں:

"غلط" سے نہ میں نے اپنے آپ کو بے پروا رکھا ہے اور نہ انھیں کا ہو کر رہ گیا ہوں۔ اکثر غلطیوں کا مجھے احساس ہے۔ بعض غلطیاں ایسی ہیں جنھیں میں نے دانستہ اختیار کیا ہے۔ بعض ایسی بھی ہیں کہ وہ اپنی جگہ محاسن ہیں۔

اکثر ایسی بھی ہوں گی جن کا مجھے علم نہیں یا جن کو ناقدانہ نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ اس لئے میں خوش ہوں گا اگر مجھے میری غلطیوں سے متنبہ کر دیا جائے۔

(میرے تدریجِ شعری کے اعتبار پر) شاعرے کی غزلوں میں سے بہت کم ایسی غزلیں ہو سکتی ہیں جن پر صحیح معنوں میں غزل کا اطلاق کیا جا سکے۔ تاہم ہر جگہ آپ میری انفرادیت محسوس کئے بغیر نہیں گزر سکیں گے۔

میری شاعری "غزل" ہی تک محدود ہے اور چونکہ حسن و عشق ہی میری زندگی ہے، اس لئے بعض مستثنیات کو چھوڑ کر کبھی دوسرے میدان میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کر سکا۔

واقعۂ کانپور کے متعلق جو نظم ہے۔ وہ بے شک بالکل بے اختیارانہ طور پر لکھی گئی ہے۔ لیکن اس میں ایک لفظ ایسا آ گیا ہے جس کے مفہوم کی محدودیت پر مجھے اکثر تاسف رہا اور وہ لفظ "مادرِ وطن" ہے۔ میں وطنیت اور قومیت دونوں کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔ ناظرین میں کسی کو اللہ اگر توفیق عطا فرمائے تو انھیں میری طرف سے قطعاً اجازت ہے کہ وہ اس کو صحیح کر دیں۔

اکثر سیاسی نظمیں بھی کہی ہیں لیکن احباب کے سخت اصرار پر۔ ممکن ہے کہ ان میں بھی کہیں کہیں اجزائے دل پائے جائیں لیکن میرے لئے وہ سرمایۂ ناز نہیں۔ اچھا ہوا کہ ضائع ہو گیا۔ البتہ دو نظمیں جن میں سے ایک نظم "تلک کی موت" پر ہے اور دوسری مکمل اسٹرائک کے موقع پر "بچوں سے خطاب"۔ ان دونوں کے تلف ہونے کا مجھے ضرور صدمہ ہے۔ لیکن تلک کی موت پر جو نظم ہے اس میں سے بعض تخیل کے متعلق محض اس خیال سے کہ ایسا نہ ہو کہ "مورخِ ادبی" میرے عقائدِ مذہبی کو بھی ویسا ہی سمجھنے لگے، اس لئے یہ ظاہر کئے دیتا ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ نظم پورے شباب کے عالم میں کہی گئی۔ جب کہ نہ مجھے مذہب کی خبر تھی اور نہ اپنی۔ اس لئے اس میں بے جا غلو اور بعض شدید قسم کی لغزشیں ہو گئی ہیں۔ میں نے بہت چاہا کہ یہ نظم دستیاب ہو جائے۔ لیکن نہیں ہو سکی۔ اس لئے احتیاطاً اس قدر لکھ دیا گیا۔

اپنی خصوصیاتِ شاعری کے متعلق فی الوقت کسی طویل مضمون نگاری کے لئے آمادہ نہیں۔ صرف کچھ کہنے کے لئے کہتا ہوں۔ مجھے اپنے شعر و ادب پر سب سے بڑا فخر یہ ہے کہ میری زندگی اور میری شاعری میں بالکل مطابقت ہے۔ تنہا نہیں۔ نقالی اور استادانہ شانی میرے لئے ننگ رہی ہے اور انشاء اللہ ننگ سمجھتا رہوں گا۔

دوسری خصوصیت کی جانب بہت کم حضرات کی توجہ منعطف ہوئی ہے اور وہ خصوصیت یہ ہے کہ میں نے (اول کلام کا کچھ زمانہ چھوڑ کر) حسن کو قصائی ہندی یا ایرانی عاشق کی طرح عشق کو ذلیل اور رسوا صورت میں ہرگز پیش نہیں کیا بلکہ حسن ہو یا عشق ان کے حقیقی تاثرات و واردات کو تا امکان صحیح صحیح شاعرانہ اندازِ بیان کے ساتھ نمایاں کر دیا ہے۔

محاکات کے اعتبار پر اکثر مقامات آپ کو ایسے ملیں گے کہ مصور کے تمام کمالات ان کی تصویر کشی میں بیکار محض ثابت

ہوں گے۔

لفظی اور معنوی دونوں حیثیتوں سے آپ کو اکثر و بیشتر مستقل اضافات اولیات ملیں گے جنہیں بخوفِ طوالت چھوڑتا ہوں۔ وقت نہیں کہ اس سے زیادہ کچھ لکھا جا سکے۔ ناظرین نکتہ رس خود ہی اندازہ فرمالیں گے۔

ممکن ہے کہ اکثر حضرات اپنے کلام پر اپنی ہی جنبشِ قلم کو پسند نہ فرمائیں گے لیکن اگر ازرہِ انصاف غور فرمائیں گے تو یقیناً مان لینا پڑے گا کہ شاعر سے زیادہ کسی دوسرے شاعر یا غیر شاعر کو اس کے کلام پر نقد و نظر کا حق نہیں۔ بشرطیکہ احتسابِ نفس کے ساتھ ہو۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں نفسیات کو مطلق دخل نہیں دیا گیا۔

میری زندگی گوناگوں انقلابات و تغیرات کا مجموعہ ہے جسے پیہم مصائب و آلام کی آمیزش نے خدا جانے کیا بنا دیا ہے۔ لیکن میں مُنہ بنا بنا کر رونے بسورنے کو بالطبع سخت ناپسند کرتا ہوں۔ خود میں نے کہا ہے ؎

جاں ہمہ غم ساختم، رقصم بہ عشق
دل ہمہ خوں کردہ، خنداں می روم

بے شک جس طرح جذباتِ مسرت و انبساط فطرتی عطیات ہیں اسی طرح جذباتِ غم و الم بھی۔ لیکن سچے رونے والے کہاں؟ الفاظ بے شک رونے والے صرف کئے جاتے ہیں لیکن ٹٹولیے تو درد کا نام بھی نہیں۔

مشاقی کی بدولت الفاظ پر قدرت حاصل ہے یا جو چاہا اور جس طرح چاہا کہہ دیا۔ زندگی کو شعر سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو۔ لیکن اگر سمجھنے والے ہوں بھی تاہم اس قسم کا "شعر و ادب" اولاً تو حیاتِ قومی کے لئے سمِ قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ دوئم کامیاب رونا وہ رونا نہیں جس میں نسائیت و عورتیت پائی جاتی ہے۔

آپ میرے کلام میں بظاہر درد کا عنصر بہت کم پائیں گے لیکن ذرا ٹھہر کر اگر آپ جذبات اور شعر کا جائزہ لیں گے تو ایک بہت ہی نازک سی موجِ درد ضرور محسوس کریں گے اور جس طرح میری زندگی تازہ بتازہ نو بنو انقلابات و تغیرات کے ماتحت تبدیل ہوتی گئی بعینہ اسی طرح رنگِ کلام بھی تبدیل ہوتا گیا۔ اس لئے جہاں تک ممکن ہو سکا اور حافظے نے مدد کی "شعلۂ طور" کو مختلف ادوار میں تقسیم کر دیا۔ تاہم نظرِ ثانی کا محتاج رہ گیا۔ انشاء اللہ دوسری اشاعت میں پورا لحاظ رکھا جائے گا۔

(شعلۂ طور۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۳۲ء مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ)

منکہ شیخ علی سکندر المتخلص بہ جگر مراد آبادی خلف شیخ علی نذر مرحوم ساکن حال گونڈہ کا ہوں جو کہ من مقر اپنی عمرِ طبعی کو پہنچ چکا ہے۔ آئے دن کی بیماریوں نے کمزور کر دیا ہے۔ پیمانۂ حیات لبریز ہو چکا ہے۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ نہ معلوم کب رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر جائے ہر فرد بشر کا فرض ہے کہ اپنی حیات میں اپنی مِلک کا ایسا انتظام کر دے کہ اس کے بعد اسے ثوابِ دارین ملتا رہے اور اس کے ورثا میں تنازعات بھی نہ ہوں۔ من مقر کے پاس کوئی جائداد غیر منقولہ نہیں ہے۔ میرا سرمایۂ حیات صرف یہ تین دیوان ۱؎ داغِ جگر ۲؎ شعلۂ طور ۳؎ آتشِ گل ہیں جو مجھے بہت عزیز ہیں اور جنہیں بفضلِ الٰہی ایک بڑی حد تک مقبولیتِ عام بھی حاصل ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی میں ان کا ایسا انتظام کر دوں کہ مجھے ان کے ذریعے ثواب ملتا رہے اور میری اہلیہ و بھائی کی — زندگی بھر مالی اعانت بھی ہوتی رہے۔

میرے کوئی اولاد ذکور و اناث سے نہیں ہے۔ میری اہلیہ مسماۃ نسیم جگر اور میرے برادر حقیقی علی مظفر بقید حیات ہیں۔ ان دو کے علاوہ میرا کوئی جائز وارث نہیں ہے۔ میں نے تمام امور پر کافی غور کر کے اور اپنے بہی خواہوں سے مشورہ کر کے یہ طے کیا ہے کہ میں ایک وقف علی اللہ الخیر علی الدوام موسوم بہ "جگر ٹرسٹ" قائم کر دوں جس کے ذریعہ میرا نام بھی قائم رہے، میری روح کو بھی ثواب پہنچتا رہے اور میری اور میرے وارثان کی تا حیات کفالت بھی ہوتی رہے۔

لہٰذا بحالت صحت نفس و ثبات عقل بدرستی حواس بہ رضا و رغبت خاطر خود یہ اقرار کرتا ہوں اور لکھے دیتا ہوں کہ تاریخ امروزہ سے اپنی تصانیف مندرجہ بالا اور ان کے جملہ حقوق طباعت و کاپی رائٹ کو اپنی ذاتی ملکیت سے نکال کر بہ ملکیت حق باری تعالیٰ عز اسمہ دے دیا۔ اب میری یہ تصانیف میری ملکیت نہیں رہیں بلکہ ملکیت حضرت باری تعالیٰ ہو گئیں۔

شرائط و مقاصد وقف حسب ذیل ہوں گے۔　　　73707

۱۔ یہ کہ یہ وقف جگر ٹرسٹ کے نام سے موسوم ہوگا۔　　　14 2 91

۲۔ یہ کہ جگر ٹرسٹ کے متولی آج سے میرے دوران حیات اور میری وفات کے بعد بھی میرے عزیز و مخلص دوست جناب محمد یٰسین قریشی صاحب المتخلص بہ تسکین ساکن حال خدیجی اسٹریٹ میرٹھ ہوں گے۔

۳۔ یہ کہ متولی جناب تسکین صاحب کو یہ اختیار ہوگا کہ اپنی وفات سے قبل اپنا جانشین متولی اغراض و مقاصد وقف کے لحاظ سے کسی بہتر و مناسب شخص کو مقرر کر دیں۔ اسی طرح ہر ان کے جانشین کو اپنی زندگی میں اپنا جانشین مقرر کرنے کا اختیار ہوگا۔

۴۔ یہ کہ متولی نامزد شدہ ہمیشہ حنفی المذہب مسلمان ہوگا۔

۵۔ یہ کہ متولی کو جائداد موقوفہ کے انتظام کا پورا اختیار ہوگا اور یہ بھی اختیار ہوگا کہ وہ میری تصانیف کو جس جس زبان میں مفید اور منفعت بخش سمجھیں طبع کرا دیں۔ چھپوانے کے شرائط و دیگر امور متعلق نفاذ و استعمال کاپی رائٹ طے کرنے کا حق بھی متولی کو ہوگا لیکن وہ کوئی ایسا کام نہیں کریں گے جو اغراض و مقاصد وقف کے منافی ہو۔

۶۔ یہ کہ ضروری مصارف طباعت وغیرہ نکالنے کے بعد جگر ٹرسٹ کی کل آمدنی کا چار بٹہ پانچ حصہ (⅘) میری زندگی میں متولی مجھ کو دے گا اور ایک بٹہ پانچ حصہ (⅕) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نادار مسلمان طلباء کو بطور امدادی وظیفہ کے دیا جائے گا۔ طلباء میں ترجیح ان کو دی جائے گی جو اردو ادب کے مطالعہ اور خواندگی میں مصروف ہوں۔

۷۔ یہ کہ واقف یعنی من مقر کی وفات کے بعد جگر ٹرسٹ کی چار بٹہ پانچ (⅘) آمدنی دو مساوی حصہ میں تقسیم کی جاوے گی۔ اس طرح پر کہ دو بٹہ پانچ (⅖) حصہ میری اہلیہ مسماۃ نسیم جگر اور بقیہ دو بٹہ پانچ (⅖) حصہ میرے برادر حقیقی علی مظفر کو دیا جاوے گا۔ واضح رہے کہ نسیم جگر اور علی مظفر صرف اپنی حیات ہی میں حصہ پائیں گے اور ان کی وفات کے بعد ان کے حصوں کی آمدنی بھی بسبیل خیر بصورت امدادی وظائف نادار مسلمان طلباء مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں حسب ہدایت ماقبل تقسیم کر دی جائے گی۔

۸۔ یہ کہ مسماۃ نسیم جگر اور علی مظفر کے انتقال کے بعد ان کے ورثا کو کوئی حصہ جگر ٹرسٹ کی آمدنی سے نہیں ملے گا نہ وہ اس کے دعویدار ہو سکیں گے اور اگر کوئی شخص ایسا دعویٰ کرے تو وہ باطل و نامسموع ہوگا۔

۹۔ یہ کہ متولی کا فرض ہوگا کہ وہ جگر ٹرسٹ کی آمدنی و خرچ کا باقاعدہ حساب رکھے اور سالانہ حساب کتاب کی جانچ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
کے آڈیٹر یا کسی اور کوالیفائڈ آڈیٹر یا چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ سے کرادے اور اس کی ہدایت کے مطابق عمل کرے۔

۱۰۔ یہ کہ کم از کم سال میں ایک بار متولی تقسیم منافع حسب شرائط دفعہ ۶، ۷ کیا کرے۔ متولی وقف میری زندگی میں مجھے اور میرے
انتقال کے بعد نسیم جگر اور علی مظفر کو سال کے آخر میں حساب، جانچ کرا دیا کریں یا نقل حساب بھیج دیا کریں۔

۱۱۔ یہ کہ ان تصانیف کے علاوہ آئندہ میں یا کوئی دیگر شخص جگر ٹرسٹ میں نقد یا کوئی جائداد وقف کرے تو وہ بھی شرائط بالا کی
پابند ہوگی۔

۱۲۔ یہ کہ تصانیف مندرجہ بالا کی مالیت کا صحیح اندازہ بحالت موجودہ نہیں لگایا جا سکا۔ اس لئے بغرض ادائے اسٹامپ مالیت
تصانیف مندرجہ بالا مبلغ ایک ہزار روپیہ قرار دی جاتی ہے۔ بنا بریں یہ چند کلمہ بطریق وقف نامہ الی اللہ والخیر علی الدوام تحریر کر دیا ہے کہ سند رہے
اور وقت ضرورت پر کام آوے۔ تاریخ تحریر ۲۶ مارچ ۱۹۶۰ء

دستخط

جگر مرادآبادی علی مظفر نسیم خاتون محمد ایوب احمد وکیل محمد بشیر صدیقی وکیل گونڈہ

اپنے اشعار میں

تکلف سے تصنع سے بری ہے شاعری اپنی
حقیقت شعر میں جو ہے وہی ہے زندگی اپنی
جگر رہ جائے بن کر آہ جو اک کاسۂ سائل
نہ ایسی شاعری اپنی نہ ایسی زندگی اپنی

ہے یہی عین دوستی اپنی طرف سے اے جگر دست کرم بڑھائے جا غیر کی دشمنی نہ دیکھ

جگر کی ہے زندگی محبت نہیں ہے اس کو کسی سے نفرت
جگر کے دل میں ہے سب کی عزت جگر ہے یاروں کا یار اب بھی

یار و اغیار سے محبت ہے گل تو گل خار سے محبت ہے

خون جگر کا حاصل اک شعر تر کی صورت اپنا ہی عکس جس میں اپنا ہی رنگ بھرنا

محبت ہی اپنا بھی مذہب ہے لیکن — طریقِ محبت جدا چاہتا ہوں

بلا سے رسوا سہی جگر لیکن — خوش نظر بھی ہے خوش خیال بھی ہے

جگر کا یہ نغمہ ہے اور سازِ مشرق — یہ مغرب زدوں کی کہانی نہیں ہے

صرف نقالی ہے مغرب کی جگر — شعر میں جب مشرقیت ہی نہیں

کوئی حسین حسین ٹھہرتا نہیں جگر — باز آئے اس بلندیٔ ذوقِ نظر سے ہم

میں نہیں بس میں خیام جگر — حافظِ خوش کلام نے مارا

مرا کمالِ شعر بس اتنا ہے اے جگر — وہ مجھ پہ چھا گئے میں زمانے پہ چھا گیا

مرا شوق بھی مرا ذوق بھی ہے بلند سطحِ عوام سے — ترا ہجر بھی ترا وصل بھی مرے دردِ دل کی دوا نہیں
مرے شعر میں ہیں نزاکتیں مری نظم میں ہیں لطافتیں — مری فکر میں کہیں اے جگر "ادبِ کثیف" کی جا نہیں

کاریگرانِ شعر سے پوچھے کوئی جگر — سب کچھ تو ہے مگر یہ کمی کیوں اثر میں ہے

شعلہ سامانیٔ غم پر نہ کرو ناز جگر — تم سے کتنے ہی جگر شعلہ بداماں ہوں گے

عالم تمام میرا ثنا خواں ہوا جگر — میں آپ اپنے شعر کا جب قدرداں ہوا

بزمِ مشاعرہ ہے یا گلشنِ تخیل — بلبل چہک رہا ہے یا حضرت جگر ہیں

تیرا دیوانہ غریب جگر — فخرِ ہندوستان ہے پیارے

حریمِ حسنِ معنی ہے جگر کاشانۂ اصغر		جو بیٹھو باادب ہوکر جو اٹھو بے خبر ہوکر

یوں تو ہوئے کہ جگر اور بھی اہلِ کمال		خاص ہے حضرتِ اصغر سے ارادت مجھ کو

نگاہِ حضرتِ اصغر کی ہے ودیعتِ خاص		قرار بن کے جگر کے دلِ حزیں میں رہی

پابندِ شریعتِ نبیؐ ہوں		خاکِ درِ دولتِ غنیؓ ہوں

کچھ ہم کو نہیں کام جگر اور کسی سے		کافی ہے بس اک نسبتِ سلطانِ مدینہ

جانتا ہوں کہ ہوں دراصل میں ننگِ اسلام		کچھ نہ اندیشۂ آغاز نہ خوفِ انجام
میری آشفتہ مزاجی میں نہیں کوئی کلام		وہی میخانہ و ساقی وہی بادہ وہی جام
مجھ کو اپنی روشِ خاص سے انکار نہیں
میرے مشرب میں ریاکاری و پندار نہیں

سب کو مارا جگر کے شعروں نے		اور جگر کو شراب نے مارا

کہاں پھر یہ مستی کہاں ایسی ہستی		جگر کی جگر تک ہی مے خواریاں ہیں

کیا جگر سے آپ ابھی واقف نہیں		اک ہی تو رندِ مے آشام ہے

للہ اب تو ذرا ہوش میں آجا		تنگ آگئے احباب تری بے خبری سے

جگر کی بادہ کشی ان دنوں معاذاللہ		جب آپ دیکھیں گے غرقِ شراب دیکھیں گے

دیکھا تھا کل جگر کو سرِ راہِ میکدہ		اس درجہ پی گیا تھا کہ نشے میں چور تھا

پہلے شرابِ زیست تھی اب زیست ہے شراب   کوئی پلا رہا ہے پئے جا رہا ہوں میں
یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر   جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں

اسے سمجھے نہ سمجھے کوئی لیکن واقعہ یہ ہے
کہ ترکِ میکشی پر بھی وہی ہے میکشی اپنی

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے   مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

احباب مجھ سے قطعِ تعلق کریں جگر   اب آفتابِ زیست لبِ بام آگیا

وہ حلم وہ تواضع وہ طرزِ خود فراموشی
خدا بخشے جگر کو وہ انسانوں کا انساں تھا

قریبِ منزلِ ہستی ہے الفراق جگر   سفر تمام ہوا نیند چھائی جاتی ہے

دل کو سکون، روح کو آرام آگیا
موت آگئی کہ یار کا پیغام آگیا



یگانہ چنگیزی

"........ آخرکار لکھنؤ پہونچا یہ واقعہ ۱۹۰۵ء کا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا اور رنگا رنگ دلچسپیوں نے مجھ پر ایسا اثر کیا کہ یہیں کا ہو رہا۔ وقتاً فوقتاً عظیم آباد جا کر جائیداد کا کچھ حصہ فروخت کر کے لکھنؤ میں بے فکری سے بسر کرتا رہا..."

میرزا واجد حسین یگانہ چنگیزی ابن پیارے صاحب ابن میرزا آغا جان ابن میرزا احمد علی ابن میرزا حسن بیگ چغتائی۔ یہ سلسلۂ نسب چنگیز خاں تک پہنچتا ہے۔ میرے ننھیالی بزرگ جن کا سلسلہ میرزا آغا جان تک پہنچتا ہے۔ لکھنؤ سے عظیم آباد چلے گئے اور مرشد آباد سے بھی ان کے تعلقات تھے۔

میری ولادت کی ٹھیک تاریخ معلوم نہیں۔ مگر اتنی معلوم ہے کہ ۱۳۰۱ھ ذی الحجہ کی آخری تاریخوں میں سے کوئی تاریخ تھی۔ عظیم آباد کا محلہ مغلپورہ میرا مولد ہے۔ میری ابتدائی تعلیم مولانا محمد سعید صاحب حسرتؔ[1] عظیم آبادی کے مدرسہ میں ہوئی۔ اس کے بعد عظیم آباد کے محمڈن اینگلو عربک اسکول میں داخل ہوا۔ اول سے آخر تک وظیفے، تمغے اور انعام پاتا رہا۔ ۱۹۰۳ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس پاس کیا۔

میرے ذاتی سخن کی اصلاح سب سے پہلے استاذی مولوی سید علی[2] جان صاحب بیتابؔ عظیم آبادی نے کی اور بعد ازاں اپنے استاد خان بہادر مولانا سید علی محمد صاحب شادؔ کے سپرد کر دیا۔ جن کی ذاتِ گرامی سے خاکسار کو بہت فیض پہنچا ہے۔

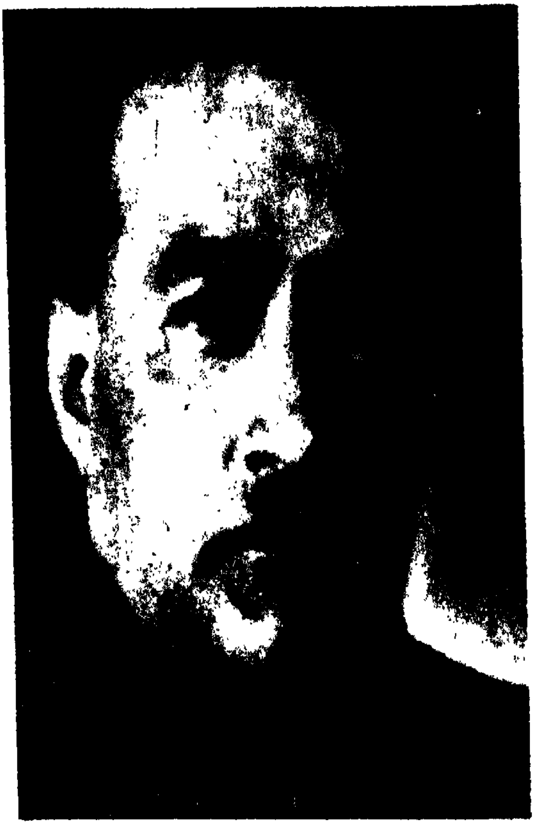
۱۹۰۴ء میں میں نے کلکتہ اور مٹیا برج کا سفر کیا۔ جہاں برسوں مرزا محمد مقیم بہادر (سلطانِ عالم حضرت میرزا محمد واجد علی شاہ بہادر کے نواسے) کے مرشد زادوں یعنی محمد یعقوب علی میرزا اور محمد یوسف علی میرزا کا کچھ دنوں معلم رہا۔ مگر مٹیا برج کی آب و ہوا نے صحت پر بہت خراب اثر کیا۔ کچھ دنوں علیل رہ کر عظیم آباد واپس آیا۔ یہاں بھی صحت درست نہ ہوئی۔ آخر کار لکھنؤ پہنچا۔ یہ واقعہ ۱۹۰۵ء کا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا اور رنگا رنگ دلچسپیوں نے مجھ پر کچھ ایسا اثر کیا کہ یہیں کا ہو رہا۔ وقتاً فوقتاً عظیم آباد جا کر اور جائداد کا کچھ حصہ فروخت کر کے لکھنؤ میں بے فکری سے بسر کرتا رہا۔

حسنِ اتفاق سے ایک سال میرے کرم و محترم نواب بنا صاحب موجؔ عظیم آبادی اپنے علاج کی غرض سے لکھنؤ تشریف لائے اور انھیں کی وساطت سے لکھنؤ کے معزز متوسط گھرانے میں میری شادی ہوئی۔ یہ واقعہ ۱۹۱۳ء کا ہے۔ میرے خسر جناب حکیم مرزا محمد شفیع صاحب اور نواب بنا صاحب موجؔ سے دیرینہ مراسم تھے۔ کتنے شائستہ کتنے پاکیزہ مزاج لوگ تھے۔ خدا جنت نصیب کرے۔

---

[1] حضرت شمس العلما مولانا محمد سعید صاحب عظیم آبادی ابن مولوی واعظ علی صاحب مرحوم عظیم آباد کے ایک باوقعت رئیس تھے۔ عربی فارسی میں یگانۂ روزگار اور فنِ خوش نویسی میں استاد مانے جاتے تھے۔ ۱۳۰۳ھ میں گورنمنٹ عالیہ سے شمس العلما کا خطاب پایا۔

[2] مولوی سید علی جان عرف لاڈلے صاحب عظیم آباد پٹنہ کے باشندے اور مولانا علی محمد صاحب شادؔ عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔



جوش ملیح آبادی

"......... اچھا ہوا کہ ساری جاگیریں ضبط کر لی گئیں اور ظالم کے ہات شل ہو کر رہ گئے۔ ورنہ آج بھی کسی جاگیردار صاحب کی انگنائی میں رات کے وقت پنکھے کی ڈوری کھینچنے والی جوانی کی پشت پر کوئی پہرہ دینے والی خبیث بڑھیا محض اس "خطا" پر دمادم گھونسے مار رہی ہوتی کہ رات کے وقت اس "مردار" کی جوانی کو نیند کیوں آگئی....؟....."

میرے خاندان میں بچوں کی تاریخ ولادت نہیں لکھی جاتی تھی، میری دادی کو قمری مہینوں کے حساب سے جو میری تاریخ پیدائش یاد تھی، اس کے لحاظ سے غالباً ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوا تھا۔ ملیح آباد کے محلہ میرزا گنج میں صبح کے چار پانچ بجے میری ولادت ہوئی تھی۔ جاڑے کا موسم تھا۔

دادی جان فرمایا کرتی تھیں کہ اس قدر لاغر پیدا ہوا تھا کہ مجھے چھوتے ہی میری چیخ نکل گئی تھی اس کمزوری کا یہ نتیجہ تھا کہ پورے نو سال تک سینے کے امراض میں گرفتار رہا تھا۔ میرے گھر میں ہر آن گہما گہمی رہتی تھی۔ زنانے میں لونڈیوں، باندیوں، ماماؤں، اصیلوں، اناؤں، دائیوں، کھلائیوں، مغلانیوں، پیش خدمتوں، استانیوں اور کہانی کہنے والیوں کا ایک لشکر چلتا پھرتا نظر آتا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ تعلقے سے آنے والی رعایا کی ان عورتوں کا بھی جمگھٹا رہتا تھا جو زری پنکھوں کی ڈوریاں کھینچنے، پانی گرم کرنے اور بھرنے، انگیٹھیاں دہکانے، غلے کو صاف کرنے، دو چکیاں پیسنے کی خاطر باری باری سے آیا کرتی تھیں۔

اسی کے دوش بدوش اس مستقل آبادی میں ان عورتوں کی آمد و رفت اور قیام سے اضافہ ہوتا رہتا تھا جو مراد حاصل کرنے اور آرام سے وقت گزارنے کے واسطے آئے دن آتی جاتی رہتی تھیں۔ یہی چہل پہل مردانے میں بھی رہا کرتی تھی۔ جہاں سپاہیوں، خدمت گاروں، ضلع داروں، کارندوں، منشیوں، مولویوں، ماسٹروں، مصاحبوں، داروغاؤں، باورچیوں، پہرہ دینے والوں، حقے بھرنے والوں، تیتر اور مرغ پالنے، داستان کہنے، پنکھا کھینچنے والوں اور گڑیتوں[1] کا ایک دریا سا بہتا رہتا تھا۔

اس مستقل آبادی میں اضافہ ہوتا رہتا تھا ان ارباب حاجت اور ان احباب و شعرا کی آمد و رفت سے جو آئے دن آتے جاتے اور ان میں سے بعض مہمانوں کی صورت سے مہینوں ٹھہرا کرتے تھے۔

میرا مزاج انتہائی سختی و نرمی اور غیر معمولی قہر و مہر کا ایک عجیب نقطۂ اتصال و مجموعۂ اضداد تھا۔ غصہ آتا تھا تو اس قدر کہ خدا کی پناہ اور پیار آتا تھا تو اس قدر کہ العظمۃ للہ (یہ مجھ میں اپنے باپ کا اثر تھا) اپنی انتہائی بد مزاج چھوٹی بہن انیس جہاں کو جب کہ وہ میرا منہ نوچ لیتی تھی۔ ایسی ایسی پٹخنیاں دیتا اور اس کے بال اس قدر زور سے نوچتا تھا کہ وہ بلبلا اٹھتی تھی۔ اور جب گھر کی بڑی بوڑھیاں اسے میرے چنگل سے چھڑانے آتی تھیں تو ان سے الجھ جاتا اور دیوانہ وار چیخیں مار مار کر کہتا تھا نہ چھڑاؤ، نہ چھڑاؤ، میں اسے مار ڈالوں گا، مار ڈالوں گا۔

مجھے برفی کھانے کا بہت شوق تھا، للّو اور کنجا حلوائی کی دکان سے میرے واسطے برفی کا ایک بہت بڑا دونا روز آیا کرتا تھا۔

میری کھلائی تھیں نوے برس کی عباسی خانم، میں جب انہیں برفی کھلانے پر آتا تھا، تو چاہتا تھا کہ آدھے سے زیادہ دونا انہیں کھلا دوں اور جب وہ بیچاری دو ایک ڈلیاں کھا کر یہ کہتی تھیں کہ بیٹا بس، میں اب کھا نہیں سکتی تو ان کے سفید بال پکڑ کر ان کا سر زمین سے لگا دیتا تھا۔ اور وہ بیچاری تھرائی آواز میں چیخیں مارتی تھیں کہ اللہ کوئی بچاؤ، منجھلا[2] مارے ڈال رہا ہے۔

---

[1] تعلقے کے کسان باسیوں کو "گڑیتا" کہا جاتا تھا جنہیں مالک کی خدمت یا بیگار کے معاوضے میں معافی کی زمین دی جاتی تھی۔ [2] مجھے "منجھلے بھیا" کہا جاتا تھا۔

بے سے ہم سب بھائی بہن بے حد ڈرتے تھے، لیکن میں شدت غضب میں ایک روز ان سے بھی گستاخی کر بیٹھا تھا۔
مرحوم کا حکم تھا کہ گھر سے بے اجازت قدم باہر نہ رکھو، اور جب باہر جاؤ تو دو ایک سپاہیوں کو ساتھ لے کر جاؤ۔
ایک روز والد مکان پر موجود نہیں تھے کہ ان کے ایک دس قدم کے پڑوسی، دوست مشیر احمد خاں کی والدہ نے اپنے لڑکے مختار احمد خان کی معرفت مجھے بلا بھیجا اور بڑے مزے کی بھنڈیاں، نوالے بنا بنا کر اپنے ہات سے مجھے کھلائیں۔

بھنڈیاں کھا کر میں اپنے مکان میں جب داخل ہوا تو دیکھا کہ والد آرام کرسی پر دراز ہیں، مجھے دیکھتے ہی ان کے تیوروں پر بل پڑ گئے، پوچھا، کہاں گئے تھے: میں نے کہا شیر خاں کے گھر۔ فرمایا کس سے اجازت لی تھی، میں نے کہا آپ تو یہاں تھے ہی نہیں، فرمایا سپاہیوں کے بغیر اکیلے کیوں گئے تھے، میں نے کہا سامنے ہی تو شیر خاں کا مکان ہے۔ یہ سنتے ہی والد نے میرا ہات پکڑا، زنانے میں لے گئے، اور وہیں زمین پر سے اٹھا کر ایک قمچی میرے پیٹ پر اتنے زور سے ماری کہ بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا "اللہ کرے مر جائے"۔

بس پھر کیا تھا، اللہ دے اور بندہ لے، والد نے مجھے اس قدر قمچیاں ماریں کہ میری کھال ادھڑ کر رہ گئی۔ اگر عین وقت پر میری دادی آ کر مجھے نہ بچا لیتیں تو میں بے ہوش یا ہلاک ہو جاتا۔ اس وقت جس قدر غیظ و غضب مجھ پر آخر تک طاری رہا۔ ویسا زندگی بھر میں شاید ہی کبھی طاری ہوا ہو۔

مجھے اپنی ماں سے بے حد محبت تھی، ہر چند میری ماں کو امور خانہ داری سے کوئی لگاؤ نہیں تھا مگر چونکہ وہ مجھے اپنے سب بچوں سے زیادہ چاہتی تھیں اس لئے میرے واسطے صبح کو دودھ کا پیالہ خود تیار کرتی تھیں۔ لیکن اگر دودھ میں کسی روز کوئی ذرہ تیرتا نظر آ جاتا تھا، تو میں پیالہ ان کے ہات سے لے کر اسے زمین پر اس طرح پٹک دیتا تھا کہ وہ چور چور ہو کر رہ جاتا تھا، اور میری ماں بے اختیار رونے لگتی تھیں۔

نہیں معلوم کس بنا پر "میاں بسنت" میری چڑھ تھی، ادھر کسی نے "میاں بسنت" کہا، ادھر میں نے اس پر حملہ کر دیا۔

ایک روز میرے باپ کی مجلس میں ایک دراز ریش بزرگ بیٹھے ہوئے تھے کہ کھیلتا کھاتا میں ادھر نکل آیا۔ مشیر احمد خاں نے جو بلا کے ظریف تھے ——— چپکے سے ان بزرگ کے کان میں کچھ کہا اور ان بزرگ نے مجھے مسکرا کر دیکھا اور بڑی محبت سے کہا: ادھر آئیے میاں بسنت" پھر کیا تھا، میں نے چیتے کی طرح جست کر کے ایک آن میں دونوں ہاتھوں سے ان کی داڑھی پکڑ لی، اور لگا زور زور سے جھٹکے دینے بے چارے مولانا صاحب کی پگڑی اور عینک زمین پر گر گئی۔ اور لگے وہ چیخیں مارنے۔

جب میرے باپ نے ڈانٹ کر ان کی داڑھی چھڑوائی تو ان کی داڑھی کے جو بال میری مٹھیوں میں ٹوٹ کر آ گئے تھے انہیں زمین پر گرا کر میں اپنے جوتوں سے روندنے، اور ان کی جانب نظریں اٹھا اٹھا کر کہنے لگا "کیوں بے نقطے پھر کہے گا "میاں بسنت"۔

ایک دن ہوائی بندوق لئے میں اپنے پھاٹک پر کھڑا ہوا تھا کہ ادھر سے ایک نائی کا لڑکا گزرا اور مجھے سلام کئے بغیر مڑنے لگا، یہ گستاخی مجھ سے برداشت نہیں ہوئی، میں نے فوراً اپنی بندوق بھر کا اور اس پر دن سے داغ دی۔

وہ لڑکا گر گیا اور زمین پر لوٹنے لگا اور مجھ ظالم نے قریب جا کر اس کے اتنی ٹھوکریں ماریں کہ خود میرا پاؤں دکھنے لگا۔

مجھے کھیل کود کا مطلق شوق نہیں تھا، مجھے نہ گویاں کھیلنا آیا، نہ پتنگ اڑانا آیا، نہ کبڈی کھیلی نہ فٹ بال، نہ ست گھڑے ہی میں اترا، اور نہ کبوتر بازی ہی آئی۔

لے دے کر میرے صرف دو شوق تھے کمرے کو سجانا اور ہم سنوں کو ستانا۔ میرے کمرے کی آرائشی چیزوں میں سے جب کوئی چیز کسی ملازم سے ٹوٹ جاتی تھی یا اپنے کمرے میں ایک تنکا بھی مجھے نظر آجاتا تھا تو ملازموں کو مارتے مارتے اَدھ موا کر دیا کرتا تھا، اسی طرح ہم سن بچوں کو ماسٹر صاحب جو گھر میں آ کر ہمیں سبق دیا کرتے تھے اگر وہ ان کو یاد نہیں ہوتا تھا تو پکڑ لیتا۔ بید سے ان کی کھال ادھیڑ دیا کرتا اور ان کے کاندھے پر بیٹھ کر انہیں پچھاڑیاں مارا کرتا اتنا دوڑاتا تھا کہ ان کی سانس پھول جایا کرتی تھی اور وہ جس قدر زیادہ روتے تھے اسی قدر مجھے آسودگی حاصل ہوتی تھی۔

ایک روز کا ذکر ہے میں اپنے محل کے زنانے حصے کی انگنائی میں اپنے گھر کے غلام زادے حسین بخش کو یاد نہیں کس خطا پر لوہے کی سلاخ سے مار رہا تھا کہ دادا میاں آ گئے۔ دادا میاں کو دیکھتے ہی میرا ہاتھ رُک گیا میں نے حسین بخش کو اس درندے کی نگاہ سے دیکھ کر جس کا شکار چھین لیا گیا ہو سلاخ کو دور پھینک دیا اور ضبط کیے ہوئے غصے کے اثر سے تھر تھر کانپنے لگا۔ دادا میاں نے مجھے بڑے غور سے دیکھا اس جوہری کی نظر سے دیکھا جو جواہر کے کھوٹے کھرے پن کو پرکھتا ہے۔ میرے قریب آئے۔ مسکرا کر میری پیٹھ ٹھونکی، میرا ہاتھ پکڑ کر میرے باپ کے کمرے میں لے گئے، دادا میاں کو دیکھتے ہی میرے باپ نے سرو قد ہو کر تسلیم کی، دادا میاں نے میرے باپ سے کہا بشیر مبارک ہو کہ تمہارا یہ بیٹا بڑا سورما نکلے گا۔ میرے باپ نے ہاتھ جوڑ کر کہا مگر بادا یہ ایک روز مجھ سے گستاخی کر چکا ہے۔ میں نے جب اس کو ایک چھڑی ماری تو یہ کہنے لگا "اللہ کرے مر جاؤ"۔

دادا میاں مسکرا کر بیٹھ گئے فرمانے لگے بشیر اس فقرے کو کبھی بھی گستاخی پر محمول نہ کرو۔ یہ تو ایک بہادر بچے کی ایک بے ساختہ جھلک تھی جس نے بلا ارادہ اس فقرے کا لباس پہن لیا تھا۔ بشیر سپاہ گری میں ہماری کئی نسلیں گزر چکی ہیں۔ ہم نے اپنی تلوار کی دھار پر اتنے بڑے بڑے کل کھڑے کر دیے ہیں ہم سے زیادہ کون بزدل و بہادر پرکھ سکتا ہے۔ یہ لڑکا جن تیوروں سے غلام کو مار رہا تھا اور مجھے دیکھ کر رک جانے والے غصے نے اس کے اندر جو ہیجان پیدا کر دیا تھا ناممکن ہے کہ یہ تمام علامات کسی بزدل میں پیدا ہو سکیں۔

اس کے بعد دادا میاں نے بڑی شفقت کے ساتھ مجھے دیکھا، جیب سے دو اشرفیاں نکال کر مجھے دیں کہ ان کا میوہ کھانا، اور دس روپے اس غلام کو دے دینا جسے تو مار رہا تھا اور پھر فرمایا کہ تیری جوانی تک میں زندہ رہا تو ربِ کعبہ[1] میں تیرے نام دو گاؤں اور دو باغ براہ راست لکھ دوں گا۔

اس کے بعد دادا میاں نے اٹھتے ہوئے میرے باپ سے کہا، دیکھو بشیر جہاں تک کہ بہادری کا تعلق ہے اس نقطے کو اچھی طرح سمجھ لو کہ بہادر بچپن میں گستاخ اور شقی معلوم ہوتا ہے، لیکن آگے چل کر وہ حلم بردباری، شفقت و اطاعت شعاری کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ پہاڑوں سے وہ بے شک ٹکر لیتا ہے لیکن حبابوں کے روبرو سر جھکا دیتا ہے۔

آپ نے میرا غیظ و غضب دیکھ لیا اب مہر و محبت کے بھی چند واقعات سن لیجیے۔

میں اپنی کھلائی عنایت خانم سے جنہیں میں "بڑی بی" کہتا تھا اس قدر محبت کرتا تھا کہ مٹھائی، میوہ، اور پھل جو کچھ مجھے ملتا تھا میں انہیں کھلائے بغیر کھا ہی نہیں سکتا تھا، یہ اور بات ہے کہ اپنے سن کی معذوری کی بنا پر جب وہ کھانا زیادہ کھانے سے انکار کر دیتی تھیں تو فرطِ محبت کی بنا پر ان بیچاری کے جھونٹے نوچ ڈالا کرتا تھا۔

۱۔ یہ دادا میاں کی خصوصی قسم تھی۔

بڑی بی کا مکان مرزا گنج سے تقریباً دو ڈھائی میل کے فاصلے پر بھنیارا پور میں تھا، جب وہ رخصت لے کر دو تین دن کے واسطے اپنے گھر چلی جاتی تھیں، تو میں اداس اداس رہتا تھا۔ ان کے حصے کے پھل اور مٹھائی بچا کر الماری میں رکھ لیتا تھا۔ اور جب ان کی جدائی ناقابل برداشت ہو جاتی تھی تو فنس میں بیٹھ کر ان کے گھر پہنچ جاتا تھا وہ لاکھوں دعائیں دے کر مجھے چمٹا لیتی تھیں، اور مری فنس میں بیٹھ کر میرے گھر آ جاتی تھیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں سیتا پور اسکول سے بڑے دن کی تعطیل میں گھر آیا تھا اور وہاں پہنچ کر بڑی بی کے انتقال کی خبر سنی تھی تو میں کھڑے قد سے زمین پر گر گیا تھا، میرے دانت بیٹھ گئے تھے، گھر میں ایک کہرام برپا ہو گیا تھا۔ فوراً ڈاکٹر کو طلب کیا گیا تھا، اور کئی روز تک میں بستر سے اٹھ نہیں سکا تھا۔

اثنائے تعطیل میں بڑی بی کی قبر پہ جانا، وہاں چیخیں مار مار کر رونا، ان کی قبر کی مٹی کو رومال میں رکھ کر لانا، اور اسے آنکھوں سے لگا لگا کر دن دن بھر رونا میرا معمول ہو گیا تھا۔

صبح کے وقت میرے دروازے پر جو فقیر اور جوگی صدا دیتے تھے۔ میں ان کو خالی ہاتھ جانے نہیں دیتا تھا۔ روپے پیسے کے ساتھ ساتھ میں انہیں مٹھائی اور پھل کھلاتا تھا، انہیں گنے دیتا تھا اور کبھی کبھی رات کے کھانے کی جو اچھی چیزیں ہوتی تھیں، وہ بھی انہیں کھلاتا یا ان کے ساتھ کر دیا کرتا تھا۔

میری دودھ بڑھائی کے بعد میری انّا جو لکھنؤ کی سیدانیوں میں سے تھیں، میری ماں کے بے حد روکنے کے باوجود جب لکھنؤ چلی گئی تھیں تو میری حالت اس قدر خراب ہو گئی تھی کہ میری ماں نے میرے باپ سے کہا تھا کہ خدا کے لئے انّا کو بلائیے، نہیں تو پھڑک پھڑک کر خدا جانے بچے کے دشمنوں کا کیا حال ہو جائے گا۔ میری بڑی بی جب مجھے انّا کی جدائی میں روتا دیکھتی تھیں تو دری بچھا کر زمین پر مٹی کا پتلا بناتیں اور اس پر رنگین چادر ڈال کر کہتی تھیں لے بیٹا، یہ تیری انّا لیٹی ہوئی ہے، میں فوراً اس تودۂ خاک سے چمٹ کر لیٹ جاتا تھا۔ اور مجھے اس قدر آسودگی محسوس ہوتی تھی کہ سو جاتا تھا، اور پہروں سوتا رہتا تھا۔

جب میرا چھوٹا بھائی (رئیس احمد خاں) پیدا ہونے والا تھا، تو اس کے پیدا ہونے سے پیشتر ہی مجھے اس قدر محبت ہو گئی تھی کہ اس کے واسطے جو کپڑے اور پوتڑے تیار کئے گئے تھے میں انھیں سینے سے لگا لگا کر چوما کرتا تھا، میں نے اس کا نام "للّو" رکھا تھا، "میرا للّو کب پیدا ہوگا؟" دن میں بار بار میں اپنی ماں سے پوچھا کرتا تھا۔ اور ایک روز پھٹا ہوا جوتا کہیں سے اٹھا لایا تھا کہ میرا للّو جب پیدا ہوگا تو اسے یہ جوتا پہناؤں گا۔

وہ غمناک شام اب تک مجھے یاد ہے کہ جب میری بڑی بہن کی شادی میں شریک ہونے کے بعد میرے نانا اور ماموں ملیح آباد سے رخصت ہو کر آگرے جا رہے تھے، میں نانا کے درجے سے کھینچ کر نکالا گیا تھا، اور گھر آ کر میں اس قدر رویا تھا کہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ ہر صبح کو جو پھل اور میوہ مجھے ملتا تھا، میں اسے جیبوں میں بھر کر باہر آتا، دو غلام زادوں کے کاندھوں پر بیٹھ کر "گھوڑے" کی سواری سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پھل اور میوے کا دانا گھانس ان کے منہ میں ڈالتا رہتا اور بیچارے "گھوڑے" سب کچھ کھا جاتے تھے اور "سوار" کے واسطے کچھ بھی باقی نہیں رہتا تھا۔

ایک تھے ہمارے سپاہیوں میں حیدر خاں، جو کمزور اور بوڑھے آدمی تھے، وہ افیون کے خوگر تھے، میں ہر صبح ان کے واسطے گھر سے دودھ اور بالائی لایا کرتا تھا۔ اور وہ مجھے دعائیں دیا کرتے تھے، کبھی کبھی میں افیون کے واسطے دام بھی دیا کرتا تھا، اور پھر والدہ سے التجا کر کے میں نے

یہ بندوبست کر دیا تھا کہ سال بھر کی افیون انھیں ہمارے علاقے سے مل جایا کرتی تھی۔

ایک روز میں اپنی کھلائی بڑی بی کے پاؤں داب رہا تھا، ہر چند بڑی بی نے مجھے بہت روکا، اور یہ بھی کہا کہ بیٹا اگر کوئی دیکھے گا تو میرے جوڑے میں ایک بال بھی نہیں رہے گا، بڑی بی کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی، اور میں برابر ان کے پاؤں دباتا رہا۔ اتنے میں ہمارے گھر کی ایک نہایت بدمزاج خادمہ ادھر آنکلیں اور بہت ترش کر بڑی بی سے کہنے لگیں واہ بڑی بی واہ جس کا کھاتی ہو اس کے بچے سے پاؤں دبواتی ہو، ابھی نمک حلالی ہے: یہ کہا اور بڑبڑاتی ہوئی میری دادی کے پاس پہنچیں اور کہنے لگیں سنالی بی، عباس خانم بڑھیا بچے سے پاؤں دبوا رہی ہے، مت ماری گئی ہے اس ڈھڈو کی۔

دادی جان نے مجھے اور بڑی بی دونوں کو بلا کر بہت بری طرح پھٹکارا۔ ہم دونوں رونے لگے، بڑی بی تو روتی ہوئی چلی گئیں، میں وہیں دادی کی چوکی پر بیٹھا رہا، انھوں نے مجھے سینے سے لگا کر تسلی دی اور کہا کہ بیٹا امیروں کے بچے غریبوں کے پاؤں نہیں دابتے، یہ بہت بری بات ہے، اب کبھی ایسی بری بات نہ کرنا۔ دادی جان کی "امیر" اور "غریب" کی اصطلاح میری سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن سب کچھ بوجھے میری آنکھوں میں ایسے غصے کے شعلے بھڑکنے لگے کہ اگر وہ نابینا ہو چکی ہوتیں تو میری ٹھکائی ضرور کر دیتیں۔

بھوت، پریت، آسیب، برمسرا، چڑیل، بھتنی، اژدہی، پچھل پائی، دیو، جن، پری، خبیث، عفریت، شہید، مردہ، اگیا بیتال، برہم راکسس۔

ہمارے تمام محلوں کے متعلق طرح طرح کے افسانے مشہور رہتے تھے۔ کوئی ایک بھی ایسا محل نہیں تھا جس کے متعدد گوشوں میں ان "ارواحِ خبیثہ" کا تصرف نہ مانا جاتا ہو اور کتنے دن بڑی بوڑھیاں "کل آدھی رات" کا کوئی نہ کوئی دہلا دینے والا واقعہ نہ بیان کرتی ہوں۔ خوفناک داستانوں میں پلنے والے بچوں کے واسطے یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ اندھیرے، اجالے کہیں آئیں جائیں، تنہا بیٹھیں، تنہا لیٹیں یا تنہا سوئیں۔

میری بڑی عمر تک بڑی بی جب تک میرے ساتھ نہیں سوتی تھیں، ناممکن تھا کہ مجھے نیند آئے، میں جب رات کو محل سرا سے باہر جانے کا ارادہ کرتا تھا تو ڈیوڑھی میں گزرانے کے واسطے ایک ماما میرے ساتھ ہو جایا کرتی تھی۔ اور حد یہ ہے کہ جب غسل خانے جاتا تھا تو ایک خادمہ دروازے پر پہرا دیتی اور بار بار یہ آواز دے دے کر میری ڈھارس بندھاتی رہتی تھی کہ بیٹا ڈرنا نہیں، ہم دروازے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

جب راتوں کو بستر پر لیٹے لیٹے میری نظر سکونت محل کے اس گوشے کی چھت کی منڈیر کی جانب اٹھ جاتی تھی، جو چڑیلوں کی آماجگاہ کہا جاتا تھا تو میرے سینے میں دہشت کی چھری کچھ سے جو ست ہو جاتی تھی، میں فوراً کچھ کچا کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا اور بڑی بی سے چمٹ جاتا تھا اور جب سوتے وقت دادی جان دعاؤں کا حصار کھینچ کر تین بار تالی بجاتی تھیں تو ڈر کے مارے میری چھاتی دھک دھک کرنے لگتی تھی۔

اس دہشت انگیز ماحول میں پروان چڑھنے کے باوجود یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ عنفوانِ شباب تک آتے آتے میں نے ان تمام اوہام سے مکمل نجات حاصل کر لی تھی، اور ہر روز پچھلے پہر بیدار ہو کر میں باغوں، ساحلوں، گھاٹیوں، کنجوں، میدانوں اور ویرانوں میں تنہا اور گاہ گاہ اعزہ کی فاتحہ خوانی کی خاطر گورستانوں میں بھی جا کر بیٹھا کرتا تھا (واضح باد کہ میرا یہ معمول "فاتحہ خوانی" کے علاوہ آج تک جاری ہے) لیکن صاف گوئی کا یہ تقاضا ہے کہ اس موقع پر میں اپنے دل کے چور کو بھی ظاہر کر دوں: یعنی ہر چند میں "ارواحِ خبیثہ" کے وجود کا قطعیت کے ساتھ منکر ہوں، اور ان تمام بے سروپا قابلِ مضحکہ باتوں پر اپنے قہقہوں کو بھی ضائع کرنا پسند نہیں کرتا، پھر بھی اگر آپ مجھ سے یہ فرمائیں کہ میں رات کو نہیں، دن کو بھی دادا میاں کے محل میں تنہا چلا جاؤں تو میں کسی قیمت پر بھی اس کی ہمت نہیں کر سکتا۔

جاڑے کے موسم کو میں بے حد پسند کرتا تھا، جب سنتا تھا "کنوار جاڑے کا دوار آگیا" میرے دل کی کلی چٹک جاتی تھی۔ صبح منہ اندھیرے

کوڑوں کی لائم کاڈں کاڈں اور ہلکی گلابی دھوپ کا تیپٹی رنگ نیرے دل کو موہ لیا کرتا تھا۔ یہی وہ موسم تھا جس میں کثرت کے ساتھ رت جگے اور گانے بجانے کی تقریبیں ہوا کرتی تھیں۔ رات رات بھر حبشی اور گاجر کا حلوہ بنایا جاتا تھا۔ شب دیگیں، ساول بٹیروں اور شکار کا گوشت پکایا جاتا تھا، باجرے کی ٹکیاں بنائی جاتی تھیں جو صبح کو ماش کی گرم گرم، کھچڑی، خالص گھی، اور لسوڑے کے اچار کے ساتھ کھائی جاتی تھی' اور سردی کی دھار جس قدر تیز سے تیز تر ہوتی چلی جاتی تھی، اتنا ہی انشراح صدر ہوتا چلا جاتا تھا۔

ہم سب بھائی بہنوں کے واسطے مخمل کی تھیلیاں سی جاتی تھیں، ان پر سُنہرا لچکا ٹانکا جاتا تھا اور ان تھیلیوں کو ہر صبح کشمش، پستے، بادام، اخروٹ اور چھلے ہوئے چلغوزوں سے بھر دیا جاتا تھا، اور گنوں کی بہاریاں آتی تھیں، خدمتگار گنے چھیل چھیل کر ٹھنڈی ٹھنڈی گنڈیریاں کھلاتے تھے۔ ہر گنے میں دس پانچ گنڈیریاں ملتی تھیں، باقی گنڈیریاں خدمتگار گرہوں کے نام سے خود کھا جایا کرتے تھے۔

لحافوں اور توشکوں میں بھرنے کے لئے اُجلی اُجلی روئی کے ایک طرف انبار لگا دیئے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خنک برف کے پہاڑ سر اٹھائے کھڑے ہیں۔

پھر جب وہ روئی دُھنکی جاتی تھی، تو اس کی دُھن پر کائنات جھومتی نظر آتی تھی اور جب دُھنکی روئی کے ہلکے پھلکے گالے ہوا پر اڑتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا سفید پھول ناچ رہے ہیں۔

دنوں سے کہیں زیادہ جاڑوں کی راتیں مزے کی ہوتی تھیں۔ لکھنؤ کے داستان گو سید محمد اکبر صاحب مردانے میں "طلسم ہوشربا" سناتے تھے اثنائے داستان گوئی میں افیون کی چسکیاں لے لے کے بالائی کھاتے جاتے تھے، اور پھر بڑے انہماک کے ساتھ حقے کے کش لیا کرتے تھے اور کبھی کبھی جب وہ اونگھ جاتے تھے، تو منہال ان کے منہ میں گھس جاتی تھی اور سیدھے بیٹھ کر پھر وہ داستان سنانا شروع کر دیتے تھے۔

جب داستان سُن کر ہم زنانے میں آتے تھے تو کھانے کے بعد بڑے اہتمام کے ساتھ ہمیں کہانیاں سنائی جاتی تھیں۔

ایک بہت لانبا چوڑا دالان ہماری خواب گاہ تھا، جس کے اونچے اونچے دروں میں موٹے موٹے پردے چھوڑ دیئے جاتے تھے بیچ میں ایک بڑا تخت ہوتا تھا، جس پر بڑے بڑے گاؤ تکیئے رکھے ہوتے تھے، اس تخت پر ایک بڑے طشت میں ایک خوب دہکتی ہوئی انگیٹھی رکھ دی جاتی تھی، انگیٹھی کے آتے ہی تمام لالٹینیں اور چراغ سامنے سے ہٹا دیئے جاتے تھے، جن سے انگیٹھی کا جوبن اور بھی نکھر جایا کرتا تھا۔ ایک گوشے میں عود اور اگر بتیاں جلا دی جاتی تھیں اور اس اہتمام کے بعد گھر کی بڑی بوڑھیاں، اور اڑوس پڑوس کی جانی بوجھی مہمان عورتیں تخت پر بیٹھ کر کہانیوں کے ریشمی جال بُننا شروع کر دیتی تھیں۔

جاڑوں کی خاموش دخنک اور طویل راتوں کی سرمئی محراب میں جب میں کہانیاں سنتا تھا تو دروں کے پردوں کا آسمانی رنگ رنگین لگتا تھا، کہانی کہنے والی کے چہرے کی جلد ایک چلمن بن جاتی تھی جس سے جل پریاں جھانکتی نظر آتی تھیں، انگیٹھی کے حسین کوئلوں کے بار بار چٹخنے میں کلیوں کے چٹکنے کی آواز گونجا کرتی تھی، ہلکی ہلکی آنچ کی کپکپاہٹ میں زہرہ کی کمر لچکتی دکھائی دیتی تھی۔ لحاف اور توشک کی نئی روئی کی خوشبودار گدگداہٹ، بدن کی رہ رہ کر رس مساہٹ بار بار کھلتے ہوئے بڑے بڑے پان دانوں کی کھڑکھڑاہٹ، ڈلی کٹنے کی نپی تلی کٹاکٹ، کہانیوں کے "شاہ زادوں" کے قدموں کی آہٹ اور "شاہ زادیوں" کی میٹھی مسکراہٹ۔ یہ تمام دل فریبیاں عود کی لپٹوں میں حل ہو کر کسی نامعلوم جادو کے جزیرے کا ایک گہرا گہرا بن جایا کرتی تھیں، ایسا چھا جانے والا کہرا جو میرے تمام وجود کو اپنے میں یکسر جذب و گم کر لیا کرتا تھا، اور اس طرح یہ واقعات و حوادث سے بوجھل کراہتی دنیا میری

نظروں سے تمام تر اوجھل ہو جاتی تھی۔ اور کسی نازک اندام الھڑ کے مانند ایک دبے پاؤں آنے والی ربودگی، مجھے نیند کے اس اتھاہ سمندر میں کھنکتی ہوئی آہستگی کے ساتھ غرق کر دیا کرتی تھی، جس کی موجوں کے ہلکوروں میں ابدیت کے گھنگھروؤں کی آواز مجھے لوریاں دیا کرتی تھی۔

اس موسم سے مجھے بیر تھا۔ حالانکہ اس گرمی کی پشت پر خربوزے تھے، تربوز تھے، آم تھے، فالسے تھے، لیمو تھے۔ فالسے اور گوکھرو کے شربت کے رنگین گلاس تھے، خس کی ٹٹیاں تھیں۔ دوپہر کو خس کے پنکھوں کی سلا دینے والی چوں چوں کی لوریاں تھیں، شام کے سوندھے چھڑکاؤ تھے۔ اور چنبیلی کے پھولوں کی مہکیں تھیں، لیکن اس موسم کی لو سے مجھے نفرت تھی (اور آج بھی ہے) لو ایسی معلوم ہوتی تھی گویا دوزخ میرے منہ پر اپنے شعلوں کے کلمات دم کر رہا ہے، آنچ کی پھونک دے رہا ہے۔ اور پھر سونے پر سہاگا اس خبیث موسم کی بے لگام، بدتمیز دھوپ، بوڑھے سود خوار مہاجنوں کی آنکھوں کی طرح بے مروت اور سپاٹ دھوپ، چنگیز اور ہلاکو کی چنگاریاں اڑاتی ہوئی مونچھوں کے مانند جلتی جلاتی بے مہر دھوپ

رات کو انگنائی میں خوب چھڑکاؤ کر کے ہمارے پلنگ بچھا دیئے جاتے تھے۔ تکیوں میں خس کا عطر مل دیا جاتا تھا۔ اونچے اونچے لکڑی کے کھمبوں پر ایک بہت بڑی شب نمی تان دی جاتی تھی۔ سرہانوں پر کاغذی آب خورے اور کیوڑے میں بسی چھوٹی چھوٹی آگرے کی صراحیاں رکھ دی جاتی تھیں۔

علاقے کی عورتیں باری باری ساری رات بھر زمینی پنکھوں کی ڈوریاں کھینچا کرتی تھیں۔ اور ان میں سے جب کوئی نیند کی ماتی اونگھ جاتی تھی تو اس وقت جس خادمہ کی پہرے کی باری ہوتی تھی وہ اس بے چاری کے جھونٹے پکڑ کر اس کی پیٹھ پر گھونسے مارنے لگتی تھی، اور جب کبھی ایسے موقع پر میری آنکھ آواز سے کھل جاتی تو میرا دل چٹکیوں میں مسلنے لگتا تھا، اور پھر دیر تک نیند نہیں آتی تھی۔

میرا دل بہت چاہتا تھا کہ بے رحم پہرے داری کو ڈانٹوں پھٹکاروں، مگر رات کے سناٹے میں اس خوف سے آواز نہیں نکلتا تھا کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی چڑیل میری آواز کی ڈوری پر سوار ہو کر آ جائے اور میرا ٹینٹوا دبا دے۔ اچھا ہوا کہ ساری جاگیریں ضبط کر لی گئیں اور ظالم کے ہاتھ شل ہو کر رہ گئے۔ ورنہ آج بھی کسی جاگیردار صاحب کی انگنائی میں رات کے وقت پنکھے کی ڈوری کھینچنے والی جوانی کی پشت پر کوئی پہرہ دینے والی خبیث بڑھیا محض اس خطا پر دمادم گھونسے مار رہی ہوتی کہ رات کے وقت اس "مردار" کی جوانی کو نیند کیوں آ گئی۔

برسات کا میں بچپن سے عاشق ہوں، لیکن ہائے اُس دور کی برساتیں اب کہاں! جھومتی، مستاتی، شور کرتی گھٹائیں کچھ ایسی کڑک، چمک اور کچھ اس قدر گرج گرج کے ساتھ اٹھتی تھیں کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑے گا، اور زمین پاش پاش ہو کر گز دو گز دھنس جائے گی۔ پانی برسنے پر آتا تھا تو تھمنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ پندرہ پندرہ دنوں کی جھڑی لگ جایا کرتی اور گلیوں سے آوازیں آیا کرتی تھیں: "رسوام دھڑاکے سے بڑھیا مر گئی فاقے سے" اور "کوڑی گئی ریت میں، پانی گیا کھیت میں"۔ ہمارے آم کے باغ کوئلوں، پپیہوں اور موروں کی آوازوں سے گونجنے لگتے تھے، اونچے اونچے درختوں میں جھولے پڑتے تھے۔ تالاب میں آم تیرتے تھے، تالاب کے کنارے کے بنگلے میں گانا بجانا ہوتا تھا اندرسے کی گولیاں بازار سے آتی تھیں، ایک طرف چھپر میں پوریاں تلی اور برھیاں بھائی اور ایک طرف دیگیں چڑھائی جاتی تھیں، تالاب میں تیر تیر کر آم کھائے جاتے تھے، آپس میں گٹھلیاں چلتی تھیں اور تمام دن دھوم مچائی جاتی تھی، ہم تینوں بھائی اپنے باپ اور ان کے احباب کی ان رنگ رلیوں کو دیکھتے ضرور تھے لیکن شریک نہیں کیے جاتے تھے۔ خیال یہ تھا کہ اگر ہم پانی میں اتریں گے تو ڈوب جائیں گے۔

میرا جی چاہتا تھا کہ میں بھی تالاب میں کود پڑوں، لوگوں کو گٹھلیاں ماروں، ڈبکیاں لگاؤں اور اچھلوں اور شور کروں، لیکن باپ کا حکم نہیں تھا

جب تھوڑی دیر کے بعد ہمیں باغ سے گھر بھیج دیا جاتا تھا تو ہم سب اپنی تمنا کویوں نکالتے تھے کہ ہماری انگنائی کے گوشے میں جو ایک بہت بڑا ہرا بھرا نیم کا درخت تھا اُس میں جھولا کرتے تھے، ہماری دادی جان جھولا جھلانے والیوں کو یہ تاکید فرمادیتی تھیں کہ بچوں کو آہستہ آہستہ جھولا جھلایا جائے۔

مگر میں یہ چاہتا تھا کہ میرا ہر پینگ آسمان کو چھولے، اس لئے چیخا کرتا تھا کہ ارے زور سے جھلاؤ۔ زور سے، اور جھلانے والیاں دھر اُدھر دیکھ کر میری پینگ تیز کردیا کرتی تھیں۔

درخت کے سامنے ایک سہ دری تھی جس میں ہماری پھپی نواب بیگم کے گھر جانے کی ایک کھڑکی تھی، اس سہ دری سے برساتی پکوانوں کی خوشبو جب ناک میں آتی تھی، چولہے کا ہلکا پھلکا دھواں جب گھٹاؤں سے لدی ہوئی رنگین فضا پر ایک پیچ و خم کے ساتھ تیرتا تھا، اور جھولتے ہوئے جب نیم کے گرد حلقہ باندھ کر لونڈیوں باندیوں کے گیت کانوں سے مس ہوتے تھے، اور شاخوں سے بوندوں کی ٹپ ٹپ اور بھیگی ہوئی نیم کی صحت افزا خوشبو جب میرے خون میں گھل گھاتی اور سرسراتی تھی تو مجھے اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہیں رہتا تھا، اور میں کیا ہوں، میں کہاں ہوں اس بات کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔

خلوت خاص عشق را بنگر
کہ بروں کردہ اندیشہ مرا

وہ گھڑی اب تک مجھے یاد ہے کہ حسبِ معمول ایک روز اُودی اُودی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اور ہم سب گیتوں کی پھواریں، جھولا رہے تھے کہ ایک رقت آمیز تھرتھراتی آواز نے یہ سارا خوشی کا طلسم ایک آن میں توڑ کر رکھ دیا تھا۔

وہ آواز تھی میری کھلائی "بڑی بی" کی، جنہوں نے حضرت "جانِ عالم" واجد علی شاہ کی یاد میں، جن کے بغیر تمام اودھ ایک ماتم کدہ بنا ہوا تھا، یہ درد بھرا گیت، اپنی نوے برس کی کانپتی آواز میں گانا شروع کر دیا تھا کہ "ارے تم بن برکھا نا سہائے، مورے گلنکے جویا اللہ نہیں لائے، ہائے تمہارے بغیر مجھے برسات اچھی نہیں معلوم ہورہی ہے۔ اے میرے کلکتے جانے والے اللہ تمہیں واپس لائے)۔

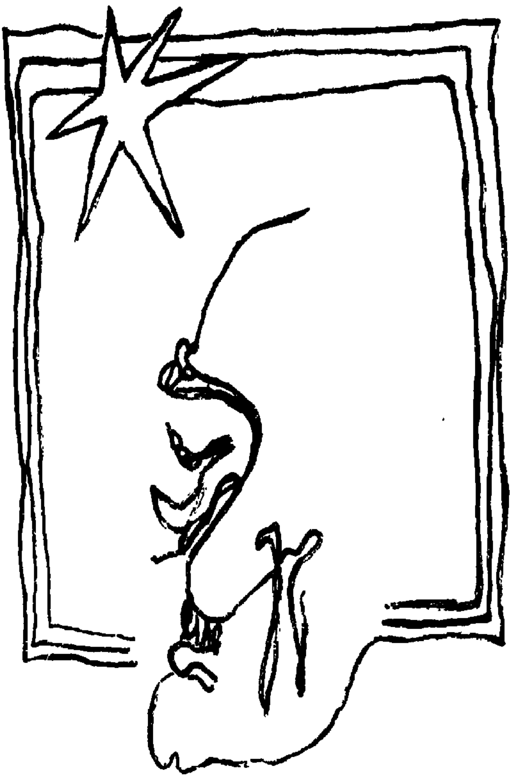
نیز غمگین و تلخ لمحہ بھی میرے حافظے میں اب تک جاگ رہا ہے جب کہ "بڑی بی" کو روتا دیکھ کر میں جھولے سے کود پڑا اور ان سے چمٹ چمٹ کر رونے لگا تھا۔ اس وقت میری پھپی نواب بیگم، جنہیں "ننھی بی بی" کہا جاتا تھا، اتفاقاً ادھر آنکلی تھیں اور مجھے روتا دیکھ کر انہوں نے میری بڑی بی" کو جھڑک کر یہ کہا تھا کہ "آگ لگے تمہارے گانے کو، بھاڑ میں جائے تمہارا گانا، بچہ پھکوں پھکوں رو رہا ہے۔" پھپی کی جھڑکی سن کر بیچاری "بڑی بی" تن ملا کھڑی تھیں اور اپنی روتی ہوئی آنکھیں اُن کی آنکھوں میں ڈال کر جب انہوں نے، اپنا ایک روئی کے بال والا سفید سر پیٹ پیٹ کر یہ کہا تھا کہ "ننھی بی بی" چھاتی پر ہاتھ دھر کر خدا لگتی کہو کہ جس نصیبوں جلی کا ساون مٹیا برج میں بند کر دیا گیا ہے، وہ نگوڑی کیوں نہیں روئے گی، ہائے کیونکر نہیں روئے گی، تو آس پاس کی تمام عورتوں کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں، اور خود میری بدمزاج پھپی بھی آنکھوں پر پلو رکھ کر رونے لگی تھیں، اور یہ رونا جنگل کی آگ کی طرح پھیل کر تمام گھر پر چھا گیا تھا، اور ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا اودھ کی تہذیب کا جنازہ اٹھایا جا رہا ہے۔

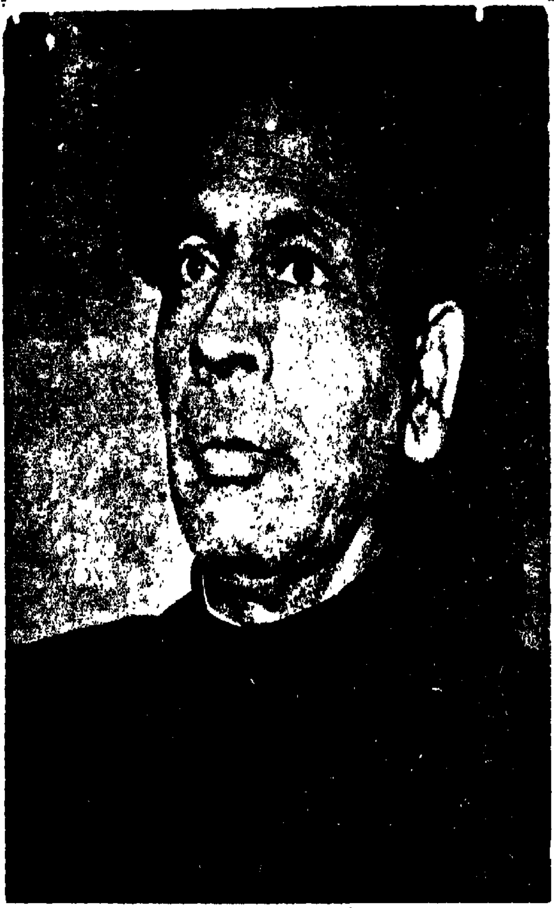
میرے نزدیک تمام شاہانِ عالم میں سے حضرت "جانِ عالم" کے علاوہ، شاید کوئی ایک بادشاہ بھی ایسا ہر دل عزیز نہیں گزرا ہے جسے کھو کر اس کی تمام رعایا نے، ایک زمانۂ دراز تک، اس قدر مسلسل آنسو بہائے ہوں۔ ط

مدتوں خاک اڑائے گی صبا میرے بعد

ہر چند اس وقت تک فرنگی کی غاصب حکومت نے اپنی شرمناک ہوسِ کشور کشائی کے تحت حضرت "جانِ عالم" کے سے فن کا پاک نفس پر جو تا قیامت یاد رہ جانے والے بے پناہ مظالم ڈھائے تھے، مجھے ان کی قطعی کوئی خبر نہیں تھی، اور میں فقط اپنی "بڑی بی" کو روتا دیکھ کر رونے لگا تھا۔

لیکن ہوش آنے کے بعد جب مجھے فرنگیوں کے مظالم کا علم ہوا تو "بڑی بی" کا وہ گیت جو میرے سینے میں اونگھا ہوا تھا یکایک جاگ اٹھا اور "بڑی بی" کی روتی ہوئی آنکھیں میری جانب اٹھیں اور کہنے لگیں، بیٹا فرنگی سے لٹکتے جانے والے کا انتقام ضرور لینا۔ "بڑی بی" نے میرے بچپن کی زمین میں آنسو بوئے تھے، میری نوجوانی چنگاریاں کاٹنے لگی۔





فراق گورکھپوری

"...... میں نے اُردو کو نئے الفاظ نئی تشبیہات اور نئے استعارے دیئے ہیں، لیکن میرا دل اتنا کچھ کرنے اور کہنے پر بھی مطمئن نہیں ہوا۔ چاہتا ہوں کہ اُردو کے لئے وہ کچھ کر جاؤں جو اب تک کسی نے نہ کیا ہو۔ شعر میری زندگی ہے اور اُردو اس کا ذریعہ۔ اس طرح اُردو میری زندگی ٹھہری" اور اپنی زندگی سے کسے محبت نہیں ہوتی ...."

شہرت میرے لئے ایک مصیبت ہو گئی ہے کیونکہ میری حیثیتیں کئی ہیں۔ اردو، ہندی، انگریزی تمام حلقوں سے نظموں، غزلوں، نثر کے مضامین، پیغامات، صلاح مشورے کی مانگیں آتی رہتی ہیں۔ جو ذہن میں پراگندگی اور انتشار پیدا کرتی ہیں۔ پھر لیکچروں اور تقریروں کی مانگیں بھی آتی رہتی ہیں اور ان سب پر مستزاد اگر بڑی ادب نے انعام کے کار منصبی کی ذمہ داریاں۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جاتا ہوں۔ میرے لئے بڑی بات صرف اپنے دردوں کی حالت نہیں ہوتی بلکہ اپنے درد کی حامل ہوتی ہے۔ صحت کی خرابی، نیم جوگی، سوداوی مزاج کی وجہ سے طبیعت میں انتشار، گھٹن اور گھبراہٹ، جسم کی مستقل تھکن، ہاتھ میں رعشہ آ جانے کی وجہ سے لکھنے سے معذوری، ان تمام بلاؤں میں مبتلا ہوں۔ بہر حال کام کئے جا رہا ہوں اور اپنے بس بھر ایک ادیب کے فرائض جیسے تیسے پورے کرتا جا رہا ہوں۔ عمر بھی ستر کے لگ بھگ ہے (تاریخ پیدائش: ۲۸ اگست ۱۸۹۶ء) پھر بھی اپنے شعور کو کچھ ایسی ترتیب دے سکا ہوں کہ داخلی سکون کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ اس امر کا خیال رکھتا ہوں کہ جو طوفان اٹھتے رہیں وہ میری شخصیت کی سطحوں پر اگر چل مچا دیں تو بھی میرے شعور کی گہرائیاں اپنا توازن قائم رکھیں۔

بظاہر میری زندگی کا خارجی ماحول دوسرے لوگوں کی زندگی کے خارجی ماحول سے زیادہ مختلف نہیں۔ میرا تعلق متوسط طبقے سے ہے۔ اور اس طبقے کی عام خصوصیتیں اپنی زندگی میں بھی پاتا ہوں۔ اس طبقے کی اچھی بری باتیں، خوبیاں اور کمزوریاں اپنی زندگی میں پاتا ہوں۔ اس کے باوجود اپنی ایک انفرادی شخصیت بھی رکھتا ہوں جس کے نمایاں خط و خال ہیں اور جو مجھ کو اپنے ہم چشموں سے ممتاز کرتی ہے۔ بچپن ہی سے میں اپنے بھائی بہنوں سے اپنے کو بہت مختلف پاتا تھا۔ مثلاً میں ان سب سے زیادہ جذباتی تھا۔ محبت اور نفرت کی غیر معمولی شدت میں اپنے اندر پاتا تھا۔ مانوس چیزیں بھی مجھے حد درجہ مانوس اور حد درجہ عجیب محسوس ہوتی تھیں۔ مناظرِ قدرت سے میں اتنا متاثر ہوتا تھا کہ ان میں کھو جایا کرتا تھا۔ میرے بچپن کی دوستیاں بھی اتنی شدید ہوا کرتی تھیں۔ بچپن کے کھیل کھلونوں سے بھی اتنی زبردست لگاوٹ محسوس کرتا تھا کہ گھر والے تعجب کیا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی میرا مذاق اڑاتے تھے۔ میری والدہ کا کہنا ہے کہ دو تین برس کی عمر ہی سے میں کسی بدصورت مرد یا عورت کی گود میں جانے سے انکار کر دیتا تھا۔ بلکہ یہاں تک ضد کرتا تھا کہ ایسے لوگ گھر میں نہ آنے پائیں۔ اس کی خوب ہنسی اڑتی تھی اور کبھی اس کیلئے مجھے چڑایا بھی جاتا تھا۔ نو دس برس کی عمر ہی سے جس لڑکی یا لڑکے کو، مرد یا عورت کو اپنے نزدیک میں خوبصورت سمجھتا تھا اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میرا جسم بلکہ میری ہڈیاں تک پگھل کر رہ جائیں گی۔ شعوری طور پر احساسِ حسن سے برانگیختہ ہونے والی جنسیت میرے اندر سنِ بلوغ سے کافی پہلے پیدا ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ زندگی میں اچھائی، خلوص اور شرافت کی قدریں بھی مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کرتی تھیں۔ جن گیتوں، کہانیوں اور واقعات میں ان قدروں کی جھلک دکھائی دی جاتی ان سے میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ اگرچہ میرا گھر ایک بھرا ہوا گھر تھا اور میں ٹوٹ کر سب سے ملتا تھا پھر بھی بچپن ہی سے اپنے اندر ایک احساسِ تنہائی پاتا تھا۔

گئے ہاتھوں یہ بھی بتا دوں کہ بچپن میں جو ابتدائی کتابیں پڑھنے کو ملتی تھیں ان کے حسنِ اسلوب سے میں بہت متاثر ہوتا تھا اور بد اسلوبی سے بدمزہ ہو جاتا تھا۔ اس طرح زندگی کے سترہ اٹھارہ سال کٹ گئے۔ بارہ تیرہ برس کی عمر ہی سے شعر کہنا چاہتا تھا لیکن جیسا پہلے کہہ چکا ہوں کہ میری زندگی جذبات سے اتنی لبریز تھی کہ اس عمر میں مجھے اظہارِ جذبات کے لئے الفاظ نہیں ملتے تھے اور شعر گوئی کی خواہش گھٹ کر رہ جاتی تھی۔ یہ گھٹن بسا اوقات ایک مصیبت بن جاتی تھی۔

بہرحال اٹھارہ برس کی عمر میں میری شادی کر دی گئی۔ میری بیوی کی شکل و صورت ویسی ہی تھی بلکہ اس سے بھی گئی گزری جو ان دنوں گاؤں کی تھی جن کی گود میں جانے سے میں دو تین برس کی عمر میں ہی انکار کر دیا کرتا تھا۔ اور زندگی کی دوسری صلاحیتیں بھی ان سے میری ذہنی ہم آہنگی کم تھیں۔ میری شادی نے میری زندگی کو ایک زندہ موت بنا کر رکھ دیا۔ زندگی کے عذاب ہو جانے کے باوجود میں نے خودکشی نہیں کی، نہ پاگل ہوا اور نہ جرائم پیشہ بنا۔ نہ زندگی کی ذمہ داریوں سے دست بردار ہوا۔ اس لئے کہ شدید حسن پرستی کے باوجود زندگی کی جن اقدار کو میں مان چکا تھا ان کا میں نے سہارا لیا۔ فرض شناسی نے مجھے برباد ہونے سے بچا لیا، یہ اور بات ہے کہ سال بعد تک مجھے نیند نہیں آئی اور صحت مستقل طور پر برباد ہو گئی۔ پھر بھی چونکہ علم دوستی کا جوہر بھی مجھ میں تھا اس لئے میں امتحانوں میں بہت اونچی پوزیشن لاتا رہا۔ بی۔ اے کا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی میرے والد منشی گورکھ پرشاد عبرت اور چھوٹے بھائی بہن سب سے بڑے دلیل تھے انتقال کر گئے۔ اور ایک بڑی گرہستی کے تمام مسائل میرے سر پر آ گئے۔

پی۔ سی۔ ایس اور آئی سی ایس دونوں کیلئے میرا انتخاب ہو چکا تھا لیکن بددلی اور بے دماغی نے مجھے اداس بنا دیا تھا کہ میں ان سے مستعفی ہو گیا تھا۔

ان صدمات اور تلخ حالات میں میں نے شاعری شروع کر دی اور بہت آہستہ آہستہ میں اپنی آواز کو پانے لگا، میرا ذوق اور شاعری کا دل و دماغ بچپن ہی سے بن گئے تھے۔ جب شاعری شروع کی تو میری یہ کوشش ہوئی کہ اپنی ناکامیوں اور اپنے زخمی حواس کیلئے اشعار کے ذریعے سے مرہم تیار کروں۔ میری زندگی جتنی تلخ ہو چکی تھی اتنے ہی پرسکون اور حیات افزا اشعار کہنا چاہتا تھا۔ بلکہ یوں کہوں کہ تلخی کو شیرینی میں بدل دینا چاہتا تھا۔ عام طور پر رات گئے اشعار کہنا شروع کرتا تھا اور غزل رات رہے ختم ہوتی تھی۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوا ہے کہ ادھر پو پھٹی ادھر غزل کا مقطع ہوا۔ ؎

اُجلے اُجلے سے کفن میں سحرِ شامِ فراق
ایک تصویر ہوں میں رات کے کٹ جانے کی

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رات کی کیفیتیں اور رات کی رمزیت جس طرح میرے اشعار میں سماں باندھتی ہے وہ چیز کہیں اور نہیں ملے گی۔ میرے کلام کا عنصر ایسا ہے جس کی بنا پر مجھے "شاعرِ نیم شبی" کہا جا سکتا ہے۔

شاعری میں میری کوششیں بہت دنوں تک تو سماجی یا سیاسی یا وطنی موضوعات سے الگ رہیں اور کافی دنوں تک تو میں اپنی شاعری میں حسن و عشق ہی کے جادو جگاتا رہا اور اس کی کوشش کرتا رہا کہ جنسیت کو کمزور کئے بغیر اور افلاطونی محبت یا عشقِ حقیقی سے قطع نظر کر کے جنسیت کو زیادہ سے زیادہ رچا سکوں اور اسے رس جس سے مالا مال کر سکوں

عشق کے غم و نشاط اور حسن کے تصورکی تہذیب و تالیف شروع ہی سے میری کوشش تھی۔ عشقیہ شاعری کو سطحیت، تنگی، [illegible] شہوانیت، عامیت اور چھوٹے پن سے بچانا اور اس میں زندگی کی اعلیٰ تر قدریں سمونا بھی میری کوشش رہی ہے۔ مغربی ادب خصوصاً ورڈز ورتھ کی شاعری اور انگریزی ادب کے دیگر اکابر و مشاہیر کے کارنامے، سنسکرت ادب کے کارنامے، فارسی ادب کے کارنامے مجھے برابر متاثر کرتے رہے ہیں۔ میری اردو شاعری جذبات و خیالات کے معاملے میں اور معیارِ شاعری کے معاملے میں جتنی غیر اردو ادب سے متاثر رہی ہے اتنا اردو شاعری کے مشاہیر سے استفادہ کرتا رہا ہوں۔ پھر بھی اپنی اردو کو اپنے وجدان کے سانچے میں ڈھالتا رہا ہوں [illegible] کی کوشش کرتا رہا ہوں کہ میرے اسلوب میں کتابوں کی زبان کے بدلے زندگی کی اور اثرات زندگی کی زبان جیتی جاگتی شکل میں ادا ہو۔ پھر کسی کیفیت کو محض مکمل طور پر بیان کر دینا میرا مقصد نہیں رہا۔ [illegible] انکلامی ایک طرح کا معجز بیان ہے کیوں کہ ہر کیفیت یا ہر خیال کے محدود منطقی پہلو کے علاوہ اس کا ایک وجدانی پہلو ہوتا ہے جس کے لئے صراحت کے ساتھ ساتھ اشاریت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس اشاریت کو اپنے اشعار میں سمونا میرے خاص مقاصدِ شعری میں رہا ہے۔ اس طرف ہمارے اردو کے شعراء کی توجہ بہت کم رہی ہے۔

جب میں زندگی میں عمل کی حیثیت سے متاثر ہونے لگا تو اس کے ساتھ ساتھ اشتراکیت کا صحیح مفہوم بھی سمجھ میں آنے لگا۔ ۱۹۳۶ء کے بعد سے میری متعدد نظموں، غزلوں اور رباعیوں میں یہ خیالات جگہ پانے لگے۔ اب میری کوشش نظموں میں یہ ہونے لگی کہ مسائل کو عالمگیر انسانیت کے ارتقاء کی روشنی میں پیش کروں۔ محض رجائیت ہونا (زندگی جیسی ہے اس سے متاثر ہونا) قومی پھر او قومی رواج کے تصور پر وجد کرنا اسے اب میں ناکافی سمجھنے لگا۔ اب دنیا اور زندگی پر وجد کرنے کے بدلے دنیا اور زندگی کو بدلنے کا تصور میرے اندر اجاگر ہونے لگا۔ دنیا کو بدل دینے کے عالمگیر عمل اور عوام عالم کی متحدہ کوششوں کی معنویت، دوررسی اور اس کے وجدانی پہلو کو ادب میں چمکانے اور روشن کرنے کو میں بہت اہمیت دینے لگا۔ پھر بھی مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ میری ذاتی زندگی بہت حد تک جنسیت زدہ رہی ہے۔ اور ہے ——— جنسیت سے چھٹکارا پانے کے بدلے میں نے اسے شعوری و وجدانی طور پر گہرا بنانے کی کوشش کی ہے۔ میری جنسی زندگی کو اس بات سے نہیں سمجھا جا سکتا کہ کن کن سے میرے تعلقات رہے ہیں۔ ان تعلقات کو میں نے کس طرح ہضم کیا ہے، جنسیت کو کتنا لطیف بنا سکا ہوں۔ جنسی جذبات و تجربات کو کتنا لطیف اور رنگین بنا سکا ہوں، اگر ان باتوں کا پتہ چلانا ہو تو میری غزلوں رباعیوں اور عشقیہ نظموں میں ان سوالوں کا جواب ڈھونڈھنا چاہیئے۔

میرے زمانے میں مرد اور عورت آزادی سے نہیں مل سکتے تھے اور نہ محبت کر سکتے تھے۔ چوری چھپے کی بات اور ہے اب بھی تبدیلیٔ حالات کے باوجود صورتِ حال بہت کچھ یہی ہے۔ اس لئے مجھے کچھ عورتوں کے حسن سے متاثر ہونے کے موقع تو ملے ہیں۔ لیکن ان سے عشق برتنے کے موقع نہیں ملے۔ یا بہت کم ملے ہیں۔

پاکیزگی جنسی تعلق سے بچنے کا نام نہیں بلکہ اس تعلق کو وجدانیت اور جمالیاتی صفات سے متصف کرنے کا نام ہے . . . جب جنسی جذبات کسی کی شخصیت میں حلول کر جاتے ہیں اور اس کے مستقل کردار کا جزو بن جاتے ہیں اور جب جنسی جذبات کے مقابلے میں احساسِ جمال بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے اور بہت زیادہ گہرا ہو جاتا ہے تب جنسیت عشق کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہے . . . . یہ حقیقت دہرانے کی ضرورت ہے کہ صرف جنسیت زندگی اور عشق زندگی نہ جنسیت کو چمکا سکتی ہے نہ عشق کو اور نہ عشقیہ شاعری کو۔ عشق اس وقت

عشق بنتا ہے۔ جب عاشق محض عاشق نہ ہو بلکہ کافی حد تک ایک مکمل انسان ہو۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ میری عشقیہ شاعری میں اور اردو کی پچھلی چوتھائی صدی کی شاعری میں قومی زندگی کی بیداری، نئی توانائیاں اور نئے امکانات پیدا کرتی جا رہی ہے۔

عشقیہ شاعری میں میری یہ کوشش رہی ہے کہ شرافت و صداقت و جذبات کے ساتھ ساتھ اشاریت کیفیت، ہمہ گیری، داخلیت و معنویت، تخلیق فضا اور زبان و بیان میں ایک عالمگیر لہجہ، انسان کے دل کی دھڑکنیں اور ایک آفاقیت پیدا کر سکوں۔ فنی محاسن اگر آئیں تو انھیں صفات اور مقاصد کو اجاگر نے اور چمکانے کیلئے آئیں۔ میں نے اپنی عشقیہ شاعری میں ایک قیمتی عنصر سمونا چاہا ہے اور وہ ہے حیات و کائنات پر مکمل ایمان۔ میرے لئے اس کی بالکل ضرورت نہیں تھی کہ خدا پر پہلے ایمان لاکر فطرت یا خلقت پر ایمان لاؤں۔ یوں تو میری عشقیہ شاعری میں دکھ، درد، غم، آنسو، اضطراب، ناکامی سبھی کچھ ہے۔ لیکن اثر اس شاعری کا حیات و کائنات سے بیزاری نہیں بلکہ حیات و کائنات پر ایمان کو تقویت پہنچانا ہے۔ تقویت کا سہارا لئے بغیر مجازی دنیا کی پاکیزگی اور خیر و برکت کا احساس کرانا میری عشقیہ شاعری کا مقصد رہا ہے حقیقت جسے حقیقت کہتے ہیں وہ میرے نزدیک اسی مجازی دنیا کا ارتقا پذیر وجود ہے۔ البتہ اب سے بیس برس پہلے تک عینیت و تصوف کا کچھ اثر مجھ پر ضرور رہا ہے۔ لیکن عنصری کائنات کی طہارت و پاکیزگی کا براہ راست احساس میرے اندر ہمیشہ رہا ہے۔

میں نے اردو کو نئے الفاظ، نئی تشبیہات اور نئے استعارے دیئے ہیں لیکن میرا دل اتنا کچھ کرنے اور کہنے پر بھی مطمئن نہیں ہوا۔ چاہتا ہوں کہ اردو کیلئے وہ کچھ کر جاؤں جو اب تک کسی نے نہ کیا ہو۔ شعر میری زندگی ہے اور اردو اس کا ذریعہ۔ اس طرح اردو میری زندگی ٹھہری اور اپنی زندگی سے کسے محبت نہیں ہوتی۔

میں اپنے ذاتی کردار و کلام کے متعلق یہ کبھی نہیں سوچتا کہ "ایں چنیں دیگرے نیست"۔ میں بسا اوقات اپنے کردار و کلام کا غیر جانبدارانہ اور سوجھ بوجھ کے ساتھ جائزہ لینے کی کوشش کرتا ہوں اپنے کردار میں کئی کمزوریاں پاتا ہوں۔ بچپن ہی سے خاص موقعوں پر میرے اندر غصہ کا جوالا مکھی پھوٹ جایا کرتا تھا۔ میں مغلوب النفرت بھی اپنے آپکو پاتا ہوں۔ لگ بھگ ادھیڑ عمر تک تو میں اپنی بدعتوں کو بکلیف وہ صفات سمجھتا ہوا بھی ان پر فخر کیا کرتا تھا۔ جن لوگوں میں غصہ کی کمی یا نفرت کی کمی پاتا تھا، انھیں میں اخلاقاً نامرد سمجھتا تھا۔

میرے اندر یہ نیم وحشیانہ صفات غالباً میری ماں کے اثر سے پیدا ہوئیں لیکن میری ماں کا غصہ کبھی کبھار ہوتا تھا اور وہ بہت جلد اپنے غصے کو بھول جایا کرتی تھیں۔ مجھ پر غیظ و غضب کے دورے ذرا جلد جلد پڑتے تھے اور میں ذرا دیر میں اپنا غصہ بھولا کرتا تھا۔ شدت ادراک و شدت احساس کی وجہ سے جو چیز مجھے بری لگتی تھی وہ ہر لمحہ میری نظر میں بد سے بدتر ہوتی جاتی تھی۔ اگر یہ غصہ ملازموں پر آیا تو میں گالی گلوچ اور مار پیٹ تک اتر آتا تھا۔ اگر دوسروں پر آیا تو قریب قریب خون اور قتل کر دینے کے جذبات سے میں بگھل اٹھتا تھا۔ میں ان لوگوں تک سے نفرت کرنے لگتا تھا جو غصے کو بری چیز کہتے تھے۔ غصہ کی برائی سن کر ہی مجھے غصہ آجاتا تھا۔ اب تک میری کچھ ایسی حالت ہے کہ چند اشخاص کے تصور ہی سے میرا جی چاہتا ہے کہ بری طرح پیٹوں۔ تاکہ ان کی تمام شرارتیں اور حرامزدگیاں دور ہو جائیں۔

میرے اندر سے مغلوب الغضب اور مغلوب النفرت ہونے کی خصوصیت سن شعور تک پہنچتے پہنچتے یقیناً غائب

ہو جاتی یا بہت کم رہ جاتی۔

اگر میری ازدواجی زندگی میرے لئے عذاب نہ ہوتی۔ سترہ برس کی عمر سے یعنی جب سے میری شادی ہوئی، میرا وجود غصہ اور نفرت کا ایک پکا پھوڑا بن کر رہ گیا ہے۔ دوسری شادی کا حوصلہ نہیں رہ گیا تھا اور بیوی کو مستقل طور پر اس کے میکے بھیج دینا یہ بھی بڑا ظلم معلوم ہوتا تھا، اسلئے ساتھ رہنا اور برابر غصہ و نفرت، بے دلی اور بددلی کے ساتھ جیتے رہنا میرے حصہ میں آیا۔ غور و فکر کے بعد میں کچھ کچھ سمجھنے لگا اور اب تک سمجھتا جا رہا ہوں کہ غصہ اور نفرت اگر وہ افراد کے خلاف ہے تو اس سے والے اپنے آپ کو تکلیف پہنچنے کے اور کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر میری شادی ایسی عورت سے ہوتی جس سے میں کافی عرصہ تک آسودہ ہوتا، کیوں کہ تہہ دل سے اور اپنی مرکزی فطرت سے میں یہی چاہتا تھا کہ دنیا بھر کو اپنی محبت سے نہلا دوں۔ ازدواجی زندگی سے شدید تلخی کی وجہ سے مجھے دوسروں سے محبت کرنا پڑی۔ اگر یہ تلخی میری زندگی میں آئی نہ ہوتی تو اس سے کئی ناتے ہوتے۔ ادھر خریدی ہوئی محبت کا میں قائل نہ تھا۔ اور پیشہ ور طوائفوں کو چھوڑ کر بھلے گھر کی عورتوں سے بے تکلف ہو کر ملنا میرے زمانے میں قریب قریب ناممکن تھا۔

میں بتا چکا ہوں کہ میرے نزدیک جنسیت محض شہوت یا مباشرت کبھی نہیں رہی۔ بلکہ ایک مکمل ساز زندگی رہی ہے۔ اس ساز کا مرکزی تار تو مہیب آوازیں پیدا کرتا رہا۔ یعنی وہ تار جس کا تعلق میری ازدواجی زندگی سے تھا۔ دوسرے تار یعنی غیر ازدواجی رومانوں کے تار کبھی کبھی خوش آہنگ و خوش آیند نغمے پیدا کرتے تھے۔ لیکن اکثر یا تو خاموش ہو جاتے تھے یا نا ہم آہنگ آوازیں پیدا کرتے تھے۔

اس طرح غصہ اور نفرت کے طوفان میرے اندر سے رفع دفع نہ ہو سکے لیکن میری شخصیت کی جڑیں یہ آندھیاں اکھاڑ نہ سکیں۔ میری علمی دلچسپیاں، بلند اخلاقی قدروں کو اپنے تخیل میں جگہ دینے کا عمل، زندگی کے خوبصورت تصورات سیاسی اور انسانی امور سے شائستہ دلچسپی، یہ تمام باتیں میری زندگی میں جاری ہیں، عملی زندگی کی نفرت شاعرانہ زندگی میں محبت، نیکی، نرمی اور شرافت کے پھول کھلاتی رہی ؎

ریاض دہر میں بوئے نشاط پھیل گئی
نہالِ غم کے بھی کیا کیا گل و ثمر نکلے

ازدواجی اور عشقیہ زندگی کے مسلسل غم نے مجھے حریم غم کے پوشیدہ ترین مقامات سے ہم آہنگ کر دیا۔ میں اپنے غم کو آزمائشوں سے پرایا غم سمجھنے اور اس سے ہم آہنگ ہونے کی طرف مائل ہونے لگا۔ اور میں غم کی معنویت سمجھنے اور اس سے ہم آہنگ ہونے کی طرف مائل ہونے لگا۔ اور میں غم کی معنویت سمجھنے لگا۔ نطشے کا یہ فقرہ میرے لئے بہت معنی خیز ہو گیا کہ "کرب کے روحانی بن جانے کا نام بھی ترقی ہے۔" اسی خیال کے تحت میں نے یہ شعر کہا ہے ؎

مٹ جائیں زمانے سے سراسر غم و اندوہ
ہونا نہیں آیا ابھی انساں کو غم آگیں

غم عموماً شروع تو ہوتا ہے کسی ذاتی سانحہ سے' لیکن اگر صحیح معنوں میں کسی کو توفیق غم ہوئی تو یہی غم حیات وکائنات کی معنویت کو سمجھنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اور اس میں آفاقیت آجاتی ہے۔

غم نے حیات وکائنات پر جو میرا اٹل ایمان تھا۔ اسے بجائے کمزور بنانے کے اور مستحکم بنا لیا۔ غم کا عنصر وجود کے مرکزی عناصر میں سے ہے اور نشاط کا عنصر بھی۔ ارتقائے حیات انسانی میں وہ موقعے بہت سعید ومتبرک ہوتے ہیں جب ان دونوں عنصروں کا سنگم ہوتا ہے۔ اور ان کی وحدت کا احساس ہوتا ہے' عمل پذیر وجود کا یہ احساس بہت وجد آور ہوتا ہے۔ اور زندگی میں ایک بلند سنجیدگی اور توازن پیدا کر دیتا ہے اب تعینات کے پردے اٹھ جاتے ہیں "کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا" والی منزل میں شعور انسانی قدم رکھتا ہے۔ ایک رباعی میں' میں نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔

ہر سنا ذہن ہوتی نہیں یہ دھن پیدا　　　ہوتا ہے بڑے جتن سے یہ گن پیدا

میزان نشاط و غم میں صدیوں تل کر　　　ہوتا ہے حسیات میں توازن پیدا

غم نشاط کی اصل حقیقت جب ہم پر کھلتی ہے تو غم نشاط پھر غم ونشاط نہیں رہ جاتے بلکہ عمل پذیر وجود کا صحیح ترین تصور بن جاتے ہیں میرے نزدیک اسی تموّج کو ہم غم ونشاط اپنی اصطلاح میں کہتے ہیں۔

اپنی کچھ اور ذاتی کمزوریاں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اب تو میں مغلوب الغضب اپنے آپکو اس درجہ تک نہیں پاتا جتنا اب سے کچھ پہلے پاتا تھا۔ پھر بھی شراب کے نشہ میں اگر میں نے کوئی ناخوش گوار اثر لے لیا تو حد سے تجاوز کر جاتا ہوں۔ اور غصہ کی رو میں بہہ جاتا ہوں۔ جوش نے میرے بارے میں یہ صحیح کہا ہے کہ ایسی حالت میں فراق سے وصال ہونے سے خدا بچائے۔

لیکن میں اپنے محترم دوست جوش صاحب کو اور دوسرے احباب کو یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اب میں اس بات سے بہت چوکنا رہتا ہوں کہ مجھے نشہ میں غصہ نہ آئے اور اگر آئے تو حد سے تجاوز نہ کر پائے۔ غصہ کے بعد میرا پچھتاوا ناقابل برداشت کرب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور جس شخص کی دل شکنی ہوتی ہے' جب تک وہ مجھ سے صاف نہ ہو جائے میں بہت دکھی رہتا ہوں۔

غصے سے ہی متعلق میرے اندر ایک اور کمزوری ہے۔ وہ یہ کہ جب کوئی بحث چھڑ جاتی ہے تو میرا لہجہ حملہ آور ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ کمزوری بھی اب برائے نام رہ گئی ہے۔ اب مجھے اس بات کا بہت دھیان رہتا ہے کہ جن لوگوں سے مجھے الجھنے کی نوبت آئی ہے۔ ہر لحاظ سے وہ مجھ سے کمزور ہیں اور برابری کے احساس کے ساتھ وہ ترکی بہ ترکی جواب نہیں دے سکتے' میری پوزیشن اور عمر کا خیال کر کے انھیں دبنا پڑتا ہے۔ ایسے موقعوں کے بعد جب مجھے ہوش آتا ہے تو میں شرم سے کھب کر رہ جاتا ہوں اور بڑی ندامت ہوتی ہے۔ چھوٹوں کی غلطی اور کمزوری کا اب میں احترام کرنے لگا ہوں۔ اور جو لمحے بھی میرے ساتھ گزارتے ہیں انھیں اپنے خلوص اور رواداری سے انتہائی طور پر خوشگوار بنانے کی کوشش کرتا ہوں۔

تیسری کمزوری میرے اندر یہ ہے کہ میں بہت سے کام وقت پر نہیں کر پاتا۔ خاص طور پر خطوط کا جواب تو بسا اوقات دے ہی نہیں پاتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ چند خیالات یا مسائل مجھ پر مسلط ہو گئے ہیں اور میں گفتگو میں اپنی چہیتی نفرتوں یا بلاوجہ کراہتوں پر ہی اظہار خیال کرتا رہتا ہوں' لیکن اب میں سامعین کا رخ پہچان کر ہی گفتگو کی تمہید اٹھاتا ہوں۔

معشوقوں سے اب میری محبت میں جنون کی شدت نہیں رہتی جس کا خوش آیند نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اپنے محبوبوں سے میں بیزار نہیں ہوا کرتا۔ محبت میں اعتدال محبت میں اضافہ کرتا ہے۔ اور شدت محبت کیلئے عموماً مہلک ثابت ہوتی ہے۔ اشتراکیت کے فلسفہ نے میری تنقیدی ذہنی کو شعبات بہت کچھ توازن بنایا۔ شاید اس عمر میں تجربات نے دل و دماغ کو اتنا سمجھ دار کر دیا ہے کہ جذبہ عشق نہیں لے ڈوبتا ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ نری جنسیت یا نرا عشق صحیح معنوں میں نہ جنسیت ہوتا ہے نہ عشق ہوتا ہے یہی بات شاعری کے بارے میں کہوں گا کہ نری شاعری اور نرا عشق صحیح معنوں میں نہ شاعری ہوتی ہے نہ شاعر ہوتا ہے۔ دوری کائنات اور تاریخ کائنات میں ایک مقبول شاعر کو گم ہو جانا پڑتا ہے۔ میری دلچسپیاں یا میری زندگی کی محرکات حسن، عشق و شاعری کے علاوہ تمام علوم و فنون سے تھیں۔ تمام انسانی علم سے تھیں۔ اپنے وطن کی بیڑیاں اور غلامی کی زنجیریں توڑنے کی کوششوں سے تھیں۔ آزادی کی تحریک میں ڈیڑھ برس تک قید فرنگ جھیلتا رہا۔ آئی سی ایس سے استعفیٰ دیا۔ اور مستقل طور پر اپنی زندگی کو اقتصادی حیثیت سے ایک معمولی زندگی بنا لیا۔ میں اپنی عمر بیکار نہیں گنوار رہا ہوں صرف اپنی دلچسپیوں پر روشنی ڈال رہا ہوں۔ ان ہی غیر تنقیدی دلچسپیوں نے میری تنقیدی شاعری اور بنیادی شاعری کے خطوط کو توانائی اور تابانی بخشی۔

۱۹۲۶ء کے قریب میری ملاقات ایک بہت بڑی ہستی سے ہوئی، انھوں نے میرا بھلا کرکے مجھے اپنا دوست بنا لیا اور میں ان کے ہاتھوں بے دام بک گیا۔ ایک بار ترقی پسند شاعری پر دوران گفتگو میں نے حسرت کا ذکر کیا اور کہا کہ حسرت اپنی غزلوں میں ہمیں حقیقتیں دیتے ہیں۔ انھوں نے کہا، لیکن بہت چھوٹی چھوٹی حقیقتیں۔ یہ فقرہ میرے لئے طلسم شاعری کی ایک کلید ثابت ہوا۔ حسرت کی صحیح قدر و قیمت تو میرے دل میں قائم رہی لیکن میں سوچنے لگا کہ غیر تنقیدی شاعری میں بھی وہ چیز ہونی چاہئے جسے انگریزی میں بیلسٹ کہتے ہیں۔ یعنی وہ وزنی شے جو جہاز کی تہہ میں جما دی جاتی ہے تاکہ جہاز ڈانوا ڈول نہ ہو۔ جذبہ اور تفکر کا آپس میں گھل مل کر ایک ہو جانا یہ صفت ان ملاقاتوں کے بعد سے میرے غیر تنقیدی اشعار میں جگہ پانے لگی۔ میرے مزاج میں پہلے ہی سے یہ بات تھی کہ عشق کائناتی اور آفاقی مسائل کے مس اور ملس سے ہی صحیح معنوں میں عشق بنتا ہے۔

نرے عاشق کے عشق میں اور اگر وہ عاشق بھی ہے تو اس کی شاعری میں ایک گھٹن پیدا ہو جانا ناگزیر ہے۔ آفاقی دلچسپیاں عشقیہ شاعری میں آفاقیت پیدا کر دیتی ہیں۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ تہذیب کے کارنامے ارتقائے جنسیت کے ہی کرشمے ہیں علیٰ ہذا القیاس تہذیب کے کارنامے سے دلچسپیاں جنسیت کے ارتقا میں مدد دیتی ہیں۔ یہ اثر اندازی باہمی ہوتی ہے شاعر پہلے دنیا بھر کو آنکھیں بھر کے دیکھ لیتا ہے، تب آنکھیں بند کر کے من کی جوت جگاتا ہے۔ بہت پاکیزہ معنوں میں شاعر کو دنیادار اور کاروباری آدمی ہونا چاہیئے۔ تاج محل شاہ جہاں کی ہی یادگار نہیں ہے بلکہ رموز مملکت خویش خسروان دانند کی جھلک بھی تاج محل میں نظر آتی ہے

اردو ادیبوں میں ایسا بہت کم لوگ کر سکے کہ تن تنہا ادب کے کئی اصناف کو اپنا سکیں۔ میری ادبی تخلیقیں اتنے اصناف میں آپ کو ملیں گی۔ دو تین کتابیں اردو نثر میں جن کا موضوع ادبی تنقید ہے جن میں "اندازے" کو میرے نزدیک خاص اہمیت حاصل ہے۔ غالباً تاثری تنقید کے مضامین کا اردو میں یہ پہلا مجموعہ ہے۔

پھر میں نے چند افسانے بھی اردو میں لکھے تھے جو اب سے پینتیس برس پہلے بلند ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئے۔ میں اور معروفیتوں کی وجہ سے یہ کام جاری نہیں رکھ سکا قریب ایک ہزار صفحوں کا تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ جو بہت سے رسالوں میں محفوظ تھا، میری غفلت سے دیمکوں کی نظر ہو گیا۔ ان کی کوئی نقل میرے پاس نہیں ہے، علاوہ ادب کے فلسفہ اور سیاسیات کے بہت سے مضامین میرے ذہن میں ہیں۔ لیکن سے

فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

اب جہاں تک شاعری کا تعلق ہے بہت سے حضرات میری غزلوں کو اس شدت سے پسند فرماتے ہیں کہ میری نظمیں انہیں متوجہ نہیں کر سکتیں۔ ہزارہا پرستاران ادب میری رباعیوں تک ہی میں اپنی پسندیدگی کو محدود رکھتے ہیں اور وہ بھی صرف عشقیہ اور جمالیاتی رباعیوں تک۔ ایسے بہت کم لوگ ہیں جن کی نظر میری تمام مساعی پر ہو یعنی نثر، غزل، عشقیہ اور جمالیاتی رباعیاں، اخلاقی اور فلسفیانہ رباعیاں، منظریہ نظمیں، عشقیہ نظمیں، مفکرانہ و فلسفیانہ نظمیں، منظوم ترجمے، غیر مقفیٰ نظمیں مارکسی اور اشتراکی نظمیں۔

اپنی قصیدہ خوانی میری مراد نہیں، بلکہ آپ حضرات کو دعوت غور و فکر دینا مراد ہے۔ اردو نظم کے مشاہیر نظیر اکبر آبادی، سودا انیس، اکبر، چکبست، درگا سہائے سرور، اقبال، حفیظ جالندھری، حالی اور اختر شیرانی کے کارناموں سے انکار کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں، لیکن حفیظ کے گیتوں کو اگر ہم الگ کر دیں تو ان تمام مشاہیر کی سنجیدہ، مسلسل نظموں میں اسلوب کا تنوع اور اس کی رنگا رنگی نہ ملے گی۔ جوش ملیح آبادی کے یہاں دو تین اسالیب بیان ضرور مل جائیں گے، لیکن میں نہایت خاکساری سے عرض کروں گا کہ تعداد میں اتنے زیادہ مختلف اسالیب بیان جتنے یہاں پیش کیے گئے ہیں، کہیں اور نہیں ملیں گے۔ یہ سب اسالیب محض میرے دماغ کی اپج نہیں ہیں۔ بلکہ مختلف زبانوں کے ادب کی تکنیک میرے اسالیب بیان پر اثر انداز ہو رہی ہے۔

غزلوں میں بھی غالباً سب سے زیادہ اسالیب بیان کے نمونے پیش کرنے میں کامیاب رہا ہوں۔ ایک گزارش اور ہے پچھلے چالیس پچاس کی اردو شاعری میں ٹھیٹ ہندی الفاظ روزمرہ ٹکسالی بول چال اور محاوروں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں پیش کرنے میں میری کوششیں نگاہ توجہ چاہتی ہیں۔ خوف طوالت سے ان کی مثالیں پیش نہیں کر سکتا۔ استعاروں اور تشبیہوں اور تعبیروں کے بھی غالباً جوش ملیح آبادی کو چھوڑ کر میں زیادہ سے زیادہ اور نازک سے نازک نمونے پیش کر سکا ہوں۔

ان باتوں کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں اپنے متعلق کوئی پر مبالغہ خوش خیالی رکھتا ہوں یا میں بر خود غلط آدمی ہوں۔ مشاہیر اردو کی خدمات کا اتنا ہی احترام کرتا ہوں جتنا تمام پرستاران اردو کیا کرتے ہیں، پھر میرے کلام کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے وہ پورے کلام کے نصف سے بھی کم ہے اور گزشتہ بیس بائیس برس کے اندر چار پانچ ہزار اشعار کا میرا مجموعہ اب تک کتابی شکل میں شائع نہیں ہوا ہے۔ ایسے بہت کم حضرات ہوں گے جنھوں نے تمام مختلف رسالوں کو دیکھا ہو جن میں گزشتہ بیس بائیس برس کے اندر میرا کلام چھپتا رہا ہے۔ اس لیے اس کی ضرورت پڑی کہ اپنی کوششوں کی طرف اشارہ کروں مجھے ایسا کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوئی اور ہو رہی ہے۔ مجھ میں جھوٹا پندار ہے نہ جھوٹی خاکساری۔ میں اپنی شاعری کی اتنی ہی قدر

کرتا ہوں جتنی مناسب ہے۔ اس پر نظرِ ثانی کی ضرورت کا بھی مجھے احساس ہے۔ جیسی شاعری کر سکتا ہوں اس سے کہیں بلند تر شاعری کے امکانات کا قائل ہوں۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ میں شاعر نہیں ہوں بلکہ صرف معلم و نقادِ ادب ہوں۔ پھر دنیا بھر کے بلند ترین فلسفہ و فکریات اور مختلف علوم پر سوچتے سوچتے بہت سا وقت کٹ جاتا ہے۔ پھر بھی میری شاعری کی عمر اب اندازاً پچاس برس ہو چکی ہے اور اب اتنی مشق ہو چکی ہے کہ چند لمحوں کے وقفہ میں بھی ایسے اشعار کہہ لوں جن میں برسوں کی مشق، مطالعہ، غور و فکر، تجربات مشاہدات بھی کچھ آ جائیں۔ محض طباعی سے یا ذاتی ذہانت سے یا محض اپنے زورِ بازو سے کوئی شاعر اپنے کلام میں گہرائی، گیرائی درون و بلندی اور اعلیٰ جمالیاتی قدریں نہیں پیدا کر سکتا۔ اور مصروفیتوں کے علاوہ خرابیٔ صحت اور گھریلو جھنجھٹ، پھر اقتصادی جھنجھٹ بھی مجھے اس طرح ادبی کام نہیں کرنے دیتے جس طرح میں کرنا چاہتا ہوں۔ اب میری زندگی کی شام ہے زندگی ختم ہونے سے پہلے جو تھوڑا سا وقت بچ رہا ہے کاش میں اس مختصر وقت میں ان کاموں کا ایک حصہ انجام دے سکتا جن کا نقشہ میرے دماغ میں ہے۔ مجھے خالص ادبی خدمت کرنے کے لیے یکسوئی کی ضرورت ہے اور وہ یکسوئی مجھے نصیب نہیں، بہرحال اپنی سی کوشش جاری ہے اور جاری رہے گی۔

زندگی کی مشکلات میں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ کوئی جتنا اور جیسا کام کرنا چاہے اتنا اور ویسا نہ کر سکے۔



حفیظ جالندھری

"ـــــــ ہ یاروں کی برہمی پہ ہنسی آگئی حفیظ : یہ مجھ سے ایک اور بُری بات ہو گئی

..... ترانۂ پاکستان کے سلسلے میں نشانہ بن کر جو تیر میں نے کھائے وہ تو میرے لئے پھول ہیں البتہ زخم وہ ذہنی چرکے ہیں جو مجھے نااہلوں کی محفلوں میں شعر سنانے کی پاداش میں لگے' یہ چرکے بہت گہرے اور بہت پرانے ہیں۔ بظاہر مندمل ہوتے ہیں لیکن ہیں! ناسور۔ میں ان کا شکر گزار ہوں اور یہ شکر گزاری بجا بھی تو ہے کیونکہ یہ چرکے تو مجھے 'ترانۂ پاکستان لکھ ڈالنے تک پہنچا گئے۔ ـــــــــ"

شاعروں، ادیبوں اور دوسرے اہلِ فن کی آپ بیتیاں، یادداشتوں کی حیثیت سے، عرضِ ہنر سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور میرے پاس تو شعر و شاعری کے سوا اور کچھ نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔ نہیں پہ کچھ ایسی بیت جاتے جس کا بیان لازم آ سکے۔

شاہنامہ پاکستان لکھنے اور منظور ہو جانے پر جو دار مجھے اپنی ہی قلم بیداری کے ایک طبقہ خصوص سے پانچ چھ ہفتے تک مسلسل ملتی رہی بیشک وہ بہت ہی نتیجہ یادگار رہے۔ اس کے لئے ایک کتاب زیر ترتیب ہے۔ یوں بھی داستان طولانی ہے ورنہ آپ بیتیوں کے ہجوم کے درمیان آپ بیتیوں کی بڑی اماں جان بھی ہوتیں کیونکہ اب کی تاریخ میں اپنی ملت و ملک سے نازل کیجئے۔ اللہ نہ کسی کے ... نہیں بیتی ہو گی!

اس نگارش کے آغاز پر آپ بیتیوں کی اس اماں جان کی طرف ہلکا سا یہ اشارہ محض اس لئے ہے کہ میرے ہم عصروں میں سے چند جفاداریوں کے اشارے پر حیات گاہ گوچ کا طوفان اٹھا تھا وہ فن شعر اور تخریب وردن کی منہ بولی بہاری تھی۔ ان جفاداریوں میں سے چند ایک کا نوبی پرس پڑ و ادیب" تو بہت با اثر و رسوخ تھا۔ اس لئے مجھے اس پر نازل ہونے یہ دن کہ ... میرے لئے

دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف　　　　اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

کا معاملہ تھا لیکن مجھے اپنے ہم عصروں کے حضور اس عزت افزائی کے مقام تک پہنچنے کے لئے جن مرحلوں سے گزرنا پڑا آج کو نہ سہی آن مراحل پر نگاہ ڈالے۔

پاکستان کا ترانہ لکھ سکنے کی عزت اور شہرت کا یہ مقام مجھ کو مشق شعر کے بل پر کتنی ذہنی ذلتوں کی لذتوں کے بعد نصیب ہوا۔ اس کی ایک آدھ جھلک آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔ محض ایک آدھ جھلک در شعر و شاعری کے سلسلے میں آتی آپ بیتیاں میں کر بے پناہ ضخامت نہیں۔ بہت سی اتفاقی ضخامتوں میں بھی شاید میں حفیظ جالندھری نہ سما سکوں۔

لیکن یہ آپ بیتیاں "میری کامیابیوں کے پہلو زیادہ رکھتی ہیں اور میں کار ہے کہ دوام کہنے کا نشانہ بنا کر دم جگ بیتی ہے۔ یہ لوگوں کا اپنا معاملہ ہے کہ میرے کلام سے اُن کے ساتھ کیا بیتی۔

آج چونسٹھ برس کا ہو چکا ہوں۔ سات برس کی عمر سے شاعر ہوں۔ وہ بھی پنجاب کے صوبے میں رہ کر اردو زبان کا شاعر!
میری دادی جالندھری پنجابی کہتو داگر کے اس پار میرے ہی گاؤں کی بولی جانتے تھے بھلا اردو والے میری اردو کو اپنے گھر کی کھولی کیسے گردانیں گے۔ مان لینے کے لئے کوئی ڈھنگ بھی تو ہونی چاہیئے!

ہائے ڈھنگ! اسی ڈھنگ نے میرے ساتھ وہ کہ میرے ہاتھوں ہی سنو کرکے یاد دلایا میرے رقیبوں سے مجھے پٹوایا ہے۔

عرضِ ہنر ہی وجہ شکایات ہو گئی　　　　چھوٹا سا منہ تھا مجھ سے بڑی بات ہو گئی

خیر ناکام رقیبوں کے ہاتھوں ذرا سی مرمت ہو جانے کو تو وصل محبوب سے ان کی ناکامی کا مداوا سمجھ ... کہ میں نے ایک شعر اور بھی جڑ دیا تھا۔ جس میں اپنی ہار مان لی تھی۔

دشنام کو جواب نہ سوجھا بجز سلام — ظاہر مرے کلام کی اوقات ہو گئی

ساتھ ہی مقطع میں شوخیٔ گستاخانہ بات بھی آ گئی تھی۔ قصہ مختصر ہو گیا تھا۔

یاروں کی واہ واہی پہ ہنسی آ گئی حفیظ — یہ مجھ سے ایک اور بُری بات ہو گئی۔

زمانے کے میلے میں تماشا بن کر جو تیر میں نے کھائے وہ تو میرے لئے پھول ہیں۔ البتہ زخم وہ ذہنی چرکے ہیں جو مجھے نااہلوں کی محفلوں میں شعر سنانے کی پاداش میں لگے۔ یہ چرکے بہت گہرے اور بہت پرانے ہیں بظاہر مندمل معلوم ہوتے ہیں لیکن ہیں ناسور۔ میں ان کا بھی تو شکر گزار ہوں اور یہ شکر گزاری بجا بھی تو ہے کیونکہ یہ چرکے تو مجھے ترانہ پاکستان لکھ ڈالنے تک پہنچا گئے۔!

پس آجکل کسی اور الجھن میں ہوں کچھ تندرست بھی نہیں۔ اور یہ بات بھی ہے کہ میرے شباب شاعری کے دور والے لوگ ... اب سب تشریف لے جا چکے ہیں ورنہ ایک مزے کا دور دورہ تائید و تردید اور رد و کد وغیرہ کا نقوش میں بھی ہو جاتا۔

یہ تمہید کچھ لانبی ہوتی جاتی ہے مجھے کہنا یہ ہے کہ آپ بیتیوں میں میری جس جھلک کو آپ ملاحظہ فرمائیں گے وہ کسی شاعر، کسی ادیب، کسی نقاد کسی استاد سے تعلق نہیں رکھتی اس کا تعلق کسی شاعر سے ہے بھی تو وہ میں خود ہوں۔

تو بہ خویشتن چہ کردی کہ بہ ما کنی نظیری — بخدا کہ واجب آمد ز تو احتراز کردن

احتراز تو آپ بیتی بن جائے گی۔ فی الحال مجھ پر اس بیتی ہوئی کو جو میں بیان کرنے لگا ہوں۔ بیالیس برس بیت چکے ہیں۔

اچانک اس کی یاد تازہ ہو گئی ہے۔ لکھنا شروع کر دیا ہے تو تمہید کے انداز تمہید بگل اندر رنگ بہار اندر بہار کا مضمون پیدا ہو رہا ہے۔

لیکن پہلے یہ سن لیجئے کہ میں کون ہوں؟ اپنی مذمت سے پہلے اپنی مدح ہو جائے تو کیا حرج ہے۔ آج پاکستان کا ہلال امتیاز ہوں اور پرائیڈ آف پرفورمینس بھی (ابھی کسی نے اس کا ترجمہ نہیں کیا) پاکستان سے پہلے غیر ملکی حکومت نے خان بہادر سے مخاطب فرما کر میرا منہ بند کرنے کی ناکام کوشش بھی کی تھی۔ اپنی دلی ریاستوں نے ملک الشعراء اور نواب حسان الملک بہادر بھی بنا دیا تھا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے ایک بہت بڑے ادبی جلسے میں سجاد حیدر یلدرم نے علی الاعلان مجھے اردو کا فردوسی بتایا اور اسلام کا شہنشاہ نواز بھی قرار دیا تھا۔ قوم ملک اور ملت فردوسیٔ اسلام۔ شاعر پاکستان اور نہ جانے اور کن اعزازات کے ساتھ نوازتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ تاہم میرے اپنے قلم سے کاغذ پر یہ جو قصیدہ در مدح ٹپک رہا ہے۔ اس قصیدے کی تشبیب ایک گریز ہے زنگار رنگ کے پھولوں کی کیاری سے کانٹوں سے چھدے ہوئے زخم ہائے کاری کی طرف۔!

یقیناً آپ آج ہر محفل میں میری واجب و ناواجب عزت افزائی پذیرائی اور میرے کلام کی شنوائی دیکھتے ہیں۔ لیکن آپ نہیں جانتے کہ یہاں تک آپ کے حضور حاضر ہونے کی راہوں کے آغاز ہی میں مجھ پر کیا کچھ بیت رہی تھی۔!

میرے کنبے کا محاسبہ تو مطلوب نہیں۔ فقط میری ذاتی آپ بیتی درکار ہے اور میری سوانح حیات آپ بیتیوں کا ایک طومار ہے۔ اس لئے اپنے بارے میں اتنا ہی بتا دینا کافی ہے کہ میں ۱۴ جنوری سنہ ۱۹۰۰ء کی صبح، سورج نکلنے سے ذرا پہلے زمین کے فرش پر عرش والے کی عطا کردہ صلاحیت لئے ہوئے وارد ہوا تھا۔ اللہ اکبر کی اذان نے میرے پیدائشی مسلمان ہونے کا اعلان میرے کان میں کر دیا تھا۔

پھر چھ برس کی عمر میں مسجد متصلہ دالان میں صبح و شام حاضری دیتے ہوئے بغدادی قاعدے کے بعد قرآن کریم میں نے معنی جانے بغیر ناظرہ پڑھ لیا تھا۔ اور کسی لفظ کا مفہوم معلوم ہوئے بغیر ہی کریما اور مقیماں بھی دونوں رٹ لی تھیں۔ اس لئے ذہین گردانے والے کنبے نے

مجھے اسکول بھیج دیا گیا تھا وہیں سے شاعری نے مجھے ایسا دریا برد کر دیا کہ آج تک مسلسل غوطے لگا رہا ہوں۔

شاعری کا دورہ مجھ پر ساتویں برس ہی پڑ گیا تھا۔ اس وقت میں دوسری جماعت کا طالب علم تھا لیکن بھلا ہو مولوی فتح دین کا کہ میرے کان کھینچے گئے۔ تھپڑ رسید ہوئے۔ جھڑکا اہتمام ہو گیا اور مجھے اپنا سر سہلاتے دیکھ کر میرے سر کا سودائے شاعری میرے سینے میں گھس کر روپوش ہو گیا یہ روپوشی ظاہری آنکھوں سے تھی ورنہ اس ظالم نے تو میرے صدر سینہ اور قلب و جگر کو گھڑ دوڑ جیتنے کی مشق کا میدان بنا رکھا تھا۔

گیارہ برس کی عمر میں چھٹی جماعت کے دنوں میں اس بھوت نے پھر سر اٹھایا اب کے ایک خوبصورت لڑکی کی صورت میں سامنے آیا کہ میں نے اس پر دل لگی میں کاٹھی کس لی تھی۔ دل لگی دل لگی ثابت ہوئی رہوار شعر و شاعری مجھے لے بھاگا۔ ایسا بگٹٹ بھاگا کہ آج تک مسلسل لیے بھاگا جا رہا ہوں۔

لہٰذا شاعری کے علاوہ میری آپ بیتی میں اگر کچھ کہیں نظر بھی آ جائے تو اسے زوائد میں سے سمجھئے گا۔ شاعری اور عاشقی ایک ہی بات ہے۔ باقی تلاش معاش کے معاملات سب واہیات۔ اس ضمن میں میرا ایک شعر بھی آویزہ ہے:

ماسوائے عاشقی اور کچھ لیا بھی ہو　　　　سوجھتا ہی کچھ نہیں کام کاج کیا کروں

شاعری میں میرا اولین فن عشقیہ غزل ہی تھی لیکن پہلی جنگ عالمگیر میں خلافت عثمانیہ پر صلیب والوں کے ہاتھوں زوال آ گیا تھا۔ میں بھی دوسرے مسلمانوں کے ساتھ آزردہ و افسردہ تھا۔ تحریک آزادی کے سلسلے میں ڈاکٹر کچلو کے اشارے پر ایک باغیانہ نظم کہہ دی تھی۔ وقتی حالات میرے حق میں تھے اس لئے جالندھر کے پڑھے لکھے ہندو زیادہ مسلمان کم مجھے ہونہار شاعر ماننے لگے۔

مشاعروں میں شاعروں سے مطابقت بھی ہو رہی تھی۔ آزاد کی آب حیات میں ذوق اور غالب کی ٹکر بھی میری نظر سے گزر چکی تھی۔ غالب کا میں ہمدرد بھی تھا۔ دونوں سہروں کا اپنے مذاق کے مطابق موازنہ بھی کیا تھا۔ غالب بیچارے کو منظور ہے گزارش احوال واقعی، پیش کرنے پاکر دردمند بھی تھا کہ اتنے بڑے شاعر کو خواہ مخواہ معذرت کرنی پڑ گئی۔ میرے خیال میں غالب کا سہرا ذوق کے سہرے سے کم نہ تھا۔ میں ایک سہرا بھی لکھ چکا تھا جو چھاپا تو گیا تھا پڑھنے کی سعادت نہیں ملی تھی۔ یہ تھا زمانہ جس کے دوران یہ آپ بیتی آج کاغذ پر لا رہا ہوں ـــ ذہن ہذا۔

لڑکپن میں دو بھائی چوتھی جماعت سے ساتویں تک مشن اسکول جالندھر شہر میں میرے ہم جماعت تھے۔ ایک کا نام (الف) اور دوسرے کا (ب) ہی لکھنا مناسب ہے کیوں کہ اگر وہ یہیں کہیں میری ہی طرح زندہ و پائندہ تاجر یا مہاجر ہیں۔ تو بفضل خدا پوتے پوتیوں نواسے نواسیوں والے ہوں گے اور اگر یہ تحریر ان میں سے کسی کی نظر سے گزری تو مبادا میری آپ بیتی اور بھی زیادہ طویل ہو جائے۔

تھے تو وہ میرے اسکول فیلو اور کلاس فیلو بھی لیکن آپ اور تب سے کچھ زیادہ میل ملاپ یا لڑائی دنگے کی راہ و رسم نہیں تھی۔ میرے ایک خاص الخاص ہمجولی "بوبے" کے یہ دور کے رشتہ دار بھی تھے۔ "بوبے" نے مجھے یہ بھی بتا رکھا تھا کہ یہ دونوں بھائی ہم دونوں کی شکایت اپنی اماں سے بھی کرتے رہتے ہیں۔ یہ شکایت "بوبے" کی اماں تک بھی پہنچتی تھی۔ لیکن الحمد للہ ہمارا ان سے کبھی کبھی علیک سلیک کے سوا کوئی بے راہ کھڑا کھیل یا راہ چلتے چنگا مندا دھندا کبھی پیش نہیں آیا۔ شکایت یہ تھی کہ بوبا کلیجیے کا دوست ہے ہم سے کھیلتا بھی نہیں۔

میں تو ساتویں کلاس کا امتحان دے کر حساب میں فیل ہو جانے کے محض خوف سے اسکول ہی کو دھتا بتا گیا۔ بوبا میٹرک پاس کر کے فرسٹ ایئر فولوں میں شامل ہونے کے لئے لاہور سدھارا۔ دوسرے کھلنڈرے اور پڑھاکو بھی بعض تو نوکریوں کی جستجو میں تتر بتر ہو گئے بعض جالندھر ہی میں میونسپلٹی

تحصیل کچہری کے منشی متصدی، کلرک، نقل نویس یا ہندو مسلمان سکھ وکیلوں کے بستہ بردار منشی جی نظر آنے لگے۔ انہی میں الف اور ب دونوں بھائی بھی تھے۔

اپنی حالت مسلسل بیقراری میں تھا۔ میں فقط اسکول ہی سے نہیں بھاگا تھا اپنے گھر سے بھاگنے اور پھر پلٹنے جا کر پٹنے کی بیڈ میرے معمول تھے۔ شعر و شاعری کی لگن نے گردش روزگار کا بھوت میرے سر پر سوار کر رکھا تھا۔ آخر بہت سے چکر کاٹنے کے بعد میں نے ایک ادبی رسالہ اعجاز نامی اپنے استاد مولانا گرامی کی سرپرستی میں جالندھر سے نکالا۔ یہ واقعہ ۱۹۲۲ء کا ہے۔ میری عمر بائیس برس کی ہو گئی تھی اور میں جالندھر میں اچھا خاصا شاعر مان لیا گیا تھا۔

رسالہ اعجاز کا دفتر دیدہ زیب سینما ہال کے مقابل سرکلر روڈ کے بازار میں تھا۔ یہ کمرہ اور برآمدہ اس کوچے کی نکڑ پر تھا جس کوچے کے خاتمے پر "الف" اور "ب" کا مکان اور چند پختہ مکان تھا۔ بازار سے میرے دفتر کے پاس سے گزر کر بہت سی ہندوؤں کی حویلیاں دونوں جانب تھیں۔ پھر ایک کالی زمین کا قطعہ تھا اس سے ملحقہ "الف" اور "ب" کے مکان کی ڈیوڑھی۔ پھر کوچہ ختم۔ آگے کھلا میدان اور میدان سے آگے شہر کے گندے پانی کا جوہڑ جسے ڈھاب کہتے تھے۔ وسعت پر بے بلند زمین تھی جس کے پیچھے ریل کا پل تھا۔ یہ شہر کے لیے نکاسی کی جگہ تھی۔ یہ بدرو شہر کے گندے پانی کو نالیوں کے ذریعے بلندیوں کے کھیتوں میں پہنچایا کرتی تھی۔

الف اور ب کا جس کوچے کا فرش اینٹوں کا تھا۔ اس کوچے میں دو چار گھر مسلمانوں کے بھی تھے لیکن بڑی حویلیاں ہندوؤں کی تھیں۔ لہٰذا فرش پختہ ہونے میں ان ہندوؤں کا زیادہ رسوخ کارگر تھا۔ کوچے میں مکانوں کے دروازوں اور باہر کی دیواروں کے ساتھ فرش کے دونوں جانب پکی نالیاں بھی تھیں۔ ہندوؤں کے محلے سے تمام گھروں کی نالیوں کا پانی اس کوچے کی نالیوں میں بہتا اور مٹی کی بو باس سے لپٹا ہوا سامنے کے میدان کی پیاس بجھاتا۔ پھر کچی نالیوں سے آگے تر زمین کا جو ہر دکھاتا کچی زمین کو کیچڑ میں تبدیل فرما کر بہتا بہتا جوہڑ میں چلا جاتا تھا۔

میدان میں جابجا بھینسیں بندھی تھیں۔ ان کے گوبر اور بہتے ہوئے پانی کی سڑاند میں ملی جلی معاشرت تھی۔ یا در ہے خالص بے حس کر کی ہوئی سڑاند سے میدان کی وسعت معمور جوہڑ کی کیچڑ اور بھینسوں کے گوبر اور بول براز سے پھیلتی ہوئی پانی کی لہروں سے ہوا اور فضا مسحور رہتی تھی۔

بھینسیں دن کے وقت شہر سے بھی اس ڈھاب میں نہلانے کے لئے لائی جاتی تھیں جو میرے دفتر کے قریب سے گزرتی ہوئی الف اور ب کے مکان تک کوچے کے پختہ فرش پر اور میدان کے نالوں میں دھنستی دھنساتی ہنکائی جاتیں پھر گندے پانی میں اٹھکیلیاں کرتی تھیں۔

ہمارا اصل گھرانہ تو محلہ شیخ بیر میں رہتا بستا تھا لیکن شاعرانہ آوارگی کی پاداش میں میری شادی کر دی گئی تھی۔ اور شادی ہو جانے کے بعد سے مجھے اپنے محلے سے دیس نکالا مل گیا تھا۔ الف اور ب والے کوچے ہی کی طرح اسی سرکلر روڈ کے بازار سے ایک اور کوچہ بھی میرے دفتر سے شمال کی طرف چل کر اسی میدان کی طرف رخ کئے ہوئے تھا۔ جس میں ہماری ایک پرانی حویلی کرایہ داروں سے خالی ہو کر میرا اور بیوی کا مسکن تھی۔ میری والدہ ہماری نگران اور رہنما تھیں۔ والد بھی ہمارے اوسان درست رکھنے کے لئے آتے جاتے تھے۔ بھینس ہمارے گھر میں بھی تھی۔ چاچا "ودلو" اور اس کی بوڑھی بیوی چاچی "بھاگاں" ہمارے پشتینی ملازموں میں سے ہماری حویلی کے ایک کونے میں رہتے اور بھینس ہماری ڈیوڑھی سے باہر بندھتی۔ جوہڑ میں نہلانے کا وظیفہ چاچا ہی کا دن البتہ دودھ دوہنا اور اُپلے تھاپنا چاچی بھاگاں کے ذمے تھا۔ والدہ سرِ صبح نماز کے بعد چاٹی میں دہی بلوتیں۔ مکھن نکالتیں۔ میری نئی نویلی دلہن بھی دہی مدد کا شوق فرماتیں۔ جب میری بیوی دہی بلوتی میں عین اس وقت جب مکھن چھاچھ کے اوپر اپنی اصل صورت دکھاتا۔ میں والدہ سے آنکھ بچا کر چاٹی ہی میں ہاتھ ڈال مکھن کا ایک اچھا خاصا "ڈگ" بھر کر اپنے منہ میں ڈال کر بھاگ جاتا۔ میری بیوی میری اماں سے شکایت کرتی۔ تو اماں میری بیوی ... کہتیں کی دعا کھا لین دے اینہئے تے ساری عمر ایہو جیہا شتو نگڑا ای بنیا رہنا ایں " کر (اری دفع کر کھا لینے دے مکھن۔ ہے تو ساری عمر یونہی شیطان ہی بنا رہنا ہے نا۔

لیکن چاچا دلو مجھے یہ حرکت کرتے دیکھتا تو واقعی ڈانٹتا۔ تھا تو چاچا ملازم مگر میرے والد ہی کے ساتھ گھر میں پلا تھا۔ اس لئے ہم سب اس سے ڈرتے تھے۔ البتہ چاچی "پھاگاں" شکایت کرتے دیکھ کر میری بیوی کو ڈانٹ دیتی تھی "نی دھیاے۔ ہو یا کیہ تیرا تیرا موسنا تاجو ہو با" (اری بیٹی۔ پھر کیا ہوا۔ تیرا بانکا دولہا ہی تو ہے)

آج میری باتیں جو میں لکھنے والا ہوں آپ کو شاید بہت ہنسائیں گی لیکن اس وقت قلم میرے کاغذ پر آنسو روئی یادیں فریاد کر رہی ہیں اور میری آنکھوں کے دونوں آنسو میرے مرجھائے ہوئے چہرے پر تازہ گڑھے لئے گر رہے ہیں۔!

آپ میری اس تمہید کو بے عرف نہ جانیں جو کچھ میں بیان کرنے والا ہوں اس کا تعلق ہے اس مکان اس کوچے اور اس کوچے کے خاتمے پر اس میدان سے ہے جس کا تصور اس تمہید سے بہت اہم واسطہ رکھتا ہے۔ یہ میدان الف اور ب والے کوچے سے شہر کے گندے پانی کا نالا جاتے ہوئے تھا۔ میرا کوچہ بھی الف اور ب والے کوچے کے متوازی تھا۔ دونوں کے درمیان حویلیوں کے پچھواڑے ہی تھے۔ درمیانی راستہ ایک کوچے سے دوسرے میں جانے کا نہیں تھا۔ یا تو میدان سے گزر کر بھینسوں کے بول براز و سینگوں سے دن کے وقت بھی بچتے اور گندے نالے کو پھاندتے پھلانگتے ہوئے "شارٹ کٹ" کی جا سکتی تھی اور یا مغرب کی طرف اپنے کوچے کے نیچے فرش پر چل کر سرکلر روڈ والے بازار تک پہنچا پھر اپنے دفتر کا رخ فرما کر جنوب کی طرف چلنا ہوتا تھا۔ میں گھر سے نکل کر یہی لمبی راہ اختیار کرتا اور اپنے دفتر میں جا براجتا۔ مجھے الف اور ب کے مکان تک پہنچنے کی ضرورت کبھی پیش ہی نہیں آئی تھی۔ یہ دونوں بھائی ہر صبح کچہری جاتے وقت کے بعد چلتے تو مجھے کبھی گرامی صاحب کے ساتھ برآمدے میں بیٹھے دیکھتے ہوئے گزر جاتے البتہ میں تنہا نظر آتا تو صاحب سلامت ہو جاتی چونکہ یہ دونوں شعر نہیں کہتے تھے اس لئے میرے پاس زیادہ بیٹھنا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ ڈنگر کو بھینس کے ساتھ دھکیلنے میں چاچا دلو کی مدد کرتا ہوا میں کبھی کبھار اس میدان سے گزرتا تھا گندے نالے کو پھلانگنا مجھے پسند نہ تھا۔ کیونکہ اگر کپڑے سنبھال بھی لئے جاتے تو جوتوں کو کیچڑ و کیچڑ سے لتھڑائے بغیر اس راہِ ہفت خواں کو طے کرنا ممکن نہ تھا اور یہ تھا جالندھر کا ان دنوں مشہور شاعر۔ شاعر ہی نہیں اب تو جالندھر کے ایک اولین ادبی رسالے کا ایڈیٹر بھی تھا۔ اور میرے دفتر میں وکیل، وکلا، ہندو مسلمان شاعر شعراء بھی راجماں ہوتے کیونکہ حضرت گرامی ہر تیسرے چوتھے دن سہ پہر کے بعد مجھے نوازتے تھے۔ میرے والد میری شاعری سے نالاں تھے تو کیا ہوا۔ میں بھلا کوئی ایسا ویسا آدمی تھا کہ گندی راہ سے "شارٹ کٹ" کا اقدام فرماتا۔! "زن بیوہ مکن" کی تو ابھی فکر ہی نہ تھی البتہ "راہ راست برو گرچہ دور است" پر عمل پیرا تھا اور میں اپنے گھر سے دفتر۔ دفتر سے گھر تک پرشرک پھر ٹینٹوں کے فرش والے کوچے پر پیدل چلتا ہوا آتا جاتا تھا لیکن ---!

اور یہی میری آپ بیتی ہے۔ آپ نے دو کوچوں اور بھینسوں والے میدان، پھر کوچوں کی نالیوں اور میدان کے گندے نالے کا تصور تو کر لیا ہوگا۔ اب سن لیجئے آپ بیتی:-

کرنا خدا کا ایک دن یہ ہوا کہ الف اور ب دونوں بھائی ایک صبح نو بجے مسکراتے ہوئے اپنی گلی سے نکل کر میرے دفتر کے برآمدے میں آکھڑے ہوئے میں رسالہ اعجاز کے خوشنویس کے سامنے تصور کاپیوں کی تصحیح کے لئے تصریح میں منہمک تھا۔ دونوں بھائیوں نے آج ذرا زیادہ تپاک سے علیک سلیک دکھائی اور مژدہ سنایا کہ آج ان دونوں بھائیوں کا نکاح ہونے والا ہے۔ ساتھ ہی خندہ پیشانی کے ساتھ مجھے بھی سہرہ بندی کے وقت تشریف لانے اور برات کے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ دونوں نے کچہری سے چھٹی لے لی تھی۔ دوسرے دن تو ایلینی سیک کر شمہ شادی سے دکار کا معاملہ تھا۔

دونوں بھائی آج میرے میز کے سامنے کی دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے اور ان کی گفتگو سے خوش نویسی اعجاز کی تصحیح تو عاجز ہو گئی۔ البتہ دونوں نے ایک حسنِ اتفاق دکھایا یعنی بتایا کہ جس طرح الف اور ب دونوں محض ایک سال بڑے چھوٹے سگے بھائی ہیں اُن کی آج رات ہونے والی دلہنیں بھی اسی طرح سگی بہنیں ہیں الف اور ب کی خالہ زاد بہنیں ت اور ث ۔ !

میری اس آپ بیتی کا آغاز آج اس طرح ہوا کہ دونوں سگے بھائیوں نے پرانی "کلاس فیلگی" کا حق جتا کر مجھے جالندھر ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے شاعروں سے بہتر بتایا پھر مجھ سے سہرے لکھنے کی فرمائش ایسی منت سماجت کی معصومانہ ادا سے کی کہ میں رد کر کے بغیر مان گیا یا تو نہیں۔ لیکن میرے اندر خانے یہ تعلّی بھی ہو گی کہ ان "منشی مسدی" جالندھریوں کو جو اپنی نقل نویسی اور قانون گوئی وغیرہ کو بہت اہم سمجھے ہوئے میرے ساتویں جماعت سے بھاگ جانے پر آوازے کسا کرتے ہیں آج دکھا دوں کہ شاعر ان سب کے مقابل چیزے دیگر است ۔ بتا دوں کہ حفیظ جالندھری غالب اور ذوق دونوں کا بیک وقت مدِمقابل ہے ۔ درباری انعام کے لئے نہیں بلکہ بہت ہی معمولی سی کلاس فیلگی بہت ہی غیر معمولی بنا دینے کی قلم برداشتہ طاقت رکھتا ہے ۔ اور ایک ہی دن میں ایک ایسا سہرا لکھ سکتا ہے کہ اگر بہادر شاہ ظفر تختِ طاؤس کے بغیر ہی کبھی اس سہرے کی دہلی میں گونج سُن پا لیتے تو غالب و ذوق کو اپنے اپنے مقام سے پیچھے ہٹا کر حفیظ کو اپنا استاد بنا لیتے ۔ !

سہرا بندی اسی شام کی نماز کے بعد تھی ۔ الف اور ب نے بڑی لجاجت آمیز تاکیدِ شدید کے ساتھ یہ اصرار بھی کیا کہ ان کے مکان سے ملحقہ خالی زمین (جسے ہم جالندھری پنجابی میں توڑ کہتے تھے) صاف کی جا رہی ہے نمازِ مغرب کے بعد وہاں سہرہ بندی کی رسم ادا ہو گی لہٰذا اگر سہرے سروں پہ بندھ چکنے کے فوراً بعد میں اپنی زبان سہرا ترجمان سے ان کے سہرے پڑھ کر خود ہی سنا دوں تو ان دونوں بھائیوں کے ساتھ ہی ان کی ساری شیخ برادری کی عزت افزائی کا سبب سے اولین باعث میں ہی بن جاؤں گا ۔ اور مجھے برات کے ساتھ ہو کر دوسرے محلے میں دونوں دولہاؤں کی واحد سسرال کے سر بھی چڑھنا ہو گا تاکہ اپنے سہرا دی کلام کے عوض طعام بھی نوش کروں اور اس کو اپنا انعام جان کر تا عمر پھولا نہ سماؤں ۔

اگرچہ سہرے کا ایک واقعہ ایک برس پیشتر بھی گزر چکا تھا لیکن وہ میں اپنے منہ بولے بھانجے حمید جالندھری شاعر جیم اے ۔ ایل ایل بی (علیگ) کی اجازت کے بغیر لکھ تو سکتا ہوں شائع نہیں کر سکتا ۔ یہاں اس کا ذکر اس لئے کر رہا ہوں کہ میں آج پھر اُس آپ بیتی ہوئی کو بھول گیا تھا ۔ میں نے اعجاز کی پہلی کاپی کاتب کے سپرد کر دی ۔ خود کمرے کو بند کر کے میز سے ہٹ کر اس صوفے پر بیٹھ گیا جس پر گرامی صاحب کو بٹھایا کرتا تھا ۔ آج حقے کی جگہ میں نے قینچی سگریٹ کی ڈبیا دو آنے کاتب کو دے کر منگوائی اور ہو گیا سہرا لکھنے کے سمندر میں غرق ـ !

دونوں بھائیوں (الف اور ب) کا ایک سہرا ـ میری اختراع ـ !

چونکہ دونوں کے چہروں پہ چیچک کے بھرپور داغ رخساروں کی جلد کی تہ میں اندروں تک ہموریا ناسور تھے میں نے ان کو کھِلے ادھ کھِلے نمایاں پھول بنایا اور الف اور ب کی ت ، ث اَن دیکھی دلہنوں کی تصوراً گل رخساری کے عکس بنا کر اس ایک ہی سہرے میں پرو کر سجا دیا ۔ دونوں کی نائیں اس سہرے کے چہرے پہ شاہانہ لگی تھیں اور دونوں دولہاؤں کے منہ آدھ کھِلے گلاب غنچے وغیرہ وغیرہ ـ !

مجھے یقین تھا ۔ اور میں الفاظ کو کاغذ پر لاتا ہوا دعویٰ میں بھی تھا کہ سہرا نویسی کی تاریخِ قدیمہ میں چیچک قیمے کی کلیاں اور غنچے پہلی مرتبہ میں نے ہی بنا ڈالے ہیں ۔ ان دو سگے دولہا بھائیوں ، دو سگی دلہن بہنوں کو جو آج کی رات سے بیویاں بن رہی تھیں آدم سے لے کر دم تک کسی شاعر نے ایسا انوکھا تحفہ پیش نہیں کیا ہوگا دونوں بھائی کبھی الف کبھی ب باری باری دو تین مرتبہ باہر برآمدے کے تخت پر بیٹھے ہوئے کاتب سے یہ پتہ لینے بھی آئے کہ میں کہیں ان کو ٹرخا تو نہیں دوں گا ـ !

عصر کے وقت تک کمرے ہی میں رہا۔ سگریٹ کی دو ڈبیاں پر بھی مزید دو آنے خرچ ڈالے۔ "ایش یا ایش ٹرے" موجود نہ تھا اعجاز کے دفتر کا فرش جلے ہوئے سگریٹوں کی راکھ اور چھیلنے: دونے زبانوں سے بہار آ رہی تھا۔ آج دوپہر کا کھانا کھانے بھی گھر نہیں گیا۔ چاچا "دولو" کو اماں نے بلانے بھی بھیجا۔ میرے انکار پر میرے والد کا فقرہ "شاعری کو ریکیران" دہراتا اور بڑبڑاتا چلا گیا۔ البتہ میری اماں جان نے لسی کی گڑوی، گرم روٹی چنگیرے کے درمیان رکھ کر اور اس روٹی کے اوپر "تڑکے" سونے رسوں کی گندلوں کے ساگ میں مکھن کی ایک پگھلتی ہوئی سفید گیند پیٹ کر چاچی پھاگاں کے ہاتھ بھجوادی تھی۔ میں فکر شعر میں تھا محض دو چار لقمے اُچک لئے اور یہ نعمت خوشامد کے طور پر خوشنویس کا حصہ بنی۔!

سہرا تیار اور نوک پلک کی سنوار سے میرے بھونڈے خط کے باوجود معناً پُربہار ہو گیا۔ میں نے کاتب سے گزارش کی اب اپنی خوش خطی کو میرے فنی رنگ سے ہم آہنگ کر دے۔ اور خود کپڑے بدلنے پہننے بال وال سنوارنے کے لئے گھر کا رُخ اس تاکید کے ساتھ کیا کہ منشی جی آپ کی کتابت کا جوہر دونوں ہونے والے شوہروں کو ان کی ہونے والی بیویوں کی آنکھوں میں اور بھی چمکا دے گا۔ لہٰذا مغرب کی نماز تک اسے لکھ ڈالئے گا۔!

اب میں دفتر سے نکلا۔ گھر پہنچا۔ پانی گرم کرنے کا آرڈر اپنی بیوی کو دیا۔ مارچ کے مہینے کا آغاز تھا قدرے خنکی تھی۔ والدہ اور اپنی پیاری دلاری بیوی کو بتایا کہ آج پچھواڑے کی گلی میں شیخ برادری کے دو بھائیوں کی برات کے ساتھ جانا ہے رات کا کھانا ان کے سسرال میں اڑانا ہے۔ میں نے سہرے کا تذکرہ نہیں کیا۔ مبادا والد کو پتہ چل جائے اور گزشتہ برس کے "واقعہ سہرانہ" کی یاد میں میری تواضع میرے اپنے ہی گھر میں ہو جائے۔ یوں بھی شاعری کو ہمارے گھرانوں میں منحوس سمجھا جاتا تھا۔

میری والدہ نے میری بیوی سے کہہ کر میرا اجلا لباس نکلوایا۔ میں نیم گرم پانی سے نہایا۔ داڑھی ان دنوں دوسرے تیسرے دن نائی سے منڈوائی جاتی تھی۔ آج اس سونڈ کی ضرورت نہیں تھی۔ بیوی نے اپنے صندوق سے میری اپنی شادی کا یادگار کوٹ نکالا۔ دھلی ہوئی قمیض اور سفید شلوار پر میرے کوٹ کی شان ابھی جوان تھی۔ آج وہ میری کیسری رنگ کی پگڑی بھی نکلی جو میری بیوی کو دو برس گزر جانے کے باوجود ابھی تک بھائی ہوئی تھی۔ وہی کیسری پگڑی جس کو سر پہ لپیٹے ہوئے سہرا لٹکا کر میں اس کو بیاہنے گیا تھا۔ یہ پگڑی کبھی کبھی امراء کے ساتھ میرے سر بندھوائی جاتی تھی۔

اُن دنوں اپنے اُستاد گرامی کی تقلید میں کالے وارنش سے چمکتے ہوئے چمڑے کا پمپ شو بھی کبھی کبھی مشاعروں میں جاتے ہوئے پہنا کرتا تھا۔ آج خاص طور پر بدست خود ایک چیتھڑا لے کر اس کی پالش کر دی۔ جمی ہوئی گرد کو سرکایا اور وارنش کو چمکایا۔ نماز مغرب کی اذان سنی۔ لباس ڈٹایا۔ اماں جان کی چٹائی پر ہی سات رکعتیں جلد جلد ادا کر لیں۔ نماز پڑھتے دیکھ کر میری اماں دعائیں دیا کرتی تھیں۔ یہ دعائیں آج تک میری زندگی کا سہارا ہیں۔ میں ان دعاؤں کے لئے صبح اور شام کی نماز لازماً اماں کی موجودگی میں ان کے مصلے پر پڑھتا۔ میری بیوی تو نمازن تھی مرتے دم تک ہر صبح قرآن شریف کی تلاوت کرتی رہی۔ میں ہی نالائق اب صبح کے چار سجدوں کے بعد چائے کے ساتھ اخبار لیکر جھوٹ کا سچ بنائی ہوئی خبریں پڑھتا ہوں۔ خیر یہ میری آپ بیتی کا دوسرا رُخ ہے۔ پھر کبھی سہی۔ نماز پڑھ کر۔ سر پہ کیسری پگڑی۔ تن پر سفید قمیض کے اوپر ٹائی کے بغیر کشمیرے کا اپنا نوشاہی کوٹ اور کمر سے پیروں تک سفید شلوار کے بل درست کئے ہوئے پرانی دھلی ہوئی اور بیوی کے ہاتھوں رفو فرمودہ جرابیں پیروں پر پنڈلیوں تک چڑھائے میں نے کالے وارنش والے پمپ شو پہنے۔ لیمپ جل رہا تھا۔ میری بیوی سجدہ ریزی سے

اُٹھی میں اس کے طاق سے آئینہ اٹھا کر اپنی سج دھج دیکھ رہا تھا۔ ابا ابھی گھر نہیں آئے تھے۔ اماں تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ مجھے آئینہ دیکھتے ہوئے دیکھ کر میری بیوی مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ پر میرے ہاتھ ابھی ایک جنبش کی جسارت کے لئے پر ہی تول رہے تھے کہ اماں نے درود شریف ختم کر کے رُخ ہماری طرف کر لیا ـــ!

اُف یہ آپ بیتیاں ۔۔ اماں اٹھیں۔ ایک صندوقچی سے دس روپے نکال کر میرے ہاتھ میں رکھ دیئے اور فرمایا (فرمایا تو پنجابی میں تھا۔ میں اردو ترجمہ ہی لکھ رہا ہوں)

"بیٹا تمہارے دوستوں کی شادی ہے۔ وہ ہماری برادری کے نہیں تم پانچ پانچ روپے دونوں کی سہرہ بندی پہ ضرور نذر کر دینا! میری اماں کو کیا معلوم تھا کہ میں پورے اور مکمل گیارہ شعر ان دونوں پر نچھاور کرنے والا ہوں۔ تاہم میں نے روپے لیکر شادی کے یادگار کوٹ کی داہنی جیب میں ڈال لئے۔ اماں کو سلام کیا اور بیوی کا منہ چڑا کر کیسری رنگ کی پگڑی کا طرّہ پھڑکاتا ہوا جلد جلد گھر سے نکلا۔ بار بار میری نگاہیں اپنے اپنے پیروں کے پمپ سوز کی چمکتی ہوئی وارنش پہ پڑ رہی تھیں۔ سفید شلوار کی ہریاں کتھئی رنگ کی جرابوں کے ساتھ عجیب گلکاری کا سماں ہر قدم پر چھڑ رہی تھیں۔ میرا داہنا ہاتھ کوٹ کی جیب کے رشک نقدا نقد روپے ہلکے ہلکے چھنکا رہا تھا۔ کوچے کے اینٹوں والے فرش پر بھنسوں کے گوبر سے بچتا ہوا میں سڑک پہ آیا۔ اپنے دفتر کا رُخ کیا برآمدے میں کاتب صاحب میرے منتظر تھے۔ لیمپ کمرے میں روشن تھا۔ سہرا خوشنویسی کے مراحل طے کر چکا تھا۔ کالی روشنائی کے حروف نے الف اور ب دولہا بھائیوں کے چیچک زدہ داغوں کی یاد دلائی۔ لیکن خوشنویس صاحب نے تحریر کے گرد سہ رنگی جدول بھی کھینچ رکھی تھی۔ میں نے لیمپ کی روشنی میں سہرا پڑھ لیا۔ ایک دو نقطے خود پنسل ہی سے درست کر لیئے جی تو چاہا کہ دس روپے کاتب کی اُجرت نذر کر دوں لیکن اماں کے حکم کی تعمیل فرض تھی۔ دوسرے دن خوشنویسی کے انعام کا سن کر کاتب نے سلام کیا وہ اپنے گھر کی طرف چلتا بنا میں نے سہرے کو گول کیا اور کوٹ کی بائیں جیب میں اس طرح ڈالا کہ اگر میں خود بھی اپنے اس جلوے کو چھپانا چاہوں تو

چھپائے نہ بنے

اب میں نے دفتر بند کیا تالا لگایا اور اُس کوچے میں گھُسا جس کے خاتمے پر بائیں جانب وہ توڑا اور توڑ کے ساتھ ہی دولہاؤں کا مکان تھا اور نصیر جوہڑ سے درے گندے نالے والا میدان ـــ!

اس کوچے میں چلتے ہوئے میرا داہنا ہاتھ دس روپوں سے کھیل رہا تھا اور بائیاں ہاتھ گول کئے ہوئے سہرے کو کوٹ کی جیب سے اوپر ہی سے تھپک رہا تھا۔ اسطرح میں الف اور ب کی سہرہ بندی والے توڑے تک پہنچ گیا۔ ایک ہری کین لالٹین روشن تھی۔ دریاں بچھی ہوئی تھیں دوسری لالٹین ساتھ کے مکان کی دیوار پہ کیل کے ساتھ لٹکی ہوئی تھی۔ پچیس تیس بوڑھے اور ادھیڑ دستی برادری کے منشی مسمدن بزرگ ایک اور لالٹین کے گرد جمگھٹ بنائے ہوئے تھے۔ جوان کم تھے۔ البتہ بچے بچیاں دری کے بعض حصوں پہ دھوم مچا رہے تھے۔ دولہاؤں کے گھر سے ڈھولک کے ساتھ عورتوں کے گانے کی آوازیں بھی پہنچ رہی تھیں۔ مگر روشنی کم تھی آٹھویں شام کا نصف چاند سر پہ تھا۔ ایک خشخشی داڑھی والا ادھیڑ آدمی جس کو میں جانتا تھا کہ تحصیل کا منشی ہے ایک پرات سامنے دھرے بیٹھا تھا۔ یہ الف اور ب کا باپ تھا۔ اس کے ساتھ بائیں ہاتھ الف دولہا تھا۔ دولہا کے ساتھ اکڑوں بیٹھا ہوا ایک (قد سے) جوان آدمی تھا جس نے نیا سوٹ پہن رکھا تھا نکٹائی بھی تھی۔ اس کے سامنے وہ پرات تھی جس میں تھوڑے سے کچے چاول اور تھوڑی سی دیسی گنے کی شکر بکھری ہوئی تھی۔ پرات اور اکڑوں بیٹھے

ہونے کے سامنے ایک رجسٹر بھی فرش پر تھا۔ اور فرش ہی پر ایک ہری کین اپنی روشنی رجسٹر اور پرات دونوں پر ڈال رہی تھی۔ اُکڑوں بیٹھا ہوا شخص رجسٹر میں برات کے ہمراہ بیٹھے ہوئے آدمیوں کے نام اور ولدیت رجسٹر میں لکھتا ہوا بار بار اپنی عینک، اور ساتھ ہی ٹائی کو درست کرتا جاتا تھا۔ یہ اندراج "نیوتے" کا تھا۔ کوئی دو روپے کوئی تین روپے کوئی پانچ روپے نقد خشخشی داڑھی والے کو دیتا۔ نام اور باپ کا نام پکارتا۔ روپے ٹٹولے یا گنے جاتے پھر کچے چاولوں اور شکر پر دھر دیئے جاتے۔

تب دولہا اکڑوں ہو کر لکھنے والے کے بائیں جانب پیلی پگڑی باندھے بیٹھا تھا۔ میں بھی گھس پل کر اس کے قریب جا بیٹھا اور اس کے کان میں بتا دیا کہ بھئی سہرا تیار ہے۔ اور میں بھی حاضر ہوں۔ اس نے بڑی خوشی سے میرا ہاتھ دبایا۔ اتنے میں "نیوتے" ختم ہو گئے گھر کا نائی چنگیر میں دھرے ہوئے پھولوں کے سہرے لایا۔!

دولہا کا باپ پرات ہی سے روپے گن گن کر ایک تھیلی میں ڈال رہا تھا۔ رجسٹر بند کر دیا گیا تھا۔ اُکڑوں بیٹھ کر اندراجِ رقوم کرنے والا عینک جیب سے نکال کر جھک کی لالٹین کے آنکھوں پر چڑھا رہا تھا۔ کہ ایک لمبی سفید داڑھی والے بوڑھے نے الف اور ب دونوں دولہاؤں کی پگڑیوں پر سہروں کی ڈوریں باندھیں اور پھولوں کی لڑیوں سے چہرے کے دامنوں پر رنگین چھڑیں سی ڈال دیں۔ مبارک ہو شیخ جی۔ مبارک ہو میاں جی کی آوازیں گونجیں۔ نائی کو دو روپے اُکڑوں بیٹھنے والے نے دولہاؤں کے ابا سے دلوائے ساتھ ہی اس نے کچے چاول اور شکر کی پوٹلی باندھ لی۔ یہ تھا نائی کا پہلا انعام۔

یہ عالم تھا کہ میں نے دس روپے جیب سے نکالے اور ب دولہا کو تھما دیئے تاکہ وہ اپنے الف بھائی اور اپنے درمیان پانچ پانچ تقسیم کر لیں۔ یہ نیوتہ نہیں تھا۔ نیوتہ اپنی برادری میں ہوا کرتا تھا۔ یہ تو میری طرف سے دولہوں کے لئے عطا بہ لقا کا معاملہ تھا۔ یاد رہے کہ اُن دنوں پانچ پانچ روپے کوئی ایسی چھوٹی بات نہ تھی۔

یہ روپے ب دولہا نے اپنے اُکڑوں بیٹھنے والے ماموں کے سپرد کر دیئے۔ میں نے اس کو پہلے بھی ان دونوں کے ساتھ کبھی کبھی اس کوچے میں آتے جاتے دیکھا تھا مجھے یہ تو معلوم تھا کہ یہ ان دونوں کا ماموں ہے۔ لاہور میں کسی دفتر میں اسسٹنٹ انچارج کلرک ہے۔ جب جالندھر آتا ہے تو سوٹ میں ملبوس رہتا ہے۔ ٹھگنے قد پر سوٹ اور پھر گلے میں نکٹائی جالندھر میں اُس کے حلیئے پر نگاہ پڑ کر مسکراتی بھی تھیں۔ لیکن مجھے دس روپے ادا کرنے کے ساتھ ہی معلوم ہوا کہ دونوں دلہنوں کا ماموں بھی یہی ہے۔ اور رجسٹر پر لکھتے وقت اُکڑوں بیٹھنا پتلون کی وجہ سے تھا۔ روشنی کی کمی کے سبب فرش ہی پر رجسٹر فرش پہ ہری کین لالٹین کی وجہ سے عینکوں کے باوجود جھکنا بھی ضروری تھا۔!

اب نیوتے کے خاتمے پر رجسٹر بند ہو چکا تھا لیکن یہ دس روپے مزید وصول ہوتے تو ماموں نے داہنے ہاتھ سے دولہاؤں کے ابا کو دے دیئے اور عینکوں والی نگاہ مجھ پہ ڈالی نام پوچھا۔ تو الف دولہا نے سہرے کو ہاتھ سے ایک طرف ہٹاتے ہوئے اس کے کان میں جو کچھ کہا وہ کانا پھوسی نہ تھی اعلان تھا۔

"یہ حفیظ جالندھری صاحب ہیں روپیہ ہی نہیں دیا۔ سہرا بھی پڑھیں گے۔ ہمارے یہ دوست شاعر ہیں نا۔!"

آہا کہہ کر ماموں نے اور بھی تعجب سے میرا چہرا اور میری کیسری پگڑی کو سہرے کے بغیر طرے تک دیکھ ڈالا۔ اب ب دولہا نے بھی میرے کان میں اعلان کے طور پر فرمایا:۔

ہاں حفیظ بھائی اب ہو جائے نا سہرا۔!

ذرا پھر تصور فرمالیجئے۔ سہرے بندھے ہوئے دو دولہے، جن کے درمیان ساری محفل میں ایک سوٹ پہنے ہوئے اکڑوں بیٹھا ہوا ماموں دولہاؤں کا باپ نیوتے کی تھیلی میں میرے دس روپے میرا نام رجسٹر میں لکھوائے بغیر ڈال رہا ہے۔ رجسٹر تھیلی کے نیچے دبا ہوا ہے پچیس تیس شیخ برادری کے براتی منشی مصرعہ، نیوتہ دینے کے بعد دلہنوں کے گھر جاکر پلاؤ، زردہ کھانے کی فکر میں قل ہو اللہ پڑھتے ہوئے خالی شدہ جیبوں والی کمریں سیدھی کر رہے ہیں۔ گھر سے ڈھولکی کی آوازیں بند ہیں۔ "توڑ" سے باہر گلی میں باجے والے آگئے ہیں۔ اور انھوں نے ڈھوتو، ڈھوتو ڈھمک ڈھمک کا آغاز کیا ہے۔ تین لالٹینوں کی روشنی فرش پر اور آٹھویں رات کا چاند عرش پر ہے لیکن فضا میں دھندلاہٹ ایسی ہے کہ اس بزم شادی پر چادر تانے ہوئے ہے۔

روشنی کا معقول انتظام شاید اس لئے نہیں کیا گیا ہوگا کہ اول تو اللہ میاں کا چاند روشن ہے اور پھر اگر دولہاؤں کے گھر میں پہلے ہی سے روشنی کی جگمگ موجود ہو تو ان دو سگی بہنوں یعنی آفتاب اور ماہتاب کو دلہنیں بناکر اس گھر میں لانے کی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی — !

بہرصورت کوٹ کی داہنی جیب سے دس روپے نکل گئے تھے تو کیا ہوا! بائیں جیب میں گیارہ شعر سہرے کے تو موجود ہی تھے۔ لہٰذا میں اٹھا، ٹوپی لیمپ شو جو بیٹھتے وقت محفل کے پاس ادب سے، اپنے زانو تلے دبا رکھا تھا، پہن لیا۔ جیب سے سہرا نکالا اور کھنکارا — ! یعنی ع

اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی

کاغذ پر نگاہ ڈالی تو سہرے کے حروف تڑپنے لگے۔ چاند کی طرف نگاہ اٹھائی تو وہ بھرپور اس ہنسی اپنے ہالے میں سے برسا تو رہا تھا لیکن یہ ہنسی چاندنی بھی ہو تو بہت پھیکی تھی — ! کسی نے باجے والوں کو چپ ہو جانے کی کڑک دار آواز دی۔ اکڑوں ماموں اٹھا، لالٹین اٹھائی اور بائیں جیب سے نمایاں رومال کو بائیں ہاتھ میں لیکر میرے پیچھے آکھڑا ہوا۔ اس کا قد ناٹا یعنی یہ ماموں ٹھگنا تھا۔ اُس نے داہنے بازو کو میری داہنی بغل کے رُخ سے بڑھایا۔ اس ہاتھ میں لالٹین تھی۔ لالٹین کی روشنی چاندنی سے ملکر سہرے کے حروف پر پڑی۔ اب ماموں نے بھی اچھی خاصی آواز میں فرمایا۔

"صاحبو! یہ شاعر ہیں۔ سہرا سنائیں گے۔ ہاں شاعر صاحب ہو جائے سہرا۔"

ہو جائے سہرا بھی کھلا تو ہی لیکن شاعر نے شعر کہہ ڈالے ہوں اور بزعم خود بہ شعر ہوں بھی غالب اور ذوق تک کو شرمانے والے تو جب تک وہ ان اشعار کو سنا نہ لے پیٹ پھٹ جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔

اور میں تھا اس بزم میں تنہا شاعر! اب میں سہرا پڑھ رہا تھا۔ اُس دور میں میری شعر خوانی تحت اللفظ ہی ہوا کرتی تھی۔ ترنم میرے لئے لاہور جاکر تشریف لانے والا تھا۔

میں نے دو تین شعر اپنے تحت اللفظ انداز سے پڑھے۔ شیخ برادری کے براتی اس آفاقی واردات پر ہکے بکے میرا منہ تکنے کی مصیبت میں مبتلا نظر آئے۔ داد کی طلب گار نگاہوں نے دیکھا کہ وہ بھوکے تو تھے ہی اب سب کے سب آدھا آدھا منہ کھولے میرے گلزار شاعری کے اثمار چبائے بغیر ہی اپنے شکم میں اتار رہے ہیں — !

میں جالندھر کے مشاعروں میں ہی نہیں منٹگمری، امرتسر، کپورتھلہ، لدھیانہ اور نکودر تک کے مشاعروں میں واہ وا سبحان اللہ سننے کا عادی آج اس وادی میں کیا دیکھ رہا تھا۔

بہرصورت یہ لوگ براتی تھے۔ کوئی مشاعرہ تو تھا نہیں لیکن سانپ سونگھ جانے کی سی فضا تھی۔ ایک دو مرتبہ نصف سے بھی کم نمایاں چاند پر میری نگاہ اٹھی اور پھر اپنے دانش فرسودہ پمپ شو پر بھی میری آنکھوں نے جھانکا۔ دونوں بیر دل پر ستارے سے ترمر ترمر کر رہے تھے۔

لیکن یہ سکوت ٹوٹ گیا۔ وہ اس طرح کہ براق عالم لاہوت میں ایک عجیب سی آواز سنائی دی جانے لگی۔ یہ آواز ایسی تھی جیسے کوئی مرغی اپنے دبے ہوئے حلق سے تُق تُق۔ قُقُق قُق۔ قُو قُو کر رہی ہو۔ ساتھ ہی میری آنکھوں کے سامنے خوشنویس کے لکھے ہوئے سہرے کی لڑیاں سہرے کے پھولوں کی طرح ناچنے لگیں۔ یہ تھرتھراتا ناچ تاریکی اور اُجالے کی خاموشی اتھاہ ٹھیک سی تھی۔ میں نے اپنی داہنی جانب جھانکا۔ تو لالٹین بھی حال کھیلتی نظر آئی۔ وہ بازو جس کے ہاتھ میں لالٹین تھی وہ بھی متحرک رہا تھا۔ لیکن میری آپ بیتی کا اصل موضوع وہ خشوع و خضوع کی گھٹی ہوئی قُق قُق۔ قُق قُق۔ قُق قُق تھی جس کے تسلسل نے مجھے منہ موڑ کر اپنے پیچھے کی طرف دیکھنے پر اکسایا حالانکہ سہرے کے تحریکی جادو کی میرے دہن سے جاری و ساری تھی۔

مڑ کر دیکھا تو نظر آیا کہ الف اور ب دو لہاؤں کا سوٹ پہنے اور نکٹائی لگانے والا ماموں جو لاہور میں اسسٹنٹ انچارج کلرک اور جالندھر آ کر بیٹھا ہوا تھا جس نے سہرے پر لالٹین سے میرے سہرے والے کاغذ پر روشنی ڈال رکھی تھی۔ بائیں ہاتھ سے اپنا رومال اپنے منہ میں ٹھونس رہا تھا تاکہ میری سہرا پڑھنے کی ادا پر خوشی کی ہنسی جو اس کے اندر سے باہر کو چھوٹ رہی تھی، اس کو ضبط کر لے۔ ضبط کرنے سے ہنسی نے اس کے سارے جسم پر رعشہ طاری کر رکھا تھا اور قُق قُو قُق تَقَقَق وغیرہ کی کڑک کڑک اس کے حلق ہی میں ادھم مچاتی ہوئی میرے کانوں سے میرے قلب تک پہنچ رہی تھی۔

جالندھر میں ان دنوں شادی بیاہ پر طوائفوں کے ناچ گانے ترکھاتے پیتے مسلمانوں کے ہاں اکثر ہوتے تھے۔ بھانڈ اور نقال وغیرہ بھی براتوں میں اپنے فن کا ٹیکس وصول کرنے خود بخود آ دھمکتے تھے۔ لیکن ابھی تک ہم کی برادریوں میں ارباب نشاط کا مقام کسی شاعر کو حاصل نہیں تھا۔ میں نے کھری چاندی کے پورے دس روپے دے کر سہرے کے گیارہ شعر سنا کر ان کو پریشان کرنے کی یہ جو حرکت فرمائی تھی وہ تو خیریت گزری کہ سامنے بیٹھے ہوئے منہ کھول کر میری صورت پر غور کرنے والے براتیوں کی سمجھ میں نہ آئی تھی کہ وہ مجھ سے کیا سلوک کریں۔ البتہ لاہور میں کلرکی کرنے والا مہذب ماما ئے دولہگان اور دولہنان کی شرافت تھی کہ ہنسی ہی چھوٹی لالٹین چھوڑ کر ہاتھ نہیں چھوڑتا۔ اس کی تہذیب یافتگی لاہوری تھی۔ اس لئے وہ بیچارہ رومال کو فیشن ایبل کوٹ کی جیب سے نکال کر اپنے منہ میں ٹھونس رہا تھا۔

اور وہ بھاپ جس نے ہنسی بن کر پیٹ سے منہ کے راستے نکلنے کی آزادی چاہی تھی۔ اب اگر منہ میں ٹھنسے ہوئے رومال کو مزاحم پا کر حلق میں انڈا دے کر اعلان ولادت بیضہ کرنے والی مرغی کی مانند قق قق قو قو نہ کرتی تو اور کیا کرتی۔ یہ ہے روداد میری سہرہ نویسیوں اور سہرہ خوانیوں کی چند وارداتوں میں سے ایک واقعے کی اپنی یادوں میں سے یہ میری آپ بیتی ایک معصوم سا قصہ ہے۔ شاید آپ اس وقت جب کہ میں　　　　جلد جلد یہ حروف کاغذ پر لا رہا ہوں۔ میری اس صورت کا تصور نہیں کر سکتے اور یہ صورت جو اس کی یاد انشاد سے میری اس وقت بنی ہوئی ہے۔ میں نے ابھی ابھی ہوٹل (جس کے اندر مقیم ہوں) کے غسل خانے میں دیکھی ہے۔ خیر میری آج کی صورت کا تذکرہ تو اس وقت بے محل ہے کیونکہ کوئی بھی شہر ہو یا قصبہ ہر جگہ میں نے دیکھا کر

پریزادوں کی زباں سے کلام سن کے مرا　　　　بہت سے لوگ مری شکل دیکھنے آئے

یہ تذکرہ اس وقت کا ہے۔ محض دو رکی دو لالٹینوں اور تھرکتی ہوئی ہری کیں اور ہالے میں کھڑے ہوئے نصف چاند کو دھندلی چاندنی میں شیخ برادری کے کچہری زدہ نقل نویسوں کی صورتیں خود میرے سامنے بھی دھندلائی ہوئی تھیں۔ وہ محض جلد اٹھ کر دولہنوں کے گھر کے چاولوں کی نگری میں تھے میری صورت ان کو شاید ہی نظر آ رہی ہو۔ اور اگر ان میں سے کوئی آنکھوں والا نہ سہی تصور کرنے والا بھی ہو تو مجھے یقین نہیں کہ میری شکل کی وہ جھلک دیکھ سکے جو اس سہرے کو پڑھنے اور پڑھے جانے کے وقت بنی ہوئی ہوگی۔ ا

لیکن واہ رے میں! نہ جانے ماندن نہ پائے رفتن۔ کے معنی آج پہلی مرتبہ مجھ پر صادق تھے۔ اس کیفیت کی تکرار کے طور پر مجھے دوبارہ

کہنے دیجئے کہ داد دے رہے ہیں۔! یہ کوئی سیاسی اسمبلی نہ تھی جس کا رکن ہونے کی وجہ سے میں واک آؤٹ کر جاتا۔ اس توڑے سے پانی کا جوہڑ بھی قدرے دور تھا اور تھا بھی اس وقت کی اس برات سے بدذوق، ورنہ میں "ڈوب کر مر جاتا"۔ ہم سہ بارہ "داد دے رہے ہیں۔!" میں پورا سہرا پڑھ ڈالا۔ اپنی والدہ کے عطا کردہ دس روپے نذرانہ دینے کا حق ادا کر دیا۔ رجسٹر میں نام لکھوائے بغیر پورے گیارہ شعر پڑھ ڈالے اور فرما دیئے۔ ہاں پورے گیارہ شعر تخلص والے مقطع سمیت۔!

مجھے یہ تو یاد ہے کہ سہرا پڑھ کر میں نے کاغذ توڑ مروڑ کر اس جیب میں اڑس لیا تھا جس جیب میں روپے کھنکھنائے تھے مگر یہ بالکل یاد نہیں کہ میں یہ سب شعر کیسے پڑھ گیا، کب ختم کئے اور ختم کرنے کے بعد میں کیا کر رہا تھا؟ میری حالت دید کے قابل ضرور ہوگی۔ ہائے افسوس نہ ہوئی اس وقت میری اپنی دلہن کیونکہ وہ اگر کسی جھروکے سے مجھے جھانک رہی ہوتی تو شاید میرے سر کی کیسری پگڑی اور اس کے طرے کے باوجود میرے چہرے کی نمائش اس کو ہمیشہ کے لئے چند صیا دیتی۔

اس کے بعد کا میرا تصور۔ یہ ہے کہ برات کے پچیس تیس آدمی اٹھ کھڑے ہوئے اور توڑے سے باہر نکل گئے اور باجا بجنے لگا۔ باجے والوں کے پیچھے تق تق تفق والا ماموں اپنے دونوں بھانجے داماد بھانجوں کو دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر لگائے ہوئے تھا۔ ان کے پیچھے براتی تھے۔ گھر کی ڈیوڑھی سے عورتیں بھی کوئی نیم برقعہ اوڑھے کوئی محض چادر سے گھونگھٹ لٹکائے گلی کے فرش پر زنانی جوتیوں کی سٹر سٹر اور زبان سے مختلف خوش گفتاریوں کی بڑبڑ کرتی ہوئی پیچھے پیچھے تھیں۔

سب تینوں دلہنیں بھی برات کے ساتھ ہی تھیں۔ میں بھی ان سب سے پیچھے آٹھ دس قدم چلا اور پھر ہاں اور پھر میں یکایک رک گیا۔ برات سڑک۔ روڈ کی طرف جانے کو گلی میں کوئی ایک منٹ رکا کھڑا رہا۔ باجا میرے دفتر کے قریب پہنچ چکا ہوگا۔ میں نے اپنا منہ اس میدان کی طرف موڑا جس کا تذکرہ اس آپ بیتی کی تمہید میں کر چکا ہوں۔ یعنی

تم اپنا منہ ادھر کر لو ہم اپنا منہ ادھر کر لیں

میں اغلباً یہ چاہتا تھا کہ الف اور ب دولہاؤں کی ہونے والی دلہنوں کے گھر براتی بن کر جانے کی بجائے جلدی سے اپنی دوسالہ پرانی دلہن کے دامن میں پناہ لے لوں اور بغیر سوچے سمجھے اس شارٹ کٹ پر میرے پمپ شوز والے پاؤں چل پڑے تھے۔ جس سے میں باز رہا کرتا تھا۔

میں یہ شام بیان کر چکا ہوں، مارچ کے پہلے ہفتے کی تھی۔ سردی تھی ہوا بھی خنک تھی لیکن میں سر سے پیر تک پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ کیا یہی پسینہ عرق ندامت کہلاتا ہے۔ اگر عرق ندامت اسی کا نام ہے تو خطا　　　میرے اللہ میری توبہ ہے۔

سست روی تھی یا تیز خرامی تھی مجھے یاد نہیں۔ بہر آئینہ میں اس کوچے سے میدان میں نکل آیا تھا اور شمال کے رخ اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ رات سرد تھی چاند کے گرد ہالہ تھا۔ شاید میرے پسینے کو دھونے کے لئے کل کلاں مینہ برسنے والا تھا۔ چاندنی کا رنگ اس میدان میں پھیلے ہوئے گوبر کی وجہ سے مٹیالا تھا (ابھی خاصی قافیہ بندی) میں اپنی سہرہ نویسی اور سہرہ خوانی کے باوجود برات عاشقاں بر شاخ آہو سے بھی روگرداں تھا۔ عرق ندامت کے گھڑوں پانی میں غوطہ لگائے ہوئے چل نہیں رہا تھا بہ رہا تھا۔ اپنی حالت آج بھی سوچتا ہوں تو بغیر مرے ہوئے سو دُرّے پڑنے کی سی تھی۔ عرصۂ شاعری کے شکست خوردہ سپاہی کو یاد نہ رہا تھا کہ اس راہ میں وہ سٹراند بھرا کچا نالہ بھی ہے جس پر سے پھلانگنا میں کسر شان سمجھا کرتا تھا۔

یہ پتہ اس وقت چلا جب میرا پاؤں پھسلا۔ اور میرے دونوں پیر وارنش کے چمکتے ہوئے پمپ شو جوتوں سمیت نالے کے پانی میں غوطہ لگا کر ابھرے۔ میری پشت میری شلوار اور میرے دولہا پن والے کوٹ کی پشت لیس دار کیچڑ پر ٹیک گئی اور میری دونوں کہنیاں دلدل نما سیلی زمین پر گڑ گئیں کیسری پگڑی والے سر کو کندھوں پر اٹھائے میری آنکھیں آسمان پر ہنستے ہوئے چاند کو تک رہی تھیں اور میرے پیر بھی جرابوں اور چمکیلے پمپ شوز جوتوں کو سری کے زاویے کے مقابل کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تو تھے مگر چاند کی ہنسی کا منہ چڑا رہے تھے۔



اختر شیرانی

'......اب رہا میری حیاتِ معاشقہ کا تذکرہ' جس سے اکثر عزیزوں اور دوستوں کی دلچسپیاں وابستہ ہیں۔ میں اس کے متعلق کچھ لکھنے سے احتراز کرنا چاہتا ہوں کہ اس علم کے بعد کسی عزیز کو میری زندگی سے دلچسپی رہے گی اور نہ کسی دوست کو......"

سنہ ۱۹۰۹ء کے اواخر میں ریاست ٹونک (راجپوتانہ) میں پیدا ہوا۔ جہاں (غالباً) میرے دادا جن کا نام مولوی محمد اسمٰعیل خاں تھا تشریف لائے اور مختلف مناصب پر ریاست کی خدمات انجام دیتے رہے۔ میرے والد کا نام حافظ محمود خاں شیرانی ہے۔ ان کے نام سے علمی دنیا اچھی طرح واقف ہے۔ ان کی تنقیدی نظر مستشرقین سے بھی خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے۔ جاننے والی نظریں انھیں جاننے کی طرح جانتی ہیں اور ماننے والی عقیدت شناسیاں ماننے کی طرح مانتی ہیں۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں والیٔ ریاست کی نگاہِ عتاب نے یہ احسان فرمایا کہ ٹونک کی مختصر مگر جذباتی دنیا کو چھوڑ کر مجھے والد ماجد کی معیت میں لاہور جیسی متمدن، مہذب اور شاندار دنیا میں آنا پڑا۔ ہندوستان کے مشہور اور دنیائے اسلام کے مشہور تر شاعر علامہ اقبال اور آغا حشر کاشمیری میرے پسندیدہ شاعر تھے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ آغازِ طفلی میں داغ جیسے مشہور شاعر کو بھی میری خوش مذاقی یا بد مذاقی نے توہین آمیز نظروں سے دیکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دو زبانہ دہ سالہ عمر کی نادانیاں، مرزا نوشہ کی غزلوں پر لکھنا اپنے لئے قابلِ تعریف سمجھا جاتا تھا۔ ان کی تقلید میں بہت کچھ غزل نگاری کے بعد مرحوم کی ذہانت کی قدر دانیاں، اس عہد میں اپنے اوجِ شباب کو نہ پہونچی تھیں۔ گو سر عبد القادر، سر اقبالؒ اور ان کے ہم مذاقوں کی قدر شناسی مرزائے مرحوم کے "اوجِ قبول" کی ابتدائی ترتیب میں مصروف تھیں۔ لاہور آنے پر والد ماجد نے اپنے چند عزیز دوستوں سے ملاقات کرائی۔ ان میں علامہ اقبالؒ، مرزا محمد سعید (آئی ای ایس) اور سر عبد القادر بھی تھے ایک بھولا بھالا بچہ ایک مشہور اور مقبول شاعر کو جس عقیدت بھری نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ وہ انارکلی کے پرشور و پر از ہجوم بازار میں بھی اس کی ارادتوں کی شریک تھی لیکن نتیجہ کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میرے محترم دوست مولانا نیاز فتحپوری نے سر اقبالؒ مرحوم کی ملاقات کے بعد کچھ ایسے خیالات کا اظہار کیا تھا جو مرحوم کے عقیدت کیشوں کیلئے زیادہ خوشگوار نہیں ہو سکتے۔ میرا بھی حال اس سے مختلف نہ تھا بہرحال بقول شاعر ؎

بحرِ ہزج میں ڈال کے بحرِ رمل چلے

کے تصور کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا۔ اس لئے اس تذکرے کو کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں اب سے اپنے حالات جس کے اظہار کے دوران میں کسی قدر بہک چلا تھا۔ اس کی طرف اپنے عزیز (سید) بشیر ہندی کے اصرار پر رجوع کرتا ہوں۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں اورنٹیل کالج میں داخل ہوا۔ دو چار مہینے منشی فاضل کی کلاسوں میں پڑھا اور امتحان میں کامیاب بھی ہو گیا ڈاکٹر وولنر آنجہانی جو بعد کو پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہو گئے تھے کالج کے پرنسپل تھے۔ اس کے اگلے سال ادیب فاضل کا امتحان دیا اور اس میں بھی ممتحنوں کی غلط بخشی یا غلط فہمی کی وجہ سے پاس ہو گیا۔

یہ زمانہ وہ ہے کہ گلستان کلابِ نجم' اور خیام کی' رباعیات' لاہور کے ہر ذرے میں دعوتِ قبول دے رہی تھیں یہاں یہ عالم تھا کہ بقول آقائی میرزا حسین کاظم زادہ مدیر و سردبیر مجلّہ' ایران شہر' (برلن):۔

" شما کہ یک قریحہ ملیح جانِ جوشاں و دلِ تپاں و جذباتِ سوزاں دارید .. .. .. حیف باشد کہ زبانِ سعدی در کلام و ذوالفقار علی

در نیامد بہ ماند ؎

چنانچہ تباہیوں کی اس دعوت کو قبول کرنا پڑا اور ہمایوں کی چند روزہ ادارت کے بعد ایک دوست کے نئے رسالے "بہارستان" کی ادارت کا بار اٹھانا پڑا۔ تعلیم چھوٹ گئی۔ اور جنونِ عشق و شباب کے ہاتھوں اسے خیرباد کہنا پڑا۔ چند سال گذرنے کے بعد از سرِ نو تعلیم کی دُھن سوار ہوئی اور میں اپنے پرانے کالج (اورینٹل کالج) میں میٹرک کلاس میں داخل ہوا۔ اس کے بعد صحافت کی وحشت حواب آگئی ؎

مری تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی

کا ہیولیٰ (خونِ گرم دہقاں) کی شکل میں کرم فرما رہی تھی۔ از سرِ نو دامن گیر ہوئی اور میں نے "خیالستان" کے نام سے ایک ماہانہ پرچہ نکالا۔ بہارستان کی زندگی میں جبکہ مولانا محمد علی نے خواجہ حسن نظامی کے خلاف قلمی جنگ کا آغاز کر رکھا تھا۔ میرے ایک مضمون نے جو مولانا مرحوم کی تائید اور خواجہ صاحب کے خلاف لکھا گیا تھا، مولانا محمد علی کو نا متأثر کیا کہ انھوں نے اپنے ادارہ کے توسط سے مجھے مجبور کیا کہ میں "ہمدرد" کے لکاہی کالم کے لئے (کم از کم ہفتہ میں ایکبار) کچھ نہ کچھ لکھ کر بھیج دیا کروں۔ چنانچہ اس پر کافی عرصے تک عمل ہوتا رہا۔

محمد علی بھی آج رخصت ہو گیا۔ ہمدرد بھی مٹ چکا۔ مگر میں اور میری جنوں سامانیاں ہنوز بقید حیات ہیں۔

۱۹۲۵ء میں "رومان" کے نام سے ایک اور پرچہ نکالا۔ جو بوجوہ بند ہو گیا۔ اب رہا میری حیاتِ معاشقہ کا تذکرہ جس سے اکثر عزیزوں اور دوستوں کی دلچسپیاں وابستہ ہیں۔ میں اس کے متعلق کچھ لکھنے سے احتراز کرنا چاہتا ہوں تا اس کے علم کے بعد کسی عزیز کو میری زندگی سے دلچسپی رہے گی اور نہ کسی دوست کو، ورنہ یہ موضوع میرے لئے ایسا ہے کہ دل چاہتا ہے ؎

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم!

پر عمل کرسکوں ؎

کچھ ابھی دل کی لگی ہم نے اٹھا رکھی ہے

پر اس کو ختم کروں۔

شاعری کے متعلق مجھ سے میرا نظریہ دریافت کیا گیا ہے مختصر تر الفاظ میں گذارش کر دوں گا کہ میرے نزدیک شاعری کا ایک ایسا جذبہ ہے — صرف عاشقانہ تنہائیوں کی پیداوار اور انھیں کے لئے باعثِ حاصلِ مسرت ہے اور بس۔!



فیضؔ احمد فیضؔ

"...... اپنی ذات کو باقی دنیا سے الگ کر کے سوچنا اوّل تو ممکن ہی نہیں، اسلئے کہ اس میں بہر حال گرد وپیش کے سبھی تجربات شامل ہوتے ہیں اور اگر ایسا ممکن ہو بھی تو انتہائی غیر سود مند فعل ہے کہ ایک انسانی فرد کی ذات اپنی محبتوں اور کدورتوں، مسرتوں اور رنجشوں کے باوجود بہت ہی چھوٹی سی، بہت ہی محدود اور حقیر شے ہے اس کی وسعت اور پنہائی کا پیمانہ تو باقی عالم موجودات سے اس کے ذہنی اور جذباتی رشتے ہیں ...."

اپنے بارے میں باتیں کرنے سے مجھے سخت وحشت ہوتی ہے اس لئے کہ سب سے بور لوگوں کا مرغوب شغل یہی ہے۔ اس انگریزی لفظ کے لئے معذرت چاہتا ہوں لیکن اب تو ہمارے یہاں اس کے مشتقات بوریت وغیرہ بھی استعمال ہونے لگے ہیں۔ اس لئے اسے اب اردو روزمرہ میں شامل سمجھنا چاہیئے۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے اپنے بارے میں بات کرنا بری لگتی ہے۔ بلکہ میں تو شعر میں بھی حتی الامکان واحد متکلم کا صیغہ استعمال نہیں کرتا اور میں کے بجائے ہمیشہ "ہم" کہتا آیا ہوں۔ چنانچہ جب ادبی سراغرساں حضرات مجھ سے یہ پوچھنے بیٹھتے ہیں تم شعر کیوں کہتے ہو، کیسے کہتے ہو اور کس لئے کہتے ہو تو بات کو ٹالنے کے لئے جو دل میں آئے کہہ دیتا ہوں۔ مثلاً یہ کہ بھئی بس جیسے بھی کہتا ہوں، جس لئے بھی کہتا ہوں تم شعر میں سے خود ڈھونڈ لو، میرا سر کھانے کی کیا ضرورت ہے لیکن ان میں سے ڈھیٹ قسم کے لوگ تب بھی نہیں ملتے۔ چنانچہ آج کی گفتگو کی سب ذمہ داری ان حضرات کے سر ہے مجھ پر نہیں۔

شعر گوئی کا کوئی واحد عذر گناہ تو مجھے نہیں معلوم۔ اس میں بچپن کی فضائے گرد و پیش میں شعر کا چرچا، دوست احباب کی ترغیب اور دل کی لگی سبھی کچھ شامل ہے۔ یہ نقش فریادی کے پہلے حصے کی بات ہے جس میں ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۴ء تک کی تحریریں شامل ہیں جو ہماری طالب علمی کے دن تھے۔ یوں تو ان سب اشعار کا قریب قریب ایک ہی ..... ذہنی اور جذباتی واردات سے تعلق ہے اور اس واردات کا ظاہری محرک تو وہی ایک حادثہ ہے جو اس عمر میں اکثر نوجوان دلوں پر گزر جایا کرتا ہے۔ لیکن اب جو دیکھتا ہوں تو یہ دور بھی ایک دور نہیں تھا بلکہ اس کے بھی دو الگ الگ حصے تھے۔ جن کی داخلی اور خارجی کیفیت کافی مختلف تھی۔ وہ یوں ہے کہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک کا زمانہ ہمارے ہاں معاشی اور سماجی طور سے کچھ عجب طرح کی بے فکری، آسودگی اور ولولہ انگیزی کا زمانہ تھا جس میں اہم قومی اور سیاسی تحریکوں کے ساتھ ساتھ نثر و نظم میں بیشتر سنجیدہ فکر و مشاہدہ کے بجائے کچھ رنگ رلیاں منانے کا سا انداز تھا۔ شعر میں اولاً حسرت موہانی اور ان کے بعد جوش، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی کی ریاست قائم تھی۔ افسانے میں یلدرم اور تنقید میں حسن برائے حسن اور ادب برائے ادب کا چرچا تھا۔ نقش فریادی کی ابتدائی نظمیں۔ خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو، مری جاں! اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو، تہ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں، وغیرہ وغیرہ اسی ماحول کے زیر اثر مرتب ہوئیں اور اس فضا میں ابتدائے عشق کا تحیر بھی شامل تھا۔ لیکن ہم لوگ اس دور کی ایک جھلک بھی ٹھیک سے نہ دیکھ پائے تھے کہ صحبت یار آخر شد۔ پھر دیس پر عالمی کساد بازاری کے سائے ڈھلنے شروع ہوئے۔ کالج کے بڑے بڑے بانکے تیس مار خاں تلاش معاش میں گلیوں کی خاک پھانکنے لگے۔ یہ وہ دن تھے جب یکایک بچوں کی ہنسی بجھ گئی، اجڑے ہوئے کسان کھیت کھلیان چھوڑ کر شہروں میں مزدوری کرنے لگے۔ اور اچھی خاصی شریف بہو بیٹیاں بازار میں آ بیٹھیں۔ گھر کے باہر یہ حال تھا اور گھر کے اندر مرگ سوز محبت کا کہرام مچا تھا۔ یکایک یوں محسوس ہونے لگا کہ دل و دماغ پر سبھی راستے بند ہو گئے ہیں۔ اور اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا۔ اس کیفیت کا اختتام جو نقش فریادی کے پہلے حصے کی آخری نظموں کی کیفیت ہے ایک نسبتاً غیر معروف نظم پر ہوتا ہے۔ جسے میں نے "یاس" کا نام دیا تھا۔ وہ نظم یوں ہے:

"یاس"

بربطِ دل کے تار ٹوٹ گئے
ہیں زمیں بوس راحتوں کے محل
مِٹ گئے قصہ ہائے فکر و عمل
بزمِ ہستی کے جام پھوٹ گئے
چِھن گیا کیفِ کوثر و تسنیم

زحمتِ گریہ و بُکا بے سُود
شکوۂ بختِ نارسا بے سود
ہو چکا ختم رحمتوں کا نزول
بند ہے مدتوں سے بابِ قبول
بے نیازِ دُعا ہے ربِّ کریم

بجھ گئی شمعِ آرزوئے جمیل
یاد باقی ہے بے کسی کی دلیل
انتظارِ فضول رہنے دے
رازِ اُلفت نباہنے والے
بارِ غم سے کراہنے والے
کاوشِ بے حصول رہنے دے

۱۹۳۴ء میں ہم لوگ کالج سے فارغ ہوئے اور ۱۹۳۵ء میں میں نے ایم اے او کالج امرتسر میں ملازمت کرلی۔ یہاں سے میری اور میرے بہت سے ہمعصر لکھنے والوں کی ذہنی اور جذباتی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دوران کالج میں اپنے رفقا صاحبزادہ محمودالظفر مرحوم اور ان کی بیگم رشید جہاں سے ملاقات ہوئی۔ پھر ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی۔ مزدور تحریکوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور یوں لگا کہ جیسے گلشن میں ایک نہیں کئی دبستاں کھل گئے ہیں۔ اس دبستاں میں سب سے پہلا سبق جو ہم نے سیکھا تھا کہ اپنی ذات کو باقی دُنیا سے الگ کرکے سوچنا اوّل تو ممکن ہی نہیں، اس لئے کہ اس میں بہرحال گردوپیش کے سبھی تجربات شامل ہوتے ہیں۔ اور اگر ایسا ممکن ہو بھی تو انتہائی غیر سُود مند فعل ہے کہ ایک انسانی فرد کی ذات اپنی سب محبتوں اور کدورتوں مسرتوں اور رنجشوں کے باوجود بہت ہی چھوٹی سی، بہت ہی محدود اور حقیر شے ہے۔ اس کی وسعت اور پہنائی کا پیمانہ تو باقی عالمِ موجودات سے اس کے ذہنی اور جذباتی رشتے ہیں، خاص طور سے انسانی برادری کے مشترکہ دُکھ درد کے رشتے۔ چنانچہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں تو ایک ہی تجربے کے دو پہلو ہیں۔ اس نئے احساس کی ابتدا نقشِ فریادی کے دُوسرے حصّے کی پہلی نظم سے ہوتی ہے۔ اس نظم کا عنوان ہے "مجھ سے پہلی سی محبت

مری محبوب نہ مانگ" اور اگر آپ خاتون ہیں تو "مرے محبوب نہ مانگ"

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ
میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخاب میں بُنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

اس کے بعد تیرہ چودہ برس "کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں" میں گزرے، اور پھر فوج، صحافت، ٹریڈ یونین وغیرہ کرنے کے بعد ہم چار برس کے لئے جیل خانے چلے گئے۔ "نقشِ فریادی" کے بعد کی دو کتابیں "دستِ صبا" اور "زنداں نامہ" اسی جیل خانے کی یادگار ہیں۔ بنیادی طور سے تو یہ تحریریں انھیں ذہنی محسوسات اور معمولات سے منسلک ہیں جن کا سلسلہ "مجھ سے پہلی سی محبت" سے شروع ہوا تھا لیکن

جیل خانہ عاشقی کی طرح خود ایک بنیادی تجربہ ہے جس میں فکر و نظر کا ایک آدھ نیا دریچہ خود بخود کھل جاتا ہے۔ چنانچہ اوّل تو یہ ہے کہ ابتدائے شباب کی طرح تمام حسیات یعنی (SENSATIONS) پھر تیز ہو جاتی ہیں اور صبح کی پو، شام کے دھندلکے، آسمان کی نیلاہٹ، ہوا کے گداز کے بارے میں وہی پہلا سا تحیّر لوٹ آتا ہے۔ دوسرے یوں ہوتا ہے کہ باہر کی دنیا کا وقت اور فاصلے دونوں باطل ہو جاتے ہیں۔ نزدیک کی چیزیں بھی بہت دور ہو جاتی ہیں اور دور کی نزدیک اور فردا و دی کا تفرقہ کچھ اس طور سے مٹ جاتا ہے کہ کبھی لمحہ قیامت معلوم ہوتا ہے اور کبھی ایک صدی کل کی بات۔ تیسری بات یہ ہے کہ فراغتِ ہجراں میں فکر و مطالعہ کے ساتھ عروسِ سخن کے ظاہری بناؤ سنگھار پر توجہ دینے کی زیادہ مہلت ملتی ہے۔ اس جیل خانے کے بھی دو دور تھے، ایک حیدرآباد جیل کا جو اس تجربے کے انکشاف کے تحیر کا زمانہ تھا، ایک منٹگمری جیل کا جو اس تجربے سے اکتاہٹ اور تھکن کا زمانہ تھا۔ ان دو کیفیتوں کی نمائندہ یہ دو نظمیں ہیں۔

پہلی "دستِ صبا" میں سے ہے، دوسری "زنداں نامہ" میں سے۔

زنداں کی ایک شام

شام کے پیچ و خم ستاروں سے
زینہ زینہ اُتر رہی ہے رات
یُوں صبا پاس سے گزرتی ہے
جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات
صحنِ زنداں کے بے وطن اشجار
سرنگوں، محو ہیں بنانے میں
دامنِ آسماں پہ نقش و نگار

شانۂ بام پر دمکتا ہے
مہرباں چاندنی کا دستِ جمیل
خاک میں گھُل گئی ہے آبِ نجوم
نُور میں گھُل گیا ہے عرش کا نیل
سبز گوشوں میں نیلگوں سائے
لہلہاتے ہیں جس طرح دل میں
موجِ دردِ فراقِ یار آئے

دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گُل کریں تو ہم جانیں

۱

"اے روشنیوں کے شہر"

سبزہ سبزہ، سوکھ رہی ہے پھیکی، زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے "تنہائی" کا زہر
دور افق تک گھٹتی، بڑھتی، اٹھتی گرتی رہتی ہے
کہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر
بستا ہے اس کہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر

اے روشنیوں کے شہر
اے روشنیوں کے شہر

کون کہے کس سمت ہے تیری روشنیوں کی راہ
ہر جانب بے نور کھڑی ہے ہجر کی شہر پناہ
تھک کر ہر سو بیٹھ رہی ہے، شوق کی ماند سپاہ

آج مرا دل فکر میں ہے
اے روشنیوں کے شہر

شب خوں سے منہ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رَو
خیر ہو تیری لیلاؤں کی، ان سب سے کہہ دو
آج کی شب جب دیئے جلائیں اونچی رکھیں لو

زنداں نامے کے بعد کا زمانہ کچھ ذہنی افراتفری کا زمانہ ہے [illegible] پیچھا چھٹا۔ ایک بار پھر جیل خانے گئے۔ مارشل لاء کا دور آیا۔ اور ذہنی اور گرد و پیش کی فضا میں پھر سے کچھ انتشار پیدا ہوا اور کچھ نئی زمینوں کی طلب کا احساس پیدا ہوا۔ اس سکوت اور انتظار کی آئینہ دار ایک نظم ہے "شام" اور ایک نامکمل غزل کے چند اشعار۔

کب ٹھہرے گا درد اے دل، کب رات بسر ہو گی!



مجاز لکھنوی

"شاعر تو صرف دو ہیں ایک فیض اور دوسرا مجاز ـــــ"

مجاز صاحب آپ کو لڑکیوں نے کھایا یا آپ کے قدردانوں نے یا شراب نے۔

شراب کا گلاس منہ سے لگاتے ہوئے مجاز بولے۔ ہم نے سب کو برابر کا حصہ دیا ہے۔

(رسالہ میخانہ وجہ چغتائی)

اختر میں چاہتا تھا کہ اپنے مجموعے کے کسی ایڈیشن کو اس کے نام (زہرہ جبیں) منسوب کروں لیکن اس نے منظور نہیں کیا۔ میرا دوست میرا ہمدم

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ　　　مہکیں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ

اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ

فیض اور جذبی کے نام جو میرے دل و جگر ہیں۔ سردار و مخدوم کے نام جو میرے دست و بازو ہیں

شاعر تو صرف دو ہی ہیں۔ ایک فیض اور دوسرا مجاز۔　　(انساب آہنگ)

(ڈاکٹر محمد حسن)

فراق ہوں اور نہ جوش ہوں میں

مجاز ہوں سرفروش ہوں میں

تعارف

خوب پہچان لو اسرار ہوں میں　　جنسِ الفت کا طلبگار ہوں میں

عشق ہی عشق ہے دنیا میری　　فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں

عیب جو حافظ و خیام میں تھا　　ہاں کچھ اس کا بھی گنہگار ہوں میں

زندگی کیا ہے گناہِ آدم　　زندگی ہے تو گنہگار ہوں میں

دیر و کعبہ میں مرے چرچے ہیں　　اور رسوا سرِ بازار ہوں میں

کفر و الحاد سے نفرت ہے مجھے　　اور مذہب سے بھی بیزار ہوں میں

مجھ سے برہم ہے مزاجِ پیری　　مجرمِ شوخیٔ گفتار ہوں میں

ایک لپکتا ہوا شعلہ ہوں میں

ایک چلتی ہوئی تلوار ہوں میں

تم نے بمبئی جانے کا مشورہ دیا تھا سو وہاں اس لئے نہ جا سکا کہ — اگر پینے کا ہے تو پریشانی اور اگر کمائی کے لئے تو معقول مصرف نہیں ہے۔ اس لئے کہ حکومت نے اب بمبئی جیسے شبستاں کو خشک کر دیا ہے۔ (خطبہ مستقیم)

پہلے جھونپڑیوں میں لوگ محلوں کے خواب دیکھتے تھے۔ لیکن اب یار لوگ محلوں میں رہ کر جھونپڑیوں کے خواب دیکھنے لگے ہیں۔

(ترقی پسند کانفرنس میں ایک تقریر کا اقتباس)

I HAVE BEEN DRINKING POETRY IN THE NIGHT AND
VOMITING IT IN THE DAY. (ڈائری مجاز حسن)

راجہ محمود آباد نے بڑے پیار سے مجاز سے خطاب کرتے ہوئے کہا: "مجاز اگر تم مان لو تو ایک بات کہوں۔"

مجاز سراپا انکسار بنتے ہوئے بولے، "آپ کا حکم سر آنکھوں پر، فرمائیے راجہ صاحب کیا ارشاد ہے"؟

"میں چاہتا ہوں تمہارے دو سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دوں۔"

"یہ اکرم ہے حضور کا۔"

"لیکن.." "تم خدا کے لئے یہ شراب پینا ترک کر دو۔"

"شراب پینا ترک کر دوں۔" مجاز نے نہایت حیرت سے راجہ صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تو پھر آپ کے دو سو روپے میرے کس کام آئیں گے۔"

مجھے ساغر دوبارہ مل گیا ہے
تلاطم میں کنارہ مل گیا ہے
مری بادہ پرستی پر نہ جاؤ
جوانی کو سہارہ مل گیا ہے

میری تمام زندگی ہنگامہ اور طوفان ہے۔ ایسا ہے بھی اور نہیں بھی بہر حال سفر میں اپنے آپ کو بالکل تنہا چھوڑ دیتا ہوں اور چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔ (خط بنام منفیم)

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بدر مارا پھروں
اے غم دل کیا کروں ....

یہ روپہلی چھاؤں میں آکاش پہ تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے دل کا حال
اے غم دل کیا کروں ....

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی چوٹ سی دل پر پڑی
اے غم دل کیا کروں ....

رات ہنس ہنس کے یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہناز لالہ رخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غمِ دل کیا کروں ......

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے مُلّا کا عمامہ جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب
اے غمِ دل کیا کروں ....

راستے میں رک کے دم لوں یہ مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہم نوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

سُننے ہو میری شراب نوشی میرا احساسِ شکست ہے۔ اعترافِ شکست ہے۔ میں نے شراب میں پناہ ڈھونڈی ہے۔ تم مجھ سے اونچے ہو، وہ سب مجھ سے اونچے ہیں جنھیں غمِ روزگار شراب نہیں پلا سکا۔ وہ لڑنا جانتے ہیں۔ وہ عارضی بیگانگی کا سہارا نہیں لیتے۔ میں شراب تسکین کے لئے پیتا ہوں۔ (اس کے جنوں کی داستاں۔ ابوالخیر کشفی)

ان لڑکیوں کا کام ہی کیا ہے۔ یہ تو ہماری زندگیوں میں اسی طرح ہنستی ہوئی آتی ہیں اور ہنستی ہوئی چلی جاتی ہیں اور ہم سے سب کچھ چھین لیتی ہیں۔ ادیب اور شاعر کی شخصیت اور اس کی آوارہ مزاجی سے محبت بھی کرتی ہیں لیکن خارزاروں میں ساتھ نہیں دیتیں۔ کسی آئی سی ایس سے شادی کرنے کے خواب دیکھتی ہیں اور شملہ، سوری یا نینی تال کی کوئی شام انھیں کسی موٹے اور بھدّے سے آئی سی ایس سے وابستہ کر دیتی ہے۔ اور ہماری زندگیوں کی تمام روشنیاں بجھ جاتی ہیں۔ (اس کے جنوں کی داستاں۔ ابوالخیر کشفی)

یار یہ موٹر زن سے ہمارے پاس سے اس طرح گذر جاتی ہے، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم پر طنز کر رہی ہے..... زندگی تو یوں بھی اجیرن ہے کہنے نہ کرنے سے کیا ہوگا۔ اس کی ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ زندگی کو بھلا دیا جائے۔ (مطربِ دلنواز۔ عبادت بریلوی)

شاعر کی دنیا شاعر کی ہستی
یا نالۂ غم یا شورِ مستی

دلّی ایک ہفتہ سے زیادہ قیام نہیں رہ سکا۔ ہوٹل میں ٹھہرنا اور ضروری اور غیر ضروری اخراجات کا بار کب تک برداشت ہو سکتا ایک زمانہ تھا دلّی پر ہم اور خود دلّی ہم پر جان دیتی تھی۔ یاد ش بخیر کیا دن تھے اور آج وہاں ٹھہرنے کی جگہ نہیں۔ اتفاقات ہیں زمانے

کے خبریں بھی ہوا۔

(خط بنام مستقیم)

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے گردشِ جاناں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے، وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

سردار (سردار جعفری) تمہارے بیوی بچے ہیں گھر ہے۔ میرے پاس کیا ہے۔ اب شراب بھی نہیں پینے دیتے۔

(ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ۔ سردار جعفری)

اعتراف

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو
میں نے مانا کہ تم اک پیکرِ رعنائی ہو
چمنِ دہر میں روحِ چمن آرائی ہو
طلعتِ مہر ہو فردوس کی برنائی ہو
بنتِ مہتاب ہو گردوں سے اتر آئی ہو
مجھ سے ملنے میں اب اندیشۂ رسوائی ہے
میں نے خود اپنے کئے کی یہ سزا پائی ہے

خاک میں آہ ملادی ہے جوانی میں نے
شعلہ زاروں میں جلائی ہے جوانی میں نے
شہرِ خوباں میں گنوائی ہے جوانی میں نے
خواب گاہوں میں گنوائی ہے جوانی میں نے
حسن نے جب بھی عنایت کی نظر ڈالی ہے
میرے پیمانِ محبت نے سپر ڈالی ہے

سنگ کو گوہرِ نایاب و گراں جانا تھا
دشتِ پُر خار کو فردوسِ جواں جانا تھا
ریگ کو سلسلۂ آبِ رواں جانا تھا
آہ یہ راز ابھی میں نے کہاں جانا تھا
میری ہر فتح میں ہے ایک ہزیمت پنہاں
ہر مسرت میں ہے رازِ غم و حسرت پنہاں

کیا سنو گی مری مجروح جوانی کی پکار
مری فریادِ جگر دوز مرا نالۂ زار
شدتِ کرب میں ڈوبی ہوئی میری گفتار
میں کہ خود اپنے مذاقِ طرب آگیں کا شکار

وہ گدازِ دلِ مرحوم کہاں سے لاؤں
اب میں وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں

میرے سائے سے ڈرو تم مری قربت سے ڈرو
اپنی جرأت کی قسم اب مری جرأت سے ڈرو
تم لطافت ہو اگر میری لطافت سے ڈرو
میرے وعدوں سے ڈرو میری محبت سے ڈرو

اب میں الطاف و عنایت کا سزاوار نہیں
میں وفادار نہیں ہاں میں وفادار نہیں

آج کل ہم پا بہ زنجیر ہیں قیدی ہیں۔ یہ بھی کیا زندگی ہے۔ (مطربِ دلبراں عبادت بریلوی)

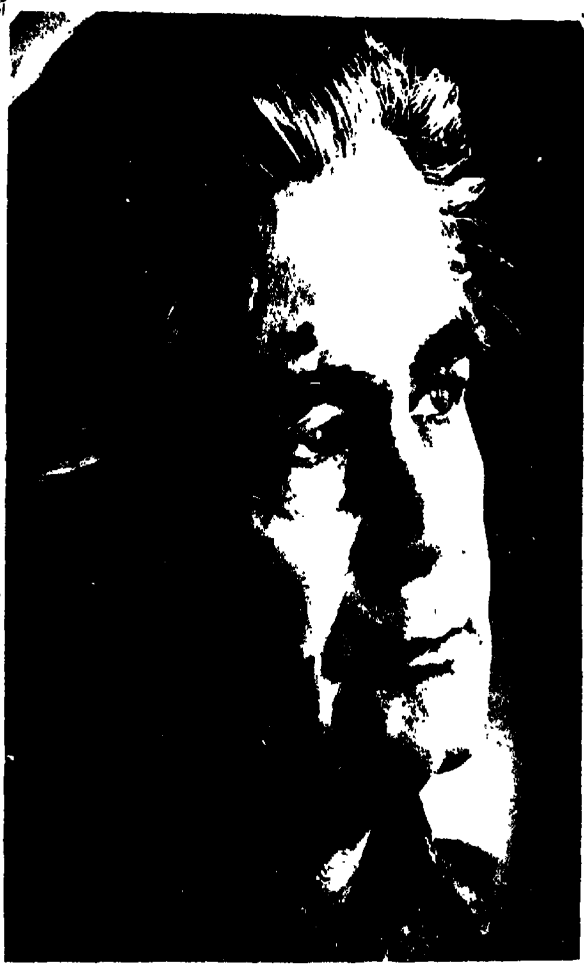
انتقال سے دو روز قبل عصمت چغتائی نے ان سے کہا۔ شاہد لطیف نے لکھنؤ سے چکن کے دو تھان منگائے ہیں اور مجھے بلایا ہے۔ مجاز نے جواب دیا۔ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ گریباں اور چاک گریباں دونوں ساتھ منگائے ہیں۔

لکھنؤ اب کہاں۔ اب یہاں کوئی غزال نہیں سب چلے گئے ...... وقت کاٹتے ہیں .... ہو کا عالم ہے۔ ویرانی ہی ویرانی ہے ..... دل بجھ گیا ہے، کہیں آنے جانے کو جی نہیں چاہتا ...... بس جی رہے ہیں ...

(مطربِ بزمِ دلبراں۔ عبادت بریلوی)

اب اس کے بعد صبح ہے اور صبحِ نو مجاز
ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ

(مرتب: ندا فاضلی)



سردار جعفری

"........ اس سے بھی زیادہ مشکل اس صداقت کا پیش کرنا ہے جس کا تعلق اپنی ذات سے ہو۔ انسان اپنے دل سے جتنے جھوٹ بولتا ہے اتنے جھوٹ دنیا کے سامنے نہیں بولتا اور اپنے جھوٹ کو سچ کی جھلک دینے کے لئے وہ کبھی جادوگری سے کام لیتا ہے اور کبھی فریب کاری سے۔ دنیا سے جھوٹ بولنے کے لئے پہلے اپنے دل سے جھوٹ بولنا ضروری ہے ...."

مجھے انسانی ہاتھ بڑے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی جنبش میں ترنم ہے اور خاموشی میں شاعری۔ ان کی انگلیوں سے تخلیق کی گنگا بہتی ہے۔ یہ وہ فرشتے ہیں جو دل و دماغ کے عرش بریں سے وحی و الہام لے کر کاغذ کی حقیر سطح پر نازل ہوتے ہیں اور اس پر اپنے لافانی نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کاغذوں کو دنیا نظم اور افسانہ، مقالہ اور کتاب کہہ کر آنکھوں سے لگاتی ہے اور ان سے روحانی تسکین حاصل کرتی ہے۔

انسان کے تسلسل میں حیاتیاتی عمل کارفرما ہے جو باپ سے بیٹے کی شکل اختیار کرتا ہے لیکن انسانیت کا تسلسل ہاتھوں کی تخلیق کا رہین منت ہے یہ تخلیق بظاہر بے جان ہوتی ہے لیکن جاندار سے زیادہ جاندار ہوتی ہے۔ ہاتھوں کے بغیر نہ جنگ ممکن ہے نہ امن۔ محبت ممکن ہے نہ نفرت۔ یہی ہاتھ گلے میں حائل ہوتے ہیں اور یہی ایک دوسرے کو چھو کر دل کی دھڑکنیں تیز کر دیتے ہیں۔ سازوں میں سوئے ہوئے نغمے ان ہاتھوں سے ہی بیدار ہوتے ہیں۔ ہم آغوشی کیلئے پہلے یہی آگے بڑھتے ہیں۔ اور رخصت کے وقت یہی سب کے بعد پیچھے ہٹتے ہیں۔ یہ وصال و فراق کی حسین علامتیں ہیں، جس طرح ذہن اپنے آپ کو خیال میں تبدیل کر کے اس کو اپنے وجود سے الگ کر دیتا ہے اور وہ خیال ذہن انسانی سے بھی زیادہ طاقتور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہاتھ اپنے آپ کو قلم اور تلوار، مشین اور اوزار میں تبدیل کر کے انھیں اپنے وجود سے الگ کر دیتے ہیں اور وہ چیزیں ہاتھوں سے بھی زیادہ طاقتور اور خلاق بن جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ قلم کو ہاتھوں کا تقدس، ذہن کی عظمت، اور قلب انسانی کی وسعت سمجھا ہے۔ اور قلم کے بنائے ہوئے ہر نقش کو سجدہ کیا ہے۔ اس لئے جب قلم جھوٹ بولتا ہے یا چوری کرتا ہے تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میرے ہاتھ گندے ہو گئے ہیں۔ میں ہر ادیب سے یہ توقع کرتا ہوں کہ وہ اپنے قلم کا احترام کریگا۔ کیونکہ اس کے نفس کی عزت اور شرافت اسی طرح برقرار رہ سکتی ہے۔

میں اپنے بچپن میں ایک تختی لکھا کرتا تھا جس پر ہزاروں بار نہیں تو سینکڑوں بار اس شعر کی مشق کی ہے۔

قلم گوید کہ من شاہ جہانم
قلم کش را بدولت می رسانم

ممکن ہے کسی کے لئے یہ دولت چاندی سونا ہو، کیونکہ دنیا میں ضمیر فروشوں کی طرح قلم فروشوں کی بھی کمی کبھی نہیں رہی ہے۔ لیکن میرے لئے یہ علم، ہنر، خلوص اور صداقت کی دولت ہے، اور قلم کے احترام کے معنی اس دولت کا احترام ہے اور احترام کا جذبہ ہی بار بار میرے قلم کو روک رہا ہے۔

کیا میرا قلم صداقت کو پیش کر سکے گا؟ صداقت کوئی سپاٹ حقیقت نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا ہیرا ہے جو برابر تراشا جا رہا ہے اور زندگی اور عمل کی جلا اس میں نیا نور اور نیا رنگ پیدا کر رہی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ صداقت بدل

جاتی ہے۔ دراصل اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اچھے شعر اور اعلیٰ فن کی طرح صداقت تہہ دار ہوتی ہے۔ اس لئے کبھی کوئی تنہا انسان، کوئی تنہا قوم، کوئی تنہا نسل، اس کا احاطہ نہیں کر سکتی ہے۔ اور نہ کوئی تنہا نظریہ اس پر حاوی ہو سکتا ہے۔ ناتمامی اس کی خصوصیت رہی ہے، اور اس ناتمامی میں بلا کا حسن ہے۔

اس سے بھی زیادہ مشکل اس صداقت کا پیش کرنا ہے جس کا تعلق اپنی ذات سے ہو۔ انسان اپنے دل سے جتنے جھوٹ بولتا ہے اتنے جھوٹ دنیا کے سامنے نہیں بولتا۔ اور اپنے جھوٹ کو سچ کی جھلک دینے کے لئے وہ کبھی جادوگری سے کام لیتا ہے اور کبھی فریب کاری سے۔ دنیا سے جھوٹ بولنے کے لئے پہلے اپنے دل سے جھوٹ بولنا ضروری ہے۔ اس لئے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے اور بھی ڈرتا ہوں کہ مجھے اپنی زندگی میں کن شخصیات اور واقعات نے متاثر کیا ہے۔

وقت کے ساتھ بنی ہوئی یادوں کے نقوش بدل جاتے ہیں ایک نقش دوسرے نقش میں مل جاتا ہے اور تصویریں مسخ ہو جاتی ہیں۔ تعبیروں کے تپتے ہوئے میدان سے خوابوں کی ٹھنڈی اور سکون بخش چھاؤں دکھائی نہیں دیتی۔ اور ہم اکثر نئے خواب تخلیق کر کے انھیں پرانے خوابوں کا نام دے دیتے ہیں۔ عمر کے چالیس سالوں میں ہزاروں دنوں اور ہزاروں راتوں کی شکلیں پڑی ہیں۔ اور ہر شکل میں لاکھوں لمحے سو رہے ہیں۔ ان کو جگانے کی ہمت کس میں ہے۔ قہقہوں کے مرجھائے ہوئے پھول، آنسوؤں کے بجتے ہوئے موتی، ابروؤں کی ٹوٹی ہوئی کمانیں، رخساروں کی بجھی ہوئی شمعیں، کتابوں کے پھٹے ہوئے ورق، علم، شعور، رشک، حسد، محبت، نفرت، حماقت، رعونت سب ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے ہوئے ہیں۔ آج یہ بتانا مشکل ہے کہ کس نے کیا سکھایا ہے، کس نے کیا اثر ڈالا ہے۔ شعوری اثرات اور غیر شعوری اثرات کے درمیان لکیر کھینچنا مشکل ہے۔

میری یادوں میں ایک کھنڈر ابھر رہا ہے۔

کھنڈر کبھی کسی کھوئی ہوئی عظمت کا پتہ دیتے ہیں اور کبھی کسی عظمت کے بغیر بھی انحطاط کی داستان سناتے ہیں۔ ہر کھنڈر کے لئے قدیم ہونا ضروری نہیں ہے۔ ایسے کھنڈر بھی ملتے ہیں جن کی ہر اینٹ سلامت ہوتی ہے، ہر دروازہ کھلتا ہے، اور ہر دیوار کھڑی ہوتی ہے۔ پھر بھی عمارت کو دیکھ کر اس پر کھنڈر کا گمان گزرتا ہے دیواروں پر بغیر حروف کی ایک کہانی لکھی ہوئی ہے، دروازے بغیر زبان کا ایک افسانہ سنا رہے ہیں اور اردگرد کی ہواؤں سے بوسیدگی کی بو آ رہی ہے۔ میں جس کھنڈر کا ذکر کر رہا ہوں، وہ ایسا ہی ہے، اس کو دیکھتے ہی دل میں ویرانگی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔

بمبئی سے ہزار ڈیڑھ ہزار میل دور شمال میں ہمالیہ کی ترائی کا دامن جہاں سے پہاڑ کی برف پوش چوٹیاں دکھائی دیتی ہیں۔ پندرہ بیس ہزار کی آبادی کا ایک چھوٹا سا قصبہ برام پور ایک تعلقہ داری کی راجدھانی ہے، تعلقہ داری کو ریاست کہتے ہیں، اور تعلقہ دار کو مہاراجہ۔ اس قصبے کی ایک پتلی سی گرد آلود سڑک کے کنارے ایک اصطبل جس میں گھوڑوں کے لئے پچیس تھان ہیں۔ سائیسوں کے لئے دو کوٹھریاں، اور موٹروں اور گاڑیوں کے لئے تین گراج۔ میرے بچپن میں ہر تھان پر گھوڑے تھے، ہر کوٹھری میں سائیس، اور ہر گراج میں موٹر یا بگھی۔ اب ایک گراج میں ایک پرانا تانگا ہے اور دوسرے میں ایک بوسیدہ ٹم ٹم اور دو تھانوں پر دو مریل سے گھوڑے جنہیں دیکھ کر ان کے مالکوں کے بارے میں صحیح رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ اصطبل

کے باقی حصہ میں بینڈی کتے رہتے ہیں محلے کی کتیاں بچے جنتی ہیں اور قصبے بھر کے جانور گرمی، برسات اور جاڑوں کی موتوں سے بچنے کے لئے آکر پناہ لیتے ہیں۔

مصطبہ کے برابر ہاتھی کا کھڑا ہوا تھان ہے جہاں رام پیاری ہتھنی گنے کھایا کرتی تھی جب وہ مری ہے تو اس کی لاش کلہاڑیوں سے کاٹی گئی تھی اور گوشت اور ہڈیاں ٹکڑے ٹکڑے کر کے اٹھائی گئی تھیں، پرانے سماجوں کا جنازہ بھی اسی شان سے نکلتا ہے۔

دریھان کے سامنے جو نیپٹے کے ہرے پتوں اور نیلے پھولوں سے ڈھکا ہوا تالاب ہے اس کا پانی کبھی بڑا صاف شفاف تھا اور اپنی بڑی بڑی رہو مچھلیوں کے لئے مشہور تھا۔ اس کے کنارے امرودوں کا ایک باغ تھا اور ایک بڑی سیٹھ کا بوڑھا اور اس کی سوہ میٹھی امرود بیچا کرتی تھی، پکنے سے پہلے گدر امرود بک جاتے تھے۔ اب باغ اجڑ چکا ہے اور ہاتھی کا تھان کھورے کے نیچے دب گیا ہے۔ اور اکثر سبزی اُگانے کا نئے داریوں کے زرد پھولوں میں دو چار گدھے کھڑے نظر آتے ہیں۔

تھان کے پاس لگا ہوا برگد کا بڑھا درخت اب بھی بچا ہے اور چڑیاں اس کے سرخ رنگ کے پھلوں کو کتر کتر کر زمین پر پھینکتی رہتی ہیں اور اس کی ٹہنیوں پر لال چونچ کے طوطے ٹائیں ٹائیں کرتے رہتے ہیں۔ پریاں برگد کے پھول اب بھی چرانے جاتی ہیں، لیکن اب اس بات میں کوئی رومانی کیفیت باقی نہیں ہے۔ اس خیال پر کوئی حیرت کا لطف نہیں ہے۔ میں اپنے بچپن میں جب کبھی ان پریوں کا تصور کرتا تھا تو میری بڑی آپا اور اماں کے چہرے مسکرانے لگتے تھے اور میں اس بات کا کوئی جواب نہیں سوچ پاتا تھا کہ وہ برگد کے پھول کیوں چرا لے جاتی ہیں۔ میری اماں اور بڑی آپا اب منوں خاک کے نیچے سو رہی ہیں اور برگد کے پیڑ کی موٹی موٹی لمبی لمبی جٹائیں زمین میں اپنے لئے جڑیں تلاش کرنے شاخوں سے نیچے اتر آئی ہیں، بچپن کی پریاں کھو گئیں۔ اور جن شاخوں سے پھولوں کا تصور وابستہ تھا وہ ہیبت ناک ہو گئی ہیں۔

سڑک کی دوسری طرف سرخ اینٹوں کی قدآدم دیوار کا ایک چوکور احاطہ ہے، اس کے دو کونوں پر لوہے کے پھاٹک لگے ہوئے ہیں جن کو کبھی سرخ بجری کی لہرائی ہوئی روش نے ایک دوسرے سے جوڑ رکھا تھا، اب جوڑوں میں اتنا زنگ لگ چکا ہے کہ پھاٹکوں کا بند کرنا مشکل ہے۔ احاطے کے اندر ایک ٹینس کورٹ تھا اور اس کے چاروں طرف ہری ہری [illegible] بھی ہوئی تھی، عشق پیچاں کی بیلیں باریک تاروں پر پھیلی ہوئی تھیں۔ گلاب، بیلے اور چمپا کے پودے لگے ہوئے تھے اور مہندی کی باڑھ کھڑی تھی، جو بجری کی لال روش کے کنارے دوڑتی تھی۔ دو کونوں پر گل مہر کے دو پیڑ تھے جو اپنے پھولوں سے لد کر لال بھبوکا ہو جاتے تھے۔ ان سب کی حفاظت کے لئے دو مالی تھے۔ جو ذرا سی کوتاہی پر پیٹ دیئے جاتے تھے، اگر غلطی سے اس باغ میں کوئی گائے، بیل گھس آئے تو اسے پکڑ کر میونسپلٹی کے کانجی ہاؤس میں [illegible] کر دیا جاتا تھا اور مالیوں پر اتنی گالیاں پڑتی تھیں کہ خدا کی پناہ۔ میں نے اپنے بچپن میں اس باغ سے بے شمار تتلیاں پکڑی ہیں اور گل مہر کی ہری ہری کلیوں سے فالیں نکالی ہیں۔

اب مہندی کی باڑھ، گلاب، بیلے اور چمپا کے پودے، عشق پیچاں کی سرخ پھولوں سے بھری ہوئی سبز بیلیں اور

ہری ہری دوب سب سوکھ چکی ہے، باغ ایک میدان میں تبدیل ہو چکا ہے اور اب سانڈ وہاں آپس میں لڑتے ہیں اور گدھے رینکتے ہیں۔ اور کھجلیے کتے اپنی پچھلی ٹانگوں میں اپنی دم دبائے ہوئے ٹہلتے رہتے ہیں۔ گل مہر کے پیڑ اب بھی ہیں لیکن وہ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ اور ان میں پھول نہیں آتے۔ کبھی کبھی کوئی بھولی بھٹکی کلی جھانکتی ہے، ورنہ بس شاخوں کے سوکھے ہوئے ہاتھ ہوا میں پھیلے ہوئے ہیں ۔۔۔۔ بھوکے بھکاریوں کے ہاتھوں کی طرح جنہیں کوئی بھیک نہیں دیتا۔ یہ خشک ہاتھ ٹھنڈی اور گرم ہواؤں سے خشک اور تر موسموں سے اپنی پتیوں اور پھولوں کی بھیک مانگتے مانگتے تھک جائیں گے اور پھر ایک ایک کرکے گرتے جائیں گے۔ انہوں نے شکست کھا جانے کے بعد بھی اب تک شکست کا اعتراف نہیں کیا .... انھیں یہ خبر نہیں کہ جب جڑیں سوکھ جاتی ہیں تو شاخوں میں برگ و بار نہیں آتے۔ موسم بہار بھی ان کے لئے بہار کا پیغام نہیں لائے گا یہی ضد سماجی نظاموں میں تشدد کی پرورش کرتی ہے۔

احاطے کے اندر بجری کی لال روش کے موڑ پر ایک اور بڑا پھاٹک ہے اس کی محراب اتنی بلند ہے کہ اس کے نیچے سے ہاتھی گذر سکتا ہے۔ اس کے اندر اینٹوں کا بنا ہوا ایک بڑا صحن ہے۔ اور بیچ میں ایک چبوترے پر اس قصبے کا سب سے اونچا نیم کا درخت کھڑا ہوا ہے، اس کی عمر کوئی سو برس کے قریب ہوگی۔ اس کا سایہ اب بھی ٹھنڈا اور صحت بخش ہے لیکن پھنگیوں پر چیلوں اور کوؤں نے گھونسلے بنا لئے ہیں اور ان کی بیٹ نیم کے نیچے کسی کو نہیں بیٹھنے دیتی، پکی ہوئی خوشبودار نبولیاں سال میں ایک بار ٹپکتی ہیں۔ نیم کی ہری پتیاں سنہری ہو کر سال میں ایک بار ہواؤں میں اپنا سونا بکھیرتی ہیں، لیکن چیلوں اور کوؤں کی بیٹ بارہ مہینے ٹپکتی رہتی ہے۔

اس کے چاروں طرف کئی مکانات ہیں۔ ہر مکان میں ایک گھرانہ آباد تھا۔ انھیں میں ایک میرا گھر بھی تھا۔ بڑے سے صحن، وسیع دالان اور کوٹھے کی دو کھلی ہوئی چھتوں کا گھر، اس کی پورب کی دیوار کی طرف سے ایک مندر کا خوب صورت کلس اور شیشم کا ایک بلند قامت درخت اندر جھانکتا تھا۔ اور پیڑ کے پیچھے سے صبح کا سورج اور چودھویں کا چاند نکلتا تھا۔ گرمیوں کی راتوں میں جب پلنگ بچھ جاتے تھے تو یہ آنگن چھوٹا معلوم ہوتا تھا۔ اور جاڑوں کی راتوں میں اتنا لمبا کہ میں اکثر دوڑ کر اس آنگن سے گذرا کرتا تھا۔ اسی آنگن میں میں نے پہلی بار اپنی رگوں میں جوانی کا خون محسوس کیا۔ گرمیوں کی ایک تپتی ہوئی دوپہر میں دیوار کے سائے کے نیچے ایک چارپائی پر اس کا پسینے سے بھیگا ہوا چہرہ کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ وہ غافل سو رہی تھی۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے اس سے زیادہ حسین چیز نہیں دیکھی ہے۔ وہ چہرہ آج نظروں سے اوجھل ہو کر اور زیادہ خوبصورت ہو گیا ہے۔

اس سارے ساز و سامان میں جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے ہمارے چھوٹے سے گھر کے سوا اپنا اور کچھ نہیں تھا۔ ہر چیز ریاست کی تھی جو میرے والد اور چچا کو ملازمت کے سلسلے میں استعمال کے لئے ملی تھی۔ میرے چچا بڑے عہدے پر تھے اور والد چھوٹے عہدے پر، لیکن رعب پورے خاندان کا تھا۔ چچا سید صاحب کہلاتے تھے اور والد بڑے بھیا کے نام سے مشہور تھے۔ میری ماں کو سارا قصبہ بڑی بہو کہتا تھا۔

خاندان میں بڑا اطمینان تھا۔ بلرام پور سے باہر کی دنیا ہمارے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ یہیں بچے پیدا ہوتے تھے، جوان ہوتے تھے، بلرام پور کے اسکول کے بعد علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور پھر شادی ہو جاتی تھی اور ریاست میں

ملازمت مل جاتی تھی۔

خاندان کی چھوٹی چھوٹی لڑائیاں کبھی کبھی ہوتی تھیں، ورنہ دن ہنسی خوشی گزر جاتا تھا اور رات کو سب بہن بھائی بستروں پر لیٹ جاتے تھے۔ کوئی ایک بہن شرلاک ہومز کی کہانیاں، راشد الخیری کے ناول یا عظیم بیگ چغتائی کی کوئی کتاب پڑھ کر سناتی۔ اس سے تھک جانے کے بعد جناتوں کے قصے شروع ہوتے جو انتہائی دلچسپ ہونے کے بعد بھی دل میں دہشت پیدا کر دیتے۔ میری ایک پھوپھی کو اصرار تھا کہ گھر میں جو کالا کتا آتا ہے وہ جن ہے اور اُسے انھوں نے بلی اور گدھے میں تبدیل ہوتے دیکھا ہے۔

یہ بڑا ایمان دار، مذہب کا پابند اور پرہیزگار خاندان تھا۔ اسی لئے مجھے چھوٹی عمر میں سلطان المدارس لکھنؤ میں داخل کر دیا گیا کہ مولوی بن جاؤں گا تو خاندان کی عاقبت سُدھر جائے گی۔ لیکن طبیعت کی آزادہ روی نے اس سعادت سے محروم کر دیا اور میں لکھنؤ سے تین بار بھاگا۔ میرے دادا اور چچا نے کبھی رشوت نہیں لی۔ اور دولت مندی کی شہرت کے باوجود صبر و قناعت کے ساتھ زندگی گزار دی۔ میری ماں کے سارے زیور بک گئے، لیکن کسی کو کانوں کان یہ خبر نہ ہوئی کہ گھر میں افلاس ہے۔ وہ بڑے خلوص سے ملازمت کرتے تھے اور ہر موقع پر نمک حلال ہونے کا ثبوت دیتے تھے۔ عام طور سے کالی ٹوپیاں پہنتے تھے جو نہ جانے کیوں ایرانی ٹوپیاں کہلاتی تھیں لیکن دسہرے کے موقع پر جو ریاست میں بڑی دھوم سے منایا جاتا تھا رنگین صافے باندھ کر جلوس کے ہاتھیوں پر بیٹھتے تھے اور مہاراج اور مہارانی کو نذر دینے جاتے تھے۔ عید، بقر عید، ۱۳ رجب اور عید غدیر بڑی شان سے مناتے تھے اور دیوالی پر ریاست کے دیئے ہوئے تیل کے دیوں سے گھر کی دیواریں سجاتے تھے۔ ریاست کے کام کے علاوہ ہمارے خاندان کو اخراجات کے لئے سو گاؤں ٹھیکے پر ملے تھے ان کا انتظام کرتے تھے، اور سال بھر نمازیں پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے۔ شعبان کے مہینے میں بارھویں امام کا یوم ولادت مناتے اور عریضے ڈالنے جاتے تھے۔ اور محرم بڑے جوش و خروش سے مناتے تھے۔ اپنے انتقال سے کچھ پہلے جب میرے والد بستر سے اُٹھنے کے قابل نہیں تھے۔ تو ان کی چارپائی محرم کی مجلسوں کے لئے عزا خانے میں لا کر رکھ دی جاتی تھی اور وہ لیٹے لیٹے مجلس سنتے تھے۔

چاند رات کو عورتیں چوڑیاں توڑ دیتی تھیں۔ اور زیور اتار کر رکھ دیتی تھیں اور سب لوگ کالے کپڑے پہن لیتے تھے۔ اور باہر کوٹھی کے سب سے بڑے کمرے میں ضریح رکھی جاتی تھی اور علم کھڑے کئے جاتے تھے۔ چھتوں میں جھاڑ فانوس لگائے جاتے تھے، چاندی اور سونے کے علم کے نیچے اور سنہری کام کے سبز، زرد، سرخ اور سیندوری پٹکے مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ محرم کی ساتویں تاریخ کو مہندی اُٹھتی تھی۔ اور مجھے علی بند پہنایا جاتا تھا۔ آٹھویں کو حضرت عباسؑ کا علم نکلتا تھا اور شب عاشور عزا خانہ سجا دیا جاتا تھا۔ اور فانوس جگمگا اُٹھتے تھے۔ قصبے اور گرد و نواح کے گاؤں کے لوگ زیارت کرنے کے لئے ٹوٹ پڑتے تھے۔ عورتیں ٹولیاں بنا کر دیہاتی مرثیے گاتی ہوئی آتی تھیں، اور حضرت صغریٰ کے قاصد کے نام پر جوان لڑکے پیک بن کر آتے تھے۔ ان کی کمر میں ایک پٹکے کے ساتھ ایک گھنٹا بندھا ہوتا تھا۔ سر پر پگڑیوں میں مور کے پر لگے ہوتے تھے اور ہاتھوں میں مورچھل رہتے تھے۔ پیکوں کی ٹولیاں اپنے گھنٹے بجاتی ہوئی آتیں اور عزا خانے میں مرثیے گا گا کر ناچتی تھیں۔ اُن کے قدم "حامی اللہ" کے بول پر اُٹھتے تھے۔ دس دن مسلسل مجلسیں ہوتی تھیں اور پڑھنے کے لئے لکھنؤ سے ذاکر آتے تھے، عشرے کے دن سارے قصبے کی فاقہ کشائی ہمارے گھر ہوتی تھی۔

سال کے دوسرے مہینوں میں بھی مجلسیں اور محفلیں ہوتی تھیں جن کی بدولت میں نے اس عہد کے تمام بڑے ذاکروں کو سنا ہے اور تمام بڑے علماء و مجتہدین کے ہاتھوں کو بوسے دیئے ہیں۔ مولانا سبط حسن کی خطابت بے پناہ تھی۔ فصاحت اور بلاغت کا دریا موجیں مارتا تھا۔ اور شاعروں اور کنایوں کا تیکھا پن تڑپا دیتا تھا۔ دولھا صاحب کو میں نے اس عالم میں دیکھا کہ وہ منبر کے نیچے تقریباً دوہرے ہو کر بیٹھے تھے، دو آدمیوں نے سہارا دے کر منبر پر بٹھا دیا۔ مرثیہ انھوں نے ہاتھ میں لیا۔ ایک بار سنبھلے اور پڑھنا شروع کیا تو دوسری ذاتِ چیز ہو گئے۔

نام مردوں کا رقم بازو پہ تلوار کی ہے

اس کے علاوہ انیس کے مرثیوں کا چرچا بھی تھا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ کلمہ اور تکبیر کے بعد شاید میرے کانوں نے پہلی آواز انیس کی سنی ہے۔ میں شاید پانچ چھ برس کی عمر سے منبر پر بیٹھ کر سلام اور مرثیے پڑھنے لگا تھا۔ سلام اور مرثیوں کے علاوہ ویسے بھی مجھے بے شمار اشعار یاد تھے۔

شاید اسی کا اثر تھا کہ میں نے پندرہ سولہ برس کی عمر میں خود مرثیے کہنے شروع کر دیئے تھے۔ اور مرثیوں کا اثر آج بھی میری شاعری پر باقی ہے۔ ان کی زبان، تشبیہ، استعارے ترتیب ہر چیز انیس کی تھی۔ میرا اپنا کچھ نہیں تھا۔ میں ساٹھ ساٹھ، ستر ستر بند لکھ جاتا تھا لیکن مرثیہ ختم نہیں کر پاتا تھا۔ ویسے مجلس میں پڑھنے کے لئے یہ بند کافی تھے۔

جب میں نے پہلا مرثیہ کہا ؎

آتا ہے کون شمعِ امامت لئے ہوئے
اپنی جلو میں فوجِ صداقت لئے ہوئے

— — — — —

اللہ رے حُسن فاطمہ کے ماہتاب کا
ذرّوں میں چھپتا پھرتا ہے نور آفتاب کا

اور یہ منبر پر بیٹھ کر پڑھا تو والد اور چچا نے بہت گلے لگایا اور ماں نے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں۔ میرے چچا بار بار مرثیے کے آخری دو مصرعوں کو پڑھتے تھے اور روتے تھے۔

اکبر کو اپنے پہلوئے غم میں سُلاؤں گی
اصغر کو اپنی گود میں جھولا جھلاؤں گی۔

اس کامیابی سے ہمت بہت بڑھی اور میں نے پندرہ بیس دن میں ایک مرثیہ اور کہہ لیا ـــــ وہ اس طرح شروع ہوتا تھا ؎

آتا ہے ابنِ فاتحِ خیبر جلال میں
ہلچل ہے شرق و غرب و جنوب و شمال میں

اک تہلکہ ہے وادی و دشت و جبال میں
بھاگا ہے آفتاب بھی برج زوال میں
کروٹ بدل رہی ہے زمین درد و کرب سے
ہلتا ہے دشت گھوڑے کی ٹاپوں کی ضرب سے

مجھے اب تک یاد ہے کہ آخری مصرعے کے قافیے کی بہت داد ملی لیکن کچھ لوگوں کو یہ بھی کہتے سنا کہ میں کسی سے لکھوا کر پڑھ دیتا ہوں۔ یہ بات مجھے بہت ناگوار گزری کہ میں نے نیا مرثیہ ان مصرعوں سے شروع کیا ؎

اے بلبلِ ریاضِ بیاں نغمہ بار ہو
اے نو عروسِ طبعِ جواں ہم کنار ہو
اے خامۂ شگفتہ زباں لالہ کار ہو
اے حاسدِ دریدہ دہاں شرمسار ہو

کیا اس میں تجھ سے ہیچمداں کا قصور ہے
یہ تو عطائے رحمتِ ربِ غفور ہے

اس میں میں نے یہ بھی لکھا تھا:

اک خوشہ چین ہوں باغِ جنابِ انیس کا

پھر ایک اور مرثیہ کہا جس کے صرف دو مصرعے یاد رہ گئے ہیں ؎

عرش تک اوس کے قطروں کی چمک جانے لگی
چلی ٹھنڈی جو ہوا تاروں کو نیند آنے لگی

یہ مرثیے اب تک بلرام پور میں محفوظ ہیں۔ اور محرم کی مجلسوں میں پڑھے جاتے ہیں۔

کربلا کے قافلے میں مجھے امام حسینؑ کے بعد سب سے زیادہ عقیدت حضرت عباسؑ اور حضرت زینبؑ سے تھی، اور انیس کے مرثیوں نے اس عقیدت پر جلا کر دی تھی۔

میرے والد کے پاس مذہبی کتابوں کا اچھا ذخیرہ تھا۔ قرآن بچپن میں بہار کے ایک مولوی صاحب سے پڑھا تھا۔ وہ دن میں بید دوں سے مارتے تھے، اور رات میں پیغمبروں کی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ والد کی کتابوں سے میں نے تمام پیغمبروں اور چودہ معصومین کے حالات پڑھ لئے تھے۔ اور چونکہ میں اس عمر میں مرثیہ خوانی کے علاوہ حدیث خوانی بھی کرنے لگا تھا اس لئے وہ حالات اور قرآن کی بہت سی آیتیں زبانی یاد تھیں۔ اور ان سب کا مجموعی اثر مجھ پر یہ تھا کہ حق اور صداقت کے لئے جان کی بازی لگا دینا انسانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ میں نے حق اور صداقت کو ہمیشہ زمین کی چیز سمجھا۔ نمرود و خلیل کی داستان سے لے کر شہادتِ حسین تک کے واقعات نے میرے خون میں حرارت پیدا کر دی تھی اور میں اقبال کے یہ اشعار لہک لہک کر

پڑھا کرتا تھا۔

آن امامِ عاشقان پورِ بتول
سروِ آزادے ز بستانِ رسولؐ
اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر
معنیِ ذبحٍ عظیم آمد پسر
دشمنان چون ریگِ صحرا لاتعداد
دوستان بالفظِ یزدان ہم عدد
رمزِ قرآن از حسینؓ آموختیم
ز آتشِ او شعلہ ہا اندوختیم
این دو قوت از حیات آمد پدید
موسیٰؑ و فرعون و شبیرؓ و یزید
شوکتِ شام و فرِ بغداد رفت
سطوتِ غرناطہ ہم از یاد رفت
تارِ ما از زخمہ اش لرزان ہنوز
تازہ از تکبیر او ایمان ہنوز

اس زمانے میں چند سوالات نے مجھے بے چین کیا اور چند واقعات نے میری زندگی میں بہت بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔ مجھے اس سوال نے کبھی پریشان نہیں کیا کہ یہ دنیا کیوں ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ لیکن اس سوال نے ہمیشہ بے چین رکھا کہ یہ دنیا ایسی کیوں ہے۔ اور اس کی ابتدا میرے بچپن ہی میں ہو گئی تھی۔

میں نے ایشیائی افلاس کے بدترین نمونے دیکھے ہیں، ریاست کے گاؤں میں پہلے اور اپنے گھر میں بعد کو۔ مجھے شکار اور گھوڑے کی سواری کا بے انتہا شوق تھا اور میں بندوق لئے گاؤں گاؤں اور جنگل جنگل مارا پھرتا تھا اور ریاست کی تحصیلوں اور ذیلداریوں میں ٹھہرتا تھا اس طرح میں اودھ کے دیہات کی زندگی سے آشنا ہوا۔ یہ خوبصورت گیتوں، دھان اور گیہوں کے کھیتوں اور انتہائی افلاس کی سرزمین ہے۔ اس میں اتنی پگڈنڈیاں نہیں ہوں گی جتنے خون کے دھارے اس کے جسم میں جذب ہو چکے ہیں۔ میری یاد میں اس کی انتہائی بھیانک تصویریں محفوظ ہیں، گرمیوں کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں جھکے ہوئے کسان جن کی پیٹھوں پر اینٹیں لدی ہوئی ہیں، اُن کے جوتے مارے جا رہے ہیں، اور وہ دہائیاں دے رہے ہیں، پیڑوں کی شاخوں میں بالوں سے لٹکی ہوئی عورتیں، پتلی پتلی سوکھی ہوئی ٹانگوں اور باہر نکلے ہوئے پیٹوں کے بچے۔ بڑی بڑی سیاہ مگر بجھی ہوئی آنکھیں، ایک بار میرے سامنے ایک کسان عورت ننگی کر دی گئی۔ یہ اور اس قسم کی بے شمار تصویریں ہیں جو اگر کوئی مصور پردے پر بنا دے تو

دُنیا چیخ اُٹھے۔ ان دیہاتوں میں جاکر مجھے پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ لاکھوں آدمی چوبیس گھنٹے میں صرف ایک بار کھانا کھاتے ہیں۔

اودھ کی دوسری تعلقہ داریوں کی طرح بلرام پور میں بھی ہرواہی کا رواج تھا۔ خود ہمارے گاؤں میں ہرواہے اور ہرواہیاں تھیں۔ ان کے پاس اپنی زمین اور اپنا گھر نہیں ہوتا تھا۔ یہ زمینداروں اور ٹھیکیداروں کے کھیتوں پر کام کرتے تھے اور فصل کٹنے کے بعد سوکھے اناج کی شکل میں ان کو مزدوری دی جاتی تھی جس سے ان کا پیٹ نہیں بھرتا تھا۔ اور یہ قرض لینے پر مجبور ہوتے تھے جسے نہ وہ خود زندگی بھر ادا کر سکتے تھے نہ ان کی آنے والی نسلیں، اس لئے ان کی نسلوں کی نسلیں زمینداروں اور ٹھیکیداروں کے کھیتوں کے ساتھ بندھی ہوتی تھیں۔ وہ ایک طرح کے نیم غلام تھے۔ اور ان کی جان اور مال اور عزت و آبرو پر زمینداروں کا پورا پورا حق تھا۔ ان سے زیادہ تباہ حال مخلوق میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ یہ مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ اس ہرواہی کے عذاب سے بچنے کے لئے یہ لوگ بمبئی اور کلکتہ کے شہروں کی طرف بھاگتے ہیں۔ کیونکہ اودھ کے کسی ضلع یا گاؤں میں ان کے لئے پناہ لینا ناممکن تھا۔ قدیم عہد کے غلاموں کی طرح یہ اپنے مالک کی ملکیت تھے اور دوسرا مالک انھیں زبردستی پکڑ کر واپس کر دیتا تھا۔

ایک بار ایک ہرواہی ہمارے گھر میں اناج صاف کرنے آئی تھی، وہ چاول صاف کرتی جاتی تھی اور ایک مٹھی کچے چاول اپنے مُنہ میں ڈال لیتی تھی، یکایک میرے بہنوئی کی نظر پڑ گئی۔ انہوں نے ڈانٹ کر پوچھا کہ مُنہ میں کیا ہے، ہرواہی گھبرا کر جلدی جلدی کچے چاول چبانے لگی۔ میرے بہنوئی نے لپک کر اس کے منہ پر ایک گھونسہ مارا۔ ہرواہی نے خون کی ایک کلی کے ساتھ کچے چاول تھوک دیئے، وہ غریب کئی دن کی بھوکی تھی۔

افلاس کچھ مضحکہ خیز تصویریں بھی بناتا ہے۔ لیکن وہ حقیقتاً بڑی دردناک ہوتی ہیں۔ مجھے اپنے اسکول ماسٹروں کی یاد اسی طرح آتی ہے۔ اُن میں ایک منشی بدری پرشاد چھوٹے سے قد کے بوڑھے آدمی تھے۔ دھوتی باندھتے تھے اور ایک میلا سا کوٹ پہنے رہتے تھے۔ مشین سے کٹے ہوئے خشخاشی بالوں کے سر پر نیلے کی کالے رنگ کی میلی چیکٹ ٹوپی چھوٹے سے تنگ ماتھے پر جھکی رہتی تھی۔ گردن کوتاہ تھی اور کندھے اوپر کو اُٹھے رہتے تھے۔ اور وہ چلتے بھی تھے ذرا جھک کے، تیسرے سے چھٹے درجے تک حساب پڑھاتے تھے۔ اور بیچ بیچ میں کھنکارتے جاتے تھے۔ منشی جی اپنی چھوٹی سی پرانے فریم کی عینک لگا کر حاضری لیتے اور پھر پڑھانے کھڑے ہو جاتے۔ پھر سوال پوچھتے۔ جو بچہ سوال کا ٹھیک جواب نہ دے پاتا اس کی شامت آ جاتی۔ تین چار بید مارنے کے بعد منشی جی کھنکارتے، اور طالب علم کے دماغ کو کمزور قرار دے کر اسے تیل لگانے کی ہدایت دیتے۔ تاکہ دماغ روشن ہو جائے اور حافظہ تیز ہو جائے، اور حساب سیکھنے میں کوئی مشکل نہ پیش آئے یہ کہتے کہتے وہ جیب سے تیل کی شیشی نکال لیتے اور طالب علم کے ہاتھ بیچ دیتے معلوم نہیں وہ یہ تیل خود بناتے تھے یا خرید کر لاتے تھے۔ ایک بار میں نے بھی اُن کا تیل خریدا اور اس یقین کے ساتھ سر میں لگا لیا کہ اس کی ہر بوند سے دماغ اس طرح روشن ہو جائے گا جیسے مٹی کے تیل سے لالٹین جل اٹھتی ہے۔ لیکن صبح روشن دماغی کے سلسلے میں اپنی ماں کا یہ فقرہ سُنا کہ چھچھوندر کی بُو کہاں سے آ رہی ہے۔

آج منشی بدری پرشاد کا خیال آتا ہے تو مجھے اُن پر بے انتہا پیار آنے لگتا ہے۔ حالانکہ بچپن میں اُن کے بید کھا کر میں نے بھی دوسرے لڑکوں کی طرح درختوں کے پیچھے چھپ کر اُن پر آوازیں لگائی ہیں، لیکن منشی جی نے کبھی لڑکوں کے نعروں پر مُڑ کر نہیں دیکھا۔

گردن جھکائے آتے تھے اور گردن جھکائے چلے جاتے تھے۔ میں کبھی اُن کے گھر نہیں گیا۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کی زندگی میں کیسی کیسی ناکامیاں اور حسرتیں تھیں۔ شاید خواہشوں کا گلا وہ بہت پہلے گھونٹ چکے ہوں گے اور تیل صرف اس لئے بیچتے ہوں گے کہ اُن کی قلیل سی تنخواہ ان کے لئے ناکافی ہوگی اور ان کی دال گھی سے محروم رہتی ہوگی۔ اب اگر مجھے منشی بدری پرشاد مل جائیں تو میں اُن کے پیر چھو کر اپنی گستاخیوں کی معافی مانگوں، جن کا غالباً انھیں علم بھی نہ ہوگا۔ اور ان کی تیل کی شیشیاں خریدنے کے لئے تمام عمر اُن سے بید کھاتا رہوں اور اُف بھی نہ کروں۔

ایک میرخی چودھری جی تھے جن کے ہاتھ پیر کو لقوے نے بے کار کر دیا تھا۔ لوگ انھیں چوتی جیت کہہ کر چڑھاتے تھے۔ اُن کا مُنہ کالا کر کے انھیں گدھے پر بٹھایا گیا اور ایک بوڑھی مہترانی سے اُن کی فرضی شادی رچا دی گئی، اور یہ سب صرف اس جرم میں کہ وہ بے بس اور اپاہج تھے۔ اور بھی بہت سے ایسے ہی کردار تھے، سب ٹوٹے پھوٹے چہروں کے لوگ لیکن دکھی دلوں کے مالک۔

میں سوچتا تھا یہ مخلوق کہاں سے آئی ہے۔ یہ مظالم کیوں ہو رہے ہیں، ان پر کوئی احتجاج کیوں نہیں کرتا۔ میرا خاندان اس پر قانع تھا، سب کچھ خدا کی دین ہے۔ امیر اور غریب ہمیشہ سے ہیں۔ ظلم و استبداد ہمیشہ سے ہے۔

اسی زمانے میں مجھے پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ اسلام میں زمین کی ملکیت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اور میں نے پہلی بار اپنے والد اور چچا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور مجھے پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ سماجی زندگی اور ذاتی عقائد کی زندگی کے درمیان ایک اونچی دیوار ہے اور جو سوالات مجھے پریشان کر رہے ہیں وہ دوسروں کو پریشان نہیں کرتے۔ میں نے قرآن اور حدیث کی مدد سے استدلال کرنے کی کوشش کی۔ "خدا کے دیئے ہوئے رزق سے کھاؤ پیو اور زمین پر فتنہ و فساد برپا نہ کرو۔" اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ فتنہ و فساد برپا کرنے والے صاحبانِ اقتدار ہیں، جن کے ملازم میرے والد اور چچا ہیں۔ جنھیں اس کا اندازہ نہیں کہ وہ خود کتنے پسے اور دبے ہوئے ہیں۔ لیکن عام تصور یہ تھا کہ فتنہ و فساد کے ذمہ دار کسان ہیں اگر وہ بیگار سے انکار نہ کریں اور لگان ادا کر دیں اور موٹا جھوٹا پہن کر اور آدھے پیٹ کھا کر خدا کا شکر کیا کریں تو کوئی ہنگامہ نہیں ہوگا۔

مجھے سنہ یاد نہیں ہے لیکن ایک مرتبہ یہ ہوا کہ ایک گاؤں کے کسانوں نے بغاوت کر دی۔ ریاست کی فوج نے جواب میں سارے گاؤں میں آگ لگا دی اور کسان عورتوں کو بے عزت کیا۔ اس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ اخباروں میں خبریں چھپیں۔ انڈین کانگریس کی طرف سے پنڈت جواہر لال نہرو اس معاملہ کی تحقیقات کرنے آئے۔ ریاست کے عملے نے ان کو گاؤں تک جانے سے روک دیا۔ اور راستے کی کچی سڑک میں جا بجا گڑھے کھود دیئے گئے تاکہ پنڈت نہرو کی کار وہاں تک نہ پہنچ سکے۔

غالباً عیدِ غدیر کا دن تھا یا یوں ہی ہمارے گھر میں کوئی محفل تھی۔ میں اس محفل میں قصیدہ پڑھنے کے بجائے اس عام جلسے میں چلا گیا جہاں پنڈت نہرو نے جاگیرداری ظلم و استبداد کے خلاف تقریر کی۔ جلسے کے بعد میں واپس آیا تو گھر کے لوگ مجھ سے خفا تھے۔ اور میں ساری کائنات سے بیزار۔ ظلم اور افلاس کے سماجی اسباب کے پہلے علم نے میرے دل میں چراغ جلا دیئے تھے۔

اسی زمانے میں میں نے دو نہایت اہم کتابیں پڑھیں جنھوں نے میری زندگی بالکل پلٹ کر رکھ دی۔ ایک مہاتما گاندھی کی کتاب "تلاشِ حق" اور دوسری پلوٹارک کی کتاب "مشاہیرِ یونان و روما"۔ گاندھی جی کی کتاب میں پوری طرح نہ سمجھ سکا، اس لئے کہ وہ انگریزی

میں تھی اور میری انگریزی کی استعداد اتنی نہیں تھی۔ کتاب میرے چچا کی تھی جنہوں نے خود اسے بڑے شوق سے پڑھا تھا لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان سے اس کے مطالب دریافت کروں۔ خود ہی اس کی سیاہ چھپی ہوئی سطروں میں نور اور روشنی کی جستجو کرتا رہا۔ پیز نارک کی کتاب انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے چھپی تھی اور غالباً اس کا اردو ترجمہ ہاشمی فرید آبادی نے کیا تھا۔ اس کا اثر زیادہ گہرا پڑا کیونکہ میں اسے آسانی سے سمجھ سکتا تھا۔ خاص طور سے [illegible] نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ اب یہ بتانا مشکل ہے کہ اس کی کون سی ادا مجھے بھائی تھی۔

لیکن ان کتابوں نے میرے سوالات حل کرنے کے بجائے میرے دل میں اور آگ لگا دی۔ اس آگ کو کون بجھائے، نہ گھر میں کوئی میرا جواب دینے والا ہے اور نہ اسکول میں۔ نہ کتابیں نہ رسالے نہ اخبار۔ میرے دادا اور چچا مجھ سے بہت محبت کرتے تھے، اس لئے ان کو میرے سوالات دیوانگی معلوم ہوتے تھے۔ ان کی شفقت میرے دل کی آگ کو نہیں بجھا سکی۔ ایک واقعے نے اس آگ کو اور بھڑکا دیا۔ ایک اور گاؤں میں بغاوت ہوگئی اور کسانوں نے ریاست کے تحصیلدار کو جان سے مار دیا۔ میرے بہنوئی جو نائب تحصیلدار تھے بہ مشکل اپنی جان بچا کر بھاگ آئے۔ سب کی ہمدردیاں میرے بہنوئی اور مرے ہوئے تحصیلدار کے ساتھ تھیں میری ہمدردیاں کسانوں کے ساتھ۔

اب مجھے ہر اس چیز سے نفرت ہوگئی جس سے امارت کی ذرا سی بھی بو آتی ہو۔ میرا ردِ عمل صرف جذباتی تھا اور عقل کو جذبات کی تنظیم کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ اس عالم میں میں نے ایک نظم کہی کہ خدا نہ تو غرناطہ و بغداد کے ایوانوں میں ہے نہ امیروں کے محلوں میں، خدا جو کی روٹی میں ہے، بیوہ عورتوں کی چادر میں ہے، اور کربلا میں ٹپکنے والی حسین ابن علی کی تلوار میں۔ اب اس کا ایک مصرع بھی یاد نہیں ہے۔ لیکن یہ نظم میں نے کئی مجلسوں میں پڑھی اور اس کی داد بھی ملی۔ اور تو کسی نے اس نظم کو نہیں سمجھا لیکن والد اور چچا کے ملنے والے ایک گورنمنٹ کے تحصیلدار التجا حسین صاحب تھے، وہ مجھے بہت پیار کرتے تھے، ان کے کان کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے نظم کی تعریف کی اور پھر مجھ سے پوچھا "تم خدا کو مانتے ہو؟" وہ مجھے اس طرف لے جانا چاہتے تھے کہ امیر و غریب سب خدا کے بنائے ہوئے ہیں، لیکن گفتگو میں بات یہاں آ پہونچی کہ میں نے کہا کہ "میں خدا کو اس لئے مانتا ہوں کہ رسول کو مانتا ہوں۔" بزرگوں کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور انھوں نے مجھے گھور کر دیکھا۔ لیکن میں اس وقت ان کے سامنے گستاخ ہوگیا تھا، میں یہاں تک کہہ گیا کہ "آپ کے پاس خدا کے ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے، لیکن میرے پاس ہے اور وہ یہ کہ رسول نے کہا ہے کہ خدا ہے۔" میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا اور دیر تک اقبال کی بانگِ درا پڑھتا رہا اور جب شکوہ کے اس بند پر پہنچا ؎

تھی تو موجود ازل ہی سے تری ذاتِ قدیم
پھول تھا زیبِ چمن پر نہ پریشاں تھی شمیم
شرط انصاف ہے اے صاحبِ الطافِ عمیم
بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم

ہم کو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی ورنہ امت ترے محبوب کی دیوانی تھی

تو خوشی سے میری باچھیں کھل گئیں، کہ میں اپنے بزرگوں کے سامنے اقبال کی دلیل پیش کرکے آیا ہوں۔

اب خاندان میں میرا تھوڑا سا احترام بھی کیا جاتا تھا اور لوگ میرے نام پر زیرِ لب مسکرا بھی دیتے تھے۔

میں نے اچھی چیزیں کھانا چھوڑ دی تھیں۔ ٹینس کھیلنا اور شکار کھیلنا بھی تقریباً ترک کر دیا تھا۔ زیادہ تر کتابیں پڑھنے میں وقت گزارتا تھا۔ لیکن کام کی کتابیں کم تھیں۔ سب سے اچھی کتاب بانگِ درا تھی جو زبانی یاد ہو گئی تھی۔ اسی دوران میں نگار کے کچھ پرانے پرچے کہیں سے مل گئے۔ غالباً ۱۹۲۴ء کی ڈائریں تھیں۔ ان میں پہلی بار غالباً نیاز فتحپوری کی کسی تحریر میں انقلاب روس کا ذکر مل گیا۔ اور میں نے اقبال کی حضر راہ کو اس کے ساتھ ملاکر اپنے خوابوں کی نئی دنیا تعمیر کرنا شروع کر دی۔

ماں باپ میری حالت پر کڑھتے تھے اور بہنیں مجھے حیرت سے دیکھتی تھیں۔ ایک رشتہ کی بہن تھی اس کی آنکھوں میں حیرت سے زیادہ پسندیدگی کی چمک تھی۔ اور یہ چمک مجھ کو اس پر آمادہ کر دیتی تھی کہ میں اس کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کروں، میں اس سے ہمیشہ مفلسی اور امارت، ظلم اور انصاف کی باتیں کرتا رہتا تھا لیکن کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ ہمارے درمیان کچھ نازک اور لطیف رشتے پیدا ہو گئے ہیں۔ اور میرے دل میں ایک نور سا بکھر گیا۔ برسوں بعد جب میری شادی کا سوال اٹھا تو میں نے اپنے والدین کو اس لڑکی کا نام بتا دیا لیکن لڑکی کے باپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں اول جلول آوارہ گرد ٹھہرا نہ رہنے کا ٹھکانا ہو گا نہ کھانے کا۔ لڑکی کہاں بھاڑ جھونکے گی۔

یہ غالباً ۱۹۳۰ء کے آس پاس کی بات ہے کہ میں نے طے کر لیا کہ میں بلرام پور سے نکل جاؤں گا۔ اتفاق سے یہ خبر معلوم ہوئی کہ جہازرانی کی ٹریننگ کے لئے اب ہندوستانی بھی لئے جائیں گے۔ کچھ ذوق آوارہ گردی کچھ بلرام پور سے نکل جانے کا شوق، میں نے اپنے والد سے جہازرانی میں جانے کی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے اجازت دے دی۔ میں مہینوں امتحان کی تیاری کرتا رہا اور پھر لکھنؤ جاکر امتحان دیا۔ اور اس میں کامیاب ہو گیا۔ بمبئی سے بلاوا آ گیا۔ میں بے انتہا خوش تھا، اور سفر کی تیاریاں کرنے لگا تھا کہ یکایک ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے سارے خوابوں کو خاک میں ملا دیا۔

ایک مجتہد صاحب ہر سال تشریف لاتے تھے، میں جانے کی تیاری میں تھا کہ وہ آ گئے۔ جب میرے والد نے ان کے سامنے ذکر کیا تو کچھ شبہات کا اظہار بھی ہوا۔ کس طرف سے؟ یہ مجھے نہیں معلوم۔ بس اتنا معلوم ہے کہ مجھے ان کے سامنے بلایا گیا اور پھر میرے سامنے استخارہ دیکھا گیا اور استخارہ منع آ گیا۔ میں نے اس وقت ذرا سی جھنجھلاہٹ محسوس کی پھر یہ تاویل کی چلو اچھا ہوا۔ میں خواہ مخواہ انگریزوں کی ملازمت کرنے جا رہا تھا۔ لیکن جب ۱۹۴۶ء میں میری آنکھوں کے سامنے بمبئی کے جہازیوں نے بغاوت کی تو میرا دل اس خیال سے تڑپ اٹھا کہ میں اس بغاوت میں شریک نہ ہو سکا۔ اسے ایک طرح کی رومانیت کہہ لیجئے لیکن یہی رومانیت تو زندگی میں رس پیدا کرتی ہے۔

اب پھر بلرام پور کا کنواں تھا اور میں، عمل کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ذہنی الجھنیں بڑھتی جا رہی تھیں، میں بے بس تھا۔ اور اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

اس ذہنی کیفیت میں میں ۱۹۳۳ء میں علی گڑھ پہونچا۔ اس وقت میری عمر بیس برس کی تھی۔ چونکہ میں نے ابتدائی چند

سال عربی اور فارسی کی تعلیم میں گذارے تھے اور تب انگریزی اسکول میں داخلہ لیا تھا، اس لئے میں اپنی عمر کے اعتبار سے تعلیم میں پچھڑا ہوا تھا۔ جب انٹر میڈیٹ میں پہونچا تو میرے ہم عمر بی اے اور ایم اے کے طالب علم تھے۔

یہ زمانہ جتنا ہندوستان کی تاریخ میں اہم ہے اتنا ہی اُردو ادب اور علی گڑھ کی تاریخ میں بھی۔ علی گڑھ تحریک نے انیسویں صدی کی ابتدا میں غزل کی اصلاح کا سہرا بھی علی گڑھ ہی کے ایک سپوت مولانا حسرت موہانی کے سر ہے۔ دوسری دہائی میں زبان کی رومانی تحریک میں بھی علیگڑھ کا اچھا خاصہ حصہ ہے، اور تیسری دہائی میں جب ترقی پسند تحریک نے اُردو ادب کو نیا رُخ دیا تو یہاں بھی علی گڑھ پیچھے نہیں رہا۔

جس زمانے میں میں وہاں پہونچا نئی تحریک کے اولین نقوش بن رہے تھے اور ادب اور سیاست مل کر ایک ہوئے جا رہے تھے۔ احتشام حسین، سبط حسن، حیات اللہ انصاری، سعادت حسن منٹو، مجاز، جاں نثار اختر، آل احمد سرور سب وہاں کے طالب علم تھے۔ ڈاکٹر اشرف اور ڈاکٹر عبد العلیم استادوں میں تھے۔ بعد کو عصمت چغتائی بھی وہاں پہونچ گئیں اور جذبی بھی)۔ اور یہ سب جدید اُردو ادب کے نہایت اہم اور ہوش مند معمار ہیں۔

میں جس ذہنی کیفیت میں گیا تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ میں سیدھا لائبریری کا رُخ کروں۔ مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ علی گڑھ میں کون کون ہے اور کس قسم کے طوفان پرورش پا رہے ہیں۔ میں اس نتیجہ پر پہونچ گیا تھا کہ ذہنی اُلجھنوں کو دور کرنے کے لئے علم بہت ضروری ہے، جس سے میں اب تک بری طرح محروم تھا۔

بغیر کسی ترتیب کے میرا ہاتھ جس کتاب پر پڑا اُسے پڑھ ڈالا۔ لیکن نہ جانے کیوں میرا ہاتھ کسی سیاسی کتاب پر نہیں پڑا۔ عام طور سے میں ادبی کتابیں پڑھ رہا تھا۔ ان کے زیر اثر لڑکپن میں پیدا ہونے والے سوالات کچھ عرصے کے لئے دب گئے اور میں آسکر وائیلڈ میں کھو گیا، جس کی سالومی کے زیر اثر میں نے نہایت بے سر و پا ڈرامہ لکھا۔ غالباً اس کا نام "دیوانے" تھا۔ اور وہ علیگڑھ میگزین میں شائع ہوا تھا اس کی نہ جانے کیوں میرے محترم استاد رشید صدیقی صاحب نے تعریف کی۔ اور بھی کچھ لوگوں نے اُسے سراہا۔ میں اس وقت تو خوش ہوا اور جب ذرا ہوش آیا تو حیران ہو گیا اور آج بھی حیران ہوں۔ کیونکہ اس پر کسی قسم کے سیاسی اور سماجی شعور کی پرچھائیں بھی نہیں ہے۔ صرف لفاظی ہے اور وہ بھی انتہائی مصنوعی۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ چند سال بعد رشید صاحب نے اپنی کتاب مجھے دستخط کر کے دی اور اس پر میرے لئے یہ لکھا کہ "جن کے بارے میں میری وہی رائے ہے جو میر کی غالب کے بارے میں تھی۔" اس پر میں چونکا اور مجھے "دیوانے" کے مہمل ہونے کا یقین ہو گیا۔ غالب کی منزل تو نصیب نہیں ہوئی لیکن ہوش ضرور آ گیا۔

لیکن میں آسکر وائیلڈ کی گرفت سے بہت پہلے نکل چکا تھا۔ جس زمانے میں میں اس کی سوانح عمری پڑھ رہا تھا تو گوئٹے کا "ورتھر" میرے ہاتھ لگ گیا اس سے میں گوئٹے کی طرف مائل ہوا، اور جب میں نے اس کا شاہکار فاوسٹ پڑھا تو مجھے ادب کی حقیقی بلندی کا اور عظمت کا احساس ہوا۔

دل میں سوئے ہوئے سوالات پھر جاگنے لگے اور ایک روز محض اتفاق سے ایک واقعے نے مجھے نئی راہ پر ڈال دیا۔ تقریریں کرنے کا مجھے بھی شوق تھا اور میرے دوست فرحت اللہ انصاری کو بھی۔ وہ چونکہ انگریزی میں تقریریں کرتے تھے اور وہ زمانہ

یورپ میں فاشزم کے عروج کا زمانہ تھا، اور ہندوستان میں تحریک آزادی کی لہریں اونچی اُٹھ رہی تھیں اس لئے احمد عباس کی تقریروں کی طرح ان کی تقریروں میں بھی سیاسی الفاظ کی بہتات ہوتی تھی۔ ایک دن میں نے فرحت کی زبان سے پورژوا کا لفظ سنا اور اُن سے اس کے معنی پوچھے: جواب دینے کے بجائے وہ ہنسنے لگے! میں پھر لائبریری کی طرف بھاگا اور اس بار جب میں واپس آیا تو میری بغل میں لینن کی سوانح عمری تھی مجھے اب یہ بالکل یاد نہیں ہے کہ وہ کس کی لکھی ہوئی تھی۔ بس اتنا یاد ہے کہ جو دروازے گاندھی جی کی کتاب پڑھ کر اور نہرو کی تقریریں سن کر ذرا ذرا سے کھلے تھے اور پھر بند ہو گئے تھے اس بار پورے کھل گئے۔ اور مجھے بیڑیوں میں لٹکی ہوئی کسان عورتوں کو نیچے اتار کر اُن کا کھویا ہوا وقار واپس دینے کا طریقہ معلوم ہو گیا۔ میں فرحت کا شکرگزار ہوں کہ اُن کی ایک ہنسی نے کتنے ہونٹوں کی کھوئی ہوئی ہنسی واپس دلادی۔

اُسی زمانے میں مجاز سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہنس مکھ اور تندرست تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ زبانہ تب بھی بہت کم کھلتا تھا۔ لیکن ترنم کا جادو اپنے شباب پر تھا۔ (مجھے یاد ہے ۱۹۳۶ء کی ایک شام مجاز رشید جہاں کے گھر پر اپنی کوئی نظم سنا رہا تھا، محمود الظفر اور شوکت عمر اور خواجہ منظور حسین بھی وہاں تھے۔ دو بچیاں بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک بچی نے کچھ کہا تو دوسری بچی نے یہ کہہ کر سے خاموش کر دیا "چپ رہو باجا بج رہا ہے") مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ مجاز شاعر ہیں۔ ہم دونوں ایک ہی کورٹ پر ٹینس کھیلتے تھے! ایک روز مجاز کھیل کر واپس جا رہا تھا کہ اس کی پتلون تار میں اُلجھ کر پھٹ گئی۔ غوث محمد نے ہنس کر کہا شاعر صاحب کی پتلون پھٹ گئی۔ اور میں نے مڑ کر دیکھا کہ یہ کون شاعر ہے۔ اسی رات کو یونین کے مشاعرے میں مجاز سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ اس کی نظم اور ترنم دونوں میں جادو تھا۔ نظم "انقلاب" تھی اور اس کے ہر مصرعے میں مجھے اپنے دل کی دھڑکن محسوس ہوئی۔ اس دن سے ہم دونوں دوست ہو گئے۔ یہ دوستی بائیس ۲۲ برس تک اتنی ہی بے لوث اور خوبصورت رہی جتنی پہلے دن تھی۔

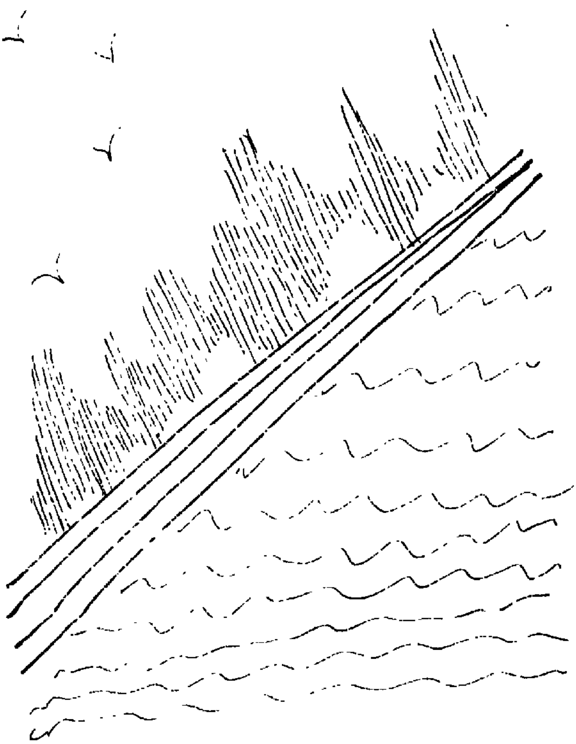
اس مشاعرے میں میں نے اپنی نظم "سماج" پڑھی تھی جو ان شعروں پر ختم ہوتی تھی ؎

تمناؤں میں کب تک زندگی اُلجھائی جائے گی
کھلونے دے کے کب تک مفلسی بہلائی جائے گی
نیا ہے تجربہ پتھر کے شگافوں سے اُبلنے کو
زمانہ کس قدر بے تاب ہے کروٹ بدلنے کو

جب میں مشاعرے کے بعد باہر نکلا تو ایک انتہائی ذہین آنکھوں اور بیمار چہرے کا طالب علم مجھے اپنے کمرے میں یہ کہہ کر لے گیا کہ "میں بھی انقلابی ہوں" اس کے کمرے میں وکٹر ہیوگو کی بڑی سی تصویر لگی ہوئی تھی اور میز پر چند دوستوں کے ساتھ اس کی اپنی تصویر تھی۔ جس کی پشت پر گورکی کا ایک اقتباس لکھا ہوا تھا۔ یہ سعادت حسن منٹو تھا۔ اس نے مجھے بھگت سنگھ پر مضامین پڑھنے کے لئے دیئے، اور وکٹر ہیوگو اور گورکی سے آشنا کیا، میں جب اپنی تعلیم ختم کر کے لکھنؤ چلا گیا اور منٹو بمبئی تو اس نے کئی بار بمبئی بلایا۔ جب میں کمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار اخبار میں کام کرنے کے لئے ۱۹۴۲ء میں بمبئی پہنچا تو میرے اور منٹو کے درمیان ادبی اختلافات کی خلیج بہت وسیع ہو چکی تھی۔ لیکن ہماری ذاتی دوستی میں

فرق نہیں آیا۔ ویسے تلخ لمحات بھی آئے اور تیز و تند کیفیت بھی پیدا ہوئی۔

اس رات منٹو بڑی دیر تک باتیں کرتا رہا اور ہم دونوں نے مل کر ایک رسالہ نکالنے کی اسکیم تیار کی۔ شاہد لطیف نے اس کا نام "نیا ادب" تجویز کیا۔ یہ رسالہ پانچ چھ برس بعد لکھنؤ سے نکلا۔ لیکن منٹو اور شاہد لطیف کے بجائے مجاز اور سبط حسن میرے ساتھ تھے۔





جاں نثار اختر

"...... بچپن کا سادہ ذہن اپنے اِردگرد کے اثرات کو قبول کرنے میں فوٹو پلیٹ کی طرح ہوتا ہے۔ آگے چل کر یہ نقوش دھندلے بھی پڑ سکتے ہیں اور مِٹ بھی سکتے ہیں، لیکن اُس وقت اپنا اثر ڈالے بغیر نہیں گذر سکتے۔ میں نے جس گھر اور جس فضا میں آنکھ کھولی تھی اُس میں مذہبی رنگ غالب تو نہیں تھا موجود ضرور تھا......"

میرا بچپن اگر میں یہ کہوں کہ تنہا گذرا ہے تو زیادہ غلط نہ ہوگا۔ اس کی وجہ گھر کا وہ پردہ آلود ماحول تھا جس میں بچوں کو ہر طرح کی قید و بند میں رکھنا ان کی تربیت کے لئے مفید سمجھا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے پیچھے اپنے اونچے خاندان سے تعلق رکھنے کا تصور یا اپنی موجودہ سماجی پوزیشن کا خیال کار فرما ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی کچھ تھا جس نے میرے کھیل کود کی دنیا، گھر کی چہار دیواری میں محدود کر دیا تھا۔ پاس پڑوس کے بچوں سے جو زیادہ تر غریب لوگوں کے بچے تھے۔ میرا کوئی ربط ضبط ممکن نہ تھا۔ گھر میں مجھ سے تین سال بڑی میری بہن تھی۔ میں تمام وقت اسی کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ ایسا بہت کم ہوتا کہ میں اس کی گڑیوں میں دلچسپی لوں۔ اکثر وہی کو اپنی گڑیاں چھوڑنی پڑتیں اور میرے ساتھ میرے کھلونوں سے کھیلنا پڑتا۔ کبھی کبھار ہم دونوں میں لڑائی ہو جاتی۔ اور پھر میں گھنٹوں اپنے کھلونوں سے اکیلا بیٹھا کھیلا کرتا۔ مٹی کے کھلونے، ربڑ کے کھلونے، گتا چار چے کے کھلونے، ٹین کے کھلونے جو چابی دینے سے چلتے تھے۔ آئے دن ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ کچھ نہیں تو کوئی سو کھلونے میں نے جمع کر رکھے تھے۔ ان سے مجھے ایسا ہی گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ گویا واقعی وہ میرے جیتے جاگتے دوست اور ساتھی ہوں۔ اگر اتفاق سے کوئی کھلونا ٹوٹ جاتا تو مجھے بڑا صدمہ ہوتا۔ مجھے یاد ہے میرے کھلونوں میں مٹی کی ایک گڑیا تھی وہ میرے تمام کھلونوں کی رانی تھی اور میں اسے جھانسی کی رانی کہا کرتا تھا۔ ایک دن اتفاقاً اس کی گردن ٹوٹ گئی۔ گھر والوں نے دوسری ویسی ہی گڑیا منگوا دینے کو کہا لیکن میں کسی قیمت پر تیار نہ ہوا۔ اسی گڑیا کی گردن آٹے سے جوڑ دی گئی اور پھر وہ لکڑی کے قلعے میں رانی بن کے بیٹھ گئی۔ غالباً دوسری صبح جب میں سو کر اٹھا اور میں نے رو رو کر برا حال کر لیا۔ آخر گردن کہاں غائب ہو سکتی ہے۔ سوچتے سوچتے گھر والے اس نتیجہ پر پہنچے کہ اناج کی کوٹھری میں جو موٹے موٹے چوہوں نے بنا رکھے ہیں کوئی چوہا اس آٹے سے جوڑی ہوئی گردن کو اٹھا لے گیا ہے۔ چنانچہ چوہوں کے بلوں کی تلاشی لی گئی اور یہ تلاش کامیاب رہی۔ تب سے اس رانی کی خاص طور پر حفاظت کی جانے لگی۔

بہر کیف کھلونوں سے اتنی دلچسپی تو بچپن میں اپنے ہم عمر ساتھی نہ ملنے کی وجہ سے تھی جس کے نتیجے میں آج بھی کھلونوں کی دنیا مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے، اور میرا دل نئے نئے کھلونے دیکھ کر بچے کی طرح خوش ہو جاتا ہے۔ لیکن بچپن کے اس اکیلے پن نے مجھ میں سماجی میل جول کے جذبے SOCIAL INSTINCT کو بڑی حد تک مار دیا۔ اور میری طبیعت دیر آشنا ہو گئی۔

بچپن کا سادہ ذہن اپنے ارد گرد کے اثرات کو قبول کرنے میں فوٹو کی پلیٹ کی طرح ہوتا ہے۔ آگے چل کر یہ نقوش دھندلے بھی پڑ سکتے ہیں اور مٹ بھی سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت اپنا اثر ڈالے بغیر نہیں گذر سکتے۔ میں نے جس گھر اور فضا میں آنکھ کھولی تھی اس میں مذہبی رنگ غالب تو نہیں تھا موجود ضرور تھا۔ اماں نماز روزے وظیفے اور تلاوت قرآن کی سخت پابند تھیں۔ والد صاحب رمضانوں میں کچھ روزے ضرور رکھتے تھے۔ اسی وقت نماز بھی پڑھتے تھے یا پھر عید اور بقر عید کے موقع پر۔ عام دنوں میں انہیں نماز پڑھتے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ خیرات و زکوٰۃ کی پابندی بھی ہمارے ہاں کی جاتی تھی اور نذر و نیاز کا سلسلہ بھی قائم تھا۔ مذہبی اوہام اور دینی بدعتیں تھیں جنہیں

ہمارا گھر عام مسلمانوں کے زوال پذیر خاندانوں کی طرح اپنائے ہوئے تھا۔ ان میں تعویذ گنڈے، منت مراد، قبر پرستی اور تعزیہ داری بھی کچھ شامل تھا۔ مجھے یاد ہے میرے گلے میں جہاں ایک چھوٹی سی ڈبیا میں قرآن شریف موم جامہ کیا ہوا آویزاں تھا وہاں اور دو چار تعویذ بھی لٹکے رہتے تھے۔ اور میں اکثر انھیں چبایا کرتا تھا۔ میں یا میری بہن بھی بیمار پڑ جاتے تو علاج معالجے کے علاوہ جھاڑ پھونک کا سلسلہ بھی چلتا۔ ایک کوری ٹھکری جس پر کچھ اعداد لکھے ہوتے ایک سرخ دھجی میں ہماری کلائی پر باندھ دی جاتی۔ اگر بیماری طول کھینچ جاتی تو پھر نہ جانے کتنے ڈھونگ ہوتے کتنے صدقے اتارے جاتے۔ کڑوا تیل اور ماش ہم سے اتاری جاتی۔ تازہ گوشت ہمارے ماتھے، سینے، ہاتھ اور پاؤں کو چھوا کر چیلوں کو کھلایا جاتا۔ پھر بکرے کا ایک بکرا ہمارے پلنگ کے گرد کان پکڑ کے گھمایا جاتا۔ اور ذبح کر دیا جاتا۔ کبھی کوئی سفید مرغ یا کالا کپڑا قد کے ناپ کا اور کچھ آنے پیسوں کا صدقہ بتا دیا اور یہ سب چیزیں اتار کر کسی چوراہے پر رکھ دی جاتیں۔ پانی مسجد سے دم کر کے منگایا جاتا۔ دودھ دیا جاتا تو اس پر لعنیہف پڑھ کے پھونکی جاتی۔ اور پھر جب ہم اچھے ہو جاتے تو دوا سے زیادہ انہیں چیزوں کے اثر کو غالب تسلیم کیا جاتا۔ منتوں مرادوں کا بھی زور رہتا تھا۔ کسی مرقع پر مسجد میں گھی کے چراغ بھیجے جاتے۔ کبھی کسی درگاہ پر چادر چڑھائی جاتی۔ کبھی کونڈے لانے جاتے اور کبھی تعزیوں پر منتوں کی چھڑیاں باندھی جاتیں۔ چاندی کی ہنسلیاں جو بڑے پیر صاحب کے نام کی کہی جاتی تھیں گیارھویں میں ہر سال مجھے پہنی ہوتی تھیں اور یہ "منتوں کا طوق" گیارہ سال مجھے پہنایا جاتا رہا۔ محرم کی ساتویں تاریخ کو مجھے "فقیر" بنایا جاتا۔ ململ کی رنگی ہوئی سبز ٹوپی، سبز کرتا۔ گلے میں کلاوا اور سیلیاں ڈالی جاتیں۔ کھانے میں دو پیڑے ملتے۔ کان میں چبی ہوئی گرہ تو خود اپنی مرضی سے لگایا کرتا تھا۔

ہر سال شعبان میں دس تاریخ سے سولہ تاریخ تک ہمارے یہاں میلاد ہوا کرتا تھا۔ ان سات محفلوں کے لئے خود ہمارے والد صاحب نے سات جلدیں تالیف کی تھیں جن میں ابتدائے آفرینش سے لے کر حضرت محمد صلعم کی وفات تک کے حالات درج تھے۔ انہوں نے بڑی محنت و کاوش سے یہ کام انجام دیا تھا۔ پھر بھی ان میں بہت سی غیر مستند احادیث اور غیر معتبر روایتیں شامل ہو گئی تھیں۔ مجھے ان میں دو محفلیں بہت پسند آتی تھیں۔ ایک تیسری محفل جس میں حضرت یوسفؑ اور حضرت زلیخا کا تذکرہ تھا۔ دوسرے پانچویں محفل جس میں خود حضرت محمدؐ کا ذکر خیر تھا۔ آج بھی مجھے اسلامی قصص میں حضرت یوسف اور حضرت زلیخا کا عشق اور امام حسینؑ کا معرکۂ کربلا عظیم واقعات محسوس ہوتے ہیں۔

ان میلاد کی محفلوں کے علاوہ ہمارے یہاں ایک عرصے تک محرم کی مجالس بھی ہوتی رہیں۔ میں نے اپنے دادا کو نہیں دیکھا۔ اپنے باپ کی زبانی سنا تھا کہ ان کی زندگی میں ہمارے گھر "علم" رکھے جاتے تھے۔ میرے والد اپنے کو تفضیلی سید بتاتے تھے جو شیعہ فرقے سے اپنے معتقدات میں مختلف ہے۔ وہ حضرت ابوبکر، حضرت فاروق اور حضرت عثمان کے خلیفہ ہونے کا منکر نہیں۔ البتہ حضرت علی کی فضیلت رسول خدا کے داماد ہونے کی حیثیت سے مانتا ہے۔ اسی تفضیلی ہونے کے ذیل میں حضرت عباسؓ کے نام سے علم بھی آ جاتے ہیں۔ محرم کی مجالس بھی اور باپ دادا کے ناموں کا وہ سلسلہ بھی جو حسینؑ یا علیؑ پر رکھے جاتے رہے۔ چنانچہ باپ کا نام سید افتخار حسین، دادا کا نام احمد حسین، پردادا کا نام تفضل حسین اور نگھڑ دادا کا نام محفوظ علی اتنا تو مجھے یاد ہی ہے۔

ہمارے گھر کچھ سال تعزیہ داری بھی ہوئی ہے اور اس کی ابتدا دراصل ہمارے بچپن کے کھیل سے ہوئی۔ محرم کا زمانہ تھا۔ ایک دن میں اور میری بہن نے طے کیا کہ چھت پر جو مٹی پڑی ہے اس کا تعزیہ بنایا جائے۔ چنانچہ ہم نے چھپ کر کھیل ہی کھیل میں ایک تعزیہ بنا ڈالا۔ مٹی کا تعزیہ۔ اسے اٹھا کر ہم اپنی ماں کو دکھانے کے لئے نیچے لے گئے۔ والد صاحب بھی موجود تھے وہ خاصے خوش ہوئے اور ہمیں

تائید کی کہ اب اسے توڑنا نہیں چنانچہ وہ تعزیہ ایک تخت پر رکھ دیا گیا اور شام ہوتے ہوتے پھولوں کا سہرا بھی بن گیا۔ پھر ہر سال ہمارے نام کے الگ الگ تعزیے رکھے جانے لگے۔ ہمارے مکان میں دو ہرا دالان تھا باہر کے دالان میں ایک طرف بانس دنبرہ باندھ کر امام باڑہ بنا دیا گیا۔ ان پر رنگ برنگ کے کاغذ اور پنیاں منڈھ دی جاتیں۔ بازار سے تعزیے آ جاتے اور دیوڑھیوں پر روز نوبت ہوا کرتی۔ میری عقیدت کا یہ عالم تھا کہ محرموں میں پلنگ پر سونا چھوڑ دیا تھا، عشرے کے زمین پر سوتا تھا، عشرہ کے دن جب تعزیے اٹھائے جاتے تو کربلا تک جانے کی اجازت تو تھی نہیں، باہر تک اپنا تعزیہ خود اپنے سر پر رکھ کر پہنچاتا تھا۔

میرے والد کو صوفیوں اور درویشوں سے بھی بڑی عقیدت تھی۔ خود وہ حافظ کریم علی شاہ سے خاندان چشتیہ میں بیعت تھے۔ حاجی وارث علی شاہ سے انہیں بڑی عقیدت تھی۔ گوالیار میں جہاں زیادہ عرصہ ہمارے بچپن کا گذرا ایک بزرگ بابا مسیح الدین تھے جو جھنگا میاں کے عرف سے مشہور تھے اور گوالیار قلعے کی ایک اونچی ٹیکری پر رہا کرتے تھے۔ والد صاحب ان کے بڑے معتقدوں میں سے تھے۔ اکثر ان کی خدمت میں حاضری دیتے اور کبھی کبھی مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ مجھے یاد ہے جب میں ساتھ جاتا تو وہ اوپر سے آواز لگواتے کہ اس بچے کو آگے چھوڑ دو۔ میری عمر ساڑھے سات سال کی ہو گی۔ ٹیکری پر چڑھنا میرے لئے مشکل ہوتا۔ چنانچہ والد کے ساتھیوں میں سے کوئی مجھے اپنی گود میں اٹھا کر آگے لے جاتا۔ وہ مجھ سے بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ ایک آدھ سال بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا اور جھنگا میاں کا عرس بڑی دھوم دھام سے ہر سال ہونے لگا۔ چادر ہمارے گھر سے اٹھا کرتی تھی۔ میں ان کے عرس میں جایا کرتا۔ ساری رات جاگ کر قوالی سنا کرتا۔ کبھی نیند کا جھونکا آتا تو منہ دھو کر پھر آ بیٹھتا۔ والد ایک دو روپیہ قوالی میں نذر کرنے کے لئے مجھے بھی دے دیتے۔ میں پورے آداب کے ساتھ وہ نذر درگاہ کے متوال کے آگے پیش کرتا اور وہ اپنے ہاتھ سے اٹھا کر قوال کو دے دیتے۔ قوالی کا زیر و بم تالیوں کی آواز اور ڈھولک کی گمک درگاہ کی فضا سے مل جل کر ایک عجیب فضا پیدا کر دیتی۔ پھر اگر کسی پر وجد یا حال طاری ہوتا اور وہ کھڑے ہو کر رقص کرنے لگتا تو ساری کی ساری محفل کھڑی ہو جاتی اور یہ سارا سماں ایک پر جلال سی کیفیت میرے ذہن میں پیدا کر دیتا۔

اپنے بچپن میں اس سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی مجھے اپنے ماں باپ کے ساتھ مختلف اولیاء اللہ کی مزاروں پر جانے کا اتفاق ہوتا رہا۔ حضرت معین الدین چشتیؒ، حضرت خواجہ نظام الدینؒ، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت شاہ میناؒ، حضرت مخدوم سعدؒ۔ ان بزرگوں اور بہت سے دوسرے اولیائے کرام کے تذکرے میں سنتا رہتا لیکن ان تذکروں میں زیادہ زور ان کے کشف و کرامات اور بعض اوقات ان کے محیر العقول معجزات پر ہوتا تھا۔ ان کی اخلاقی تعلیم اور انسانی خدمات پر نہیں جس کے نتیجہ میں جہاں ان برگزیدہ شخصیتوں کے لئے تعظیم و تکریم کا جذبہ مجھ میں پیدا ہوتا وہاں ایک انجانا خوف بھی اس میں ضرور شامل رہتا۔ خود اپنے جد اعلیٰ محفوظ علی صاحب کے بھائی مشوق علی شاہ کے لئے میں نے جن کی درگاہ خیرآباد ہی میں ہے، میں نے بہت سی محیر العقول روایات سن رکھی تھیں۔

اس کے ساتھ مجھے بچپن میں ایسے کئی واقعات دھندلے دھندلے یاد ہیں جب کوئی نہ کوئی گیروا لباس پہنے فقیری اور درویشی کا ڈھونگ رچائے ہوئے کہیں سے آ دھمکتا تھا تو والد صاحب اس پر پہلی نظر میں ایمان لے آتے۔ ان کی خاطر مدارت کی جاتی۔
ایک مرتبہ ایک شاہ صاحب نوش ہمارے یہاں آ کر ٹھہرے۔ ہمارے گھر میں شراب کا کیا گذر تھا لیکن ان کے لئے وقتاً فوقتاً شراب بھی منگائی جاتی۔ ایک بار ایسے بے وقت انہوں نے شراب کا مطالبہ کیا کہ کوئی نوکر یا ملازم موجود نہ تھا۔ چنانچہ والد صاحب نے خود میرے

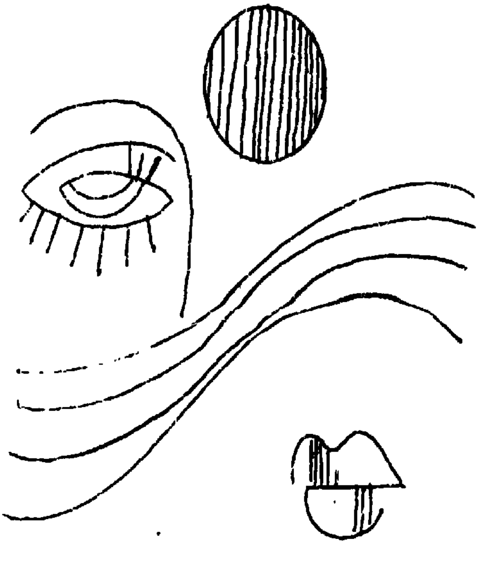
میرے بڑے بھائی (یہ دوسری ماں سے تھے) کو ان کو لینے کے لئے بھیجا۔ لیکن یہ ذریب جلد ٹوٹ بھی جایا کرتا تھا اور اکثر میں نے والد صاحب کو جن کے ہاتھ چومتے ہوئے دیکھا تھا انہیں پر اُن کے منہ سے گالیاں پڑے ہوئے بھی سُنی تھیں۔

ایک قصہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ایک دن والد صاحب کے ایک ملاقاتی اپنے ساتھ بارہ سال کے ایک سفید فام لونڈے کو جو گیروا تہمد ڈنڈے ہوئے تھا لئے ہوئے آئے اور کہا خدا کی قسم اس عمر میں بابا کی آنکھوں سے سارے پردے اٹھ گئے ہیں۔ بابا گاؤ تکیہ سے ٹیک کر صدر میں بٹھائے گئے۔ لوگ ان کے گرد دو زانو بیٹھے۔ بابا اپنی سرخ آنکھیں کسی کی آنکھوں میں ڈال دیتے اور تمام جسم پر تھرتھری پیدا کر لیتے۔ سب لوگ اس جذبے کی کیفیت تعبیر کرتے۔ بولتے بہت کم تھے ورنہ شاید بھید جلد کھل جاتا۔ تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنی کلائی بڑھا کر والد صاحب کے ہاتھ پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ والد صاحب نے فوراً گھڑی کھول کر ان کی کلائی پر باندھ دی۔ ایک آدھ گھنٹے کے بعد بابا چلنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد اکثر بابا ہمارے گھر آتے رہے۔ شہر میں اُن کی خاصی شہرت ہو گئی تھی۔ ایک صبح اطلاع ملی کہ بابا رات سے غائب ہیں۔ ان کے اس طرح غائب ہو جانے کو بھی ایک معجزہ ہی سمجھا گیا۔ ان کے لئے بغیر کسی ذریعۂ "آمد و رفت" کے بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ میرے والد اس وقت گوالیار میں ڈسٹرکٹ جج اور سٹی مجسٹریٹ دونوں عہدوں پر تعینات تھے۔ گیارہ بجے عدالت گئے تو سب انسپکٹر پولیس نے کچھ لڑکوں کا چالان پیش کیا جو رات کو ایک دکان کا تالہ توڑتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ ان میں بابا بھی موجود تھے۔ بابا کو دراصل بابا بنانے والے کچھ اور لوگ نکلے۔ بابا آخر کم عمر لڑکا ہی تو تھا۔ دن بھر چپ رہ کر بابا کی ایکٹنگ کرتے ہوئے دل گھبرا جاتا تو رات کو چپ چاپ اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ گلیوں میں مارا پھرتا اور صبح ہوتے پھر بابا بن کے آ بیٹھتا۔ اس واقعہ کا مجھ پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ پھر کوئی درویش یا بزرگ ہمارے یہاں تشریف لاتے تو میں ان پر دل ہی دل میں بھوت پریت کے بارے میں شک کرتا رہتا۔ ایک تو ہم جس مکان میں رہتے تھے وہ مس مال کی کوٹھی کے نام سے مشہور تھا اور اسے آسیب زدہ بتایا جاتا تھا۔ والد صاحب نے یہ مکان میرے ہوش سے پہلے کرایہ پر لیا تھا اس لئے اس مکان میں آنا مجھے یاد نہیں۔

یہ بڑا شاندار سہ منزلہ مکان تھا اور کوئی اسے کرایہ پر لینے کو تیار نہ تھا۔ چنانچہ اتنا عالیشان مکان صرف بیس یا پچیس روپے ماہانہ کرایہ پر مل گیا تھا۔ والد صاحب نے یہ جانتے ہوئے کہ یہ آسیب زدہ ہے اسے کیسے لے لیا؟ یہ ایک سوال ہے۔ لیکن جہاں وہ بھوت پریت کو مانتے تھے وہاں غالباً انہیں اس کا بھی کامل یقین تھا کہ سید ہونے کے لحاظ سے بھوت پریت انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ میں نے اپنی عمر کے ابتدائی دس سال اسی مکان میں گزارے لیکن ایک دفعہ بھی میں نے کسی بھوت وغیرہ کو نہیں دیکھا۔ اپنے والد کو، اپنی ماں کو اور گھر کے بعض ملازموں کو کبھی کبھی صبح یہ کہتے ہوئے ضرور سُنا کہ رات کو فلاں چھت پر ایک بوڑھا آدمی لکڑی ٹیکتا ہوا اِدھر سے اُدھر جاتا دکھائی دیا، یا ایک سیہ فام عورت لہنگا پہنے اس دالان سے نکل کر اس کوٹھڑی میں غائب ہو گئی۔ ان کے علاوہ نہ جانے کتنے قصے میں نے بھوت پریتوں کے بارے میں سُنے تھے اور میں اُن کے وجود سے خوف محسوس کرنے لگا تھا۔ اپنے بڑے پن میں جب میں گوالیار کالج میں لیکچرار تھا اور ایک ایسے مکان میں رہتا تھا جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ پہلے اس کے صحن میں ایک کنواں تھا اور اس میں ایک عورت نے گر کر خودکشی کر لی تھی۔ مجھے دو مرتبہ اس قسم کا دھوکہ سا ہوا۔ جاڑوں کی رات تھی۔ میں اور صفیہ سونے کے لئے اپنے اپنے پلنگ پر لحاف میں منہ دے کر پڑے تھے۔ دونوں پلنگوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ تھا۔ تھوڑی سی غنودگی طاری ہوئی ہو گی کہ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی برابر والے کمرے سے چپ چاپ داخل ہوا اور دونوں پلنگوں کے درمیان

سے دبے پاؤں گزر رہا ہے۔ قدموں کی چاپ بے حد واضح تھی۔ میں نے اور صفیہ نے بیک وقت اپنا اپنا لحاف اُلٹا۔ صفیہ نے مجھ سے پوچھا کیوں کیا بات ہے۔ میں نے کہا مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی ہمارے پلنگوں کے درمیان سے گزرا۔ اُس نے کہا بالکل یہی آہٹ میں نے بھی محسوس کی۔

دوسری بار گرمیوں کی ایک چاندنی رات تھی۔ وہی مکان کوئی دو بجے رات کے قریب میری آنکھ کھلی۔ میں کروٹ لیے لیٹا تھا۔ میں نے دیکھا ایک عورت سفید ساڑی باندھے میرے پیروں کے قریب پلنگ کی پٹی پر پاؤں لٹکائے بیٹھی ہے۔ ساڑی کا آنچل اُس نے اس طرح لے رکھا تھا کہ میں پورے طور پر صورت نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس شام صفیہ سے میری لڑائی ہو گئی تھی اور میں نے ضرورت سے زیادہ پی لی تھی اور بغیر کھانا کھائے سو گیا تھا۔ چنانچہ کچھ نیند اور کچھ خمار کی کیفیت میں میں نے سمجھا صفیہ ہی ہو گی جو بیٹھی جاگ رہی ہے۔ مجھے شدید پیاس لگ رہی تھی۔





احمد ندیم قاسمی

"......... میں ادب اور فن کی شاہراہ کا ایک مسافر ہوں۔ بہت دُور کا سفر کرنے کے ارادے ہیں اور مجھے اعتراف ہے کہ میں ابھی ابتدائی مراحل بھی طے نہیں کر سکا زندگی کا حُسن اور کائنات کی حقیقت اور اس کائنات میں انسان کی مرکزی حیثیت ۔ یہ اور بے شمار باتیں ابھی میرے ذہن میں پک رہی ہیں ۔ تکمیل کا دعویٰ فن کی توخیر نہیں ، فن کار کی موت ضرور ہے............"

میں اپنی زندگی کے موٹے موٹے واقعات کو اتنی بار دہرا چکا ہوں کہ اب بار بار انہی کی تکرار بھدی معلوم ہوتی ہے۔ اپنے قلم سے اپنے حالاتِ زندگی کبھی تفصیل سے لکھنے کا ارادہ ہے مگر یہ تفصیل سوانح نگاری وسعت چاہتی ہے اور اس کے لیے مہینوں کی فرصت چاہیے جو ان دنوں ناپید ہے۔ البتہ میں آپ بیتی کے ضمن میں اپنی چند یادیں اور چند محسوسات پیش کیے دیتا ہوں جن کی میری زندگی سے وابستگی عیاں ہے۔ محسوسات کا یہ مجمل تذکرہ تسلسل سے محروم نہیں۔

میں نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جس کے افراد اپنی روایتی وضع داری نباہنے کو ریشم تک پہنتے تھے اور خالی پیٹ تک سو جاتے تھے، بقول غالب ؎

خول خور، نم نہفتہ و می خوردن آشکار

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مدرسے جانے سے پہلے میرے وہ آنسو بڑی احتیاط سے پونچھے جاتے تھے جو اماں سے محض ایک پیسہ حاصل کرنے میں ناکامی کے دکھ پر بہہ نکلتے تھے، لیکن میرے لباس کی صفائی، میرے بستے کا ٹھاٹ اور میری کتابوں کی ٹیپ ٹاپ، کسی سے کم نہ ہوتی تھی۔ گھر سے باہر احساسِ برتری طاری رہتا تھا اور گھر میں داخل ہوتے ہی وہ سارے آبگینے چور ہو جاتے تھے جنھیں میری طفلی کے خواب تراشتے تھے۔ پیاز یا سبز مرچ یا نمک مرچ کے مرکب سے روٹی کھاتے وقت، زندگی بڑی سفاک معلوم ہونے لگتی تھی۔ اور جب میں اپنے ہی خاندان کے بچوں میں کھیلنے جاتا تھا تو آنکھوں میں ڈر ہوتا تھا اور دل میں غصہ۔ خاندان کے باقی سب گھرانے کھاتے پیتے تھے، زندگی پر ملمع چڑھائے۔ کھنے کا تکلف صرف ہمارے نصیب میں تھا۔ والد گرامی پیر تھے۔ یادِ الٰہی میں کچھ ایسی استغراق کی کیفیتیں طاری ہونے لگیں کہ مجذوب ہو گئے۔ اور بعض عزیزوں نے ان کی گدی پر قبضہ جمایا۔ انھوں نے ان کی بیوی، ایک بیٹی، دو بیٹوں اور خود اُن کے لیے کل مبلغ ڈیڑھ روپیہ ماہانہ (نصف جس کے بارہ آنے ہوتے ہیں) وظیفہ مقرر کیا۔ تین پیسے روزانہ کی اس آمدنی میں (اماں) مجھے روزانہ ایک پیسہ دینے کے بجائے میرے آنسو پونچھنا زیادہ آسان سمجھتی تھیں اور آج جب میں اپنی نظموں اور افسانوں کے معاوضے کا کچھ حصہ ہر مہینے ان کی خدمت میں پیش کرتا ہوں[1] تو وہ رو دیتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ روتی تو جب بھی تھی، مگر وہ آنسو میرے اپنے آنسو تھے۔ اب جو روتی ہوں تو یہ وہ آنسو ہیں جنھیں میں تم دونوں بھائیوں کی آنکھوں میں تسلی کر دیتی تھی کہ گھرانے کی عزت پر پانی نہ پھر جائے۔

گھرانے کی اس عزت کے احساس نے مجھے تنند سے پہلے حساس بنا دیا۔ اور ممکن ہے اسی احساس نے مجھے فن کار بنایا ہو۔ اگر بچپن میں مجھے ماں کی محبت نہ ملتی تو ممکن ہے آج میں نہایت خطرناک کلبی اور قنوطی ہوتا۔ لیکن عالم یہ تھا کہ جب ہم بہن بھائی اپنی اماں کا ہاتھ بٹاتے، وہ چرخہ کاتتیں اور ہم پونیاں بناتے، وہ چکی پیستیں اور ہم مل کر گیت گاتے، وہ کوٹھے کی لپائی کرتیں اور ہم سیڑھی سے چمٹے کھڑے رہتے۔ بہرحال جب ہم سب اکٹھے

---

[1] افسوس کہ اب وہ ہم میں نہیں۔

ہوتے (والد گرامی ۱۹۲۴ء میں انتقال فرما گئے تھے) اور بارش ہونے لگتی تو اماں دہلیز کے پاس بیٹھ جاتیں۔ ہم تینوں ان کے آس پاس گھس جاتے۔ باہر آنگن میں بلبلے ان گنت گنبدوں کا فرش بچھاتے اور آنگن کی بیریوں کے پتے اڑتے ہوئے ہمارے پاس آ جاتے اور باہر گلیوں میں ننگ دھڑنگ بچے پرناموں کے نیچے نہاتے اور چلاتے تو اماں ہمارے سر پر ہاتھ پھیرتیں اور روتیں، اور بڑے دکھ سے آپ ہی آپ کہتیں "بوند بوند کے ساتھ فرشتہ اترتا ہے، اے پاک فرشتو! خدا کے دربار میں جا کر مجھ دکھیا کی طرف سے عرض کرو کہ میں نے تو جو دکھ بھوگنے سو بھوگے ان میرے بچوں کو کوئی دکھ نہ دینا۔ میں نے انھیں بڑی مشکل سے پالا پوسا ہے۔ یہ پڑھیں لکھیں، نیک اور لائق بنیں اور دنیا میں نام پیدا کریں۔ اللہ ان کی قسمتوں کے کانٹوں کو پھول بنا دے، اور یہ نہ ہو سکے تو یہ کانٹے میری قسمت میں لکھ دے۔ یہ بچے میرا اثاثہ ہیں۔ یہ بچے میرا غرور ہیں۔ مال تو سب تیرا ہی ہے پر تو نے مجھے یہ مال عطا فرمایا ہے تو بس اتنا کر کہ میں ان کا دکھ نہ دیکھوں بوند بوند کے ساتھ فرشتہ آتا ہے اور میں بوند بوند کو پکار رہی ہوں۔ میری پھٹی ہوئی پوروں اور کٹی ہوئی ایڑیوں کی لاج تیرے ہاتھ میں ہے یا رب العلمین!" پھر وہ زیر لب کوئی آیۂ کریمہ پڑھتیں اور ہم تینوں پر "چھو" کرتیں۔ اور یہ "چھو" ہوتے ہی زندگی کی ڈالیاں پھولوں سے لد جاتیں۔ جھکاروں اور چہکاروں کا ایک طوفان امڈ پڑتا اور ہم موسلا دھار بارش میں ناچتے کودتے اپنی بیریوں کے بیر چننے بھاگ جاتے۔ آپا پکارتیں "کیڑا ہے بیر میں!"

اور میں گول مٹول احمد شاہ ناچتے ہوئے اپنی بھدی آواز میں گاتا۔

"کیڑا ہے بیر میں
دانہ ہے ڈھیر میں
رتی ہے سیر میں
کھا جاؤ"

"تم اصل میں میراثی ہو" بھائی جان کہتے "تمہیں تو ہم نے رحم کھا کر اپنے گھر میں رکھ لیا ہے۔ تمہیں ایک روز چیل پنجوں میں دبائے اڑائے لیے جا رہی تھی ابا کو رحم آ گیا۔ چیل سے چھین کر تمہیں اپنے ہاں ڈال لیا، پر جب سے تم نے بولنا سیکھا ہے سب کو معلوم ہو گیا ہے کہ تم "ڈھاڈی" ہو، کوئی سی بات کرو، اس کا گانا بنا لیتے ہو سور!"

"گانا گا لیتے ہو سور
کھانا کھا لیتے ہو سور
پھانا پھا لیتے ہو سور
دسانا دسا لیتے ہو سور
ٹھانا ٹھا لیتے ہو سور"

یہ تُہل رو جھجھی ہوتی جب بھائی جان بیر کی گٹھلی تاک کر میری موٹی سی ناک پر مارتے اور میں ایک دردمند فریادی بن کر اماں کے حضور اپنی بے گناہی ثابت کرنے چلا جاتا۔

مجھے زندگی میں بے پناہ محبت میسر آئی ہے۔ بھائی کی محبت، بہنوں کی محبت، محبوبہ کی محبت، دوستوں کی محبت، میری ادبی کاوشوں کو سراہنے والوں کی محبت، لیکن ماں کی محبت کا میں اس لیے سب سے زیادہ سپاس گزار ہوں کہ اس محبت نے مجھے پتھر نہیں بننے دیا۔ اگر میرے ادب میں PATHOS کا کہیں وجود ہے تو یہ میری اماں کی دین ہے۔ اور اگر میں انفرادی دکھ کے حصار سے نکل آیا ہوں تو یہ بھی اماں ہی کی دین ہے۔

نو برس کی عمر میں مجھے اماں سے الگ ہو کر تعلیم کے سلسلے میں کیمبل پور جانا پڑا۔ چچا جان وہاں سول آفیسر تھے۔ انھوں نے ہم دونوں بھائیوں کی تعلیم کا بیڑا اٹھالیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ بعض سنسان دوپہروں کو ہم دونوں بھائی ڈرائنگ روم کے صوفوں پر آکر بیٹھ جاتے اور رو رو کر اماں کی باتیں کرتے۔ پھر اچانک بھائی جان کو یاد آجاتا کہ وہ مجھ سے دو برس بڑے ہیں، وہ میرے آنسو پونچھتے، مجھے تسلیاں دیتے مجھ پر زیادہ رقت طاری ہوتی تو غصے بھی ہو جاتے، پیٹ بھی ڈالتے، مگر ایک عجیب بات ہے کہ ایک اتوار کو جب وہ اپنے پاس بلایا "شاہ، ذرا ادھر تو آؤ!"

میں ان کے پاس گیا۔ وہ پلنگ پر بیٹھے تھے اور ہر طرف کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ پلنگ پر آجاؤ۔ میں پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"شاہ!" انھوں نے کہا۔ "اماں یاد آرہی ہیں، اس لیے آؤ روئیں۔"

"چلیئے، شروع کیجیے۔" میں نے کہا۔

وہ بھرے بیٹھے تھے، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ میں نے زار زار ان کا ساتھ دیا۔ اور جب ہم خوب رو لیے تو انھوں نے میرے آنسو پونچھے اور بولے "دل اب جی ہلکا ہو گیا۔ ہو گیا نا؟"

"ہو گیا!" میں نے کہا۔ اور ہو بھی گیا تھا سچ مچ۔

سو میری زندگی پر سب سے عظیم اثر میری اماں کا ہے۔ میرے آنسو بہنے میں اب اتنے جلد بازی نہیں ہے۔ اب میں اپنے قلم اور اپنے عمل سے جی ہلکا کر لیتا ہوں۔ اب جب میں دیکھتا ہوں کہ اس دنیا کی بیشتر ماؤں نے اپنے بچوں کے لیے توبے کی کالک سے روشنائی لی ہے اور لوبند لوبند کے ساتھ اترنے والے فرشتوں کو اپنے بچوں کے تحفظ کا واسطہ دیا ہے، اور جب میں دیکھتا ہوں کہ میرے جیسے کروڑ ہا بیٹوں نے ایک پیسے کے حصول میں ناکامی کے دکھ پر آنسو بہائے ہیں، اور ماؤں کی آغوش میں منہ چھپا کر روئے ہیں، جب میں یہ سب کچھ دیکھتا ہوں کہ میں دھرتی کا بیٹا ہوں، دھرتی سب کی ماں ہے، تو میرے احساسات میں تموّج نمایاں ہوتا ہے۔ میرے قلم میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور میں ارتقائے حیات کی رفتار کی تصویریں اپنے شعروں اور کہانیوں میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو بالکل ایسی آسودگی محسوس ہوتی ہے جیسے ماں بیٹے سے کہے کہ بیٹا یہ میری ایڑی سے کانٹا تو نکال دو بیٹا۔ اور بیٹا کانٹے کو نکال کر اور سوئی کی نوک یا اپنی ہتھیلی پر رکھ کر زبانِ حال سے کہے کہ آج میں نے ایک بہت بڑی عبادت کی ہے۔

میں جب اپنے بچپن کا تصور کرتا ہوں تو ماں کے بعد جو چیز میرے ذہن پر چھا جاتی ہے وہ حسنِ فطرت ہے۔ یقیناً میں نہیں کہہ سکتا کہ مظاہرِ فطرت سے موانست کا یہ جذبہ کب، کیسے اور کیوں پیدا ہوا، مجھے تو بس اتنا معلوم ہے کہ جب بھی میں اپنا ماضی یاد کرتا ہوں تو لہلہاتے ہوئے کھیتوں، امڈتے ہوئے بادلوں، ڈھلی ہوئی پہاڑیوں اور چکراتی، بل کھاتی اور قدم قدم پر پہلو بچاتی ہوئی پگڈنڈیوں کی ایک دنیا میرے

ذہن میں آباد ہو جاتا ہے۔ بیکڑ کے پھول کی جڑیں، مٹھاس کا موتی، لانبی لچکتی گھاس کی چوٹی پر جانے کی کوشش میں چیونٹی سے بھی کہیں چھوٹے چھوٹے کیڑوں کی استقامت۔ بھنبھناتی ہوئی چٹانوں کی دراڑوں میں سے پھوٹتے ہوئے جنگلی پھولوں کے پودے، گھنی پھلاہیوں کے سائے میں دھرتی کی بھینی بھینی خوشبو۔ نیلے پہاڑ کے دامن میں آئینے کی طرح چمکتی ہوئی جھیل پر سورج کی کرنوں کی تڑک، بادل کی گرج کے ساتھ تانبے کی چادروں کی طرح بجتے ہوئے پہاڑ۔ مکی کے بھٹوں کے لانبے لانبے سنہرے بالوں میں مکی کی مہک، یہ اور دوسری تفاصیل جو کبھی کبھی میرے ان نقوش اور منظروں کا پس منظر بن جاتی ہیں، میری زندگی کے اسی دور کا جمع کیا ہوا اثاثہ ہے جب میں وادیوں اور گھاٹیوں میں اکیلے گھومنے نکلتا تھا۔ یا اپنے میلے کپڑوں کی پوٹلی لے اونچی پہاڑیوں پر پیالوں کے تالابوں میں کپڑے دھونے جاتا تھا، یا بعد میں مسان یا میانوالی یا خوشاب کے دور دراز ریلوے اسٹیشن میری منزل قرار پائے اور سناٹے میں لپٹی ہوئی راتوں کو اونٹ کی گھنٹی یا خچر کے ٹاپوں نے چونکا چونکا دیا۔ اس وقت میں بادل کی گرج سے بے طرح ڈرتا تھا۔ بجلی کے لشکارے کے ساتھ ہی میں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا اور روتی آواز میں بھائی جان سے کہتا: "لالہ! اب بادل گرجے گا؟" — "ہاں!" وہ کہتے۔

"پھر؟" میں پوچھتا۔ اور پھر گرج کسی نہ کسی طرح میرے کانوں کے پردوں سے ٹکرا ہی جاتی۔ اور میں خوف زدہ ہو کر رو دیتا۔ اس وقت تک مجھے مظاہر فطرت کے اس پہلو پر غور کرنے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی۔ لیکن بعد میں جب کڑک کا یہ خوف ایک دم میرے ذہن سے نکل گیا ——— اور دوسرے لوگوں کو کڑک سے گھبراتا دیکھ کر مجھ میں مسکرانے تک کی ہمت پیدا ہو گئی تو ایک بار۔ شاید کالج کے دنوں میں — مجھے یہ خیال آیا کہ کیا انسان کبھی عناصر پر قابض ہو سکے گا؟ پھر جب میں نے طوفان میں اڑتے ہوئے چھپر دیکھے، اور سیلابوں میں گاؤں کے گاؤں کو ڈوبا پایا، اور جب کسی گھر میں بھڑکی ہوئی آگ کے شعلوں کو اوپر ہوا میں تالیاں بجاتے اور ناچتے دیکھا، جب میرا ایک دور کا عزیز بیٹھے بٹھائے آسمان سے گرتی ہوئی بجلی کا شکار ہو گیا۔ جب کوئٹے کے زلزلے میں میرے چند عزیز دوستوں کے رشتہ دار موت کے گھاٹ اتر گئے، اور جب میں نے یہ سنا کہ ان میں بیشتر تعداد کمسنوں سے بچوں کی تھی، تب عناصر پر انسان کے قابض ہونے کا سوال ایک عزم بن کر میرے ذہن میں ابھرتا تھا۔ مگر ابھرا نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لیے کہ میں بنیادی طور پر مذہبی آدمی تھا اور خدا کا خوف اس سے آگے کچھ سوچنے ہی نہیں دیتا تھا۔ اور پھر چچا جان مرحوم کا یہ فرمان کہ خدا کے وجود کے بارے میں سوچنا تک کفر ہے۔ وہ ہے۔ بس! وہ کیوں ہے اور کیسے ہے؟ یہ خیال صرف کافر ہی کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی لیے میں نے اپنی ایک نظم "تذبذب" میں جو "جلال و جمال" میں شامل ہے کہا ہے ؎

خدا وہ کیا ہے سمجھ لے جسے حقیر ادراک
کہاں خرد کی اڑانیں، حریم ذات کہاں
کہاں وہ زندہ و پائندہ حسنِ لا محدود
مرے خیال کے دھندلے تاثرات کہاں

بہت آگے چل کر میرے ذہن میں یہ خیال گھر کر سکا کہ جب انسان بڑے ناز سے ؎

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم
سفال آفریدی، ایاغ آفریدم

کہہ سکتا ہے تو پھر یہ کیوں نہ کہے ؎

تو وقت ہے، روح ہے، بقا ہے
وہ حسن ہے، رنگ ہے، صدا ہے
تو جیسا ازل میں تھا سو اب ہے
وہ ایک مسلسل ارتقا ہے
وہ ہر شے کی پلٹ رہا ہے کایا
انسان عظیم ہے خدایا

دراصل آج میرا جو بھی نظریہ ہے وہ ایک دم میرے ذہن پر جھپٹ نہیں پڑا بلکہ میں نے اسے نہایت پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے بالکل تدریجی یا صحیح لفظوں میں بالکل جدلیاتی انداز میں قبول کیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں متذبذب نہیں ہوں۔ میں مانتا ہوں کہ نظریہ بدلتا رہتا ہے، لیکن اس تبدیلی کا رجحان ارتقائی ہوتا ہے۔ تجربے میری ابتدائی معصومانہ تجدد، و تجربے کے مظاہر پر تبصرہ کرنے کا عزم۔ ان دونوں باتوں میں بہت بڑا فاصلہ ہے لیکن میں اس دوسرے پر کود کر نہیں پہنچا، شاید یہی وجہ ہے کہ جب آج مجھے یا آج کا یہ شعر عزیز ہے کہ ؎

اب کیا ہے فرشتوں کے تعارف کی ضرورت
انسان نے انسان کو پہچان لیا ہے

تو وہاں مجھے اپنے ماضی کی اس یادگار سے بھی نفرت نہیں کہ ؎

الٰہی! خیالوں کے خلوت کدے میں کوئی شعبدہ باز آیا ہے
وہ پردے ہٹے وہ کوئی مسکرایا۔ مجھے ہو بہو تو نظر آ رہا ہے

ہمارے ملک میں طبقاتی شعور تو شاید صرف سائنٹیفک تعلیم ہی سے پیدا ہو سکے اور اپنے مقدر پر راضی بہ رضا ہو کر بیٹھ رہنے اور توکل کے عقیدے پر قناعت کر لینے کو شاید انتہا درجے کی نخوت ہی سے چیخ سکیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ غریبی اور امیری کا خوفناک تفاوت یہاں کے اوسط درجے کے انسان کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ درست ہے کہ اس قسم کا احساس عموماً جذباتی ہوتا ہے اور انسان کڑھنے اور اپنے دل کو خون کرنے سے آگے کچھ سوچتا ہی نہیں لیکن غریبوں اور درمیانی طبقے کے لوگوں کی امیروں سے نفرت ایک ایسی حقیقت ہے جسے نہ مذہبی اخوت آنکھوں سے اوجھل کر سکتی ہے اور نہ مقدر پرستی۔ دیہات میں تو یہ تفاوت اور بھی تیز نظر آتا ہے، شاید اس لیے کہ ہزار ڈیڑھ ہزار کی آبادی میں کل ایک یا دو آدمی ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کے پسینے کی کمائی پر سانپ بن کر بیٹھے رہتے ہیں۔ میں نے جب پندرہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیے تو مناظرِ فطرت کے حسن اور اسلامی روایات کے طنطنے کے ساتھ ساتھ مجھے اس معاشرتی اور معاشی تفاوت نے بھی متاثر کیا اور

میں رومانوں اور خوابوں سے اَٹے ہوئے ذہن کا وہ چور دروازہ بند نہ کرسکا جس میں سے آنکھوں دیکھی سفّاک یقینیں اندر سرک آتی تھیں۔ مگر اس وقت یہ حقیقتیں مجھ پر محض رقّت کی کیفیت طاری کرسکتی تھیں اور میں اسی کیفیت کو اپنی کہانیوں میں منتقل کردیتا تھا۔ بہت بعد میں مجھے یہ سوچنے کا خیال آیا کہ فلاں غریب ہے تو آخر کیوں غریب ہے؟ فلاں نے اپنی بیٹی بیچ دی تو کیوں بیچ دی؟ فلاں نے چوری کی ہے تو کیوں کی ہے؟ —— —— —— فلاں بے گناہ نے تھانیدار کے سامنے ناک سے لکیریں کھینچیں تو کیوں کھینچیں؟ اور فلاں بنک سے بیگار پر کام کرنے چلا گیا تو کیوں چلا گیا؟ اور جب میں نے سب کچھ سوچا تو ہر حقیقت کے پیچھے مجھے روپلا کی تھیلی چھنچھناتی سنائی دی۔ میں اخلاقی اور روحانی قدروں کا منکر نہیں ہوں، میں داڑھی مونچھیں منڈا دینے یا کوٹ پتلون پہن لینے کو مشرقی اخلاقیات کی بے حرمتی نہیں سمجھتا۔ لیکن انسان سے محبت کرنے، خلوص برتنے، سچ بولنے، بے تعصب اور بے ریا رہنے، نڈر ہوکر سچائی کا اعلان کرنے اور ظالم کی طرف برسرِ بازار انگلی اٹھا کر اسے ظالم کہہ دینے کو بہترین اخلاق تصوّر کرتا ہوں، اور جب میں علی الاعلان سچ بولتا ہوں تو مجھے انسان کی روح کائنات پر پھیلتی محسوس ہوتی ہے۔ بہرکیف اخلاقی اور روحانی قدروں کا احترام کرتے ہوئے بھی میں نے یہی محسوس کیا کہ اگر انسانی طبقوں کا یہ تفاوت ختم ہوجائے۔ یا اگر ایسا ہو کہ کوئی انسان کسی انسان کا محتاج نہ رہے اور ہر انسان محض اپنے لیے نہیں بلکہ ساری انسانیت کے لیے اچھے اچھے کام کرے، اور آدمی اپنی انفرادیت کی کچھ اس ڈھب پر پرورش کرے کہ اس کے مدّ نظر ہمیشہ اجتماعی مفاد ہو تو جینے کا لطف آجائے۔ قیام پاکستان کے سلسلے میں اپنے علاقے میں مجھ سے جو کچھ ہو سکا محض اسی بنا پر کیا کہ ہمارے رہنماؤں کی تقریروں میں انسانی مساوات کی بشارتیں آباد ہوتی تھیں اور وہ لیڈر پہنتے تھے اور ہمارے دیہاتی کارکنوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے اور جلسہ گاہ میں پہنچ کر بھی اپنے چہرے پر سے سفر کی دھول نہیں پونچھتے تھے۔ میرا سیاسی شعور نابخت تھا، اس لیے میں دور تک نہ دیکھ سکا۔ اپنی ناک سے ذرا سا آگے دیکھ لینے کی ہمت بڑی آزمائشوں کے بعد پیدا ہوتی ہے۔

میں پشاور ریڈیو اسٹیشن میں پاکستانی نغمے لکھ رہا تھا جب ایک پروگرام اسسٹنٹ نے ریڈیو اسٹیشن کی چھت پر چڑھ کر اپنے ریوالور سے ہوائی فائر کیے اور اسٹیشن ڈائرکٹر نے سبز جھنڈا کھول دیا۔ یہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی تاریخ تھی اور اس وقت رات کے بارہ بجے تھے دنوں تک میں سرشاری کے عالم میں رہا۔ اور پھر ایک دن ریڈیو اسٹیشن سے واپس آتے ہوئے میں نے سڑک پر ہندوؤں اور سکھوں کی لاشیں دیکھیں اور بعد میں یہ بھی دیکھا کہ غیر مسلم عورتیں کپڑوں کی گٹھریوں کی طرح تانگوں میں ٹھونس کر بھگائی جارہی تھیں اور میں نے ایک جلتے ہوئے گھر میں ایک بچے کی چیخیں سنیں اور پھر جب پشاور شہر میں ہندوؤں کے محلّے کو آگ لگادی گئی تو میں صدر پشاور میں حواس باختہ بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا تھا جب ایک دوست کی ننھی سی لڑکی میرے پاس بھاگی آئی، مجھ سے چمٹ گئی اور روتے ہوئے بولی: "چچاجان، وہ دیکھیے آسمان جل رہا ہے!"

آسمان جل رہا تھا: بچّی نے غلط نہیں کہا تھا۔ آسمان جل گیا اور اس کی بجھی ہوئی راکھ انہی پر آ گری جنھوں نے اسے دیا سلائی دکھائی تھی۔ میرے ذہن میں دھڑا کے سے ہونے لگے۔ ملک کی سیاسی صورتِ حال نے مجھے قدم قدم پر چکرا ڈالا۔ یہ کیا ہو رہا ہے، ہم کہاں جارہے ہیں، ہم کہاں جاکر رکیں گے۔ اس وقت میں نے یہی استفہامیہ ایک رباعی میں منتقل کردیا تھا ؎

کیا اپنا سراغ خود نہیں پاؤ گے؟
کیا پھر کوئی اجنبی بلا لاؤ گے؟

یہ راہ تو اس موڑ پہ مڑ جائے گی
اے اہلِ وطن کہو کہاں جاؤ گے

امیر تیمور کے انصاف اور شہنشاہ اورنگ زیب کی نرم دلی اور عدل گستری اور بزرجمہر اور ہلاکو خاں کے دور کے بغداد کے امن و سکون کے بارے میں اب مجھ سے ریڈیو فیچر نہیں لکھے جا سکتے تھے، میرا ایک ڈرامہ "شکست و فتح" ریڈیو پر خاصا مقبول ہوا ہے. لیکن کسی کو معلوم نہیں کہ میں نے تیمور کی خوفناک شخصیت کو عدل و انصاف کے تخت پر بٹھاتے ہوئے اپنے ضمیر کی انتہائی پکار کا گلا گھونٹ دیا۔ میں آج بھی حضرت عمرؓ کا قصیدہ تک لکھنے کو تیار ہوں۔ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زہد و تقا کا معترف ہوں اور میں ٹیپو کی وطن دوستی سے پیار کرتا ہوں۔

لیکن جب مجھے دارا شکوہ پر ایک فیچر لکھنے کا حکم ملا اور میں نے اس فیچر میں اورنگ زیب کے مظالم کو ذرا واشگاف انداز میں بیان کیا تو "سنسر" چیخ اٹھے اور مجھ سے جواب طلبی ہوگئی۔ میں اپنے وطن کے کھیتوں اور فصلوں کی کہانیاں پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنے وطن کے لوگوں کی امنگوں اور دکھوں کی تصویریں کھینچنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ہر روز نئے سے نئے فیچروں کے ذریعے اپنے رہنماؤں کو اُن کے وعدے یاد دلاتا رہوں مگر جب میں نے ان امور میں اپنے قلم کی نوک کو تیز کرنا چاہا تو میں پشاور سے بھاگ گیا اور لاہور میں آکر میں نے بہت کچھ لکھا اور اگرچہ مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے ندامت سی محسوس ہوتی ہے، مجھ پر اور دوسرے ترقی پسند مصنفین پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ انھوں نے نئے وطن کی مصلحتوں سے آنکھیں پھیر کر اندھا دھند لکھا لیکن کم از کم میں اپنے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے جو کچھ لکھا وہ ذرا سا ڈر کر ہی لکھا۔ ورنہ اگر حکومت کے عتاب کا ڈر نہ ہوتا تو مجھے ذی اقتدار طبقے کو نہایت بے رحمانہ قسم کے ناسور اور جہالت کے گھناؤنے انداز کے زخم دکھانا تھے۔ صرف اس لیے کہ وہ ادھر بھی متوجہ ہوں۔ یہی تعمیری تنقید ہے۔

لیکن میں نے جھجک جھجک کر بھی جو کچھ لکھا اُس نے مجھے آخرکار جیل میں لا ڈالا۔ چھ مہینے تک میں یہی سوچتا رہا کہ مجھے یہاں کیوں بھیجا گیا ہے، مجھے تو ابھی اپنا وہ شہ پارہ لفظوں میں منتقل کرنا ہے جو ذی اقتدار جماعت کی ناک کا صحیح زیور بن سکتا ہے۔ میں تو ابھی تک کھل کر بات کہنے کا انداز ہی سیکھ رہا تھا۔

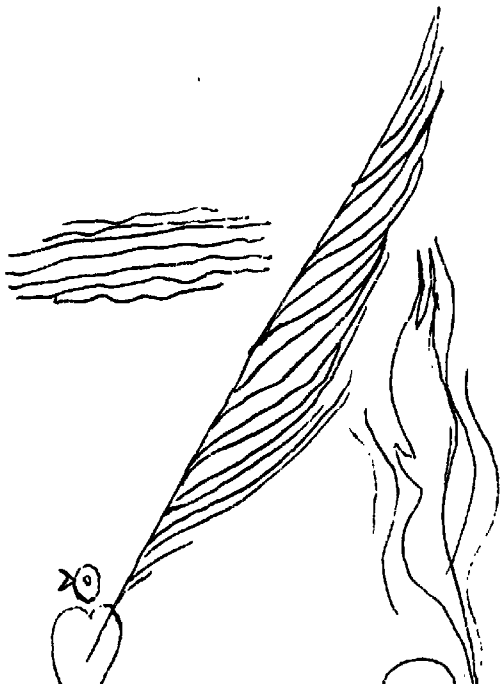
اور یہاں پہلے تو میرے ہم وطنوں نے ہی مجھ پر فتووں کی بوچھاڑ کر دی اور اس کے بعد ایک خوش گوار صبح کو میرے گھر کے دروازے پر پولیس کے ایک انسپکٹر نے کہا "یو آر انڈر اریسٹ!" —

تو کیا اپنا شہ پارہ لکھ کر مجھے پھانسی کا منتظر رہنا چاہیے۔!؟

یہ چند بکھری ہوئی یادیں تھیں، جو اپنی شخصیت کو دوسروں پر ٹھونسنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے ادب کے پس منظر کو ذرا سا واضح کر دینے کے لیے میں نے مدیر "ماحول" کے ارشاد کی تعمیل میں قلم بند کر دیں۔ میں نے ابھی کچھ بھی تو نہیں لکھا، چند نظمیں، چند غزلیں اور چند کہانیاں لکھ کر میں اپنے ان فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہوگیا جو ہر باشعور اور غیرت مند انسان کی طرح مجھے بھی تفویض ہوتے ہیں۔ میں ادب اور فن کی شاہراہ کا ایک مسافر ہوں، بہت دور کا سفر کرنے کے ارادے ہیں اور مجھے اعتراف ہے کہ میں ابھی ابتدائی مراحل بھی طے نہیں کر سکا۔ زندگی کا حسن اور کائنات کی حقیقت اور اس کائنات میں انسان کی مرکزی حیثیت! — یہ اور بے شمار دوسری باتیں ابھی میرے ذہن میں

پک رہی ہیں، تکمیل کا دعویٰ فن کی توہین نہیں، فن کار کی موت ضرور ہے، اسی لیئے اپنے آپ کو طالبِ علم کہنے سے مجھے خوشی ہوتی ہے اور مزید جستجو کا ذوق تازہ ہوتا ہے۔

چھتیس برس کا ہونے کو آیا ہوں، شادی شدہ ہوں، دو بیٹیاں ہیں، ایک کا نام ناہید ہے اور ایک کا نشاط، معاش کی مصیبتیں بے شمار ہیں، مگر اب مجھے مصیبتوں سے بھڑتے رہنے اور بھڑتے ہوئے مسکراتے اور ہنستے رہنے کا ڈھب آگیا ہے، اس لیئے بڑے مزے سے زندہ ہوں۔





نریش کمار شاد

"......... بھاڑ میں جھونکو اس زندگی کو، میں ایسی نئی زندگی کو موت سے بھی بدتر سمجھتا ہوں۔ میرے پاس ایک ہی تو قیمتی چیز ہے جس پر میں فخر کر سکتا ہوں اور وہ ہے میرا بانکپن۔ کیا عارضی اور نمائشی آسائش کے لئے اُسے بھی بیچ ڈالوں.............."

اگرچہ زیادہ تر جاننے والے مجھے محض شاد ہی کی وجہ سے جانتے ہیں، لیکن شاد عمر میں مجھ سے تیرہ سال چھوٹا ہے۔ وہی چھوٹے میاں سبحان اللہ والی بات ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا اس وقت شاد معرضِ وجود میں آیا تھا۔ اس کی پیدائش سے پہلے میں ایک سیدھا سادہ طالبِ علم تھا جس کی زندگی بڑی سادگی اور بڑے سکون سے گزر رہی تھی لیکن اس نے تو پیدا ہوتے ہی جیسے میرے لئے بے شمار الجھنیں پیدا کر دیں۔ غلط نہ ہوگا اگر میں یہ بھی کہہ دوں کہ میری تعلیم ادھوری رہ گئی ہے تو اس کا ذمہ دار شاد اور صرف شاد ہے۔ یہ روزِ ولادت ہی سے اوّل درجہ کا لاابالی اور آوارہ گرد ہے۔ جب اس نے ذرا ہوش سنبھالا تو کمبخت نے مجھے اپنی قیادت میں جا بجا اتنا گھمایا کہ مجھ ایسے سادہ لوح انسان کے دماغ کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ آخر انی طور پہ بے حد پریشان ہو کر اس سے انقطاعِ تعلقات کے بعد آج سے تقریباً بیس سال پہلے میں نے راولپنڈی کے ایک سرکاری دفتر میں ملازمت کر لی لیکن اس ظالم نے یہاں بھی میرا پیچھا نہ چھوڑا اور جب تک ملازمت سے مستعفی نہیں دلوا لیا مجھے چین نہیں لینے دیا۔ لگاتار کئی سالوں تک میں اس ناعاقبت اندیش کے ساتھ پھر کسی مقصد کے بغیر شہر شہر کی خاک چھانتا رہا۔ تقسیمِ وطن کے بعد اگرچہ اس سر پھرے کے ساتھ ایک مرتبہ پھر بغاوت اختیار کر لینے کے بعد میں نے سرکاری نوکری کر لی اور اب تک کر رہا ہوں۔ لیکن شاد کی خود سری اور بد دماغی کا وہی عالم ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سالہا سال تک اپنے دفتر میں جھک مارنے کے باوجود میں اب تک وہی کلرک ہوں جبکہ دیکھتے ہی دیکھتے میرے دوسرے ساتھی بڑے بڑے عہدوں تک پہنچ گئے۔ میرے متعلق تو میرے دفتر کے افسروں کی مشترکہ رائے یہ ہے کہ شعر کہنے کے سوا یہ دنیا کا کوئی اور کام کر ہی نہیں سکتا۔ حالانکہ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ مجھے کسی چیز سے چڑ ہے تو وہ یہی شاعری ہے، جس کے برتے پر شاد کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں بہت زیادہ سمجھدار نہیں لیکن اتنا تو سمجھتا ہوں کہ دنیاوی اعتبار سے ترقی حاصل کرنے کے لئے مصلحت اندیش ہونا بہت ضروری ہے۔ افسروں کی خوشامد نہایت لازمی ہے لیکن جب بھی مصلحت اندیش اور خوشامدی بننے کی کوشش کی شاد آڑے آ گیا۔ حد تو یہ ہے کہ کسی افسر سے بات کرنا تو درکنار اسے ڈھنگ سے سلام کرنے کی بھی شاد مجھے اجازت نہیں دیتا۔

اس حقیقت کو شاد بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ میرے ہی خون سے پروان چڑھا اور زندگی کے ہر مقام پر مجھے ہی ڈستا رہا۔ اس لحاظ سے اگر اسے "مارِ آستیں" کہا جائے تو زیادہ نامناسب نہ ہوگا۔ ویسے دوسروں کے معاملے میں وہ بہت دردمند بنتا ہے۔ دوسروں کی چھوٹی چھوٹی مصیبتوں سے آبدیدہ ہو جاتا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ سب گرمچھ کے آنسو ہیں۔ اگر اسے بہر حال رونا ہی ہو تو میری اپنی حالت بھلا کسی سے کم دردناک ہے۔

شاد کی قبیح عادات کا ذکر اس کی شراب نوشی کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اس کی تمام مذموم عادتوں کا سرچشمہ ہی شراب ہے۔ اکثر اوقات میرے اندر شاد، شاد کے اندر شراب اور شراب کے اندر شیطنت اپنے ایسے

ایسے نہ درتہ جلوے دکھاتی ہے جس سے میری طبعی شرافت اور فطری انکساری خون کے آنسو رو کر رہ جاتی ہے لیکن شاد ان آنسوؤں کو بھی شراب میں گھول کر نہایت بے حیائی سے پی جاتا ہے۔ شروع شروع میں وہ تفریحاً پیا کرتا تھا لیکن اب تو شراب نوشی اس کی عادت بن گئی ہے اور عادت بھی اس حد تک پختہ ہو چکی ہے کہ اب وہ شراب نہیں بلکہ شراب اسے پیتی ہے۔ اس کی مے نوشی مستی، سرمستی اور بدمستی کی حدوں سے نکل کر خود مستی تک پہنچ گئی ہے۔ عام لوگ تو کیا اس کی بلانوشی سے وہ شاعر بھی تنگ ہیں جن کی مے نوشی سے عام لوگ تنگ ہیں۔ میرے خیال میں اس کی بے تحاشا مے نوشی کی وجہ یہ ہے کہ وہ بزعم خویش غالب، اختر شیرانی، میراجی اور مجاز کی رندانہ روایات کو تازہ کرنا بلکہ انہیں آگے بڑھانا چاہتا ہے۔ حالانکہ شراب پینے سے وہ ان بڑے شاعروں کی صف میں تو کیا شامل ہوگا اپنی موجودہ حیثیت سے بھی گر جاتا ہے۔ شراب پینے کے بعد نہایت غیر ذمہ دارانہ حرکات کا ارتکاب کرنے کے علاوہ شاد اور کچھ کر ہی نہیں سکتا شعر کہنا تو کجا، میرے خیال میں اس عالم میں شعر سمجھنا بھی اس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

بہت سے جاننے والے اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ شاد کی وجہ سے میں مالی اعتبار سے کافی آسودہ حال ہوں گا۔ حالانکہ حقیقت اس کے قطعی برعکس ہے۔ مشاعروں، پبلشروں اور اخبار رسالوں کے دفتروں سے شاد کو اپنی تخلیقات کا جو معاوضہ ملتا ہے اس سے کہیں زیادہ رقم اس کی رندانہ بداعتدالیوں اور فضول خرچیوں کی نذر ہو جاتی ہے۔ شاد کی ستم ظریفی اور ڈھٹائی دیکھئے۔ میں جب بھی سختی سے اس کی مے نوشی پر معترض ہوتا ہوں تو وہ اس عادت کی ذمہ داری الٹی مجھ پر عائد کر دیتا ہے اور میری خفگی کے جواب میں ہمیشہ یہی کہتا ہے۔

جب تم مجھ پر حاوی ہو کر میری شخصیت کو کچلنے کی کوشش کرتے ہو اور مجھے دنیاوی آلائشوں سے آلودہ کرنے کے لئے اپنے رنگارنگ پھندوں میں الجھانے کے منصوبے تیار کرتے ہو تو میں اپنے تحفظ کی خاطر تم سے فرار حاصل کرنے کے لئے مجبوراً جام و مینا کا سہارا لیتا ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ شاد بے حد حساس اور جذباتی ہے لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ مجھ سے پریشان ہو کر وہ اپنی پریشانی کا مداوا شراب میں کیوں کر ڈھونڈ لیتا ہے۔ میری ایماندارانہ رائے تو یہ ہے کہ شاد اپنی بری عادت کے جواز کے لئے خواہ مخواہ میرا سہارا لیتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شاعری اور شراب اسے ورثہ میں ملی ہے اور وہ اس وراثت سے نہ دستبردار ہونا چاہتا ہے۔ نہ ہو سکتا ہے ویسے میں کبھی کبھی یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ شاد اگر اس بلا کا بلانوش نہ ہوتا تو غالباً اتنا مقبول بھی نہ ہوتا۔ عام لوگ عام تو کیا سمجھیں گے البتہ اس کی رندانہ حرکات کو دیکھ کر اس غلط فہمی کا شکار ضرور ہو جاتے ہیں کہ شاد کوئی بہت بڑا اور بہت اچھا شاعر ہے مجھے اس امر کا پورا یقین ہے کہ مشاعروں یا شعر و ادب کی محفلوں میں گویوں، بھانڈوں اور نقالوں کی کامیابی کو دیکھ کر اپنے احساس کمتری پر اراداتاً بے خودی و مستی کی چادر تان لینے کے سوا شاد کو کوئی اور چارہ ہی نظر نہیں آتا۔

لیکن اپنے متعلق میرے اس تجزیئے کو غلط ثابت کرنے کے لئے پچھلے کچھ مہینوں سے وہ تائب ہو چکا ہے مگر سچی بات تو یہ ہے کہ اس کی توبہ قابل اعتبار نہیں۔ کیونکہ سالہا سال کی مے نوشی اس کی قوت ارادی کو سلب کر چکی ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ وہ غضب کا ضدی بھی ہے۔ اس لئے شاید محض ضد کی وجہ سے وہ اس موروثی لعنت سے دامن چھڑا لے۔ اگر سچ مچ ایسا ہو گیا تو

بہت بڑا پاپ کٹ جائے گا۔

جب کوئی مجھ سے یہ کہتا ہے کہ شاد بہت ذہین شاعر ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ اس آدمی کی عقل پر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دوں۔ میں گزشتہ کئی سالوں کے تجربے کی بنا پر وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ شاد میں ذہانت سرے سے ہے ہی نہیں۔ اگر یہ نامراد ذہین ہوتا تو نہ خود مارا مارا پھرتا اور نہ مجھے در بدر کی ٹھوکریں کھانا پڑتیں۔ جب میں اسے یہ مشورہ دیتا ہوں کہ دیکھو بھائی ایک تم ہی نہیں۔ بھارت دیش میں اور بھی تو شاعر ہیں۔ حکومت کے قصیدے گا گا کر اور حکامِ اعلیٰ سے راہ و رسم بڑھا کر کس ٹھاٹ کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ کیسے شاندار بنگلوں میں رہتے ہیں۔ اڑوس پڑوس میں ان کی کتنی عزت ہے۔ ایک تم ہو کہ خانہ بدوشوں کی طرح زندگی ایسے گزار رہے ہو جیسے زندگی زندگی نہ ہو، کالا ڈھول ہو جو زبردستی تمہارے گلے میں ڈال دیا گیا ہو۔ تمہارا تو یہ حال ہے کہ کئی بار دفتر سے گھر تک پہنچنے کے لئے بس کا کرایہ بھی نہیں اپنے دفتر کے مین گیٹ پر بیٹھے ہوئے پنواڑی سے ادھار مانگنا پڑتا ہے۔ ارے میاں! تم بھی کسی بڑے آدمی سے چپک جاؤ۔ سب دلدر دور ہو جائیں گے اور تمہاری شاعری میں بھی نئی زندگی پیدا ہو جائے گی۔

تو یہ بد دماغ مجھے ڈانٹ کر جواب دیتا ہے۔

بھاڑ میں جھونکو اس زندگی کو۔ میں ایسی نئی زندگی کو موت سے بھی بدتر سمجھتا ہوں۔ میرے پاس ایک ہی تو قیمتی چیز ہے جس پر میں فخر کر سکتا ہوں اور وہ ہے میرا بانکپن۔ کیا عارضی اور نمائشی آسائش کے لئے اسے بھی بیچ ڈالوں۔ نہیں نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ جب تک میں زندہ ہوں میرا یہ بانکپن شہریاروں کے دل میں ایک کانٹے کی طرح کھٹکتا رہے گا۔

اب میں شاد کو کیونکر سمجھاؤں کہ اے میری ذات کے جی ٹائپ کوارٹر میں رہنے والے خوددار شہزادے۔ شہریاروں کے دل میں تو کیا البتہ تو میرے دل میں ضرور کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے اور اے شعر و سخن کے باغ کے بلبل تو میرے وجود کے پنجرے میں کیوں آ گیا۔ میں تو ایک دنیادار بابو ہوں جس کا دن دفتر کی بھاری بھرکم فائلوں میں سر کھپا کر کٹتا ہے اور رات کو جس کے آرام کے محدود لمحات تیری شاعری کی ناز برداری میں صرف ہو جاتے ہیں۔ اپنی الٹی سیدھی شاعری کی خاطر تو نے میری کئی راتوں کی نیند حرام کر دی ہے ظالم! عین ممکن ہے اپنی اسی شاعری کی وجہ سے تو دوسروں کے لئے شمعِ محفل بن جاتا ہو لیکن تیری شاعری نے میری زندگی کا مستقبل تو بالکل تاریک کر دیا ہے۔



قتیل شفائی

"...... میں بنیادی طور پر غنائی مزاج رکھنے والا شاعر ہوں...... میرے نزدیک ماتھے پر تیوریاں ڈالے ہوئے شعر کی قیمت اُس کاہن سے زیادہ نہیں جس کی عظمت سے لوگ ڈرتے تو ہیں مگر اُس سے پیار نہیں کرتے۔ اور میں وہ خوش قسمت شاعر ہوں جسے قاری کا پیار ملا ہے ...."

میری شاعری نے اگر لکھنؤ، دلی، دکن یا پنجاب میں آنکھ کھولی ہوتی تو ایک بات بھی تھی لیکن میری شاعری نے تو وہاں جنم لیا جہاں شاید چند لوگوں نے کسی کتاب میں سے پڑھ رکھا ہوگا یا کسی آتے جاتے سیاح کی زبانی سن لیا ہوگا کہ اس کائنات میں شاعر نام کی بھی ایک مخلوق پائی جاتی ہے اور یہ ایک ایسی مخلوق ہے جس کی نحوست بھری پُری آبادیوں کو اُجاڑ دیتی ہے۔ غالباً اسی مفروضے کی بنا پر میری شفیق ماں راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر مجھے مشقِ سخن سے روک روک دیتی تھیں۔

میں ۲۲ دسمبر ۱۹۱۹ء کو ہری پور ہزارہ میں پیدا ہوا۔ میرے دادا اکوڑہ خٹک سے یہاں آئے تھے۔ بہت ممکن ہے خوشحال خان خٹک کے پاؤں سے اُڑتا ہوا خاک کا کوئی ذرہ میرے اجداد کے دامن کو مالا مال کر گیا اور وہی دولت بالآخر مجھے اپنے باپ سے وراثت میں ملی ہو۔

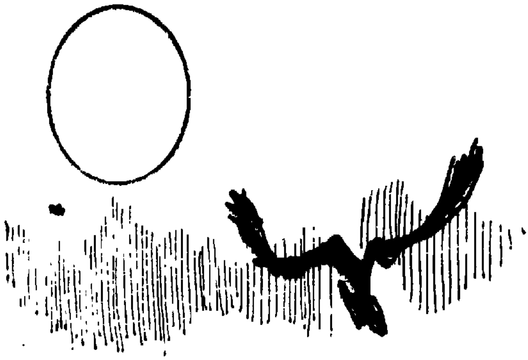
یوں تو مجھے بارہ تیرہ برس کی عمر ہی سے میری سوچ بے چین سی رکھتی تھی لیکن محسوس کر کے شعر کہنے کی ابتدا ۱۹۳۵ء سے ہوئی جب اچانک میرے شاہ خرچ باپ کا سایہ میرے سر سے اُٹھ گیا اور میرے شعور نے رنگا رنگ تجربوں کو اپنے اندر جذب کرنا شروع کیا۔ اور مجھے زندگی میں پہلی بار اس حقیقت کو سمجھنے کی فرصت ملی کہ لوگ ایک ایک چہرے پر کئی کئی چہرے سجائے بیٹھے ہیں۔

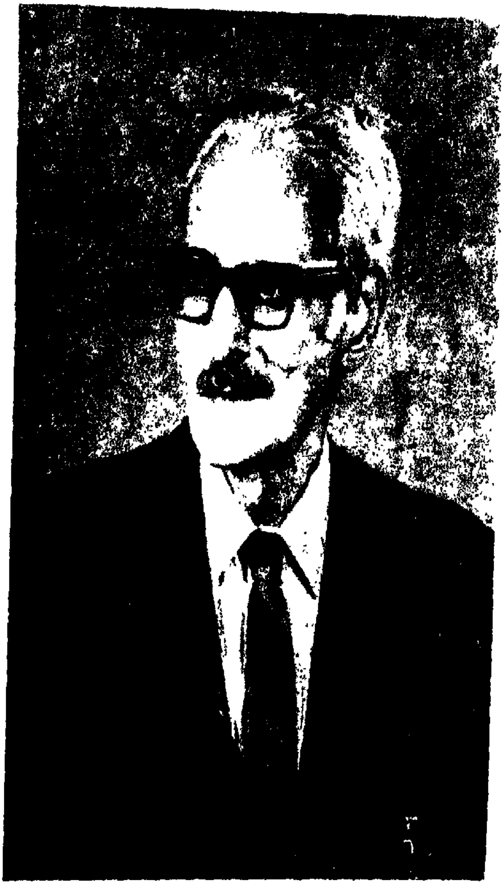
فکرِ معاش کی ندی میں آیا تو ہری پور کے سبزہ زاروں کو چھوڑ کر راولپنڈی آنا پڑا۔ یہ شہر اور اس شہر کا مزاج مجھے ایسا راس آیا کہ اس شہر کی بو باس اب تک اپنی سانسوں میں رچی ہوئی محسوس کرتا ہوں اور اکثر سوچتا ہوں کہ اگر میں راولپنڈی نہ آیا ہوتا تو مجھے اپنی سوچ کی انگلی پکڑے نہ جانے کہاں کہاں گھومنا پڑتا۔

راولپنڈی میں تلوک چند محروم تھے، عبدالعزیز فطرت تھے، عبدالحمید عدم تھے، باقی صدیقی تھے، انجم رومانی تھے اور نوجوانوں میں احمد ظفر تھے، جمیل ملک تھے، مگن ناتھ آزاد تھے، منظور عارف تھے، حسن طاہر تھے اور ان سب سے بڑھ کر حضرت شفا تھے جنھوں نے میری شاعری کو اپنے پاؤں چلنا سکھایا اور پھر اسی راولپنڈی میں بیٹھے بیٹھے اپنے ندیم صاحب کوسوں کی دوری کے باوجود میری روح میں آ بسے اور نوجوان شعراء کے ایک بہت بڑے ہجوم میں مجھے ایک الگ پہچان کا مالک بنا دیا۔

آج میں لاہور میں مقیم ہوں۔ یہاں میرا قیام ۱۹۴۷ء سے ہے۔ اس دوران میں نے نظمیں کہیں، گیت لکھے، غزلوں کو ذریعۂ اظہار بنایا لیکن یہ سب کچھ میں نے محض رسمی یا روایتی ڈھب سے نہیں کیا۔ بلکہ میں نے تکنیک کے لاتعداد تجربوں کے علاوہ شاعری کو اپنا الگ رنگ اور اپنا الگ اسلوب بھی دیا۔ میری نظمیں، میرے گیت اور میری غزلیں لوگ صرف پڑھتے ہی نہیں، اپنے حافظے میں محفوظ بھی رکھتے ہیں، انھیں دہراتے بھی ہیں، انھیں گنگناتے بھی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک شاعر کے لیے دس جانب دار نقادوں سے ایک غیر جانبدار قاری زیادہ اہم ہے۔

میں بنیادی طور پر ایک غنائی مزاج رکھنے والا شاعر ہوں مجھے اس بات پر پوری پوری قدرت حاصل ہے کہ ایک روتے بسورتے جذبے کو بھی چاندی کی چھوٹی چھوٹی گھنٹیوں کا ہار پہنا دوں۔ میرے نزدیک ماتھے پر تیوریاں ڈالے ہوئے شعر کی قیمت تیاکاہٹ سے زیادہ نہیں جس کی عظمت سے لوگ ڈرتے تو ہیں مگر اس سے پیار نہیں کرتے اور میں وہ خوش قسمت شاعر ہوں جسے قاری کا پیار ملا ہے۔





ساحرؔ ہوشیارپوری

"...... شعر کہنا میرے نزدیک اپنے لطیف جذبات اور احساسات کے اظہار کا موثر ترین وسیلہ ہے اور احساسات و اظہار میں ہم آہنگی اس کا اعلیٰ ترین نمونہ! میرا ذوقِ سخن گوئی ایک شوق اور لگن ہے جسے نصف صدی کی ریاضت کے بعد میں عبادت کے مترادف سمجھنے لگا ہوں ......"

اپنا تعارف لکھنا یا حالات زندگی کو قلمبند کرنا ایک فن کار کے لیے بڑی دشواریاں پیدا کرنے والا مسئلہ ہوتا ہے۔ بہرحال اس مرحلے سے بھی عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتا ہوں۔

۱۱ فروری ۱۹۷۹ء کو میں ۶۹ برس کا ہو جاؤں گا۔ اس طویل مدت میں زمانے نے مجھے کیا دیا اور زندگی سے میں نے کیا برتاؤ کیا، اس کا نچوڑ اس مضمون میں موجود رہے گا۔

ہمنشیں چند اپنے ذمّے دھر چلے

وطن مالوف ہوشیارپور ہے۔ ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی۔ اور پھر ۱۹۳۲ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے فارسی میں ایم اے کیا۔ کالج میں ن۔ م۔ راشد، فیض احمد فیض، سراج الدین ظفر، حفیظ ہوشیارپوری کی رفاقت حاصل رہی۔ اور احمد شاہ بخاری (پطرس)، سید اولاد حسین شاداں بلگرامی، ڈاکٹر محمود شیرانی اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ایسے بلند مرتبت اور نامور اساتذہ کے زیر سایہ تربیت اور رہنمائی میسر آئی۔ ان دنوں لاہور کی فضاؤں میں علامہ تاجور نجیب آبادی، حفیظ جالندھری، ہری چند اختر، احسان دانش اور اختر شیرانی کے نغمے گونج رہے تھے۔ ایسے خوشگوار ادبی ماحول میں میرے شعر گوئی کے فطری جوہر کو پروان چڑھنے کا خوب موقع ملا۔ اور جب ۱۹۳۱ء میں "ادبی دنیا" ایسے معیاری جریدے میں میری ایک ابتدائی نظم "صاعقہ" اشاعت پذیر ہوئی تو نئے ولولوں اور نئے حوصلوں کے ساتھ ساتھ میرے شعور میں خود اعتمادی کے احساس نے سر ابھارا۔ جس کی تکمیل کے لیے میں ابوالفصاحت حضرت جوش ملسیانی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور انھوں نے مجھے اپنے حلقۂ تلمذ میں شامل کرنے کا فخر عطا کیا۔

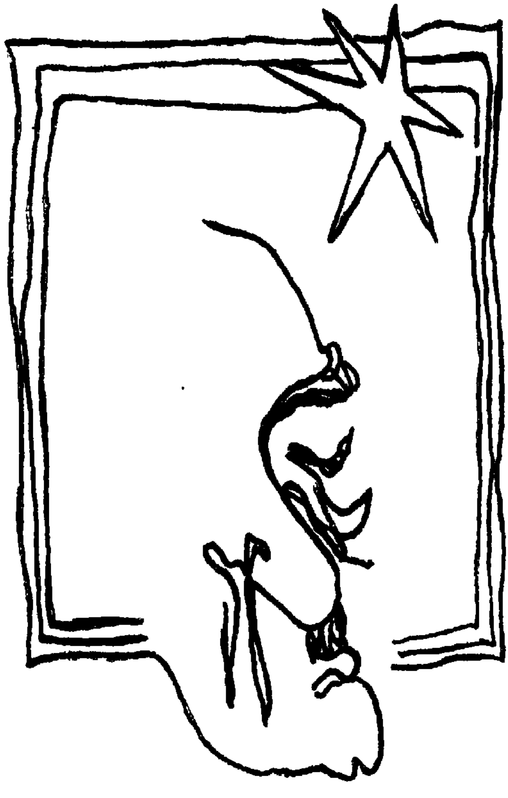
۱۹۴۷ء کا انقلاب میرے لیے بھی نئے مسائل اور نئی الجھنیں لے کر آیا۔ اور مجھے مشرقی پنجاب کے تنہا اور واحد ہندو مہاجر کی حیثیت میں ہوشیارپور کو خیرباد کہنا پڑا۔ دلّی میں چند روزہ قیام کے بعد کانپور چلا گیا اور وہاں سے ماہنامہ "چندن" جاری کیا۔ جسے ناساعد حالات کے باعث سال بھر کے بعد بند کر دینا پڑا۔ ۱۹۵۰ء میں دلّی میں اولین جشن جمہوریت منایا گیا۔ تو میں نے سکریٹری کے فرائض انجام دیے۔ اب اٹھائیس برس سے یہیں مقیم ہوں۔

اُردو زبان کے بہی خواہوں، شیدائیوں، نقادوں نیز اپنے دوستوں اور عزیزوں کا میں نہایت ممنون متشکر ہوں کہ اُنھوں نے مجھے محبت، خلوص اور قدر افزائی کی لازوال نعمت سے مالامال کیا ہے۔

۱۹۷۰ء میں دلّی میں "جشنِ ساحر" منایا گیا۔ اُسی سال ہوشیارپور میں "شامِ ساحر" کا انعقاد ہوا۔ ۱۹۷۱ء میں آل انڈیا ہندی اُردو سنگم لکھنؤ نے غزل ایوارڈ دیا۔ ۱۹۷۴ء میں قومی یک جہتی لسانی فورم (سیوان دیوبی) نے غزل ایوارڈ کے لیے مجھے منتخب کیا۔ اور پھر ۱۹۷۶ء میں ارم ایجوکیشن سوسائٹی لکھنؤ نے بھی مجھے غزل ایوارڈ سے نوازا۔ دو مجموعے اُردو رسم خط میں شائع ہو چکے ہیں۔ "سحرِ غزل" ۱۹۵۹ء میں منصۂ شہود پر آیا۔ "سحرِ نغمہ" ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔ اور اس پر مرکزی حکومت کی وزارتِ تعلیم و سماجی بہبود نے اوّل انعام اور سرٹیفکیٹ آف میرٹ

عطا کیا۔ دیوناگری رسم خط میں میرے کلام کا انتخاب "جل ترنگ" کے نام سے پی۔ کے پبلی کیشنز دلی نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔

شعر کہنا میرے نزدیک، اپنے لطیف جذبات و احساسات کے اظہار کا موثر ترین وسیلہ ہے اور احساس و اظہار میں ہم آہنگی اس کا اعلیٰ ترین نمونہ! میرا ذوقِ سخن گوئی ایک شوق اور لگن ہے، جسے نصف صدی کی ریاضت کے بعد میں عبادت کے مترادف سمجھنے لگا ہوں۔ صحت مند کلاسیکی شاعری کا دلدادہ ہوں اور جدید شاعری کی اعلیٰ تخلیقات کا معترف و مداح بھی کیوں کہ جدید شاعری بھی تو کلاسیکل شاعری ہی کی ترقی یافتہ صورت ہے۔





عزیز قیسی

"...... پتہ نہیں میرے عزیز! یہ باتیں میں تمہیں سنا رہا ہوں یا خود اپنے گناہوں کا اعتراف کرکے اپنے دل کو تسلّی دے رہا ہوں۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ "آپ بیتی" بیان کرنے میں "احساسِ گناہ" اور "اعترافِ گناہ" کا بہانہ تو مل جاتا ہے.........."

برادر عزیز! کیا لکھوں؟ میری عمر آپ بیتی لکھنے کی نہیں ہے؟ ابھی تک گردن گردن علائق دنیا کی ندی میں غرق ہوں۔ پیچ کے نتائج و عواقب سے بے نیاز ہونے کی ہمت نہیں ہے۔ ابھی زندہ ہوں۔ زندہ رہنے پر مجبور ہوں۔ موت سے بالکل نہیں ڈرتا۔ زندگی سے ڈرتا ہوں۔ جو اچھے بُرے رشتوں کچے پکے تعلقات کی بنیاد پر چلتی ہے۔ کچھ پردے، کچھ چشم پوشیاں، کچھ خوش گمانیاں اور غلط فہمیاں۔ آج بھی میرے لئے اور میرے متعلقین کے لئے بے حد ضروری ہیں۔

پٹھان ہوں۔ پٹھانوں کے بے حد خوددار۔ ضدّی، سرکش، زود رنج، زود پشیماں گھرانے میں پیدا ہوا ہوں۔ ایسے باپ کا خون رگوں میں ہے جس نے بہت چھوٹی عمر میں (جب وہ گیارہ برس کا تھا) اپنے حقیقی چچاؤں کی کمینگی کی وجہ سے، گڑھی، زمین، جائداد سب چھوڑ دیا تھا اور یتیم یسیر، بے سہارا، دل گرفتہ — ایک بڑے شہر میں تنہا زندگی گزارنے آیا تھا۔ جس نے اُس عمر میں سخت سے سخت جسمانی محنت کی، سپاہی بنا۔ خود تعلیم حاصل کی، اچھی ملازمت حاصل کی جو اس زمانے کے نوجوانوں کا منتہائے مقصود تھا۔ عربی، فارسی اور اُردو کی چار پانچ کتابیں پڑھنے کے باوجود، اپنے محلے کے ذہین پڑھے لکھے لوگوں کا "سرگروہ" رہا۔ عمر بھر خشک روٹی جو آزاد ہو کر، جس کی زبان پر ہمیشہ رہا۔ جو کم عمری میں اتنے تلخ تجربات سے گزر چکا تھا کہ انسان سے جس کا بھروسہ اُٹھ چکا تھا جو رشتہ داروں سے میل ملاپ کو لعنت اور دوستوں پر بھروسہ کرنے کو حماقت سمجھتا تھا۔ جو اپنے بل پر جینا چاہتا تھا۔ جس نے زندگی بھر کوئی اچھا لباس نہیں پہنا اچھا کھانا نہیں کھایا اور اپنے بڑے کنبے کو پالتا رہا۔ جس نے خیرات اور امداد تو ایک طرف، کسی سے قرض لینے کو بھی ذلت سمجھا۔

برادر عزیز! مجھے بھی وہ خودداری اور ہیکڑی ورثے میں ملی ہے۔ اب اگر اپنی بے نیازی اور خودداری کے واقعات سناؤں تو یہ خود ستائی ہوگی اور تم یقین نہیں کرو گے۔

ماں سیدانی تھیں۔ ان پڑھ تھیں۔ مگر بے شمار فارسی کے شعر، کہاوتیں اور ضرب الامثال ان کے نوک زبان تھے۔ امام جعفر صادق کی نیاز کے وقت سنائی جانے والی لکڑہارے کی دردناک داستان سے لے کر پریوں، جنوں، راکھششوں اور دیوزادوں کی کہانیاں انھیں یاد تھیں۔ پیرانِ پیر کی کرامتوں سے لے کر، نقش بندی فقیروں کی حکایتیں وہ ہمیں سناتی تھیں۔ ان کی کہانیوں کے کردار مجھے اب بھی ملتے ہیں۔ لیکن ایک کہانی جو وہ سات بھائیوں اور ایک بہن، کی سناتی تھیں وہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ ان سب کو ایک دیو نے قتل کر کے ایک چشمے کے پاس دفن کر دیا تھا۔ اور خدا کی قدرت سے وہ سات بھائی سات تاڑ کے پیڑ بن گئے تھے اور بہن چنبیلی کی بیل۔ میرے باشعور کو پہنچنے تک سے کئی نومولود اور نوعمر بھائی طاعون اور چیچک کی وباؤں میں میرے سامنے مرے تھے۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ کوئی راکھشش انھیں مار دیتا ہے۔ اور ہم انھیں زمین میں دبا کے آجاتے ہیں۔ میری ماں کو بہت اولادیں ہوئیں لیکن ہم سات بھائی زندہ بچے۔ ایک بہن میری پیدائش سے پہلے مر چکی تھی۔ دوسری جو میرے بعد تھی وہ پندرہ برس کی عمر میں حیدرآباد کے آخری طاعون میں مری۔ بہن چنبیلی کی بیل بن گئی۔ ہم سات بھائی جو قتل نہیں ہوئے تاڑ کے پیڑوں کی طرح

دیوقامت ہو چکے ہیں۔ لیکن — وہ کہانی مجھے نہیں بھولتی۔

میرے عزیز! اس کہانی سے تمہیں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ ایسی کہانیاں تو سب کی مائیں سنائی ہیں۔ میری ماں میں کیا خاص بات تھی۔ شاید یہ بات کچھ دلچسپ معلوم ہو کہ میری ماں کی آواز بھی کبھی بے پردہ نہیں ہوئی۔ لیکن یہ بات بھی ایسی قابلِ ذکر نہیں۔ شاید یہ بات قابلِ ذکر ہو کہ میری ماں بہت غریب گھرانے کی ہوتے ہوئے بھی بڑی فراخ دل تھیں۔ بہت دردمند دل رکھتی تھیں۔ اپنی غریبی اور میرے باپ کی سخت نگرانی کے باوجود وہ محلے بھر کی عورتوں کی مدد کیا کرتی تھیں۔ اناج اور کپڑے سے۔ وہ ایسے بانٹتی تھیں جیسے وہ حاتم طائی کی بیٹی ہوں۔ اس کے لئے انھیں میرے باپ کی قہرمانی بھی سننی پڑتی تھیں۔ مجھ میں شاید کچھ یہ وصف بھی ہو۔ لیکن پھر وہی الزام آئے گا۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننے کا۔

ذہانت (پٹھانوں میں ؟؟) ہمارے پورے گھرانے میں ہے۔ میرے بڑے بھائی۔ نویں جماعت میں انگریزی میں سو میں سو نمبر لے کر سارے مدرسے کو حیران کر چکے ہیں۔ میرا ایک چھوٹا بھائی چھٹی سے سیدھے آٹھویں میں جا چکا ہے۔ میرا ایک اور بھائی میٹرک میں سارے اسٹیٹ میں ٹاپ کر چکا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں نے نو سال کی عمر میں قرآن معہ ترجمہ پڑھ چکا تھا۔ اور تیرہویں سال بالتجوید و تفسیر ختم کر چکا تھا۔ اور میں نے فارسی، عربی کی صرف و نحو کی کتابیں پڑھی ہیں تو لوگ کیا کہیں گے؟

تو پھر میں کیا لکھوں میرے بھائی۔ کب پیدا ہوا؟ کس کس اسکول میں تعلیم حاصل کی؟ کون سے کالج سے ڈگری لی؟ کن حالات میں بڑا ہوا؟ بچپن میں کیا کیا کارنامے انجام دیئے۔ جوان ہو کر کیا تیر مارے؟ کیا حاصل ان باتوں سے حالات تو وہی ہیں جو سب جانتے ہیں۔ ہاں کچھ واقعات ایسے ضرور ہیں جو صرف میں جانتا ہوں۔ کچھ گناہ ایسے مجھ سے سرزد ہوئے ہیں کہ پشیمانی اور ندامت کا کرب مجھے دے گئے ہیں۔ شاید ان باتوں میں تمہارے لئے کوئی دلچسپی ہو۔

تو سنو! میں نے بچپن میں چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے اپنے باپ کے غصے سے بچنے کے لئے، اپنے ٹیچروں پر اپنی سمارٹنس کا رعب جمانے کے لئے، اپنی غریبی اور بے بضاعتی پر پردہ ڈالنے کے لیے اور نہ جانے کس کس بات کے لیے جھوٹ بولے ہیں، بہت جھوٹ بولے ہیں۔ آج بھی میں جھوٹ بولتا ہوں اور اس احتیاط سے بولتا ہوں کہ لوگوں کو میرے "با اصول" ہونے پر اعتبار آجائے۔ میں نے چھوٹی موٹی چوریاں بھی کی ہیں اور بے ایمانیاں بھی۔ اب میں اگر اپنی برائیوں کا ذکر کر دوں تو وہ لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے جن کا میری برائیوں سے نقصان ہوا تھا۔

میرا ہم جماعت خورشید حسن اب میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا جس کے جغرافیہ کی کتاب (جو کتابوں میں سب سے زیادہ قیمتی ہوتی تھی) اپنے ایک دوست وحید کے ساتھ میں نے چرائی تھی اور اسے بیچ کر ہم نے زندگی میں پہلی بار ہوٹل میں مٹھائی اور دال سیو کھائی تھی اور چائے پی تھی۔ اور اس چوری کا آج تک پتہ نہیں چلا۔ وہ لڑکی بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی جو ہمارے پڑوس میں رہتی تھی۔ اور مٹی کی بنی ہوئی اونچی دیواروں میں لگی کھڑکی سے جھانکتی رہتی تھی۔ اور مجھے اس نے اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ مجھ سے عشق کرتی ہے۔ میں نے کئی راتیں اس کے لئے جاگ کے کاٹی ہیں۔ اور اس کے ساتھ پتہ نہیں خوابوں میں کیا کیا حرکت کر چکا ہوں۔ میں تم سے اس لڑکی کا ذکر بھی کر سکتا ہوں جو بڑے کھلے دل کی تھی۔ اسے میری شاعری پسند تھی۔ وہ دوستانہ انداز میں مجھ سے

تھی۔ میرے گھر آتی تھی۔ میرے بستر پر بھی بے تکلفی سے لیٹ جاتی تھی اور اسے اس صاف دلی کی یہ سزا ملی کہ شہر بھر میں وہ بدنام ہوئی۔ میں نے اس بدنامی کو مٹانے کے بدلے، اس کی توثیق کر دی۔ اور بڑی کمینگی سے یہ بات پھیلا دی کہ میرا اس سے تعلق ہے جب اس "فرضی تعلق" کی کہانی میرے ایک رازدار نے جس سے مجھے ایسی امید نہیں تھی اس لڑکی تک پہنچا دی تو اندازہ کیجئے اس بیچاری پر کیا گزری ہوگی۔ آج بھی مجھے وہ بات یاد آتی ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے میں بے حد کمینہ آدمی ہوں۔

میں نے اپنی عدالت کی ملازمت کے دوران (جو صرف چار سال چلی اور مجھے اپنے "سیاسی تعلقات" کی بناء پر استعفیٰ دینا پڑا) بہت رشوت لی ہے۔ اگرچہ میری وہ ملازمت، میری کارکردگی اور فرض شناسی کی وجہ سے میری یادگار ملازمت ہے۔ میرے اس وقت کے افسر اور ماتحت وکیل اور اہل غرض جن کی تعداد ہزاروں میں ہے آج بھی میرا نام عزت سے لیتے ہیں لیکن میں جانتا ہوں میں نے کتنی بدعنوانیاں بھی کی ہیں۔ رشوت میں نے کبھی مانگی نہیں خود مجھے ملتی رہی۔ یہ بھی سچ ہے لیکن میں، جس نے اپنے منصب کی ایمانداری، جفاکشی اور بیدار ضمیری کی بار بار تعریف کی ہے، یہ گناہ کیا ہے۔ پہلے پہل جب میں نیا نیا سروس میں آیا تھا، جب کسی شخص کی جائداد پامال قرق ہوتا کسی کے نام گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوتے تو رات بھر میں سو نہیں سکتا تھا لیکن جب انھیں کاموں کے بدلے مجھے رشوت ملنے لگی تو جس روز کسی کا گھر نہ اجڑتا اور کسی کو گرفتار نہ کیا جاتا تو مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ میں اس شخص کو کبھی بھول نہیں سکتا جس نے اپنے حق میں "ناحق" فیصلہ کرانے کے لئے اپنی "بیوی" پیش کر دی تھی اور میں نے یہ رشوت قبول کر لی تھی اب وہ شخص ایک بڑے بار کا مالک ہے۔ مجھے شراب اب بھی مفت آفر کرتا ہے۔ اور میں اب بھی آفر قبول کر لیتا ہوں۔

میں نے شراب پی کر کوئی گناہ کیا ہے؟ کوئی حرام شئے پی ہے؟ ایسا میں نے کبھی نہیں سوچا۔ اگرچہ میرے والد نے کبھی شراب پینا تو ایک طرف کسی شرابی سے بات بھی نہیں کی تھی۔ شراب کی بو کیسی ہوتی ہے وہ نہیں جانتے تھے۔ وہ بے حد مذہبی آدمی تھے برسوں جب تک ان کی صحت نے اجازت دی وہ پچھلے پہر رات جاگ جاتے تھے۔ غسل کرتے تھے اور پھر پنج سورہ، اور دعائے گنج العرش پڑھنے کے بعد فجر کی نماز پڑھتے تھے۔ میں نے بھی ابتدائے عمر میں بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ پنجوقتہ نمازیں پڑھی ہیں لیکن جب میں مذہب سے برگشتہ ہوا، باشعور طریقے سے برگشتہ ہوا، تب میں نے پہلی بار شاہد صدیقی کے ساتھ شراب پی۔ اس "مشروب حافظ" کا مجھ پر اتنا خوشگوار اثر ہوا کہ شراب میں مستقل پینے لگا (اگرچہ مسلسل آج تک نہیں پی) میرے والد کو یہ خبریں ملتی رہیں۔ لیکن ہمیشہ وہ مخبروں اور خیر خواہوں کو ڈانٹ دیا کرتے تھے کہ اُن کا بیٹا۔ اُن کا خون۔ یہ گناہ کبیرا کبھی نہیں کر سکتا۔ ایک بار جب میں ایک مشاعرے میں شراب کے نشے میں دھت پہونچا تو سارے شہر میں یہ بات پھیل گئی۔ دو ایک اخباروں نے بھی اپنی اشاعتوں میں یہ رپورٹ چھاپی۔ میرے والد کو جو صدمہ ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔ آج بھی جب میں یہ واقعہ بیان کر رہا ہوں اور میرے والد اس دنیا میں نہیں ہیں، میں اپنے والد کے چہرے پر — اس عذاب — کی پرچھائیاں دیکھ رہا ہوں۔

پتہ نہیں میرے عزیز یہ باتیں میں تمہیں سنا رہا ہوں یا خود اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے اپنے دل کو تسلی دے رہا ہوں لیکن یہ بھی تو سچ ہے کہ "آپ بیتی" بیان کرنے میں "احساسِ گناہ" اور "اعترافِ گناہ" کا بہانہ تو مل جاتا ہے۔

ہم سب بہت سائنٹفک اور روشن خیال ہونے کے بعد بھی توہمات کے شکار ہیں۔ میں بھی ہوں۔ بچپن میں میرے والد نے مجھے یہ یقین دلادیا تھا کہ میں بہت "اقبال مند" ہوں۔ کچھ جوتشیوں اور قیافہ شناسوں نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ اس لڑکے کے نصیب میں "حکومت کرنا" ہے۔ اس کے دشمن اس کے آگے دبے رہیں گے۔ حکومت ملی نہ اقبال مندی البتہ میرے دشمن میرے آگے دبے رہتے ہیں۔ جو لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں بے حد نفرت کرتے ہیں اور جو محبت کرتے ہیں وہ بے حد محبت کرتے ہیں۔ درمیانی معاملہ میرے نصیب میں نہیں ہے۔ ایک عجیب بات سنو۔ ایک منجم نے کہا تھا کہ اس بچے پر کتے نہیں بھونکیں گے۔ بچپن سے میرا بھی یہی تجربہ ہے۔ کتے مجھ پر نہیں بھونکتے۔ لیکن کسے معلوم میری پیٹھ کے پیچھے جو کتے ہیں سمجھتا ہوں اور دل پر بھونک رہے ہیں وہ شاید مجھی پر بھونک رہے ہوں۔

ایک اور عجیب بات سنو۔ میں نے بچپن میں ایک پاگل دیکھا ہے۔ وہ بیچ بازار میں اپنا ازار بند کھول کر پیشاب کرتا تھا اور پیشاب کرتے ہوئے دعا کے لئے دونوں ہاتھ اٹھالیتا تھا اور بلند آواز سے کہا کرتا تھا "یا اللہ یہ تھوڑا سا پیشاب ہے تو سے سمندر کو پہونچے"۔ اور آج بھی جب وہ پاگل یاد آتا ہے میں سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر سمندر کو "تھوڑا سا پانی" پہونچاتا ہوں۔

چلتے چلتے ایک بات اپنی تعریف میں کہتا ہی چلوں۔ میں نے کبھی خیرات تو بہت دور کی بات ہے کسی سے امداد نہیں لی۔ یہاں تک کہ سرکار کا کوئی انعام نہیں لیا۔ کسی اکیڈمی کا گرانٹ نہیں لیا۔ لیکن قرض کو ذلت نہیں سمجھا۔ کاش ایسا سمجھ سکتا۔

قرض کے علاوہ ایک ذلت اور سہہ رہا ہوں۔ اس پر ندامت بھی ہوتی ہے لیکن اس کا اظہار نہیں کرتا۔ وہ ہے میرا پیشہ۔ اگرچہ یہ بھی سچ ہے کہ اس پیشے پر میں فخر بھی نہیں کرتا۔ اور اس پیشے کو اختیار کرنے میں کسی کی خوشامد کبھی میں نے نہیں کی۔ کسی دروازے پر صدا بھی نہیں لگائی۔ ناجنسوں کی صحبت اختیار نہیں کی، کھوکھلے ذہنوں اور خودنما لوگوں کی مصاحبت کبھی نہیں کی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ "خشک روٹی آزاد رہ کر" کمانے کے بدلے "حلوے" کی خاطر یہ پیشہ اختیار کیا۔ اور ان لوگوں کی جوتیاں دیکھیں جن کے چہرے پر نہ تھوکا جائے۔ میں یہ نہیں بتاؤں گا۔ کیسے کیسے "نرودں" کی دُمیں اٹھا کر دیکھ چکا ہوں۔ اس حمام میں جہاں سب ننگے ہیں۔ اگرچہ میں ننگا نہیں ہوں لیکن ننگوں کی اس بھیڑ میں، ایک آدھ ستر پوش کس کو نظر آئے گا؟ شاید میں پھر اپنی تعریف کرنے لگا ہوں۔ اسی لئے برادر عزیز۔ مجھے اجازت دو۔

☆



ندا فاضلی

"جنگل میں دور تک کوئی دشمن نہ کوئی دوست
مانوس ہو چلے ہیں مگر بمبئی سے ہم"

گوالیار کا ایک علاقہ نئی سڑک، دریا کی ریت کو دھو کر چاندی سونا نکالنے والے کولیوں کی کچی کچی جھونپڑیوں کے بیچ، ستر بہتر سال بوڑھے املی کے چھتنار درخت کے سامنے ایک گھر، بڑے بڑے دالان، کشادہ صحن، دالانوں کی محرابوں کے اوپر روشندانوں میں جنگلی کبوتر کے جوڑے جو آنگن میں اتر کر بے خوف ادھر ادھر گھومتے ہیں، اور جہاں سے جو چاہتے ہیں منہ میں دبا کر ادھر سے ادھر اڑ جاتے ہیں۔ یہ ذات کے سید ہیں۔ انہیں ستانا گناہ ہے۔ ان کے پروں کی ہوائیں کئی بیماریوں کو شفا بخشتی ہیں۔ صبح شام دونوں وقت یہ روشندانوں کے کگاروں پر بیٹھے ماں اور بڑی بہن کو قرآن کی آیات سناتے ہیں۔

آنگن میں چاروں طرف چھوٹے بڑے پیڑ ہیں... یہ سب جاندار ہیں..... شاخیں اور پتے توڑنے سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ یہ بھی پانچوں وقت خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ سارے پیڑ اور جانور مسلمان ہوتے ہیں۔

گھر میں ایک ڈیڑھ سال کی چھٹائی بڑائی کے کئی بھائی بہن۔ گھر کے ناموں کے علاوہ ہر ایک کا کوئی نہ کوئی چھیڑ خانی کا نام۔ گھر سے بلا وجہ باہر نکلنے اور کولیوں کے بچوں کے ساتھ کھیلنے پر کڑی پابندی ہے۔ دن بھر گھر میں شور و غل کا عالم۔ بندروں کی طرح چھت، آنگن، دیواریں ناپی جاتی ہیں۔

(ایک دن)

سورج اک نٹ کھٹ بالک سا
دن بھر شور مچائے
ادھر ادھر چڑیوں کو بکھیرے
کرنوں کو چھترائے
قلم، درانتی، برش، ہتھوڑا
جگہ جگہ پھیلائے
شام تھکی ہاری ماں جیسی
ایک دیا ملکائے
دھیمے دھیمے ساری بکھری چیزیں
چنتی جائے

گرمی ہو یا سردی۔ سورج نکلنے سے پہلے محلے کا کوئی مرغا زور سے اذان دیتا ہے۔ اس اذان کے ساتھ غسل خانے میں نل کی گھڑگھڑاہٹ جاگتی ہے۔ آنگن میں بچھی ہوئی چارپائیوں سے چادریں ہٹائی جاتی ہیں۔ گہری نیندوں کو پانی کے چھپاکوں سے توڑا جاتا ہے۔ گھر کے

قریب پرانی مسجد ہے۔ مسجد کے امام صاحب بالکل گھر کی بغل میں رہتے ہیں۔ دروازہ پران کی آواز سے پہلے تیاری ہو جاتی ہے۔

مسجد میں نماز پڑھنے سے دوگنا ثواب ملتا ہے۔ سویرے سے تو آسمان زمین ایشور لوید سے چرند پرند سب اللہ اور محمدؐ کی حمد و نعت میں مشغول ہوتے ہیں۔ مسجد جانے کے لیے جو گھر کا دروازہ کھولتا ہے وہ رزق کے فرشتے کو گھر میں داخل کرتا ہے۔ ہمیں گھر سے جاتا دیکھ کر دالان میں پنجرے میں بیٹھا ہوا طوطا بھی ہاں مرچی کو کترتے ہوئے۔ یا نبی یا نبی کا گردان کرتا ہے۔

گونج رہی ہیں چنچل جلکیاں ناچ رہے ہیں سوپ
آنگن آنگن

چھم چھم
گھونگٹ کاڑھے روپ

دھیمے دھیمے بچھیا کا منہ چاٹ رہی ہے گائے
ہولے ہولے جاگ رہی ہے آڑی ترچھی دھوپ

مکان کے پیچھے ایک لمبی تنگ گلی جس کے سرے پر دن بھر گھر گھر چلنے والا کنواں ہے۔ اس کنویں پہ رات کو پریوں کا پہرہ رہتا ہے..... اور دن میں لڑکیوں کا جمگھٹا .... شوخ، ریشمی غراروں کی سرسراہٹیں اور پائلوں کی چھماچھم ...... گھر کا ایک دروازہ گلی کی طرف کھلتا ہے..... محلے کے سارے مکان برابر برابر ہیں۔ عورتیں جب جسارتوں کا روپ دھارتی ہیں تو آن کی آن میں شور مچ جاتا ہے۔ شکایتیں گھر تک آتی ہیں..... لڑکیاں حرافائیں ہیں جو لڑکوں کو مفت بدنام کرتی ہیں۔ ان کے لباس بھی ایسے ہوتے ہیں کہ فرشتے بھی شرم سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ پڑھے لکھے گھر کے لڑکے ان پڑھ گنواروں کو بھلا منہ کیسے لگا سکتے ہیں..... ہر بار قصور لڑکیوں کا ہوتا ہے...... لیکن یہ بے قصور لڑکیاں بہت قیمتی ہوتی ہیں، یہ چلتی پھرتی دولتیں ہیں، جو صرف دیکھنے سے ساری فضاؤں کو زیر کر دیتی ہیں۔

دو کھڑکیاں

آمنے سامنے دو نئی کھڑکیاں
جلتی سگرٹ کی لہراتی آواز میں
سونی ڈورسے کے رنگین الفاظ میں
مشورہ کر رہی ہیں
کئی روز سے
شاید اب بوڑھے دروازے
سر جوڑ کر
وقت کی بات کو وقت پر مان لیں
بیچ کی ٹوٹی پھوٹی گلی چھوڑ کر،
کھڑکیوں کے اشاروں کو پہچان لیں۔

۱۹۶۴ء۔ ۱۹۶۵ء کا زمانہ۔ شہر میں جگہ جگہ ہندو مہاسبھا کی سبھائیں ہو رہی ہیں۔ باڑے (گوالیار کا بازار) پر عام مجمع میں قرآن کو جلا کر عوام میں خوف ہراس پھیلایا جاتا ہے۔ ماں میرے کالج کے دوستوں سے ملنے جلنے پر پابندی لگاتی ہے۔ ہر کمار کی بھابی میرے پینے کا گلاس الگ کر دیتی ہے..... ہمارے گھر کے پچھواڑے حلوائی کی دکان سے لگا ایک غریب رنگ ریز کا گھر دن دہاڑے لوٹ لیا جاتا ہے۔ میں زندگی میں پہلا قتل ہوتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ اور دنوں سہما رہتا ہوں...... پاکستان اچانک ہر گھر کی جنت بن گیا ہے۔ وہاں ہر آدمی عیش کرتا ہے۔ جن کو یہاں... جھونپڑیاں میسر نہیں تھیں وہاں بڑی بڑی عمارتوں کے مالک ہیں۔ اسلامی ملک ہے۔ خدا وہاں اپنے محبوب کی اُمت پر رحمتوں کی بارش کر رہا ہے۔

بھور بھئی ....

بستی کے اندر گھس آیا ویرانہ
دھرتی پر پرچھائیں پھیلیں
کھڑی ہوئی دیواریں
جیسے جیسے تھکے سپاہی
چمک اٹھیں تلواریں
کوئی لڑے بیری بچوں سے
کوئی لکھے افسانہ
بجھے آنگن ' گرگ ' دریچے
نکھرا نکھرا دھوپ
دو پیروں پر چلتے بندر
انسانوں سے روپ
چپ چپ دیکھے کھیل سیانا
شور کرے دیوانہ
بھور بھئی بستی کے اندر
گھس آیا ویرانہ

مجھے کالج سے بھوپال ریڈیو کے طالب علموں کے مشاعرہ میں بلایا جاتا ہے۔ اخباروں میں گوالیار کے فسادات کی خبریں چھپتی ہیں۔ وہاں والد کے دوست مجھے فوراً جانے سے روک دیتے ہیں۔ ایک ہفتہ بعد واپس لوٹتا ہوں لیکن گھر اپنی جگہ نہیں ملتا ہے۔... اکیلا ہوں بے گھر ہوں۔

کیمونسٹ پارٹی نے رہنے کے لئے ایک کمرہ دے دیا ہے۔ کیمونسٹ پارٹی سے قریب بھی ہوں اور زندہ رہنے کے لئے پارٹی کی میٹنگس کی اطلاع C.I.D. انسپکٹر کو دے کر روٹی کما رہا ہوں۔ چھوٹا شہر ہے 'دکھی' بھوکی روٹی کھانے کے جرم میں مجھ سے چھت اور دیواریں چھین لیتے ہیں۔ ایک دوست کے یہاں سوتا ہوں۔

"پھیلی دھرتی"

کھلا آکاش تھا میں

چاند سورج کہکشاں کہسار بادل

لہلہاتی وادیاں، خاموش جنگل

میں ہی میں

پھیلا ہوا تھا ہر دشا میں

جیسے جیسے

آگے بڑھتا جا رہا ہوں

ٹوٹتا مڑتا سکڑتا جا رہا ہوں

کل زمیں سے آسماں تک

میں ہی میں تھا

آج

اک چھوٹا سا کمرہ رہ گیا ہوں

کالج میں ایم اے کا فائنل ایئر ہے۔ میں چاہتا ہوں اسے پورا کروں۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اچھے گھر کا ایک دوست کبھی کبھار کچھ پیسے دے جاتا ہے۔ ہر ہفتہ میں دو تین دن ہندوستان صرف پانی پر اکتفا کرتا ہے۔ متوسط طبقے کے کمپلیکس کھل کر ضرورتوں کا اظہار نہیں کرنے دیتے۔ کوئی مدد کرتا ہے تو اچھا نہیں لگتا، کوئی بے رخی برتتا ہے تو برا لگتا ہے۔

بند کمرے

چھٹپٹاتا گھپ اندھیرا

اور دیواروں سے ٹکراتا ہوا میں

منتظر ہوں مدتوں سے اپنی پیدائش کے دن کا

اپنی ماں کے پیٹ سے نکلا ہوں جب سے

میں

خود اپنے پیٹ کے اندر پڑا ہوں۔

تنہا زندگی گزر رہی ہے۔ کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ ہر چیز بدلی بدلی نظر آ رہی ہے۔ ہوٹل کے بھاؤ اور صابن کے دام کے ذریعہ سماج سے نئی سطح پر رشتہ قائم ہوتا ہے۔ پیٹ کے ایندھن کی تلاش۔ سیاست سے متعارف کراتی ہے۔ مسلمان میں سے مسلمان اور ہندو سے ہندو غائب ہو جاتا ہے۔ سب ایک طرح کی بھیڑیں بن جاتے ہیں جنہیں ہر پانچ سال کے بعد نئے نئے چرواہے جدھر چاہتے ہیں ہنکا کرلے جاتے ہیں۔ کتابوں کے لفظ جھوٹے ہو جاتے ہیں۔ عقیدتیں اپنا وقار کھونے لگتی ہیں۔ سارے بھید بھاؤ مٹ جاتے ہیں صرف دو ذاتیں رہ

جاناں جی، اپرا در طرب۔

مسجد کا گنبد سُونا ہے

مندر کی گھنٹی خاموش

جزدانوں میں لپٹے سارے آدرشوں کو

دیمک کب کی چاٹ چکی ہے

رنگ

گلابی

نیلے

پیلے

کہیں نہیں ہیں

تم اس جانب

میں اُس جانب

بیچ میں میلوں گہرا غار

لفظوں کا پُل ٹوٹ چکا ہے

تم بھی تنہا

میں بھی تنہا

گرلس آرٹس کالج میں نظمیں پڑھنے کے لئے بلایا جاتا ہے۔ آٹوگراف لینے والیوں میں ایک لڑکی انجانی ہوتے ہوئے بھی جانی پہچانی سی لگتی ہے۔ ہونٹوں کی خاموش مسکراہٹ لفظ بنتی ہے۔ اور لفظ بات میں پھیل جاتا ہے۔ بات سے بات نکلتی ہے۔ اُس کے گھر والوں کو اس کے لئے انگریزی کے ٹیوٹر کی ضرورت ہے اور مجھے اُس کے زیادہ قریب ہونے کی دعوت ہے۔ عشق نے حالات سے بے خبر کر دیا ہے۔ اسکے بدن کی خوشبو اپنے بلانے سے آنے لگتی ہے۔ شہر اچانک اچھا لگنے لگتا ہے۔ راستوں کے خاموش موڑ، اور گھاس پھول باتیں کرنے لگتے ہیں۔

بہت سے کام ہیں

لپٹی ہوئی دھرتی کو پھیلا دیں

درختوں کو اگائیں، ڈالیوں پر پھول مہکا دیں

پہاڑوں کو قرینے سے لگائیں، چاند لٹکائیں

خلاؤں کے سروں پر نیلگوں آکاش پھیلائیں

ستاروں کو کریں روشن، ہواؤں کو گتی دیدیں

پھدکتے پتھروں کو پنکھ دے کر نغمگی دیدیں

لبوں کو مسکراہٹ، آنکھوں کو روشنی دے دیں
سڑک پر ڈولتی پرچھائیوں کو زندگی دے دیں
خدا خاموش ہے
تم آؤ تو تخلیق ہو دنیا
میں اتنے سارے کاموں کو اکیلا کر نہیں سکتا

لڑکی کے گھر والے ناراض ہیں۔ اُن کی ناراضگی جائز ہے۔ میرے پاس نہ رہنے کو گھر ہے نہ زندہ رہنے کے لئے کوئی کام۔ صرف شاعری سے گھر بار کہاں بستا ہے۔ میں گوالیار چھوڑ رہا ہوں۔ لڑکی ہر قیمت پر میرے ساتھ چلنے کے لئے بضد ہے۔ وہ پیسے لے کر آئی ہے۔ میں اس کے بجائے اُس کے پیسوں کو اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔ محبت کے دیوتا کیوپڈ کو لوگ بلاوجہ اندھا بتاتے ہوتے ہیں۔ لڑکیوں کے والدین ظالم ہوتے ہیں: وہ محبت کو روٹی کپڑے کے میزان میں تولتے ہیں۔ لڑکیاں بھی بے وفا ہوتی ہیں... وہ کچھ آگے پر والدین کی طرح سوچتی ہیں۔

ممکن ہے — چند روز پریشاں رہی ہو تم
یہ بھی ہوا ہو وقت پہ سورج اُگا نہ ہو
املی میں کوئی اچھا کتارا پکا نہ ہو
چھت کی کھلی ہوا میں دوپٹہ اُڑا نہ ہو
دو تین دن رضائی میں سردی رُکی نہ ہو
کمرہ کی رات پنکھ پسارے اڑی نہ ہو
ہنسنے کی بات پہ بھی بہ مشکل ہنسی ہو تم
ممکن ہے چند روز پریشاں رہی ہو تم
کچھ دن خطوں میں آنسو بہے، شور غل ہوا
تم زہر پی کے سوئیں، میں انجن سے کٹ گیا

پھر یوں ہوا
کہ دھوپ کھلی، ابر چھٹ گیا
میں نے وطن سے کوسوں پرے گھر بسا لیا
تم نے پڑوس میں نیا بھائی بنا لیا

دلی میں بھٹکاؤ۔ ایک قریبی رشتہ دار کے یہاں ٹھہرتا ہوں۔ وہ دوسرے دن میرے سامان کو ایک شکستہ مسجد کے حجرے میں ڈال دیتا ہے۔ کئی جگہ ہاتھ پیر مارتا ہوں مگر کہیں کامیابی نصیب نہیں ہوتی۔ تنگ آکر بمبئی کی طرف نکل آتا ہوں۔ کئی کام کرتا ہوں۔ اخباروں میں کالم نویسی، ناکام فلموں میں مکالمے، ہندی اردو رسالوں کی ایڈیٹری، مگر حالات میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔

اپنے مزاج کی وجہ سے بیشتر لوگوں کو دوست اور با اثر شخصیتوں کو مخالف بناتا ہوں۔ اور خود ہی پریشان ہوتا ہوں۔ ساحر لدھیانوی ایک مشاعرہ میں ملتے ہیں۔ اُن کے یہاں کلام گلوج سے کرشن چندر کو دورہ پڑ جاتا ہے۔ ان کی شرط ہے مشاعرہ میں میں پڑھوں گا یا وہ...... بازی اللہ کے ہاتھ رہی ہے۔ میں عصمت چغتائی کے لفظوں میں C.I.A کا ایجنٹ ہوں۔ ترقی پسندوں کا میرا مخالف ہونا جائز سمجھا جاتا ہے۔ مشاعرے بند ہو جاتے ہیں، کلام سننے میں رکاوٹیں پیدا کی جاتی ہیں ——— سی آئی اے (C.I.A) کا ایجنٹ امریکہ کے افلاس کا شکار ہو جاتا ہے۔

یہ کیسی بستی ہے
میں کس طرف چلا آیا
فضا میں گونج رہی ہیں ہزاروں آوازیں
سُلگ رہی ہیں ہواؤں میں ان گنت سانسیں
جدھر بھی دیکھو کھڑے ہیں کولہے، پنڈلیاں، ٹانگیں
مگر کہیں کوئی چہرہ نظر نہیں آتا
یہاں تو سب ہی بڑے چھوٹے اپنے چہروں کو
چمکتی آنکھوں کو گالوں کو ہنستے ہونٹوں کو
بدن کے خول سے باہر نکال لیتے ہیں
سویرا ہوتے ہی جیبوں میں ڈال لیتے ہیں

عجب بستی ہے اس میں نہ دن نہ رات نہ شام
بسوں کی سیٹ سے سورج طلوع ہوتا ہے
جھلستی ٹین کی کھولی میں چاند سوتا ہے

یہاں تو کچھ بھی نہیں
ریل اور بسوں کے سوا
زمیں پہ رینگتے بے حس سمندروں کے سوا
عمارتوں کو نگلتی عمارتوں کے سوا
یہ قبر قبر جزیرہ کسے جگاؤ گے
خود اپنے آپ سے الجھو گے ٹوٹ جاؤ گے۔

ابھی تک بمبئی میں ہوں۔ آنکھوں میں روشنیاں اتنی بس گئی ہیں کہ دوسری ہر بستی اندھیری محسوس ہوتی ہے۔ حالانکہ زیادہ دنوں تک رہنے سے روشنی سے روشن شہر بھی بجھنے لگتا ہے۔ بمبئی میں رہنے کے لئے بمبئی کے آداب سے سمجھوتہ ضروری ہے۔

جب سے قریب ہو کے چلے زندگی سے ہم
خود اپنے آئینے کو لگے اجنبی سے ہم

کچھ دور چل کے راستے سب ایک سے لگے
ملنے گئے کسی سے مل آئے کسی سے ہم

شائستہ محفلوں کی فضاؤں میں زہر تھا
زندہ بچے ہیں ذہن کی آوارگی سے ہم

اچھے برے کے فرق نے بستی اجاڑ دی
مجبور ہو کے ملنے لگے ہر کسی سے ہم

جنگل میں دور تک کوئی دشمن نہ کوئی دوست
مانوس ہو چلے ہیں مگر بمبئی سے ہم

ہندو پاک کے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔ ماں کراچی میں سخت بیمار ہے۔ میں ہندوستان کا وفادار ہوں۔ دشمن ملک سے دشمنی کرنا میری ہندوستانیت کی پہچان ہے۔ پاکستان سے تار آیا ہے۔ کراچی کے ایک محلے ناظم آباد میں ہندوستان کی بہبودی کے لئے اٹھنے والے دعاؤں کے ہاتھ ہمیشہ کے لیئے خاموش ہو گئے ہیں۔ اب ہزار عاؤں کے آسمان کے نیچے آخری وقت میں ماں سے دودھ نہ بخشوانے کا عذاب سہہ رہا ہوں۔

کراچی ایک ماں ہے
بمبئی بچھڑا ہوا بیٹا
یہ رشتہ پیار کا پاکیزہ رشتہ ہے
جسے اب تک
نہ کوئی توڑ پایا ہے
نہ کوئی توڑ سکتا ہے
غلط ہے ریڈیو، جھوٹی ہیں سب اخبار کی خبریں

نہ میری ماں کبھی تلوار تانے رن میں آئی ہے
نہ میں نے اپنی ماں کے سامنے بندوق اٹھائی ہے
یہ کیسا شور و ہنگامہ ہے
یہ کس کی لڑائی ہے



جاوید

"......... اورنگ آباد اتنا آباد نہیں ہے تو سونا بھی نہیں۔ سلیم بھائی، بشر بھائی، صفی صاحب اور ڈاکٹر معین شاکر کی شفقتیں بڑی گھنی اور سایہ دار ہیں اور ہم لوگ بڑی دیر سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اورنگ آباد کی آنے والی نسلیں ہمیں خوش نصیب سمجھیں گی ...." ۔

کھلا آسمان

آہستہ رو ہوائیں

سامنے جامع مسجد

مولانا آزاد ہائی اسکول کی خوبصورت عمارت

ناریل کے دو چار درخت

میلے کچیلے بچے گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے

صاف ستھرے لڑکے کرکٹ میں مشغول

سٹی کلب کے ٹینس لان میں متمول حضرات جی بہلاتے ہوئے

کنارے پر شہر پناہ آثار کی شکل میں موجود اور دو آنکھیں فصیل سے شہر کا نظارہ کرتی ہوئی۔

لہلہاتے ہوئے کھیت

بی بی کا پرشکوہ مقبرہ اور اس مقبرہ کے عقب میں مرہٹواڑہ یونیورسٹی کیمپس

شاہراہوں پر تاریخ کے اوراق ستونوں اور دروازوں کی شکل میں دھڑکتے ہوئے ———

پرانے اورنگ آباد کے چھوٹے چھوٹے محلے ———

کریم کالونی، شاہ بازار، نواب پورہ، راجہ بازار، چیلی پورہ، منظور پورہ، لوٹا کارنجہ، دیوڑھی بازار، گھاس منڈی، جونا بازار، ہنڈی لین، گھاٹی، بیگم پورہ اور ان میں ایک محلہ ——— روہلہ گلی ———

اسی روہلہ گلی کے ایک مکان میں اپنی دو بہنوں کی موت کے بعد ۱۹۴۹ء میں ۲۲ فروری کو منگل اور بدھ کی درمیانی رات میں

ٹھیک ایک بجے

میں پیدا ہوا ———

اپنے والد کا حوصلہ اور اپنی ماں کی آنکھ کا تارا بن کر ———

اختر الزماں ناصر کی بوڑھی آنکھیں دیکھتی ہیں۔

دیوڑھی بازار کا دکان، بڑا دروازہ، چھوٹی سی راہداری، دیوان خانہ، دو بڑے بڑے دالان، اونچی چھتیں، کئی کمرے، کئی کمانیں، کئی محراب، بے شمار طاق، بے شمار کھونٹیاں، ایک وسیع و عریض صحن، آم، جامن، امرود اور نیم کے گھنے درخت، درمیان میں ایک حوض،

منڈیروں اور چھتوں پر کبھی کبھی دھوم مچانے والے بندر۔ اور کرایہ ۲۷ روپے۔

جہاں دیدہ آنکھوں میں ایک ایک پل چمکتا ہے

دو ننھے ننھے پاؤں مکتب کی طرف جاتے ہوئے۔

ان کی کلاس میں بیٹھے ہوئے کئی لڑکوں کی چپلوں اور جوتوں کو گن کر روپے تقسیم کرتا ہوا بچہ۔

حمید سے ہاتھاپائی کرتا ہوا بچپن۔

جو جیتے گا وہ دلیپ کمار جو ہارے گا وہ پردیپ کمار

اختر باجی کی بار بار مار کھانے کے باوجود ان سے پلی ہوئی معصومیت

گھر کے سامنے کی سڑک پر سائیکل کا پہیہ چلاتا ہوا دوڑ رہا بچپن

ایک گالی سنتا ہے۔ گھر آتا ہے۔ کسی شرارت کی بنا پر پٹتا ہے، کمرے میں بند کر دیا جاتا ہے۔ بند کمرے کی کھڑکی سے دیکھتا ہوا رو رہا ہے بچپن۔

سنی ہوئی اور سیکھی ہوئی گالی کو اختر الزماں ناصر کے سامنے سند کے طور پر پھینک دیتا ہے۔

ردولی کا موجودہ مکان۔

ایک کشادہ کمرہ اور اس کمرہ میں گھٹی گھٹی سی ہوئی نیم روشن کھولی، نہیں کمرہ برابر برآمدہ، چہرہ مرایا ہوا آنگن تنگ و تاریک باورچی خانہ حمام اور بیت الخلا کے نام پر دو بل اور کرایہ ۱۰ روپے۔

میرے دادا جان شمس الدین۔

۸۵ برس کے توانا نحیف، مغرور، ضدی اور بڑی حد تک غلط لیکن اپنے بچوں سے محبت کرنے والے، ان کی فلسفانہ سفاکی نے ان کی بیدردی بے رحمی نے، ان کی مسلسل فاقوں اور نفل روزوں نے میرے والد اختر الزماں ناصر کو مقام بیشہ تک پہنچایا۔

اختر الزماں ناصر۔ میرے والد۔

ایک محترم استاد، ایک عمدہ شاعر، ایک مشفق باپ۔

چار بھائیوں اور تین بہنوں اور اپنے آٹھ بچوں کا بوجھ ڈھوتے ہوئے تھک گئے ہیں لیکن انھوں نے اپنی تھکن کسی کے حوالے نہیں کی مجھ سے زیادہ کسی اور کو شاید انھوں نے چاہا بھی نہیں۔ ان کا بس چلے تو میری زندگی کے لمحوں کو چن چن کر سجائیں لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔

خدا کا احسان ہے کہ اس نے اپنے محبوب کی امت میں اختر الزماں ناصر کے نطفے سے اور قمر جہاں کے بطن سے مجھے پیدا کیا۔

سجدۂ شکر رب العالمین۔ میری اکلوتی بہن اپنے گھر ہے اور خوش ہے۔ میرا چھوٹا بھائی مسعود اپنے پیروں پہ کھڑا ہے شکیل کیل کانٹوں سے لیس ہو کر ملازمت کے دروازے کھٹکھٹا رہا ہے۔ میں ان دونوں سے مطمئن ہوں اور گھر کی فکر سے آزاد ہوتا جا رہا ہوں۔ خیال ہے تو نسیم کا ہے جو فیصلا ہے اور بے ہنر۔ خیال ہے تو عقیل اور نوید کا جو ذہین ہیں لیکن لاپروا، خیال ہے تو ندیم کا ہے جو بہت چھوٹا ہے، اپنی عمر سے

بھی بہت چھوٹا ـــــــ

ناندیڑ ایک ضلع ہے مرہٹواڑہ کا اور اس ضلع میں ایک ہوٹل ہے گلمرگ اور اس ہوٹل میں ایک ٹیبل کے اطراف بیٹھے ہوئے چند لوگ۔

اطہر، نعیم، رحیم، شمیم، شفیع، واحد اور آصف

نہ قہقہوں میں کوئی ربط ہے نہ سناٹوں میں

نہ کوئی موضوع مشترک ہے نہ اندیشے

لیکن کیسی رواں ہے کیا زندگی ہے۔ نہ زمین سخت ہے نہ آسمان دور، ایسے جاں نثار دوست تو قسمت ہی سے ملتے ہیں۔

ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں نیچی چھتوں کے زیر سایہ تنگ گھروں میں رہنے والے یہ لوگ مولوی انف الدین کو دیکھتے ہی کھڑے ہو جاتے ہیں مولانا اطہر نظر آئیں تو ادب سے جھک جاتے ہیں۔ بہاء الدین بھائی، کمال بھائی یا یونس بھائی کا گزر ہو تو کیسے ان کے ہونٹوں سے سگریٹ یک لخت غائب ہو جاتے ہیں سنا ہے آج کل حفظ مراتب کا کوئی مطلب ہی نہیں۔

اورنگ آباد عالم میں انتخاب ہے اور میرے لئے مجھ ہی سے عبارت ہے۔

۱۹۶۰ء کی بات ہے۔ یہاں گورنمنٹ کالج میں اردو اسوسیشن کا الیکشن ہے۔ میں بھی کھڑا ہوا ہوں۔ میرا مقابل میرا ایک عزیز دوست ہے۔ ہم چشموں نے مجھے سمجھایا کہ تقریری مقابلوں میں ٹرافیز اور پہلے انعام پر تمہارا ہی اختیار ہے۔ ثقیل اور ادق زبان تم ہی استعمال کر سکتے ہو، تم ہی جیتو گے لیکن ہوا یہ کہ ستر یہ، زندہ اور عزیز مسکراہٹ جیت گئی میری زندگی کی یہ پہلی شکست آج بھی میری مددگار ہے قادر آج بھی میرا اچھا دوست ہے۔ اسی کالج میں خفیف سی مسکراہٹ اور گاندھی جی پر اکتفا کرنے والے ڈاکٹر سید عبدالباری بھی ہیں۔ فلسفہ، تاریخ، زبان، نفسیات، نقد، مذہب اور ادب کو اپنی زد میں لینے والے ڈاکٹر صفی الدین صدیقی بھی ہیں۔ ڈاکٹر معین شاکر بھی ہیں جنہوں نے اپنے مطالعہ اور فکر کو ذرا جھٹکا تو دنیا کو کئی مضامین اور کتابیں مل گئیں۔ مجرد موضوعات کے تنہا مجاہد ڈاکٹر عصمت جاوید بھی ہیں۔ نئی غزل کے لب و لہجہ نواز فضیل جعفری بھی موجود ہیں۔ اس کالج کی ادبی اور تہذیبی چہل پہل کا یہ آخری منظر ہے۔ فضیل جعفری آج کل بمبئی میں مقیم ہیں۔ معین شاکر مرہٹواڑہ یونیورسٹی میں ہیں۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے وظیفہ لے لیا ہے اورنگ آباد اب ولی محمد خاں جیسے مثالی استاد اور یعقوب عثمانی جیسے عروض و آہنگ کے ماہر سے محروم ہو گیا ہے۔

اورنگ آباد کی تہذیبی زندگی میں جوگندر پال کی آمد ایک اہم واقعہ ہے۔ کتنے لوگ جمع تھے قاضی سلیم، بشر نواز، صادق، عتیق اللہ، شمیم احمد، الیاس فرحت، رفعت نواز، رشید انور، محمود شکیل، اسرار عظمت، سید ظہیر علی، حمید سہروردی، یوسف عثمانی، اور ممتاز یوسف۔ ان سب میں روح پھونکتے تھے۔ جوگندر پال، ان کا وجود اور ان کا بنگلہ مرکز تھا تمام لکھنے پڑھنے والوں کا۔ رسائل، خطوط، مضامین، افسانے، نظمیں، اشعار، مباحث، مناظرے، گفتگو اور شراب جیسے اورنگ آباد تنہا اردو ادب کا ذمہ دار تھا۔ جوگندر پال جن کی کہانیوں کے پیر ٹرہ دور تک پھیلے ہوتے ہیں آجکل دہلی میں ہیں۔ عتیق اللہ نے صادق اور شمیم احمد کو بھی وہیں بلوا لیا ہے۔ عظمت نے توبہ کرلی ہے۔ الیاس فرحت، رفعت نواز اور رشید انور خاموش ہیں۔ حمید بیڑ میں ہیں۔ سلیم بھائی اور بشر بھائی سیاست میں بہت زیادہ دھنس چکے ہیں۔

اورنگ آباد کو کبھی کبھی ایسے منظر ضرور نظر آتے ہیں۔

بشر نواز طلبا کو ناسخ کے اشعار سمجھا رہے ہیں۔

معین شاکر قاضی سلیم سے اُن کی نئی نظم کو جو پورے ایک سال کے بعد لکھی گئی ہے، سُن رہے ہیں۔ ڈاکٹر صفی الدین صدیقی قاضی سلیم کی شاعری میں وجودیت تلاش کرنے پر مصر ہیں۔

اورنگ آباد اتنا آباد نہیں ہے تو سونا بھی نہیں۔ سلیم بھائی، بشر بھائی، صفی صاحب، اور ڈاکٹر معین شاکر کی شفقتیں بڑی گھنی اور سایہ دار ہیں اور ہم لوگ بڑا دیستے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اورنگ آباد کی آنے والی نسلیں ہمیں خوش نصیب سمجھیں گی۔

یہاں ایک چینی ہوٹل ہے اس میں ایک ٹیبل کے اطراف بیٹھے ہوئے ہیں امان اختر، شاذ حسین، شوکت علی، سہیل بیابانی اور کبیر احمد ٹیبل پر دنیا بچھی ہوئی ہے اور سب اپنے اپنے وجود کو قطب نما سمجھ کر سمتیں متعین کرنے میں مصروف ہیں۔ اور رحمان صاحب خالی پیالیاں اٹھا رہے ہیں۔

برصغیر میں بمبئی کا ایک ہم مزاج علاقہ ہے کراچی — مہاجرین کی پناہ گاہ اور پاکستان کا ایک باوقار صنعتی شہر۔ ۱۹۷۰ء کی بات ہے۔

سراج الدولہ کالج میں مشاعرہ ہے۔ ثروت حسین میرے ساتھ ہے۔ فیض اپنا کلام سنا کر چلے جاتے ہیں۔ جوش تشریف لاتے ہیں کہتے ہیں اگر اس وقت مجھے طُور پر بھی بلایا جاتا تو میں نہیں جاتا۔ یہاں چلا آیا۔ پشاور سے احمد فراز آئے ہوئے ہیں۔ بڑی چہل پہل ہے۔ سرسید گرلز کالج میں شامِ فیض کا اہتمام ہے۔ حمایت علی شاعر کے ساتھ میں بھی ہوں۔ رضی اختر شوق بھی ہیں۔ نصیر ترابی بھی یہیں کہیں موجود ہیں اور ہر طرف دنیا دیکھی ہوئی لڑکیوں کا ہجوم ہے۔ میں جنگ کے دفتر میں اطہر نفیس سے ملتا ہوں۔ وہ مجھے اپنے گھر بلاتے ہیں۔ اسد محمد خاں بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے ماتھے پر وندھیا چل کی آنالیتی ہوئی ہے۔ حلقۂ اربابِ ذوق نے ایک نشست ترتیب دی ہے۔ ن۔م۔ راشد ایران سے آئے ہوئے ہیں۔ سلیم احمد بکھرے ہوئے بالوں اور سلی ہوئی شیروانی کے ساتھ تقریر کر رہے ہیں۔ ضیا جالندھری بھی ہیں۔ جمیل جالبی بھی سُن رہے ہیں۔ احمد جاوید دوڑ دھوپ سے حیران ہے۔ ثروت حسین، شوکت عابد، اقبال زیدی، ایوب خاور، ناصر صدیقی اور جاوید منظر اپنے دلوں کو تھامے ہوئے ہیں۔

کراچی یونیورسٹی بھی عجیب جگہ ہے۔ لڑکیاں تعداد کے حساب سے لڑکوں پر حاوی ہیں۔ ستونوں کے آس پاس، کیمپس، زمین کے گوشوں میں، کینٹین کی نشستوں پہ، ہر طرف چار چھ لڑکیاں ایک دو لڑکوں کے ساتھ آسمان کو اپنی انگلیوں پر لپیٹ رہی ہیں۔ جہاں شعبۂ اردو میں وزیر آغا کا لیکچر ہے۔ ابو اللیث صدیقی اور فرمان فتح پوری تیز تیز قدم اٹھا رہے ہیں۔ تمام طلبا ایک ہال میں جمع ہو جاتے ہیں۔ وزیر آغا نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اردو کو ایسا جفاکش ایک عرصے کے بعد نصیب ہوا ہے لیکن اطہر نفیس انھیں اُلّو کہتے ہیں

احمد ہمیش بھی کراچی میں بھٹک رہے ہیں۔ ان کی معنوی اولادوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ثروت پروین شاکر سے متعارف کرواتا ہے۔ پروین کی تخلیقات اُس کے حُسن کے پیچھے پیچھے چلتی ہیں۔ اُس کے دامن کی گرد کو پلکوں پر سجانے والے ہزاروں نوجوان پروین کے اشعار یاد کرنے میں محو ہیں جیسے وہ نہ ہوں تو پروین شعر کہنا چھوڑ دے۔

ثروت ہر ایک شخص سے ملتا ہے۔ یہ قمر جمیل ہیں، انھوں نے حال ہی میں خطِ تنسیخ کھینچا ہے۔ اب نثری شاعری کر رہے ہیں۔ یہ عبید اللہ علیم ہیں،

رونا لیلیٰ انھیں عظیم شاعر سمجھتی ہیں۔ یہ جون ایلیا ہیں جو خوابوں میں صرف ہو چکے ہیں۔ یہ سرشار صدیقی ہیں جو عذرا ساگر کے نام سے لکھتے رہے ہیں۔ یہ محمود کنور ہیں اور یہ انور شعور۔

کراچی میں سلیم احمد کی نئی کتاب "غالب کون" کا بڑا شہرہ ہے۔ ان کی زیر تخلیق طویل نظم "سفینۂ روح" سے دنیا خوفزدہ ہے۔ سلیم احمد کے معتقدین میں اطہر نفیس، عبید اللہ علیم، جون ایلیا، انقا، عارف، ریاض زرشوری کے علاوہ اور کئی ستارے ہیں لیکن یہ سب کے سب بابا تاج الدین کے عالی شان تکیہ میں بیٹھتے ہیں۔ اور ان کی توڑی ہوئی روٹیوں کو کھاتے ہیں۔

یہاں میرا ایک قریبی دوست ہے، افسر، نہ اسے ادب سے کچھ لینا دینا ہے نہ اسلامی سوشلزم سے۔ سیدھا سادہ نوجوان ہے اور زندگی کے ہر لمحے سے مطمئن ہے ایک وجود یہاں ایسا بھی ہے جو مجھے موت کے وقت بھی یاد آئے گا۔ اس کے ساتھ گزارے ہوئے چند بیتے بڑے عذاب آشنا ہیں ہر وقت سلگتے رہتے ہیں۔ حمایت علی شاعر میرے والد کے دوست ہیں، مجھے اپنا بچہ سمجھتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ گھومتا ہوں۔ سلیم احمد کا مکان آتا ہے کچھ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہم لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ چند لمحوں بعد وقت دیکھتا ہے کہ میں اپنی غزلیں سنا رہا ہوں۔ سلیم احمد پسندیدگی کے اظہار کے لئے سر کو مکرا کر جنبش دیتے ہیں۔ حمایت چچا کہتے ہیں کرسیوں والی نظم سناؤ میں کرسیوں والی نظم سناتا ہوں۔ حمایت چچا نے کہا اب بلیوں والی نظم سناؤ میں بلیوں والی نظم سناتا ہوں۔

سلیم احمد اچانک بھڑک اٹھتے ہیں، چیختے ہوئے کہتے ہیں۔

چو تم سناتے ہو۔ یہ پاگل پن بھی نہیں ہے۔

دیوانگی میں بھی ایک معنی ہوتے ہیں۔ سنو میری طویل نظم کے دو چار مصرعے۔

وسنت راؤ نائک کالج اورنگ آباد میں جالنہ روڈ پر واقع ہے۔ ایک طرف نئے اورنگ آباد کا امید افزا منظر ہے دوسری طرف پانچ ستاروں والی دو ہوٹلیں۔ یہاں میں نے دیہات کے معصوم اور بات بات پر ڈر جانے والے طلبا کو وہ زبان پڑھائی جس کا میں مزاج داں نہیں ہوں پرنسپل راجہ رام راٹھوڑ کے چیمبر میں مختلف مضامین کے پڑھانے والے تشریف فرما ہیں۔ ان سب میں بڑی یگانگت ہے، بڑا حوصلہ ہے۔ سب ہی باآواز سوچ رہے ہیں۔ پسماندہ طبقات کو کیسے ترقی یافتہ اقوام کے دوش بدوش کھڑا کیا جائے۔ جہالت کو کیسے دور کیا جائے، زرتہ واریت کو خاتمہ ناممکن نہیں ہے غربت و افلاس کا کیا علاج ہے۔ مظالم کو کیسے روکا جائے۔ استحصال کسے کہتے ہیں، رشوت خوری کی وبا کب ختم ہوگی۔ موتی راج ہنس رہا ہے۔ باپو راؤ جگتاپ مسکراہٹوں میں بات کر رہے ہیں۔ ایل۔ بی۔ چوہان ہمہ تن گوش ہیں۔ اجیت دلوی کا بیان سانسوں کو تھام کر سنا جا رہا ہے۔ بابا دلوی کا بیٹا ڈرامہ کا رسیہ عہدوا دیکار کیسی متانت سے بات کرتا ہے۔ لیلا ہیرہ جب کتابی ہندی بولتی ہے تو پھول جھڑتے ہیں اور پاؤں دھرنے کو بھی جگہ نہیں ملتی۔ شیحان بیار ہر موضوع کو سہلا رہا ہے۔ اختتامیہ کے طور پر دیارام جادھو اپنا بلند قہقہہ محفل کو پیش کرتا ہے۔ گھنٹی بجتی ہے۔ لوگ اپنے اپنے پیریڈ پر چلے جاتے ہیں۔ پرنسپل راجہ رام راٹھور راؤنڈ لیتے ہیں۔ خالی ساعتوں میں غلام گردشوں میں بھٹکنے والے بچے اپنے امید پرور پرنسپل کو دیکھ کر عقیدت سے دوہرے ہو جاتے ہیں۔

سو اکتوبر ...ء کو میں اپنے والد کے ہمراہ دار رہ پہنچا اور وہاں سے بوریولی چلا گیا۔ ۴ اکتوبر ...ء کو آکاش وانی بمبئی میں اردو کے پروگرام ایگزیکیٹو کی

حیثیت سے رجوع ہوا۔ دو تین مہینوں کے بعد مجھے کالینہ منتقل ہونا پڑا۔ کالینہ میں ایک کالونی ہے، سندر نگر۔ اور اسی سندر نگر میں ایک شخص رہتا ہے والنچہ ـــــ ایک شفاف انسان جس کے ظاہر و باطن میں کوئی فرق نہیں۔ والنچہ صاحب کی مسکراہٹ میں زندگی کے تجربوں کا عطا کردہ اعتماد ہے۔ گفتگو یوں کرتے ہیں جیسے وضاحت بات کر رہی ہے۔ اتنے مخلص کہ اگر بس چلے تو سارے ناداروں کو پناہ دے دیں۔ ان کا خاندان ایک مثالی خاندان ہے میں خوش ہوں کہ مجھے ان کی محبت نصیب ہے۔ کالینہ سے میں ایم۔ ایل۔ اے ہاسٹل چلا گیا۔ چند دنوں کے بعد ہی مجھے کالینہ لوٹنا پڑا۔ آج کل میں کرلا میں مقیم ہوں محمد بہادر خان کے ساتھ

بہادر کرناٹک کا سیدھا سادہ نوجوان ہے۔ ایم۔ ایس۔ ای۔ بی میں انجینئر ہے۔ اس کی طبیعت میں وہ تنوع نہیں ہے جو اس کے مطالعہ میں ہے اور بڑا اچھا بھی ہے۔ اگاتھا کرسٹی، اعلیٰ ریاضی، سیاسیات، پنچ تنتر، رامائن، منٹو کے افسانے، ٹیگور کے گیت، عربی اور بنگالی زبانیں... ان سب کو ہڑپ کرنے کا شوق ہے۔ یہ معصوم اور بے ریا انسان معاشرے کے اس تصور کا عاشق ہے جس کا نفاذ کم از کم اس صدی میں ممکن نہیں۔ میرے آرام کو اپنے آرام پر ترجیح دینے والے بہادر کا ساتھ مجھے بھائیوں کی طرح ہمدم دلاسہ دیتا ہے۔

آکاش وانی بمبئی کے اردو ہندی سیکشن میں چندولہ جی ہیں جن کو میں ماجی کہتا ہوں۔ ملازمت کے ابتدائی دنوں میں ان کا تجربہ اور ان کی شفقت میرے بڑے کام آئی۔ آگے بھی یہاں بہائی [illegible] ہیں، چندر کانت شیلم اور رشید انجم بھی۔ یہ سب ہندوستانیوں کی طرح خیال رکھتے ہیں۔ لکھنوی زبان والے باصلاحیت نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی ترقی کے منصوبے بنانے والے دوسروں کے مسائل پر بے چین ہو جانے والے ممتاز بلقیس، اگلی روایتوں کی بازگشت اور میرے لئے ایک مشفق۔

سعید راہی ہیں۔ دبلے پتلے، سیدھے سادے شعر کہنے والے، بھولے۔ بے حد لاپرواہ مگر اپنے کام میں ماہر۔ نسیم عسکری ہیں ـــ ذمہ دار، شفیق، فرض پرست۔ ان سب کی موجودگی میں بمبئی کی ہنگامہ پرور زندگی اور ریاضت کی دقتیں کم کم معلوم ہوتی ہیں۔ بمبئی میں ان لکھنے والوں سے بھی ملاقات ہوئی جو ہماری نسل کے لئے بڑے محترم ہیں۔ علی سردار جعفری، اختر الایمان، راجندر سنگھ بیدی، ظ۔ انصاری، مجروح، عصمت چغتائی اور شفیق آپا۔ سب بڑی محبت اور شفقت سے ملتے ہیں۔ ان کی جیسی شہرت ہندوستان میں اردو کے کسی اور لکھنے والے کو اب ملنے والی نہیں۔

میں جب بمبئی آ رہا تھا تو سلیم بھائی نے کہا تھا کہ باقر مہدی سے پہلی ملاقات ان ہی کے مکان ہو تو بہتر رہے گا۔ لیکن یہاں مکتبہ جامعہ پر ان سے پہلی مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا۔ قہقہوں سے بنے ہوئے باقر بھائی سے جب بھی ملاقات ہوتی ہے کتابوں کے اوراق پھڑپھڑانے لگتے ہیں، فاصلے سمٹ جاتے ہیں اور دنیا میں ادب کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ فضیل جعفری صاحب نے کالج میں مجھے انگریزی پڑھائی ہے۔ یہاں سراسر سرپرست کی طرح خیال رکھتے ہیں۔ یوسف ناظم صاحب میرے والد کے ہم جماعت ہیں لیکن ہم عصر کی طرح ملتے ہیں۔ اکثر لنچ کے لئے مجھ کو اور سردار عرفان کو مدعو کرتے ہیں۔ ہم لوگ ان کے جملے ملا ملا کر کھاتے ہیں۔ عزیز قیسی، ندا فاضلی اور حسن کمال کی محبت آمیز ملاقاتیں بمبئی کی شاموں کو اداس نہیں ہونے دیتیں۔

پھر بھی چند اندیشے ضرور لاحق ہیں۔

کہیں انور خان کی بشاشت میں کمی نہ آ جائے، ابراہیم ندیم کے لب و لہجہ کی پختگی ختم نہ ہو جائے، مشتاق مومن کی باتوں میں ربط نہ پیدا ہو جائے، یعقوب راہی زیر زمین ہی نہ رہ جائے، انور قمر ہر ملاقات میں از سر نو ملنا نہ چھوڑ دیں، اردو کے مسائل میں ساجد رشید کا نام نہ آ جائے۔ صادر دست فن اور شخصیت کو پاکستان کے ادیبوں کے لئے وقف نہ کر دے!

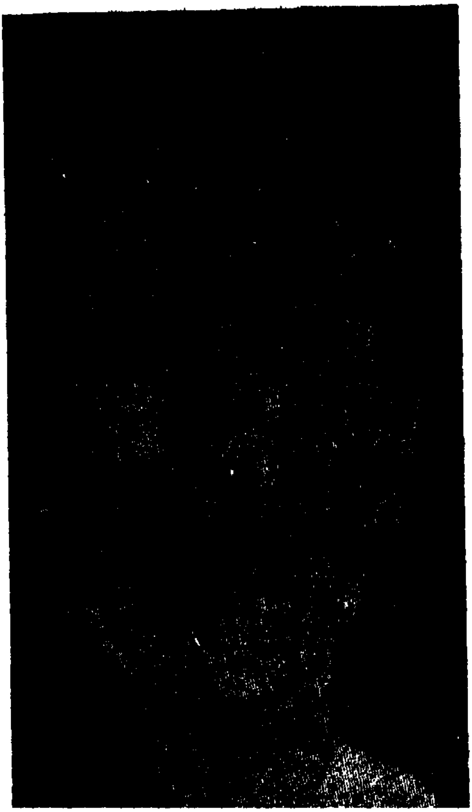
آپ بیتی نمبر

کے لئے

نیک خواہشات

پریم جی

افسانہ



منشی پریم چند

"...... ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو۔ زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت اور ہنگامہ اور بے چینی پیدا کر دے سلائے نہیں۔ کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہو گی ..!........"

میری زندگی ہموار میدان کی طرح ہے جس میں کہیں کہیں گڑھے تو ہیں لیکن ٹیلوں، پہاڑوں، گہری گھاٹیوں اور غاروں کا پتہ نہیں ہے۔ جن حضرات کو پہاڑوں کی سیر کا شوق ہو، انہیں یہاں مایوسی ہوگی۔

میرا جنم سمت ۱۹۳۷ (۱۸۸۰ء) میں ہوا۔ باپ کا نام منشی عجائب لال، سکونت موضع مڑھوا لہی متصل پانڈے پور۔ بنارس

والد ڈاکخانے میں کلرک تھے۔ والدہ مریض تھیں۔ ایک بڑی بہن تھی۔ اس وقت والد شاید بیس روپے پاتے تھے۔ چالیس روپے تک پہنچتے پہنچتے ان کا انتقال ہوگیا۔ والدہ بھی ساتویں سال گذر چکی تھیں۔ یوں تو وہ بڑے دور اندیش، محتاط اور دنیا میں آنکھیں کھول کر چلنے والے تھے لیکن آخری عمر میں ایک ٹھوکر کھا ہی گئے اور خود تو گرے ہی تھے، اسی دھکّے میں مجھے بھی گرا دیا۔ جس کے چند سال بعد ہی انھیں سفرِ آخرت درپیش ہوگیا۔ گھر میں میری بیوی۔ سوتیلی ماں اور اُن کے دو لڑکے تھے مگر آمدنی ایک پیسے کی نہ تھی۔ گھر میں جو کچھ تھا چھ ماہ تک والد کی علالت اور اس کے بعد تجہیز و تکفین میں خرچ ہوگیا۔ اس وقت میں نویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ مجھے ایم۔ اے پاس کر کے وکیل بننے کا ارمان تھا۔ سرکاری ملازمت اس زمانے میں بھی اتنی ہی مشکل سے ملتی تھی جتنی کہ اب۔ دوڑ دھوپ کر کے شاید دس بارہ روپے کی کوئی جگہ پا جاتا۔ مگر یہاں تو آگے پڑھنے کی دُھن تھی۔ مگر پاؤں میں لوہے کی نہیں اشٹ دھات بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اور میں پہاڑ پر چڑھنا چاہتا تھا۔

اپنی آپ بیتی کس سے کہوں۔ پاؤں میں جوتے نہ تھے۔ بدن پر ثابت کپڑے نہ تھے۔ گرانی الگ دس سیر کے جَو تھے۔ اسکول سے ساڑھے تین بجے چھٹی ملتی تھی۔ کوئنس کالج بنارس میں پڑھتا تھا ہیڈ ماسٹر صاحب نے فیس معاف کر دی تھی۔ امتحان سر پر تھا اور میں بانس کے پھاٹک پر ایک لڑکے کو پڑھانے جایا کرتا تھا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ چار بجے شام کو پہنچ جاتا اور چھ بجے چھٹی پاتا تھا۔ وہاں سے میرا گھر پانچ میل پر تھا۔ تیز چلنے پر بھی آٹھ بجے رات سے قبل گھر نہ پہنچتا۔ رات کو کھانا کھا کر بجلی کے سامنے پڑھنے بیٹھتا اور نہ معلوم کب سو جاتا۔

اتفاق سے ایک وکیل صاحب کے لڑکوں کو پڑھانے کا کام مل گیا۔ پانچ روپے تنخواہ ٹھہری۔ میں نے دو روپیہ میں گزر کر کے تین روپے گھر دینے کا مصمم ارادہ کیا۔ وکیل صاحب کے اصطبل کے اوپر ایک چھوٹی سی کچی کوٹھری تھی۔ اسی میں رہنے کی اجازت مل گئی ایک ٹاٹ کا ٹکڑا بچھا لیا۔ بازار سے ایک چھوٹا سا لیمپ لے آیا اور شہر میں رہنے لگا۔ گھر سے کچھ برتن بھی لایا۔ ایک وقت کھچڑی پکا لیتا اور برتن دھو مانج کر لائبریری چلا جاتا۔

جن وکیل صاحب کے لڑکوں کو پڑھاتا تھا۔ ان کے سالے میٹریکولیشن میں میرے ساتھ پڑھتے تھے۔ انھیں کی سفارش سے مجھے یہ ٹیوشن ملا تھا۔ اس دوستی کی وجہ سے جب ضرورت ہوتی۔ ان سے پیسے اُدھار لے لیا کرتا اور تنخواہ ملنے پر حساب بیباق کر دیتا۔ کبھی دو روپے ہاتھ آتے، کبھی تین جس دن تنخواہ کے دو تین روپے ملتے میری قوت ارادی کی باگ ڈھیلی ہو جاتی۔ للچائی آنکھیں حلوائی کی دکان کی طرف کھینچ لے جاتیں۔ اور دو تین آنے کے پیسے ختم کئے بغیر واپس نہ آتا۔ پھر اسی دن گھر جاتا اور دو ڈھائی روپے دے آتا۔ دوسرے دن سے پھر اُدھار لینا شروع کر دیتا۔ لیکن کبھی کبھی اُدھار لینے میں پس و پیش بھی ہوتا جس کی وجہ سے سارا دن روزہ رکھنا پڑتا۔

اسی طرح چار یا پانچ مہینے گزر گئے۔ اسی درمیان ایک بزاز سے دو ڈھائی روپے کے کپڑے لیئے تھے۔ روز ادھر سے نکلنا ہوتا تھا۔ اس کو مجھ پر پورا بھروسہ تھا۔ جب مہینے دو مہینے ہو گئے اور میں روپے نہ چکا سکا تو پھر میں نے ادھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا۔ چکر دے کر نکل جاتا۔ تین سال کے بعد اس کے روپے ادا کر سکا۔ اسی زمانے میں شہر کا ایک بیلدار مجھ سے کچھ ہندی پڑھنے آیا کرتا تھا۔ اس کا گھر وکیل صاحب کے مکان کی پشت پر تھا۔ جان بوجھ کر اس کا سخن تکیہ تھا چنانچہ سب لوگ اسے جان بوجھ ہی کہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے اس سے آٹھ آنے پیسے ادھار لیئے تھے۔ یہ پیسے اس نے مجھ سے میرے گھر گاؤں میں جا کر پانچ برس کے بعد وصول کئے۔ اب بھی میری پڑھنے کی خواہش تھی لیکن روز بروز نا امید ہوتا جاتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کہیں نوکری مل جائے تو کر لوں۔ لیکن نوکری کس طرح اور کہاں ملتی ہے یہ مجھے معلوم نہ تھا۔

جاڑے کا موسم تھا مگر کوڑی پاس نہ تھی۔ دو دن تک تو ایک ایک پیسے کے بھنے ہوئے چنے کھا کر کاٹے۔ میرے مہاجن نے ادھار دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور میں لحاظ کے مارے کسی سے مانگنے کی جرات نہ کر سکتا تھا۔ چراغ جل چکے تھے۔ اسی وقت میں ایک بک سیلر کی دکان پر ایک کتاب بیچنے گیا جو چکرورتی کی بنائی ہوئی ارتھمیٹک کی شرح تھی اور جسے میں نے دو سال ہوئے خریدا تھا۔ اب تک اسے بڑی احتیاط سے رکھا تھا۔ لیکن آج جب چاروں طرف سے مایوسی ہو گئی تو اسے فروخت کرنے کا ارادہ کیا۔ کتاب کی قیمت دو روپے تھی لیکن ایک روپیہ میں سودا ہوا۔

مصائب کا ایک اخلاقی پہلو بھی ہوتا ہے۔ آزمائشیں ہی انسان کو انسان بناتی ہیں اور انہیں سے آدمی میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔

میرے ماموں گاؤں میں رہتے تھے۔ موروثی زمین تھی۔ اس سے کھانے بھر کو آجاتا تھا لیکن مجرد زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ سماجی رکاوٹوں کے باعث شادی نہیں ہو سکی۔ اس لیئے ایک چمارن سے جو ان کے گھر میں گوبر پاتھنے اور کوڑا کرکٹ اٹھانے آیا کرتی تھی عشق لڑانے لگے۔ چماری چالاک تھی، اس نے سماج کے اس مظلوم آدمی کی کمزوری کو بھانپ لیا، ادھر اس سے اچھے اچھے کپڑے لیتی اور تر مال کھاتی رہی اور ادھر اس عشق کا چرچا چمار بستی میں کر دیا۔ اس لیئے جس روز ماموں صاحب کو اس عشق کا آخری مرحلہ طے کرنا تھا ان کی خوب مرمت ہوئی۔ چماری کے اندر آتے ہی جونہی انہوں نے سانکل لگائی کہ لٹھ بند چماروں نے دروازہ توڑنا شروع کر دیا۔ وہ خوف کے مارے بھوسے والے کمرے میں جا چھپے مگر چمار اپنی ہی کرنے پر تلے ہوئے تھے انہیں اندر سے نکال کر خوب پیٹا۔

سارے گاؤں میں اُن کی کھلی اڑی اور وہاں رہنا مشکل ہو گیا۔ اس لیئے وہ بہنوئی کے گھر اٹھ آئے۔ اس سے پہلے بھی جب کبھی اکیلے رہتے رہتے جی گھبراتا تھا اکثر آجاتے تھے۔ میری عمر اس وقت بارہ تیرہ سال تھی۔ وہ مجھ پر ہمیشہ رعب گانٹھا کرتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اس واقعہ کے بعد ماموں صاحب کا رویہ نرم پڑ جائے گا لیکن جب دیکھا کہ ایسا نہیں ہوا اور ماموں صاحب بدستور رعب گانٹھ رہے ہیں تو میں نے اس واقعے کی بنا پر ایک مزاحیہ ڈراما لکھا جس میں چماروں کے ہاتھوں ماموں کی مرمت کا ذکر خوب مزے لے لے کر کیا تھا۔

میں صبح اسکول جاتے وقت یہ ڈراما ماموں صاحب کے سرہانے رکھ گیا۔ چھٹی ملنے پر میں یہ خیال دل میں لیئے لوٹ رہا تھا کہ دیکھیں ڈراما پڑھنے کے بعد ان پر اس کا کیا ردعمل ہوا۔ لیکن گھر پہنچا تو وہاں نہ ماموں موجود تھے اور نہ وہ ڈراما۔ شاید وہ جاتے وقت اس کو نذرِ آتش کر گئے تھے۔

بمبئی کی ایک فلم کمپنی مجھے بلا رہی ہے۔ تنخواہ کی بات نہیں ٹھیکے کی بات ہے، آٹھ ہزار روپے سالانہ پر۔ میں اس حالت پر پہنچ گیا ہوں جب

مجھ کو اس کے سوائے کوئی چارہ نہیں رہ گیا ہے کہ یا تو وہاں چلا جاؤں یا اپنے ناول کو بازار میں بیچوں (اجنتا سنے ٹون) کمپنی والے حاضری کی کوئی قید نہیں رکھتے۔ میں جو چاہوں لکھوں، جہاں چاہے چلا جاؤں۔ وہاں سال بھر رہنے کے بعد ایسا کنٹریکٹ کر لوں گا کہ میں بنارس میں، بیٹھے بیٹھے میں چار کہانیاں لکھ دیا کروں اور سال پانچ ہزار روپے مل جایا کریں۔ مجھ سے "جاگرن" اور "ہنس" دونوں مزے میں چلیں گے اور پیسے کی تکلیف جاتی رہے گی۔

میں یکم جون ۱۹۳۴ء کو بمبئی چلا آیا۔ اس کمپنی سے معاہدہ کر لیا۔ سال بھر میں چھ قصے اسے دینا ہوں گے۔ رسالوں سے متواتر نقصانات ہو رہے تھے۔ ایجنسیوں سے روپے وصول نہ ہوتے تھے۔ کاغذ وغیرہ کا بار بڑھتا جاتا تھا۔ مجبور ہو کر یہ معاہدہ کر لیا۔ چھ قصے لکھنا مشکل ہیں۔ ہاں ڈائرکٹروں کے مشورے سے لکھنا ضروری ہے کہ کیا چیز فلم کے لئے موزوں ہو گی۔ اس کا بہترین فیصلہ وہی کر سکتے ہیں۔

مگر میں جن ارادوں سے یہاں (بمبئی) آیا تھا۔ ان میں سے ایک بھی پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ یہ ڈائرکٹر جس طرح کی کہانیاں بناتے رہتے ہیں اس لیک سے ذرا بھی نہیں ہٹ سکتے۔ رکیک مذاق کو یہ لوگ تماشائیوں کی جان سمجھتے ہیں ان کا عقیدہ لڑکھانا ہے۔ راجہ رانی، وزیر کی سازشیں، نقلی لڑائیاں، بوسہ بازی ہی ان کے مقصد ہیں۔ میں نے سماجی کہانیاں لکھی ہیں جنہیں تعلیم یافتہ طبقہ بھی دیکھنا چاہتا ہے لیکن انکو فلم کرتے وقت شبہ ہوتا ہے کہ چلیں نہ چلیں۔ اگر مولانا ابوالکلام مکالمے لکھیں تو فلموں میں جان پڑ جائے۔ مگر آپ تو جانتے ہیں فلم کی قدر درجہ دوم کے تماشائیوں پر ہے اور یہ اچھے مکالمے کی قدر نہیں کر سکتے۔ مگر پھر یہ لوگ قدر نہ کریں سمجھنے والے تو کرتے ہیں۔ "بازارِ حسن" کی مٹی پلید کر دی۔ "مزدور" البتہ کچھ اچھی رہی۔ سال (۱۹۳۴) تو پورا کرنا ہی ہے۔ قرضدار ہو گیا تھا قرضہ پٹ جائے گا مگر اور کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اپنے پرانے اڈے پر بیٹھوں گا۔ وہاں دولت نہیں ہے مگر سکونِ قلب ضرور ہے۔ یہاں تو معلوم ہوتا ہے زندگی برباد کر رہا ہوں۔

سینما کے ذریعہ مغرب کی ساری بیہودگیاں ہمارے اندر داخل کی جاری ہیں اور ہم بے بس ہیں۔ پبلک میں تعلیم نہیں نہ نیک و بد کا امتیاز ہے۔ آپ اخباروں میں کتنا ہی فریاد کیجئے وہ بیکار ہے اور اخبار والے بھی تو صاف گوئی سے کام نہیں لیتے۔ جب ایکٹرسوں اور ایکٹروں کی تصویریں دھڑا دھڑ چھپیں اور اُن کے کمال کے قصیدے گائے جائیں تو کیوں نہ نوجوانوں پر اس کا اثر ہو۔ سائنس ایک برکت ایزدی ہے مگر نا اہلوں کے ہاتھوں میں پڑ کر لعنت ہو رہا ہے۔ جن ہاتھوں میں فلم کی قسمت ہے وہ بدقسمتی سے اسے انڈسٹری سمجھ بیٹھے ہیں۔ انڈسٹری کو مذاق اور اصلاح سے کیا نسبت، وہ اکسپلائٹ EXPLOIT کر رہی ہے۔ برہنہ اور نیم برہنہ تصاویر۔ قتل و خون اور جبر کی وارداتیں۔ مار پیٹ، غصہ اور غضب اور نفسانیت ہی اس انڈسٹری کے اوزار ہیں اور اسی سے وہ انسانیت کا خون کر رہی ہے۔

میں بمبئی میں زندگی سے تنگ آ گیا۔ یہاں کی آب و ہوا اور فضا دونوں ہی میرے موافق نہیں۔ ہم مذاق آدمی نہیں ملتا۔ محض زندگی میں ایک نیا تجربہ حاصل کرنے کی غرض سے بمبئی آیا تھا۔ میری کمپنی کی تصاویر ایک بھی مقبول نہ ہو سکیں۔ اور ادھر ایکٹروں کے معتوب ہو جانے سے اور بھی نقصانات ہوئے۔ چنانچہ ان کے آزمودہ کار ایکٹر مثلاً جے راج، بتو "نارایانی" وغیرہ کنارہ کش ہو گئے۔ سینما میں کسی اصلاح کی توقع کرنا بیکار ہے۔ یہ صنعت بھی اسی طرح سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے۔ جیسے شراب فروشی۔ انہیں اس سے بحث نہیں کہ پبلک کے مذاق پر کیا اثر پڑتا ہے۔ انہیں تو اپنے پیسے سے مطلب۔ برہنہ رقص، بوسہ بازی اور مردوں کا عورتوں پر حملہ یہ سب ان کی نظروں میں جائز ہے۔ پبلک کا مذاق اتنا

سکتا۔ جب تک یہ مخرب اور حیا سوز نظارے نہ ہوں اس تصویر میں مزہ نہیں آتا۔ مذاق کی اصلاح کا بیڑا کون اٹھائے۔ میرے خیال میں شریف خواتین کا فلم سازی میں حصہ لینا ہرگز درست نہیں کیونکہ ان رقاصاؤں کی فضا ان کے لئے راس نہیں آ سکتی۔ اور نہ آئندہ اس میں کسی قسم کی اصلاح ممکن ہے۔ سینما کی بدولت ہمارے نوجوانوں پر جو برے اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ ان اخبارات کی بدولت اس میں دن بدن ترقی ہو رہی ہے۔

ادب، شاعری اور دوسرے فنون کا مقصد ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ آدمی میں جو بہیمیت ہے اسے مٹا کر اس کے ملکوتی صفات کو ابھارا جائے۔ اس کے ادنیٰ جذبات کو دبا کر یا مٹا کر لطیف، نرم و نازک اور پاکیزہ جذبات کو بیدار کیا جائے۔ اگر سینما اسی آدرش کو سامنے رکھ کر تصویریں پیش کرتا تو آج وہ دنیا کو آگے بڑھانے میں سب سے موثر طاقت ثابت ہوتا۔

جس زمانہ میں بمبئی میں کانگریس کا اجلاس تھا جبکہ سینما ہال خالی رہتے تھے اور ان دنوں جو تصویریں دکھائی گئیں ان میں نقصان ہی رہا۔ اس کا سبب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ عوام کے بارے میں جو خیال ہے کہ وہ مار کاٹ اور سنسنی پیدا کرنے والی تصویروں کو ہی پسند کرتے ہیں محض وہم ہے۔ عوام محبت، ایثار، اخوت اور انسانی ہمدردی کے جذبات سے بھری ہوئی فلمیں زیادہ شوق سے دیکھنا چاہتے ہیں مگر ہمارے سینما والوں نے پبلسٹی والوں کی ذہنیت سے کام لیکر یہ سمجھ لیا ہے کہ صرف بھدے مسخرے پن میں، لڑائی اور زور آزمائی میں یا سو فٹ کی اونچی دیوار سے کود نے میں اور ہیرو ولن دشمن کی تلوار چلانے میں ہی جنتا کو آنند آتا ہے اور کچھ تھوڑی سی ہوس رانی اور بوس و کنار تو گویا سینما کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا جسم کے لئے آنکھیں۔ بے شک عوام شجاعت اور جوانمردی دیکھنا چاہتے ہیں۔ عشق و محبت کے مناظر بھی ان کے لئے خاص کشش رکھتے ہیں لیکن یہ خیال کہ آلنگن اور بوس و کنار کے بغیر محبت کا اظہار ہو ہی نہیں سکتا اور صرف نقلی تلوار چلانا ہی جوان مردی ہے۔ اور بغیر کسی ضرورت کے قہقہہ لگانا خوش ذوقی کا تقاضا ہے یا تشدد اور جبر و اذیت سے عوام کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔ نفسیات کی بالکل غلط تعبیر ہے۔

"ہم خرما و ہم ثواب" "کشنا" وغیرہ میری ابتدائی تصانیف ہیں ۱۹۰۲ء میں ایک ہندی ناول "پریما" لکھ کر انڈین پریس سے شائع کرایا ۱۹۱۲ء میں "جلوۂ ایثار" لکھا۔ پھر مارچ کی صلاح سے میں نے (بازارِ حسن) سیوا سدن نامی ناول لکھا (۱۹۱۹ء)۔ سیوا سدن کی جو قدر افزائی ہوئی اس سے میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی اور میں نے دوسرا ناول "پریم آشرم" (گوشۂ عافیت) لکھا۔ "رنگ بھوم" "کایا کلپ" بار دار ناول … دو سال کے وقفے کے بعد نکلے۔ "بازارِ حسن" میری ڈیڑھ سال کی محنت اور خامہ فرسائی کا نتیجہ ہے۔ ہندی میں تو مجھے پانچ سو روپے ملے اور ہندی ناول نے خوب شہرت حاصل کی۔ اکثر نقادوں نے اسے ہندی زبان کا بہترین ناول کہا ہے۔ یہ "بازارِ حسن" کا ترجمہ ہے۔ مجھے ابھی تک یہ اطمینان نہیں ہوا کہ کونسا طرز تحریر اختیار کروں۔ کبھی تو بنکم کی نقل کرتا ہوں، کبھی آزاد کے پیچھے چلتا ہوں آج کل کاؤنٹ ٹالسٹائی کے قصے پڑھ چکا ہوں۔ تب سے کچھ اسی رنگ کی طرف طبیعت مائل ہے۔ یہ اپنی کمزوری ہے۔

الہ آباد میں ایک برہمو پارٹی ہے آپادھیائے جی اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔ اوٹ پٹانگ باتیں کہہ کر مجھے بدنام کر رہے ہیں "رنگ بھوم" اور "وینٹی فیئر" میں ذرہ بھر کی مناسبت نہیں ہے اور "پریم آشرم" (گوشۂ عافیت) کو RESURRECTION کے مماثل بتلانا تو حد درجہ بے ہودگی ہے۔ میں نے آج تک ریسرکشن پڑھا ہی نہیں۔ حالانکہ اس کی تعریف بہت سن چکا ہوں ایسی مماثلت جیسی آپادھیائے جی دکھلاتے ہیں قریب

قریب قریب سبھی کتابوں میں ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ دنیٹی نیز میں ایک آدمی غلط سلط انگریزی بولتا ہے۔ اسی سے رنگ جوڑی ہیں ایک بنگالی بابو لائے گئے۔ ان حضرات کو یہ بھی خبر نہیں کہ بنگالی بابو کیوں لائے گئے۔ ان کے وجود کا منشا کیا ہے۔ ایسا کو آپ صوفیہ سے ملانے میں حالانکہ صوفیہ دراصل مسز رانی بیٹ ہیں۔

اس صوبے میں پبلشروں کا قحط ہے۔ دو ناولوں کے ترجمے دارالاشاعت پنجاب کو دیئے۔ "پردہ مجاز" ابھی تک پبلشر نے نہیں چھاپا۔ خطوط لکھ چکا۔ نہ روپے بھیجتا ہے نہ کتابیں نہ جواب دیتا ہے۔ معلوم نہیں بیمار ہے کیا۔ ادھر "غبن" کو ترجمہ بھی شروع کر دیا۔ مگر یہ دیا ... ہو رہی ہے۔ کتابوں کی کافی بکری نہیں ہے۔ بک سیلروں کا تجربہ تلخ مجھے ہوا۔ میرے ڈیڑھ سو روپے دبا بیٹھا ہے۔ لاہور ہی میں ایک ... میرے سات سو روپے ہضم کرنا چاہتا ہے۔ اخبارات کا یہ حال ہے۔ بک سیلر وہ کا یہ بیچارہ مصنف کیا کرے۔ میری دو کتابیں ... دہلی کے اہتمام سے چھپ رہی ہیں۔ ایک کا نام "میدان عمل" دوسری کا نام "واردات" ہے۔ تیسری زیر تصنیف ہے۔

اُردو میں رسالے اور اخبارات تو بہت نکلتے ہیں۔ شاید ضرورت سے زیادہ اس لیئے کہ مسلمان ایک لٹریری قوم ہیں اور ... اپنے تئیں مصنف ہونے کے قابل سمجھتا ہے۔ لیکن پبلشروں کا تیسر قحط ہے۔ سارے قلمرو ہند میں ایک بھی ڈھنگ کا پبلشر موجود نہیں ... ان کا عدم اور وجود برابر ہے کیوں کہ ان کی ساری کائنات چند ردی کے ناول ہیں جن سے ملک یا زبان کو کوئی فائدہ نہیں۔

میں ناول کو انسانی کردار کی تصویر سمجھتا ہوں۔ انسان کے کردار پر روشنی ڈالنا اور اس کے اسرار کو کھولنا ہی ناول کا بنیادی مقصد ... کرداروں کا مطالعہ جتنا واضح اور وسیع ہوگا اتنی ہی کامیابی سے ہم کرداروں کی مصوری کر سکیں گے۔ انسانی فطرت نہ تو بالکل سیاہ ہوتی ہے ... سفید۔ اس میں دونوں رنگوں کا عجیب اتصال ہوتا ہے۔ اگر گردو پیش کے حالات اس کے موافق ہوئے تو فرشتہ بن جاتا ہے اور ناموافق ہو ... وہ حالات کا محض ایک کھلونا ہوتا ہے۔

ہر بچے کو اپنے بچپن کی کہانیاں یاد ہوں گی جو اس نے اپنی والدہ یا بہن سے سنی تھیں کہانیاں سننے کے لیے وہ کس قدر بے قرار ... شروع ہوتے ہی وہ انہماک سے اسے سنتا تھا۔ کتے اور بلیوں کی کہانیاں سن سن کر وہ کس قدر خوش ہوتا تھا۔ اسے وہ شاید کبھی نہیں بھول سکتا ... کی یادوں میں سب سے خوشگوار یاد شاید کہانی ہی ہے۔ کھلونے، مٹھائیاں اور کھیل تماشے تو تقریباً سبھی ذہن سے اُتر جاتے ہیں ... کی یاد ذہن میں باقی ہے۔

پہلے پہل ۱۹۰۷ء میں، میں نے کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی کئی کہانیاں میں نے انگریزی میں پڑھی تھیں ... میں سے بعض کا ترجمہ کیا۔ میری پہلی کہانی کا نام تھا "دنیا کا سب سے انمول رتن"۔ وہ ۱۹۰۷ء میں رسالہ "زمانہ" میں چھپی اس کے بعد ... "زمانہ" میں چار پانچ کہانیاں اور لکھیں۔ ۱۹۰۹ء میں پانچ کہانیوں کا مجموعہ "سوزِ وطن" کے نام سے زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا ... میں تقسیم بنگالہ کی شورش برپا تھی اور کانگریس میں گرم دل کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ ان پانچوں کہانیوں میں حب وطن کا ترانہ گایا گیا۔

دیباچہ سوزِ وطن:

"ہر ایک قوم کا علم و ادب اپنے زمانہ کی سچی تصویر ہوتا ہے جو خیالات قوم کے دماغوں کو متحرک کرتے ہیں ... قوم کے دلوں میں گونجتے ہیں وہ نظم و نثر کے صفحوں میں ایسی صفائی سے نظر آتے ہیں جیسے آئینہ میں صورت، ہمارے لٹریچر کا ابتدائی دور ... غفلت کے نشے میں متوالے ہو رہے تھے، اس زمانہ کی یادگار بجز عاشقانہ غزلوں اور چند خیالی کہانیوں کے اور کچھ نہیں۔ دوسرا دور ...

جب قوم نئے اور پرانے خیالات میں زندگی اور موت کی لڑائی شروع ہوئی اور اصلاحِ تمدن کی تجویزیں سوچی جانے لگیں۔ اس زمانے کے قصص و حکایات زیادہ تر اصلاح اور تجدید کا پہلو لئے ہوتے ہیں۔ اب ہندوستان کے قومی خیال نے بلوغت کے زینہ پر ایک اور قدم بڑھایا اور حب وطن کے جذبات لوگوں کے دلوں میں سر ابھارنے لگے۔ کیونکر ممکن تھا کہ اس کا اثر ادب پر نہ پڑتا۔ یہ چند کہانیاں اس اثر کا آغاز ہیں اور یقین ہے جوں جوں ہمارے خیال وسیع ہوتے جائیں گے اسی رنگ کے لٹریچر کو روز افزوں فروغ ہوتا جائے گا۔ ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حب وطن کی عظمت کا نقشہ جمائیں۔"

میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہدے یا تجربے پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر محض واقعے کے اظہار کے لئے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اس میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں جب تک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں ملتی میرا قلم ہی نہیں اٹھتا۔ زمین تیار ہونے پر میں کیریکٹروں کی تخلیق کرتا ہوں۔ بعض اوقات تاریخ کے مطالعے سے بھی پلاٹ مل جاتے ہیں۔ لیکن کوئی واقعہ افسانہ نہیں ہوتا۔ تاوقتیکہ وہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار نہ کرے۔

ادیب انسانیت کا، علوئے نیت کا، شرافت کا علمبردار ہے۔ جو پامال ہیں، مظلوم ہیں، محروم ہیں چاہے وہ فرد ہوں یا جماعت۔ ان کی حمایت اور وکالت ان کا فرض ہے۔ اس کی عدالت سوسائٹی ہے۔ اس عدالت کے سامنے وہ اپنا استغاثہ پیش کرتا ہے۔ میں لٹریچر کو MASCULINE دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے زنانہ FEMININE خواہ وہ کسی صورت میں ہو مجھے پسند نہیں۔ اسی وجہ سے مجھے ٹیگور کی اکثر نظمیں نہیں بھاتیں۔ یہ فطری نقص ہے کیا کروں۔ اشعار بھی مجھے وہی اپیل کرتے ہیں جن میں کوئی جدت ہو۔ غالب کے رنگ کا میں عاشق ہوں۔ عزیز لکھنوی کے گلدستے کی خوب سیر کی ہے مگر بدقسمتی سے آج تک ایک شعر بھی موزوں نہیں کر سکا۔ تبیعت ہی چاہتا ہے۔ غالباً شاعرانہ حس دل میں ہے ہی نہیں۔

واقعیت چاہتی ہے کہ آرٹسٹ دنیا کو اس طرح دکھائے۔ جیسے وہ اسے دیکھتا ہے۔ اگر اس سے اس کے انسانی احساسات کو صدمہ پہنچتا ہے تو پہنچے۔ اگر اس سے اس کے حسن انصاف کو چوٹ لگتی ہے تو لگے۔ پر اسے واقعیت سے منحرف ہونے کی اجازت نہیں ہے مگر ادیب سب کچھ کھینے پر بھی آئیڈیلسٹ IDEALIST بننے کے لئے مجبور ہے۔ جب تک اس کی نظر میں سوسائٹی کی کوئی بہتر صورت نہیں ہے موجودہ معاشرت کی ناہمواریاں کیسے اسے بیتاب کریں گی۔ اگر کسی زندگی اور زیادہ خوبصورت سوسائٹی کی صورت ہمارے ذہن میں نہیں ہے تو ہم موجودہ سوسائٹی کو اصلاح کی کسی منزل مقصود کی طرف لے جائیں گے۔

ہر ایک زبان کی ذہنی اور عملی ترقیوں کا اندازہ لگانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کی تصنیف و تالیف پر نظر ڈالی جائے۔

ناول اس افسانے کو کہتے ہیں جو زمانہ کا (جس کا وہ تذکرہ کر رہا ہو) صاف صاف چربہ اتارے اور اس کے رسم و رواج مراسم، آداب، طرز معاشرت وغیرہ پر روشنی ڈالے اور مافوق العادت واقعات کو دخل نہ دے۔ اگر سرشار کے افسانوں کو دیکھئے تو ایسی کونسی خوبی ہے جو اس میں بدرجہ اتم موجود نہیں۔

حق تو یہ ہے کہ ان کی سب کتابیں اپنے زمانہ کی سچی تصاویر ہیں۔ اگر آج سے سو برس بعد کوئی شخص فسانۂ آزاد کا مطالعہ کرے تو اس کو پچیس برس کی تہذیب و روشِ خیالات و مذاقِ عامہ کی جھلکیاں صاف نظر آئیں گی۔ جو تاریخ کے مطالعہ سے چاہے وہ کیسا ہی وسیع اور دقیق کیوں نہ ہو ہرگز نہیں آ سکتیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ تصویرِ زمانہ جتنے جزئیات پر حاوی ہے۔ ان سب پر سرشار کے طلسمی قلم نے جادو طرازی کی ہے

برعکس اس کے حضرت شرر کے جو ناول مشہور ہیں۔ وہ کوئی تو صلیبی لڑائیوں کا زمانہ ہے کوئی روس و روم کی لڑائی کے وقت کا کوئی اس زمانے کا جب مسلمانوں کے قدم اسپین سے اکھڑ چکے تھے۔ الغرض سبھی ناظر کو دس پانچ صدیاں پیچھے لے جاتے ہیں اور چونکہ حضرت شرر کو ان باتوں کا ذاتی تجربہ نہیں ہے اس لئے وہ اس وقت کے واقعات کی ایسی تصویر ہرگز نہیں کھینچ سکے جو اصل سے مطابقت رکھے۔ ان کی معلومات کا سب سے زرخیز ذریعہ تاریخ ہے اور تاریخی معلومات کتنی ہی وسیع کیوں نہ ہوں ذاتی عینی مشاہدے سے لگا نہیں کھا سکتیں۔

اگر بھارت میں اردو اور ہندی دو بھاشائیں الگ الگ رہیں گی۔ انھیں اپنے اپنے ڈھنگ پر اپنی اپنی سنسکرتی کے مطابق بڑھنے دیا جائے۔ ان کو ملانے کی اور اس طرح دونوں کی ترقی کو روکنے کی کوشش نہ کی جائے۔ یا ایسا ممکن ہے کہ دونوں بھاشاؤں کو اتنا قریب لایا جائے کہ ان میں رسم الخط کے سوا کوئی فرق نہ رہے۔

میرا خیال ہے کہ دونوں بھاشاؤں میں ایکتا لائی جا سکتی ہے۔ یہ لوگ ہندی اور اردو ناموں کا استعمال نہیں کرتے۔ دونوں کو ایک نام سے پکارتے ہیں اور وہ ہے ہندوستانی۔ ان کا آدرش ہے کہ جہاں تک ممکن ہو لکھی جانے والی بول چال کی زبان کی صورت ایک ہو اور وہ تھوڑے سے پڑھے لکھے آدمیوں کی زبان نہ رہ کر ساری قوم کی زبان ہو۔ چونکہ اردو زبان عرصہ سے عدالت اور تہذیب سماج کی بھاشا رہی ہے اس سے اس میں ہزاروں فارسی اور عربی کے لفظ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ دیہاتی بھی ان کا مطلب سمجھ جاتا ہے۔ ایسے لفظوں کو الگ کر کے ہندی میں خالص پن لانے کی جو کوشش کی جا رہی ہے ہم اُسے زبان اور قوم دونوں ہی کے ساتھ انصافی سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ہندی، سنسکرت یا انگریزی کے جو بگڑے ہوئے لفظ اردو میں مل گئے ان کو چن چن کر نکال لینے اور ان کی جگہ خالص فارسی اور عربی لفظوں کے استعمال کو بھی اتنا ہی اعتراض کے لائق سمجھتے ہیں۔ جب تک اردو ہندی دونوں بھاشاؤں کا میل نہ ہوگا۔ ہندوستانی زبان کی گاڑی جہاں جا کر رک گئی ہے اس سے آگے نہ بڑھ سکے گی۔

خطبۂ صدارت جلسہ ترقی پسند مصنفین:

ہمارے تمثیلوں اور انجمنوں میں اب تک عام طور پر زبان اور اس کی اشاعت سے بحث کی جاتی رہی ہے یہاں تک کہ اردو اور ہندی کا جو لٹریچر موجود ہے اس کا منشا خیالات اور جذبات پر اثر ڈالنا نہیں بلکہ محض زبان کی تعمیر تھا۔ وہ بھی بہت ہی اہم کام تھا۔ جب تک زبان ایک مستقل صورت نہ اختیار کرے اس میں خیالات اور جذبات ادا کرنے کی طاقت ہی کہاں سے آئے۔ ہماری زبان کے بانیوں نے ہندوستانی زبان کی تعمیر کر کے قوم پر جو احسان کیا ہے اس کے لئے ہم ان کے مشکور نہ ہوں تو یہ ہماری احسان فراموشی ہوگی۔

زبان بول چال کی بھی ہوتی ہے اور تحریر کی بھی۔ بول چال کی زبان تو میر امن اور للولال کے زمانے میں بھی موجود تھی۔ انھوں نے جس زبان کی داغ بیل ڈالی وہ تحریر کی زبان تھی اور وہی اب ادب ہے۔ ادب اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں حقیقت کا اظہار ہو۔ جس کی زبان پختہ، شستہ اور لطیف ہو اور جس میں دل و دماغ پر اثر ڈالنے کی صفت ہو اور ادب میں یہ صفت کامل طور پر اسی حالت میں پیدا ہوتی ہے جب اس میں زندگی کی حقیقتیں اور تجربے بیان کئے گئے ہوں۔

ترقی پسند مصنفین کا عنوان میرے خیال میں تو تعصب ہے، ادیب یا آرٹسٹ طبعاً اور خلقتاً ترقی پسند ہوتا ہے۔ اگر یہ اس کی فطرت نہ ہوتی تو شاید وہ ادیب نہ ہوتا۔ وہ آئیڈیلسٹ ہوتا ہے اسے اپنے اندر بھی ایک کمی محسوس ہوتی ہے۔ داخلیت وہ شئے ہے جو جمود پستی سہل نگاری کی طرف لے جاتی ہے اور ایسا آرٹ ہمارے لئے نہ انفرادی حیثیت سے مفید ہے نہ اجتماعی حیثیت سے۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے میں اور چیزوں کی طرح آرٹ کو بھی افادیت کی میزان میں تولتا ہوں۔ ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔

ہماری انجمن نے کچھ اس طرح کے اصولوں کے ساتھ میدان میں قدم رکھا ہے وہ ادب کو خریات اور شبابیات کا دست نگر نہیں دیکھنا چاہتا۔ وہ ادب کو سعی و عمل کا پیغام اور ترانہ بنانے کا مدعی ہے۔ اسے زبان سے بحث نہیں۔ آئیڈیل کی وسعت کے ساتھ زبان خود بخود سلیس ہو جاتی ہے۔ حسن معنی آرائش سے بے نیاز رہ سکتا ہے۔ ہمارا معاملک میں ایسی فضا پیدا کرنا ہے جس میں مطلوبہ ادب پیدا ہو سکے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ادب کے مرکزوں میں ہماری انجمنیں قائم ہوں اور وہاں ادب کے تعمیری رجحانات پر باقاعدہ چرچے ہوں۔

بہرحال جب تک ادب کا کام تفریح کا سامان پیدا کرنا، محض لوریاں گا گا کر سلانا محض آنسو بہا کر غم غلط کرنا تھا۔ اس وقت تک ادیب کے لئے عمل کی ضرورت نہ تھی۔ وہ دیوانہ تھا جس کا غم دوسرے کھاتے تھے مگر ہم ادب کو محض تفریح اور تعیش کی چیز نہیں سمجھتے۔ ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو۔ زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت اور ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے۔ سلائے نہیں۔ کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔

میری تمنائیں بہت محدود ہیں۔ اس وقت سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ ہم اپنی جنگ آزادی میں کامیاب ہوں۔ میں دولت اور شہرت کا خواہشمند نہیں ہوں، کھانے کو بھی مل جاتا ہے۔ موٹر اور بنگلے کی مجھے ہوس نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار بلند پایہ تصنیفیں چھوڑ جاؤں لیکن ان کا مقصد بھی حصول آزادی ہی ہو۔ اپنے دونوں لڑکوں کے لئے بھی کوئی منصوبہ نہیں رکھتا۔ صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ ایماندار مخلص اور مستقل مزاج ہوں۔ عیش پسند اور دولت پرست خوشامدی اولاد سے مجھے نفرت ہے۔ میں بے حرکت زندگی کو بھی ناپسند کرتا ہوں۔ ادب اور وطن کی خدمت کا مجھے ہمیشہ دھیان ہے۔ یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دال روٹی اور معمولی کپڑے میسر ہو جائیں۔ ادبی خدمت اور غریبی میں خدا واسطے کا بیر ہے۔ اگر کوئی ادیب موٹا تازہ ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس میں سوز نہیں، درد نہیں، دل نہیں، چراغ کا کام جلنا ہے۔ چراغ وہی لبالب بھرا ہوگا جو جلا نہیں۔ میں نے سمجھ لیا ہے کہ ادبی خدمت پوری عبادت ہے۔

سونے، روپے سے لدا ہوا آدمی کسی بھی حیثیت سے بڑا نہیں ہو سکتا ہے۔ دولت مند کو دیکھتے ہی آرٹ اور علم کے متعلق اس کے بلند بانگ بڑ بولوں کو میں دوسرے کان سے نکال دیتا ہوں۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس شخص نے اس سماجی نظام کی تائید کی ہے جو امیروں کے ہاتھوں غریبوں کی خون آشامی پر قائم ہے۔ ایسا کوئی بڑا نام مجھے متاثر نہیں کر سکتا جو دولت کا پجاری ہو۔ ممکن ہے کہ میری ناکام زندگی نے میرے جذبات کو اتنا تلخ بنا دیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ بنک میں کوئی موٹی رقم جمع کرنے کے بعد شاید میں بھی ان جیسا ہو جاتا اور لالچ کا مقابلہ نہ کر سکتا۔ لیکن مجھے فخر ہے کہ فطرت اور قسمت نے میری مدد کی اور مجھے غریبوں کا شریک غم بنا دیا۔ اس سے مجھے روحانی تسکین ملتی ہے۔



سعادت حسن منٹو

"...... منٹو کسی شخص کے خیال سے متاثر ہوتا ہی نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ سمجھانے والے سب چُغد ہیں
دُنیا کو سمجھانا نہیں چاہیئے اسکو خود سمجھنا چاہیئے ـــــ خُود کو سمجھا سمجھا کر وہ ایک ایسی سمجھ بن گیا ہے جو
عقل و فہم سے بالاتر ہے ...."

منٹو کے متعلق اب تک بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے اس کے حق میں کم اور خلاف زیادہ۔ یہ تحریریں اگر پیش نظر رکھی جائیں تو کوئی صاحب عقل منٹو کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتا۔ میں یہ مضمون لکھنے بیٹھا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ منٹو کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنا بڑا کٹھن کام ہے۔ لیکن ایک لحاظ سے آسان بھی ہے اس لئے کہ منٹو سے لمبے قربت کا شرف حاصل رہا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو منٹو کا میں ہمزاد ہوں۔

اب تک اس شخص کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن میں اتنا سمجھتا ہوں کہ جو کچھ ان مضامین میں پیش کیا گیا ہے حقیقت سے بالاتر ہے۔ بعض اسے شیطان کہتے ہیں۔ بعض گنجا فرشتہ۔ ذرا ٹھہرئیے میں دیکھ لوں کہیں وہ کم بخت یہیں تو نہیں سن رہا۔۔۔ نہیں نہیں ٹھیک ہے۔ مجھے یاد آ گیا کہ یہ وہ وقت ہے جب وہ پیا کرتا ہے۔ اس کو شام کے چھ بجے کے بعد کڑوا شربت پینے کی عادت ہے

ہم اکٹھے ہی پیدا ہوئے اور خیال ہے کہ اکٹھے ہی مریں گے لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سعادت حسن مر جائے اور منٹو نہ مرے اور ہمیشہ مجھے یہ اندیشہ دُکھ دیتا ہے۔ اس لئے کہ میں نے اس کے ساتھ اپنی دوستی نبھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اگر وہ زندہ رہا اور مر گیا تو ایسا ہوگا کہ انڈے کا خول تو سلامت ہے اور اس کے اندر کی زردی اور سفیدی غائب ہو گئی۔

اب میں زیادہ تمہید میں جانا نہیں چاہتا۔ آپ سے صاف کہہ دیتا ہوں کہ منٹو ایسا ون ٹو آدمی میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا جسے اگر جمع کیا جائے تو وہ تین بن جائے۔ مثلث کے بارے میں اس کی معلومات کافی ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ ابھی اس کی تثلیث نہیں ہوئی۔ یہ اشارے ایسے ہیں جو صرف بافہم سامعین ہی سمجھ سکتے ہیں۔

یوں تو منٹو کو میں اس کی پیدائش ہی سے جانتا ہوں۔ ہم دونوں اکٹھے ایک ہی وقت گیارہ مئی ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے لیکن اس نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ وہ خود کو کچھوا بنائے رکھے جو ایک دفعہ اپنا سر اور گردن اندر چھپا لے تو آپ لاکھ ڈھونڈتے رہیں تو اس کا سراغ نہ ملے لیکن میں بھی آخر اس کا ہمزاد ہوں میں نے اس کی ہر جنبش کا مطالعہ کر ہی لیا۔

لیجئے اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ خر ذات افسانہ نگار کیسے بنا۔ تنقید نگار بڑے لمبے چوڑے مضامین لکھتے ہیں۔ اپنی ہمہ دانی کا ثبوت دیتے ہیں۔ شوپن ہار۔ فرائڈ ہیگل۔ نٹشے۔ مارکس ـــــــ کے حوالے دیتے ہیں۔ مگر حقیقت سے کوسوں دور رہتے ہیں۔

منٹو کی افسانہ نگاری دو متضاد عناصر کے تصادم کا باعث ہے۔ اس کے والد خدا انھیں بخشے بڑے سخت گیر تھے اور اس کی والدہ بیحد نرم دل۔ ان دو پاٹوں کے اندر پس کر یہ دانۂ گندم کس شکل میں باہر نکلا ہوگا۔ اس کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔

اب میں اس کی اسکول کی زندگی کی طرف آتا ہوں بہت ذہین لڑکا تھا اور بے حد شریر۔ اس زمانے میں اس کا قد زیادہ سے زیادہ ۴ فٹ ہوگا۔ وہ اپنے باپ کا آخری بچہ تھا۔ اس کو اپنے ماں باپ کی محبت تو میسر تھی لیکن اس کے تین بڑے بھائی جو عمر

یں اس سے بہت بڑے تھے اور ولایت میں تعلیم پا رہے تھے ان سے اس کو کبھی ملاقات کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اس لئے کہ وہ سوچتے تھے وہ چاہتا تھا کہ وہ اس سے ملیں۔ اس سے بڑے بھائیوں ایسا سلوک کریں۔ یہ سلوک اسے اس وقت نصیب ہوا جب دنیائے ادب اسے بہت بڑا افسانہ نگار تسلیم کر چکی تھی۔

اچھا اب اس کی افسانہ نگاری کے متعلق سنیئے۔ وہ اول درجے کا فراڈ ہے۔ پہلا افسانہ اس نے بعنوان "تماشہ" لکھا جو جلیانوالہ باغ کے خونیں حادثہ سے متعلق تھا۔ یہ اس نے اپنے نام سے نہیں چھپوایا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پولیس کی دست برد سے بچ گیا۔

اس کے بعد اس کے متلون مزاج میں ایک لہر پیدا ہوئی کہ وہ مزید تعلیم حاصل کرے۔ یہاں اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ اس نے انٹرنس کا امتحان دو بار فیل ہو کر پاس کیا تھا۔ وہ بھی تھرڈ ڈویژن میں۔ اور آپ کو یہ سن کر بھی حیرت ہوگی کہ وہ اردو کے پرچے میں ناکام رہا۔

اب لوگ کہتے ہیں کہ وہ اردو کا بہت بڑا ادیب ہے اور میں یہ سن کر ہنستا ہوں کہ اردو اب بھی اسے نہیں آتی۔ وہ لفظوں کے پیچھے یوں بھاگتا ہے جیسے کوئی جال والا شکاری تتلیوں کے پیچھے۔ وہ اس کے ہاتھ نہیں آتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریروں میں خوبصورت الفاظ کی کمی ہے۔ وہ لٹھ مار ہے لیکن جتنے لٹھ اس کی گردن پر پڑے ہیں اس نے بڑی خوشی سے برداشت کئے ہیں۔

اس کی لٹھ بازی عام محاورے کے مطابق جاٹوں کی لٹھ بازی نہیں ہے وہ بنوٹ اور پھکیت ہے۔ وہ ایک ایسا انسان ہے جو صاف اور سیدھی سڑک پر نہیں چلتا، بلکہ تنے ہوئے رسے پر چلتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اب گرا اب گرا —— لیکن وہ کم بخت آج تک نہیں گرا —— شاید گر جائے اوندھے منہ ...... کہ پھر نہ اٹھے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ مرتے وقت وہ لوگوں سے کہے گا کہ میں اسی لئے گرا تھا کہ گراوٹ کی مایوسی ختم ہو جائے۔

میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں کہ منٹو اول درجے کا فراڈ ہے۔ اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ وہ اکثر کہا کرتا ہے کہ وہ افسانہ نہیں سوچتا خود افسانہ اسے سوچتا ہے۔ یہ بھی ایک فراڈ ہے۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ جب اسے افسانہ لکھنا ہوتا ہے تو اس کی وہی حالت ہوتی ہے جب کسی مرغی کو انڈا دینا ہوتا ہے۔ لیکن وہ یہ انڈا چھپ کر نہیں دیتا۔ سب کے سامنے دیتا ہے۔ اس کے دوست یار بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس کی تین بچیاں شور مچا رہی ہوتی ہیں اور وہ اپنی مخصوص کرسی پر اکڑوں بیٹھا انڈے دیئے جاتا ہے۔ جو بعد میں چوں چوں کرتے افسانے بن جاتے ہیں۔ اس کی بیوی اس سے بہت نالاں ہے۔ وہ اس سے اکثر کہا کرتی ہے کہ تم افسانہ نگاری چھوڑ دو —— کوئی دکان کھول لو۔ لیکن منٹو کے دماغ میں جو دکان کھلی ہے اس میں منیاری کے سامان سے کہیں زیادہ سامان موجود ہے۔ اس لئے وہ اکثر سوچا کرتا ہے اگر میں نے کبھی کوئی اسٹور کھول لیا تو ایسا نہ ہو کہ وہ کولڈ اسٹوریج یعنی سرد خانہ بن جائے۔ جہاں اس کے تمام خیالات اور افکار منجمد ہو جائیں۔

میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں اور مجھے ڈر ہے کہ منٹو مجھ سے خفا ہو جائے گا۔ اس کی ہر چیز برداشت کی جا سکتی ہے مگر خفگی نہیں سہی جا سکتی۔ خفگی کے عالم میں وہ بالکل شیطان بن جاتا ہے لیکن صرف چند منٹوں کے لئے اور وہ چند منٹ اللہ کی پناہ ——

افسانہ لکھنے کے معاملہ میں وہ نخرے ضرور بگھارتا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں اس لئے ۔۔ کہ اس کا ہمزاد ہوں ــــ کہ وہ فراڈ کررہا ہے ــــ اس نے ایک دفعہ خود لکھا تھا کہ اس کی جیب میں بے شمار افسانے پڑے ہوئے ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ جب اسے افسانہ لکھنا ہوگا تو وہ رات کو سوچے گا ــــ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ صبح پانچ بجے اٹھے گا اور اخباروں سے کسی افسانے کا رس چوسنے کا خیال کرے گا۔ لیکن اسے ناکامی ہوگی۔ پھر وہ غسل خانے جائے گا۔ وہاں وہ اپنے شوریدہ سر کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرے گا کہ وہ سوچنے کے قابل ہو سکے لیکن ناکام رہے گا۔ پھر جھنجھلا کر اپنی بیوی سے خواہ مخواہ کا جھگڑا شروع کر دے گا۔ یہاں سے بھی ناکامی ہوگی تو باہر پان لینے کے لئے چلا جائیگا۔ پان اس کی ٹیبل پر پڑا رہے گا۔ لیکن افسانے کا موضوع اس کی سمجھ میں پھر بھی نہیں آئے گا۔ آخر وہ انتقامی طور پر قلم یا پنسل ہاتھ میں لے گا۔ اس سے افسانے کا آغاز کر دے گا۔ بابو گوپی ناتھ۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ ہتک۔ ممی۔ موذیل۔ یہ سب افسانے اس نے اسی فراڈ طریقے سے لکھے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ لوگ اسے بڑا غیر مذہبی اور فحش انسان سمجھتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ وہ کسی حد تک اس درجہ میں آتا ہے۔ اس لئے کہ اکثر اوقات وہ بڑے گہرے موضوعات پر قلم اٹھاتا ہے اور ایسے الفاظ اپنی تحریر میں استعمال کرتا ہے جن پر اعتراض کی گنجائش بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ جب بھی اس نے کوئی مضمون لکھا پہلے صفحے کی پیشانی پر ۷۸۶ ضرور لکھا جس کا مطلب ہے بسم اللہ ــــ اور یہ شخص جو اکثر خدا کا منکر نظر آتا ہے کاغذ پر مومن بن جاتا ہے۔ یہ وہ کاغذی منٹو ہے جسے آپ کاغذی باداموں کی طرح انگلیوں ہی میں توڑ سکتے ہیں۔ ورنہ وہ لوہے کے ہتھوڑے سے بھی ٹوٹنے والا آدمی نہیں۔

اب میں منٹو کی شخصیت کی طرف آتا ہوں۔ جو چند القاب میں بیان کئے دیتا ہوں۔ وہ چور ہے۔ جھوٹا ہے۔ دغاباز ہے اور مجمع گیر ہے ــــ اس نے اکثر اپنی بیوی کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی کئی سو روپے اڑا لئے ہیں۔ ادھر آٹھ سو لاکے دیئے اور چور آنکھ سے دیکھتا رہا کہ اس نے کہاں رکھے ہیں اور دوسرے دن اسی میں سے ایک سبز غائب کر دیا، اور اس بیچاری کو جب اپنے اس نقصان کی خبر ہوئی تو اس نے نوکروں کو ڈانٹنا ڈپٹنا شروع کر دیا۔ یوں تو منٹو کے متعلق مشہور ہے کہ وہ راست گو ہے لیکن میں اس سے اتفاق کرنے کے لئے تیار نہیں وہ اول درجے کا جھوٹا ہے شروع شروع اس کا جھوٹ اسی کے گھر چل جاتا تھا۔ اس لئے کہ اس میں منٹو کا ایک خاص ٹچ ہوتا تھا لیکن بعد میں اسکی بیوی کو معلوم ہوگیا کہ اب تک مجھ سے خاص معاملے کے مطابق جو کچھ کہا جاتا تھا ــــ جھوٹ تھا۔ منٹو جھوٹ بقدر کفاف بولتا ہے لیکن اس کے گھر والے مصیبت ہے کہ اب یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اس کی ہر بات جھوٹی ہے۔ اس تل کی طرح جو کسی عورت نے اپنے گال پر سرمے سے بنا رکھا ہو ــــ وہ ان پڑھ ہے اس لحاظ سے کہ اس نے کبھی مارکس کا مطالعہ نہیں کیا۔ فرائڈ کی کوئی کتاب آج تک اس کی نظر سے نہیں گزری۔ ہیگل کا وہ صرف نام ہی جانتا ہے۔ ہیولک ایلس کو وہ صرف نام سے جانتا ہے۔ لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ لوگ ــ میرا مطلب ہے تنقید نگار یہ کہتے ہیں کہ وہ ان تمام مفکروں سے متاثر ہے جہاں تک میں جانتا ہوں منٹو کسی شخص کے خیال سے متاثر ہوتا ہی نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ سمجھانے والے سب چغد ہیں۔ دنیا کو سمجھانا نہیں چاہئے اسکو خود سمجھنا چاہیئے ــــ خود کو سمجھا سمجھا کر وہ ایک ایسی سمجھ بن گیا ہے جو عقل و فہم سے بالاتر ہے۔ بعض اوقات ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتا ہے کہ مجھے ہنسی آتی ہے۔ میں آپ کو پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ منٹو جس پر فحش نگاری کے سلسلے میں کئی مقدمے چل چکے ہیں، بہت طہارت پسند ہے لیکن میں یہ بھی کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ ایک ایسا پائدان ہے جو خود کو جھاڑتا پھٹکتا رہتا ہے۔



کرشن چندر

"........ مجھے اپنی چھوٹی سی زندگی میں ہندوستان کی کئی ایک عظیم الشان شخصیتوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے اور اکثر میں نے ان کو نہایت تنگ نظر، خود غرض، مکار، اور جاہ پرست پایا ہے۔ ان سے زیادہ انسانیت، رواداری اور خلوص میں نے ان لوگوں میں پایا ہے جو میرے ہمسایہ تھے یا میرے لئے مکمل اجنبی تھے ...."

میرا بچپن چونکہ کشمیر میں گزرا ہے اور زیادہ تر فطرت کی آغوش میں گذرا ہے۔ اس لیئے زندگی کی سب سے بڑی شخصیت جس نے مجھے متاثر کیا ہے وہ فطرت ہے۔ سردیوں میں برف کے گرنے سے بہاروں میں پھولوں کے کھلنے تک میں نے فطرت کی گوناگوں کیفیتوں کا قریب سے مطالعہ کیا ہے۔ اس کی وحشت اور سرکشی میں بھی میں نے ایک قسم کا نظم ایک قسم کی جمالیاتی شان دیکھی ہے جو میں نے اور کہیں نہیں پائی۔ میں سب سے زیادہ خوشی فطرت کے ساتھ رہنے میں محسوس کرتا ہوں۔ شہروں سے مانوس ہونے پر بھی میں شہر دل سے نامانوس ہوں اور بالعموم شہر سے باہر رہنے کی کوئی جگہ تلاش کر لیتا ہوں۔ جہاں کھیت اور درخت، پہاڑ اور سمندر میرے سامنے رہیں۔ میری زندگی کے علاوہ میرے ادب میں جو احساسِ جمال کسی کو ملتا ہے، اس کا منبع یہی فطرت ہے۔ واقعیت اور حقیقت نگاری کا پہلا درس بھی مجھے ایک طرح سے فطرت ہی نے دیا۔ کشمیر کی خوبصورت وادیوں اور مرغزاروں میں رہنے والوں کی تہی دستی، مجبوری، بےچارگی اور غربت کا تضاد اس قدر واضح اور شدید تھا کہ میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ایسا کیوں ہے؟ اس کے اسباب و علل پر غور کرنے کا سلسلہ جو چلا تو پھر بہت دُور تک پہنچا اور ابھی آگے کہاں جائے گا، میں یہ آج نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اتنا ضرور وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میری زندگی میں گورکی بہت بعد میں آیا۔ پہلے تو فطرت ہی آئی! اور پہلے تو صرف اُس کے حسن نے اس کے سطحی حُسن نے مجھے متاثر کیا بعد میں جب غور کرنے کی عادت جڑ پکڑنے لگی تو میں نے دیکھا کہ فطرت کے حُسن کے اندر بھی، پنکھڑیوں کی شوخ رنگی، بلبل کی نغمہ سرائی اور بھونرے کی بھنبھنک کے اندر بھی ایک مربوط منظم مقصد کارفرما ہے۔ اس سے پہلی بار مجھے یہ خیال آیا کہ اگر فطرت بے مقصد نہیں ہے تو انسان بھی بے مقصد نہیں ہو سکتا۔ اس کی زندگی، اُس کا سماج، اس کا ادب بھی بے مقصد نہیں ہو سکتے!

ظاہر ہے فطرت میں تخلیق ہے تو تخریب بھی ہے، وحشت ہے تو سکون بھی ہے۔ جہدِ مسلسل کے ساتھ مفاہمت بھی رواں دواں ہے۔ لیکن ان تمام مختلف عناصر کو نظامِ فطرت نے ایک ایسے توازن سے باندھا ہے جسے دراصل خوبصورتی سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ اسی توازن کو میں حُسن کہتا ہوں۔ اور جب میں انسانی سماج میں حُسن لانے کو کہتا ہوں تو میرے ذہن میں سطحی حُسن کے بعد جو حسن کی دوسری تصویر آئی تھی وہ اس فطری توازن کے حُسن کی تھی جسے میں انسانی زندگی میں جاری و ساری دیکھنا چاہتا ہوں۔ گویا میری زندگی کے یہ سوچنے سمجھنے، میرے ادراک اور فلسفے کے پہلے اصُول فطرت نے مرتب کئے ہیں۔

فطرت کے بعد سائنس آتی ہے۔ اسکول میں پڑھائی جانے والی ابتدائی سائنس نے آپ اسے شخصیت کہہ لیجئے یا دائرہ، مجھے بے حد متاثر کیا۔ اس کا طریقہ استدلال اور استخراج مجھے آج بھی یاد ہے جو اشیاء کو اجزاء میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اور پھر ان اجزاء کو ایک مرکب میں باندھ دیتا ہے اور اس طرح تخلیق اور تخریب کے اصولوں کو سمجھنے کی عقلی کوشش کرتا ہے۔ کسی شے کی آخری ماہیت شاید سائنس بھی معلوم نہیں کر سکتی۔ لیکن وہ اس دروازے تک تو پہنچ سکتی ہے، جسے حرفِ آخر کہنا چاہیئے اور جس کی چابی سائنس کے پاس بھی نہیں ہے۔ لیکن سائنس میں یہ تو خوبی ہے کہ وہ کسی حرفِ آخر کو آخر نہیں سمجھتی۔ مذہب کی طرح! ——— ایک ایٹم

کو توڑنے سے لاکھوں نئی دنیائیں آباد ہوتی ہیں اور برباد ہوتی ہیں اور سائنس کو اپنی تگ و دو کے لئے نیا میدان مل جاتا ہے۔ لیکن مذہب اور ہر مذہب اپنی قطعیت میں حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے اور مذہب کی یہی بات مجھے سب سے زیادہ ناپسند ہے۔ سائنس نے مجھے مذہبی ہونے سے بچا لیا اور اس حد تک بچایا کہ آج میں بھی سائنس کے کئی اصولوں اور کئی دریافتوں کو شبے کی نظر سے دیکھتا ہوں اور کہتا ہوں۔ آج تو تم کہتے ہو یہ سچ ہے۔ کل کو خدا جانے کیا سچ ہو؟

سائنس نے میرے بہت سے اوہام دُور کئے۔ ذہن کے بہت سے پُرانے جالوں کو صاف کیا اور شکوک کے کئی نئے جالے دے (ایسا بھی ہوتا ہے!) لیکن سائنس میری زندگی میں اس لئے اہم ہے کہ اس نے میری فطرت پسندی کو ایک نئی شکل دی۔ اس سے پہلے میرے ذہن میں انسانی سماج کی صعوبتوں کو دور کرنے کا اگر کوئی منصوبہ تھا تو وہ زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ انسان کو فطرت کے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ سادہ زندگی اختیار کرنی چاہئے۔ شہری چالاکی سے بچنا چاہئے۔ زیادہ مشینیں انسان کے لئے مفید نہیں ہیں یعنی ٹالسٹائی یا گاندھی! مگر بہت جلد یہ خیال دُور ہو گیا اور سائنس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوا کہ فطرت کے راز معلوم کر کے ہم انسانی سماج میں فطرت کا سا توازن لاتے ہوئے فطرت سے کہیں بہتر نظامِ زندگی مرتب کر سکتے ہیں۔ یعنی انسان اپنی عقل و دانش سے فطرت پر اضافہ کر سکتا ہے۔ سادہ زندگی کی بجائے بھرپور اور پیچیدہ زندگی اختیار کر سکتا ہے۔ شہر اس طرح وسیع اور کھلے آباد کئے جا سکتے ہیں کہ ہر گام پہ فطرت کا شبہ ہو اور یہ سب کام مشینوں کے بغیر ممکن نہیں۔

فطرت اور سائنس کے بعد میری زندگی کا تیسرا موڑ اور سب سے اہم موڑ اشتراکیت کی آمد ہے۔ وہ خیال جو روسی انقلاب کے بعد ایک دھماکے کی طرح ساری دنیا میں پھیلا اور ساری دُنیا کے نوجوان اذہان نے اس کی گونج سُنی۔ کالج کے پہلے سال ہی میں جہاں میں نے سائنس کے مضامین لئے وہاں میں نے مارکس، لینن اور اینگلز کی تعلیمات کا مطالعہ شروع کیا۔ ایک طرف وحشت پسندوں سے رابطہ قائم کیا تو دُوسری طرف سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کے علمی اور سیاسی مجلسوں میں شریک ہونے لگا۔ وطن کی آزادی میرے سامنے صرف ایک ملک کی آزادی کی شکل میں نہ آئی بلکہ اُسے میں نے ایشیا، افریقہ، جنوبی امریکہ بلکہ خود یورپ کے بیشتر حصّوں کے کروڑہا عوام کی آزادی کی تحریک کی صورت میں دیکھا، جو ایک مخصوص نظامِ زندگی کے چنگل سے نکل کر ایک بہتر دُنیا کی تعمیر کے خواب دیکھ رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی آزادی کا تصور کانگریس کے پاس نہ تھا۔ مسلم لیگ کے پاس نہ تھا۔ مہا سبھا اور اکالی دل کے پاس نہ تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ ان جماعتوں کی اہمیت سے ناواقف تھا یا ان کے پیچھے کارفرما تاریخی قوتوں کے وجود سے مُنکر تھا۔ لیکن میرے لئے ان کی دلچسپی محدود تھی۔ میں انھیں عوام کے نمائندے ان معنوں میں نہ سمجھتا تھا جن معنوں میں اکثر لوگ سمجھتے تھے۔ یعنی یہ ایسے لوگ ہوں گے، یہ ایسی جماعتیں ہوں گی جو ملکوں اور قوموں کو سامراجی نظامِ زندگی سے آزاد کرا کے ایک نئے نظامِ زندگی کی بنیاد ڈالیں گی۔

میں نے ان جماعتوں کی محدود افادیت کو سمجھ کر بھی کبھی انھیں اپنا راہنما یا راہبر نہ جانا۔ ان سے زیادہ توقع نہ رکھی۔ لیکن اگر کبھی اُن سے کوئی حسین کام ہو بھی گیا تو میں حیرت میں رہ گیا۔ آئیں! ان لوگوں سے تو اس حسنِ سلوک کی اُمید نہ تھی۔ یہ کیسے ہو گیا؟ اس بات کا مجھے ہمیشہ یقین رہا کہ ہمیں ان لوگوں کے ساتھ مل کر کام تو کرنا ہوگا اور ان کے ساتھ مل کر ہی ملک کو آزاد کرانا ہوگا۔ لیکن آزادی کے بعد بھی یہ لوگ ہمیں نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ ممکن ہے انگریزوں سے زیادہ بہتر طریقے سے زیادہ سلیقے سے کھائیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے

کہ مُرغ کو بوٹی کرکے کھائیں لیکن کھائیں گے ضرور! اس لئے میں گاندھی، جواہرلال، جناح یا گوگل والکر کی تعلیمات کو اُس روحانی تقدس کے ہالے میں نہ دیکھ سکا جس طرح اور بہت سے باشعور لوگوں نے دیکھا اور آج بھی دیکھتے ہیں۔

جس طرح کوئی خیال جزوِ ایمان بن جاتا ہے۔ اسی طرح اشتراکیت نے مجھے اس حد تک متاثر کیا کہ وہ میرے بنیادی عقائد کا مرکز بن گئی اور میرے متعلقہ حیات کا سب سے روشن پہلو۔ لیکن اس کا کیا کیجئے کہ ہر چراغ تلے اندھیرا ہوتا ہے اور ہر روشنی اپنا سایہ ساتھ لاتی ہے۔ میں آج بھی اشتراکیت کے راستے پر اپنی سُوجھ بوجھ کے مطابق چلتا ہوں، کام کرتا ہوں اور لکھتا ہوں۔ لیکن میں اس کا اندھا مقلد نہیں ہوں اشتراکیت بیسویں صدی کا مذہب ہے۔ مذہب ان معنوں میں کہ ہر مذہب تاریخ میں اپنا درسِ حیات، ایک مخصوص نظامِ زندگی، ایک مخصوص حلقہ اور فکر لے کے آتا ہے اور اُس کی ترویج اشاعت کرنے میں اور کروڑوں انسانوں کو اپنا ہم نوا بنانے میں کوشاں رہتا ہے اور تاریخ کے اُس موڑ پر انسانیت میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں میں اشتراکیت میں دیکھتا ہوں۔ مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ سرمایہ داری اپنا کام کرچکی۔ اب اگلے سو سال یا ڈیڑھ سو سال یا دو سو سال تک انسانی سماج کو لامحالہ اپنی بہتری کے لئے اشتراکیت کے راستے پر چلنا ہوگا۔ اس امر کا ایک بہت واضح تصور میرے ذہن میں موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں اشتراکیت کو انسانی ناطے اور نظامِ حیات کا حرفِ آخر سمجھنے سے قاصر ہوں۔ اس کے اندر روشنیاں ہیں تو سائے بھی ہیں۔ اک زمانہ ہوتا ہے۔ جب ہر فلسفہ شہیدوں کی تحریک ہوتا ہے۔ اشتراکیت کی تحریک آج دُنیا بھر میں شہیدوں کی تحریک سے آگے جاچکی ہے۔ آج دنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی سوشلزم میں اپنی راہِ نجات دیکھتی ہے۔ اور یہ تعداد بڑھتی ہی جائے گی۔ اب اشتراکیت کی تحریک اُس منزل اور اُس موڑ پر آگئی ہے کہ خود اس کی بہبودی کے لئے سختی سے اُس کا محاسبہ کیا جائے اور جدید سائنسی انکشافات کی روشنی میں اور ماضی کے تجربوں کی بنا پر اس پر کڑی سے کڑی تعمیری تنقید کی جائے۔ ورنہ اس بات کا ہمیشہ اندیشہ رہتا ہے کہ جب کوئی تحریک اس حد تک پھیل جائے تو اس میں مذہبیت کے عناصر شامل ہوجاتے ہیں۔ وہ عناصر جو اُس کے بُت بناتے ہیں اور خدا، اس کا مقدس کلام، رسوم اور روائتیں، پجاری اور پیروکار اور اس طرح سے اس کے ارتقا کی رفتار کو کم کرتے ہیں۔ اس خطرے سے بچنا ہوگا۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اشتراکیت مستحکم ہونے پر اگر اس کے روایت پسند خوشامدیوں کی تعداد بڑھے گی تو اس کے اپنے ہی بطن سے اس کے زیادہ زیادہ نقاد بھی پیدا ہوں گے۔ اس کی صورت بدلے گی اور وہ بدلتی ہوئی صورت اشتراکیت کے موجودہ اور مروّجہ سماجی اداروں کو بھی بدلے گی۔ پھر یہ اشتراکیت اپنی باطنی کیفیت میں بھی بالکل ہی بدل جائے گی اور اس کے بطن سے ایک نیا شگوفہ پھوٹے گا اور انسانی سماج کی ترقی کے لئے ایک نیا فلسفہ وجود میں آئے گا۔ یوں تو ہوگا ہی۔ اور اسے کوئی روک نہ سکے گا۔ خود اشتراکیت بھی اسے روک نہ سکے گی!

بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں جو بظاہر بے حد معمولی معلوم ہوتی ہیں۔ میں نے اپنے والد سے سیکھی ہیں۔ یعنی طے شدہ امور کو غیر طے شدہ سمجھنا۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوبصورتیوں سے حظ اُٹھانا، اپنے مخالفوں کی عزّت کرنا اور ان کی باتوں کو انتہائی غور سے سُننا، بڑے آدمیوں پر اعتبار نہ کرنا اور عام لوگوں سے میل جول رکھنا اور ان پر زیادہ بھروسہ کرنا۔ میرے والد کو ایک ذہین اور قابل ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے راجاؤں مہاراجاؤں سے واسطہ پڑتا تھا۔ لیکن وہ ان کی صحبت پر ہمیشہ معمولی آدمیوں کے ساتھ

کو نوچ دیتے تھے اور ان کے ملازم ہوتے ہوئے بھی اپنی نجی گفتگو میں اُن سے شدید نفرت کا اظہار کیا کرتے تھے اور اپنی فرصت کے اوقات باغ کے مالی سے، راہ چلتے ہوئے کسی نادار راہ گیر سے، یا کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کسانوں سے گفتگو کرنے میں صرف کیا کرتے تھے۔ مجھے بھی اپنی چھوٹی سی زندگی میں ہندوستان کی کئی ایک عظیم الشان شخصیتوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ اور اکثر میں نے ان کو نہایت تنگ نظر، خود غرض، مکّار اور جاہ پرست پایا ہے۔ ان سے زیادہ انسانیت رواداری اور خلوص میں نے ان لوگوں میں پایا ہے جو میرے ہمسائے تھے، یا میرے لئے مکمل اجنبی تھے۔ لیکن جو معمولی حیثیت کے لوگ تھے۔ اُن معمولی ہیں کہ اُن کا آج بھی کہیں کوئی نام نہیں ہے۔ اور وہ کسی قوم یا بین الاقوامی حیثیت کے مالک نہیں ہیں لیکن جو دراصل قوم ہیں اور واقعی جن کے روزمرّہ کے کام سے اور شرافت سے انسانیت کو بقا حاصل ہے۔ میرے والد بالکل ایک عام آدمی کی سی زندگی بسر کرنے کے قائل تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے: "انسان کو انسان کی طرح رہنا چاہیے فرشتے کی طرح نہیں، اس لئے تھوڑا سا گناہ کر لو، تھوڑی سی غلط کاری بھی بُری نہیں، تھوڑی سی بے راہ روی بھی جائز ہے" بظاہر یہ بات کس قدر غلط معلوم ہوتی ہے لیکن زندگی کے تجربوں نے اس کی صداقت بھی عیاں کر دی۔

پہلی ادبی کتاب جو میں نے پڑھی وہ الف لیلہ کا اُردو ترجمہ تھا۔ یہ تیسری جماعت کا قصہ ہے۔ والد ادبی کتابیں پڑھنے سے منع نہیں کرتے تھے لیکن والدہ کو سخت اعتراض تھا۔ الف لیلہ کے بعد میں نے سُدرشن کی کہانیاں پڑھیں، پھر پریم چند کی کہانیاں۔ میٹرک تک میں نے بہت سا اردو ادب کھنگال ڈالا۔ میٹرک میں ٹیگور انگریزی میں پڑھا۔ اس کا اثر بہت دیر تک دل و دماغ پر رہا۔ انقلابِ روس سے پہلے کے بڑے بڑے روسی ادیبوں نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ پشکن، گوگول، میری موئٹوف، آندریف، ترگنیف، چیخوف، ٹالسٹائی، استرادسکی، گورکی تک روسی ادب اتنا اچھا اور عمدہ ہے کہ دوسری زبان کے ادب میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ پرانے ادیبوں میں جن لوگوں کو بار بار پڑھ سکتا ہوں اور پڑھتا ہوں، وہ شیکسپیئر اور غالب ہیں۔ غالب کے متعلق میرا یہ خیال ہے کہ نہ صرف اُردو نے بلکہ ہندوستان کی کسی دوسری زبان نے بھی ۱۸۵۷ء کے بعد اتنا بڑا شاعر نہیں پیدا کیا۔ لیکن یورپ کا مزاج اُسے کبھی پسند نہیں کر سکتا۔ موجودہ یورپی ناول نگاروں میں شولوف، ارنسٹ ہمنگ وے اور ہاورڈ فاسٹ بہت پسند ہیں۔ اجنتا کی بھی تعریف کرتا ہوں لیکن گذشتہ چار سو سال میں یورپی مصوّری نے جو سرمایہ انسانی کلچر کو دیا ہے وہ اس قدر عظیم ہے کہ اس سے متاثر نہ ہونا گناہِ کبیرہ معلوم ہوتا ہے۔ ہاں کھجوراؤ اور ایلورا کے بُت کلاسیکی یونانی، اطالوی نشاۃ الثانیہ اور ماڈرن لور یا سنگ تراشوں اور صنم گروں کی تخلیقات کے ہم پلہ ہیں اور کہیں اُن سے بڑھ بھی جاتے ہیں۔ بالعموم نثر میں یورپ کے نثر نگاروں کے کہنے کے ڈھنگ سے متاثر ہوں اور شاعری میں مشرقی شاعروں کی ادا کا قتیل ہوں اور قتیل تو جانے کس کس کا ہوں کیونکہ ہر نیا روز ایک نیا سورج لے کر آتا ہے۔



عصمت چغتائی

"...... مجھے روتی بسورتی حرام کے بچے جنتی ، ماتم کرتی نسوانیت سے ہمیشہ سے نفرت تھی۔ خواہ مخواہ کی وفا اور وہ جملہ خوبیاں جو مشرقی عورت کا زیور سمجھی جاتی ہیں مجھے لعنت معلوم ہوتی ہیں۔ جذباتیت سے مجھے سخت کوفت ہوتی ہے۔ عشق قطعی وہ آگ نہیں جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے ...."

ددھیال والوں کا خیال تھا کہ میں پورم پور اپنی ننھیال والوں پر گئی ہوں۔ گوڑے سے بیچ پتلی دال کھانے والے۔ مگر ننھیال والوں کو یقین تھا کہ میں سو فیصدی ددھیال والوں پر پڑی ہوں۔ ہوبہو اپنی پھوپی جیسا تیہا اور گز بھر کی زبان۔ چنگیز خاں کی اولاد سے اور کیا اُمید کی جا سکتی ہے۔

لیکن اگر کوئی اماں سے پوچھتا کہ بیٹی کو کیا ہو گیا تو وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتیں "نہ ددھیال کا قصور نہ ننھیال' یہ سب نصیب کا پھیر ہے"۔

ایسی صورت میں کس کا نام لے دوں۔ ذرہ بیج جس سے میری ہستی وجود میں آئی بلکل ٹیڑھا سیڑھا نہ تھا۔ ضرور بانے بونے میں کہیں بھول چوک ہو گی۔

مگر مجھے بذات خود اس ماحول سے کوئی شکایت نہیں جہاں میری تراش خراش ہوئی۔ کچھ بیچ بچوں کے جم غفیر میں ایک پا پیادہ سپاہی کی طرح تربیت پائی۔ نہ لاڈ ہوئے نہ نخرے، نہ کبھی تعویذ گنڈے بندھے نہ نظر اتاری گئی۔ نہ خود کو کبھی کسی کی زندگی کا اہم حصہ محسوس کیا۔

بہنیں چونکہ بڑی نکل گئیں اس لئے بھائیوں کی صف میں جگہ ملی۔ کھیل کود کا زمانہ انھیں کے ساتھ گلی ڈنڈا، فٹ بال اور ہاکی کھیل کر گزرا۔ پڑھائی بھی ان کے ساتھ ہی ہوئی۔ سچ پوچھئے تو اصل مجرم میرے بھائی ہی تھے۔ جن کی صحبت نے مجھے ان ہی کی طرح آزادی سے سوچنے پر مجبور کیا۔ وہ شرم و حیا جو عام طور پر درمیانہ طبقہ کی لڑکیوں میں لازمی صفت سمجھی جاتی ہے۔ پنپ نہ سکی چھوٹی ہی عمر سے دوپٹہ اوڑھنا، جھک کر سلام کرنا، شادی بیاہ کے ذکر پر شرمانے کی عادت بھائیوں نے چھیڑ چھاڑ کر پڑنے ہی نہ دی سوائے عظیم بھائی کے سب ہی گھر میں چاق و چوبند تھے۔ کنبہ کا کنبہ حد درجہ بامذاق اور باتونی، آپس میں چخیں چلتیں نئے نئے خطے تراشے جاتے، ایک دوسرے کی دھجیاں اڑائی جاتیں، بچے بچے کی زبان پر سان رکھ جاتی۔

ابا پنشن لے کر آگرہ کے مردنی گھر میں رہنے لگے۔ کھلی ہوا میں اُڑنے کے بعد ایک دم سے نہایت بوسیدہ ماحول کی گھٹن سے واسطہ پڑا۔ کہاں فٹ بال اور گلی ڈنڈا اور کہاں آگرہ محلہ پنجۂ شاہی کی بوسیدہ گلیاں اور اُن گھٹی ہوئی گلیوں میں پلنے والی جھجکی جھجکی نیم مدقوق لڑکیاں جو اپنے دل کی دھڑکن سے سہم جائیں۔ میری ان لڑکیوں سے بالکل نہ بنی اور اُن بڑھیوں . . . سے ٹھن گئی جو مجھے چھجوں پر قلانچیں بھرتا دیکھ کر ہیبت زدہ ہو جاتیں۔

"نوج بوا، پھوکی لونڈیا ہے کہ موا سجار توبہ توبہ۔"

اور میری اماں جان نصرت خانم جنھیں لوگ پیار میں نچھو کہتے تھے شرم کے مارے پانی پانی ہو جاتیں۔

اور آگرہ کی اُن مُردہ گلیوں پہلی بار مجھے اپنے لڑکی ہونے کا صدمہ ہوا۔ عورت خُدا نے کیوں پیدا کی۔ مری پٹی مجبور و محکوم ہستی کی کیا ضرورت، دھوبن روز رات کو پٹتی تھی۔ مہترانی کے آئے دن جوتے پڑا کرتے تھے۔ پاس پڑوس کی تمام ہی عورتیں آئے

دن اپنے شوہروں کے جوتے کھایا کرتی تھیں اور میں خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگتی۔ "اے اللہ پاک مجھے لڑکا بنا دے کہ میں بھی چھت پر پتنگ اڑانے پر نہ چوکوں۔ گلیوں میں کبڈی کھیل سکوں اور آزادی سے بندروں کے پیچھے بھاگتی پھروں۔ مگر آگرہ میں گندی گلیاں ہی نہ تھیں ان گلیوں میں سارے دور اور قریب کے رشتہ دار بھی رہتے تھے جن سے اماں لڑا کرتیں۔ جب تک دوسرے شہروں میں رہے آزاد رہے اپنے کنبہ میں آکر تو جیسے بیڑیاں پڑ گئیں۔

مگر مجھے آگرہ کی ان شرمیلی دبی دبائی لڑکیوں سے مجبوراً بہناپا جوڑنا پڑا۔ اور مجھے معلوم ہوا کہ یہ ظاہر میں بھولی نظر آنے والی لڑکیاں بڑی چلتی پرزہ ہیں۔ چھپ کر وہ گل کھلائے جاتے ہیں کہ الٰہی توبہ۔ بڑھیوں کو چینکیوں میں الو بنا کر گلی کے لونڈوں سے خوب خوب پینگیں بڑھی ہیں۔ مجھے اس دوغلی زندگی سے بڑی کراہت آئی۔

آگرہ کی مکروہ فضا سے جلد ہی پیچھا چھوٹ گیا اور ہم لوگ علی گڑھ منتقل ہو گئے۔ اماں کو بھی کچھ خاندان والوں سے وحشت ہوتی تھی۔ علی گڑھ کی کھلی ہوا میں پھر ہماری پرانی زندگی لوٹ آئی .... وہی پھوس کے بنگلے ڈگی کا کنارہ اور ہرے بھرے کھیت اور ان کھیتوں میں ککڑیاں کھیرے چرانا، پیڑوں پر چڑھنا اور پھر مجھے اپنے لڑکی ہونے کا غم نہ رہا۔ بلکہ لڑکی ہونے کے کچھ فائدے نظر آنے لگے۔ مثلاً ابا کا حکم تھا کہ لڑکیوں کی چوٹی نہ کھینچی جائے نہ اُن کی بالیوں میں انگلی ڈال کر جھٹکے دیئے جائیں۔ لڑکیاں اگر ماریں تو سرکار سے شکایت کی جائے۔ مناسب سزا دی جائے گی۔ لڑکیاں کہاں بس خاکسار ہی ایک لڑکی تھی جس کی شکایتیں ابا حضور کے دربار میں آئے دن پیش کی جاتیں مگر بھائی اتنے بدنام ہو چکے تھے کہ عموماً سزا نہیں ملتی الٹے ڈانٹ دیئے جاتے۔

علی گڑھ آکر عظیم بھائی کے وجود کا احساس دن بدن بڑھنے لگا۔ خدا جانے انھیں مجھ سے کیوں ایک دم دلچسپی پیدا ہو گئی مجھے تو بڑے بھائی نسیم ہمیشہ سے اچھے لگتے تھے۔ اُن سے مار کھانے میں بھی مزا آتا تھا، کیونکہ وہ پیسے اور مٹھائیاں بھی تو دیتے تھے۔ عظیم بھائی نہ پیسے دیتے نہ چپتیں مارتے تھے۔ بڑی سنجیدگی سے بات کرتے۔

اور پھر انھوں نے مجھے تاریخ اور انگریزی پڑھانا شروع کی۔ یہ یاد نہیں رہا کہ ابتدا کیسے ہوئی۔ مگر اتنا یاد ہے کہ شام کو جب وہ کام سے تھکے ہارے آتے تھے تو اپنے برآمدے میں پلنگ پر لیٹ جاتے تھے اور مجھ سے کہتے زور زور سے پڑھو۔ پھر ترجمہ درست کرتے املا لکھواتے اس کے بعد باتیں کیا کرتے۔ یاد نہیں کیا باتیں تھیں جن سے ابتدا ہوئی۔ بعد میں تو حدیث و قرآن کے بارے میں بتایا کرتے تھے ان کا پڑھانے کا طریقہ عجیب تھا۔ کوئی ناول دیتے کہ اس کا ترجمہ کر ڈالو۔ انگریزی سے اردو میں اور اردو سے انگریزی میں دس دس صفحے ترجمہ کروا ڈالتے۔ ناولوں کا ترجمہ کرنے میں کئی فائدے ہوتے تھے۔ ایک تو یہ کہ پوری ناول کا ترجمہ کرنے سے پہلے ناول ختم کرنا پڑتی تھی اور اسی زمانے سے مجھے شدت سے ناولیں پڑھنے کا چکر پڑ گیا۔ ساری ساری رات ناولیں پڑھیں خاک پتے نہیں پڑا۔ لہٰذا پھر پڑھنا پڑیں۔ ہارڈی وہ پہلا ناولسٹ تھا جسے میں نے بقول عظیم بھائی گھول کر پی لیا۔

اس زمانہ میں عظیم بھائی نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں بالکل ان کی آوازِ بازگشت بن گئی۔

"منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔" جب میں بولتی تو سب چڑاتے کہ یہ میں نہیں عظیم بھائی بول رہے ہیں، اور عظیم بھائی نے میری ناسمجھی سے فائدہ اٹھایا۔ وہ بات جو وہ خود نہ کہہ پاتے۔ بڑی ہشیاری سے میرے کان میں ڈال دیتے اور میں پھٹ سے

کہہ دیں۔ اس دور میں بقول خاندان والوں کے انھوں نے مجھے خوب بگاڑا۔ میری طبیعت جو پہلے ہی خودسر اور ضدی تھی ان کی شہ پا کر اور بھی قابو سے باہر ہو گئی۔

وہ ان دنوں قانون پڑھ رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ایک کارخانہ میں نوکری بھی کرتے تھے، مضمون بھی لکھا کرتے تھے اس قدر محنت کرنے کے بعد وہ رات کو مجھے کئی گھنٹے پڑھایا کرتے۔ کبھی انھیں حرارت ہو جاتی، کبھی سینے میں درد ہوتا، ہاتھ پیر اینٹھتے۔ ان کی بیوی بیٹی ان کی چھاتی سینکا کرتیں۔ اور وہ مجھے پڑھایا کرتے۔ انھوں نے کبھی مجھ سے سر یا پیر دبانے کو نہیں کہا اور میں نے بھی کبھی ان کا کوئی کام کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بڑے بھائی جو تھے۔ اس لئے مجھے پڑھانا تو ان کا فرض تھا۔ ایک دفعہ ان کو بڑی شدت کا کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ دو گھنٹے ہو گئے اور چند صفحوں کا ترجمہ ختم نہ ہو پایا۔ مجھے جھلاہٹ آنے لگی۔

"ہم نہیں پڑھتے آپ سے، آپ اتنا تو کھانستے ہیں۔" میں نے جل کر کہا۔

"بیوقوف کہیں کی، کیا ہم جان بوجھ کر کھانس رہے ہیں۔" انھوں نے ہنس کر کہا اور وعدہ کیا کہ اب نہیں کھانسیں گے۔

پتہ نہیں انھیں میرے مستقبل سے کیوں دلچسپی ہو گئی تھی۔ میٹرک کرنے پر تو اس قدر خوش ہوئے کہ اپنے بیٹے کے پیدا ہونے پر بھی نہ ہوئے ہوں گے۔ چھٹیوں میں انھوں نے مجھے اپنے گھر بلا لیا، چونکہ اب وہ جودھپور میں وکالت کرنے لگے تھے۔ ان دنوں انھوں نے مجھے قرآن کا ترجمہ اور حدیث پڑھنے میں مدد دی۔

اور شاید کیا بلکہ قطعی میں نے ان کے افسانے پڑھ پڑھ کر خود بھی چھپا کر لکھنا شروع کر دیا۔ حجاب اسمٰعیل، مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتح پوری کے افسانے پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا گویا یہ سب کچھ میرے ہی اوپر بیت رہی ہے؛ اور پھر میں نے خود کو افسانہ کی ہیروئن تصور کر کے نہایت چٹ پٹے قسم کے واقعات لکھنا شروع کئے۔

مثلاً میں بہت خوبصورت ہوں، بالکل حجاب اسمٰعیل کی ہیروئن کی طرح سنہری بال نیلی آنکھیں ... قرمزی رنگ کا لبادہ اوڑھے نیم دیوانہ ہوں، ہیرو آتا ہے .... میرا پہلا ہیرو ہمیشہ ڈاکٹر ہوتا تھا، شاید اس لئے کہ اس زمانہ میں ڈاکٹر ہی ایسا غیر مرد ہوتا تھا جو گھر میں آکر نبض ٹٹول سکتا تھا۔ یہ ڈاکٹر لازمی طور پر بہت حسین ہوتا تھا۔ رات بھر میرے سرہانے بیٹھا رہتا۔ میری حالت خراب ہونے پر زار زار روتا اور بے تابانہ مجھے چومتا اور میری حسین موت پر دھاڑیں مار کر روتا اور عموماً خودکشی کر لیتا۔ کیا مزے دار ہوا کرتی تھیں یہ کہانیاں۔ انھیں لکھنے میں اتنا ہی لطف آتا تھا جیسا چٹ پٹی کہانیاں پڑھنے میں آتا ہے جیسے رومانی ناولوں میں جب ہیرو ہیروئن کے لبوں کا بوسہ لیتا ہے تو پڑھنے والے کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ یہی حال لکھنے میں بھی ہوتا ہے۔ عموماً ایسی کہانیاں لکھ کر میں فوراً پھاڑ ڈالا کرتی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا وہ "گندی" ہیں اور اگر کسی نے پڑھ لیں تو وہ جوتا کاری ہوگی کہ بس۔

مگر نہ جانے کیوں پھر لکھ کر دوبارہ تبارہ پڑھنے میں لطف آتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے میں نے نہیں کسی اور نے لکھی ہیں۔ اور واقعی وہ میری تصنیف نہ تھی اور نہ میرا اپنا بچہ تھیں بلکہ وہ ان کہانیوں کا نچوڑ تھیں، جو مجھے بھا چکی تھیں۔

ایسی کہانیوں کا میرے سرہانے انبار جمع ہو گیا اور وہی ہوا جس کا مجھے خوف تھا۔

ایک دن شمیم جو عمر میں مجھ سے سال ڈیڑھ سال بڑے ہیں، میرے پلنگ پر لیٹ گئے۔ سرہانے کاغذ سرسرائے تو

نکالکر پڑھنے لگے " آہا ..... مُجتنی نے کیا گندی گندی باتیں لکھی ہیں' توبہ توبہ"

شمیم صور نے زور زور سے پڑھنا شروع کیا .....

"ڈاکٹر جمیل نے اپنا سفید براق ہاتھ میرے سینے پر رکھا اور میرے گلابی ہونٹ . . . . '

میں پاس ہی غسل خانے میں نہا رہی تھی' سر میں بیسن ڈال چکی تھی' اُوہ بیان نہیں کر سکتی کہ کیا حالت ہوئی . . . یا خدا اگر ایک سطر اور آگے پڑھ لی تو پھر ڈوب مرنے کے سوا کہیں ٹھکانا نہ رہے گا۔

ہیبت زدہ ہو کر میں نے غسل خانہ ہی سے وہ زور زور کی چیخیں ماریں کہ سارا گھر ہل گیا۔ لوگ سمجھے شاید موری سے سانپ نکل آیا اور مجھے ڈس لیا۔ شمیم بیچارہ کا غذ پھینک پھانک میری جان کی خیر منانے لگا۔ میں نے اُلٹے سیدھے کپڑے پہنے اور باہر نکل کر شمیم کا منہ نوچ ڈالا۔ وہ بے چارا ہونق منہ پھاڑ کر رہ گیا۔ آگے اُسے پڑھنے کا ہوش ہی نہیں رہا۔ وہ خود میری زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ میں نے اسی وقت سارا پلندہ جلا کر خاک کر دیا۔ شمیم نے بہت کہنے کی کوشش کی کہ میں نے نہایت گندی کہانیاں لکھی تھیں مگر میں نے جھٹلا دیا کہ ٹرانسلیشن تھا۔ وہ بیچارہ پرلے درجہ کا جھوٹا مشہور تھا۔ اس لئے کسی نے بھی نوٹس نہ لیا۔

اب اس خیال سے کوفت ہوتی ہے کہ اگر بجائے شمیم کے کوئی دوسرا بھائی پڑھ لیتا تو واقعی قیامت آجاتی بس اس دن سے میں نے توبہ کی کہ اول تو ایسی بیہودہ کہانیاں لکھوں گی ہی نہیں جو اگر لکھیں بھی تو فوراً پھاڑ ڈالوں گی۔ حالانکہ اب اگر غور کرتی ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ ان کہانیوں میں تو کچھ بھی نہیں تھا سوائے اوپری چوما چاٹی کے جو مجھے نہایت پھُس پھُسی لگنے لگی تھی۔

پھر کئی سال کچھ نہیں لکھا۔ بی۔ اے کے بعد دُنیا ہی بدل جاتی ہے۔ چار سال میں انسان کتنا بڑا ہو جاتا ہے۔ میٹرک کے بعد چار سال بے کورس کی کتابیں مجبوراً پڑھیں۔ یونانی ڈرامہ پشین پلے اور شیکسپیئر سے لے کر ابسن اور برنارڈ شا تک بہت کچھ پڑھ ڈالا۔ برنارڈ شا نے میرا دل مٹھی میں لے لیا۔ میں نے اپنا پہلا مضمون یا ڈرامہ "فسادی" برنارڈ شا سے حد درجہ متاثر ہو کر لکھا مواد میں نے اپنے اردگرد سے لیا۔ اور اینٹ گارا برنارڈ شا سے سیکھا۔ بی۔ اے کلاس میں میری ہم جماعت عذرا حیدر مجھے برنارڈ شا کہہ کر خوب چڑایا کرتی۔ اس لئے میں نے فوراً برنارڈ شا کے شکنجہ سے نکل کر کہانیاں لکھنا شروع کیں۔

اور زندگی کے اس دور میں مجھے ایک طوفانی ہستی سے ملنے کا موقع ملا جس کے وجود نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ روشن آنکھوں اور مسکراتے شگفتہ چہرے والی رشیدہ آپا سے کون ایسا تھا کہ ایک دفعہ مل کر بھلا نہ جائے۔

پہلی دفعہ میں نے انھیں نہ جانے کون سے جلسے میں دیکھا تھا۔ بیگم بھوپال صدارت کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کڑکڑاتے جاڑے میں بیویاں موٹے موٹے دو شالے اور کوٹ ڈاٹے پنڈال کے اندر سوں سوں کر رہی تھیں اور رشیدہ آپا بغیر آستین کا بلاؤز پہنے دھواں دھار کچھ کہہ رہی تھیں۔ ان کے سیاہ بھونرا اور گھنگھریلے بال ہوا میں اُڑ رہے تھے کیونکہ تقریر شروع کرنے سے پہلے انہوں نے سامنے کی کھڑکی کھول دی تھی۔ بیویاں بڑبڑا رہی تھیں' اُن کے کٹے ہوئے بالوں پر بغیر آستین کی بلاؤز پر اور کھلی ہوئی کھڑکی میں سے آتی ہوئی برفیلی ہوا پر۔ مگر اُن کی تقریر بھی شاید کچھ کم خاردار نہیں تھی۔ کیونکہ تقریر کے بعد انھیں بیگم بھوپال نے خوب ڈانٹا۔ اس دن ان کی بے حیائی اور بیباکی کا نہلکہ مچ گیا تھا اور میں نے بے سمجھے بوجھے اُن کے ہر لفظ کو موتی سمجھ کر چن لیا تھا

۳۸ء میں رشیدہ آپا انگارے والی رشیدہ آپا بن چکی تھیں۔ اب ان کی سلگتی ہوئی باتیں پلّے بھی پڑنے لگی تھیں۔

اور پھر وہ میرا حسین ڈاکٹر ہیرو، شمعی انگلیاں، نارنگی کے شگوفے اور قرمزی لبادے چھو ہو گئے۔ مٹی سے بنی ہوئی رشیدہ آپا نے سنگِ مرمر کے سارے بُت منہدم کر دیے۔

زندگی ننگی چٹی سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اُن سے گھنٹوں باتیں کر کے بھی جی سیر نہ ہوتا تھا۔ جی چاہتا انھیں کھا جاؤں، پی جاؤں۔ جو رشیدہ آپا سے مل چکے ہیں، انھیں اچھی طرح جانتے ہیں، اگر وہ میری کہانیوں کی ہیروئن سے ملیں تو دونوں جڑواں بہنیں نظر آئیں۔ کیونکہ انجانے طور پر میں نے رشیدہ آپا ہی کو تمام افسانوں کے سانچے میں بٹھا دیا کہ میرے تصور کی دنیا کی ہیروئن صرف وہی ہو سکتی تھیں مگر جب غور سے اپنی کہانیوں کے بارے میں سوچتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میں نے صرف ان کی بے باکی اور صاف گوئی کو گرفت میں لیا۔ ان کی بھرپور سیمابی شخصیت میرے قابو میں نہ آئی۔ مجھے روتی بسورتی حرام کے بچے جنتی ماتم کرتی نسوانیت سے ہمیشہ سے نفرت تھی۔ خواہ مخواہ کی وفا اور وہ جملہ خوبیاں جو مشرقی عورت کا زیور سمجھی جاتی ہیں مجھے لعنت معلوم ہوتی ہیں۔ جذباتیت سے مجھے سخت کوفت ہوتی ہے۔ عشق قطعی وہ آگ نہیں جو لگائے نہ لگے اور بُجھائے نہ بنے۔ عشق میں محبوب کی جان کو لاگو ہو جانا، خودکشی کرنا، واویلا کرنا میرے مذہب میں جائز نہیں۔ عشق تقویتِ دل و دماغ ہے نہ کہ جی کا روگ۔

یہ سب میں نے رشیدہ آپا سے سیکھا اور مجھے یقین ہو گیا کہ رشیدہ آپا جیسی لڑکی سو لڑکیوں پر بھاری پڑ سکتی ہے۔

ملک کی تقسیم کے بعد سوائے فسادات کے اور کچھ ذہن میں باقی نہ رہا۔ ملک بکھرا، دنیا بکھری اور اس کے ساتھ کتنی ہی حسین و نازک قدریں چور چور ہو گئیں۔ مقصدی ادب کے نعرے نے اور زیادہ گڑبڑا دیا۔ کیوں لکھیں اور کیا لکھیں؟ کے چکر میں پڑ کر اور بھی راستہ گم ہو گیا۔

انجمن ترقی پسند مصنفین نے بہت کچھ دیا اور بہت کچھ مٹا دیا۔ کتنے نئے ساتھی ملے، اور پُرانے بچھڑ گئے اور پھر،

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

انجمن سے پرچھے اٹھ گئے۔ بمبئی گروپ جس کی طرف لوگوں کی نظریں اٹھا کرتی تھیں، فلموں میں غرق ہو گیا۔ ظاہر ہے صرف رسالوں کے لیے لکھ کر روزی نہیں کمائی جا سکتی۔ نہ ناولوں اور افسانوں کے مجموعوں سے۔ بمبئی کا خرچہ چل سکتا ہے۔ فلم ہی ایک ایسی لائن ہے جہاں اگر ہاتھ لگ جائے تو قلم چلا کر روٹی کا سہارا ہو سکتا ہے۔

فلموں کے لیے لکھتے وقت معلوم ہوا کہ یہاں نہ بے باکی کی دھونس چلتی ہے نہ صاف گوئی کام آتی ہے۔ یہاں تو وہ چیز چاہیے جو چھپر پھاڑ کر دولت لائے۔ یہاں ایک خاص بندھی ہوئی لکیر کے مطابق چلنا ہوگا۔ لہٰذا چلنے والے چلے اور ناک کے بل چلے۔

فسادات کے بارے میں تجربہ سنی سنائی سے آگے نہ بڑھ پایا۔ "دھانی بانکیں" اور جڑیں سے زیادہ نہ محسوس کر پائی اور نہ لکھ پائی۔ مگر ان دو مضامین کو لکھتے وقت میرے دل نے بڑے زور سے قلابازی لگائی۔ اس وقت تک میں نے جتنی کہانیاں لکھی تھیں۔ ان میں ماں باپ یا تو تھے ہی نہیں اگر تھے تو نہایت فضول سی شے۔ انھیں نظر انداز کر کے ہی میری دانست میں اُن پر فتح پائی جا سکتی ہے۔ والدین سڑک کا روڑا ہی تو ہیں جو اولاد کے راستہ میں رکاوٹوں کے سوا کچھ نہیں پیدا کرتے۔" یہ نظریہ، وہ نظریہ اب تک میرے دماغ میں بسا ہوا تھا لیکن یہ دو مضمون لکھتے وقت میں نے اپنی ماں کو دیکھا۔

سب انھیں اکیلا چھوڑ کر پاکستان جا چکے تھے۔ میں ان سے ملنے جودھ پور گئی۔ اماں ہمارے ذاتی مکان کے سامنے ایک مختصر سے کمرے میں منتقل ہو گئی تھیں۔ ہمارا اپنا وسیع مکان رفیوجیوں کے قبضہ میں تھا۔

میں پہنچی تو دھنڈار اجڑے ہوئے کمرے میں میری اماں بیٹھی تھیں۔ اماں کو ہم لوگوں کو چومنے چاٹنے کی کبھی فرصت نہ ملی۔ مجھے نہیں یاد اس سے پہلے کبھی انہوں نے محبت کا اظہار کیا ہو۔ مگر اس وقت مجھے دیکھ کر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ بچپنے کے زمانے میں ماسہار میں نے دیکھا وہ خاموش کھڑکی سے اپنے گھر کو تک رہی ہیں۔ جہاں بھرے پرے خاندان کے ساتھ ہم سب ہنسی خوشی رہتے تھے۔ بچے قلانچیں بھرتے تھے، لڑائیاں ہوتی تھیں، ملاپ ہوتے تھے۔

میں نے ان کی عمر کی طرف دیکھا اس اکیلے پن کو دیکھا۔ موٹے تازے دس بچے پیدا کر کے بھی وہ اکیلی تھیں۔

میرے دل میں پیار کا طوفان ابل آیا۔ ممتا جاگ اٹھی۔ میں نے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ پھر اپنی بچی کی طرف دیکھا اور ان دو ہستیوں کے بیچ میں خود کو جکڑا ہوا پایا۔ اپنی ماں کو دیکھ کر مجھے پہلی دفعہ ساری دنیا کی بڑھیوں پہ پیار آنے لگا، جو دنیا کو بساتی ہیں۔ مر مر کر جنم دیتی ہیں۔ انھیں پالتی پوستی ہیں، جو کچھ ان پر بیتا اور کرتی ہیں نہ ان سے اسٹامپ لکھاتی ہیں نہ بچے کاغذ پر رسید۔ اب اگر اولاد ان کے بڑھاپے کا خیال کر لے تو فرمانبردار ہے جو اپنے بال بچوں کے خرچہ سے کچھ نہ بچے تو مجبور ہے۔ پرانے زمانے میں بڑے بوڑھوں کو لوگ بیکار جنس سمجھ کر زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ یہ سنسان بڑھاپا کس قدر مہیب شے ہے۔

اور یہ بھی اتفاق ہی تھا جو میری اپنی اماں سے ملاقات ہو گئی اور کچھ سوتے ہوئے تار جاگ اٹھے۔ ابھی کتنے تار ہیں جو مردہ خاموش سوئے پڑے ہیں۔ کون جانے کون سے نئے مضراب اور پیدا ہوں گے جن کی چوٹ سے بہت سی نیندیں ٹوٹیں گی۔ ٹھہرے ہوئے پانی پر کائی جم جاتی ہے، ایک ننھا سا کنکر سطح پر گرتا ہے۔۔۔ کائی چھٹ جاتی ہے۔۔۔۔ جگمگاتی دنیا کا عکس پانی کی سطح پر لو دینے لگتا ہے۔ انسان ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔



خواجہ احمد عباس

"...... میں اپنے خون کے رشتے داروں ہی کی اولاد نہیں ہوں۔ میں اپنے ملک اور قوم کی اولاد بھی ہوں۔ گاندھی اور نہرو کے خاندان میں سے ہوں اور انسانیت اور سوشلزم کے ناطے سے میرے رشتے دار ساری دنیا میں ــــ روس میں اور امریکہ، انگلستان میں اور چین میں ــــ پھیلے ہوئے ہیں اور جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے وہ مجھ پر اثر انداز ہوتا ہے ــــ ...."

میرے بچپن میں سب سے پہلی اور سب سے اہم شخصیت جس نے مجھے متاثر کیا وہ میرے نانا خواجہ سجاد حسین مرحوم تھے۔ وہ ہمارے خاندان ہی میں نہیں ہمارے قصبے میں سب سے نمایاں ہستی تھے۔ میرے بچپن کی اولین یادیں ان کی شخصیت سے وابستہ ہیں۔ گیارہ برس ہوئے لگ بھگ اسی برس کی عمر میں انہوں نے وفات پائی لیکن بچپن ہی سے ہم سب بھائی بہن ان کو بہت بوڑھا سمجھتے تھے۔ حالانکہ اس وقت ان کی عمر پچاس پچپن ہی کی تھی اور ان کی خشخشی داڑھی بھی پوری طرح سے سفید نہیں ہوئی تھی اور ان کے گورے چہرے پر جھریوں کا بھی کوئی نشان نہ تھا لیکن پھر بھی ہمارے ذہن میں ان کی شخصیت الف لیلہ کے کسی دراز ریش بزرگ کی سی تھی جو اپنی عقل اور دور اندیشی سے انسانی زندگی کے الجھے ہوئے مسئلوں کو سلجھاتا ہے اور خواجہ خضر کی طرح ظلمات کے اندھیرے میں سندباد جہازی کو راستہ بتاتا ہے۔ دراصل ہم بچپن میں خدا کی ہستی کو بھی اپنے نانا کی نورانی صورت اور بزرگانہ شان ہی میں تصور کرتے تھے۔ سنا تھا کہ خدا ساری کائنات میں بزرگ و برتر ہے۔ سو ہمارے نانا (جنہیں ہم بابا کہا کرتے تھے) بھی ہمارے قصبے کی سب سے بزرگ اور قابلِ احترام ہستی تھے جن کا حکم ہر کوئی مانتا تھا۔ سنا تھا کہ خدا نیکی سے خوش ہو کر انعام دیتا ہے اور بدی سے ناراض ہو کر سزا دیتا ہے۔ بس یہی خصوصیت ہمارے بابا کی تھی۔ وقت پر نماز پڑھنے اور قرآن کا سبق یاد کرنے پر ہمیں ان کے دربار سے دو پیسے ملتے تھے (اور اس زمانے میں دو پیسے کتنی بڑی دولت ہوتے تھے اس کا تو آج اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا) اور جھوٹ بولنے یا گالی بکنے پر ان کے ہاتھ سے ہمارے گالوں پر دو زناٹے دار چپت پڑتے تھے۔ جزا اور سزا کا مسئلہ ہمارے لئے بالکل ہی مبہم اور پیچیدہ نہیں تھا۔

جب میں چار پانچ برس کی عمر میں گھر کی چار دیواری سے اسکول کی دنیا میں آیا، اس وقت مجھ پر اپنے بابا کی شخصیت کے دوسرے اہم پہلو روشن ہوئے۔ یہ اسکول ہمارے پڑنانا خواجہ الطاف حسین حالی کے نام پر حالی مسلم ہائی اسکول کہلاتا تھا اور خواجہ سجاد حسین اس کے بانی، سکریٹری اور کرتا دھرتا تھے۔ دراصل ان کی زندگی تمام تر اس اسکول کے لئے وقف تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ اپنے ہم قوموں میں نئی تعلیم رائج کرنے کے لئے انھوں نے کتنی بڑی قربانیاں کی تھیں۔ آج سے ساٹھ برس پہلے وہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کے پڑھے ہوئے پہلے چار مسلمان نوجوانوں میں تھے جنہوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بی اے کی سند دولت و اقتدار کی سنہری کنجی سمجھی جاتی تھی۔ یوپی کے گورنر نے چار مسلمان نوجوانوں کو بلا کر کہا کہ گورنمنٹ سروس کے کسی اعلیٰ عہدے کے لئے بھی وہ درخواست دے سکتے ہیں۔ انھیں صرف یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ کس محکمے میں کام کرنا چاہتے ہیں۔ سول سروس، فوج، پولیس، جوڈیشری یا تعلیم۔ ایک نے سول سروس کو چنا اور دس برس میں کمشنر کے درجے تک پہنچ گیا جو اس زمانے میں ہندوستانی سویلین کی معراج تھی۔ دوسرے نے پولیس کا محکمہ چنا اور انسپکٹر جنرل کے عہدے تک ترقی کی۔ تیسرا جوڈیشری میں گیا اور سشن جج ہو کر ریٹائر ہوا لیکن سجاد حسین نے وہ محکمہ پسند کیا جو سرکاری ملازمتوں میں ان دنوں سب سے گھٹیا سمجھا جاتا تھا یعنی تعلیم۔ ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر سے انسپکٹر جنرل مقرر ہوئے تھے کہ نوکری سے استعفیٰ دے کر چوتھائی تنخواہ پر پنشن لے لی۔ اور جائداد بیچ کر اس کے روپے سے اپنے قصبے میں اسکول چلانے لگے۔

اور اس کے بعد نہ صرف اپنی ساری پنشن بلکہ اپنی ساری باقی عمر اور اپنا تمام وقت اور تمام ہمت اور صحت اس اسکول کے چلانے بڑھانے اور ترقی دینے میں صرف کردی۔ ۱۹۲۶ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو میں اُن کے بستر مرگ کے قریب ہی تھا۔ موت سے صرف ایک گھنٹہ پہلے انہوں نے انتہائی کمزوری اور بے ہوشی کے عالم میں ایک لمحے کے لئے آنکھ کھولی اور ہونٹوں کی خفیف سی جنبش سے پوچھا "میٹرک کا نتیجہ کب نکلے گا؟" آخری دم میں بھی ان کو اسکول ہی کی فکر تھی۔

اپنے نانا کے بعد جس ہستی سے میں اثر پذیر ہوا وہ میرے والد خواجہ غلام السبطین کی تھی۔ اگر نانا کی زندگی ایثار اور خدمت خلق کا ایک روشن نمونہ تھی تو ابّا (جیسا ہم اپنے والد کو کہتے تھے) کے کردار سے میں نے بچپن ہی میں انسان دوستی اور جمہوریت پسندی کے ان اصولوں کو سیکھا اور سمجھا جو آخر مجھے اشتراکیت کی سرحد تک لے آئے۔ جس خاندان اور جس ماحول میں میں پیدا ہوا تھا اس میں چھوٹی موٹی زمینداری کی بنیادوں پر کتنی ہی جھوٹی قدروں کے کھنڈر ڈگمگا رہے تھے۔ حسب نسب۔ شرافت رذالت۔ اونچے خاندان۔ نیچ خاندان۔ سیّد۔ انصاری۔ شیخ۔ برہمن مغل اور پٹھان کے امتیازات۔ شادی بیاہ کے رسوم میں فضول خرچیاں۔ قبر پرستی، توہم پرستی۔ تعویذ گنڈے۔ پیری مُریدی۔ نذر نیاز۔ عرس اور قوالیاں۔ مجلسیں اور ماتم۔ اگر میں شروع ہی سے ان اقدار کے غلط اثرات سے محروم یا محفوظ رہا تو اس کی صرف ایک وجہ تھی کہ میرے والد ایک ایسے اسلام کے پیرو تھے جس میں توہمات اور تعصبات دونوں کے لئے جگہ نہیں تھی اور جس کی بنیاد عقل اور انسان دوستی پر تھی۔ پانچ برس کی عمر میں میں نے جمہوریت کا نام بھی نہیں سنا تھا نہ انسانی برابری کا مسئلہ کسی نے مجھے سمجھایا تھا۔ لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ ایک بار گھر کے ملازم چھوکرے کو (جو میرا ہی ہم عمر تھا) "الّو کا پٹھا" کہنے کی یہ سزا ملی تھی کہ بارہ گھنٹے تک اندھیرے کمرے میں بند کردیا گیا تھا۔ نہ کھانا نہ پانی۔ جب تک ہاتھ جوڑ کر اس ملازم سے معافی نہیں مانگی۔ ابّا کسی حد تک سادگی پسند (PURITAN) تھے۔ نہ انھیں انگریزی فیشن اچھے لگتے تھے اور نہ وہ ہندوستانی ٹیپ ٹاپ کو ہی پسند کرتے تھے۔ نہ وہ اپنی بیٹیوں کو زیور گہنے بنواکر دیتے تھے۔ نہ بیٹے کو انگریزی لمبے بال رکھنے دیتے تھے۔ عرس میں جاکر قوالی سننے کو بھی بُرا سمجھتے تھے اور سنیما کے ناچ گانوں کو بھی۔ نہ ہمیں پان کھانے کی اجازت تھی نہ چائے پینے کی۔ اُن کی خواہش اور کوشش تھی کہ اُن کی اولاد سادہ اور جفاکش زندگی کی عادی ہو، توہمات اور غیر ضروری رسومات سے آزاد ہو اور تعلیم اور صحت کی طرف پُوری توجہ دے۔

اپنے عقیدے میں وہ بہت سخت گیر تھے۔ مگر ان کے مزاج میں ایک عجیب شگفتگی اور مزاح کی چاشنی تھی جو ان کی اصول پرستی کو کٹھ مُلّاؤں کی سی روکھی پند نصیحت سے بچائے رکھتی تھی۔ کسی کو پان سے ہونٹ رچائے ہوئے دیکھتے تو سنجیدہ چہرہ بناکر پوچھتے "خیریت تو ہے؟ کیا چوٹ لگ گئی ہے کہ مُنہ سے خون جاری ہے؟" چائے کو بھنگ کہتے تھے لیکن کوئی چائے کا شوقین دوست ملنے آجاتا تو کہتے۔ "ارے اندر جاکر کہو ایک بھنگڑا آیا ہے۔ اس کے لئے تھوڑی سی بھنگ گھول کر بھیج دیں۔"

ابّا جتنے اپنے عقیدوں میں پکے تھے۔ اتنی ہی حد تک آزادیِ رائے کے حامی بھی تھے۔ آخر عمر میں وہ مسلم کانفرنس میں شامل ہوگئے (جو مسلم لیگ کی طرح فرقہ وارانہ جماعت تھی) اور میں اس وقت تک کانگریس کو بھی پیچھے چھوڑ کر سوشلزم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لیکن کبھی انہوں نے اپنے اصُول مجھ پر زبردستی عائد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ سیاسی بحث ضرور کرتے۔ گرما گرمی بھی کبھی کبھی ہو جاتی۔ لیکن جیسی برابر کے دوستوں میں ہوتی ہے۔ اُن کے کئی دوستوں نے بار بار انھیں سمجھایا کہ اپنے بیٹے کو انقلابی تحریکوں کا ساتھ دینے سے روکیں لیکن ایک بار بھی مجھ سے یہ نہیں کہا کہ کانگریس یا سوشلسٹ پارٹی کا ساتھ چھوڑ دو۔ دراصل وہ اس بات سے بہت خوش تھے کہ ان کا بیٹا اپنے اصُولوں

پر قائم رہنے کی ہمت رکھتا ہے (خواہ اُن اصولوں کو وہ کتنا ہی غلط سمجھتا ہوں)

ماں باپ اپنی اولاد کے لئے نقد، مکان، جائداد، زمین ورثے میں چھوڑ جاتے ہیں۔ ہمارے ابّا نے ان میں سے کچھ بھی نہیں چھوڑا مرنے سے چند روز پہلے مجھے ایک فہرست دی اُن رشتے داروں، دوستوں اور جاننے والوں کی جن کو انھوں نے مختلف رقمیں قرض دی ہوئی تھیں میں نے پوچھا۔ کوئی ہنڈیاں، پرچے یا رسیدیں ہیں کیا۔ جواب میں انھوں نے سر ہلا کر نہیں کہہ دیا۔ پھر مجھے ہدایت کی کہ ان میں سے کسی پر کبھی قرض کی ادائیگی کا تقاضا نہ کرنا۔ ان لوگوں کے پاس ہوگا تو وہ خود واپس کر دیں گے۔ ساری رقمیں ملا کر پینتیس ہزار کے لگ بھگ تھیں ایک ہزار روپے بھی واپس نہیں ملے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ اب پاکستان چلے گئے ہیں اور مدت ہوئی۔ میں نے وہ فہرست بھی پھاڑ دی ہے۔ ابا جو "جائداد" ہمارے لئے چھوڑ گئے وہ دوسری ہی قسم کی تھی۔

یہ عجیب بات ہے کہ بظاہر اُن میں اور مجھ میں کوئی چیز بھی تو مشترک نظر نہیں آتی۔ ان کے چہرے پر داڑھی تھی، میں روزانہ شیو کرتا ہوں۔ وہ شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ میں قمیص اور پتلون پہنتا تھا۔ وہ مسلم کانفرنس کی فرقہ وارانہ سیاست کو سراہتے تھے۔ میں کانگریس کے دائیں بازو کو بھی رجعت پسند قرار دیتا ہوں اور کوشاں ہوں کہ ہمارا ملک جتنی جلدی ہو۔ سوشلزم کی منزل تک پہنچ جائے۔ وہ کبھی فلم نہیں دیکھتے تھے۔ میں فلم بناتا ہوں۔ وہ عورتوں کو پردہ کرانے کے حامی تھے اور میں اس کا مخالف ہوں۔ ان تمام باتوں کے باوجود لوگ کہتے ہیں کہ ان کو میری شخصیت اور میرے کردار میں میرے والد کی جھلک نظر آتی ہے۔ کوئی کہتا ہے میں بھی ان کی طرح ضدی ہوں کوئی کہتا ہے وہ بھی میری طرح "غیر مقلد" (NON CONFORMIST) تھے۔ کسی کی رائے ہے کہ میں بھی ان کی طرح روپے پیسے کی طرف سے لاپرواہ ہوں اور کوئی کہتا ہے کہ باپ اور بیٹا دونوں خودسر اور خود رائے ہیں اور شاید وہ غلط نہیں کہتے۔ میرے عقائد اور خیالات میری نسل اور میرے زمانہ کی پیداوار ہیں۔ لیکن جن اثرات نے میرے بنیادی کردار کی تشکیل کی ہے۔ ان میں (ہر معمولی انسان کی طرح) میرے والد اور والدہ کی شخصیات سب سے زیادہ اہم اور نمایاں ہیں۔

میرے ابّا اور میری امّاں کے کرداروں کا تضاد نہ صرف دلچسپ بلکہ معنی خیز تھا۔ جن چیزوں کو ابّا ناپسند کرتے تھے (جیسے پان، چائے، سرمہ، کاجل، مِسّی، چوڑیاں، زیور، بچوں کے لئے ریشمی کپڑے) ان سب کو امّاں پسند کرتی تھیں۔ ابّا کا اصرار تھا کہ ان کے بچے کھدر کے سادہ کپڑے پہنیں، مگر امّاں آنکھ بچا کر ہمیں ململ کے کُرتے، لٹھے کے پاجامے اور عید پر ریشمی شیروانیاں بنوا کر دیتی تھیں۔ ابّا کبھی ہمیں ڈانٹتے تو وہ ہمیں پچکار کر تسلی دیتیں۔ ایک طرف سے سختی اور دوسری طرف سے نرمی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہم بچوں کی زندگی میں آپ سے آپ ایک قسم کا توازن آ گیا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان دونوں نے آپس میں مشورہ کرکے اپنے بچوں کی تربیت کے لئے یہ پروگرام بنایا تھا۔

یہ تو ہمیں بچپن ہی سے معلوم تھا کہ ہماری اماں بھی (ہر ماں کی طرح) اپنے بچوں سے بے پناہ محبت کرتی ہیں اور وقتاً فوقتاً ہم اس کا جائز اور ناجائز فائدہ بھی اٹھایا کرتے تھے۔ لیکن ان کی زندگی کے صرف آخری دنوں میں مجھے اپنی امّاں کے کیرکٹر کی مضبوطی، ان کی انسان دوستی اور رواداری کا پورا احساس ہوا۔

جب ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کا بٹوارہ ہوا اُس وقت (والد کا انتقال ہو چکا تھا) میری امّاں اور بہنیں پانی پت میں تھیں اور

میں بمبئی میں جب مغربی پنجاب کے زخم خوردہ ہندو سکھ شرنارتھیوں کے بعد پانی پت میں مسلمانوں کا رہنا مشکل ہوگیا اور وہ سب پاکستان "ہجرت" کی تیاری کرنے لگے تو میری ماں پر بھی وہ سب عزیز رشتے داروں نے دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ ان کے ساتھ پاکستان چلیں اور مجھے بھی لکھیں کہ میں بمبئی سے کراچی آجاؤں۔ مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ "ہم اپنا وطن نہیں چھوڑیں گے۔ میرے بیٹے نے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس فیصلے میں میں اس کے ساتھ ہوں۔"

فسادات کے بیس بائیس دن انھوں نے پانی پت میں گزارے۔ سات سات دن کا کرفیو لگتا۔ گھر میں جتنی روٹی کھا کر گزارہ کرنا پڑتا۔ اور پانی جو ان کی زندگی کا اہم جزو تھا۔ روپے میں ایک پتہ نصیب ہوتا جس کے دس چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرکے وہ دن بھر گزارہ کرتیں۔ پھر ایک ملٹری ٹرک ان سب کو نکالنے کے لئے دہلی سے پانی پت بھیجا گیا اور راتوں رات برقع پوش عورتوں کو اپنا وطن اور اپنا گھر چھوڑنا پڑا۔ بیس دن وہ سب دہلی میں رہے۔ تیس آدمی ایک کمرے میں بند۔ اور اس عرصے میں خبر آئی کہ پانی پت میں ہمارے مکان لُٹ گئے اور شرنارتھیوں نے ان پر قبضہ کر لیا ہے۔

ان حالات میں وہ ہوائی جہاز سے بمبئی آئیں۔ زندگی میں پہلی بار جان بچانے کے لئے برقع ترک کرنا پڑا۔ میں ڈر رہا تھا کہ ان سب باتوں کا اثر ان کے مزاج پر نہ جانے کیا پڑا ہوگا۔ مگر پہلے الفاظ جو ایئرپورٹ پر میں نے ان سے سنے وہ یہ تھے۔ "بھئی میں تو اب ہمیشہ ہوائی جہاز میں سفر کیا کروں گی۔ بڑے آرام کی سواری ہے۔"

اور اس رات پانی پت اور دہلی کے حالات سناتے ہوئے انھوں نے کہا "نہ یہ اچھے، نہ وہ اچھے، نہ مسلمانوں نے کسر اٹھا رکھی ہے، نہ ہندوؤں اور سکھوں نے سب کے سروں پر خون سوار ہے۔ مگر مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں تو مسلمانوں کو زیادہ الزام دوں گی کہ انھوں نے اپنی حرکتوں سے اسلام کا نام ڈبو دیا۔"

میرا ایک پنجابی شرنارتھی ہندو دوست ان دنوں میرے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ سُن کر کہ اُس کے شہر شیخوپورہ میں بہت سے ہندو مارے گئے ہیں اور میرے دوست کے گھر والے راتوں رات وہاں سے پیدل چل کر ہندوستان کے کسی شرنارتھی کیمپ میں پہنچے۔ میری ماں بہت دیر تک روتی رہیں اور پھر مجھے الگ لے جاکر کہا۔ "دیکھنا یہ لڑکا آج سے تمہارا بھائی ہے اس کا ہمیشہ خیال رکھنا۔ شاید اس طرح سے ہم ان گناہوں کا کفارہ ادا کر سکیں جو ہمارے ہم مذہبوں نے کئے ہیں۔" رواداری اور انسان دوستی کی قدریں میں نے کسی کتاب سے نہیں حاصل کیں۔ اپنی ماں کی شخصیت سے ورثے میں پائی ہیں۔

شخصیات جنہوں نے مجھے متاثر کیا؟ یہ فہرست تو لمبی ہوتی جارہی ہے۔ کس کس کا نام گناؤں؟ اپنے رشتے داروں میں ایک اور ہستی کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ وہ ہیں میرے چچازاد بھائی خواجہ غلام السیدین جو آج گورنمنٹ آف انڈیا کی ایجوکیشنل منسٹری کے سکریٹری ہیں لیکن میں بچپن سے آج تک انھیں "بھائی جان" ہی کہتا آیا ہوں۔ میرے خیال میں بچپن میں ہر کسی کا ایک IDEAL ہوتا ہے۔ اور عام طور سے وہ اس کا بڑا بھائی ہوتا ہے جس کو دیکھ کر بچہ اس کی نقل کرنا چاہتا ہے جیسے کیونکہ اگلے آدمی کی نقل و حرکت کی ہم پیروی کرتے ہیں اس طرح بچپن میں لاشعوری طور پر چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہے۔ میرا اپنا کوئی سگا بھائی نہیں تھا اس لئے بچپن سے ہی اپنے چچازاد بھائیوں ہی کو میں سگا بھائی سمجھتا تھا۔ بھائی جان مجھ سے دس برس بڑے ہیں۔ جب میں پانی پت

کے پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا تو وہ علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے۔ چھٹیوں میں جب وہ آتے تو ان کی موٹی موٹی انگریزی کی کتابوں اور ٹینس کے ریکٹ کا مجھ پر بڑا رعب پڑتا۔ وہ اپنے یونیورسٹی میگزین کے لئے کبھی بیٹھ کر کوئی مضمون لکھتے تو میرا بھی جی چاہتا کہ میرے قلم میں بھی کسی دن ایسی طاقت آ جائے کہ میں یوں بے تکان مضمون لکھ سکوں۔ اور پھر وہ انگلستان پڑھنے گئے اور وہاں سے اُن کے خط اور تصویر والے پوسٹ کارڈ آنے لگے تو ہمارے لئے اور بھی دلچسپی اور حیرت اور رشک کا سامان ہو گیا۔ لندن۔ لیڈز۔ کیمبرج۔ آکسفورڈ۔ پیرس۔ برلن۔ جنیوا۔ ہم اپنے اسکول کے اٹلس میں ان شہروں کو ڈھونڈنے لگے اور وہاں سے آئی ہوئی تصویروں کو سنبھال کر البم میں لگانے لگے اور دل ہی دل میں سوچتے۔ کیا کوئی دن ایسا بھی آئے گا کہ ہم بھی اس وسیع اور رنگین دنیا کی سیر کر سکیں گے۔ اور پھر ولایت سے واپس آ گئے۔ فرسٹ کلاس ڈگری لے کر اور علی گڑھ میں پروفیسر ہو گئے۔ اس سال علی گڑھ یونیورسٹی کی جوبلی تھی۔ ۱۹۲۵ء کا ذکر ہے۔ اپنے نانا کے ساتھ میں بھی افراد سے علی گڑھ پہنچا۔ یونیورسٹی کی شاندار عمارتوں اور جوبلی کے ہنگاموں کا رعب تو پڑا ہی۔ لیکن سب سے زیادہ رعب پڑا اس ڈبیٹ کا جو جوبلی پنڈال میں ہوئی اور جس کے ہیرو ہمارے بھائی جان قرار پائے۔ اگر میں کسی ایک واقعہ کو یاد کروں جس نے میری زندگی پر سب سے گہرا اثر ڈالا ہے تو وہ یہی ڈبیٹ ہو گی۔

کوئی پانچ چھ ہزار کا مجمع ہو گا۔ اسٹیج پر ہندوستان کے مسلمانوں کے سب ہی مشہور سیاسی اور غیر سیاسی لیڈر موجود تھے۔ مسٹر محمد علی جناح۔ سر آغا خان۔ سر محمد اقبال۔ سر علی امام۔ ڈبیٹ کا مضمون تھا کہ "ہندوستان کے مسلمانوں کو قومی سیاست میں دوسری قوموں کے دوش بدوش کام کرنا چاہئے۔ اپنی سیاسی تنظیم علیحدہ نہیں کرنی چاہئے۔" یہ تجویز ہمارے بھائی جان نے پیش کی اور اس کی مخالفت کی۔ اُن تمام مشاہیر و قائدین نے جو وہاں موجود تھے۔ میں تو اس وقت انگریزی نہیں کے برابر سمجھتا تھا۔ لیکن یہ میں دیکھ سکتا تھا کہ بھائی جان نے تقریر کی تھی اسٹیج کی دائیں طرف سے اور سب بڑے لوگ بول رہے تھے اُن کی مخالف سمت سے۔ جب اُن سب کی تقریریں ختم ہو گئیں تو تجویز پیش کرنے والے نوجوان کو جواب الجواب دینے کا حق دیا گیا۔ اس وقت بھائی جان نے وہ تقریر کی جو علی گڑھ کی تاریخ میں آج تک یادگار ہے اور جس نے میری زندگی کا رخ موڑ دیا۔ انگریزی الفاظ نہ سمجھنے پر بھی میں اُن کے زورِ کلام کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ کتنی روانی تھی ان کی تقریر میں۔ کتنا سلجھا ہوا اور مدلل تھا ان کا انداز۔ کیسا جادو تھا ان کی آواز میں کہ ہر شخص مسحور اور مبہوت بنا ہوا ہمہ تن گوش سن رہا تھا۔ کتنا خلوص اور کتنا جوش تھا اُن کے بیان میں کہ جب اُن کی تقریر ختم ہوئی تو سارا پنڈال تالیوں سے گونج اُٹھا اور مسٹر علی امام جنہوں نے تجویز کی مخالفت کی تھی اُٹھے اور اپنے نوجوان حریف کو گلے سے لگا لیا۔ اس کے بعد جب حاضرین کی رائے لی گئی تو کثرتِ رائے سے تجویز پاس ہو گئی اور میرے دھڑکتے ہوئے دل نے مجھ سے کہا۔ "کتنے قابل ہیں میرے بھائی جان، کتنی اچھی تقریر کی انھوں نے۔ ایک دن میں بھی اُن جیسا بنوں گا۔ اُن جیسی تقریر میں کروں گا۔ مگر اس کے لئے بہت کچھ پڑھنا پڑے گا، لکھنے اور بولنے کی کوشش کرنی پڑے گی۔ بڑے آدمیوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا..... مگر میں سب کچھ کروں گا۔ سب کچھ کروں گا۔

اور میں جو کبھی انجن ڈرائیور بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا، پھر ڈاکٹر بننا چاہتا تھا، پھر جج، پھر ڈپٹی کلکٹر، اب صحافی اور مقرر اور سیاست داں بننے کے خواب دیکھنے لگا۔

ان کے علاوہ وہ شخصیتیں بھی ہیں جن سے میں ہی نہیں میری نسل کے کروڑوں ہندوستانی متاثر ہوئے ہیں اور جن کی "چھاپ"

ہم سب کی زندگی اور کردار پر موجود ہے۔

مہاتما گاندھی ان کو پہلی بار جب میں نے دیکھا تھا اس وقت میری عمر صرف پانچ یا چھ برس کی تھی لیکن اس وقت بھی ان کی مقناطیسی شخصیت نے مجھے متاثر کیا تھا۔

بھگت سنگھ، جس کی شہادت کے دن میں اور میرے بہت سے کالج کے ساتھی اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے جیسے ہمارا سگا بھائی پھانسی پر چڑھا دیا گیا ہو۔

جواہر لال نہرو، جن کو کالج کے دنوں میں ہم نوجوانوں کا لیڈر سمجھتے تھے اور جن کی انقلابی اور اشتراکی تقریروں اور تحریروں کا ایک ایک لفظ ہمیں حفظ یاد ہوتا تھا۔

منشی پریم چند، جن کی کتابوں سے میں نے سیکھا کہ ادب کا مقصد صرف دل بہلانا اور تفریح ہی نہیں ہوتا۔ انسانی زندگی کی سچی عکاسی بھی ہوتی ہے۔

پورن چند جوشی، جن سے مل کر مجھے معلوم ہوا کہ کمیونسٹ مارکسی اصولوں کو دہرانے والی مشینیں ہی نہیں ہوتے انسان اور انسان دوست بھی ہوتے ہیں۔

زندگی کی مختلف منزلوں اور موڑوں پر میں ان سب ہی سے متاثر ہوا ہوں۔

اور واقعات؟

پہلا ناقابلِ فراموش واقعہ ۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء کا ذکر ہے۔ جب میں صرف چار یا پانچ برس کا تھا اور پانی پت میں پرائمری اسکول کی پہلی جماعت میں پڑھتا تھا۔ جلیانوالہ باغ کا خونی ڈرامہ کھیلا جا چکا تھا اور تمام پنجاب کی آبادی کو اطاعت اور وفاداری کا سبق پڑھایا جا رہا تھا۔ سڑک اعظم (جو دلی سے پشاور جاتی ہے) کے کنارے جتنے شہر اور قصبے تھے ان کے تمام سکولوں کو حکم دیا گیا کہ اپنے بچوں کو سڑک کے کنارے قطاریں بنا کر کھڑا کریں۔ کیونکہ وہاں سے انگریزی گھوڑا سوار فوج کے رسالے گزرنے والے تھے۔ صبح سویرے سے سہ پہر تک ہم گرمیوں کی دھوپ میں وہاں کھڑے رہے۔ کئی بچوں کو لو لگ گئی۔ ایک بھوک اور دہشت سے بیہوش ہو گیا۔ تب جا کر انگریز فوجیوں کے لال لال چہروں کے درشن ہوئے۔ اس زمانے میں ایٹم بم اور راکٹ تو ایجاد نہیں ہوئے تھے لیکن انگریزی فوج کے پاس جتنے بھی بھیانک ہتھیار تھے وہ سب ہی تو اس جلوس میں ہمارے سامنے سے گزارے گئے۔ توپیں، مشین گنیں، رائفلیں، بندوقیں، پستول، بھالے، تلواریں۔ ہمارے دلوں پر برطانوی سامراج کی ہیبت بٹھانے کے لئے یہ جلوس تین گھنٹے تک سڑک اعظم سے گزرتا رہا اور ہم کھڑے دیکھتے رہے۔ لیکن جس مقصد سے یہ مظاہرہ کیا گیا تھا اس میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ کیونکہ بچوں کے دلوں میں اس فوج کے رعب یا خوف سے کہیں زیادہ نفرت بھری جا رہی تھی شام کو جب ہم بھوکے پیاسے نڈھال ہو کر گھر لوٹ رہے تھے تب بچے یا تو ہنس ہنس کر کہہ رہے تھے "ارے کیسے لال لال منہ کے انگریز تھے جیسے بندریا بندر" اور یا تحریکِ خلافت اور نان کوآپریشن کے گیت گا رہے تھے جیسے:

" کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی
ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو "

اور اس دن ایک چار پانچ برس کے بچے نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا: "میں ان انگریزوں کی سرکاری نوکری نہیں کروں گا"

اور اب چالیس برس بعد بھی جب انگریز سرکار ختم ہو چکی ہے اور آزاد ہندوستان کی اپنی قومی حکومت قائم ہو چکی ہے۔ نہ جانے کیوں اب بھی میں سرکاری نوکری کے خیال سے گھبراتا ہوں۔

دوسرا ناقابلِ فراموش واقعہ ۔ شاید ۱۹۳۳ء کی بات ہے۔ میں علی گڑھ یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ کالج میں پڑھتا تھا۔ نیا نیا سائیکل چلانے کا شوق ہوا تھا۔ چند دوستوں نے طے کیا کہ سائیکلوں پر آگرے جائیں گے جو علی گڑھ سے کوئی اسّی میل ہے۔ دھن تو تھی تاج محل کو چاندنی رات میں دیکھنے کی۔ لیکن راستے میں کسی کی سائیکل کا ٹیوب پھٹ گیا۔ اُسے ٹھیک کرنے کے لئے ایک گاؤں میں دوپہر بھر ٹھہرنا پڑا۔ اس گاؤں کی غربت کی تصویر آج تک میرے دل و دماغ پر نقش ہے۔ ٹوٹے پھوٹے کچے مکان۔ لوگوں کے پھٹے پرانے میلے کچیلے کپڑے۔ جھونپڑوں کے بیچ میں سے بہتا ہوا گندا نالہ جس پر کروڑوں مچھر بھن بھنا رہے تھے۔ دُبلے پتلے سوکھے جسم کے ننگے بچے جو بھیک مانگنے کے لئے ہمارے سامنے ہاتھ پھیلا رہے تھے اور ہر چہرے پر نہ صرف افلاس بلکہ اس سے بھی زیادہ بھیانک ایک عمیق مایوسی کی چھاپ جیسے انھیں یقین ہو کہ ان کی حالت کبھی بہتر نہیں ہو سکتی۔ . . . . .

اس وقت تک میں نے سوشلزم پر دو چار کتابیں پڑھی تھیں لیکن اُس دن میں قطعی طور پر اشتراکیت پر ایمان لے آیا۔

۳۸ ، (۱۹۳۸ء) میں میں نے دنیا کا سفر کیا۔ اس سفر نے میرے دماغ کو قوم پرستی کی حدود سے نکال کر بین الاقوامی اشتراکیت کی شاہراہ پر ڈال دیا۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ امریکہ میں سرمایہ داری کی اتنی صنعتی ترقی کے باوجود بھی افلاس ہے اور انگلستان میں سامراجی روایات کے باوجود ترقی پسند اور اشتراکی حلقوں میں ہندوستان کے قوم پرستوں کے ساتھ ہمدردی ہے اور جرمنی اور اٹلی میں ہٹلر اور مسولینی ایک کروہ اور بھیانک فلسفے کی تعلیم دے رہے ہیں اور اسپین میں فاشزم اور جمہوریت کے درمیان آنے والی جنگ کا ریہرسل ہو رہا ہے . . . .

اسی سفر کے دوران میں میں نے نیویارک کے قریب ایک قصبے پوکیپسی (POUGHKEEPSIE) میں تمام دنیا کے نوجوانوں کی ایک کانفرنس میں شرکت کی جو فاشزم کے بڑھتے ہوئے خطرے کو روکنے کی غرض سے منعقد کی گئی تھی۔ آج کل تو تقریباً ہر سال ہی کہیں نہ کہیں نوجوانوں کے ایسے بین الاقوامی جمگھٹے ہوتے رہتے ہیں۔ پچھلے سال میں ماسکو میں تھا۔ جب وہاں لگ بھگ سو قوموں اور ملکوں سے آئے ہوئے چالیس ہزار نوجوان اکٹھے ہوئے لیکن ۱۹۳۶ء میں نوجوانوں کی بین الاقوامی تحریک کی ابتدا ہوئی تھی۔ ہماری کانفرنس میں صرف چھ سات سو نمائندے شریک ہوئے تھے۔ جو شاید ۳۰۔۳۵ ملکوں سے آئے تھے لیکن پھر بھی کئی وجوہ سے اس کانفرنس کا گہرا نقش میری یاد پر آج تک [illegible] میرے (اور دوسرے نمایندوں کے لئے بھی) اتنے مختلف ملکوں کے نوجوانوں سے ملنے اور ان سے تبادلۂ خیالات کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ امریکن انگریز فرانسیسی جرمن (جو ہٹلر کی خفیہ پولیس سے چھپ کر آئے تھے) اطالوی جو مسولینی کے چنگل سے کسی طرح چھوٹ کر آئے تھے ، میرے جیسے ہندوستانی نوجوان جو برطانوی سرکار سے مختلف بہانوں سے پاسپورٹ لے کر کسی نہ کسی طرح امریکہ پہنچ پائے تھے۔ چینی نوجوان جو جاپانی فاشزم کے خلاف اس وقت بھی برسرپیکار تھے۔ سیاسی اعتبار سے اس کانفرنس میں حیرت انگیز تنوع تھا۔ کہنے کو تو اس کے بارے میں بھی مخالفین نے کہا اور لکھا تھا کہ یہ کمیونسٹوں کا ڈھونگ ہے لیکن اس میں کمیونسٹ ، سوشلسٹ ، لبرل ، قوم پرست اور یہاں تک کہ برطانیہ کی قدامت پرست CONSERVATIVE پارٹی کے وہ نوجوان اراکین تک شامل تھے جو ونسٹن چرچل کی پیروی میں فاشزم کے مخالف تھے۔ ہندوستان سے جو نمائندے گئے تھے۔ ان میں علاوہ اور نوجوانوں کے مرحوم یوسف علی مہر علی تھے۔ جو اس وقت بھی سوشلسٹ

پارٹی کے لیڈر تھے۔ موجودہ پارلیمنٹ کی کمیونسٹ ممبر رینو چکرورتی تھیں جو اس وقت انگلستان میں پڑھتی تھیں اور شاید اس وقت بھی کمیونسٹ پارٹی میں تھیں۔ اس کانفرنس کے مباحثوں کا ایک دلچسپ پہلو جسے مجھے ابھی تک یاد ہے وہ یہ تھا کہ نمائندوں کی اکثریت کی رائے یہ تھی کہ فاشزم کے خلاف متحدہ محاذ کی خاطر کچھ عرصے کے لئے سامراج اور سرمایہ داری کے خلاف جدوجہد کو ملتوی یا کم کر دینا چاہیے تاکہ امریکہ کے لبرل عقیدے کے سرمایہ داروں اور فرانس اور انگلستان کے ان سیاستدانوں کو بھی جو سوشلسٹ نہیں تھے، ہٹلر اور مسولینی کے خلاف محاذ میں شامل کیا جا سکے، لیکن ہم ہندوستانیوں کے لئے تو برطانوی سامراج اور جرمن فاشزم میں کوئی فرق نہیں تھا اور اگر کوئی فرق تھا بھی تو وہ یہ تھا کہ ایک بلا ہمارے گھر میں موجود تھی اور دوسری آفت کے بارے میں ہم نے صرف سنا تھا۔ جب کانفرنس کا بنیادی رزولیوشن پیش ہوا تو اس میں سامراجی مقبوضات اور نوآبادیات کے لئے مکمل آزادی کے بجائے بتدریج جمہوری خود مختاری کا مطالبہ رکھا گیا تھا۔ بھلا اس سے ہم ہندوستانی قوم پرستوں کی کہاں تسکین ہوتی۔

ہندوستان کی طرف سے مجھے اس تجویز پر بولنا تھا۔ میں نے برطانوی اور فرانسیسی سامراج کے خلاف بڑی شدومد سے تقریر کی اور اتنے زور سے ہندوستان اور ایسے دوسرے ملکوں کے لئے فوری مکمل آزادی کا مطالبہ کیا کہ برطانیہ اور فرانس کے غیر سوشلسٹ نمائندوں نے تو کانفرنس کا بائیکاٹ کرنے کی ٹھان لی۔ لیکن تقریر کے ختم پر باقی نمائندوں نے خوب زور سے تالیاں بجائیں اور پلیٹ فارم سے نیچے اترتے ہی مجھے کئی ملکوں کے نوجوانوں نے گھیر لیا اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملانے لگے۔ ان میں سے ایک جرمنی سے نکالا ہوا فاشسٹ دشمن نوجوان تھا۔ جس کے چہرے کی لکیروں میں اس کی جھیلی ہوئی مصیبتوں کی کہانی لکھی ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہنے لگا۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ اپنے دشمنوں کے خلاف محاذ بنانے کی خاطر ہمیں کوئی حق نہیں ہے کہ ہم ہندوستانیوں سے کہیں کہ تم سامراج کے خلاف اپنی جدوجہد کو بند کردو۔ یقین مانو کہ ہم ہندوستان کی تحریک آزادی کے پورے پورے حامی ہیں۔ ایک انگریز ترقی پسند نوجوان نے بھی آکر مجھ سے کہا کہ میری تقریر سن کر اسے یقین ہوگیا تھا کہ فاشزم کے خلاف بین الاقوامی محاذ بنانے کے لئے سب سے زیادہ ضروری شرط یہی تھی کہ ہندوستان جیسے ملکوں کو جلد از جلد مکمل آزادی حاصل ہونی چاہئے تاکہ ان کے عوام فاشزم کے خلاف جنگ میں بھرپور حصہ لے سکیں۔ ان دونوں کی باتوں کا مجھ پر بہت اثر ہوا اور اس کے بعد گو رزولیوشن میں صرف اتنی ترمیم ہوئی کہ ہندوستان اور دیگر سامراجی مقبوضات میں فوری [illegible] آزادی کا نفاذ ہونا چاہئے۔ لیکن پھر بھی جو نوجوان شریک ہوئے تھے ان میں سے بیشتر نے اتنے جوش و خروش سے ہماری آزادی کی حمایت کی کہ اس کانفرنس کا نقش اب تک میرے دل پر تازہ ہے۔

وہ کانفرنس فاشزم اور جنگ کو روکنے کے لئے منعقد کی گئی تھی لیکن بہت دیر میں ہوئی۔ اس کانفرنس کے ختم ہونے پر جب میں فرانس سے انگلستان اس وقت پہنچا۔ جب برطانوی وزیر اعظم مسٹر چیمبرلین ہٹلر سے چیکوسلواکیہ کا سودا کر رہے تھے اور ابھی سال بھی نہیں گذرا تھا کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی۔

میرے جیسے سب ہی ترقی پسند فاشسٹوں اور نازیوں کے مخالف تھے لیکن ہمارے اپنے ملک میں تو برطانوی سامراج ہمارے سر پر سوار تھا۔ اگست ۱۹۴۲ء میں مہاتما گاندھی کی قیادت میں ہماری جنگ آزادی کا آخری دور شروع ہوا۔ اس زمانے کے دو واقعات نے مجھے از حد متاثر کیا۔

۸ اگست کو کانگریس نے برطانوی سرکار کو الٹی میٹم دے دیا۔ اسی رات کو سب لیڈر گرفتار کر لیے گئے۔ اگلے دن اعلان ہوا کہ شیواجی پارک میں عام جلسہ ہوگا جس میں کستوربا گاندھی تقریر کریں گی۔ وہ شام مجھے آج تک یاد ہے۔ پارک کا سارا میدان میدانِ جنگ کا نمونہ بنا ہوا تھا اگر یہ "جنگ" اس جنگ سے کتنی مختلف تھی جو یورپ میں ہو رہی تھی۔ یہاں ایک طرف تگ بھگ ایک لاکھ نہتے مرد، عورت، بچے۔ دوسری طرف ہزاروں مسلح پولس والے ان کے اور ان کے درجنوں انگریز اور اینگلو انڈین افسروں کے پاس ہر قسم کے ہتھیار: لاٹھیاں، بندوقیں، رائفلیں، ریوالور، لاریوں پر چڑھائی ہوئی مشین گنیں اور رلانے والی گیس کے بم، کئی گھنٹے تک یہ "جنگ" جاری رہی۔

لاٹھیاں برسائی گئیں، رائفلوں سے فائر کیے گئے، رلانے والی گیس کے سینکڑوں بم چھوڑے گئے، جن سے چاروں طرف زہریلے بادل چھا گئے۔ جن کے قریب آتے ہی بے اختیار آنکھوں میں مرچیں لگ کر آنسو بہنے لگتے تھے اور انسان تقریباً اندھا ہو جاتا تھا لیکن مجمع نے ہار نہیں مانی۔ اگر ایک جھنڈا بردار لاٹھی کھا کر گرا تو دوسرے نے ترنگا سنبھال لیا۔ اگر کوئی گولی کھا کر گرا تو والنٹیر اسے فوراً اٹھا کر لے گئے۔ اور اس کی جگہ دوسروں نے لے لی۔ گیس کا مقابلہ کرنے کے لیے کسی نے یہ نسخہ نکالا کہ رومال پانی میں بھگو کر چہرے کو ڈھانک لیا جائے تو گیس کا اثر نہیں ہوتا۔ پھر کیا تھا۔ چاروں طرف کی عمارتوں سے عورتیں بالٹیاں لے کر نکل پڑیں اور نہتے سورما ایک بار پھر پولس اور فوج کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ جھنڈے لہرائے گئے۔ پولس کے باوجود پارک کے کونے کونے میں جلسے ہوئے، "آزادی کا ریزولیوشن" بار بار پڑھا گیا۔ تقریریں ہوئیں۔ انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند ہوئے اور ایک لاکھ بمبئی نواسیوں نے اس شام عدم تشدد پر قائم رہتے ہوئے بھی سامراجی پولس اور فوج کو شکستِ فاش دی۔

"جنگِ آزادی" یہ دو لفظ تو بچپن سے سنتا آیا تھا۔ سینکڑوں بار اپنی تقریروں اور مضامین میں بھی یہ لفظ دہرائے تھے۔ لیکن اس شام میں نے اپنی آنکھوں سے اس "جنگِ آزادی" کو دیکھا، اور اس میں شرکت کی۔ میرا کمر پر بھی لاٹھی کی ایک ضرب لگی۔ زہریلی گیس کے اثر سے میں بھی وقتی طور پر اندھا ہو گیا اور جب لوگوں نے دیکھا کہ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے تو کوئی ان جانے ہاتھ مجھے سہارا دیتے ہوئے ایک بلڈنگ کی دوسری منزل پر لے گئے اور مراٹھی زبان میں نہ جانے کیا کہہ کر نہ جانے کس کے سپرد کر گئے۔ اس گھر کے کسی فرد نے میرا ہاتھ پکڑ کر پلنگ پر لٹا دیا اور میری آنکھوں پر پانی میں بھیگا ہوا رومال رکھ دیا۔ تھوڑی دیر میں میں نے محسوس کیا کہ آنکھوں کی چرمراہٹ کم ہو رہی ہے۔ رومال ہٹا کر میں نے دیکھنا چاہا تو پہلے تو ہر چیز دھندلی نظر آئی، جیسے گیلے شیشے میں سے دیکھ رہا ہوں لیکن جلد ہی آنکھوں کا فوکس ٹھیک ہو گیا، دیکھا کہ دیواروں پر بھگوان کرشن، شو مہاراج، دیوی لکشمی اور شیواجی کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ ایک کونے میں پوجا کی جگہ ہے، جہاں مورتی رکھی ہوئی ہے۔ چراغ جل رہے ہیں، پھول رکھے ہیں اور ایک بوڑھی عورت پوجا کر رہی ہے۔

سولہ برس پہلے تو چھوت چھات کا کافی خیال رکھا جاتا تھا۔ میں اتنے مذہبی اور پوجا پاٹھ کے ماحول میں ہوں، یہ دیکھ کر میں کسی قدر سٹپٹا کر اٹھ بیٹھا۔

پلنگ کی چوں چوں سن کر بڑی بی نے مڑ کر دیکھا، پھر مورتی کی طرف جلدی سے سر جھکا کر پوجا کو بیچ میں چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میرے پاس آ کر مراٹھی میں بولیں۔ "کیوں اٹھ کیوں گیا، بیٹا۔ کچھ دیر اور آرام کر۔"

میں تھوڑی سی مراٹھی سمجھتا ہوں مگر بول نہیں سکتا، سو میں نے جواب ہندوستانی میں دیا۔ میں نے کہا: "نہیں اب میں

ٹھیک ہوں، رات ہوگئی ہے، اب مجھے جانا چاہیے۔"

"نہیں نہیں۔ پہلے دودھ پی لے۔" اور یہ کہہ کر وہ اندر گئیں اور ایک تانبے کے گلاس میں گرم گرم دودھ لے آئیں۔

میں نے سوچا اتنی مہربان دیوی کے دھرم کو کیوں بھرشٹ کروں، سو میں نے دودھ کا گلاس نہیں لیا اور کہا۔ "ماں جی میں مسلمان ہوں" ——

میرا خیال تھا کہ یہ سن کر وہ سوچ میں ضرور پڑ جائیں گی کہ اب اس لیچھ سے کیسے برتاؤ کیا جائے گا مگر انھوں نے ایک سکنڈ بھی توقف نہیں کیا اور بولیں۔ "تو پھر کیا ہوا؟" اور یہ کہہ کر مجھے دودھ کا گلاس پکڑا ہی دیا۔

میں نے دودھ کا ایک گھونٹ پی کر کہا۔ "شما کرنا ماں جی، میری وجہ سے آپ کی پوجا پوری نہ ہو سکی"۔

اُس بوڑھی، گمنام، شاید اَن پڑھ مرہٹہ خاتون کا جواب سُن کر میں ششدر رہ گیا۔ بولیں۔ "تو کیا ہوا بیٹا۔ یہ بھی تو پوجا ہی ہے"۔

اور اُس وقت میں نے دیکھا کہ ایک کونے میں گاندھی جی کی تصویر بھی لگی ہوئی ہے اور اس تصویر میں وہ مسکرا رہے ہیں اور اُن کی مسکراہٹ مجھ سے کہہ رہی ہے۔

"دیکھا تم نے۔ انقلاب یوں بھی آتا ہے دھیرے دھیرے دل کے راستے۔"

۱۵ راگست ۱۹۴۷ء۔ آزادی کا پہلا دن۔ کسی قوم کی زندگی میں یہ دن ایک ہی بار آتا ہے اور یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ وہ دن ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور آزادی کے اس جشن میں شرکت کی۔ اس "واقعہ" سے متاثر ہوئے بغیر بھلا کون رہ سکتا تھا۔ بمبئی میں گوالیا ٹینک کے میدان سے وہ یادگار جلوس چلا جو ہندوستان کی تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہی تھا۔ میری یاد میں، پہلی بار اور (فی الحال) آخری بار تمام سیاسی پارٹیوں اور تمام فرقوں اور جاتیوں اور ہر پیشے کے لوگوں نے مل کر ایک قومی تہوار منایا۔ کانگریسی۔ سوشلسٹ۔ کمیونسٹ، ہندو، مہا سبھائی، جن سنگھی، مسلم لیگی اس مذہر مسلک کے پیرو ایک ہی رخ، ایک ہی راستے پر دوش بدوش چل رہے تھے۔ ادیب، کالجوں کے پروفیسر، طالب علم، مل مزدور، کلرک، چپراسی، تاجر، سیٹھ اور بھنگی اور جوتا پالش کرنے والے چھوکرے اور مشہور فلم اسٹار اور بین الاقوامی شہرت کی ناچنے والیاں اور چھوٹے موٹے دوکاندار اور ہوٹلوں کے بیرے اور باورچی اور بھکاری اور فقیر اور لکھ پتی اور سرکاری افسر اور بے کار —— وہ جلوس نہیں تھا ساری ہندوستانی قوم تھی جو سڑکوں پر امڈ آئی تھی اور آزادی کی خوشی میں نعرے لگا رہی تھی، گا رہی تھی، ناچ رہی تھی۔ ایک مشہور اور مقبول فلم ایکٹر ڈھول بجا رہا تھا اور اسی کی لے پر ایک پڑھی لکھی کھاتے پیتے خاندان کی لڑکی جو لندن اور پیرس اور نیویارک کی اسٹیج پر ناچ آئی تھی ناچ رہی تھی! اس کے ساتھ ایک کالا سا دُبلا سا مل مزدور ناچ رہا تھا اور ایک ادیب اور جرنلسٹ نہایت بھونڈے اور بھدے طریقے سے ان دونوں کے ساتھ ناچنے کی بالکل ناکام کوشش کر رہا تھا اور وہ ادیب و جرنلسٹ میں تھا۔ نہ جانے اس دن مجھے کیا ہو گیا تھا؟ نہ جانے ہم سب کو، لاکھوں کروڑوں ہندوستانیوں کو اس دن کیا ہو گیا تھا؟ نہ جانے پھر ہم سب کے سر پر وہی جنون کب اور کیسے سوار ہوگا؟

ابھی پندرہ اگست کے نعرے فضا میں گونج ہی رہے تھے کہ شمال مغرب اور شمال مشرق سے فرقہ وارانہ قتل و خون کی خبریں آنے لگیں، بمبئی میں بھی فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھ گئی۔ نہتے راہ چلنے والوں پر قاتلانہ حملے ہونے لگے۔ اس ہولناک زمانے کے کئی واقعات نے مجھے از حد متاثر کیا اور ان میں سے اکثر کے بارے میں اپنے مضامین اور افسانوں میں لکھ چکا ہوں۔ مگر ایک واقعہ ایسا ہے جس کا میں نے اب تک

کسی سے ذکر نہیں کیا۔

شیواجی پارک کے علاقے میں جو چند مسلمان خاندان رہتے تھے وہ سب اپنے اپنے گھر چھوڑ کر "محفوظ مسلم علاقوں" میں چلے گئے صرف میں اور میری بیوی اپنی سمندر کے کنارے والی فلیٹ میں اکیلے رہ گئے۔

چند فرقہ پرور گھٹی موالیوں نے کوشش کی کہ ڈرا دھمکا کر ہمیں بھی مجبور کیا جائے کہ یہ علاقہ چھوڑ دیں۔ لیکن میں نے سوچا کہ اگر شیواجی پارک میں میرے لئے زندہ رہنا ناممکن ہے تو زندہ رہنا ہی بیکار ہے۔ میں وہیں رہا۔ ایک شام کو اندھیرا ہونے کے بعد دادر اسٹیشن پر ریل سے اترا تو دیکھا بازار اندھیرے اور سنسان ہیں۔ معلوم ہوا کہ قتل کی چند وارداتیں ہو چکی ہیں۔ اس لئے کرفیو نافذ کر دیا گیا ہے اور نو بجے کے بعد کسی کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس وقت تقریباً پونے نو بجے تھے۔ میں نے جلدی جلدی قدم بڑھائے کہ کرفیو کے وقت سے پہلے اپنے گھر پہنچ جاؤں۔

راستے میں دادر کی ایک اندھیری سی گلی میں سے گزر رہا تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ کوئی پیچھے چلا آ رہا ہے۔ میں فطرتاً کوئی بہت بہادر نہیں ہوں۔ اگر میں اس خطرناک زمانے اور اس خطرناک علاقے میں اندھیرے اُجالے اس طرح اکیلا گھومتا تھا تو اس میں بہادری سے زیادہ ضد کو دخل تھا۔ میں نے سوچا آج ضرور میری موت آ گئی مگر اب تو بھاگنے سے بھی کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ وہ شخص جو بھی تھا مجھ سے چند قدم پیچھے ہی چلا آ رہا تھا۔ مرنا ہے تو پیٹھ میں چھرا کھا کر کیوں مروں۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے قدم دھیمے کر دیئے اور جب مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے بالکل قریب آ گیا ہے تو میں ایک دم ٹھہر کر مڑا۔ ایک لمحے کے لئے تو وہ بیچارہ ڈر کر ٹھٹک گیا کہ شاید میں اس پر حملہ کرنے والا ہوں۔

اس کو اطمینان دلانے کے لئے میں نے پوچھا۔ "کیوں کرفیو لگا ہے کیا؟"

اس نے کہا "ہاں نو بجے کا کرفیو ہے ادھر۔ مگر شیواجی پارک میں نہیں ہے۔"

اب ہم دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے مگر کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے جا رہے تھے

"کیوں بھئی تم کہاں جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"شیواجی پارک اور تم؟"

"میں بھی شیواجی پارک۔"

"وہاں رہتے ہو کیا؟"

"ہاں۔"

"کون ہو تم؟ نام کیا ہے تمہارا؟"

میں اس سوال کا انتظار ہی کر رہا تھا اور اس سوال سے ڈر بھی رہا تھا۔ اب کیا جواب دوں؟ کہوں کہ میرا نام گوپال راؤ ہے یا موہن لال ہے یا وسنت ڈیسائی ہے اور اگر اس نے جرح شروع کر دی اور بھانڈا پھوٹ گیا تو؟ یا یہ کہوں کہ تم کون ہوتے ہو میرا نام پوچھنے والے۔ اس سے تو اسے شبہ نہیں یقین ہو جائے گا کہ میں اپنا نام چھپا رہا ہوں۔

سو میں نے کہا۔ "میرا نام ہے احمد عباس، خواجہ احمد عباس۔"

اس نے کہا۔ "تم پیپر میں کام کرتے ہو نا۔"

میں نے کہا۔ "ہاں بمبئی کرانیکل میں۔"

"اور تم ابھی تک شیواجی پارک میں رہتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "ہاں کئی برس سے یہیں رہتے ہیں ہم۔"

اور اتنے میں ہم پولس کے سپاہیوں کے ایک گروہ کے قریب سے گزر کر فیوکس روڈ سے گزر کر شیواجی پارک والی سڑک پر آگئے۔

میرے ہمراہی نے کہا۔ "میٹنگ میں نہیں چلو گے عباس بھائی؟"

میں نے کہا۔ "کون سی میٹنگ؟"

"سورکشا دل بنا رہے ہیں نا۔ سب شیواجی پارک کے رہنے والے اکٹھے ہوں گے۔"

میں نے کہا۔ "تو ضرور چلتا ہوں۔"

سو ہم دونوں اکٹھے اس جلسے میں داخل ہوئے۔ سو سوا سو آدمی موجود تھے اور ان میں سے اکثر مجھے جانتے تھے۔ "آؤ آؤ عباس بھائی۔" چاروں طرف سے آوازیں آئیں۔

تجویز پیش کی گئی کہ فسادات کی روک تھام کے لئے اور شیواجی پارک کے علاقے میں امن قائم رکھنے کے لئے ایک "سورکشا دل" (خود حفاظتی دستہ) بنایا جائے۔ کمیٹی کے ممبروں کا چناؤ ہوا۔ پہلا ممبر جس کو چنا گیا اس کا نام تھا۔ "خواجہ احمد عباس۔"

اور جن لوگوں نے میرے نام کی موافقت میں ہاتھ اٹھائے ان میں وہ آدمی بھی تھا جس کو چند منٹ پہلے میں اپنا قاتل سمجھ رہا تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ جلسہ ختم ہونے کے بعد اس سے ضرور ملوں گا۔ اس کا نام پوچھوں گا۔ لیکن جلسے کے ختم پر جو بات چیت اور بحث و مباحثہ اور افراتفری ہوتی ہے۔ اس میں وہ کھو گیا اور آج تک مجھے اس کا نام نہیں معلوم ....!

مگر اس کے بعد میں بدترین فسادات کے دوران میں بمبئی کے ہر علاقے میں گھوما۔ دلی اور پانی پت گیا۔ کشمیر گیا۔ جب سارا ہندوستان اور پاکستان نفرت اور غصے اور انتقام کے خونی سیلاب میں ڈوبا ہوا تھا۔ لیکن جہاں کہیں بھی میں گیا خود میں نے تو غیر معمولی انسان ہی دیکھے۔ ہندو، سکھ، مسلمان۔ نہ مجھے کسی سے خوف ہوا نہ کسی نے مجھ پر حملہ کیا اور مجھے ایسا لگا کہ دراصل یہ فسادات، یہ خون خرابہ [illegible] اور دھاڑ اس وقت ہوتی ہے جب تعصب اور نفرت کا اندھیرا چھایا ہوتا ہے اور اس اندھیرے میں ہر راستہ چلتا ایک خونی اور ڈاکو نظر آتا ہے اور ایک دوسرے کا خوف ایک دوسرے پر حملہ کراتا ہے، ایک دوسرے کا خون کراتا ہے۔

اور اپنی یادداشت کے اندھیرے میں اب بھی میں اس گمنام انجانے ہمراہی کے قدموں کی آواز سنتا ہوں اور جب میں مڑتا ہوں اور ہم آمنے سامنے ہوتے ہیں تو اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔

"کون ہو تم؟ کیا نام ہے تمہارا؟"

اور میں بے خوفی اور کسی قدر فخر سے جواب دیتا ہوں۔ "احمد عباس۔ خواجہ احمد عباس۔ جو چوالیس برس ہوئے پانی پت میں پیدا

ـا۔ پانی پت جواب بھی ہندوستان میں ہے اور میرے نانا تھے خواجہ سجاد حسین جنھوں نے بچّوں کی تعلیم کے لئے اپنی ساری دولت، ساری ر ساری طاقت خرچ کردی اور میرے والد تھے خواجہ غلام السیدین جنھوں نے مجھے سچ بولنا سکھایا کسی کے سامنے سر نہ جھکانا سکھایا اور اسی اختلافات میں رواداری سکھائی اور میری والدہ تھیں مسرورۃ النساء بیگم جنھوں نے اسکول کالج میں تعلیم نہیں پائی تھی نہ کسی سیاسی جلسے شریک ہوئی تھیں لیکن جو آخری دم تک اپنے ملک ہندوستان کی وفادار رہیں...... مگر میں اپنے خون کے رشتے داروں ہی کی اولا ہوں۔ میں اپنے ملک اور قوم کی اولاد بھی ہوں۔ گاندھی اور نہرو کے خاندان میں سے ہوں اور انسانیت اور سوشلزم کے ناطے سے ے رشتے دار ساری دنیا میں ـــــ روس میں اور امریکہ میں، انگلستان میں اور چین میں ـــــ پچھڑے ہوئے ایشیا اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ مجھ پر (اور ہر شخص پر) اثر انداز ہوتا ہے کیونکہ جیسا ایک یورپین شاعر جان ڈان JOHN BONNE نے کہا ہے:

"کوئی انسان جزیرہ نہیں ہے۔
ہر انسان سمندر میں ایک قطرہ ہے۔
ہر انسان زمین کا ایک ذرّہ ہے۔
ہر انسان کی موت میری موت ہے کیونکہ میں اور انسانیت جُدا نہیں ہیں۔"

...... اور اسی طرح دن، مہینے اور برس گزرتے ہیں اور شخصیات اور واقعات کا لامتناہی جلوس گزرتا رہتا ہے اور جس طرح کیمرے فلم پر ہر منظر کا عکس (خواہ وہ صاف ہو یا دھندلا) پڑنا ضروری ہے اسی طرح ان واقعات اور شخصیّات کا اثر قبول کرنا بھی میرے لئے ہر کسی کے لئے لازمی ہے۔ یہ سلسلہ ہر انسان کی پیدائش کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور موت سے پہلے یہ ختم نہیں ہو سکتا۔



راجندر سنگھ بیدی

"........ مجھے مذہبی کتابوں کی ضرورت نہیں کیونکہ ان باسی کتابوں سے اچھی کتابیں خود لکھ سکتا ہوں۔ مجھے اُستاد یا کسی شاگرد کی تلاش نہیں کیونکہ ہر آدمی آپ ہی اپنا اُستاد ہو سکتا ہے اور آپ ہی اپنا شاگرد — باقی دکانیں ہیں...."

مجھے آج تک پتہ نہ چل سکا کہ میں کون ہوں؟

اس جملے سے اگر کوئی یہ مفہوم عکس کرلے کہ میں انکسار کر رہا ہوں تو یہ غلط ہوگا۔ بہت ممکن ہے کہ جو آدمی کسی دوست کے سامنے نہیں جھکتا یا کسی خاص مکتبۂ خیال، مذہبی عقائد یا دعووں کی پروا نہیں کرتا وہ انکسار کا پتلا ہو اور وہ آدمی جو ہر ایک سے جھک جھک کر ملتا ہو تکبر، انا کا گھناؤنا نمونہ ہو۔ میرا خیال ہے انکسار کا مظاہرہ کرنے والا شاید زیادہ خطرناک انسان ہو سکتا ہے۔

"اپرادھی دونا نیسویں۔ جیوں ہنتا ہرکنہ (گرنتھ صاحب)

(مجرم دگنا جھکتا ہے جیسے ہرنوں کو مارنے والا شکاری۔)

میں جانتا ہوں کہ سیدھے سادے مزاج کا آدمی ہوں، لیکن مجھ پر ایسے لمحے بھی گذرتے ہیں کہ مجھے باہر سے دیکھنے والا بُری رائے بھی قائم کر سکتا ہے۔ ایسے لمحے اس وقت آتے ہیں جب کوئی ادبی تخلیق کرنے بیٹھوں۔ موضوع میرے ذہن میں ہو۔ بات نئی اور نرالی ہو۔ اور اسے بیان کرنے کے انداز پر مجھے اندرونی قوت کا احساس ہو۔ اس وقت یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں خود کو اپنے سے علیحدہ کرکے دیکھ رہا ہوں۔

ہٹ جاؤ میں آ رہا ہوں!

باادب با ملاحظہ ہوشیار!

با.... ہوشیار! ..... شہنشاہوں کے شہنشاہ سلطان اعظم راجندر سنگھ بیدی تشریف فرما ہوتے ہیں۔

چونکہ اس قسم کے احساس کے بغیر لکھنا آسان نہیں۔ اس لئے میری یہ لمحاتی اکڑفوں بعید از قیاس نہیں ہو سکتی! اس وقت کاغذ اور میرے درمیان کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ اس لئے اس سے کسی دوسرے کے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا اپنے گھر بیٹھ کر ایک آدمی کسی کو کالی داس یا شیکسپیئر سمجھ لے تو اس میں کسی دوسرے کا کیا جاتا ہے؟ البتہ لکھنے اور ناشر تک پہنچنے کے دوران بھی اگر وہ آدمی خود کو عظیم سمجھتا رہے تو یقیناً وہ بڑا احمق آدمی ہے۔

ہاں تو میں کون ہوں؟

عام طور پر یہی دریافت کیا جاتا ہے کہ فلاں آدمی کون ہے؟ یا کیا ہے؟ مطلب یہ کہ کیا کام کرتا ہے؟ میرے متعلق یہ دونوں سوالات فالتو ہیں۔ کیونکہ چند آدمی مجھے جانتے ہیں۔

کیا کام کرتا ہوں؟ اس سے بھی واقف ہیں۔

بھلا ہو فلموں کا جنہوں نے مجھے بدنام کر دیا۔ یہ دنیا اشتہار اور تشہیر کی دنیا ہے۔ شہرت یافتہ آدمی کی جانب لوگ آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگوں کو اپنی شہرت کی جو قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اس سے لوگ عام طور پر واقف نہیں ہوتے،

اس لئے وہ لوگ شہرت و نام آوری کی تمنا کیا کرتے ہیں۔

میں تو کچھ بھی نہیں ہماری فلموں کے جو ہیرو ہیں ان سے پوچھئے۔ کیا وہ زندگی کا ایک لمحہ بھی عام انسانوں کے مانند گزار سکتے ہیں؟ وہ تو اپنے گھر میں بھی بیوی کے لئے ہیرو بننے کی کوشش کیا کرتے ہیں ——— حالانکہ بیوی ان کی رگ رگ کو پہچانتی ہے۔ اور مسکرا کر لیتی ہے ۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش

من انداز قدت را می شناسم

اپنے آپ کو دیکھتا ہوں تو مجھے وہ کتا یاد آجاتا ہے (میں اب بھی انکسار کا مظاہرہ نہیں کر رہا ہوں) جسے ایک ڈائرکٹر نے اپنی ایک فلم میں لے لیا تھا۔

کتا فلم کی کنٹی نیوٹی میں آگیا۔ یعنی سین نمبر ۱۲ میں آیا تو سین نمبر ۱۵ میں بھی اس کی ضرورت تھی اور یہ سین چھ مہینے بعد فلمایا جانے والا تھا۔ بے چارہ اچھا بھلا کتا تھا بازار میں گھومتا پھرتا تھا۔ کوڑے کے ڈھیروں پر یا ادھر ادھر ہر جگہ کھانے کی چیزوں کی تلاش میں سر دھنتا رہتا تھا۔ لیکن فلم پر آجانے کے بعد وہ ایک سنجاف شے ——— ایک جنس بن گیا۔ جو بک سکتی تھی اس کا مول تول ہو سکتا تھا۔ اس ڈائرکٹر صاحب نے اسے باندھ کر رکھ لیا۔ اب بے چارے کو دن میں تین چار وقت کھانا ملتا تھا۔ سونے کے لئے نرم گدے تھے۔ زکام ہو جانے پر ڈاکٹر طلب کیا جاتا اور ہر آدمی کے آنے پر وہ کتا زور زور سے اپنی دم ہلاتا تھا۔ جس کے جواب میں نہیں ٹھوکریں ملتیں اور وہ چیں چیں کرتے ہوئے وہاں سے بھاگ جاتے لیکن گھوم پھر کر وہیں ..... وہی حیرانی، وہی اپنی اوقات کا علم، وہی گالی۔

ڈائرکٹر کتا نہیں۔ کوئی انسان ہے۔

یہ اس آدمی کی حالت ہے جو شہرت ملنے پر بہک جائے یا زندگی میں کسی عہدے یا کرسی کا بھوکا ہو۔ پیسہ چاہتا ہو جس سے وہ ہر چیز خرید لینے کی قوت حاصل کر سکے۔ قانون، مذہب، سیاست سب کو اپنی جیب میں ڈال لے۔ تو لیتا کے ہیرو کی مانند کسی ذہنی یا نفسیاتی الجھن کا شکار ہو جائے۔ مزا اڑائے اور لوگ داد دیں۔

یہ بڑے لوگوں کے چو نچلے ہیں۔

شہرت، دولت، کرسی ایسی خطرناک چیزیں ہیں کہ ہر شریف آدمی انہیں ترک کرنا چاہتا ہے۔ لیکن جیسا کہ کسی نے کہا ہے میں تو کمبل چھوڑنا چاہتا ہوں لیکن کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ لیکن یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ وہ آدمی واقعی ان چیزوں کو ترک کرنا چاہتا ہے یا خالی باتیں ہی کرتا ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میرے ایک پرستار مجھے مل گئے جنہوں نے میری چند کہانیاں پڑھی تھیں وہ ان بزرگوں میں سے تھے جو زندگی کے اسرار جانتے ہیں۔ ادھر ادھر کی دو چار باتیں کرنے کے بعد وہ براہ راست مطلب کی بات پر آگئے۔

"بیدی صاحب! آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔"

"جی؟" میں نے گھبراتے ہوئے کہا۔ "میں جی (پنجابی لہجے میں) ..... جی میں کچھ بھی نہیں۔"

اور جب انہوں نے میری باتوں سے اتفاق کا اظہار کیا تو مجھے بڑا غصہ آیا۔

"میں کون ہوں؟ ـــــ کیا ہوں؟" کے سوال تو ختم ہو چکے۔ درحقیقت یہ سوالات مجھ پر لاگو ہی نہیں ہوتے۔ میں تو اور لوگوں میں سے ہوں، جن سے پوچھنا چاہئے۔

"آپ کیوں ہیں، یعنی کہ کیوں؟"

یہ بھی میں نہیں جانتا۔

دنیا میں کروڑوں انسان ہر روز پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان ہی میں ایک میں بھی اچانک ایک دن پیدا ہو گیا، ماں کو خوشی ہوئی ہوگی۔ باپ کو خوشی ہوئی ہوگی۔ لیکن دائیں ہاتھ کی طرف رہنے والے پڑوسی کو علم بھی نہ ہوا اور پڑوسی کو علم ہونا کوئی اچھی بات نہیں۔ وہ ضرور مبارک باد دینے آیا ہوگا۔ لیکن محض دنیاوی رسم و رواج کے ناطے۔ ورنہ میرے پیدا ہو جانے سے کونسی خوشی ہو سکتی تھی؟ اُلٹے اس لین دین کی دنیا میں اس کے بیٹے پنا لال کا ایک حریف پیدا ہو گیا۔ اس کی پیدا ہونے والی لڑکی کے لئے ایک خواہ مخواہ کا خطرہ! تو گویا ایک قاعدہ بنا ہوا ہے کہ راجندر سنگھ بیدی پیدا ہوں تو مبارک باد دو۔ چوہڑ سنگھ پیدا ہو تو مبارکباد دو۔ ڈھلو رام یا چمن خان آ جائیں تو خوشیاں مناؤ۔ ڈھول بجاؤ۔ ٹیگور کا قول ہے دنیا میں ہر روز جو اتنے انسان پیدا ہوتے ہیں اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ ابھی بھگوان انسان بنانے سے مایوس نہیں ہوا۔ بھگوان بھی ہنسی ہنسی میں کتنا ظلم کرتا ہے چونکہ وہ مایوس نہیں اس لئے انسان بنائے جا رہا ہے۔

بیکار مباش کچھ کیا کر
پاجامہ ادھیڑ کر سیا کر

چنانچہ بھگوان کے پاجامے کا ایک ٹانکا یعنی پہلی ستمبر ۱۹۱۵ء کی صبح کو تین بج کر سینتالیس منٹ پر لاہور میں ٹیگور کے قول کا ثبوت فراہم کرنے کے لئے پیدا ہوا۔ رام اور رحیم انسانوں کے مانند بھول گئے کہ دنیا دکھ کا گھر ہے ـــــ ورنہ مجھے اس دنیا میں بھیجنا ان کی کونسی رحمت ہے؟ بلکہ ہمارے شاستر کے مطابق تو یہ ان کا انتقام لینے کا انداز ہے۔ پچھلے جنم میں کوئی کرم کیا ہوگا جسے بھگوان کی رحمت بھی دھونے کی طاقت نہیں رکھتی!

ہر ماں باپ کی تمنا ہوتی ہے کہ ان کا بیٹا بڑا ہو کر کلکٹر بنے۔ میرے ماں باپ کی بھی یہی تمنا تھی۔ اس تمنا میں ان بیچاروں کا قصور بھی کیا تھا۔ ان کے سوچنے کی حد کلکٹر کے عہدے تک ہی تھی۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ کوئی ایسا بھی ہو سکتا ہے جس کے سامنے کلکٹر بھی پانی بھرے۔

جس طرح ایک سادہ لوح جاٹ مال گزاری کی ادائیگی کے سلسلے میں تحصیلدار کے سامنے پیش ہوا اور جب تحصیلدار نے اس کے حق میں فیصلہ کر دیا تو اس نے خوش ہو کر دعا دی۔

"بھگوان کرے تحصیلدار صاحب آپ ایک دن پٹواری بن جائیں۔"

کمپٹیشن کی اس دنیا میں لوگ بڑے بڑے خطرے دے کر بات کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا حربہ ہے کہ ہر عام انسان اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ مثلاً لوگ کہتے ہیں کہ لنکن "لاگ کیبن" (لکڑی کی جھونپڑی) میں پیدا ہوا۔ اور یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکہ کا صدر بن گیا۔ اس طرح لاگ کیبن سے پریسیڈنٹ کی کہاوت چل نکلی لیکن اس کا تذکرہ کرنے والے یہ حقیقت نظر انداز کر دیتے ہیں کہ کتنے ایسے لوگ ہیں جو جھونپڑی سے نکل کر ایوان صدر تک پہنچے ہیں؟ اس فریب اور سازش کا شکار ہو کر لاکھوں کروڑوں آدمی سر ٹپک کر مر جاتے ہیں اور پھر

اجل ہے لاکھ ستاروں کی اک ولادت مہر

اس کے بعد بھی آپ اس کی خدائی سے ناانصافی کرنا چاہیں تو آپ کی مرضی!

میں ایک بیمار بچہ تھا۔ ایک بیمار ماں کا بیٹا۔ میں نے میعادی بخار کے جھکولے دیکھے ہیں جن کا مرکز خود مریض ہوتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بار بار موت کی افق کے پار پھینکا جا رہا ہے۔ میں نے نیند میں آنکھیں دھنسا کر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے ہوئے وہ ہزاروں رنگ دیکھے ہیں جو کسی عکس کی گرفت میں نہیں آتے اور دھنک بھی جن کی حد بندی کرنے سے قاصر رہتی ہے میں نے وہ آنسو بہائے ہیں جو نمکین تھے نہ میٹھے جو کسی ذائقے کی گرفت میں نہیں آتے اور پیار اور پیار کرنے والے ماں باپ بھائی بہن یا محبوبہ بھی جنہیں پونچھ سکتے! ـــــ سیکڑوں بار کسی ڈراؤنے ویرانے میں اکیلا رہ گیا ہوں اور شدت خوف میں مجھے محسوس ہوا کہ کروڑوں میل تک میرے قریب کوئی نہیں، خود میں بھی نہیں، بیسوں بار میں نے انگلستان کا وہ بازار یا بنارس کا وہ گھاٹ دیکھا ہے کہ جہاں میں پچھلے جنم میں پیدا ہوا تھا ـــــ باڑھ کے بعد گنگا پیچھے سرک گئی ہے۔ اور ساحل کے قریب سرخ اور زرد ملی جلی مٹی کے نیچے ہزاروں چھوٹی چھوٹی لہریں چھوڑ گئی ہے جہاں پیر پڑتا ہے تو ایک اور لہر ابھرتی ہے۔ اور وہاں آٹھ نو سال کا ایک کالا کلوٹا بچہ ننگا، کمر کے گرد سیاہ دھاگہ باندھے اور سر پر پٹیلا لئے کھڑا ہے اور وہ میں ہوں ...!

قبل اس کے کہ میں بڑا ہو کر اپنی نسوں کو بدکاری اور کاروباری ہتھکنڈوں میں برباد کر لیتا۔ میرے جسم کے رگ پٹھے ختم ہو چکے ہیں۔ ذرا سی بات ناراضی اور غصہ۔ خفیف سی بات پر ریں ریں روں روں ـــــ ماں جھنجھلا کر مجھے دور پھینک دیا کرتی تھیں، کیونکہ میں اس کی بیمار چھاتی تک چچوڑ ڈالتا تھا ـــــ ماں تم بہو نہ رہو بلکہ مجھے میرا دودھ دے دو۔ اور ماں کہیں نہیں ہے۔ اس کا مطلب جانتے ہیں ماں کہیں نہیں ہے۔ ہاں ایک بار پھینکنے کے بعد بے پایاں ممتا کے جوش میں ماں مجھے پھر اٹھا لیا کرتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ مجھے رکھے یا پھینک دے۔ میں کئی بار مرا اور کئی بار زندہ ہوا۔ ہر چیز کو دیکھ کر حیران، ہر حادثہ کے بعد پریشان، میری حیرانی اور پریشانی کی کوئی حد نہیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا۔ مری جنم کنڈلی دکھائی گئی۔ جوتشی نے کہا۔ یہ لگن میں کیتو ہے۔ برہسپت اپنے گھر کا ہے اور بدھ پر نظریں ڈالتا ہے۔ یہ بچہ ایک بڑا فنکار بنے گا۔ لیکن شنی کی نظریں بھی ہیں۔ اس لئے نام اور شہرت مرنے کے بعد ہی حاصل ہوگی۔ سورج طلوع ہو رہا ہے۔ دولت کے خانے میں شکر ہے جسے سورج نے اپنی تیز روشنی سے ماند کر دیا ہے۔ چونکہ شنی شکر کو دیکھتا ہے اس کی زندگی میں بیسوں عورتیں آئیں گی۔ شنی اور شکر کا یہ میل شاید اسے کوٹھوں پر بھی لے جائے۔ لیکن برہسپت کے خانے کے سبب کبھی اس کو بدنامی نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ منگل کبھی سنیچر کے ساتھ

ہے۔ حالانکہ دونوں ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں لیکن منگل پھر منگل ہے اثر تو ہوگا ہی کام چلتے چلتے ایک دم سے رک جائے گا۔ جس گھر میں راہو ہے جسے منگل دیکھ رہا ہے اس کی بیوی ہمیشہ بیمار رہے گی۔ گویا میرے باپ کی بیوی بیمار، دائم المریض اور میری بیوی شاید پورے خاندان کو بددعا لگی تھی۔

چنانچہ ایک بیوی کی زندگی تباہ کرنے اور چند بچوں کا مستقبل خراب کرنے کے سوا میں نے آج تک کوئی دوسرا کام نہیں کیا۔ ورنہ اگر کوئی زندہ بخش نہ تخلیقی کام کیا ہے تو یہی کاغذ سیاہ کرنا، چند کتابیں لکھ ڈالنا اور پھر خود ہی انہیں خریدنے چل دینا ـــ چند فلمیں فیل کرانا ـــ

چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

میری ماں برہمن تھی۔ اور میرا باپ چھتری۔ اس زمانہ میں اس قسم کی شادی گریٹنا گرین (ایک مقام، جہاں بھاگے ہوئے لوگ شادی کرتے ہیں) میں بھی ہونا ممکن نہ تھی لیکن ہوگئی۔ میرے ماں باپ ایک دوسرے کے احساسات وخیالات کا بڑا لحاظ کیا کرتے تھے۔ اس لئے گھر میں ایک گرنتھ صاحب پڑھا جاتا تھا تو دوسری طرف گیتا کا پاٹ ہوتا تھا۔

ابتدائی کہانیاں جو بچپن میں سنیں وہ جن اور پریوں کی داستانیں نہ تھیں بلکہ "مہاتم" تھے جو گیتا کے ہر باب کے بعد ہوتے ہیں جنہیں ہم ماں کے پاس بیٹھ کر بڑی عقیدت سے سنا کرتے تھے۔ چند باتیں تو سمجھ میں آجاتی تھیں جیسے راجہ، برہمن، شیطان۔ لیکن ایک بار۔

"ماں! یہ رنڈی کیا ہوتی ہے؟"

"ہوتی ہے۔ آرام سے بیٹھو۔"

"اوہوں۔ بتاؤ نا رنڈی ...."

"چپ رہو۔"

اور پھر وہ جذبۂ ترحم جو ماں کے سینے ہی میں اٹھ سکتا ہے۔ جب وہ اپنے بچے کے چہرے کو کملایا ہوا دیکھتی ہے۔

"رنڈی بری عورت کو کہتے ہیں۔"

"تم تو اچھی عورت ہو نا ماں؟"

"ماں ہمیشہ اچھی ہوتی ہے ـــ کسی کی بھی ہو۔"

"تو پھر بری کون ہوتی ہے؟"

"تو تو سر کھا گیا آج۔ بری عورت وہ ہوتی ہے جو بہت سے مردوں کے ساتھ رہے۔"

میں سمجھ گیا۔

لیکن اگلے دن مجھ پر وہ جوتے پڑے کہ بس۔ ہوا یہ کہ میں نے پڑوس میں ساوتری کی ماں کو رنڈی کہہ دیا۔ کیونکہ اس کے گھر میں دیور، جیٹھ اور دوسرے اسٹنٹ کے بہت سے مرد رہتے تھے۔

چنانچہ میری بقیہ زندگی بس ایسی ہی ہے۔

ادھر میں نے کوئی سوال کیا اُدھر زندگی نے کہا۔

"چپ رہو!"

اور اگر کبھی جواب دیا بھی تو ایسا کہ میں اسے سمجھ ہی نہ سکوں اور سمجھ لوں تو جوتے پڑیں۔

میری جسمانی کمزوریاں، نسواں کا الجھاؤ، میرے سوالوں کا مناسب سا جواب نہ دینا۔ خود میرا ان جوابوں کی اہمیت کو نہ سمجھنا یہ تمام ایسی باتیں ہیں جو کسی بھی بچے میں خودی کا شعور پیدا کر سکتی ہیں۔ اور بچہ ضرورت سے زیادہ حساس ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ زندگی گھپ اندھیرے کے ساتھ ساتھ خلا بھی ہے۔ مقام ہو ہے بیسیوں ذہنی خطرات ہیں ایسے خیال ہیں جو ہر وقت دل میں اندیشے پیدا کرتی رہتی ہیں جس طرح بجلی کا معمولی سا جھٹکا بھی دل و دماغ میں تھرتھری پیدا کر دیتا ہے ــــ اس پر مستزاد حادثات اور تجربات ہیں جو ہر ادیب کی زندگی میں آتے ہیں۔ وہ ان سے سبق لیتا ہے۔ ان سے متاثر ہوتا ہے اور پھر انہیں کاغذ پر منتقل کرتا ہے

یوں تو میں پانچ سال کی عمر میں رامائن اور مہا بھارت کی داستانوں اور ان کے کرداروں سے متعارف ہو چکا تھا۔ بلاشبہ رامائن ایک اہم کتاب ہے اس میں کتنے ہی خوبصورت ہزاروں گن والے اور قناعت پسند کردار رہتے ہیں۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے رامائن کے تمام کرداروں میں سب سے زیادہ ہمدردی صرف سگریو کے ساتھ ہوئی جس کا بڑا بھائی بالی اس کی بیوی تک کو اٹھا لے جاتا ہے اور وہ بیچارہ ٹک ٹک دیکھتا رہ جاتا ہے!

اگر بھگوان رام ادھر نہ جا نکلتے تو بے چارہ سگریو انشا رہا ہی رہ جاتا! اسی طرح مہا بھارت میں بھی مری دلچسپیوں کا مرکز صرف ایک ہی کردار ہے شکھنڈی جسے درمیان میں رکھ کر بھیشم پتامہ کو مارا جاتا ہے۔

ورنہ وہ بھلا مر سکتے؟

آج تک زندہ رہتے!

ماں کی علالت کے باعث میرے پتا جی ایک پیسہ یومیہ کے کرائے پر بازار سے کوئی نہ کوئی کتاب لے آتے افسانے کے قریب بیٹھ کر انہیں سنایا کرتے میں بھی پائینتی بیٹھا سنا کرتا۔ اسکول جانے کی عمر کو پہنچتے تک میں تاڑ کے رجستان اور شرلاک ہومز کے کارناموں سے متعارف ہو چکا تھا اور میں حیران ہوتا تھا کہ ہر آدمی کیوں ہر بار کسی نئی عورت سے گڑبڑ کرتا ہے! اس وقت تک میں جان چکا تھا کہ عورتوں کے پیچھے بھاگنا کوئی شرافت کی بات نہیں۔ اور یہ عورت بے حد گندی شے ہے......!"

اس کے بعد میرے چچا نے ایک اسٹیم پریس خرید لیا جو جہیز میں پانچ چھ ہزار کتابیں لایا پرائمری سے مڈل کلاس تک پہنچتے پہنچتے میں نے وہ تمام کتابیں چٹ کر ڈالیں۔ میں وہ نقرئی کیڑا تھا جو ہر پرانی کتاب کے درمیان میں پایا جاتا ہے وہ بک مارک جسے ہر ٹریڈ پبلشر نئی کتاب میں رکھ دیتا ہے۔

تھیوری کی حد تک میں تقریباً ہر چیز سے متعارف ہو چکا تھا۔ لیکن عملی طور پر سب چیزوں سے نامانوس تھا.... تھیوری

ردعمل کے درمیان فاصلے کے باعث جو تباہی ہوسکتی تھی ہوئی اور میں ہر تجربے کی صلیب پر چڑھا۔

شاید میرے لئے ضروری بھی تھا۔

زندگی کی اس قسم کی بنیادی باتیں تفصیل سے بتا دینے کے بعد حادثات کا ذکر کرنا فضول ہوگا۔ یہی نا کہ —— میں نے میٹرک پاس کیا۔ کالج میں داخل ہوا۔

انگریزی اور پنجابی میں شعر کہے۔

اردو میں افسانے لکھے۔

ماں چل بسی

ڈاکخانے میں ملازم ہوگیا

شادی ہوئی، بچہ ہوا

پتا چل بسے

بچہ چل بسا

نو سال ڈاک خانے میں ملازمت کی

ریڈیو میں چلے گئے

بٹوارہ

خون خرابہ ...... تباہی

خون میں لتھڑے ہوئے جسم

ریل کے ڈبے کی چھت پر ننگے دلی پہنچے

اسٹیشن ڈائرکٹر جموں ریڈیو اسٹیشن ا

ریاست کی رعایا کی حکومت سے جنگ .....

پھر بمبئی

اچھی فلمیں

بری فلمیں

درمیان میں کبھی کبھی کہانیوں کی کسی کتاب پر ہاتھ قلم کرتے رہے۔

ہاتھ قلم ہوتے سنے ہیں۔ دیکھے نہیں۔ مرزا غالب لکھتے ہیں —

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں

ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

پھر کئی مصیبتیں، ایسے لمحے جو کسی بُدھ پر بھی نہ گزرے۔ ایسے لمحے جنہیں آجال بھی نہ جھیل سکا۔

بیوی میں دلچسپی کا خاتمہ

بیوی سے محبّت کا خاتمہ

سبب؟

ادھیڑ عمری کا پاگل پن۔

بڑے بیٹے کا مجھے کاروباری طور پر بے وقوف سمجھنا اور میرا اسے صرف پیسے کا پجاری اور غیر ذمے دار سمجھنا۔۔۔ بھلا کوئی بات ہوئی!

میری تمنائیں کیا ہیں؟ — کوئی نہیں۔

میری اُمیدیں کیا ہیں؟ — کوئی نہیں۔

اور مایوسیاں کیا ہیں؟ — کوئی نہیں۔

میں عقل مندی کے باعث کسی عورت سے محبت نہیں کرتا اور وہ بے وقوفی کی وجہ سے مجھ سے پریم نہیں کرتی۔ اس لئے کہ میں ہوس و محبت کا فرق پہچانتا ہوں!

بدقسمتی سے میری ایک ہی خواہش ہے کہ میں لکھوں پیسے کے لئے، کسی پبلشر کے لئے نہیں۔

میں بس لکھنا چاہتا ہوں۔

مجھے مذہبی کتابوں کی ضرورت نہیں کیونکہ ان باسی کتابوں سے اچھی کتاب میں خود لکھ سکتا ہوں۔

مجھے اُستاد یا کسی شاگرد کی تلاش نہیں کیونکہ ہر آدمی آپ ہی اپنا استاد ہو سکتا ہے اور آپ ہی اپنا شاگرد!

باقی دکانیں ہیں۔

میں نے ہرے ہرے پتوں اور چنبیلی کے پھولوں سے گفتگو کی ہے اور ان سے جواب لیا ہے۔ میں گاگ بھاشا (جادو سحر) جانتا ہوں۔ میرا کتا مجھے سمجھتا ہے اور میں اُسے۔

مجھے سچ اور جھوٹ کے جھگڑوں سے کوئی غرض نہیں!

اگر بھگوان انسان بنانے کی جسارت کرتا رہتا ہے تو میں انسان ہو کر بھگوان بناتے رہنے کی حماقت کیوں کروں!

اگر اس عظیم ذات کو میری ضرورت ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ صلح و آشتی کے کسی ایسے لمحے میں جو ماضی اور مستقبل کی گرفت سے آزاد ہو۔ مجھے خود ہی تلاش کرلے گی۔

میں ایک انسان کی مانند زندہ رہنا چاہتا ہوں ایک ایسے مقام پر پہنچنے کی تمنا رکھتا ہوں تمنا سے بے نیاز ہو کر جسے ہم درویشوں کی اصطلاح میں "عالم حالات" کہتے ہیں اور جو صرف جاں کا دی کے بعد ہی آتے ہیں۔

اور! ....

میں نہیں جانتا! ....!



مصنفہ کی تازہ تصاویر: نومبر ۱۹۷۹ء

قرۃ العین حیدر

"........رشک مجھے صرف دو طرح کی خواتین و حضرات پر آتا ہے، ایک بھرت ناٹیم ڈانسرز۔ دوسرے وہ لوگ جو آکسفورڈ یا کیمبرج میں رہ کر علمی کام کرتے ہیں۔ اگر میں ایک مسلم گھرانے پیدا نہ ہوتی اور ایسا مسلم گھرانا جو ماڈرن ہونے کے ساتھ ساتھ قدامت پرست بھی تھا تو میں نے یقیناً بھرت ناٹیم میں مہارت حاصل کی ہوتی ...... اور اگر مجھ میں DRIFT کرنے کی عادت اور سستی نہ ہوتی تو میں یقیناً اوکس برج میں مستقل قیام کرتی....."

اینکر لائن کا ایس ایس سائیلیشیا، انگلستان سے واپس آرہا تھا۔ ایک شام مغرب کے وقت میں عرشے پر ریلنگ سے ٹک کر بحیرہ روم کی لہروں کو ملاحظہ کر رہی تھی جب اماں نماز پڑھ کر اپنے اسٹیٹ روم سے برآمد ہوئیں اور قریب آکر بیٹھ گئیں۔ اور چند منٹ خاموش رہنے کے بعد کہا "اللہ سے دعا مانگو کہ وہ تم کو عقل دے۔"

ہمارے بہی خواہ میرے لئے ہمیشہ سے یہی دعا مانگتے آئے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اسے آج تک نہ سنا۔ اس نے سب کچھ دیا اِلّا دنیاوی و مالی معاملات کی سوجھ بوجھ۔ ہوشیاری اور کومن سنس کے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو دنیاداری کی عقل سے مالا مال ہیں کوئی مضائقہ نہیں اگر وہ جیرالڈ مینلے ہوپکنز یا دستر یا متیس سے ناواقف ہیں۔

مثال کے طور پر آپ بیتی لکھنے کا معاملہ۔ آپ بیتی عام طور پر اپنی پیدائش سے شروع کی جاتی ہے اور چند سطور یا پیراگراف یا صفحات خاندان کے متعلق۔ میں نے اس کے لئے تیرہ سو سال کھنگال ڈالے۔ اس سے بھی قبل ابراہیمؑ اور باب عشتار تک۔ کیونکہ مجھے تاریخ سے ازحد دلچسپی ہے۔ اور میں اپنے عرب، عراقی، ایرانی، تورانی اور ہندوستانی ورثے کو آپ بیتی میں شامل اور اس کا ایک لازم حصہ سمجھتی ہوں۔ ہیلے مصنف کی کتاب ROOTS نے ان دنوں مغرب میں دھوم مچا رکھی ہے ناچیز نے "کارِ جہاں دراز ہے" (جلد اوّل) اس سے بہت پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ بلکہ اس سے بھی قبل جب والد کا انتقال ہوا ان کے تیسرے چوتھے دن سے بیٹھ کر میں نے بچپن کی کہانی لکھنی شروع کی کیونکہ اس وقت مجھے شدت سے یہ احساس ہوگیا تھا کہ یہ دور ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا ہے۔ اسے ریکارڈ کر لینا ضروری ہے (وہ کہانی تلف ہو چکی ہے) والدہ کو بھی آپ بیتی لکھنے کا عارضہ لاحق تھا۔ انھوں نے ۱۹۰۸ء سے روزنامچہ لکھا جو برسوں تہذیب نسواں اور عصمت میں چھپا کیا۔ پھوپھی زاد بہن فاطمہ خاتون مستقل کنبے کی اور اپنی زندگی کے متعلق عصمت میں لکھا کرتی تھیں۔ چچی وحیدہ (بیگم نصیر الدین حیدر) اپنی شادی سے قبل ۱۹۱۱ء کے شروع میں اپنا روزنامچہ لکھتی تھیں جو عصمت میں چھپتا تھا۔ ثابت یہ ہوا کہ انسان بہت سی باتیں ہیں جن کے متعلق سوچتا ہے کہ ان کو قلمبند کرنا ضروری ہے۔ بشرطیکہ صورت میں لطیفہ، جگ بیتی یا آپ بیتی۔ یا بطور ذاتی فلسفہ۔ شاید ۵۵ء میں اسد اللہ شاہ بخاری نے نیویارک سے لکھا کہ میں ادیبوں کے اپنے فلسفۂ حیات پر ایک کتاب مرتب کر رہا ہوں۔ "زندگی نے مجھے کیا سکھایا" وغیرہ تم بھی اپنا فلسفۂ زندگی بھیجو۔ میں نے جواب دیا بخاری صاحب "آنسوؤں کی وادی" میں ابھی اتنا وقت نہیں گزرا کہ کوئی باضابطہ فلسفۂ حیات مرتب کرسکوں یا فیصلے صادر کردوں۔ ممکن ہے آج سے ... بیس سال بعد کچھ بات بنے۔ تو آج ۸۰ء میں بھی معلوم ہوا کہ کوئی ذاتی فلسفہ مرتب ہو ہی نہیں سکتا۔ سب گھپلا ہے۔

نقوش نے شاید ۵۵ء میں شخصیات نمبر شائع کیا تھا۔ اس کے لئے محمد طفیل نے کمانڈر حسن عسکری (ابن سعید) سے ناچیز پر مضمون لکھوایا اس مضمون پر میں نے فٹ نوٹ کا اضافہ کیا۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:-

"ہم بہت ذوق و شوق سے رسالہ شمع بھی پڑھتے ہیں جب سارے بہن بھائیوں کی محفل جمع ہو کر ایک چنڈو خانہ بن جاتا ہے۔ ایک کمرے میں ایک بھائی صاحب پیانو سے شغل فرما رہے ہیں۔ گیلری میں چوہے دوڑ بلّی آئی کھیلا جا رہا ہے۔ برآمدے میں باضابطہ کرکٹ میچ ہو رہا ہے متواتر

فون کی گھنٹی بج رہی ہے اور کوئی نہیں سنتا۔ سب ایک دوسرے پر حکم چلا رہے ہیں۔ ہماری بڑی بھابی صاحبہ ڈاکٹر ہیں اور ایئر فورس میں فلائٹ لفٹننٹ۔ مگر ان کا یہ عالم ہے دنیا بھر کی فضولیات خرافات سے انھیں سخت دلچسپی ہے۔ قصہ یہ ہے کہ مجھے اپنا احوال رقم کرنے سے پہلے اپنے سارے گھرانے کا احوال رقم کرنا پڑے گا کیونکہ میں ان سب سے علیحدہ کوئی انوکھی ہستی قطعی نہیں ہوں۔ (انفرادیت وغیرہ ابن سعید نے جو عالمانہ الفاظ استعمال کیے ہیں وہ سب گپ بازی ہے) ایک روز ہم لوگ گھاس پر بیٹھے نہایت اطمینان سے سنگترا کو کیدار میں منتقل کرنے میں مصروف تھے جب ایک بھائی نے اچانک یہ انکشاف کیا کہ ایک چیز از بس ہم دوسروں میں ہمیشہ تلاش کرتے رہتے ہیں شدید ذہانت اور شدید مزاحی حس۔ فی زمانہ یہاں دونوں چیزوں کا تقریباً فقدان ہے۔ غالباً ہماری اپنی "خصوصیات" بھی زیادہ لوگوں کے پلے نہیں پڑتیں۔ اور اسی لئے دو دوسرے ہی گھاس پر سے اٹھ کر کینیڈا چلا گیا۔

پہلے اور اپنے قبیلے کے متعلق اس قدر نوٹس کا اضافہ کرنے سے قبل یہ بھی عرض کر دوں کہ ہم لوگ خود غلط نہیں ہیں۔ ہمارا جو معاشرہ ہے جس طرح ہمارے ذہنوں کی تشکیل کی جاتی ہے اور جو ہمارے یہاں کے موجودہ حالات ہیں ان کی وجہ سے لوگ یا تو احساس برتری کا شکار ہیں یا احساس کمتری میں مبتلا۔ ہر فرد کسی نہ کسی طرح کے COMPLEX میں گھرا ہوا ہے۔ میں ان لوگوں کو بہت قابل قدر سمجھتی ہوں جو ہر ماحول اور ہر موقع پر نارمل رہتے ہیں۔ رہی ہماری شخصیت تو بھئی یہ تو ایک بڑا جدید قسم کا خوفناک لفظ ہے۔ شخصیت مولینا ابوالاعلیٰ مودودی اور بیگم رعنا لیاقت علی خان کی ہوتی ہے۔ ہم اور ہماری شخصیت — یہ کیا مسخرہ پن ہے۔"

یہ آخری جملہ بہت مشہور ہو گیا تھا۔ اُس وقت ن۔ م۔ راشد نے زندگی کے متعلق میرے رویے کو "اسکول گرلش" کہا تھا، تو سنس آف ہیومر کے ساتھ چیزوں کو ان کے صحیح تناظر میں دیکھنے کی بدولت، SCHOOL MARMISH اپروچ تو میری آج تک نہ بن سکی۔ ایک انکشاف یہ بھی ہوا ("ڈاکٹر جانسن کے ساری عمر نثر بولتے رہنے کی طرح) کہ لکھنے میں زیادہ BLAA، BLAA اور عملی زندگی میں اکثر نہایت بیوقوف۔ دراصل میری ساری اپروچ ہر معاملے میں ذہنی اور جذباتی یعنی EMOTIONAL (SENTIMENTAL ہرگز نہیں) پریکٹیکل بہت کم۔ اور ہر چیز اور انسان حیرت انگیز ہیں۔ اور دنیا کی ساری کہانی اور اس کا پھیلاؤ اور اس کا اختصار یعنی فنا۔ اور اس کی بقا۔ تو کیا آپ بیتی شروع کرنے کے لئے میں کوہ آرارات نہ جاؤں؟

لہٰذا میں اچھی چیزوں سے بے حد محظوظ ہوتی ہوں۔ ذرا سی خوشی بے انتہا ELATION اور ذرا سی فکر اور پریشانی بے حد "ڈپریس کرتی ہے اور میں HUMBUG اور منافقت کو کبھی برداشت نہ کر پائی۔ اور میں نے ملکوں ملکوں گھوم کر بہترین کتابیں جمع کیں اور ملکوں ملکوں انواع و اقسام کے کام کئے جن کا تعلق MEDIA اور لکھنے سے تھا۔ کراچی اور لندن میں سرکاری افسر اور جرنلسٹ اور دستاویزی فلم بھی بنائے۔ یہ سب احوال "کار جہاں دراز ہے" جلد دوم میں تفصیل سے رقم کیا یہاں مختصراً دہرانا بہتر ہے۔

انگریزی میں اخباروں میں لکھنا کالج چھوڑنے کے کچھ عرصے بعد شروع کیا الفرا سٹن نقی صاحب سب سے پہلے "پاکستان ٹائمز" میں جارج برنارڈ شا کے انتقال پر اس استاد بزرگ کے متعلق مضمون لکھا۔ پروفیسر وقار عظیم نے اسے فوراً اردو میں ترجمہ کر کے شاید نقوش میں شائع کیا اس کے بعد مزید افسانے اور نظمیں "پاکستان ٹائمز" میں، "ڈیلی ٹیلی گراف" لندن، "ایسٹرن ورلڈ" لندن۔ "پاکستان کوارٹرلی" کی ایک سالہ ادارت۔ پھر یہاں بمبئی میں تین سال "امپرنٹ" کی مینیجنگ ایڈیٹر۔ پھر ایک سال یکے از مدیران امپرنٹ (دوسرے دو مدیر نسیم ایزیکیل اور کرل چپر جی مرحوم) ۱۹۶۹ء [illegible]

تیز ہرا کاروباری نے خرید لیا جس کا نام آر. ایس. پنڈت تھا۔ انھوں نے کہا اس کا اداریہ میں لکھا کروں گا۔ میں نے کہا آپ سرمایہ دار ہیں آپ نے یہ رسالہ خریدا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ جرنلسٹ بھی ہیں۔ آپ اداریہ میں کیا لکھیں گے؟ تو پھر رسالہ بھی آپ ہی ایڈیٹ کیجیے۔ اور اسی وقت استعفیٰ دے کر گھر آئی۔ پھر السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا آٹھ سال جس میں لکھے ہوئے ناچیز کے مضامین اور فلم ریویو مقبول خواص و عوام ہوئے۔ پھر وہ مشہور واقعہ سنٹرل بورڈ آف فلم سنسرز کا تفصیل جلد سوم میں ملاحظہ کیجیے گا کہ اب اس کے تذکرے سے کوفت اور شدید بوریت ہوتی ہے۔ مگر اس سلسلے میں اور اس زمانے میں پہلے ان لوگوں نے زک دی جنکو میں نے بوجہ بیوقوفی اپنا دوست سمجھا تھا خصوصاً جن صاحب کی سنسر بورڈ میں کام کرنے کے دوران میں جنھیں مارے شرافت کے میں نے دوڑ بھاگ اور کوشش کی تھی خود ان ہی افراد نے ہی مجھے شدید نقصان پہنچایا۔ تب مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ MALE-DOMINATED سوسائٹی میں ایک خاتون کو خواہ اس کی کتنی ہی کوالیفیکیشنز اور ٹیلنٹ ہو اس طرح کی صورت حال پر متعجب نہ ہونا چاہیے۔ یہ تو پھر پسماندہ مشرق ہے۔ مغرب میں ویمنز لب کی تحریک بلاوجہ وجود میں نہیں آگئی (جہاں تک عورتوں کی ذہنی اور اقتصادی آزادی اور حقوق اور ہمسری اور خودداری کا تعلق ہے میں ویمنز لب کے ساتھ ہوں مگر اس تحریک کی اخلاقی بے راہ روی کی خلاف اور اس سلسلے میں بھیتر کی مولوی) یا آپ ذہن پرست حلقوں میں سوڈو گیری کرتی پھریئے بہت شہرت مقبولیت حاصل ہوگی اور کامیابی۔ پوچھیے یہ کون چیز ہے۔ عرض کرتی ہوں۔ السٹریٹڈ ویکلی میں میرے بے حد دلچسپ رفیق کار نے کرتر اپنے یہ اصطلاح ایجاد کی تھی۔ یہ ان دانشوروں یعنی PSEUDO-INTELLECTUAL خواتین و حضرات کی سوڈو گیری۔ ہم دونوں نے اس لائف اسٹائل اور ذہنیت پر کافی ریسرچ کی اور یہ بھی طے کیا تھا کہ ایک نہایت سوڈو گیری سے لبریز مضمون لکھیں گے یا ایک دوسرے کا انٹرویو۔ دراصل ویکلی میں چھاپیں گے اور ہمیں یقین تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے بے حد سنجیدگی سے پڑھیں گے کیونکہ یہ عام طور پر سوڈو گیری کا دور ہے۔ یا آپ زندگی کے ہر شعبے میں "سکنڈ" "فڈل" بنی رہیے۔ ورنہ آپ کو شعوری اور غیر شعوری طور پر RESENT کیا جاسکتا ہے۔ ایسا اکثر ادب میں بھی ہوتا ہے۔

تو سلسلہ آپ بیتی تاریخ وار یہ بتانا کہ اس سن میں یہ کیا اس سن میں یوں کہ ڈنڈ پیلے تیر مارا تو یہ سب "کارِ جہاں —" کی TRILOGY میں قلمبند کر لیا ہے۔ تاکہ سند رہے۔

مسئلہ سن اور تاریخ کا نہیں۔ مسئلہ سارے اسرار کا ہے۔ پارٹ آف دی … کہاں۔ اور کیا۔ اور کون۔ سرکٹ ہاؤس کے سامنے تیز چلتا میں کنارے دریا میں نے ایک سرخ گلاب کا پھول تیز زرد اور سرد پانی میں بونے کی ناکام کوشش کی اور اماں مالی سے باتیں کرتی قریب سے گزر گئیں۔ ریت پہ سے گزرتا ایک طویل سایہ اور دوپہر کے وقت تیز دھوپ میں برآمدے کے سامنے سفید دھوتی اور لپیٹے منہ دہائے بڑھی عورت آکر اکڑوں بیٹھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک خالی برتن تھا۔ اس نے کہا ہم نیا ماں آت رہن۔ نیا ڈوب گئی۔ اماں نے … دے دیے چند روز بعد وہ پھر آئی۔ ہم نیا ماں آت رہن نیا ڈوب گئی۔ تم ہر دفعہ نیا ماں آت ہو نیا ڈوب جات ہے؟ میں نے تعجب سے پوچھا۔ ہاں تو پھر کا کری۔ اس نے جواب دیا۔ دنیا کا یہی سارا ڈرامہ ہے جو بار بار دہرایا جا رہا ہے۔ تو پھر کا کری۔ تو پھر کا کری۔

دریا کے کنارے اونچے سرسبز مکان کے صحن میں اُوشا ناچ رہی تھی۔ چھُن چھُن چھُن۔ اس کے جوان والدین کی تصویر ہمارے ڈرائنگ روم کے آتشدان پر رکھی تھی۔ بانکے والد کی نوکیلی مونچھیں۔ تھری پیس سوٹ۔ والدہ بالکل سرت چندر کی ہیروئن۔ وہ کون لوگ تھے؟ کہاں گئے؟ اب ان کے متعلق بتانے والا بھی کوئی باقی نہیں۔ تاریخ کا بھی یہی مسئلہ ہے۔

اور تالاب میں سرخ کنول اور اس کے گرد اگرد شتنالی اور ہانسی کودتی پھر رہی ہیں۔ اور رات گئے وقت ان کے گھر کی چھت پر ایک کمرے میں لالٹین جل رہی تھی۔ اور ان کا ایک نوکر ایک لکڑی کے ٹکڑے کو (شاید وہ "جگن ناتھ جی" تھے) لالٹین کے سامنے رکھ کر اسے بار بار پرنام کر رہا تھا۔ میں دروازے میں متحیر کھڑی ہوں۔ وہ مجھے دیکھ کر سنجیدگی سے کہتا ہے۔ "یہ ہمارے کھُدامیاں ہیں"۔

جب سے اب تک لوگوں نے مجھ سے اپنے اپنے کھُدامیاؤں کے متعلق اسی وثوق سے بات کی ہے۔ اور شتنالی بڑی ہو کر اخبار میں پڑھا کہ ایک اطالوی فلم ڈائرکٹر کے ساتھ اٹلی چلی گئی۔ اور روم میں ایک بوتیک چلاتی ہے۔ تعجب خیز۔ اور شکارگاہ میں رات۔ ہم سب بچے، بھائی، میں صہیب، سلویا، مظفر، تھوڑی دیر کے لئے مچان پر لے جائے جاتے ہیں۔ مجھے بڑی سخت نیند آ رہی ہے۔ دور سے ایک ٹرین گزرتی ہے۔ میں چلا کر کہتی ہوں۔ وہ دیکھئے جیسے جگنوؤں کی قطار۔ اللہ میاں اماں سے کہتے ہیں لو باجی تمہاری لونڈیا بھی بڑی ہو کر افسانہ نگار بنے گی۔ پھر چھ سال پہلی کہانی لکھی۔ "کاٹھ گودام کا اسٹیشن تھا۔ رات کے بارہ بجے تھے۔ قُلی لالٹین لئے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے"۔ کہانی لکھ کر اسے خود ہی مصور بھی کرتی۔ بشیر خاں ڈرائیور قریب آ کر کھڑے ہو جاتے۔ نہایت متانت سے تصویر کشی دیکھتے اور کہتے "بی بی جینا کھانچ رہی ہیں" اور اس سے بھی پہلے ایک مرتبہ بھائی نے مجھ سے کہا آپ کے سر میں بھوسہ بھرا ہے۔ میں نے یقین کر لیا۔ چند روز بعد میری ایک ولایتی گڑیا ٹوٹ گئی۔ اس کے سر میں سے بھوسہ نکلا۔ تب بھائی کی بات پر یقین پختہ ہو گیا کہ لوگوں کے سروں میں بھوسہ ہی بھرا ہوتا ہے۔ اس کے بعد جب بھی بھائی پوچھتے بی بی آپ کے سر میں کیا ہے میں فرماں برداری اور وثوق کامل سے جواب دیتی "بھوسہ"۔

کزن پیارے میاں کو ایک مرتبہ میں نے اپنی ہوائی بندوق عطا کی جس کے بدلے میں انھوں نے مجھے اپنا میکنو سیٹ اور چڑیوں کے رنگین پر پیش کئے۔ کزن اچھّونے اپنا گڑیا کا ناشتہ دان عنایت کیا۔ میں ان کو اپنی سرخ پھولوں والی ہیٹ۔ کزن شاہجہاں بیگم بنت نواب محمود لوہارو ہوئیں آئیں۔ فرش پر اکڑوں بیٹھ کر انھوں نے بٹوے میں سے ریزگاری نکالی اسے احتیاط سے گنا اور نہایت متانت کے ساتھ کہا۔ یہ بارہ آنے ہیں میں اس کی ایک اچھی سی موٹر خریدنا چاہتی ہوں۔

ساری عمر اس گمشدہ معصومیت کی تلاش۔ کوشک۔ قرولباغ۔ دہلی۔ جمیلہ نسیمہ اور چنّی اور میں باغ کے گول چبوترے پر "ثریا کی گڑیا" ڈرامہ کر رہے ہیں۔ (یہ ڈرامہ شاید غلام عباس نے لکھا تھا اور بچوں کے اس نفیس ادب میں شامل تھا جو دارالاشاعت لاہور اور پھول اخبار نے تخلیق کیا) چنّی میری گڑیا لیڈی بلینڈا سنبھالے ہیروئن۔ پھر تینوں بہنیں کہتی ہیں تم نے یہ ڈانس دیکھا ہے؟ دیکھو وہ دونوں تالیاں بجا بجا کر گول گول چکر کاٹتی ہیں اور ایک سانس میں گاتی جاتی ہیں۔ اچیرا ہوڑیلکا ماندھری مانڈ والے۔ پھر وہ مطلع کرتی ہیں یہ گربا ہے ہم نے اسکول میں سیکھا ہے میں بہت مرعوب ہوتی ہوں۔ اچیرا ہوڑیل کا رماندھری مانڈ والے۔ (اس کے اصل الفاظ اب جا کر چار پانچ روز قبل اتفاقیہ معلوم ہوئے۔ اچیرا ہوڑی ہنکار۔ مارے جاؤ چھے جمنا پار۔ چنانچہ اسطرح ہم ساری عمر غلط الفاظ یاد رکھتے ہیں۔ کوشک کے فوراً بعد نور منزل علیگڑھ۔ وہاں کزن زلیخا الاپتی پھر رہی ہیں "منزے بھڑان چل تیر نظر۔ یہ خورشید آپا نے ہم لوگوں کو ڈانس سکھایا ہے"۔ میں اور زیادہ متحیر اور مرعوب ہوتی ہوں۔ (خورشید آپا انہی دنوں نئی نئی رینوکا دیوی بنی تھیں) یہ "منزے بھڑان" کیا ہوتا تھا؟ یہ بچوں کی اپنی زبان تھی اور میں بھی بہت دنوں تک "منزے بھڑان" الاپتی پھری۔ اور سنیلز چوکلیٹ میں سے نکلنے والی فلم اسٹارز کی تصاویر۔ نیلسن ایڈی۔ پولٹ گوڈارڈ۔ جنیٹ مک ڈانلڈ اور ان کے میٹلز البم جو دہرہ دون میں توفیق رفعت اور میں بے حد انہماک سے تیار کرتے تھے اور ہمیشہ یہ امید اور متوقع کر جانے اس

چوکلیٹ میں سے کس کی تصویر نکلے گی۔ کس چیز کے اندر سے کیا چیز برآمد ہوگی۔ نہاں خانہ اسرار۔ پارٹ آف دی مسٹری۔

اور حسنین ماموں اپنی بھاری آواز میں نہایت سنجیدگی سے اور الّن ماموں لڈّن ماموں اپنی سریلی آواز میں گا رہے ہیں۔ وہ تینوں بھی معدوم ہو چکے۔ شمع نکلا اور غائب۔ محرم نہیں ہے کوئی نوا ہائے راز کا۔

اور پھولوں میں کیا ہے؟ سفید زنگی پانی جو دہرہ دون میں مارچ اپریل میں کھلتا تھا۔ اور جاپا کی رانی اور گل جعفری۔ گل ہزارہ۔ گل آفتاب۔ گل مخمل۔ نام۔ گیندا کی کائنات الگ ہے۔ اس کو گل جعفری کہئے اس لئے منسوب کائنات مختلف ہو جائے گی۔

کالج کے فرسٹ ایئر میں پہنچنے تک گڑیاں الماری میں سب سے نیچے اصطبل۔ پھر بیتا گردینشہ۔ پھر باورچی خانہ بھر ڈرائنگ اور ڈائننگ روم۔ سب سے اوپر بیڈ روم۔ ان کا اسکول الگ قائم کیا تھا۔ لندن کی چھپی ننھی منّی کتابیں پریوں کی۔ ان کا کورس تو ہم سب ساری عمر کسی نہ کسی نوع کی پریوں میں یقین رکھتے ہیں اور کھلونوں سے بھی جی بہلاتے ہیں۔

انّا دے میں جب فقیرا خانساماں رات کو سلام کرنے آتا تو پابندی سے کہتا "سلام بیگم صاحب۔ سلام بابا۔ سلام بی بی۔ سب گڑیوں کو سلام" کیوں کہ میں نے اسے بتا رکھا تھا کہ گڑیوں کو گڈ نائٹ کہنا بھی ضروری ہے۔ وہ سب باتیں سمجھتی ہیں۔

پھول اور اس کے بعد بنات میں لکھنا شروع کیا۔ اگر وہ کہانیاں حاصل کی جائیں مثلاً "چوکلیٹ کا قلعہ" جو بنات میں چھپی تھی تو اس کے ذرا ہی بعد جو افسانے ساقی اور ادب لطیف سویرا وغیرہ میں شائع ہوئے تو اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی "چوکلیٹ کے قلعے" کی توسیع تھے۔

امّاں اور چچی وحیدہ تخت پر لیٹی باتوں میں مصروف تھیں جیسے چائلڈ آرٹ ہوتا ہے۔ میں نے کاغذ پر دو دائرے بنا کر ان کے اندر دو نقطے لگائے گویا آنکھیں ایک نقطہ پھسل لکیر کی صورت میں ایک دائرے سے باہر آگیا۔ میں نے کاغذ ان دونوں کو پیش کیا اور کہا یہ لیجئے آپ دونوں کی تصویر۔ چچی جان نے مسکرا کر لکیر کے لئے پوچھا "اور یہ کیا ہے؟" میں نے فوراً جواب دیا۔ "یہ آپ کا بندہ" اس وقت میری عمر چار سال کی تھی۔ وہ منظر اچھی طرح یاد ہے۔ تو واضح ہو کہ نقطہ اگر پھسل کر لکیر بن جائے تو اس کی کچھ بھی عالمانہ تاویل کی جا سکتی ہے۔ اور کی جاتی ہے جیسے لکیر کو کہہ دیا بندہ

اور اس نقطہ سے میں "تلازمہ خیال" اور "شعور کی رو" پر آتی ہوں۔ جن مغربی اصطلاحات کا میری تحریروں کے سلسلے میں مستقل ذکر کیا جاتا ہے بات صرف یہ ہے کہ میری یادداشت فوٹوگرافک ہے (ہر افسانہ نگار کی ہوتی ہے ورنہ وہ کہانیاں نہ لکھے) اور اپنے تلازمہ خیال کی ایک توجیہ میں اس طرح کر سکتی ہوں کہ ایک دوہرے کلچرل پیٹرن میں پرورش پائی۔ میرے گھر پر بیرہ سفید چکن پر سرخ نواڑی پٹی کسی کر اور دھلنے کی وجہ سے ذرا سا پیلی پر ایسی ہی بیج کا چاندی کا مونوگرام لگائے سفید دستانے پہن کر لنچ اور ڈنر سرو کرتا تھا (یہ "براؤن صاحبیت" نہیں تھی بلکہ ایک سو سال سے کلکتہ میں) وہ برٹش کولونیل طرز معاشرت اختیار کر رکھی تھی۔ جس طرح اس سے قبل اس ملک کے چند طبقات نے مغل تہذیب اپنائی تھی۔ ایک حد تک گجرات اور مہاراشٹر سمیت علاوہ جنوبی ہند کے اور اپنے گھر اور اپنے چچاؤں اور ماموؤں کے گھروں کے "کوئی ہے" والے ماحول سے نکل کر انہی لوگوں کے اصل تمدنی اور جذباتی HINTER LAND ہنٹرلینڈ، محلہ سادات لاکھڑی مراد آباد اور قلعہ محمود پور (ضلع مراد آباد) چند ہفتوں یا چند مہینوں کے لئے جاتی تھی جہاں وہ پہلے والی مغل تہذیب کی بنیاد اور ڈھانچہ ابھی موجود تھا تو وہ دوسرا خالص ہندوستانی۔ انڈو مغل ایرانی میلیو بھی میرا اپنا تھا۔ اسی وجہ سے مجھے سوشل ہسٹری بے حد فیسی نیٹ کرتی ہے اور اس کے تمام تہہ در تہہ لوازمات، ادب میں میں بنیادی طور پر ایک رومینٹک ہوں اسی وجہ

ہے۔ مجھے تاریخ اور ماضی اور وقت کے بہاؤ سے ازحد دلچسپی ہے اور اسی لئے جب کبھی لکھوں تاثراتی تنقید لکھتی ہوں۔

تو "قلزم خیال" اور "شعور کی رو" کے لئے کچھ کم چیزیں تھیں؟ چنانچہ یہی قلزم خیال اور وغیرہ ساقی اور دوسرے ادبی رسالوں میں چھپنے والے میرے اولین افسانوں "یونہی" "آہ! اے دوست" "رقص شرر" "یہ باتیں" وغیرہ میں نمودار ہوا۔ اس وقت ورجینا وولف کا میں نے نام بھی نہیں سنا تھا۔ نہ ہنری جیمز اور برگساں کا۔ یہ افسانے میں نے ابھی چند ماہ قبل "ستاروں سے آگے" میں پڑھے۔ مدتوں سے یہ کتاب نایاب تھی۔ ایک خاتون نے سنبھل ضلع مرادآباد کی پبلک لائبریری سے حاصل کرکے بھیجی۔ اسے صادق الخیری نے ۱۹۴۷ء میں خاتون کتاب گھر سے شائع کیا تھا۔ (اسی سال دلی کے فسادات میں اس کا سارا اسٹاک مع بلڈنگ ہاؤس نذر آتش ہوا) شاید منٹو نے کہیں لکھا ہے کہ جب لوگوں نے انھیں بتایا کہ وہ گورکی اور ہیوپاساں سے متاثر ہیں تو انھوں نے ان مصنفوں کو پڑھا۔ خاکسار کے لئے کہا جاتا ہے کہ ہنری جیمز سے متاثر ہوں۔ تو ہنری جیمز کی ایک کتاب جو مجھے مکتبہ فرینکلن (لاہور نیویارک) نے ۱۹۵۴ء میں ترجمے کے لئے بھیجی وہ پہلا اور آخری ناول اس ناولسٹ کا تھا جو میں نے پڑھا۔ اور میں اس سے بہت پہلے سے لکھ رہی تھی۔ برگساں کو میں نے باقاعدہ پڑھا ہی نہیں البتہ شپنگلر اور ٹوئن بی کو پڑھا ہے۔ لیکن کیا انسان از خود کچھ بھی نہیں سوچ سکتا؟ نہ بقلم خود کچھ لکھ سکتا ہے؟ واضح ہو کہ میں مفکر ہونے کا دعویٰ کرتی ہوں نہ فلسفہ دانی کا۔ محض جستجو۔

ازابیلا تھوبرن کالج میں امریکن طریقہ تعلیم کے مطابق انٹرمیڈیٹ کلاس میں ہر ہفتے ہم لوگوں کو لائبریری سے دو کتابیں لیکر ان کی "ریڈنگ رپورٹ" دینی ہوتی تھی EARLY TEENS کی دلچسپی کے مطابق میں بھی ڈکنز، کپلنگ، اسٹیونسن، لوئیزا مے الکاٹ، ڈیوماز وغیرہ پڑھا کرتی تھی۔ بہنوں کی ساتھی کملا جے پال ایک بے حد ذہین خاتون تھیں اور میری گرو بنی ہوئی تھیں۔ میں ان کی چیلی۔ مجھ سے سینئر تھیں۔ ایک روز انھوں نے بے نیازی سے مطلع کیا کہ اسٹریم آف کونشسنس ان انگلش ناول پر مقالہ لکھ رہی ہیں۔ مجھ پر بڑا رعب پڑا کہ یہ کوئی بہت ہی زبردست چیز ہوگی۔

ایم اے میں ہم کو جدید انگریزی ناول نہیں پڑھایا گیا۔ اسی زمانے میں بنگلور کی ایک خاتون ممتاز شیریں نے بحیثیت ناقد بہت شہرت حاصل کی۔ "تکنیک کا تنوع" ان کا ایک نہایت عالمانہ مضمون سویرا (لاہور) میں چھپا۔ انھوں نے مجھ سے خط و کتابت شروع کی اور لکھا آپ ورجینا وولف سے بہت متاثر ہیں۔ میں نے جواب دیا جی ہاں ہوں۔ عزیز احمد کا خط حیدرآباد دکن سے آیا۔ آپ نے غالباً فلاں فلاں کو بہت پڑھا ہے (بہت سے جدید مغربی ادیبوں کے نام لکھے تھے) ان میں سے ولیم سیرویان کا نام مجھے اب تک یاد ہے جسے میں نے بعد میں پڑھا اور بہت پسند کیا۔ احمد ندیم قاسمی نے اندر پرستھ کالج کے رسالے میں جسے میں ایڈٹ کرتی تھی میرا ایک انگریزی ڈرامہ پڑھ کر پشاور سے لکھا "معلوم ہوتا ہے آپ نے فلاں فلاں مغربی مصنفین کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔" میں نے جواب دیا جی ہاں۔ اب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ پھر میں نے کملا جے پال اپنی گرو کی تقلید میں اعلان کیا کہ میں اسٹریم آف کونشسنس ان انگلش ناول پر مقالہ لکھ رہی ہوں۔ خود کو ایک صاحب نظر ادیبہ کہلانے کے شوق میں اور اپنی کم عمری چھپانے کے لئے خود کو نہایت بھاری بھرکم ظاہر کیا کہ کچھ عرصے بعد کراچی پہنچ کر پہلی بار ایک عزیز نے ورجینا وولف کی TO THE LIGHTHOUSE ۱۹۵۰ء میں پڑھنے کو دی اور وہ مجھے بے انتہا پسند آئی (میرے بھی صنم خانے اپریل ۱۹۴۹ء میں چھپا تھا) اسی زمانے میں جدید انگریزی ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اور تب سے ورجینا وولف بہت پڑھا۔ خصوصاً جدید انگریزی شاعری۔ تو عرض یہ ہے کہ ورجینا وولف کا مطالعہ کرکے میں نے "شعور کی رو" شروع نہیں کی جیسا کہ مستقل کہا جاتا ہے بلکہ کچھ نمونے تو اس خاکسار نے بہت پہلے سے شروع کر دی تھی۔ مجھے الیزبتھ بوون بھی بہت پسند ہیں۔ میرے سلسلے میں ان کا ذکر کوئی نہیں کرتا۔ لیکن ورجینا وولف نے سفینۂ غم دل لکھنے

ے پہلے یقیناً متاثر کیا۔ ان لوگوں کو جو خود تخلیقی ادیب نہ ہوں یہ سمجھانا بہت مشکل ہے کہ شاعر کس طرح شعر کہتا ہے۔ موسیقار کیسے کمپوز کرتا ہے افسانہ نگار کیوں کر افسانے لکھتا ہے۔ یہ ایک اندرونی ساختی عمل ہے۔ تکنیک کے نسخے سامنے رکھ کر نہیں لکھا جاتا نہ پینٹ کیا جاتا ہے جب میں نے "میرے بھی صنم خانے" لکھا اس وقت تک میں نے کوئی جدید انگریزی ناول پڑھا ہی نہیں تھا۔ نہ آگ کا دریا کے لیے میں نے کوئی نسخہ سامنے رکھا۔ ایک صاحب نے لکھا ہے اور لیفٹ کا جو ہے ایک نئے اسد تقارتھ کا۔ ہمارے یہاں کوئی چیز اوریجنل سمجھی ہی نہیں جاتی۔ (اور تیسرے میرے خیال میں ورجینیا وولف کا جدید کردار ناول ہے) مجھے فرانسیسی امپریشنسٹ بہت پسند ہیں اور کانسٹیبل کی روپہلی ... بھی اور ... ایکسپریشنسٹ بھی اور "لٹل ڈچ ماسٹرز" بھی بڑی سیدھی سی بات ہے۔ جس طرح کی آپ کی افتاد طبع ہوگی اسی نوع کا ... اور آرٹ آپ کو اپیل کرے گا اور متاثر کرے گا۔

اقبال اور ایلیٹ میرے اولیا ہیں۔ دونوں نوعمری سے میرے ساتھ رہے ہیں اس وقت بھی جب ... اس طرح سوچ رہی تھی ... تھا لیکن سوچ کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک بار میں نے اپنی دانست میں اقبال کی جو البیری تصویر کھینچی وہ والد مرحوم کو سناتی تھی کہ سمرقند یا بخارا سے اور شہسوار دوڑے چلے آ رہے ہیں اور گلیوں میں قالین بچھے ہیں اور ... جاتے ہیں۔ گویا بچپن ہی سے اقبال کے EVOCATIVE الفاظ پر معنی تصویر معنون کرتے۔

میں اپنی مرحومہ والدہ کی طرح ایک نہایت GREGARIOUS اور زندہ دل خاتون ہوں اور ان ہی کی مانند رشتے داروں اور دوستوں کے سلسلے میں بے حد خوش نصیب۔ مجھے ہر ملک اور ہر قوم اور فرقے میں بے انتہا پرخلوص، اور اچھے دوست ملے ہیں۔ ہندوستانی پاکستانی بنگالی پنجابی، پٹھان، گجراتی، انگریز، امریکی، یورپین، روسی، پارسی، یہودی اور یہ دوستیاں پرانی اور پائیدار اور پرخلوص ہیں۔ کہا جاتا ہے جس کے بہت دوست ہوں دراصل اس کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں یہ مفروضہ قطعی غلط ہے۔ اور میرے احباب میں متعدد اہل قلم بھی شامل ہیں "معاصرانہ چشمک" والی بات بھی میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ رشک مجھے صرف دو طرح کی خواتین و حضرات پر آتا ہے۔ ایک بھرت ناٹیم ڈانسرز دوسرے وہ لوگ جو آکسفرڈ یا کیمبرج میں رہ کر علمی کام کرتے ہیں۔ اگر میں ایک مسلم گھرانے میں پیدا نہ ہوتی اور ایسا مسلم گھرانہ جو ماڈرن ہونے کے ساتھ ساتھ قدامت پرست بھی تھا، تو میں نے یقیناً بھرت ناٹیم میں مہارت حاصل کی ہوتی۔ زمانہ بدل گیا۔ مجھ سے اگلی پیڑھی میں میری چچازاد بہنوں کی لڑکیوں نے اپنے والدین کی اجازت اور ہمت افزائی سے باقاعدہ کلاسیکل رقص سیکھا۔ اور اگر مجھ میں DRIFT کرنے کی عادت اور سستی نہ ہوتی تو میں یقیناً آکسبرج میں مستقل قیام کرتی۔

ہاں کی "معاصرانہ چشمک" اپنے دوستوں کی اچھی تخلیقات کے علاوہ اگر مجھے کسی بھی ادیب کی کوئی چیز پسند آتی ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھیں۔ میں نے السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا میں انتظار حسین، خالدہ اصغر، ابوالفضل صدیقی اور آغا جابر کے افسانے جو مجھے بہت اچھے لگے فوراً ترجمہ کرکے شائع کیے — اس سے قبل میں ہاجرہ، خدیجہ اور کئی ادیبوں کی چیزیں انگریزی میں ترجمہ کر چکی ہوں۔

معاصرین سے پرخاش اور اپنے سے سینیئر ادیبوں

کا مذاق اڑانا یا ان کے ساتھ بدتمیزی کے موجودہ رویے میرے لیے تعجب خیز ہیں۔ کسی PERSONALITY PROBLEM کے فقدان کی وجہ سے میں لوگوں سے فوراً دوستی کر لیتی ہوں اور زیادہ تر لوگوں کو جو مغرور نہ ہوں بہت اچھا اور سویٹ سمجھتی ہوں۔ میرے بہی خواہوں کو یہی شکایت

ہے کہ میں ہر کس و ناکس کو بہت اچھا سمجھتی ہوں اور ان کی اصلیت نہیں پہچان پاتی۔ اس بات کا تجربہ مجھے اب تک نہیں ہوا الّا چند موقعوں کے اور یہ تلخ تجربے ابھی نقطہ پچھلے دو تین سال ہی میں بسلسلۂ ملازمت اور بسلسلۂ ادب ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر چند ماہ قبل ایک مشہور شاعرہ کراچی سے چار دن کے لئے تشریف لائیں مجھ سے ملنے آئیں۔ میں حسب عادت ان سے نہایت خلوص اور اپنائیت سے ملی۔ دو تین مرتبہ کی سرسری ملاقات کے بعد کراچی واپس جا کر انھوں نے میرے متعلق ایک نہایت بھیانک اور لغو اور لچر اور SICK نظم لکھ کر چھپوا دی۔ جس میں میری شخصیت کو بری طرح اور انتہائی VICIOUS طور پر مسخ کرکے پیش کیا اور میں متحیر ہوں کہ انھوں نے ایسا کس وجہ سے کیا۔ افسوس یہ ہے کہ اس طرح انہوں نے اپنے TWISTED MIND اور بیمار ذہن کا مظاہرہ کیا۔ COMPLEXES کی بھی گوناں گوں اقسام ہیں۔ ایک قسم تہلکہ خیزی کی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ چاہے کسی قسم ہی کی سہی شہرت حاصل ہو۔ ایک صاحب نے میری ایک MAJOR تصنیف کارِ جہاں دراز ہے (جلد اوّل) پر نہایت طویل تبصرہ شائع کیا جو تبصرہ کم اور چھکڑ پن اور بالکل UNPROVOKED ذاتی حملے زیادہ تھا۔ اسی طرح کچھ عرصہ قبل ایک بیہودہ افسانہ لکھا جا چکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ لوگ بالخصوص آجکل آخر ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ کیا اس افسوسناک رویئے کا تعلق ایسے لوگوں کی انفرادی ابنارمل نفسیات سے ہے یا اس کی کوئی سماجیاتی وجہ بھی ہے؟ اس کے علاوہ میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ ہمارے ادب میں MALE CHAUVINISM یقیناً موجود ہے۔

میں نے آج تک کسی معاصر کے خلاف کچھ نہیں لکھا۔ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ پھر لوگ ایسے UNPROVOKED ذاتی حملے اور اتنے بیہودہ کیوں کرتے ہیں؟ ان سے انھیں کس طرح کی خوشی حاصل ہوتی ہے؟ اس قسم کے VICIOUS لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر میں بد نفسی اور شرارت پر اتر آؤں تو قلم میرے ہاتھ میں بھی ہے جن کے خلاف جو دل میں آئے میں بھی لکھ سکتی ہوں۔

اپنی تحریروں کا مجھے کوئی OBSSESSION نہیں ہے۔ عموماً ان کے خلاف ہی لکھا جاتا ہے سو وہ بالکل جائز ہے۔ یہ ناقد کا حق ہے وہ جو چاہے لکھے۔ جب آپ کوئی چیز لکھ کر چھپواتے ہیں تو پھر آپ کو شکایت نہیں کرنی چاہیئے کہ اس پر کیسی تنقید ہوئی۔ لیکن خود مصنف پر ذاتی حملے کسی مہذب متمدن سوسائٹی کا شیوہ نہیں اور یہ ہمارے ہاں برابر ہوتا رہتا ہے اور اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ عمرانی۔ انگلستان اور فرانس میں خواتین نصف صدی سترھویں صدی سے ناول لکھ رہی تھیں وہاں کے سماج کو عورت کے متعلق وہ HANG - UPS اور فرسٹریشن نہیں ہے جو ہمارے یہاں موجود ہے بشمول ۱۹۴۷ آگیا لیکن ہمارے معاشرے میں خصوصاً اور دوسری سوسائٹی میں ایک خود مختار کریٹو عورت کو ایک عجوبہ روزگار ہستی سمجھا جاتا ہے لہٰذا اس کے لئے جو بھی قیاس آرائیاں نہ کی جائیں کم ہیں۔ ذاتی طور پر میرے سلسلے میں ایک اور مسئلہ ہے میں نے جس مخصوص سوشل سیٹ اپ ماحول اور فضاؤں میں پرورش پائی اور زندگی گزاری وہ زیادہ تر لوگوں کے لئے ایک اجنبی دنیا ہے لہٰذا میرا جو مخصوص PURITANICAL, SEMI-FEUDAL, ANGLICISED LIBERAL MILIEU رہا ہے وہ ان کی سمجھ ہی میں نہیں آسکتا۔ اور اس کی عکاسی جو میں کرتی ہوں اپنے افسانوں اور ناولوں میں کر رہی ہوں وہ بھی اسی وجہ سے ہدف ملامت بنتا رہی۔ میرے اندر وہ "انا" اس حد تک یقیناً موجود ہے جو ہر معقول انسان میں ہونی چاہیئے لیکن خود پرست، الغیوزدہ ہر خود غلط لوگوں کو میں قابل رحم سمجھتی ہوں۔ علم و دانش کے لحاظ سے خود کو عقل کل گرداننا زبردست حماقت ہے اور اسی حماقت میں لوگ اکثر مبتلا ہو جاتے ہیں آپ اگر کسی وجہ سے بھی مدعی ہیں۔ دانشوری، یا دولت و ثروت، کارنامے، سماجی مرتبہ، اقتدار، کامیابی، شہرت — ان چیزوں میں سے کسی کی وجہ سے آپ میں غرور آجائے تو سمجھ لیجیئے کہ آپ کی ذات میں کچھ کمی ہے۔ ہمیشہ اپنے پاؤں زمین پر رہنے چاہئیں ہم اور آپ تو کچھ بھی نہیں جانتے۔ نہ جانا شروع کر سکتے ہیں۔ وہ وکٹورین پادری جس کا نام ریورنڈ چارلس ڈوجسن تھا وہ لوئیس کیرل کے قلمی نام سے ایک کتاب لکھ گیا۔ "ایلس ان ونڈرلینڈ"۔ وہ آپ نے اب تک نہ پڑھی ہو تو ایک بار پڑھ لیجئے۔ وعلیکم السلام۔



امرتا پریتم

"........ کوئی "بیج" جانے کیسے ہوتے ہیں؟ ایک بار خون اور گوشت میں اُگ آئیں تو پھر چاہے کیسی ہی ہوا چلیں، سوکھے پڑیں، اُن کے پتے جھڑ جائیں، ٹہنیاں ٹوٹ جائیں لیکن وہ جڑوں سے نہیں اُکھڑتے۔ ایک... "کسی چہرے کا تصور" اور دوسرا "الفاظ کا ادب" ایسی قسم کے بیج تھے جو بالپن میں میرے اندر سے اُگ پڑے........."

کیا یہ قیامت کا دن ہے؟ زندگی کے کئی وہ لمحے جو وقت کی کوکھ سے پیدا ہوئے، زندہ رہے اور وقت کی قبریں جا پڑے، آج میرے سامنے کھڑے ہیں...... یہ تمام قبریں کیسے وا ہو گئیں؟ اور تمام لمحے جیتے جاگتے قبروں میں سے کیسے نکل آئے؟!

یہ ضرور قیامت کا دن ہے..

یہ ۱۹۱۸ء کی لحد سے نکلا ایک لمحہ ہے۔ میرے وجود سے بھی ایک سال پہلے کا، آج پہلی بار دیکھ رہی ہوں، پیشتر صرف سنا تھا۔ میرے ماں باپ، دونوں پنج کھنڈ بھسوڑ کے سکول میں پڑھاتے تھے۔ وہاں کے سربراہ بابو تیجا سنگھ کی بیٹیاں ان کے طالب علموں میں سے تھیں ان بچیوں کو ایک دن جانے کیا سوجھی۔ دونوں نے مل کر گوردوارہ میں کیرتن کیا۔ ارداس کی اور ارداس کے آخر میں کہہ دیا۔ "دو جہانوں کے والی! ہمارے ماسٹر جی کے گھر ایک بچی بخش دو!" بھری سنگت میں والد نے دعا کے یہ الفاظ سنے تو انھیں میری ہونے والی ماں پر طیش آیا۔ انھوں نے سمجھا تھا کہ ان بچیوں نے اس کی رضا مندی سے یہ دعا کی تھی۔ لیکن ماں کو کچھ پتہ نہ تھا۔ ان بچیوں نے ہی بعد ازاں بتایا کہ اگر راج بی بی سے پوچھتیں تو وہ شاید بیٹے کی تمنا کرتی۔ لیکن وہ اپنے ماسٹر جی کے گھر لڑکی مانگتی تھیں، اپنی طرح کی لڑکی۔ یہ لمحہ ابھی تک خاموش ہے — قدرت کے اسرار کو ہونٹوں میں بھینچ کر ہولے سے مسکراتا، پر کہتا کچھ نہیں۔ ان بچیوں نے یہ ارداس کیوں کی؟ ان کے کون سے اعتقاد نے سُن لی؟ مجھے کچھ خبر نہیں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ سال کے اندر اندر راج بی بی، راج ماں بن گئی۔

اور اس سے بھی دس برس پہلے — وقت کی قبر میں سویا ہوا ایک وہ لمحہ جاگ اٹھا ہے جس لمحے بیس سال کی راج بی بی نے گوجرانوالہ میں سادھوؤں کے ایک ڈیرہ میں متھا ٹیکا اور اس کی نظر کچھ اتنے ہی سال کے نند سادھ پر جا پڑی۔ نند سادھ ساہوکاروں کا بیٹا تھا۔ جب چھ برس کا تھا، ماں بھی مر گئی تھی۔ اس کی نانی نے اس کو گود لے لیا تھا اور دانہ چھڑنے والی ایک عورت کے دودھ پر پال لیا تھا۔ نند کے اور بھی چار بڑے بھائی تھے اور ایک بہن تھی۔ مگر بھائیوں میں سے دو مر گئے۔ ایک گوپال سنگھ، بال بچوں کو چھوڑ کر شرابی ہو گیا تھا اور ایک حاکم سنگھ سادھوؤں کے ڈیرہ میں جا بیٹھا تھا۔ اس لئے نند کا سارا موہ اپنی بہن ہاکو کے ساتھ پڑ گیا تھا۔ بہن بڑی تھی، انتہا کی حسین۔ جب بیاہی تو اپنے خاوند بیلا سنگھ کو دیکھ کر ایک ہی ضد پکڑ لی کہ اس کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ نہیں۔ مکلاوے پھیرے جانے کے بجائے اس نے میکے گھر میں ایک تہ خانہ بنوایا اور چلّے رکھ لیے۔ گلے میں گیروے کپڑے ڈالتی۔ رات کو کچے چنے پانی میں بھگوتی اور دن میں چبا لیتی۔ نند نے بھی بہن کی دیکھا دیکھی گیروے کپڑے پہن لئے۔ تاہم بہن زیادہ عرصہ زندہ نہ رہی۔ اس کی موت سے نند کو لگا کہ دنیا سے اصلی بیراگ اس کو اب ہوا تھا۔ وہ متمول نانا سردار امر سنگھ سچدیو سے ملی ہوئی لا انتہا جائیداد کو چھوڑ کر سنت دیال کے ڈیرہ میں جا بیٹھا۔ سنسکرت سیکھی، برج بھاشا سیکھی اور حکمت سیکھی، اور ڈیرے میں بال سادھو کہا جانے لگا۔ بہن جب زندہ تھی، ماما جی نے نند کی کہیں امرتسر سگائی کی تھی۔ نند نے وہ رشتہ چھوڑ دیا اور بیراگ سے بھری نظمیں لکھنے لگا۔

راج بی بی ماںگ ضلع گجرات کی تھی؛ بٹے سٹے میں بیاہی ہوئی۔ جس کے ساتھ بیاہی تھی، وہ فوج میں بھرتی ہو کر گیا تھا۔ پھر اُسکی

کوئی خبر نہ آئی تھی۔ اداس اور دل شکستہ، وہ گوجرانوالہ کے ایک چھوٹے سے اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ اسکول جانے سے پہلے اپنی بھابی کے ساتھ دیال جی کے ڈیرے اشنان کرنے آتی تھی۔ بھائی فوت ہو گیا تھا۔ بھابی بیوہ تھی۔ اسی بھابی کے بٹہ میں وہ بھابی کے بھائی سے بیاہی تھی لیکن اب دونوں بیکل اور اداس ایک سکول میں پڑھاتی تھیں اور اکٹھی رہتی تھیں۔ ایک دن دونوں جب دیال جی کے ڈیرے پر آئیں، موسلادھار بارش امڈ آئی۔ دیال جی نے بارش کا وقت گذارنے کے لئے اپنے بالکے سادھو کو نظم سنانے کے لئے کہا۔ وہ سادھو آنکھیں موند کے نظم سنا رہے تھے۔ اور جب آنکھیں کھولیں تو دیکھا —— ان کے من کی آنکھیں راج بی بی کے چہرے پر جیسے اٹک رہی تھیں۔ کچھ دن کے بعد انہوں نے راج بی بی کی داستانِ غم سنی اور نند سے کہا "بیٹا نند! جوگ تمہارے لئے نہیں ہے۔ یہ بھگوے کپڑے اتار دو اور گرہستھ آشرم میں پاؤں رکھو۔" یہی راج بی بی میری ماں بنی اور نند سادھو میرے پتا۔ نند نے دھرتی پر قدم رکھا۔ اپنا نام کرتار سنگھ رکھا۔ نظم کہتے تھے اس لئے ایک تخلص بھی تھا۔ پیوکھ! —— دس سال بعد جب میں پیدا ہوئی تو انہوں نے پیوکھ لفظ کو پنجابی میں الٹا کر میرا نام امرت رکھ دیا اور اپنا تخلص ہتکاری!

فقیری اور امیری دونوں کا میرے والد کے مزاج میں امتزاج تھا۔ ان کا ملاپ کیسا تھا —— ہمسایہ ان کا ایک گورو بھائی (سنت دیال جی کا ایک اور مرید) سنت ہرنام سنگھ کہنے لگا کہ اس کا بڑا بھائی شادی کرانا چاہتا ہے لیکن اچھا بھلا رشتہ ہوتے رہ گیا ہے کہ اس کے پاس رہنے کو اپنا مکان کوئی نہیں۔ والد کے پاس اس وقت بھی اپنے باپ کی جائیداد میں سے ایک مکان بچا ہوا تھا۔ کہنے لگے "اگر اتنی سی بات کے لئے بیاہ نہیں ہوتا تو میں اپنا مکان اس کے نام لکھے دیتا ہوں۔" اور اپنا اکلوتا مکان اس کے نام لکھ دیا۔ پھر ساری عمر کرائے کے مکانوں میں رہے۔ اپنا مکان نہیں بنا سکے۔ لیکن میں نے کبھی ان کے چہرے پر ملال نہیں دیکھا۔

لیکن میں نے ان کے چہرے پر ایک بہت گہرا ملال دیکھا —— گیارہ برس کی تھی، ماں داغِ جدائی دے گئی۔ وہ زندگی سے پھر بے نیاز ہو گئے۔ لیکن میں ان کے لئے ایک بہت بڑا بندھن تھی۔ موہ اور بیراگ دونوں ان کو مخالف سمتوں کی طرف کھینچتے۔ کئی لمحے ایسے بھی آتے —— میں بلک پڑتی۔ پتہ نہیں لگتا تھا، میں ان کو منظور تھی کہ نا منظور .... اپنا وجود —— ایک وقت چاہا اور ان چاہا لگتا .... قافیہ اور ردیف کا حساب سمجھا کر والد نے چاہا تھا کہ میں لکھوں۔ لکھتی رہی —— میرا خیال ہے، والد کی نظر میں جتنا کچھ ان چاہی تھی، وہ بھی چاہی بننے کے لئے۔

آج نصف صدی بعد سوچتی ہوں —— فقیری اور امیری، دونوں بیک وقت میرے مزاج میں ہیں اور یہ مزاج اپنے نقوش کی مانند مجھے والد سے ملا ہے۔ شاید ان کی نظر بھی میری نظر میں شامل ہے —— کبھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ میں اپنی نظروں میں منظور ہوں کہ نہیں؟ —— شاید اسی لئے ساری عمر لکھتی رہی کہ میری نظروں میں جو کچھ میرا ان چاہا ہے، وہ سارا میرا چاہا بن جائے، ...... جیسے اس وقت بھی دنیا کو نہیں سوچتی تھی، صرف سوچتی تھی کہ میرے والد مجھ سے خوش ہوں، آج بھی دنیا کا ذکر نہیں کرتی، فکر کرتی ہوں صرف یہ کہ میرا اپنا آپ مجھ سے خوش ہو ...... والد کے روبرو کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا، اپنے آپ سے بھی نہیں بول سکتی.....

یہ ایک وہ پل ہے —— جب گھر میں تو نہیں لیکن رسوئی میں نانی کی حکومت ہوتی تھی۔ سب سے پہلی بغاوت میں نے اس کی حکومت میں کی تھی۔ دیکھتی تھی، باورچی خانہ کی ایک پڑچھتی پر تین گلاس، باقی برتنوں سے الگ، تھلگ، ہمیشہ ایک کونے

میں پڑے رہتے تھے۔ یہ گلاس صرف اس موقع پر زیریں چھت سے اتارے جاتے تھے جب والد کے مسلمان دوست آتے تھے اور ان کو لسی چائے پلائی ہوتی۔ اور اس کے بعد مانجھ دھو کر پھر وہیں رکھ دیئے جاتے تھے۔ سو تین گلاسوں کے ساتھ میں بھی چوتھے گلاس کی طرح شامل ہو گئی۔ اور ہم چاروں نانی کے ساتھ لڑ پڑے۔ نہ گلاس بھی باقی برتنوں کو نہیں چھو سکتے تھے؟ میں نے بھی ضد پکڑ لی کہ میں کسی دوسرے برتن میں نہ پانی پیئوں گی، نہ دودھ جائے۔ نانی ان گلاسوں کو الگ رکھ سکتی تھی مگر مجھ کو بھوکا پیاسا رکھ سکتی تھی۔ اس لئے بات والد تک پہنچ گئی۔ والد کو اس سے قبل معلوم نہ تھا کہ کوئی گلاس اس طرح علیحدہ رکھے جاتے ہیں۔ ان کو پتہ چلا تو میری بغاوت کامیاب ہو گئی۔ پھر نہ کوئی برتن ہندو رہا نہ مسلم۔ اس گھڑی نہ نانی کو معلوم تھا نہ مجھ کو کہ بڑی ہو کر زندگی کے کئی سال جس کے مونہہ کو عشق کروں گی، وہ اسی مذہب کا ہوگا جس مذہب کے لوگوں کے لئے گھر کے برتن بھی اچھوت بنا دیئے جاتے تھے۔

ہونہار کا مونہہ ابھی نکلا نہیں تھا، لیکن سوچتی ہوں، اس پل شاید اسی کا سایہ تھا، جو بچپن میں دیکھا تھا..... سائے بہت بڑی حقیقت ہوتے ہیں۔ مونہہ بھی حقیقت ہوتے ہیں۔ لیکن کتنی دیر؟ سائے، جتنی دیر آپ چاہیں۔ چاہیں تو ساری عمر.... سال آتے ہیں، گزر جاتے ہیں۔ کھڑے نہیں ہوتے۔ مگر کئی سائے، جہاں کبھی کھڑے ہوتے ہیں، وہیں کھڑے رہتے ہیں....

یوں تو ہر سایہ کسی وجود کی پرچھائیں ہوتی ہے، وجود کی محتاج۔ لیکن کئی سائے اس قسم کے بھی ہوتے ہیں جو اس قاعدے سے باہر ہوتے ہیں، وجود سے بھی آزاد۔ اور یوں بھی ـــــ کہ ایک سایہ معلوم نہیں کہاں سے، اور کس وجود سے ٹوٹ کر آپ کے پاس آ جاتا ہے۔ اور آپ اس سائے کو لے کر دنیا میں گھومتے رہتے ہیں اور ڈھونڈتے رہتے ہیں کہ یہ جس وجود سے ٹوٹا تھا، وہ کونسا ہے؟ مغالطوں کا کیا ہے، بڑھ جاتے ہیں۔ آپ یہ سایہ غیروں کے گلے کے ساتھ بھی لگا کر دیکھتے ہیں، کیا پتہ ناپ کا ہو؟ نہیں ہوتا، نہ سہی۔ آپ پھر اس کو، اندھیرے سے پکڑ کر وہاں سے چل پڑتے ہیں۔

میرے پاس بھی ایک سایہ تھا۔ نام کا کیا ہوتا ہے، اس کا ایک نام بھی رکھ لیا تھا ـــــ راجن! گھر میں قاعدہ تھا کہ سوتے وقت "کیرتن سوہلا" کا پاٹھ کرنا ہوتا تھا۔ اس کے لئے والد کا اعتقاد تھا کہ جوں جوں اس کی سطریں پڑھتے جاؤ، آپ کے گرد ایک قلعہ تعمیر ہوتا جاتا ہے۔ اور پاٹھ کے پورا ہوتے ہی آپ ساری رات ایک قلعے کی حفاظت میں ہوتے ہیں۔ پھر ساری رات باہر سے کسی کی مجال نہیں ہوتی کہ وہ اس قلعہ میں داخل ہو سکے۔ اس لئے آپ سب طرح کے افکار سے آزاد ہو کر ساری رات سوتے ہیں۔ یہ پاٹھ سوتے وقت کرنا ہوتا تھا۔ آنکھیں نیند سے بھری ہوتی تھیں، اتنی کہ نیند کے غلبہ میں یہ ادھورا بھی رہ سکتا تھا۔ سو اس بارے میں ان کا کہنا تھا کہ آخری جملہ تک یہ پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر آخری جملات بھی چھٹک جائیں تو قلعہ بندی میں کوئی درز فاصلہ رہ جاتا ہے جس لئے وہ پوری حفاظت نہیں دے سکتا۔ سو آخری تک یہ پاٹھ کرنا ہوتا تھا۔ بہت بچی تھی، فکر لاحق ہوا کہ اس پاٹھ کے بعد میرے گرد قلعہ تعمیر ہو جائے گا تب پھر راجن میرے خوابوں میں کیسے آئے گا؟ میں قلعہ کے اندر ہوں گی، وہ قلعہ کے باہر ہوگا..... سوچا کہ پاٹھ زبانی یاد ہے، اپنی چارپائی پر بیٹھ کر ہولے ہولے کرنا ہے۔ میں یاد سے اس کی کچھ سطریں چھوڑ جایا کروں گی، قلعہ پوری طرح بند نہیں ہوگا اور اس کھلی رہ گئی درز میں سے وہ اندر آ جایا کرے گا۔

لیکن والد نے اس قاعدہ کی صورت بدل دی۔ اس کے بجائے کہ سب اپنی اپنی چارپائی پر بیٹھ کر اپنا اپنا پاٹھ کریں۔ انہوں نے

وہ بتا دیا کہ میں اپنی چارپائی پر بیٹھ کر بلند آواز میں پاٹھ کروں گی اور سب اپنی اپنی چارپائی پر بیٹھ کر اس کو سنیں گے۔ یہ شاید اس لئے کہ دور رہتے تھے ہیں تھا اور ایک چھوٹی سی بچی والد کے پاس ہی رہتے اور پڑھتے تھے اور اس چھوٹی سی بچی کو یہ پاٹھ یاد نہ ہوتا تھا۔ سو پاٹھ کی کوئی بھی سطر چھوڑی نہیں جا سکتی تھی۔ ایک دو بار چھوڑنے کی کوشش کی لیکن والد نے بھول کر درست کروا کر وہ سطریں بھی پڑھوا لیں۔ پھر بڑی سوچ بچار کے بعد یہ حل نکالا کہ میں سوہلے کا پاٹھ کرنے سے پہلے میں ذہن کو یاد کر کے اس کو اپنے پاس بلا لیا کروں تاکہ وہ قلعے کی دیواروں کی تعمیر سے پہلے ہی قلعے کے اندر آ جایا کرے۔

اس وقت دس برس کی تھی۔ اب چالیس برس بعد اس بات کو سوچتی ہوں تو لگتا ہے جس کسی کے لئے یہ لگن تھی وہ بیکار نہیں گئی۔ گرد حفاظتی قلعے سب بھی ہیں اور ٹوٹے بھی، لیکن اس کا وجود کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ میرے ساتھ رہا ہے ——— کبھی انسانی موہنی کی شکل میں، کبھی قلم کی صورت میں۔ اور کبھی خدا کی ذات کی طرح واحد سے بجد ہوتا ——— کسی کتاب کے صفحات میں سے بھی ابھرا ہے اور کسی کینوس میں سے بھی نکل کر باہر اتر آتا ہے۔ اور دھوئیں کی لکیروں سے جن کے ظاہر ہونے کی انتہا پر کبھی کسی گیت کے بولوں میں سے بھی نکلتا ہے۔ کسی پھول کی کھلتی پنکھڑیوں میں سے بھی، اور سمندر کے پانیوں میں بہتے ہوئے چاند کے سایے میں سے بھی، اور سخت تنہائی کے وقت یہ دریاؤں کو چیر کر بھی ملا ہے۔ میرے جسم کی رگوں میں بہتے خون کے دریاؤں کو چیر کر۔ اور اس کے وجود سے بیزاریگا کا نند رنگ بھی سرخ ہو جاتا ہے۔

یہ ——— اب گوشت پوست کے دیدہ وجود سے کہ رنگوں اور خوشبوؤں میں سے گزرتا، فکروں اور خوابوں کی اس حد تک ہمہ گیر ہو گیا ہے جہاں کسی راہگزر کی چھوٹی سی پرچھائی بھی اس کا وجود معلوم ہوتی ہے اور آنکھوں میں پانی بھر آتا ہے۔

میرے لئے غیر جسمی کچھ نہیں۔ ہر شے کا وجود گوشت پوست کی طرح ہے جس کو ہاتھ سے چھو سکتی ہوں، جو میرے جسم میں سے گزر سکتا ہے۔ چھوٹی عمر میں جب گرو ہرگوبند جی یا گرو گوبند سنگھ کا خواب آتا تھا، میں ان کے گھوڑے کو، باز کو یا گلے میں پڑی تلوار کو ہمیشہ ہاتھ سے چھو کر دیکھتی تھی، دور سے سجدہ کر کے نہیں! اسی طرح پھولوں اور پتیوں کی ٹہنیاں میں باہوں میں بھر لیتی تھی اب بھی کسی سے گلے ملنے کی طرح۔ سارا جسم لرز جاتا ہے اور ان کے کانٹے سے میرے سانس گرم ہو جاتے ہیں۔ بڑے سالوں کی بات ہے۔ ایک بار کوئی پاس بیٹھا تھا، اس کی جیب کا رومال میلا تھا۔ اس کو رومال کی ضرورت پڑی تو بنا دے کر اس کا میلا رومال لے لیا، پاس رکھ لیا۔ وہ برسے سال میرے پاس رہا۔ جب کبھی اس رومال کو ہاتھ لگاتی تھی تو پیشانی کی رگیں سلگ جاتی تھیں۔

کوئی "بیج" جانے کیسے ہوتے ہیں؟ ایک بار خون اور گوشت میں اگ آئیں تو پھر چاہے کیسی آندھیاں چلیں، سوکھے پڑیں، ان کے پتے بکھر جائیں، ٹہنیاں ٹوٹ جائیں، لیکن وہ جڑوں سے نہیں اکھڑتے۔ ایک "کسی چہرے کا تصور" اور دوسرا "الفاظ کا ادب" اسی قسم کے بیج تھے۔ جو بالپن کی عمر میں میرے اندر سے اگ پڑے۔ پھر اعتقاد ٹوٹے۔ یوں ٹوٹے کہ سوچتی ہوں ——— یہ دونوں درخت جڑوں سے اکھڑ جانے چاہیے تھے۔ کبھی محسوس بھی ہوتا ہے کہ ان کا کوئی نام و نشان نہیں رہا۔ لیکن دل کی خشک مٹی میں سے پھر ان کی ٹہنیاں نکل آتی ہیں، ان کو بور پڑ جاتا ہے اور میرے سانسوں میں ان کی خوشبو آنے لگتی ہے۔ ان ایسے پیڑوں کا ایک بیج میں نے اپنے ہاتھ سے بیجا تھا لیکن دوسرا میرے والد نے۔ کسی کتاب کا ورق زمین پر پڑا ہوتا، وہ ادب سے اٹھا لیتے۔ اگر کہیں بھول سے میرا پاؤں

اس ورق پر آجاتا تو وہ خفا ہوتے۔ سو وہ دن کا ادب دل میں بیٹھ گیا اور ساتھ ہی ان کاغذ کے ہاتھ میں قلم ہوتی ہے۔ دیکھتی بھی یوں ہی تھی۔ بھائی کاہن سنگھ جی والد کے دوست تھے۔ وہ جب کبھی آتے —— گھر کی دہلیزیں بھی ادب سے معمور ہو جاتیں۔ والد کے گرو، سنت کے عالم دیال جی تصویر ہمیشہ والد کے سرہانے کی طرف لگی ہوتی تھی۔ اس کی طرف پاؤں کرنا بھی منع تھا۔ اس لئے بڑی ہوئی تو اپنے معاصرین کے لئے بھی میرے پاس ادب تھا۔ لیکن اپنے معاصروں سے جتنے اداس تجربے ہوئے ہیں، حیران ہوں، حرفوں اور قلموں کے ادب کا یہ درخت جڑوں سے کیوں نہیں سوکھ گیا؟ یوں سوچتی ہوں —— میرے ہم عصر صرف وہی ہیں جن کے ساتھ واسطہ پڑا؟ وقت اور فاصلوں کی حدوں سے پرے بھی کوئی ہیں، کتنے ہی کافکا، لاکس، جنہوں نے میرے اس حرفوں اور قلموں کے ادب والے پیڑ کو سنبھالا ہے۔ پھر وہ پیڑ بھی اگر سرسبز رہ گیا ہے تو حیران کیوں ہوں؟

۳۱، جولائی ۱۹۳۰ء

بمشکل گیارہ سال کی تھی، جب اچانک ایک دن ماں بیمار ہو گئی۔ بیماری کچھ ہفتہ بھر لمبی ہوئی تھی، جب میں نے دیکھا، ماں کی چارپائی کے گرد بیٹھے سب کے منہ گھبرائے ہوئے تھے۔ "میری بتا کہاں ہے؟" کہتے ہیں۔ ایک بار ماں نے پوچھا تھا اور جب ماں کی سہیلی پریتم کور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ماں کے پاس لے گئی، ماں کو ہوش نہیں تھا۔ "تم خدا کا نام لو تو، شاید اس کے دل میں مہر پڑ جائے۔ وہ بچوں کا کہنا نہیں موڑتا....'، میری ماں کی سہیلی، میری موسی نے مجھ سے کہا۔ ماں کے بستر کے پاس کھڑے میرے پاؤں پتھر ہو گئے۔ مجھے کئی برسوں سے پرماتما کے ساتھ دھیان جوڑنے کی عادت تھی۔ اور اب جبکہ ایک سوال بھی سامنے تھا، خیال جوڑنا دشوار نہیں تھا۔ میں نے پتہ نہیں کتنی دیر خیال جوڑے رکھا اور رب العزت سے کہا۔ "میری ماں کو نہ مارنا!"

ماں کے بستر سے اب ماں کے درد سے کراہنے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ لیکن ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگوں میں ایک گھبراہٹ پھیل گئی تھی۔ مجھے لگتا رہا "یونہی سب گھبرا رہے ہیں۔ اب ماں کو درد نہیں ہو رہا۔ میں نے خدا کو اپنی بات کہہ لی ہے! وہ بچوں کا کہا نہیں ٹالتا!"

اور پھر ماں کی چیخوں کی آواز نہ آئی لیکن سارے گھر کی چیخیں نکل گئیں۔ میری ماں مر گئی تھی۔ اس روز میرے دل میں ایک غیظ ابل پڑا —— "خدا کسی کی نہیں سنتا، بچوں کی بھی نہیں...." یہ وہ دن تھا جس دن کے بعد میں نے اپنا برسوں کا معمول چھوڑ دیا۔ والد کا حکم سخت ہوتا تھا، لیکن میری ہٹ نے اس کے ساتھ ٹکر لے لی۔

"رب کوئی نہیں ہوتا۔"

"یوں نہیں کہا کرتے۔"

"کیوں؟"

"وہ ناراض ہو جاتا ہے۔"

"تو ہو جائے! مجھے پتہ ہے، رب کوئی نہیں۔"

"تمھیں کیسے پتہ ہے؟"

"اگر وہ ہوتا تو میری بات نہ سنتا؟"

"تم نے اُس کو کیا کہا تھا؟"

"میں اُس سے کہا تھا، میری ماں کو نہ مارنا۔"

"تم نے اُس کو کب دیکھا تھا؟ وہ دکھائی تھوڑے دیتا ہے؟"

"لیکن اس کو سنائی بھی نہیں دیتا؟"

پوجا پاٹھ کے لئے والد کا حکم اپنی جگہ اٹل ہوا تھا اور میری ہٹ اپنی جگہ پر۔ کبھی اُن کا غصہ زیادہ ہی مشتعل ہو جاتا اور وہ مجھ کو چوکڑی مروا کو بٹھا دیتے۔ "دس منٹ آنکھیں بند کر کے رب کو یاد کر!" بہ ظاہر جب جسمانی طور پر میری کم سنی ان کے حق دلدیت سے ٹکر نہ لے سکتی میں چوکڑی مار کر بیٹھ جاتی، آنکھیں بھی موند لیتی، لیکن اپنی شکست کو اپنے دل کا غضب بنا لیتی ——— "اب آنکھیں بیچ کر اگر میں خدا کو یاد نہ کروں تو وہ میرا کیا کر لیں گے؟ جس خدا نے میری وہ بات نہیں سنی اب میں نے اس کو کبھی کچھ نہیں کہنا۔ اس کا تصوّر بھی نہیں لانا۔ اب میں آنکھیں موند کر اپنے راجن کا چہرہ سوچوں گی۔ وہ میرے ساتھ خوابوں میں کھیلتا ہے، میرے گیت سنتا ہے، وہ کاغذ لے کر میری تصویر بناتا ہے۔ بس اسی کو سوچوں گی، اسی کو....."

یہ وہ دن تھے جن کے بعد میں نے کئی دن نہیں، کئی مہینے نہیں، کئی سال وہ سپنوں میں بتا دیئے۔ روز رات کو میرے پاس آنا ان سپنوں کا معمول بن گیا۔ گرمی ہو یا سردی، آنکھوں نے حتی الوسع ناغہ نہیں ڈالا۔ ایک سپنا تھا کہ ایک بڑا سا قلعہ ہوتا۔ اور لوگ مجھے اس قلعے میں بند کر دیتے۔ اندر سے دروازہ کوئی نہ ملتا۔ میں قلعے کی دیواروں کو انگلیوں سے ٹٹولتی رہتی لیکن پتھر کی دیواروں کی کوئی جگہ نہیں کھلتی۔ سارا قلعہ کھوند کھوند جب کوئی دروازہ نہ ملتا، میں سارا زور لگا کر اُڑنے کی کوشش کرنے لگتی۔ میری باہوں کا اتنا زور لگتا، اتنا زور کہ میرا دم پھول جاتا۔ پھر میں دیکھتی، میرے پاؤں زمین سے اوپر کی طرف اُٹھنے لگ جاتے۔ میں اُوپر اٹھتی جاتی، اور اُوپر، اور پھر قلعے کی دیوار سے بھی اونچی ہو جاتی۔ سامنے عرش آ جاتا۔ اوپر سے نیچے نگاہ ڈالتی قلعے کا پہرہ دینے والے لوگ گھبرائے ہوتے۔ غصہ و غضب سے بانہہ پھیلاتے لیکن مجھ تک کسی کا ہاتھ نہ پہنچ پاتا..... اور دوسرا سپنا تھا ——— لوگوں کا ایک ہجوم میرے تعاقب میں ہوتا۔ میں پاؤں کی ساری قوت کے ساتھ دوڑتی۔ لوگ میرے پیچھے بھاگتے۔ فاصلہ کم ہوتا جاتا اور میری گھبراہٹ بڑھتی جاتی۔ میں اور زور لگاتی اور دوڑتی، اور سامنے دریا آ جاتا۔ میرے تعاقب میں آئے ہجوم میں مسرت پھیل جاتی۔ "اب آگے کہاں جائے گی؟ آگے کوئی راستہ نہیں، آگے دریا بہتا ہے......" اور میں دریا کے اُوپر چلنے لگ جاتی۔ پانی کی روانی قائم رہتی، لیکن جیسے اس میں زمین کا سا آسرا آ جاتا۔ زمین بلکہ پاؤں کو سخت لگتی ہے، پانی ملائم لگتا۔ اور میں چلتی جاتی۔ ساری بھیڑ کنارے پر رک جاتی۔ کوئی پانی میں پاؤں نہ ڈال سکتا۔ اگر کوئی ڈالتا، ڈوب جاتا۔ اور کنارے پر کھڑے لوگ گھور گھور کر تکتے، پیچ و تاب کھاتے، لیکن کسی کا ہاتھ مجھ تک نہ پہنچ پاتا۔

میرا سولہواں[16] سال ———

سولھواں سال آیا۔ ایک اجنبی کی طرح۔ پاس آکر بھی ایک فاصلہ پر کھڑا رہا۔ میں کبھی چپکے سے اس کی جانب دیکھ چھوڑتی، وہ کبھی مسکرا کر میری طرف دیکھ چھوڑتا۔ گھر میں باپ کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ بھی معتقت باپ، جس نے ساری رات جاگتے رہنا، لکھنا، اور پھر سارے دن سوتے رہنا۔ ماں زندہ ہوتی تو سولھواں سال شاید اور طرح آتا۔ واقف کاروں کی طرح، سہیلیوں دوستوں کی طرح، رشتہ داروں کی طرح۔ لیکن ماں کی غیر حاضری کی وجہ سے زندگی میں سے بڑا کچھ غیر حاضر ہو گیا تھا۔ اردگرد کے اچھے برے اثرات سے بچانے کے لئے باپ کو اس میں حفاظت معلوم ہوئی تھی کہ میرا کوئی شناسا نہ ہو۔ نہ سکول کی کوئی لڑکی، نہ پڑوس کا کوئی لڑکا۔ سولھواں سال بھی اسی گنتی میں شامل تھا۔ نہ میرا خیال ہے کہ اسی لئے وہ سیدھی طرح گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر نہیں آیا تھا، چوروں کی مانند آیا تھا۔ وہ کبھی کسی رات میرے سرہانے کی کھلی کھڑکی میں سے گزر کر چپ چاپ میرے خوابوں میں آجاتا یا کبھی دن کے وقت، جب میرے والد کو سویا دیکھتا تو وہ کھڑکی دیوار پھلانگ کر آجاتا اور میرے کمرے کے گوشے میں لگے ہوئے چھوٹے سے آئینے میں آکر بیٹھ جاتا۔

گھر کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ بہت سی کتب کی فضا مذہبی تھی، سمادھی میں مگن رشیوں کی مانند۔ تاہم کئی تاریخی تصانیف کی فضا اس قسم کی بھی تھی جن میں کسی مینکا یا اُروشی کے آنے سے رشیوں کی سمادھی ٹوٹ جاتی تھی۔ یہ دوسری قسم کی کتابیں اس طرح کی تھیں، جن کو پڑھتے ہوئے ان کی کسی سطر میں نکل کر اچانک میرا سولھواں سال میرے سامنے آکھڑا ہوتا تھا —— لگتا تھا، یہ سولھواں سال بھی جیسے کسی اپسرا کا روپ تھا جو میرے سادہ لوح بچپن کی سمادھی بھنگ کرنے کے لئے کبھی اچانک میرے سامنے آکھڑا ہوتا تھا..... کہتے ہیں، ہر اپسرا جو کسی نہ کسی رشی کی سمادھی بھنگ کرنے آتی تھی، راجہ اندر کی سازش ہوتی تھی۔ میرا سولھواں سال بھی ضرور قدرت کی سازش ہوگی کیونکہ اس نے میرے سیدھے سادے بچپن کی سمادھی توڑ دی تھی۔ میں نظمیں لکھنے لگ گئی تھی اور ہر نظم مجھے خواہش ممنوعہ ایسی لگتی تھی۔ کسی رشی کی سمادھی ٹوٹ جائے تو بھٹکتے رہنے کا شراپ اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے، فکر و غور کا شراپ میرے پیچھے پڑ گیا.....

لیکن سولھویں سال کے ساتھ میرا طبعی رشتہ نہ تھا، چوری کا تعلق تھا۔ اس لئے وہ بھی میری طرح، میرے والد کے سامنے سہم جاتا تھا۔ اور مجھ سے دور ہٹ کر کسی دروازے کے پیچھے جا کھڑا ہوتا تھا۔ اور اس کو چھپائے رکھنے کے لئے میں ایک پل میں جو من مرضی کی نظم لکھتی تھی، دوسرے پل پھاڑ دیتی تھی۔ اور والد کے سامنے پھر سیدھی سادھی اور فرمانبردار بچی بن جاتی تھی۔ میرے والد کو میرے نظم لکھنے پر اعتراض نہ تھا بلکہ قافیہ و ردیف کی بات مجھ کو میرے والد نے سکھائی تھی، صرف تقاضا یہ تھا کہ میں مذہبی نظمیں لکھوں۔ اور میں فرمانبردار بچی کی طرح وہی دینی نوعی نظمیں لکھ دیتی تھی۔ (عمر کے سولھویں سال میں ہر اعتقاد روایتی ہوتا ہے، اور اس لئے دقیانوسی بھی) یوں سولھواں سال آیا اور چلا گیا۔ ظاہر طور پر کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ اصل میں یہ سال عمر کی سڑک پر لگا ہوا خطرے کا نشان ہوتا ہے —— (کہ گذرے سالوں کی ہموار سڑک ختم ہو گئی ہے، آگے سے اونچی نیچی اور بھیانک موڑوں والی سڑک شروع ہو گی۔ اور اب ماں باپ کی نصیحت سے لے کر اسکول کے درس یاد کرنے، وعظ کو سننے ماننے اور سماجی بناوٹ و تشکیل کو احترام سے قبول کرنے تک کے بھولے بھالے اعتقاد کے سامنے ہر دن ایک سوالیہ فقرہ آکھڑا ہو گا۔ ...) اس سال میں جانا پہچانا سب کچھ تن کے کپڑوں کی مانند تنگ ہو جاتا ہے، ہونٹ زندگی کا رس سے خشک ہو جاتے ہیں، آسمان کے تارے جن کو سپت رشیوں کی صورت میں دیکھ کر دور سے پرنام کی جاتی تھی، قریب جا کر چھونے کو جی چاہتا ہے..... اردگرد اور دور و نزدیک کی ہوا میں اتنی ممانعتیں اور انکار ہوتے ہیں اور اتنی مخالفت کہ سانسوں میں

آگ سلگ پڑتی ہے......

جس حد تک یہ سب کے ساتھ پیش آتا ہے، میرے ساتھ اس سے تین گنا بڑھ گیا (ایک اداس گرد کی متوسط طبقہ بے رونق اور رکی ہوئی رہن سہن۔ ایک ماں کی محرومی کے سبب ہر وقت انکار کی آگ تو ایک باپ کے مذہبی رہنما ہونے کی حیثیت میں مجھ پر بھی بندشیں میں عجیب کی پابندی) اس لئے سولہویں سال سے میری واقفیت اس ناکام محبت کی مانند تھی جس کی کسک ہمیشہ کے لئے کہیں پڑی رہ جاتی ہے شاید اسی لئے وہ سولہواں سال بھی اب میری زندگی کے ہر برس میں کہیں نہ کہیں شامل ہے۔

اس روح کا پر جلوہ میں نے اس کے بعد کئی بار دیکھا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے وقت بھی دیکھا تھا۔ سماجی، سیاسی اور مذہبی قدریں شیشے کے ظروف کی مانند ٹوٹ گئی تھیں اور ان کی کرچیں لوگوں کے پاؤں تلے بچھی ہوئی تھیں۔ یہ کرچیں میرے پاؤں میں بھی چبھی تھیں اور میری پیشانی پر بھی۔ زندگی کے منہ کو دیکھنے کی تڑپ میں میں نے اسی تپش میں مبتلا نہ کر نظمیں لکھیں جس تپش کے ساتھ کوئی سولہویں سال میں اپنے محبوب کا چہرہ ڈھونڈنے کے لئے لکھتا ہے، اور اسی طرح بیرونی ممالک کے حملوں کے وقت ویت نام کی طویل جنگوں کے دوران اور چیکوسلواکیہ کی مجبوری کے وقت۔

میرا خیال ہے جب تک آنکھوں میں کوئی حسین تصور برقرار رہتا ہے اور اس تصور کی راہ میں جو کچھ بھی غلط ہے اس کے ساتھ جذبہ قائم رہتا ہے اس وقت تک آدمی کا سولہواں سال بھی قائم رہتا ہے (خدا کی ذات کی طرح ہر صورت میں)

حسین تصور، ایک محبوب کا رخ ہو یا زمین کے چہرے کا اس میں کوئی فرق نہیں۔ یہ دل کے سولہویں سال کے ساتھ والے تصور کا رشتہ ہے اور میرا یہ رشتہ ابھی تک قائم ہے۔

خدا کی جس سازش نے 'یہ سولہواں سال' کسی اپسرا کی طرح بھیج کر میرے بچپن کی محویت توڑ دی تھی۔ اس سازش کی میں قرض دار ہوں۔ کیونکہ اس سازش کا تعلق صرف ایک سال سے نہیں بلکہ میری عمر سے ہے'

میری ہر سوچ اب بھی وقتاً فوقتاً میرے سیدھے سادے دلوں کے تسلسل کو شکستہ کرتی ہے۔ (اور صبر استقلال سے زندگی کی غلط قدروں سے کی ہوئی صلح اس مراقبے کی طرح ہوتی ہے جس میں عمر ضائع ہو جاتی ہے) اور میں خوش ہوں کہ میں نے مراقبے کے سکون کی نہیں پائی۔ تڑپ کے بے چینی کا عذاب پایا ہے، اور میرا سولہواں سال اب بھی آج میرے ہر سال میں شامل ہے، صرف اب یہ چہرہ انجانا نہیں رہا بلکہ سب سے زیادہ جانا پہچانا ہو گیا ہے۔ اور اب اسے دیواریں پھاند کر چوری سے آنے کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ ہر خدعت کو سرِعام چیر کر آتا ہے، صرف بیرونی مخالفت کو نہیں، میری عمر کے پچاسویں سال کی مخالفت کو بھی توڑ کر ——— اور ان کی سب علامتیں اسی طرح ہیں ——— اب بھی ارد گرد کا سب کچھ، جسم کے لباس کی مانند روح کو تنگ محسوس ہوتا ہے۔ لب زندگی کی تشنگی سے خشک ہو جاتے ہیں۔ آسمان کے تاروں کو ہاتھوں سے چھو لینے کے لئے جی چاہتا ہے۔ اور کوئی بے انصافی چاہے دنیا میں کسی سے بھی ہو اس کے خلاف میرے سانسوں میں آگ سلگ جاتی ہے۔

ایک پرچھائیں ———

ایک دھندلی سی پرچھائیں تھی جو میرے چلنا سیکھنے کے ساتھ ساتھ ہی چل پڑی تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ جان لیا کہ اس میں بہت

کچھ ملا جلا سا اپنے محبوب کا بھی، اپنا چہرہ بھی جو ابھی تک میری تمنا تھی۔ ـــ مجھ سے کہیں زیادہ سمجھدار، گمبھیر اور طاقتور، اور اس کے علاوہ اپنے وطن کا اور ہر ملک کے آدمی کا چہرہ تھی۔

جو لکھتی رہی ـــ اسی ہڈیوں کے ڈھانچے کو گوشت اور خون دینے کے لئے لکھتی رہی، اس کے دھندلے رنگ میں اجالے کا رنگ بھرنے کی آرزو میں۔

یہ ایک طرح خدا کی زمین پر دستار ہونے کی آرزو تھی شاید اسی لئے یہ ایک چہرے تک محدود نہیں رہا۔ جہاں کہیں بھی خوبصورتی کا کوئی ذرہ سے وہاں تک نمایاں ہوگیا۔ اردو میں سہرے جس کے لئے لکھا تھا بہت سے میرے ہمعصر ہیں صرف اسلئے "میں" میرا ہمعصر نہیں۔

یہ ایک درد تھا، کسی پرندے کے گیت کی مانند۔ ایک پل فضا میں، دوسرے پل کہیں بھی نہیں۔ جس کان نے اسے سن لیا، ٹھیک ہے نہیں سنا، تو بھی ٹھیک ہے۔ کسی کے کانوں پر نہ کوئی حق ہے نہ کوئی دعویٰ۔

بہت چھوٹی سی تھی، اس وقت حیران ہوئی کہ میرے اردگرد کتنی ہی آوازیں تھیں جو گالیاں بن گئی تھیں۔ کتنے ہی ناموں کے جھنڈے تھے اور چبوترے جن پر وہ جھنڈے نصب تھے انہوں نے پکارا میں بھی وہاں اپنے نام کا کوئی جھنڈا لہرانا ہے، کہنا چاہا ـــ "دوستو! تمہارے چبوترے اور تمہارے جھنڈے تمہیں مبارک، مجھے کچھ نہیں چاہیئے، فریب میں نہ آؤ۔

دیکھا ـــ کوئی کہنا سننا ممکن نہیں، سمجھا کہ وقتی بات ہے کسی وقت تو ممکن ہوگی۔ لیکن اپنی زبان کے فنکاروں کے ہاتھوں یہ کبھی ممکن نہیں ہوئی۔ نہ آج سے تیس برس پہلے نہ آج۔

یہ میرا پہلا المیہ تھا۔ لیکن معلوم نہیں تھا، کہ عمر جتنا طویل ہوگا۔

کچھ بزرگ چہرے تھے ـــ گوربخش سنگھ جی، دھنی رام چاترک، پروفیسر تیجا سنگھ، جو پیار سے، شاید رحم سے مسکراتے تھے۔ لیکن ان میں سے دو چہرے بہت جلدی بچھڑ گئے۔ اور گوربخش سنگھ جو کچھ ادب میں نمایاں ہوئے تھے وہ جلدی گوشہ نشین ہو گئے شاید غائب۔

دل کی تہوں میں سب سے پہلا درد جس کے چہرے کی روشنی میں دیکھا وہ اُس مذہب کا تھا جس مذہب کے لوگوں کے لئے گھر کے برتن بھی الگ کر دیے جاتے تھے۔ وہ چہرہ تھا جو میرے اندر کے انسان کو اتنا وسیع کر گیا کہ ہندوستان کی تقسیم کے وقت تقسیم کے ہاتھوں تباہ ہو کر بھی دونوں مذہبوں کے مظالم بغیر کسی رو رعایت لکھ سکی۔ یہ چہرہ نہ دیکھا ہوتا تو پنجر ناول کا مقدمہ نہ جانے کیا ہو۔

بیس، اکیس سال کی تھی جب تخیلی چہرہ اس زمین پر دیکھا تھا (اس ملاقات کو کئی سالوں کے بعد میں نے تفصیل سے آخری میں لکھا تھا) یہ سی، کی طرح اور آگ میں نہانے کی حالت تھی ـــ یہاں تک کہ ۱۹۵۶ء میں جب اکاڈمی کا ایوارڈ ٹیلیفون پر خبر سنتے ہی سر سے پیروں تک میں تپش میں ڈوب گئی۔ خدایا! یہ "سنہڑے" تو میں نے کسی انعام کے لئے نہیں لکھے تھے جس کے لئے لکھے تھے اس نے نہیں پڑھے۔ اب ساری دنیا بھی پڑھ لے تو مجھے کیا۔

اُس دن شام کے وقت ایک پریس نے نامہ نگار بھیجا، فوٹوگرافر بھی، وہ جب تصویر لینے لگا اس نے کاغذ قلم کے ساتھ وہ لمحہ گرفت میں لینا چاہا جو کسی نظم کے لکھنے کا لمحہ ہوتا ہے میں نے سامنے میز پر کاغذ رکھا اور ہاتھ میں قلم پکڑ کر کوئی نظم لکھنے کی جگہ۔

ایک بے خودی کی حالت میں اس کا نام لکھنے لگ پڑی جس کے لئے "سنیہڑے" لکھے تھے ــــ ساحر، ساحر، ساحر، ساحر ــــ سارا کاغذ بھر گیا۔

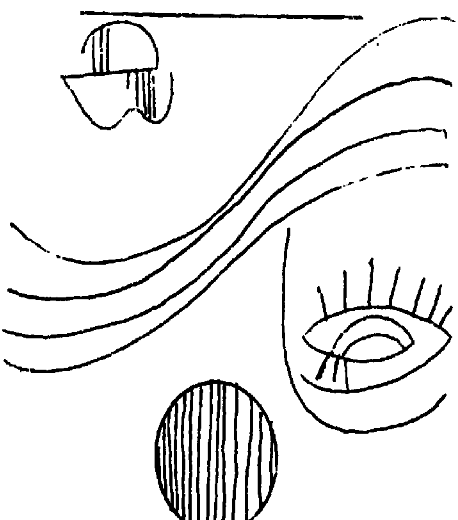
پریس کے لوگ چلے گئے تو اکیلے بیٹھے ہوئے مجھے ہوش آیا۔ صبح اخبار میں تصویر ہوگی تو میز کے کاغذات کے اوپر یہ ساحر ساحر کی گردان ادھر آیا !

مجنوں کے لیلے لیلے پکارنے والی حالت میں نے اس دن اپنے تن بدن پر گزاری۔

یہ بات، دوسری ہے کہ کیمرے کا فوکس میرے ہاتھ پر تھا کاغذ پر نہیں تھا۔ اس لئے دوسرے دن کے اخبار میں کاغذ پر کچھ نہیں پڑھا جاسکتا تھا۔ (کچھ نہیں پڑھا جاسکتا تھا اس بات کی تسلی میں ایک درد بھی شامل ہوگیا۔ کاغذ خالی دکھائی دیتا ہے۔ لیکن خدا جانتا ہے کہ خالی نہیں تھا) ساحر کا میں نے تھوڑا "اشو" ناول میں بھی ذکر کیا، پھر ایک نظم "ایتنا" میں اور پھر "دلی کی گلیوں میں" ساگر کی صورت میں۔

نظمیں کئی لکھی تھیں "سنیہڑے" سب سے لمبی نظم "بغیر نام کی سب نظمیں" اور ایک آخری نظم "اگ رہی اپنے بات ہے تری اپنی بات پائی سی" لکھ کے محسوس ہوا کہ اب چودھواں برس کا بن باس گزار کر آزاد ہوگئی ہوں۔ لیکن گذرے ہوئے برس جسم پر پہنے ہوئے لباس کی مانند نہیں ہوتے یہ جسم کے تل بن جاتے ہیں چاہے زبان سے کچھ نہیں کہتے جسم پر چپ چاپ چھپے رہتے ہیں۔ کئی برسوں کے بعد ــــ بلغاریہ کے جنوب کی طرف "وارنا" میں ٹھہری ہوئی تھی جس کے ایک طرف سمندر تھا اور ایک طرف جنگل اور ایک طرف پہاڑ ــــ وہاں ایک رات کو محسوس ہوا جیسے سمندر کی طرف سے ایک کشتی آئی ہو اور کوئی کشتی میں سے اتر کر کھڑکی کی طرف سے پورے کا پورا میرے ہوٹل کے کمرے میں آگیا ہو۔

ہوش اور بے ہوشی آپس میں یکجا ہوگئی تھیں۔ اس رات نظم لکھی تھی "تیریاں یاداں بہت دیر ہوئی جلاوطن ہوئے۔"





خدیجہ مستور

"......... بھیّا ندیم کی سرپرستی پر چہ میگوئیاں بھی ہوئیں۔ سب نے اپنے اپنے ذہن کے مطابق سوچا مگر مجھے آج بھی اِن باتوں کا ملال نہیں۔ ظالموں نے میرے ناصر نانا کو جیل بھیج دیا تھا۔ صرف اس لئے کہ وہ سچ بولے تھے۔ ندیم بھیا، بھیّا ہی رہے۔ سچ پر کون پہرے بٹھا سکتا ہے —— ؟ ——"

اپنی عمر کے لئے کون اندازے نہیں لگاتا۔ تقریباً ہر شخص یہی سوچتا ہے کہ اگر عمرِ خضر نہ پائی تو ساٹھ ستر سال تو ضرور ہی جی لیں گے کل کی کسی کو بھی خبر نہیں ہوتی اور نہ کل کی آنے والی موت کے لئے سوچ سوچ کر کوئی دہلنا پسند کرتا ہے۔ میرا بھی یہی خیال تھا کہ عمر کے اسی حصے میں آپ بیتی لکھوں گی جسے بڑھاپا کہتے ہیں۔ اس وقت لے دے کے انسان کے پاس صرف یادیں رہ جاتی ہیں۔ وہ اذیت ناک ہلا یا فرحت بخش مگر ایڈیٹر اور میرے برادرِ محترم طفیل صاحب مصر ہیں کہ کچھ نہ کچھ لکھ دیجئے۔ سو میں جو کچھ لکھوں گی وہ میری آپ بیتی کے صرف چند تاثرات ہوں گے۔ آج اگر میں بہت کچھ لکھنے کی کوشش کروں تو وہ قبل از وقت ہوگا۔ مجھے اس دنیا کو کچھ اور دیکھنے دیجئے۔ کچھ اور سیکھنے دیجئے اور وہ زمانہ بھی آنے دیجئے۔ جب یادوں کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا جب کہ میری ننھی سی اکلوتی بیٹی مجھے چھوڑ کر ایک نئے گھر میں آباد ہو جائے گی اور میرا اکلوتا بیٹا پرویز یا اپنی دلہن کے وجود میں کھو کر مجھے بھول جائے گا اور ظہیر بابو شاید عینک لگا کر گہرے مطالعے میں غرق رہا کریں گے تو پھر میں کیسی تھکن اور تنہائی محسوس کروں گی۔ اس وقت میں احساسِ تنہائی سے بچنے کے لئے اپنی آخری کتاب لکھوں گی جسے آپ بیتی کہا جائے گا۔

میرا بچپن ان غریب بچوں سے کھیل کر گزرا جنہیں لوگ اپنی زبان میں پنچ کہتے ہیں۔ میری رشتے کی ایک پھوپی مجھے بچوں سے کھیلتے دیکھ کر کہتی تھیں کہ دیبوں کے گھر بھوت پیدا ہوا ہے۔ میرے کھیل اپنی سب بہنوں اور بھائی سے بالکل مختلف ہوتے تھے۔ گلی ڈنڈا، کبڈی، گیڈی، تالاب میں بھینسوں کے ساتھ تیرنا، درختوں پر چڑھنا۔ بچپن میں مجھے جنون سا تھا کہ اونچے سے اونچے درخت سر کروں، مگر یہ عجیب بات ہے کہ میں کبھی گری نہیں۔ ہاں کبھی کبھی فراک پھٹ جاتی تھی جس پر گھر میں مار بھی پڑ جاتی تھی اور اس مار کا گہرا اثر ہوتا کہ گھنٹوں روتی تھی۔ بچپن میں جب میں نے کھیلنا سیکھا تو عام لڑکیوں کی طرح گھروندے بنا کر کھیلتی تھی۔ مگر جلد ہی مجھے گھروندے بنانے سے نفرت ہو گئی۔ میں بڑی مشقت سے گھروندا بناتی مگر کوئی نہ کوئی شریر بچہ لات مار دیتا۔ میرے لئے بچوں کی یہ حرکت بڑی اذیت ناک ہوتی تھی۔ گھروندا بنا کر میں نے کبھی خود نہیں توڑا۔

آٹھ سال کی عمر میں قرآن پاک ختم کر کے شوق چرایا کہ اپنے ساتھ کھیلنے والے بچوں کو بھی قرآن شریف پڑھا ڈالا جائے۔ دو تین مہینے تک برآمدے میں دری بچھا کر بچوں کو انتہائی بزرگی کے ساتھ سبق پڑھائے اور ابھی ان کا ایک ایک پارہ بھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ ان کی کند ذہنی سے تنگ آ کر سب کو بھگا دیا۔ انہی دنوں کہانیاں لکھنے کا شوق بھی پیدا ہوا۔ والدہ اور والد کی زبان سے لفظ پلاٹ سن لیا تھا، مطلب بھی معلوم کر لیا۔ اس کے بعد کہنا شروع کیا کہ میرے دماغ میں تو سینکڑوں پلاٹ ہیں۔ خوب مذاق اڑتا مگر میں ڈھیٹ بنی رہتی۔ ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں کوئی پرستان نام کی تھیٹر کمپنی آئی تھی۔ ابا میاں نے اپنے ایک عزیز دوست کے ساتھ مجھے، ہاجرہ اور عائشہ بجیا کو لکھنؤ بھیج دیا تاکہ بچوں کی تفریح ہو جائے۔ وہاں شوکت تھانوی مرحوم تھے۔ ہمارے گھر میں ان دنوں شوکت صاحب کی "سودیشی ریل" کا چرچا تھا۔ میں سخت بیتابی سے ملی اور انہیں بھی بتایا کہ میرے دماغ میں بہت سے پلاٹ ہیں۔ میں بھی کہانیاں لکھوں گی۔ شوکت صاحب

مرحوم دوسروں کی طرح ہنسے نہیں (پتہ نہیں دل میں وہ بھی ہنس رہے ہوں) بلکہ بڑی سنجیدگی سے فرمایا کہ تم ضرور لکھو گی۔

۱۹۳۰ء میں ابا میاں کا انتقال ہو گیا اور ان کے مرنے کے بعد راز کھلا کہ یہ ایک معقول قسم کی تنخواہ پر حاتم طائیوں جیسی زندگی گزارنے والے ابا میاں اپنے تلے اوپر کے سات عدد بچوں کے لئے کچھ بھی نہیں چھوڑ گئے۔ اس کے بعد ایک لمبے عرصے تک زندگی کس طرح گزری، یہ ایک پوری داستان ہے۔ سوچتی ہوں کہ جب وہ سب تفصیلیں لکھوں گی تو کلیجے کا کیا حال ہوگا۔ ایک ننھا سا قصہ بتاتی ہوں۔ والد کے انتقال کے بعد ہم سب لکھنؤ آ گئے۔ ہمارا مکان اسی جگہ تھا جہاں والد کے پیر نانا کا مزار تھا۔ مزار پر روز گھی کے چراغ جلتے۔ جانے کہاں کہاں سے عورتیں آتیں اور مزار کا طاق گلگلوں سے بھر کر چلی جاتیں۔ ایک بات ہمارے گھر فاقہ تھا کیونکہ ماموں میاں کا منی آرڈر آنے میں دیر ہو گئی تھی۔ میرا چھوٹا بھائی توصیف جو صرف چھ سات سال کا تھا بھوک سے بلبلا کر طاق پر سے گلگلے اٹھا لایا۔ باجی اماں (میری اُمّی) نے اسے سمجھایا کہ یہ گلگلے تو محتاجوں کے لئے ہوتے ہیں اور یہ سنتے ہی معاً بچہ گلگلے اسی طاق پر رکھ آیا۔ ہم نے دکھوں کا وہ زمانہ انتہائی خاموشی اور غرور سے گزارا۔ اپنوں کو ہمارا حال کبھی نہ معلوم ہو سکا جو ہمارے دکھوں کی لو میں رہتے تھے۔ ہم کبھی ان کے سامنے شرمندہ نہیں ہوئے۔ اس زمانے میں ہم سب بے حد حساس ہو گئے تھے۔ ہم کوسوں دور سے خلوص اور محبت کی ننھی سی کرن کو بھی تاک لیتے تھے اور سنبھل سنبھل کر ان کرنوں کے سائے میں قدم اٹھاتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک آدھ بار دھوکا بھی کھایا۔ مگر میں آج تک سوچتی ہوں کہ کیا دھوکا دینے والے کامیاب رہے؟ کیا انہوں نے خود اپنے آپ کو دھوکا نہیں دیا تھا؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ ان کے دھوکوں کے بعد بھی میرا ایمان محبت اور انسان کی عظمت پر سے نہیں اٹھا! میرے ابا میاں مرحوم، میرے ماموں میاں مرحوم، میرے سوتیلے والد مولانا مصطفےٰ خاں صاحب مداح (احمق پھپھوندوی مرحوم)، میری سوتیلی والدہ، میرے پیارے سوتیلے بھائی، میرے منہ بولے نانا سید ناصر حسین صاحب مرحوم۔ کیا محبت اور ایثار کی ایسی مثالیں مل سکتی ہیں؟ جب میں اپنی آپ بیتی لکھوں گی اور جب بیس پچیس سال بعد آئندہ نسلیں اسے پڑھیں گی تو وہ یقیناً اسی طرح حیران ہوں گی جیسے کہ حاتم طائی کے قصے پڑھ کر دنگ رہ جاتی ہوں۔ ان کے لئے میرے اکلوتے ماموں میاں کتنے عجیب سے انسان ہوں گے جو ناز و نعم میں پرورش پانے کے بعد اپنی بیوہ بہن اور بھانجیوں کو سنبھالنے کے لئے اپنے مستقبل کو تاریک کر کے اٹھارہ[۱۸]، انیس سال کی عمر میں نوکری کرنے پردیس چلے گئے۔ اپنی ساری کمائی ہمارے پیٹ کے جہنموں میں جھونک کر جانے خود کس طرح گزارہ کرتے تھے اور پھر سال کے اندر آنتوں کی دق لے کر وطن واپس آ گئے۔ اور وہیں ہمیشہ کی نیند سو گئے اور یہ نئی نئی کوٹھیاں بنانے کے لئے ہزاروں جتن کرنے والے کب یقین کریں گے کہ نانا ناصر نے اپنا سر چھپانے کا سہارا، اپنے باپ دادا کی یادوں کا مرکز، اپنا گھر لکھنؤ سے لاہور آنے کے سلسلے میں کوڑیوں کے مول بیچ دیا۔ فقط یہی نہیں بلکہ لکھنؤ کے حکیموں کے خاندان کا یہ معزز فرد ہم سے ملنے کی خاطر ایک دن کی جیل بھی جھیل آیا۔ مگر جیل اور مقدمے سے فرصت پاتے ہی پاکستان آ کر رہا۔ ناصر نانا کو مرے پورا ایک سال ہونے آ رہا ہے مگر آج بھی جب میں اپنے میکے اپنے لاڈلے بھائیوں، بہنوں اور ماں کو دیکھنے جاتی ہوں تو وہاں مجھے نانا ناصر نظر آ جاتے ہیں۔ لحاف اوڑھے، بستر پر بیٹھے کھانس رہے ہیں، سانس چڑھ رہی ہے، مگر آنکھوں سے خوشی ٹپک رہی ہے۔ وہ سر اونچا کر کے کہتے ہیں "دیکھو بیٹیا۔ کیا میں نے جھوٹ بولا تھا۔ جب میں نے پاسپورٹ بنوانے کی درخواست دی تو اس میں لکھا تھا کہ میں اپنی بیٹی انور جہاں (میری اُمّی) سے ملنے جانا چاہتا ہوں۔ تحقیق کرنے کے بعد ان ظالموں نے کہا کہ میری کوئی بیٹی نہیں۔ مجھے حوالات میں بھیج دیا۔ لے بھلا تو میری بیٹی نہیں؟ دیکھ میں تو آ کر رہا۔ روک لیتے تو جانتا۔"

اور پھر احمد ندیم قاسمی، میرے بھیا، میرے سرپرست، میرے شوہر کے ماموں اور سسرال والوں کی نظروں میں میرے خسر، بھیا کے لئے میں صرف اتنا ہی لکھوں گی۔ کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے سب کچھ لکھنا شروع کر دیا تو ان گنت صفحے بھر جائیں گے۔ ہاں صرف ایک بات ضرور کہوں گی کہ بھیا ندیم کی سرپرستی پر چہ میگوئیاں بھی ہوئیں۔ سب نے اپنے اپنے ذہن کے مطابق سوچا۔ مگر مجھے آج بھی ان باتوں کا ملال نہیں۔ ظالموں نے میرے ناصر نانا کو جیل بھیج دیا تھا، صرف اس لئے کہ وہ سچ بولتے تھے۔ ندیم بھیا بھیا ہی رہے۔ سچ پر کون پہرے بٹھا سکتا ہے؟

۱۹۴۲ء میں لکھنا شروع کیا اور ایک رسالے کو (جس کا نام اب یاد نہیں) اپنی کہانی چھپنے کے لئے بھیج دی۔ کہانی تو خیر چھپی مگر میرے نام رسالہ آ گیا۔ اس قدر خوشی ہوئی کہ نہ تو اس دن کھیلنا یاد رہا اور نہ کھانا۔ رسالے پر سے پتے کی چٹ اتار کر بڑی حفاظت سے بکس میں رکھ دی۔ پھر بہت سوچ سمجھ کر ایک مضمون لکھا اور وہ ایک زنانے پرچے میں سچ مچ چھپ گیا۔ یہ مضمون پردے کی حمایت میں تھا۔ اور ثابت کیا تھا کہ پردہ اتارنا سخت بے حیائی کی بات ہے۔ کہانیوں کے ساتھ ساتھ دو چار شعر بھی کہہ لیتی مگر جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ شاعری اپنے بس سے باہر ہے۔ کہانیوں کا بھی یہی حال رہا۔ جانے کتنی لکھیں اور پھاڑیں۔ پھر بھی "خیام" اور "عالمگیر" میں ابتدائی کہانیاں برابر چھپتی رہیں۔ ۱۹۴۵ء میں ذرا سنبھل کر لکھنا شروع کیا اور اس روز بڑی مسرت ہوئی جب سید احتشام حسین صاحب کا ایک مضمون لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوا اور اس مضمون میں میری کہانی "گھن" کی بڑی تعریف تھی۔ میں اس وقت تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ اتنے بڑے نقاد میری کہانی کی تعریف کریں گے۔ اس ہمت افزائی کے بعد میں نے اور بھی سنبھل کر لکھنا شروع کیا اور اب تک لکھ رہی ہوں۔ ایک ناول اور افسانوں کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ناول پر "آدم جی ادبی انعام" بھی ملا تھا۔ اپنے لکھے سے آج تک مطمئن نہیں ہوئی۔ شاید میں ایک چیز ایسی بھی لکھ سکوں جس سے خود بھی مطمئن ہوں۔

۱۹۵۰ء میں میری شادی ظہیر بابر سے ہو گئی۔ اب ایک بیٹی اور ایک بیٹے کی ماں ہوں۔ ازدواجی زندگی خاصی پرسکون ہے۔ میں عام بیویوں کی طرح ہی جان سے ظہیر کو چاہتی ہوں۔ حالانکہ لوگوں کو یہ شبہ ہی رہتا ہے کہ یہ افسانہ نگار عورتیں گھریلو زندگی کیا گزارتی ہوں گی۔ وغیرہ وغیرہ۔

۱۹۵۰ء میں ہی انجمن ترقی پسند مصنفین کی لاہور شاخ کی سیکریٹری منتخب کی گئی۔ ہفتہ وار ادبی اجلاسوں کی رپورٹ لکھنا پڑتی مگر مہربانوں نے یہیں سے نکو بنانا شروع کیا، اور یہیں سے سی۔آئی۔ڈی کی مہربانیاں نازل ہوئیں۔ یہ سب کچھ صرف ہفتہ وار ادبی اجلاسوں کی رپورٹ لکھنے کی وجہ سے ہوا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ گناہ بھی ہوتا ہے ——— مجھے اپنی سب بہنوں اور بھائیوں سے بے تحاشہ محبت ہے مگر جانے کیسے مجھے ہاجرہ سب سے زیادہ عزیز رہی۔ ہم ہمیشہ ساتھ رہے۔ شادی بھی ایک ہی روز کی۔ شادی کے بعد بھی لاہور میں صرف گھر الگ الگ ہو گئے تھے۔ مگر روز ملنا ہوتا۔ اب جب سے ہاجرہ کراچی میں مقیم ہے تو مجھے لاہور پردیس لگنے لگا ہے۔ جانے یہ پردیس کب دیس بنے گا۔



ہاجرہ مسرور

"...... اُن کا کہنا تھا کہ ایسی کہانیاں لکھوگی تو مستقبل خراب ہو جائے گا، لوگ سمجھیں گے کہ ان کہانیوں کی ہیروئین تم خود ہو۔ اس وقت تو یہ دُور اندیشی ہمیں قائل نہ کر سکی مگر میری منگنی کے بعد ایک خاتون نے یہی مثالیں دے کر میرے ہونے والے شوہر کو شادی سے باز رہنے کا مشورہ دیا تھا ——— ......"

میں نے پرانے لکھنؤ کے ایک پرانے سے گھر میں زندگی کی پہلی سانس لی۔

میں ایک کم عمر ماں اور نوجوان باپ کی تیسری بیٹی تھی۔

اس وقت میرے والد تعلیم کی تکمیل کے بعد گھر میں بیکاری کے دن ملازمت کے لئے درخواستیں ٹائپ کر کے کاٹ رہے تھے۔

میری پیدائش کے تیسرے روز میرے والد کو ملازمت کا بلاوا آگیا۔ اور ان کی پہلی تقرری ایک قصبے میں ہوئی۔ اس کے بعد میری زندگی کا پورا ابتدائی زمانہ اپنے والدین کے ساتھ یو۔ پی کے مختلف اضلاع میں بسر ہوا۔

میری تعلیم کی ابتدا اپنی بہنوں کے ساتھ گھر پر رہ کر ہوئی۔ دن کے مختلف اوقات میں قرآن پاک، فارسی اور اسکول کا مروجہ نصاب پڑھانے والے مختلف استاد آتے اور پڑھا پڑھا کر ناک میں دم کر دیتے۔

میں ان استادوں کی نظر میں خاصی پرشوق اور کند ذہن بچی ثابت ہوئی۔ استادوں کے سامنے شوق سے بیٹھنے کی ابتدا اس وقت ہوئی، جب میں نے بچوں کے ایک رسالے میں سے "سنڈریلا" کی کہانی بڑی بہن کی زبان سے سنی اور جب اس کہانی کو بار بار سننے کی خواہش کی تو ہر ایک سے جھڑکیاں ملیں۔

میرا بچپن ایسا خوفناک اور جینیل کے بچوں جیسا بچپن نہیں تھا جن کا ذکر بعض خواتین و حضرات بہت بہت ہلک ہلک کر کرتے ہیں۔ اس کے باوجود میں دور کو یاد کرتی ہوں تو مجھے کسی بڑی چبھن اور ناانصافی کی یاد نہیں آتی۔

ہمارے ہاں کھانے پینے کی چیزیں بچوں سے چھپا کر رکھنے کا طریقہ نہیں تھا۔ اور نہ دوسرے بچوں سے گھلنے ملنے کی پابندی تھی۔ ہمارے ساتھ کھیلنے والے بچوں کو امیر غریب کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاتا۔ گھر آنے والے سب بچوں کے ساتھ ایک سا سلوک ہوتا تھا۔ پابندی تھی تو یہ۔ بچے کوڑا گھروں میں گھس کر نہ کھیلیں۔ ہم کو کپڑا عموماً سادہ اور سوتی ملتا۔ ہاں سلائی اور تراش خراش میں خاصا اہتمام کیا جاتا۔ عید بقرعید کے موقعے پر ہم بچے ریشمی اور رنگین کپڑے پہنتے تو والدین میں سے کوئی نہ کوئی ہمیں جتا دیتا کہ ریشمی کپڑے پہننا کوئی شان کی بات نہیں، شان تو سادگی میں ہے۔

ہمارے ہاں بچوں کو کتابوں کی الماریوں میں ہاتھ ڈالنے کی اجازت تھی اس لئے بچوں کے رسالے پڑھ کر ختم کر لیتے تو جو ملتا پڑھنے لگتے۔

اس زمانے کے تقریباً سبھی اہم ادبی، مذہبی اور دو ایک زنانہ رسائل ہمارے ہاں باقاعدہ منگوائے جاتے تھے۔ کچھ پلے پڑے یا نہ پڑے۔ ان سب کو پڑھ ڈالنا میرا مشغلہ تھا۔ یہی عالم اخبار بینی کا تھا۔ اس سلسلے میں کتابوں کی الماریاں اجڑ جاتیں یا فدیہ سے چھین جھپٹ میں کوئی کتاب یا رسالہ پھٹ جاتا تو امی کے ہاتھ سے ایک آدھ چپت بھی وصول ہو جاتی۔

گھونسے اور چپتیں مجھے اپنے ننھے بھائی سے بھی وصول ہوتی رہتیں۔ لیکن جواب میں اسے پیٹنے یا پٹوانے کا خیال کم از کم میرے ذہن میں جگہ نہ پاتا۔ مجھے اس ننھے شیطان سے بے تحاشا محبت محسوس ہوتی۔ کیونکہ مجھے اپنے ملک کی ہر بچی کی طرح ننھے پن سے ہی بھائی کے رشتے کی قدر و قیمت کا احساس تھا۔ ساون کے دنوں میں ہمارے آنگن میں جھولے کے کھمبے گڑتے۔ بادلوں سے گھرے کسی سرمئی دن میں امی

کی سہیلیاں سادن منانے جمع ہو جاتیں تو کوئی بھائی چڑھتی، گنگنانے تلے جاتے اور میری آپی سب کے ساتھ جھولا جھولتے ہوئے بے حد دبی دبی آواز میں جو گانا گاتیں وہ یہ تھا۔

بھیا کی نبکولی پکی ساون کب آئے گا،
جیوے میری ماں کا جایا ڈولی بھیج بلائے گا

جب بہنوں کے جھولنے کی باری آتی سب مل کر یہی گانا گلے پھاڑ کر گاتیں۔ اور مجھے یہ گانا بہت اچھا لگتا تھا۔ بادل گھرتے ہیں تو میں اب بھی یہی گانا بے ساختہ گنگناتی ہوں۔

میرے والد کسی بڑے شہر میں رہتے ہوتے تو زندگی نسبتاً مشکل اور گمنام سی ہوتی۔ لیکن قصبوں اور چھوٹے چھوٹے شہروں میں میرے والد خاصے اہم اور مقبول شخصیت کے مالک سمجھے جاتے۔ ان کی تھوڑی سی تنخواہ شریفانہ گزر بسر کے لئے کافی تھی۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے کا سستا زمانہ تھا گر میرے والد دوستوں کی خاطر مدارات مستحقوں اور رشتے داروں کی امداد و اعانت کے سلسلے میں چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانے کے عادی تھے۔ ہر ماہ کی پہلی کو اخراجات کا رجسٹر کھلتا تو میرے والدین کے چہروں پر فکر کا سایہ پڑتا نظر آتا۔

اور ان سایوں کی حقیقت مجھے اس وقت معلوم ہوئی جب میرے والد جوانی میں اچانک چل بسے۔

اس کے بعد جو زندگی شروع ہوئی وہ مصیبتوں سے بھرپور تھی۔ یہ طویل داستان باپ کی موت سے لے کر میری شادی کے زمانے تک پھیلی ہوئی ہے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب دوسری جنگ عظیم کے شعلے ہندوستان کی سرحدوں تک پہنچ چکے تھے اور ملک میں سیاسی بے چینی ہنگامے کا روپ اختیار کر چکی تھی۔ ایک دن بیٹھے بٹھائے مجھے کچھ لکھنے کا خیال آیا اور میں نے ایک شاعرانہ سی عبارت لکھ ڈالی۔ (میری بہن خدیجہ مجھ سے پہلے ننھے ننھے گیت اپنی کاپی پر لکھنے لگی تھی) میری یہ پہلی نثر نیلے آسمان، لمبی لمبی اڑانیں کرنے والے سفید کبوتروں اور رنگین پتنگوں کے بارے میں تھی جو اس سوال پر ختم ہوتی تھی کہ کیا اس نیلے پرسکون آسمان تلے بم برسانے والے ہوائی جہازوں کو گزرنے کا حق ہے؟ میں نے اپنی اس پہلی تحریر کو اپنی ایک ہم جماعت لڑکی کے نام سے ایک روزنامے میں بھیج دیا اور یہ عبارت ضرورت سے زیادہ نمایاں طریقے پر اخبار کے پہلے صفحے پر چوکھٹے میں چھپ گئی۔ میں نے یہ اخبار خدیجہ کو دکھایا اور وہ اس طرح خوش ہوئی جیسے ہم دونوں کو کوئی دفینہ مل گیا ہو۔ لیکن بڑوں کو میری اس جسارت کا علم نہ ہو سکا اب میں سوچتی ہوں تو مجھے یہ بات بڑی بے تکی معلوم ہوتی ہے کہ میں نے آسمان کی نیلی وسعتوں کے بارے میں الفاظ کا طومار باندھا جبکہ ایک عرصے سے آسمان کی وسعتیں میرے آنگن کے برابر تھیں اور میں نے برسوں سے کسی پرندے کو لمبی اڑان کرتے نہ دیکھا تھا۔

پھر تھوڑے دنوں بعد ایک جلتی دوپہر کو خدیجہ کے حکم پر میں نے لکھنا شروع کیا۔ جب قلم رکا تو معلوم ہوا کہ میں نے اپنی ادبی زندگی کا پہلا مختصر افسانہ لکھ لیا ہے۔ یہ افسانہ ایک فقیر کے بارے میں تھا۔ جو سڑک پر جیا اور سڑک پر مر گیا۔ میرے ساتھ ساتھ خدیجہ نے جو چیز لکھی وہ ایک مضمون تھا۔ یہ دونوں چیزیں بھی چھپ گئیں۔

اس کے بعد ہم دونوں بہنوں نے بے تحاشا لکھنا اور چھپنا شروع کر دیا تو ہمدردوں تک نے اسے ہماری جرأت بے جا کہا۔ ان کے خیال میں افسانوں کے موضوعات کا تعین بڑوں کے مشورے سے ہونا چاہیئے تھا اس کے بعد ان موضوعات پر ہم کو قلم اٹھانے کی جرأت کرنا

چاہئے تھا۔ یہ تجویز اس لئے تھی کہ ہم دونوں نے چھ سات ماہ کے عرصے میں جو بہت سی کہانیاں لکھ ڈالی تھیں ان میں سے کچھ کا موضوع "دبی دبی محبت" تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ایسی کہانیاں لکھو گی تو مستقبل خراب ہو جائے گا۔ لوگ سمجھیں گے کہ ان کہانیوں کی ہیروئن تم خود ہو (اس وقت تو یہ دور اندیشی ہمیں قائل نہ کر سکی مگر میری منگنی کے بعد ایک خاتون نے یہی مثالیں دے کر میرے ہونے والے شوہر کو شادی سے باز رہنے کا مشورہ دیا تھا) اس کے جواب میں میں نے بحث کر کے پوچھا۔ نفسیاتی کہانی اور اسی قسم کی دوسری کہانیاں پڑھ کر بھی وہ ایسا ہی سوچیں گے جو میں نے لکھی ہیں۔ اس کا جواب ان کے پاس نہ تھا۔ بہر حال اس کی وجہ سے خاصی کشمکش ہوئی اور کچھ اچھے دل بھی بُرے ہوئے۔ میری والدہ نے میرا ساتھ دیا (کیونکہ وہ خود زنانہ رسائل کی لکھنے والی تھیں) اس کے بعد کوئی رکاوٹ ہمیں لکھنے سے باز نہ رکھ سکی لیکن اس کے لئے ہم دونوں بہنوں کو بے شمار آنسوؤں کا خراج قدم قدم پر ادا کرنا پڑا۔ بچوں کے رسائل سے لے کر اہم ترین ادبی رسالوں تک پہنچنے کے لئے کڑی محنت کی۔ خود ہی لکھتے خود ہی ناپسند کرتے اور خود ہی دوبارہ سہ بارہ لکھتے۔

گھر سے باہر کی دنیا سے پہلا ادبی مشورہ ہمیں ایک اعلیٰ ادبی رسالے کے مدیر محترم نے دیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ہم دونوں بہنوں نے اپنے ابتدائی دور کے افسانے اس رسالے میں چھپنے کے لئے بھیجے اور جواب کے لئے بار بار تقاضا کیا لیکن مدیر موصوف نے اپنی مکمل خاموشی کی زبان میں جو مشورہ دیا وہ ہمارے بہت کام آیا۔ یہ مشورہ تھا۔ "ابھی اور محنت کرو"۔

اس واقعے سے میرے اعتماد کو دھکا سا لگا۔ اب تک جو اُلم غلم لکھا تھا، جہاں بھیجتے چھپ جاتا، اس موڑ پر آ کر ہم نے اپنی تحریروں پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ خاصا بیکار بھی لکھا ہے۔ اس کے بعد اپنی تحریروں پر اور زیادہ محنت شروع کی۔ اس واقعے کے تقریباً ڈیڑھ دو سال بعد ہم دونوں بہنوں نے "ساقی" کو اپنے افسانے بھیجے اور وہ چھپ گئے۔ اتنے بلند پایہ رسالے میں اپنے افسانے دیکھ کر خوشی کے مارے جو حال ہوا بتا نہیں سکتی۔ یوں ہمارے حوصلے بڑھانے میں جناب شاہد احمد دہلوی کا بڑا حصہ ہے۔

دوسرا ادبی مشورہ اس وقت ملا جب "ادبی دنیا" میں میرا پہلا افسانہ شائع ہوا۔ ساتھ ہی جناب مولانا صلاح الدین احمد صاحب کا ایک ادارتی نوٹ چھپا جس میں انہوں نے میری ہمت افزائی بھی کی لیکن مجھے بسیار نویسی اور سہل انگاری سے دامن بچانے کا مشورہ بھی دیا۔ اس مشورے کو بھی میں نے سر آنکھوں پر رکھا۔

تیسرا ادبی مشورہ مجھے "جناب احمد ندیم قاسمی" سے اس وقت ملا جب میں نے اپنا ایک افسانہ "ادبِ لطیف" میں چھپنے کے لئے بھیجا۔ انہوں نے "محترمہ و مکرمہ ہاجرہ مسرور صاحبہ" کو افسانے کا آخری پیراگراف حذف کر دینے کا مشورہ دیا۔ اور کہا کہ خواہ مخواہ کی عریانیت سے بچوں۔ اُن کا یہ مشورہ میں نے قبول کر لیا۔

اس کے بعد میں نے اور خدیجہ نے خود ہی اُن سے ادبی معاملات پر مشورے طلب کرنا شروع کئے۔ دو تین سال بعد اپنے ایک ذاتی مسئلے کے بارے میں بھی ان کی رائے طلب کر لی۔ تب اچانک مجھے اور میری بہن خدیجہ کو (بلکہ میرے پورے خاندان کو) "محترم و مکرم جناب احمد ندیم قاسمی کے ساتھ ساتھ "ندیم بھائی" بھی مل گئے۔

اعلانِ آزادی کے بعد اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان کا رخ کیا، کراچی پہنچے، اور پھر لاہور چل دیئے۔ ہمارے کئی اعزا نے بہت جلد لاہور ہی پہنچنے کا ارادہ ہم پر ظاہر کیا تھا۔

لاہور ریلوے ویٹنگ روم میں سامان اتارنے کے بعد اپنی بڑی بہن اور ایک ہم سفر دُور کے رشتے دار کے ساتھ تانگے میں بیٹھ کر شہر میں نکلی۔ کسی ڈاکٹر کی تلاش تھی کیونکہ میرا ہاتھ بری طرح مِن کر رہ گیا تھا۔ ڈاکٹر ملنے سے پہلے "مکتبۂ اردو" اور "مکتبۂ جدید" مل گئے۔ لاہور کے ادارے اس لیے بھی ہر چیز سے زیادہ اپنے "نظر آئے" اور ہمارا یہ خیال صحیح ثابت ہوا۔ اور انہی کی مخلصانہ مدد سے لاہور پہنچنے کے دو دن کے اندر ہم اس گھر میں بیٹھے ہوئے تھے جو ابھی تک میرا میکہ ہے۔ قلم کا رشتہ اتنا مضبوط رشتہ ہوتا ہے، اس سے قبل ہمیں معلوم نہ تھا۔

مہربان نہر لاہور کی نسبت روڈ کے اس گھر سے میری زندگی کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔

اس گھر میں پہلی بار ندیم بھائی آ کر ہم سب سے ملے اور ہمیں تسلی دی۔

اسی مکان کے دروازے پر کچھ عرصے بعد "مکتبۂ افسانہ خواں" کا بورڈ لٹکایا گیا اور اسی گھر میں بھائی محمد طفیل کی شرکت سے "نقوش" نکالنے کی اسکیم تیار ہوئی۔

اسی گھر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں ہم دونوں بہنیں اور ندیم بھائی سر جھکا کر گھنٹوں کتابت شدہ کاپیاں پڑھتے، مسودات منتخب کرتے اور ادیبوں کو خطوط لکھتے۔

اسی کمرے میں آ کر ندیم بھائی نے یہ خبر سنائی تھی کہ "نقوش" کی اشاعت پر چھ ماہ کے لیے سیفٹی ایکٹ کے تحت پابندی لگ گئی ہے (ایسی ہی پابندی "سویرا" اور "ادبِ لطیف" پر بھی لگائی گئی تھی)

"نقوش" کے دس شمارے مرتب کرنے کے بعد اسی گھر میں مجھے یہ علم ندیم بھائی کی زبانی ہوا کہ اب ہمارا "نقوش" سے کوئی تعلق نہ ہو گا کیونکہ بھائی طفیل کی کچھ مجبوریاں ہیں۔ اس گھر سے میری اور بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ مثلاً اسی گھر میں خدیجہ کی منگنی کی رسم ندیم بھائی کے بھانجے ظہیر بابر کے نام پر ادا کی گئی اور میں خدیجہ کا ساتھ چھٹ جانے کے خیال سے چپکے چپکے روتی رہی۔

اسی گھر میں احمد علی خاں کے نام کی انگوٹھی میری انگلی میں پہنائی گئی تو میں اس گھر کو چھوڑ دینے کے خیال سے اداس ہو گئی۔

پھر ایک دن اسی گھر کے دروازے پر ہم دونوں بہنیں دلہنیں بنی ٹھٹھک کر کھڑی ہوئیں تو ہمارے بھائیوں نے ہمیں سہارا دے کر نئی زندگی کے حوالے کر دیا۔

اور پھر جب میں اس گھر میں ذرا دیر کو آتی اور مجھے "اپنے" گھر جانے کی جلدی پڑتی تو میرا چھوٹا بھائی کہا کرتا: "سب لڑکیاں شادی کے وقت جھوٹ موٹ روتی ہیں ــــ اب ہمارے پاس ایک دن گزارنا دوبھر ہے؟ ــــ قطعی فراڈ ہیں آپ لوگ۔"

زندگی کا سب سے زیادہ طویل عرصہ لاہور میں گزرا ہے۔ لیکن جب میرے شوہر احمد علی خاں نے پاکستان ٹائمز کی ادارت سے استعفیٰ دیا تو کراچی آنا ہوا ــــ اب تقریباً ڈیڑھ سال سے کراچی میں قیام ہے۔

دو بچیوں کی ماں ہوں۔ پانچ افسانوی مجموعوں اور ڈراموں کے ایک مجموعے کی مصنفہ ہوں ــــ کچھ مضامین بھی مختلف موضوعات پر لکھے ہیں ــــ ایک طویل ڈرامہ اور ایک ناول مکمل کرنے کا ارادہ ہے ــــ کوئی ایسی چیز ابھی تک لکھنے کا ارماں ہے جسے چھپوانے کے بعد پڑھوں تو کسی کمی کا احساس نہ ہو۔



جیلانی بانو

"........ تعریفیں اور حوصلہ شکنی ہر نئے ادیب کا مقدر ہے۔ اگر لکھنے والے میں سچی لگن اور اپنے آدرش کیساتھ خلوص ہے تو وہ تعریفوں اور تنقیدوں کے لئے نہیں لکھتا۔ اسلئے اگر ابتدائی دور میں اس کی حوصلہ شکنی زہر ہے تو تعریف کا نشہ بھی زہر سے کم نہیں ہے ...."

یہ بانو کون ہے!

شاید آپ اس سے بالکل واقف نہ ہوں۔ کیونکہ جس افسانہ نگار جیلانی بانو نے آپ پر رعب جمانے کی کوشش کی ہے وہ میں تو نہیں ہوں۔ میں تو ایک نہایت کاہل مُحتّس قسم کی عورت ہوں جس کی ہر بات بے تکی، ہر کام بے موقعہ۔ کبھی سلیقہ سے بات کرنے کا ڈھنگ تو آیا نہیں تب بھلا افسانے لکھنے کا دعویٰ کون کرے! شاید یہی وجہ ہے کہ مجھ سے پہلی ملاقات پر سب بڑے تعجب سے کہتے ہیں۔

"بھئی آپ کا ہم نے بڑا لحیم شحیم قسم کا تصور کیا تھا۔ آپ تو نہایت مختصر سی نکلیں۔!

اور پھر اسلوب انصاری صاحب کی طرح ہر بات پر بھی تعجب کا اظہار ہوتا ہے۔

"آپ ویسی تو نہیں ہیں جیسی افسانوں میں نظر آتی ہیں۔"

اس وقت مجھ پر سچ مچ ندامت سی چھا جاتی ہے۔ تھوڑی دیر تک کوشش کرتی ہوں کہ کوئی اچھا سا پوز بنا کر بھائیوں کو ذرا باوقار افسانہ نگار نظر آؤں۔ کچھ علمیت بگھارنے کی کوشش کرتی ہوں اور بے حد تکلف کے ساتھ بے تکلفی کا انداز بناتے بناتے گھپلا ہو جاتا ہے! جانے یہ دھاگہ کہاں الجھ جاتا ہے کہ میں پھر تکلف کے جال سے نکل کر نہایت زناٹے کے ساتھ بے تکلفی کے میدان میں دوڑنے لگتی ہوں، ہوش اس وقت آتا ہے جب ملازم کی چوری کا قصہ سنا چکتی ہوں۔ بہت تیرے کی۔ ارے بھئی بڑے افسانہ نگار تو بہت بڑے دل کے ہوتے ہیں۔ ارے توبہ نوکروں کو چوری نہیں لگنے۔ بلکہ ان کی سماجی، سیاسی اور اقتصادی حالت کا تجزیہ کر کے افسانہ لکھ ڈالتے ہیں۔ اپنی کمائی ان کی جیب میں ڈال آتے ہیں۔ اور بس اسی وقت اپنے چھوٹے بہت چھوٹے ہونے کا احساس چھا جاتا ہے۔ لوگ سچ ہی تو کہتے ہیں ——— سچ مچ کے افسانہ نگار تو کچھ اور ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ ہمارے قریب ہی ایک افسانہ نگار رہتی تھیں۔ بچپن میں (جب میں بچوں کے لئے کہانیاں لکھ لکھ کر بہن بھائیوں پر خوب رعب جمایا کرتی تھی۔) وہ افسانہ نگار خاتون میری آئیڈیل تھیں۔ میں دل ہی دل میں منصوبے باندھتی کہ جب بڑی ہو جاؤں گی تو میں بھی ان کی طرح بڑے بڑے افسانے لکھا کروں گی۔ پبلک میٹنگوں میں جاؤں گی۔ چہرے پر سرخ، نارنجی، سیاہ ہرے اودے رنگ کی دھنک بنایا کروں گی۔ بلاؤز ایسے جن کے وجود پر شک ہو اور پھر اردو کے سارے روزمرہ الفاظ کے مبتدل انگلش لفظوں کی پریکٹس بھی تو بڑا جان جوکھوں کا کام تھا۔ لیکن ان کی کاپی کرنے کے لئے جو سب سے ناممکن کام تھا وہ ان کا اپنے بارے میں ہر وقت کہتے رہنا۔ میں — میں — میں ——

پھر جب میں بھی افسانے لکھنے لگی تو کسی کے احوال پوچھنے پر جی چاہتا ہے کہ طویل مختصر افسانے کا انداز اختیار کر دوں۔ لیکن چھوٹی سی کہانیاں لکھتے لکھتے اپنے بارے میں کہنا ہو تو بالکل نقادوں کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہاں سے وہاں تک کہیں ڈھونڈو زندگی کا کوئی شاندار کارنامہ یاد ہی نہیں آتا۔ بڑے فرسودہ انداز میں پالے گئے کہ غیر معمولی انسان بننے کا کوئی اندیشہ نہ رہے اتنی ہی خاموشی سے افسانہ نگار بن گئے کہ وہ ہرے اودے پیلے رنگ جو دور ہی دور سے جھلملایا کرتے ہیں۔ کبھی انہیں منہ پر ملنے کی فرصت ہی نہ ملی۔

میں اس معنوں میں تو یو پی کی ہوں کہ میری ددھیال اور ننھیال وہیں ہیں۔ ابّا ملازمت کے لئے حیدرآباد آئے تو اماں کو بھی ان کے ساتھ آنا پڑا۔ مگر اس طرح کہ تیس برس گزرنے کے باوجود انہیں اپنے میکے کے کوٹھے ابھی تک یاد آتے ہیں۔ ہر سال جب وہ چند مہینے وہاں گزار کے اپنی سسرال (یعنی ہمارے گھر) واپس آتی ہیں تو یوں دھاروں دھار روتی ہوئی جیسے ابھی پہلی بار میکے کی چوکھٹ الانگھی ہو۔

اسی وجہ سے ہم بہن بھائی چوں چوں کا مربہ بن گئے کہ بدایوں جاتے تو وہاں سب مدیہ کہ ذرا ذرا سے بچے ہمیں "حیدرآبادی" پکار کے ناک بھوں سکیڑتے۔ حیدرآباد میں رہتے تو "ہندستانی" کے تحقیر آمیز خطاب ملتے۔ یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

میرا بچپن طویل طویل بیماریوں میں گزرا۔ اس لئے اماں اور خصوصاً ابّا کی بے حد لاڈلی ہوگئی۔ مزاج کی تیزی تو ہمیشہ کی تھی۔ کڑوا کریلا اور نیم چڑھا میرے کمزور بدن اور چڑچڑے پن کی دھونس سہتے سہتے سارے بہن بھائی مجھ سے دور دور رہنے لگے۔ اس لئے میں کسی کونے میں تنہا بیٹھی اپنے آپ سے باتیں کئے جاتی۔ ایسی فضاؤں میں پہنچ جاتی جہاں ہر چیز پہ میرا راج ہوتا۔ ان جاگتے خوابوں نے کچھ حساس بنایا کچھ سوچنے اور غور کرنے کی عادت ڈالی۔ بے چاند کے چھپنے اور بادلوں کے دوڑنے کی شاعرانہ دنیوں سے تشفی نہ ہوتی تھی۔

ہم سات بہن بھائی ہیں۔ پھر ان کی سہیلیاں اور دوست ملاکر پوری بٹالین بنا لیتے۔ سب کو غیر معمولی اور فن کارانہ کام کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اس لئے بچوں کے عام اور گھسے پٹے کھیل کبھی نہ بھاتے۔ محلے کے سارے معمولی قسم کے بچوں کے ہم آئیڈیل تھے۔

ہمارے بولنے اور کھیلنے کی کاپی کرکے انہیں دلی مسرت ہوتی تھی۔ ادھر ہم ہیں کہ بڑے فن کاروں کے انداز میں اسکیچ بنانے کے مقابلے کر رہے ہیں۔ کبھی پینٹنگ کی نمائش ہو رہی ہے۔ میوزک کنسرٹ منعقد کئے جا رہے ہیں۔ قلمی رسالے اور اخبار شائع ہو رہے ہیں اور ایک دوسرے کے پول کھولے جا رہے ہیں۔ صحافتی میدان میں اتنے اصول پرست اور وسیع النظر صحافی کبھی نہ آئے ہوں گے جیسے ہمارے دور میں تھے۔

اس کے علاوہ مشاعرے ہوتے۔ ڈرامے اسٹیج کئے جاتے۔ شاید اسی ماحول کا اثر ہے کہ ہم سب بڑے ہو کر بھی کسی نہ کسی آرٹ کے پیچھے پڑ گئے۔ کوئی آرٹسٹ بنا۔ کوئی فوٹوگرافر کوئی شاعر۔ کوئی افسانہ نگار مگر سب کو اپنے اصول ابھی تک پیارے ہیں۔ آدرش کو کلیجے سے لگائے جی رہے ہیں۔ کیا کہنا ان آدرش وادیوں کا۔

یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ میں افسانہ نگار بن گئی۔ ورنہ میرا بچپن تو قطعی ایسا نہ تھا کہ کوئی ماہر نفسیات اپنے تجزیئے سے مجھے مستقبل کی افسانہ نگار ٹھہراتا۔

البتہ اس بات کا امکان ضرور تھا کہ میں مصورہ بن جاتی۔ کیونکہ میں نے اپنا بچپن تو اسی شوق میں گنوایا۔ باقاعدہ پینٹنگ کے مقابلے ہوتے لوگوں کے اسکیچ بنائے جاتے۔ مگر اپنی چیزیں کبھی من کو نہ بھاتیں۔ اسی مصلحت کے پیش نظر جب کوئی اونچے داموں یہ اسکیچ خرید لیتا تو کبھی اپنے نام سے نہ دیتے۔ اپنی قدر دانی کا یہ نقشہ ایسا نہ تھا کہ کوئی اور شوق اسے اتار سکتا۔ مگر یہ ایک ایسا دور تھا جب اپنے بارے میں خواہ مخواہ بڑی خوش فہمی تھی۔ یعنی کونسا کام ایسا ہے جو ہم نہیں کر سکتے۔ چاہے کسی کام کا اور کسی سے مقابلہ ہو جائے لیکن جیتنا اپنا حق ہے۔ چنانچہ شاعری ہوتی تقریریں جھاڑی جاتیں۔ بچوں کے رسالے کو کہانیاں بھیجتے۔ فرصت کے پروگراموں کا دلچسپ اور پسندیدہ آئٹم اسٹیج ڈرامہ تھا۔ ان ڈراموں کو نوک پلک سے درست کرنے کے لئے بالکل آغا حشر والا شوق طاری ہو جاتا۔ کیا مجال کہ ان ڈراموں پر کہیں بچکانہ انداز کی چھاؤں پڑنے دیں اداکاری

کی ٹریننگ۔ مو‌لانے کا انتخاب اسٹیج کی سجاوٹ اور کاسٹیوم کی اہمیت۔ ہر چیز پر کافی سوچ بچار سے کام لیا جاتا۔ اکثر ڈرامے معیار پر پورے نہ اترتے تو بدولت خود ہی ڈرامہ تصنیف کر لیتے۔ (ملاحظہ فرمائیے معیار کی بلندی)

چنانچہ ایک بار ایک ایسا ہی شاہکار قسم کا ڈرامہ بمبئی ریڈیو اسٹیشن بھیج دیا۔ اس تشویش کے ساتھ کہ جانے اسٹیج ڈرامہ ریڈیو پر کیسا چلے گا۔ مگر ریڈیو سے وہ ڈرامہ کیا ہوا گھر والے یک لخت مجھ سے مرعوب ہونے کا تہیہ کر بیٹھے۔ اور میرے ماموں ریاض ترشوری نے ایک بار کہا۔ "بیٹا ——— یہ رنگ ڈھنگ ایک طرف پھینکو۔ تم لکھنے کی مشق بڑھاؤ۔"

لے واہ ——— گویا ہم بھی کوئی فرشتے ہیں کہ لکھنے کی مشق کریں گے۔ ابھی آپ کہیں تو ایسی ایسی کہانیاں لکھ پھینکوں کہ آپ حیران رہ جائیں۔

ان ہی دنوں کمال امروہوی کے "نقش محل" کا ایک ادبی سوال نامہ اخبارات میں چھپا۔ یہ صرف فلمی نقادوں کے لئے تھا۔ مگر جانے کیسے مجھے اس کا دوسرا انعام سو روپے مل گیا۔ اس وقت میں نے ایک بار پھر اپنا لوہا گھر والوں سے منوانا چاہا۔ مگر صاحب کوئی ٹس سے مس نہ ہوا اور یہ کہہ کر ٹال دیا کہ بھئی ان مقابلوں میں تو صرف قسمت کا ہاتھ ہوتا ہے مگر یہ محترمہ اپنی قابلیت بگھارنے پر اترا رہی ہیں۔ یہ میری تحریر کا پہلا معاوضہ اور پہلی تنقید تھی۔

کی دور جہالت میں ہم سب شاعر بھی تھے۔ اصلی نہیں ذرا سستی۔ کوئی جوش کوئی فراق۔ کوئی مجاز۔ ان شاعروں کا کلام ان ہی کے اشعار میں سنایا کرتے۔ لیکن کمال امروہی سے اپنے آرٹ کی داد وصول ہوتے ہی ہم نے شاعروں کی نقل کرنے کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ چنانچہ سب نے اپنے اپنے ذاتی تخلص رکھے اور خود ہی مشق سخن کی ٹھانی۔ چنانچہ یہ خاکسار باز التخلص یعنی صبا بدایونی کہلائی جانے لگی۔ پھر شاعری کا طوفان بڑی شدت سے اٹھا۔ جسے دیکھئے کاپی کھولے مشق سخن میں مبتلا ہے۔ ہفتہ واری مشاعرے ہوتے جس میں سامعین کو ناریل اور چنے بانٹے جاتے تاکہ وہ فراخ دلی سے داد دیں اور ضبط و تحمل سے کام لیں۔

لیکن ایک نہایت واہیات بات یہ لوگوں نے محسوس کی کہ ہمارے مصرعے گزوں سے ناپنے پر بھی برابر نہیں ہوتے۔ اغیار اس کا خوب مذاق اڑاتے اور چوریاں پکڑی جاتیں۔ اس ندامت سے بچنے کے لئے میں نے سوچا کہ سب شاعر ہیں تو میں افسانہ نگار ہوں گی۔ لہٰذا بچاری صبا بدایونی کو پیدا ہوتے ہی اس دنیا سے کوچ کرنا پڑا۔ اور جیلانی بانو اکھاڑے میں کودنے کو تیار ہو گئی۔ شاعری سے توبہ کرنے میں ایک راز یہ بھی پنہاں تھا کہ شاعر کی بیٹی تھی۔ شاعر کی پوتی تھی۔ اس لئے بھی اس خاندانی پیشے سے جی اکتا گیا تھا۔ پھر اپنے گھر کے شاعروں کے پاس جو شاعر آتے تھے ان کی بہت کنگالی، ابالی پن اور کاہلی دیکھ دیکھ کر شاعروں سے جی اوب گیا تھا۔ لیکن کیا معلوم تھا کہ شاعری سے مجھے پھر بھی چھٹکارا نہیں ملے گا اور ایک ایسے شاعر کی بن جاؤں گی۔ جو صد درجہ شاعر مزاج ہو گا۔)

چنانچہ افسانہ نگاری کے اعلان کے ساتھ ہی ایک عدد کہانی گھسیٹ کر "ادب لطیف" کو بھیج دی۔ مگر نہایت رازداری کے ساتھ۔ تاکہ بے رنگ لوٹے تو جگ ہنسائی نہ ہو۔ مگر دیکھتے کیا ہیں کہ وہ کہانی چھپی چلی آ رہی ہے۔ دوسری کہانی "سویرا" کو بھیجی جو فوراً شائع ہو گئی۔ ساتھ ہی کچھ اس قسم کا تعارف بھی کہ لکھنے والو ——— مژدہ ہو تمہیں کہ وہ افسانہ نگار آ گئی جس کا انتظار تھا۔ وغیرہ وغیرہ قسم کی کچھ عبارت تھی۔ تیسری کہانی "افکار" کراچی کو بھیجی۔ چوتھی "شاہراہ" دہلی کو۔ بس یہی چار کہانیاں تھیں جو میں نے کسی رسالے کو بغیر کسی فرمائش کے بھیجی تھیں۔ لیکن مجھے اس وقت بھی ان کہانیوں کے بارے میں کوئی اندیشہ نہیں تھا (اسی لئے ان کہانیوں کو "روشنی کے مینار" میں شامل بھی کیا) کیونکہ اپنے کام پر سب سے کڑی اور بے رحم تنقید میں خود ہی کرتی ہوں۔ بلکہ کہیں کسی کہانی کی صرف تعریف ہو رہی ہو تو اس کے کمزور پہلوؤں کی طرف توجہ دلانے

نہیں مجھے چین نہیں پڑتا۔ اگر میں ایسی جلاد قسم کی اپنی نقاد نہ ہوتی تو کتنی آسانی سے آرٹسٹ بن جاتی۔

کیونکہ مجھے بچپن کا شوق تھا۔ مگر اپنے اوپر تنقید کے رجحان نے مجھے بار بار ٹوکا۔ یہاں تک کہ جھنجھلا کے میں نے رنگ اور برش پھینک دیئے۔ اب جب کہ میری چھوٹی بہن قمر بحرین میں آرٹ کی دھوم مچانے سے پہلے ہی اسے رشک بھری نظروں سے دیکھتی ہوں سوچتی ہوں کہ افسانہ نگاری نے مجھے کیا دیا۔ اگر لکھے بغیر تو میرا کھانا بھی ہضم نہیں ہوتا۔ کسی وجہ سے دس پندرہ دن نہ لکھ سکوں تو دل پر اداسی چھا جاتی ہے کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ اٹھتے بیٹھتے یہ احساس رہتا ہے کہ وقت کتنا فضول گزر رہا ہے! پھر کسی وقت فرصت کے چند منٹ نکال کر کوئی بات سوچے بغیر فائل کھول کر بیٹھ جاتی ہوں اور ایک سطر لکھ ڈالتی ہوں جس میں پوری کہانی ہوتی ہے۔ کہانی کی پہلی سطر مجھے بڑی مشکل سے ملتی ہے اس کی خاطر میرے کئی کئی ہفتے برباد ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ کہانی کا آغاز و اختتام، تعارف اور پھیلاؤ سب کچھ مجھے اسی سطر میں لکھنا ہوتا ہے۔

یہ سن کر آپ کو سخت مایوسی ہوگی کہ افسانے کے اسرار و رموز سے میں بہت بعد میں واقف ہوئی۔ میں نے لکھنے کے بعد پڑھا۔ زندگی اور فن کا رشتہ، کلاسیکل ادب کی اہمیت اور کسی ایک نظریئے پر عمل کا راستہ، میں نے بہت بعد میں جانا۔

مجھے سب سے پہلے تلگو کی دیومالائی کہانیاں (زبرہ کتھا) نے متاثر کیا۔ دیوی دیوتاؤں کی ان ناقابل یقین کہانیوں کا سحر اور پھر انہیں سنانے والے نانوں کی زبان کے جادو نے سمجھایا کہ کہانی دل میں کیسے اترتی ہے۔ ان کہانیوں کی خاطر میں نے تلگو سیکھی اور تلگو بولنے کی پریکٹس کی۔

ابا (حیرت بدایونی) کو کلاسیکل موسیقی کا بھی بڑا شوق ہے۔ یہ شوق مجھے بھی ملا۔ سنگیت سیکھنے کی اجازت تو بھلا کیا ملتی۔ کیونکہ ابا اپنی روشن خیالی کے باوجود بڑے سخت گیر قسم کے عالم ہیں۔ لیکن سُر تال، مختلف راگوں کی بندشوں اور ان کی خوبیوں کی پرکھ آ گئی۔ اس لئے اگر میں یہ کہوں کہ میری افسانہ نگاری پر روشن آرا بیگم، بیگم اختر، ابا بائی، اونکار ناتھ ٹھاکر اور بڑے غلام علی خاں کا بھی گہرا اثر ہے تو آپ کو شاید یہ بات کچھ عجیب سی لگے۔ میں نے اپنی کچھ کہانیوں میں کسی ایک راگ کے تاثر کو چھونے کی کوشش بھی کی ہے۔ جانے میں اس میں کہاں تک کامیاب ہوئی ہوں!

مجھ پر اپنے ابا کی شخصیت کا گہرا اثر پڑا۔ جیسا کہ ہمارے گھروں میں ہوتا چلا آیا ہے کہ لڑکیاں باپ کو زیادہ پیاری ہوتی ہیں۔ ہم بہنیں بھی ابا کی بڑی چہیتی ہیں۔ مگر میرے ناز نخرے کچھ زیادہ ہی تھے۔ کیونکہ شاید ابا کو اس بات کا احساس ہے کہ ان کے بچوں میں صرف میں نے ہی سنجیدگی سے لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رکھا۔ ہمارے ابا نے بچوں کی تربیت میں بڑی دلچسپی لی ہے۔ ان کی یہی کوشش تھی کہ ان کے بچے صرف ڈگریاں لے کر پڑھے لکھے نہ کہلائیں بلکہ ان کے جمالیاتی ذوق کی تربیت بھی ہو۔ ہم جو کرنا چاہیں اسے کرنے کے قابل بن سکیں۔ اس لئے انہوں نے عام ابوں کی طرح کبھی نہ تو ڈانٹ ڈپٹ سے کام لیا نہ زبردستی اپنی بات منوانے کی کوشش کی۔ اس برتاؤ کی وجہ سے ہم میں شروع سے ہی خود اعتمادی اور اپنی عزت آپ کرنے کا سلیقہ آ گیا۔

دیوان غالب، بانگ درا، کلیات میر، اور ذوق کے قصیدے انہوں نے ہمیں خود پڑھائے۔ ابھی تک ان کی عادت ہے کہ اٹھتے بیٹھتے کسی خاص لفظ یا مشکل شعر کی تشریح ہم سے کروائیں گے۔ کوئی غلط ترکیب یا بے محل لفظ دیکھیں تو فوراً ہمارا امتحان لیا جائے گا۔ ویسے ہمارے گھر میں ایک سے ایک خونخوار قسم کا نقاد موجود ہے کہ اللہ کی پناہ۔ خدا کوئی خطا بخش دے مگر یہ سفاک نقاد ایک حرف کی غلطی معاف کرنے کو تیار نہیں۔ چاہے کوئی کہانی لکھے، شعر کہے، فوٹو کھینچے یا پینٹنگ کرے۔ گھر کے ہر فن مولا قسم کے حضرات فوراً اپنے طنز کے نوکیلے نشتروں سے سرجری شروع کر دیں گے۔ یہ منزل بڑی کٹھن تھی۔ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد مجھے ادب کے بامروت اور رحم دل نقادوں سے کبھی اتنا ڈر

نہیں لگا۔

تو کہنا تھا کہ مجھ پر اپنے گھر اور اپنے ماحول کا گہرا اثر پڑا۔

میں ہائی اسکول میں تھی جب گورکی، موپاساں، چیخوف، پریم چند، عصمت چغتائی، بیدی، کرشن چندر، فیض، مجاز، قرۃ العین حیدر، منٹو اور احمد ندیم قاسمی کو پڑھ چکی تھی۔ ان ادیبوں نے مجھے بہت کچھ سکھایا۔ بلکہ یہ سب میرے استاد رہے ہیں جنہوں نے مجھے فن کی نزاکتیں اور خامیاں بتائی ہیں۔ بعد میں بھی بہت سے عظیم فنکاروں کے شاہ پارے میں نے پڑھے اور ان کی بڑائی کے آگے جھکی ہوں مگر ان ادیبوں کا جو پہلا تاثر مجھ پر چھایا تھا وہ آج بھی ہے۔ یہ سب وہ ادیب ہیں جنہوں نے مجھے کہانیاں پڑھنے اور لکھنے کا شوق دلایا ہے۔

یہ وہ ہنگامہ پرور دور تھا جب حیدرآباد ابھی ابھی ایک بڑے سیاسی انتشار سے گزرا تھا۔ اس لئے ہر طرف ایک غیر یقینی کیفیت تھی۔ حیدرآباد کی وہ مخصوص تہذیب اور روایتیں دم توڑ رہی تھیں۔ جاگیرداری دور ختم ہو چکا تھا۔ اور بڑی بڑی ڈیوڑھیوں کے مالک رکشائیں پکڑے چوراہے پر لوگوں سے پتے پوچھتے تھے۔ ان لوگوں کا گناہ کیا تھا اور یہ کس سزا کے مستحق تھے۔ اس پر مجھے اس وقت بحث نہیں کرنا ہے۔ لیکن جب ایک بہت بڑے گاؤں میں گھومنے والے جاگیردار شام کو کھانا مانگنے آتے تھے تو یہ حادثہ مجھے کچھ کرنے پر اکساتا تھا۔ ادب میں وہ ہنگامہ پرور دور تھا جب بڑے لکھنے والے ٹھٹھک سے گئے تھے۔ نئے ادیب سامنے نظر نہیں آ رہے تھے اور نقاد جمائیاں لے کر ادب میں جمود کا نعرہ بلند کر رہے تھے۔ کچھ زیادہ چوکنے قسم کے حضرات ادب میں شدید قسم کی حد بندیاں قائم کر رہے تھے اور ترقی پسند ادب کو چھانٹ چھانٹ کر الگ کیا جا رہا تھا۔

اس وقت اپنے خاموش کمرے میں بیٹھے بیٹھے میں نے لکھنا شروع کیا تو یہ سارے مناظر میرے سامنے تھے۔ ایک نئے لکھنے والے کے فطری تجسس نے مجھے بھی ان باتوں پر غور کرنے کی دعوت دی۔ لیکن میں اس وقت بھی کسی کانفرنس میں نکلنے والے نعرے پر لکھنے کی مشق کر کے اور نہ کسی ادبی یا سیاسی کلیے کو سامنے رکھ کر کہانی لکھنے میں کامیابی حاصل کی حالانکہ میرا نوخیز ذہن ایسی خبروں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ ایک کمیونسٹ لڑکی نے اپنی رائفل سے پچاس سپاہیوں کا مقابلہ کیا۔ میں نے اس وقت تک باقاعدہ مارکسزم کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ دنیا کے دو واضح سیاسی عقائد کے بارے میں میری کوئی رائے نہیں تھی۔ میں نے مزدور کو پسینہ بہا کے روٹی کماتے دیکھا تھا اور نہ سرمایہ داروں کے ظلم و ستم سے واقف تھی۔ اس کے باوجود جاگیرداری دور میں عورت کی سماجی حالت میرے سامنے تھی۔ حیدرآباد کی عورت اونچے طبقے میں جتنی مظلوم تھی محنت کش طبقے میں اتنی ہی خود مختار تھی۔ کیونکہ بڑی بڑی ڈیوڑھیوں میں سوکنوں کا جلاپا، شوہر کا تحکم اور بچوں کو خود سری اس کی قسمت تھی تو ان ڈیوڑھیوں کو بناتے وقت وہ خود پتھر پھوڑتی تھی۔ خود کدال چلاتی اور اس نے مرد کا غرور اتار پھینکا تھا۔

شاید اسی لئے میرے دل میں اس لڑکی کے لئے بڑی عقیدت تھی جو پہاڑوں کی کھوہ میں چھپی اپنے حقوق کی لڑائی جیت رہی تھی۔ میرے آس پاس جب کوئی باپ بیٹی کو جہیز نہ دینے پر خودکشی کر لیتا۔ جب کوئی ماں بیٹی کی پیدائش پر آنسوؤں کی دھار نہ روک سکتی جب کوئی شوہر تین بار زبان ہلا کر بیوی پر موت و زندگی حرام کر دیتا ہے تو وہ لڑکی میرے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ وہ جواں ہمت کنواری لڑکی جو رسموں، روایتوں، سماج اور مذہب کے سپاہیوں سے بیک وقت نبٹ رہی تھی۔ وہ آئیڈیل لڑکی میرے خیالوں میں بس گئی تھی۔ میں جانے کتنی بار عزم اور جرأت مانگنے اس کے سامنے گئی ہوں اور ہر بار اس نے میرے سامنے ایک نیا چراغ جلایا ہے۔ ایک بار بس کے ایک چھوٹے سے سفر میں مجھے وہ سچ مچ مل گئی اور تین گھنٹے کے سفر میں اس نے مجھے تجربوں کی صدیاں سونپ دیں۔ تب میں نے "روشنی کا مینار"

تھی۔ مگر لکھ کر دیکھ پاتی کہ اس لڑکی کی عظمت کو میرا قلم چھو بھی نہ پایا! حالانکہ میں نے اپنی کہانیوں میں عورت کی عظمت اور جرأت کو ہمیشہ اسی عورت سے مستعار لیا ہے۔ ایک بار کسی نقاد نے میرے بارے میں لکھا کہ میں اپنی ہی صنف کی نمائندگی کرتی ہوں لیکن میں نے صرف اسی پہلو کو چلنے نہیں رکھا۔ اگر ادب شعوری طور پر زندگی کو سمجھنے کا نام ہے تو میں نے بھی اپنے آس پاس ہی سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے ان میں عورت کے احساسات اور اس کے مسائل سے میں زیادہ تر قریب ہوں۔

چند کہانیاں لکھنے کے بعد ہی جب ادبی حلقے میرے بارے میں سنجیدہ ہو گئے تو میں گھبرا گئی۔ کیونکہ ابھی تک شعوری طور پر میں اپنے آپ کو مستورہ کہلوانے پر مصر تھی۔ انٹرمیڈیٹ میں پڑھ رہی تھی اور افسانہ نگار کہلوانے میں خاصی وحشت ہو رہی تھی۔ ان دنوں میری دنیا محدود تھی۔ صرف کتابیں ہی میری دوست تھیں۔ میری ساتھی تھیں۔ مجھے مشورے دیتیں۔ لکھنے پر اکساتیں۔ بعض وقت دشمنی پر اتر آتیں۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دوستوں دشمنوں سے کیسے پناہ مل سکتی ہے۔ مگر ان کتابوں نے مجھے اتنا سہارا دیا کہ میں اپنی راہ ڈھونڈ سکوں۔ طے کر سکوں کہ کیا لکھوں گی۔ کیسے لکھوں گی!

اپنے ماحول میں لکھتے وقت مجھے ذرا سی بات، معمولی سا حادثہ بھی غیر معمولی نظر آیا۔ انسانی جذبات، احساسات اور ان کے تہہ در تہہ پہلوؤں کو میں نے پڑھا اور یہ ہزار داستان کی طرح طویل اور دلچسپ کہانی نظر آئی۔ ویسے رنگوں اور برش کے شوق نے مجھے چہرے پڑھنا سکھا ہی دیا تھا۔ رنگوں نے مجھ سے زیادہ کھل کر بات کی تھی۔ رنگوں سے منظر نگاری اور احساسات کو واضح کرنا زیادہ آسان تھا۔ شاید اسی لئے میری کہانیوں میں کردار اور ماحول کی عکاسی زیادہ تفصیل سے ہوتی ہے۔ منظر نگاری کو جگہ کم ملی ہے۔ حالانکہ شعوری طور پر میں نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ لکھتے وقت کس چیز کو ابھارنا چاہیے کسے پس منظر میں رکھنا چاہیے۔ شعوری طور پر میں نے کوئی بھی کوشش نہیں کی۔ نہ کہانیاں لکھنے کی نہ انہیں چھپوانے کی اور نہ کسی قسم کا صلہ پانے کی۔ اس بات پر مجھے ہمیشہ اطمینان رہے گا کہ اپنے بارے میں کبھی مجھے خوش فہمی کا شکار نہ ہونا پڑا۔ اور شہرت کے لئے انوکھے اور حیرت انگیز ہتھکنڈے آزمائے۔ بلکہ میری تنہائی اور کم گوئی نے میرے بارے میں بڑی غلط فہمیاں پھیلائیں۔ ترقی پسندوں نے مجھے قدامت پسندوں میں گنا تو کمیونسٹوں نے قدامت پرستوں کی طرف ڈھکیلا۔ مجھ سے جواب طلب ہوتے کہ آپ کونسے گروپ کی ہیں۔ لکھنے سے پہلے اس کی وضاحت کیجئے کہ کس حلقے سے وابستہ ہیں۔ یوپی کی ہیں یا حیدرآباد کی ـــــ قوم پرست ہیں یا غدار ـــــ؟

ان سارے سوالوں کے جواب میں بڑے اطمینان کے ساتھ اپنی کہانیوں میں دیتی رہی اور آئندہ بھی دیتی رہوں گی۔ لیکن یہ بڑا نقصان ہوا کہ ہر طرف سے حد درجہ سرد مہری کا سلوک ہوا۔ میں کسی گروپ کی چہیتی نہ بن سکی۔ میری اس خود سری نے بہت سے ایسے لوگوں کو ناراض کر دیا جو ادب کی ٹھیکیداری کرتے تھے۔ چنانچہ ایڈیٹروں کو میرے خلاف خط لکھے گئے کہ یہ کون خاتون ہیں جن کی پہلی کہانی آپ نے اپنے پرچے میں شائع کر کے پرچے کا وقار متاثر کر دیا" ـــــ "سنا ہے یہ کوئی بالشت بھر کی لڑکی ہے اور اس کے پردے میں کوئی اور لکھ رہا ہے" ـــــ اور پھر یہ اعتراض ـــــ "انہیں حیدرآباد کے بارے میں لکھنے کا کیا حق ہے جب یہ حیدرآباد کی نہیں ہیں" ـــــ وغیرہ وغیرہ۔

صرف یہی نہیں ایک سرپھرے خبطی ایڈیٹر نے مجھ پر جھوٹا اور بے بنیاد الزام لگایا کہ میں نے پاکستان میں کسی کہانی کا معاوضہ دو ایڈیٹروں سے وصول کیا۔ میں نے صرف اسی ایڈیٹر پر ہتک عزت کا دعویٰ کر کے اسے سزا دلوائی۔ اس سلسلے میں بھی بڑی دھوپیں جھیلیں۔ محض اس تصور میں کہ میں نے کسی سہارے کے بغیر خود ہی رینگنے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ مخالفت کی آندھیوں کا زور تھم گیا ہر طرف سے

صلے کے ساتھ بڑھتے گئے۔ لیکن یہ صلح جو حضرات بھی اس بات سے پھر خفا ہو گئے کہ مجھ پر ان عنایتوں کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ بعض وقت اپنی ہمت پر خود ہی تعجب بھی ہوتا تھا کہ اتنا منظم پروپیگنڈہ تو بڑے سے بڑے ثابت قدم کو اکھاڑ پھینکتا۔ لیکن میں تناور درخت نہیں تھی بلکہ دھرتی کے سینے سے پھوٹی ہوئی ایک ننھی سی کونپل تھی۔ اس لئے تیز و تند طوفان میرے سر پر سے گزر گئے۔ شاید ہار جاتی۔ شاید کبھی نہ لکھنے کی قسم کھالیتی اگر مجھے اس مخالفت کے علاوہ بے شمار بڑھاوے نہ ملتے۔ خصوصاً ان ادیبوں کی حوصلہ افزائی میرے لئے بڑی اہمیت رکھتی تھی جو میرے آئیڈیل تھے جنہوں نے مجھے لکھنا سکھایا تھا۔

تعریفیں اور حوصلہ شکنی ہونے ادیب کا مقدر ہیں۔ گو لکھنے والے میں سچی لگن اور اپنے آدرش کے ساتھ خلوص ہے تو وہ تعریفوں اور تنقیدوں کے لئے نہیں لکھتا۔ اس لئے اگر ابتدائی دور میں اس کی حوصلہ شکنی زہر ہے تو تعریف کا نشہ بھی زہر سے کم نہیں ہے۔ اس کٹھن دور سے تو وہ حقیقی تعلق سے گزرے گا فن اس کے نزدیک آتا جائے گا۔ بی اے کرنے کے بعد ۵۹ء میں میری شادی ڈاکٹر انور معظم سے ہوئی۔ یہ بھی ایک عجیب حادثہ تھا۔ کہتے ہیں کہ مجھ ایسی جذباتی لڑکی کے لئے تو یہ ایک بے حد مشکل مسئلہ تھا۔ مگر شاید زندگی میں سب سے بڑا صلہ یہی ملا کہ انور بالکل ویسے ہی آئیڈیل ثابت ہوئے جیسے ایک حساس جذباتی لڑکی اپنے خوابوں میں ڈھونڈتی ہے۔ اس شادی کی مقامی طور پر بھی بڑی اہمیت تھی۔ کیونکہ انور شاعر بھی ہیں اور ڈرامہ نگار بھی۔ اس کے علاوہ اپنی طالب علمی کے دور میں یہ حضرت لڑکیوں کے پسندیدہ شاعر تھے۔ دروغ برگردن راوی موصوف نے شادی کے بعد اپنے ان کارناموں کا مجھ پر خوب رعب جمایا۔

بہرحال جب ان کا قرعۂ فال میرے نام پڑا تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان پر تنے والا عتاب مجھے بھگتنا پڑا ہوگا۔ ویسے شادی کے بعد اور ایک بچے کی ذمہ داریاں بننے کے بعد عشق کا اعتراف کر لینا کوئی خطرہ کی بات نہیں ہے۔ مگر اس کو کیا کہیے کہ یہ عشق یک طرفہ تھا اور اس کو شہرت انور صاحب کی ان نظموں سے ملی جو وہ جانے کس محبوبہ کے تصور میں کہہ کر میرے نام منسوب کر رہے تھے۔

شادی کے دوسرے برس ہمارے ہاں ثمین آیا۔ عورت پن کی ساری کمزوریوں سمیت اپنے بچے کو دیکھ کر مجھے پہلی بار اپنے فن کار ہونے کا یقین آیا۔ میں سچ مچ مغرور ہو گئی۔ میں نے لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا۔ لوگوں سے ملنا جلنا۔ اپنے بارے میں سوچنا ہر بات بھول بیٹھی۔

مگر اچانک موت کی آندھی اسے میرے ہاتھوں سے چھین کر لے گئی۔ مہینوں مجھے اس بات پر یقین نہیں آیا کہ میرے اوپر ظلم کرنے کی ہمت کون کر سکتا ہے۔ وہ مر گیا تو میں کیسے نہ مر سکی۔ شاید مر جاتی اگر انور مرنے دیتے ——— سب نے مجھے مشورہ دیا کہ لکھنے میں کھو جاؤ، اداسی نے جانے کیا کیا لکھ پھینکا۔ مگر ایسا لگتا ہے جیسے ساری دنیا کی جگمگاہٹ کھو گئی ہے۔ ہر چیز کتنی بے روح اور کھوکھلی دکھائی دیتی ہے۔

شادی کے بعد دو برس میں علیگڑھ میں رہی۔ علی گڑھ میں بار بار یہ احساس ہوتا تھا کہ یہ ادیبوں کی بستی ہے۔ اور یہاں خالص ادب بگھارنا چاہئے۔ مگر اس کو کیا کہیے کہ وہاں مجنوں گورکھپوری جیسے نقاد بھی ہمارا ادبی مزاج پوچھنے کی بجائے مرچوں کے سالن اور حیدرآبادی کھانے کا ذکر چھیڑ دیتے۔ وہاں ادبی حلقوں کی اس خاموشی اور بیزاری کو دیکھ کر کبھی تو یہ خیال آتا کہ ہم صورت سے ایک افسانہ نگار کی بجائے یقیناً ایک ماہر باورچن نظر آتے ہیں۔ کبھی سوچتے کہ بیچارے یہاں کے ادیب بھی کیا کریں جب کہ ان کے ذہنوں کو سکون ہی نہیں ہے۔ زندگی وہاں اچانک ٹوٹ پڑنے والے واقعات و حادثات کا نام ہے۔ وہاں تو صرف مجھ جیسے ادیبوں کا ہی بھلا ہوتا ہے جو چپکے چپکے سب کچھ سنتے رہیں اور ایک کونے میں بیٹھے سر جھکائے لکھے چلے جائیں۔ میں نے علی گڑھ کے بارے میں صرف ایک کہانی لکھی ہے آئندہ اور لکھوں گی۔

ہنتے ہیں افسانہ نگار ناول کی مسافت طے کرنے سے ہانپ جاتے ہیں۔ اس لئے نقاد افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کو علیحدہ علیحدہ صف میں کھڑا کرتے ہیں۔ میں نے اس اصول کو توڑنے کی یوں کوشش کی کہ میں اپنی کسی کہانی سے مطمئن نہیں ہوں۔ اس لئے جلد ہی ناول لکھ کر دیکھوں۔ شاید اس ناول کے بعد میں اپنے نام کے ساتھ ادیب کا خطاب لکھا دیکھوں تو مجھے آج کی طرح شرم نہ آئے۔ ابھی چند مہینے ہوئے ٹمکور کی ایک کانفرنس میں مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میں دراصل ہندی میں لکھنے والی ہوں (شاید یہ میری ہر کہانی کے ہندی میں ترجمہ ہونے سے گڑبڑ پھیلی) کیونکہ ہل منڈل، جینیندر کمار وغیرہ کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ میں اردو میں بھی لکھا کرتی ہوں!

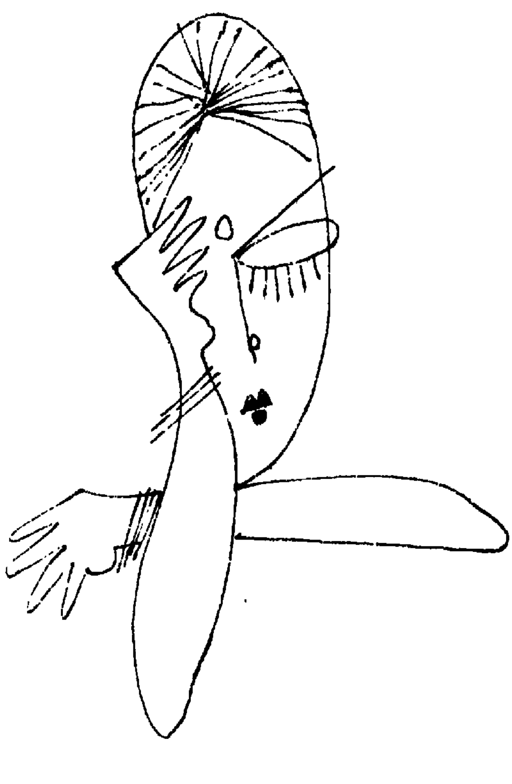
ایک بار ایگزیبیشن میں چھ سات بچوں میں گھری ہوئی کسی ماں نے مجھے روک کر اپنے بچوں کو دکھایا۔

"دیکھو بھئی جیلانی بانو ہیں جو کہانیاں لکھتی ہیں"۔

اس سے پہلے کہ میں اپنی صفائی میں کچھ کہتی ایک بچے نے میرا پلو پکڑ کے پوچھا۔

"آپ ہماری کہانی کب لکھیں گی"؟

اس سوال کے بعد آپ ہی کہئے کہ میں اپنی کہانی سنانے کے لئے وقت کہاں سے لاؤں ——— ؟





سلمیٰ صدیقی

"......... کسی عذاب ثواب، حساب کتاب، انعام عتاب اور سود و زیاں کے دائرے میں، میں
محصور نہیں ہوں اور ایسا کرنے میں اور ایسا سوچنے میں بحیثیت ایک انسان کے حق بجانب بھی ہوں..."

سوچا تو یہی تھا کہ جو کچھ باقی بچا ہے وہ بھی بیت جائے تو آپ بیتی لکھوں۔ لیکن اس بارے میں مزید انتظار سے بچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جو کچھ کہنا ہے آج ہی کہہ لو۔ کل کی "کل" "کس کل" بیٹھے کون جانے۔!

میری پیدائش میں میرا قطعاً کوئی دخل نہیں تھا بالکل ایسے ہی جیسے آپ کی اور آپ جیسے بہتوں کی پیدائش میں آپ کا اور بہتوں کا کوئی ارادہ یا مشورہ شامل نہیں تھا۔ مجھے اپنا پیدا ہونا کیسا لگا تھا یہ تو یاد نہیں لیکن اتنا بار بار سنتے سنتے یاد رہ گیا ہے کہ میری پیدائش سے پہلے چونکہ میرے دو بھائیوں کی ولادت ہو چکی تھی۔ اس لئے والدین اور اقربا کی خواہش یہی تھی کہ بیٹی پیدا ہو جائے۔ چنانچہ میں پیدا ہو گئی۔ میری پیدائش سے دو ماہ قبل علی گڑھ میں کوئی وبا پھیل گئی تھی اُس سے بچنے اور بچانے کی خاطر ابا میاں (والد) نے اماں بی بی (والدہ) کو ان کے میکے بنارس بھیج دیا تھا۔ جہاں ۱۸ جون کی ایک نہایت گرم صبح میں پیدا ہو گئی۔ مجھے تو علم نہیں لیکن سنا ہے کہ میں بے حد خوبصورت پیدا ہوئی تھی۔ لیکن یہ صرف سُنی سنائی بات ہے اس لئے کہ میں نے جب سے آئینہ دیکھنا شروع کیا، مجھے ہمیشہ مایوس ہونا پڑا۔ میرا اور آئینے کا یہ جھگڑا ابتک جاری ہے۔ آئینے کی مستقل مزاجی اور صاف گوئی، مجھے اب بھی دھمکاتی رہتی ہے۔ ممکن ہے میری شکل و صورت اتنی معمولی نہ رہی ہو جتنی میں سمجھتی ہوں۔ لیکن میرے اس وسوسے کے پیچھے میرا ایک COMPLEX ہے جسے ماہر نفسیات کے علاوہ میں خود بھی سمجھتی ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ میری والدہ بے حد حسین و جمیل خاتون ہیں۔ اپنے عہد میں وہ واقعی بے پناہ خوبصورت نظر آتی تھیں۔ ایک تو حسنِ خداداد تس پہ اُن کی خوش لباسی اور جامہ زیبی اور اپنے زمانے کے فیشن کی مکمل نمائندگی، وہ جس محفل میں ہوتیں، بلاشبہ چھا جاتیں اور میری چھوٹی بہن عذرا جب اُن کے ساتھ کہیں میلاد شریف یا دعوت میں جاتے تو خواتین ناک پہ انگلی رکھ رکھ کے کہتی تھیں کہ "ہئے ہئے بچیاں تو ذرہ برابر بھی ماں پہ نہیں پڑی ہیں!"

عذرا پیدائشی طور پر شریفانہ مزاج رکھتی ہیں اس اتنے بڑے "الزام" کو بڑی خوش اسلوبی سے درگزر کر دیتی تھیں لیکن میں "علی گڑھ والیوں" کی اس "تہمت" پہ بڑا فیل مچاتی تھی۔ کچھ اور تو کر نہیں سکتی تھی بس اماں بی بی سے جھگڑتی تھی چونکہ آپ زیورات پہنتی ہیں، بندی لگاتی ہیں بالوں میں افشاں چھڑکتی ہیں اور خوبصورت بنارسی ساڑیاں پہنتی ہیں اس لئے خوبصورت لگتی ہیں۔ اماں بی بی جلسی کے میری اُول جلول باتوں کو ٹال دیا کرتی تھیں لیکن ایکبار ایک محفل سے واپسی پر انھوں نے میری اچھی پٹائی کی اور وارننگ دیدی کہ کبھی کسی دعوت میں مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گی۔

ابا میاں کو پتہ چلا تو انھوں نے اس سہ پہر مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور میری دُکھ بھری روداد بڑے غور سے سنتے رہے۔ پھر مجھے ان الفاظ میں سمجھانے لگے۔ دیکھو بیٹی! اصل قصہ یہ ہے کہ لوگ تم سے مذاق کرتے ہیں۔ تمہاری ماں بالکل خوبصورت نہیں ہیں۔ بلکہ میں بہت خوبصورت ہوں۔ اور تم بالکل مجھ پہ پڑی ہو۔ لو یہ پیڑا کھاؤ سرور صاحب بدایوں سے لائے ہیں۔ اور یہ بات میں نے تم سے کہی ہے کسی سے مت کہنا۔ اور اپنی ماں سے تو بالکل ہی مت کہنا ورنہ تمہارے ساتھ میری بھی شامت

آجائے گی۔۔!"

اس بات کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ خود اعتمادی جو جانے کہاں چھپی ڈھکی بیٹھی تھی عود کر آئی۔ اور میں نے اپنی ماں کے حسن کو برداشت کرنا سیکھ لیا۔ اس سے زیادہ خوشی اور فخر مجھے اس بات پہ تھا کہ ابّا میاں اور میرے درمیان کوئی مشترکہ راز ہے جو مجھے میرے دوسرے بھائی بہنوں سے ممتاز کرتا ہے۔!!

اس زمانے میں ہم لوگ یونیورسٹی کے مکان میں رہتے تھے۔ مکان یونیورسٹی کے مرکز میں تھا۔ ممتاز ہوسٹل سامنے تھا اور گھر سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پہ باب اسحٰق تھا۔ یونیورسٹی کے شعبے اور کلاس رومز تھے۔ باب اسحٰق کے آہنی پھاٹک کے جنگلے پہ چڑھ کے بیٹھنا اُس زمانے میں میرا اور میری دوسری دوستوں کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ سامنے کے میدان میں یونیورسٹی اسٹاف کے بچے کھیلتے تھے۔ میرے دونوں بڑے بھائی اقبال رشید اور احسان رشید اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں کرکٹ کھیلتے تھے۔ میں بھی ضد کر کے اصرار کرتی تھی کہ مجھے بھی کھیل میں شامل کیا جائے۔ احسان بھائی کو یہ بات سخت ناپسند تھی اور وہ مجھے ڈانٹ پھٹکار کے اور کبھی کبھی پیار محبت سے سمجھا بجھا کے گھر کے اندر کھیلنے کا مشورہ دیتے لیکن اقبال بھائی مجھے فیلڈنگ پہ مجبور کر دیتے اور میں بہت خوش ہوتی تھی کہ میں بھی کھیل میں شریک ہوں لیکن ہوتا یہ کہ بھاگ بھاگ کے گیند اٹھانے میں میرا بُرا حال ہوجاتا۔ جب میری باری آتی تو سب لڑکے کہتے تم کل کھیلنا اور یا۔ ذرا یہ گیند وکٹ اور بیٹ گھر پہنچا دو۔ مجھے اس دھاندلی پہ بہت غصّہ آتا اور میں وہیں میدان میں بیٹھ کے رونے لگتی۔ اس وقت مغرب کا نماز پڑھانے مولانا ابوبکر صاحب یونیورسٹی کی مسجد میں جاتے ہوتے۔ وہ لمبی سی عبا پہنے ہوتے۔ مجھے روتے دیکھ کے وہ میری انگلی پکڑ کے مسجد لے جاتے۔ وہاں حجرے سے کوئی مٹھائی نکال کے دیتے اور میں ہنستی بولتی گھر آجاتی۔

ایک بار یونیورسٹی کے رجسٹرار عظمت الٰہی زبیری صاحب کی بیٹیوں راشدہ اور ناصرہ کے ساتھ میں وکٹوریہ گیٹ کے اندر پہنچ گئی اور "اونچی گھڑی" (کلاک ٹاور) تک پہنچنے کے لئے ہم تینوں سیڑھیوں پہ جانے کہاں تک چڑھ گئے۔ نیچے دیکھا تو گرزن ہاسپٹل کی چھت نظر آرہی تھی، اور یونیورسٹی باغ کا لمبا چوڑا کرٹ واک بلا مالی بالکل ایک کھلونا نظر آرہا تھا اتنی اونچائی سے دیکھنے کی عادت نہیں تھی، اور پھر جانے ہم کس طرح کلاک ٹاور کے کس حصّے کی بھول بھلیوں میں کھو گئے اور سوائے چیخ پکار کے رونے کے نیچے اترنے کی سب تدبیریں اور ترکیبیں بھول گئے۔ اس وقت جانے کس کام سے گھنٹہ بجانے والا اوپر آیا اور ہم لوگوں کو ساتھ خیر وعافیت کے نیچے لے کے اترا اور گھر پہنچا آیا۔

میرے بچپن کے علیگڑھ (یونیورسٹی) کا ماحول بہت خوشگوار اور دلچسپ تھا اور اس وقت تو ایسا ہی محسوس ہوتا تھا گویا علیگڑھ سے باہر کچھ ہے ہی نہیں۔ بس جو کچھ بھی ہے وہ یہی ہے اور یہیں ہے۔ یونیورسٹی اسٹاف کے خاندانوں میں اس قدر میل ملاپ تھا اور اس قدر سب ایک دوسرے رنج وراحت میں شریک رہتے تھے کہ کبھی خیال ہی نہیں ہوتا تھا کہ ان رشتوں میں کوئی بھی خون کا رشتہ نہیں ہے۔ حالانکہ رشتہ صرف علیگڑھ کا رشتہ تھا لیکن کتنا عجیب و غریب رشتہ تھا وہ۔ اس کا احساس اب ہوتا ہے جب رشتے ناطے، اپنائیت، خلوص اور مروّت و محبّت کے الفاظ صرف محاورے

کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

اس زمانے میں میری اور میری عمر کے سب بچوں کی خوشیاں اور پریشانیاں یکساں اور محدود تھیں۔ خوشی، عید، بقر عید، شب برات، مشاعرے اور نمائش، اور کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی کی شادی، بیاہ، منگنی، سالگرہ، ورت جگے، نذر نیاز اور اسی طرح کے دھوم دھڑکے کی ہوتی تھی۔ اور ہماری پریشانیاں اور مصائب کی حد اور انتہا ہوتی تھی سالانہ امتحانات کا قریب قریب ہونا۔ امتحانات گرمی کے موسم میں ہوتے تھے اور اس وقت جیب میں کیلنڈر دیکھنا اور سمجھنا بھی نہیں جانتی تھی۔ دن تاریخ اور ماہ کا حساب کتاب عام طور سے مختلف تقاریب اور امتحانات کی آمد سے لگایا کرتی تھی۔ یعنی جلے کی سردی شروع ہوتی تو سالانہ نمائش قریب ہوتی۔ آتے ہوئے جاڑوں یونین الیکشن کی دھوم دھام ہوتی۔ کھیتوں میں سرسوں اور جب ہر روش میں سویٹ پی کے پھول کھلانے لگتے اور ہوسٹلوں میں رات گئے تک روشنیاں جاگتیں تو امتحانات نزدیک ہوتے۔ چلچلاتی گرمی ہوتی تو جانے چیل انڈے چھوڑتی تھی یا نہیں۔ یونیورسٹی کے طلبا و اسٹاف اپنے اپنے وطن یا پہاڑوں کی راہ لیتے تھے اور جب یہ سب کچھ نہیں ہوتا تھا تو راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ یعنی ہوسٹلوں میں سہگل اور کانن بالا کے ریکارڈ بجتے تھے۔ شمشاد مارکیٹ کی چائے کی دوکانوں میں جنھیں اس زمانے میں بڑے احترام سے "کافے ڈی پھوس" اور ایسے ہی کسی معزز ناموں سے پکارا جاتا تھا، چائے پی جاتی تھی۔ اس زمانے میں یونیورسٹی کا "شاہی باغ" تو ایک تھا یعنی سوئمنگ باتھ "جہاں سرسبز لان، [illegible] کے پودوں گلاب اور چنبیلی کی کلیوں کی بہار کے علاوہ ایک COVERED سوئمنگ پول بھی تھا (اب بھی ہے) [illegible] کتابیں لے کر پہنچ جاتے تھے اور اوپر کے ریستوران میں جو علیم اللہ کا ریستوران کہلاتا تھا بیٹھ کے لیمونیڈ پیتے اور [illegible] کرتے تھے۔ یونیورسٹی کے طلبا اور اسٹاف اور ملازمین کے خورد و نوش میں چند چیزیں مشترک تھیں۔ یعنی [illegible] کے انڈے جو اپنے حجم کے اعتبار سے انتہائی "کنبہ پرور" ہوتے تھے اور نمک پارے اور "تتلیاں" [illegible] اس زمانے میں علیگڈھ سے کچھ فاصلے پہ چھیرت کے گاؤں میں ایک انگریز (کیونٹر) نے بڑے پیمانے پر ڈیری فارم کھول رکھا تھا اور بڑے سائنٹفک طریقے پہ دودھ اور مکھن کی سپلائی کرتا تھا۔ یونیورسٹی کے سب گھروں اور ہاسٹلوں میں کیونٹر کا مکھن استعمال ہوتا تھا CREAM بھی اسی کے ہاں سے آتی تھی اور ہمیشہ ایک دن پہلے اس کا آرڈر کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں آئس کریم کا کیا درجہ تھا۔ آج کل کے بچے سنیں گے تو ہنسیں گے۔ کیونکہ اب تو بڑے یا چھوٹے شہروں کے علاوہ گاؤں گاؤں اور گلی گلی ہر موسم میں آئس کریم ملتی ہے۔ لیکن ہمارے بچپن کے علیگڈھ میں آئسکریم بہت اہم پُر اہتمام مواقع پہ کھائی اور کھلائی جاتی تھی۔ ایک دن پہلے سے دودھ، بالائی اور برف کا انتظام کیا جاتا، محلّے میں صرف دو چار ہی آئسکریم کے فریزر ہوتے۔ جسے بہت ذوق و شوق سے آئسکریم کی مشین کہا جاتا تھا اور اس کو جب لوگ ایک دوسرے کو عاریتاً دیتے تو اس کے استعمال کے بارے میں بڑی ہدایات دی جاتیں۔ لگتا جیسے لڑکی کو سسرال بھیجا جا رہا ہے اور اس کی قسمت اور مستقبل کے بارے میں دعائیں اور پیشگوئیاں کی جا رہی ہیں۔

ابّا میاں اس طرح کے لین دین کو پسند نہیں کرتے تھے لہٰذا آئسکریم کی مشین، چائے کا سیٹ، [illegible] اور تھرمامیٹر،

ہمیشہ گھر میں دو دو رکھے جاتے۔ ایک گھر کے استعمال کے لئے ہوتا دوسرا ہمیشہ دوسروں کے گھر میں ہوتا۔

ایک دفعہ اگر آپ کو بتاؤں تو شاید مبالغہ لگے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ ۳۵ء میں ایکبار ابا میاں کے ایک بزرگ دوست جونپور سے علی گڑھ آئے۔ اس وقت ریڈیو صرف ہمارے گھر میں تھا۔ انھوں نے جو ریڈیو کو ہنستے بولتے گاتے روتے سُنا تو بالکل مبہوت رہ گئے۔ کہنے لگے: "معجزہ ہے صاحب۔ معجزہ!" میز کے گرد چکر لگاتے تھے اور حیران ہو ہو کے میز پوش اٹھا اٹھا کے میز کے نیچے جھانکتے تھے اور جب پورے طور پر مطمئن ہو گئے کہ ریڈیو کے اندر یا آس پاس کوئی چھپ کے نہیں بیٹھا ہے تو سر ہلا ہلا کے کہتے تھے "کرشمہ ہے صاحب کرشمہ!" بعد میں انتہائی حسرت سے بولے۔

"بجلی تو اب ہمارے محلّے میں بھی آ گئی ہے لیکن یہ بلبلِ ہزار داستان (ریڈیو) کہاں سے لائیں۔ اور اگر گھر میں ہے" (بیوی) اسے دیکھیں تو جانے حیرت و استعجاب سے ان کی کیا کیفیت ہو جائے!" ابا میاں نے اُن بزرگ کی واپسی پہ وہ ریڈیو ان کے ساتھ بھیج دیا۔ لائسنس ابد میں گیا، چند دن بعد بزرگ کا پوسٹ کارڈ آیا "گھر میں بہت ناراض ہیں کہ یہ شیطانی بکھیڑا کہاں سے اُٹھا لائے۔ گھر میں کنواری بیٹیاں اور جوان بہوئیں بیٹھی ہیں اور تمہیں یہ چونچلے سُوجھے ہیں۔ سارا محلّہ تھو تھو کر رہا ہے کہ جلد یہ ابلیسی کاروبار بند ہو۔ چنانچہ ہم نے اُسے دیوان خانے میں چھپا کے رکھ دیا ہے۔ کیا کریں۔ ظلم ہے صاحب ظلم۔!!"

اسی زمانے میں آل احمد سرور صاحب کی شادی ہوئی اور وہ بدایوں سے دُلہن بیاہ کے علی گڑھ آئے اور ہمارے گھر سے تھوڑے فاصلے پر انھوں نے مکان لیا۔ شادیاں تو اس سے پہلے بھی ہوتی تھیں اور دُلہنیں بھی دیکھنے کو ملتی تھیں لیکن سرور صاحب جب اپنی دلہن کو لے کے ہمارے گھر آئے تو میں تو دلہن کو دیکھ کے خوشی سے بے حال ہو گئی۔ اس سے پہلے کی جو دلہنیں میں نے دیکھی تھیں وہ اپنے آپ میں بالکل کھوئی رہتی تھیں اور بے حد شرماتی تھیں۔ گو شرما تو وہ بھی رہی تھیں اور ایک گلابی رومال بار بار چہرے پہ پھیرتی تھیں لیکن بے حد ہنس مکھ اور خوش مزاج نظر آتی تھیں۔ میرے ساتھ پہلے ہی دن سے ان کا بہت اپنائیت کا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ اور میں دن میں گھر والوں کی نظر بچا کے ڈیوڑھی کے دروازے سے بار بار نکل کے "دلہن" دیکھنے سرور صاحب کے گھر پہنچ جایا کرتی تھی۔ پہلے تو امّاں بی بی نے یہ سمجھا کہ شاید میں بدایوں کے پیڑے کھانے اور گڑیا کے کپڑے سلوانے وہاں جاتی ہوں لیکن ایک دن جب میں نے گھر آ کے ابا میاں سے سیدھے سیدھے یہ سوال کیا کہ "ابا میاں۔ نازنین کسے کہتے ہیں؟" تو انھوں نے لکھتے لکھتے حیرت سے سر اُٹھایا اور آہستہ سے کہا: "خوبصورت عورت کو!" لیکن امّاں بی بی نے جنھیں بچوں کی کارکردگی کے اسرار و رموز جاننے کا بہت شوق تھا تیوری پہ بل ڈال کے مجھ سے پوچھا۔

"تم نے کہاں سُنا یہ لفظ؟"

میں نے کہا: "آج دوپہر سرور صاحب۔ دلہن کے ہاتھ دیکھ کے کہہ رہے تھے کہ ان ہاتھوں میں مہندی لگائے ہے نازک نازنین۔"

امّاں بی بی نے پکانے والی بڑی بی کی طرف دیکھا۔ بڑی بی نے بھی جوابی مسکراہٹ فرمائی۔ لیکن اس دن سے مجھ پہ یہ پابندی لگا دی گئی کہ وقت بے وقت دلہن کے گھر نہ پہونچ پاؤں۔!!"

اس زمانے میں گھر میں مہمانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ شب و روز رہتا تھا اور مجھے پتہ رہتا تھا کہ جب پاندان کے

پاس جوڑ ڈبہ رکھا ہوتا تو جگر مراد آبادی مقیم ہوتے۔ ناشتے میں حلوے اور بالائی کا اہتمام ہوتا تو فراق گورکھپوری ٹھہرے ہوتے۔ دہلی کا حبشی حلوہ اور پستے بادام کی برفی رکھی ہوتی تو ذاکر صاحب آئے ہوتے۔ الہ آباد کے امرودوں سے بھرا ٹوکرا برآمدے میں دیکھا جاتا تو اصغر گونڈوی کا قیام ہوتا۔ کیونٹر کے مکھن کے ڈبے اور بسکٹ کے پیکٹ منگائے جاتے تو سید سلیمان ندوی رخصت ہونے والے ہوتے۔ پرہیزی کھانے پکے ہوتے تو ڈاکٹر عابد حسین آنے والے ہوتے۔ اور کوئی کا خوبصورت سیٹ نکالا جاتا تو خواجہ غلام السیدین یا اسماء اللہ کاظمی آئے ہوتے۔ اور جب اماں بی بی اپنی پٹاری سے دھاگے کی پیچک بھیجتیں تو ہمیں پتہ چل جاتا کہ مولانا حسرت موہانی آئے ہوں گے اور اپنی عینک کی ٹوٹی ہوئی کمانی کو دھاگے سے باندھ رہے ہوں گے۔!! زنانے دروازے پہ کھڑے ہو کے پردے کی آڑ سے اماں بی بی سے بریانی، نرگسی کوفتے، شب دیگ، پائے اور شاہی ٹکڑے کی فرمائش کرتے اکثر حفیظ جالندھری پائے جاتے۔ بڑے صحن میں دھوپ میں کرسیاں لگائی جاتیں اور صبح ناشتے کے بعد سے دوپہر کے کھانے تک ان شعرا و ادبا اور ان سے ملنے آنے والے طلبا اور ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا۔ چائے، کوفی اور پان کا سلسلہ مستقل اور مسلسل رہتا۔ ہمارا پرانا ملازم سکندر (خدا کے فضل سے بقید حیات ہے) تمام مہمانوں کی عادات سے اس قدر واقف تھا کہ اکثر مہمان، میزبانوں کے بجائے اپنی ہر ضرورت سکندر سے بتاتے تھے۔

پچھلے دنوں میں علی گڑھ گئی تو سکندر کو اسی طرح مصروف و مستعد دیکھا۔ ابا میاں کی آخری وقت تک جیسی خدمت اور دیکھ بھال جس محبت سے سکندر نے ادا کی۔ اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اب گھر وہ گھر نہیں رہ گیا ہے جس کی دیکھ بھال کے لئے سکندر کو تفویض کیا گیا تھا لیکن سکندر کی سرگرمیاں، خدمات، حفظ مراتب اور "اسٹوکریسی" جوں کی توں باقی ہے۔ کیا مجال کے اس گھر کے روزمرہ میں کوئی فرق آ جائے۔!

سکندر اور اس جیسے دوسرے انسانوں ہی سے یہ زندگی عبارت ہے۔!! ہم نے جن ادیبوں، شاعروں اور سیاستدانوں کو اخباروں میں پڑھا ہے یا اُن کے بارے میں دوسروں سے سُنا ہے۔ سکندر نے ان کی خدمت کی ہے اور ان کی عادات و اطوار کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے وہ "مستند" مانی جا سکتی ہے۔!!

ابا میاں کے پاس اُن کے دوستوں اور ملاقاتیوں کے علاوہ اُن کے شاگردوں کا بھی مجمع رہتا تھا۔ اس زمانے میں جو نوجوان طلباء اکثر گھر پہ آتے رہتے تھے اُن میں شاہد لطیف، معین احسن جذبی، علی سردار جعفری، مجاز، جاں نثار اختر، سید حامد اور منیب احمد فریدی کے نام مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ دوسرے طلباء بھی آتے تھے لیکن اُن کے نام مجھے ٹھیک سے یاد نہیں ہیں۔ دو چار طالب علم ایسے بھی ہوتے جو آئی۔ سی۔ ایس یا دوسرے مقابلے کے امتحانوں کی تیاری میں ابا میاں سے درس لیتے تھے۔ میرے بچپن اور لڑکپن میں شمالی ہندوستان میں خصوصاً والدین کی بڑی آرزو یہی ہوتی تھی کہ اُن کی لڑکی کسی آئی سی ایس سے بیاہ جائے۔ علی گڑھ کے ماں باپ بھی یہی تمنا دل میں رکھتے تھے۔ لڑکیوں کو مکمل تعلیم یافتہ اُسی وقت سمجھا جاتا تھا جب وہ لکھنؤ کے ازابلا تھابرن کالج (آئی۔ ٹی۔ کالج) میں پڑھتی ہو یا پڑھ چکی ہو۔ اگر آئی ٹی کالج کی نعمت سے محروم ہو تو کم سے کم ہوم سائنس کا ڈپلوما لیڈی ارون کالج (دہلی) سے ضرور حاصل کرے۔ ان کالجوں سے نکلی ہوئی لڑکیاں عام طور سے آئی سی۔ ایس افسروں کی بیویوں کے "منصب" کے کیل کانٹے

رہی ہوتی تھیں۔ باقی لڑکیاں مسلم گرلز کالج (علی گڑھ) کرامت حسین مسلم گرلز کالج (لکھنؤ) میں تعلیم حاصل کرتی تھیں وہ اکثر کلکٹر ۔۔۔ تحصیلدار، منصف، یا مدرس کی زوجیت میں دی جاتی تھیں۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم کے آغاز میں شادیوں کے بازار میں بڑی تیزی سے گرمی شروع ہوئی۔ نوجوان لڑکے دھڑادھڑ فوج میں بھرتی ہونے لگے۔ اور لڑکوں کی ملازمت اور شادی ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ لیفٹیننٹ کی وردی اور لڑکی تقریباً ساتھ ساتھ ملنے لگی۔ کبھی کبھی دلہن کو چند ماہ کے اندر اندر بیوہ ہو جانا پڑتا تھا لیکن پھر بھی ماں باپ کے لئے فوجی داماد کا بڑا CHARM تھا۔ ہمارے خاندان میں عام طور آپس ہی میں شادی کرنے کا رواج تھا اور رشتہ صرف سید اور صدیقی ہی کا قابلِ قبول تھا۔ میری ننھیال اور ددھیال والوں میں قریب تھے۔ ننھیال میں نانا ابا اثنا عشری تھے سب۔ لیکن ددھیال میں (جو میر صاحبان کے نام سے مشہور تھی) تفضیلیے سنی تھے۔ ننھیال اور ددھیال والے شکل و صورت اور عادت و خصلت میں ایک دوسرے کی ضد تھے۔ ننھیال میں پشت ہا پشت ویسے ہی ملازمت چلی آتی تھی اور ددھیال میں علم و آگہی کا چلن تھا۔ ننھیال والے بے حد وجیہہ، خوش شکل اور گورے چٹے اور فطرتاً ان کا رجحان ورزش، گھوڑ سواری، سیر و سیاحت، شکار اور دربار داری کی طرف تھا۔ اس کے برعکس ددھیال میں ذہانت، متانت، علمیت، دانائی اور رکھ رکھاؤ کی کارفرمائی تھی جسمانی طور پر بھی فریقین میں بڑا فرق تھا۔ ددھیال والے قدرے دبلے اور دھان پان سے تھے۔ شکل و صورت کے اس تضاد کے سلسلے میں امّاں بی بی نے ایک بار کہا۔ شادی کے بعد جب میں نے تمہارے ددھیال والوں کو دیکھا تو مجھے لگا جیسے راون کے دیش میں آ گئی ہوں۔ کوئی ایک بھی تو گت کی صورت نظر نہ آئی۔" میرے پھوپھی زاد بھائی (اب ڈی) جلال الدین احمد نے برجستگی سے کہا۔ مامی آپ صحیح فرماتی ہیں۔ لنکا والے سب ہی کولاتے ہیں۔!!"

۱۹۴۰ء کا ایک ایسا واقعہ مجھے یاد ہے جو بھلائے نہیں بھولتا۔ قصہ خود میری ہی ذات سے وابستہ ہے اور ہر چند کہ میری بیوقوفی کا روشن ثبوت ہے۔ اور اسے سن کر کرشن جی نے مجھ سے کہا تھا کہ "تمہارا یہ واقعہ میں اپنی سوانح میں ضرور لکھوں گا" لیکن کرشن اپنی سوانح کا وہ باب نامکمل چھوڑ کے کہیں آگے بڑھ گئے ہیں اسی لئے اب یہ مجھے ہی لکھنا پڑ رہا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک دن میں اسکول سے گھر لوٹی تو میں نے گھر میں عجیب سی اداسی دیکھی۔ ابّا میاں اخبارات سے کوئی خبر امّاں بی بی کو سنا رہے تھے اور امّاں بی بی چپ چاپ دل گرفتہ سی بیٹھی تھیں۔ امّاں بی بی کے پاس اُن کی جرمن سہیلی مس ڈورا (بعد میں علامہ اقبال کے بیٹوں کی گورنس بنیں) بیٹھی تھیں اور امّاں بی بی ان کو ٹوٹی پھوٹی جرمن اور کچھ اشاروں کی مدد سے سمجھانے لگیں۔ وہ خاتون اپنی ٹوٹی اور کچھ زیادہ ہی چھوٹی اردو میں جواب دے رہی تھیں۔ باورچی خانے میں گئی تو خانساماں کو سکینہ بوا سے کچھ کہتے سنا.... شام کو امّاں بی بی کی ایک بے حد قریبی دوست (بیگم حکیم عبداللطیف) آئیں تو ان کو بھی امّاں بی بی نے اطلاع دی۔ یہ سب کچھ ایسی رازداری خاموشی اور مدھم سُروں میں ہو رہا تھا کہ میری حسِ تجسس پہ مسلسل کوڑے برس رہے تھے۔ رات کو کھانے کے بعد سب لوگ ڈائننگ روم میں ریڈیو کے آس پاس جمع ہوئے اور ہمہ تن گوش ہو کے کچھ سننے لگے۔ خبریں یا جو کچھ بھی وہ تھا ختم ہوا تو مرد زیادہ خاموش اور سنجیدہ ہو گئے لیکن اکثر خواتین سسکیاں بھر رہی تھیں۔ میں اپنے بستر میں گرم لحاف میں دبکی ہوئی تھی لیکن نیند کوسوں دور تھی۔ میں چپکے سے بستر سے نکلی اور سیدھی باورچی خانے میں گئی۔ وہاں سکینہ بوا چائے کے برتن دھوتی جا رہی تھیں اور خود کلامی میں مصروف تھیں۔

"بڑے بڑے تخت لوٹے نامرادوں، کم بخت طلاقن شہزادے کی جان کو آگئی، اور کوئی نہ جڑا قتّامہ کو، بھولا بھالا شہزادہ دیکھ کے پھانس لیا مال زادی نے۔"

میں نے کہا سکینہ بوا...... مجھے بھی بتاؤ نا۔ طلاقن کون ہوتی ہے اور مال زادی کسے کہتے ہیں اور شہزادے کو کیسے پھانس لیا اُس نے۔؟"

بس اچھی بھلی بڑھیا طیش میں آگئی۔ "لو اور سنو، یہ بات نوار یوں بالیوں کے پوچھنے کی ہیں۔ کل کو یہ بھی پوچھنا کہ بچے کیسے جنتے ہیں!"

مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن میرا پورا وجود تجسس کی بھٹی میں تپ رہا تھا۔ چنانچہ میں نے انتہائی لجاجت سے کہا۔ اللہ سکینہ بوا اتنا بتا دو کہ ماجرا کیا ہے۔ پھر میں تم سے کچھ بھی نہیں پوچھوں گی۔ کسی اور سے پوچھ لوں گی۔"

اے ہونا کیا...... ولایت کا شہزادہ ہے نا...... اے وہی اپنے بادشاہ جارج پنجم کا بڑا بیٹا۔ ماشاء اللہ۔ لاکھوں میں ایک، پڑھا لکھا عالم فاضل، پنج وقتہ نماز وہ پڑھے، مہینے بھر کے روزے وہ رکھے، انگریزی وہ بولے فرفر۔ باپ کی آنکھ کا نور ماں کے کلیجے کی ٹھنڈک، تخت و تاج کا وارث۔ ماں باپ نے کن کن ارمانوں سے پالا پوسا۔ اور اب جو وقت آیا تو بیٹا ماں باپ کو کما کے کھلاتے تو جانے کدھر سے یہ "سیم تن" کو دیڑی۔ اے پوچھو۔ تجھے بھرا پُرا گھر بگاڑنے کو کس نے کہا تھا۔ لڑکے کی عقل پہ پتھر پڑے ہیں جو شاہی خاندان کی کنواری بالی لڑکی چھوڑ کے اس موئی کے چکر میں پڑ گیا۔ میں تو جانوں نگوڑی نے جادو ٹونے کا چکر چلایا ہوگا......!"

روداد سنا کے بی وا پس اپنے لحاف میں دبک گئی۔ لیکن شہزادے کے بھولپن اور شاہی گھرانے کی مصیبت کا خیال مجھے سونے نہ دیتا تھا۔ میرا شہزادے کا تصوّر بڑا روایتی اور خوبصورت تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس طرح انگلستان کے شاہی خاندان کا مسئلہ حل کروں۔ صبح اسکول گئی تو یہ بات میں نے اپنی سب دوستوں کو بتائی۔ اس دن اشوک کمار اور لیلا چٹنس کی کوئی فلم شہر میں چل رہی تھی۔ لڑکیاں وہاں جانے کی تیاریاں کر رہی تھیں، لیکن میری ایک سہیلی نے نام حسن کا نور جہاں تھا لیکن وہ نوری کہلاتی تھیں۔ اس معاملے میں بہت دلچسپی لی اور کنگ ریڈر کھول کر شہزادے کی　　تصویر بھی دکھائی اور بہت سوچ سوچ کے اس نتیجے پہ پہنچیں کہ اگر ہمارے اسکول کی کسی لڑکی سے شہزادہ شادی کر لے تو شاہی خاندان کے تمام تفکرات دور ہو جائیں گے۔ میں نے کئی لڑکیوں کے نام لئے لیکن سات سالہ نوری کو کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آئی تھی۔ بالآخر انھوں نے بے حد شرما شرما کے خود اپنی خدمات پیش کر دیں اور یہ شرط بھی رکھ دی کہ کپڑے اور زیور بے حد خوبصورت... اور بہت سارے ہونے چاہئیں۔ میں نے جو نوری کو یوں شہزادہ ہتھیاتے دیکھا تو بپھر گئی۔ واہ بھئی واہ، خوب۔ ہم نے تو شہزادہ ڈھونڈا۔ اور نوری بیگم اس سے شادی کریں گی۔ یہ تو کھلی بے ایمانی ہے... بس صاحب میں بھاگم بھاگ گھر آئی وہاں دیکھا کہ نوری کی امی اور میری اماں بی بی تخت پہ بیٹھی ہیں اور پاندان کھلا رکھا ہے۔ نوری اور میں دھڑاس اور بے تحاشہ بھاگتے ہوئے تخت پہ پہنچے اور نوری نے چلا کے کہا..." شہزادے سے شادی میں کروں گی...!" میں نے اس سے بھی زیادہ چیخ کے کہا "ہرگز نہیں

شہزادے کی شادی تو صرف مجھ سے ہوگی۔!"

دونوں خواتین کی حیرت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ لیکن ہم دونوں کو اس وقت کسی ماں باپ، اسکول یا سماج کی پرواہ نہیں تھی۔ ہم دونوں گتھم گتھا ہو کے لڑائی میں مصروف تھے۔

"شہزادے سے شادی میں کروں گی۔"

"نہیں، شہزادے سے شادی میں کروں گی۔"

"میں" "نہیں میں" "نہیں میں" کی تکرار چل رہی تھی۔ جب ڈرامہ زیادہ ہی ہوگیا تو دونوں "ماؤں" نے اپنی اپنی بیٹی کی اچھی دھنائی کی اور سانوں کو ہاتھ لگوا کے معافی منگوائی اور نوکر، نوکرانیوں کو بلا وجہ یہ کہہ کہہ کے ڈانٹا گیا کہ "ان کم بختوں کے بچوں بچیوں سے بُری بُری باتیں سیکھ لیتے ہیں ہمارے پھول سے بچے!!"

بچپن کی یادوں میں پہاڑوں کی یاد مجھے اب بھی تڑپاتی ہے۔ گرمی کی چھٹیوں میں عام طور سے ہم لوگ نینی تال جاتے تھے۔ الموڑہ مسوری، شملہ، سولن، رانی کھیت اور بھوالی، ان پہاڑوں میں شامل تھے۔ جہاں ہم جاتے تھے۔ لیکن نینی تال ابّا میاں کو بہت پسند تھا۔ اسلئے زیادہ تر وہیں جاتے تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ بچپن ہی کی نہیں۔ میری بچپن کے بعد کی یادیں بھی نینی تال ہی سے وابستہ ہیں۔ کرشن جی کا اور میرا بہترین اور خوبصورت ترین وقت نینی تال ہی گزرا ہے۔ کرشن جی کشمیر خصوصًا پونچھ پہ عاشق تھے۔ جہاں اُن کے والد ڈاکٹر تھے اور ان کا بچپن اور نوجوانی کا بڑا حصہ وہاں گزرا تھا، وہ اور میں گھنٹوں بیٹھ بیٹھ کے پونچھ اور نینی تال کا موازنہ کرتے رہتے تھے، جانے کتنے ہی پھول، پتیاں، جڑی بوٹیاں، پھل اور پیڑ دکھا دکھا کے وہ بتاتے تھے کہ پونچھ میں بھی یہی سب کچھ تھا۔

سنہ ۱۹۴۰ء میں میں چھٹی جماعت میں تھی تو پہلی بار عصمت چغتائی اور صفیہ اختر (مرحومہ بیگم جان نثار اختر) کو دیکھا۔ دونوں اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے B.T. (اب B.ed) کر رہی تھیں اور ہماری کلاسیز لیتی تھیں۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں چھٹیوں کے بعد جب نینی تال سے ہم لوگ علی گڑھ آئے تو جگر مرادآبادی کے ہمراہ مجروح صاحب (مجروح سلطانپوری) بھی یونین کے کسی مشاعرے کے سلسلے میں گھر پہ مقیم تھے۔ مجروح صاحب کو مشاعرے میں بہت داد ملی اور جب اُن کی واپسی کا وقت آیا تو ابّا میاں نے اُن کو یہ کہہ کے روک لیا کہ "آپ کی شاعرانہ صلاحیتوں کے سب قائل ہیں۔ اور میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ کچھ وقت علی گڑھ میں گزاریں۔!" ابّا میاں کے بارے میں تو سب ہی جانتے ہیں کہ وہ علی گڑھ کے عشق میں ابتدا تا انتہا مبتلا رہے۔ اور اُن کا کہنا تھا کہ "جب کسی معقول آدمی سے ملتا ہوں تو فوراً ہی خیال آتا ہے کہ علی گڑھ کا ہوگا۔ پتہ چلتا ہے کہ ایسا ہی ہے تو خوشی ہوتی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے تو افسوس ہوتا ہے کہ یہ کمی بھی کیوں رہ گئی۔ چنانچہ مجروح صاحب چند سال علی گڑھ میں مقیم رہے۔ پھر کسی مشاعرے کے سلسلے میں بمبئی پہنچے تو فلمی دنیا اور انجمن ترقی پسند مصنفین سے منسلک ہو گئے۔ اور اب تک بمبئی کی فلمی اور ادبی سرگرمیوں سے وابستہ ہیں۔

سنہ ۴۲ء میں ذاکر صاحب علی گڑھ آئے تو انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کی سوانح حیات میری کہانی (اردو) میں مجھے

مے کر دی۔ اس وقت مجھے پڑھنے کا نیا نیا شوق ہوا تھا۔ گھر کی کتابیں پڑھ لیتی تو یونیورسٹی لائبریری سے کتابیں منگواتی، اس علاوہ آل احمد سرور صاحب کے گھر جا کے کتابیں اٹھا لاتی ۔ اس وقت حجاب امتیاز علی کی کتابوں پہ دیوانی تھی۔ ان کے سارے مزعومی کردار بہت خوبصورت اور جیتے جاگتے نظر آتے۔ سر ہارلی، ڈاکٹر گار، جسٹن روناشن، جسوتی، روحی اور کوہ الماس وغیرہ اور مصنوعی حرارت پہ پکے ہوئے انگور اور فرانسیسی دریچے سے باہر گرم ایشیائی رات میں بلبلوں کا نغمہ اور جانے کیا کیا پڑھتی رہتی تھی۔

بڑے بھائی اقبال رشید جو فرسٹ ایئر میں تھے ایک دن گھر آئے اور مجھے کوئی اوٹ پٹانگ کتاب پڑھتے دیکھا تو بہت خفا ہوئے "یہ نہیں کیا آئیں بائیں شائیں پڑھتی رہتی ہو۔ لو یہ کہانی پڑھو۔ اگر دماغ میں کچھ آئے تو۔" رسالہ انھوں نے میرے آگے ڈال دیا اور خود اماں بی بی کو بنگال کے قحط کے بارے میں کچھ پڑھ کے سنانے لگے۔ میں نے اس دن پہلی بار کرشن چندر کا نام جانا اور پہلی کہانی "ان داتا" پڑھی۔ کچھ عرصے بعد پھوپی زاد بھائی جلال الدین احمد نے "شکست" پڑھنے کو دی۔ پھر میری سہیلی تسنیم نے (نواب صاحب چھتاری کی بیٹی) "طلسم خیال" کہیں سے منگوا کے مجھے بھیجی۔ بس پھر تو یہ حالت تھی کہ جی چاہتا تھا کہ شب و روز صرف کرشن چندر کی کہانیاں پڑھتی رہوں۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ کرشن چندر بہت زیادہ لکھتے تھے لیکن کرشن جی کے پرستاروں سے کوئی پوچھے کہ ان کو تو محسوس ہوتا تھا کہ کرشن جی بہت ہی کم لکھتے ہیں۔ اس زمانے میں شمالی ہندوستان کے تقریباً ہر اردو داں گھر میں لڑکیاں بسم اللہ کے گنبد سے نکلتی تھیں تو کرشن چندر پہ ایمان لے آتی تھیں۔

اس وقت جب ہم نے کارل مارکس اور لینن کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ کرشن چندر، سردار جعفری، عصمت، مخدوم، جاں نثار اختر، وامق اور مجاز اپنے کلام اور کہانی سے سوشلزم کی بنیاد رکھ رہے تھے اور ہمارے اذہان میں ایک نئے، بہتر اور برتر نظامِ زندگی کی داغ بیل پڑ رہی تھی۔ اس زمانے میں یعنی تقسیم ملک سے کچھ عرصے پہلے تک ترقی پسند مصنفین کی مقبولیت کا وہ عالم تھا جو یہاں بمبئی میں مقبول فلمی ستاروں کی آمد پہ یا کسی فلمی پریمیئر پہ ہوتا ہے۔ یعنی پرستاروں پہ بدحواسی اور ہیبت طاری ہوتی تھی۔ مشاعروں میں طلبا، وطالبات دیوانوں کی طرح امڈتے تھے۔ شعر تو شعر ہے وہ تو خود ہی یاد ہو جاتا ہے لیکن کرشن جی کی کہانیوں کے صفحوں کے صفحے پڑھنے والوں کو ازبر ہوتے تھے۔ "کس نے سردار جعفری کو دیکھ لیا۔ کس نے عصمت سے بات کر لی کون کرشن چندر سے مل لیا۔" دنوں اس کا چرچا رہتا تھا۔

تقسیم کے انقلاب نے اور آزادی کے بعد کے فرقہ وارانہ فسادات نے جیسے ہندوستانی دانشوروں کے قلعے کو ڈائنامائیٹ سے اڑا دیا، ہر اچھے، خوبصورت اور عظیم خیال کی دھجیاں بکھر گئیں۔ قومی یکجہتی کا شیرازہ بکھر گیا۔ بے شمار ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی آبرو کے ساتھ اردو زبان و ادب کا بھی جنازہ اٹھ گیا۔!!

کرشن جی سے میری پہلی ملاقات سنہ ۵۳ء میں دہلی میں مجاز نے کروائی تھی۔ اس کے بارے میں پہلے بھی کہیں لکھ چکی ہوں۔ اور آج کل بھی "اپنی یادوں" میں اس کا ذکر تفصیل سے کر رہی ہوں۔ فی الحال اس تھوڑے لکھے کو بہت جانیے کہ ہماری شادی نینی تال میں ہوئی تھی چند مشترکہ دوستوں کی موجودگی میں۔! چونکہ یہ عام شادی نہیں تھی اس لئے اس میں رکاوٹیں بھی قدم قدم پہ در پیش

تھیں۔ عزیز و اقارب کے علاوہ مذہب اور سماج بھی اپنا اپنا رول بڑی خوش اسلوبی سے نباہ رہے تھے۔ کوئی کہتا: "ایسا ہوگا تو ہندو مسلم فساد ہو جائے گا۔" کرشن جی کہتے: "ہندو مسلم فساد ہماری شادی سے پہلے بھی ہوتے ہیں اور بعد میں بھی ہوتے رہیں گے۔ ہمیں فسادات کے محرک یا موجد کا منصب نصیب نہیں ہوگا۔!"

میں کہتی: "دیکھو نا! ہمارے تمہارے رشتے دار خودکشی کر لیں گے۔"

کرشن جی جواب دیتے: "محبت کرنے والوں نے تو اکثر خودکشی کی ہے۔ لیکن نفرت کرنے والوں کو خودکشی کرتے میں نے کبھی نہیں دیکھا... وہ تو جیتے ہیں اور جی جی کے نفرت کرتے ہیں۔"

میں کہتی: "محبت کرنا کافی نہیں ہے کیا، آخر شادی ہی کیوں؟"

کرشن جی کہتے: "صرف محبت کرنا کافی نہیں ہے۔ محبت میں سپردگی لازمی اور غیر مشروط ہونا چاہیئے۔ اور چونکہ یہ شادی کے بغیر ممکن نہیں، اس لئے شادی ضروری ہے۔!"

میں نے کہا: "شادی ہوگی کیسے؟"

کرشن جی نے کہا: "جیسے شادی ہوتی ہے!"

میں کہتی: "لیکن آپ بی بی تو نکاح کو ہی شادی مانتی ہیں!"

کرشن جی کہتے: "تو ہم بھی نکاح کو ہی شادی مان لیں گے!"

"مگر یہ کیسے ہوگا؟"

"مگر یہ کیوں نہیں ہوگا.....!"

بالآخر ایک دن ایک دوست رامپور سے ایک مولوی صاحب اور تین گواہوں کو لے کر نینی تال آئے۔ اور بعد نماز عصر سوئس ہوٹل نینی تال میں وہ "واقعہ" ظہور پذیر ہوا جسے نکاح کہتے ہیں۔

نکاح سے پہلے مولوی صاحب نے پوچھا۔

"جناب کا نام"

جناب نے جواب دیا: "کرشن چندر۔"!

مولوی صاحب اور ان کے رفقاء چونک گئے۔ "جی! جی کیا فرمایا...."؟

حالات معلوم ہونے پر مولوی صاحب نے پوچھا۔

"کیا آپ نے اچھی طرح غور کر لیا ہے۔"

"آپ کے آنے سے پہلے ہی کر رہا تھا۔"

"گویا مشرف بہ اسلام ہونے کا قصد ہے۔ جناب کا نیک خیال ہے۔"

"زندگی بھر خیال بدلتا رہا ہے۔ آج نیک خیال کی طرف رجوع کرتا ہوں۔!"

"اسمِ شریف کیا تجویز فرماتے ہیں جناب؟"

کرشن جی نے میری طرف دیکھا۔ میں تو روہانسی ہو گئی۔

"کیوں اس نام میں برائی کیا ہے۔ آخر اتنا تو خوبصورت نام ہے۔" میں نے کہا۔

مولوی صاحب نے کہا۔ دیکھو بی بی۔ امورِ شرعیہ میں قیل و قال کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ الله کا نام لے کے اس بارِ ثواب سے سبکدوش ہونا چاہیئے۔"

ہائے ہائے کیسا قیامت کا وقت تھا وہ۔ میں تو یہ سوچ سوچ کے رونے لگی کہ ہمارے اچھے بھلے رشتے کو کار ثواب بنایا جا رہا ہے۔ میں نے کہا "اس میں کار ثواب کی کیا بات ہے؟"

"ارجی ؟ آپ کو ایک حج کا ثواب ملے گا بی بی!"

اب تو میری حالت تباہ ہو گئی۔ میں دوسرے کمرے میں جا کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ اجب رو دھو کے منھ پونچھ کے اور لپ اسٹک گہری کر کے باہر نکلی تو کرشن جی بیٹھے بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ پتہ چلا کہ کرشن جی نے اپنا نام وقار ملک تجویز کیا ہے۔ میں پھر دوسرے کمرے میں آ گئی۔ کرشن جی میرے پیچھے پیچھے آئے..... میں نے جھنجلا کے کہا۔

"یہ بھی کوئی نام ہوا آخر؟"

کرشن جی کھڑکی کے باہر دھندلائی ہوئی پہاڑیوں کو دیکھتے ہوئے بولے۔ جب میں پونچھ میں چوتھی جماعت میں تھا تو میرے دو دوست تھے۔ ایک کا نام وقار تھا دوسرے کا ملک۔ ہم لوگ ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے رہتے تھے۔ میں نے پہلا بار غالب کا شعر اسی گھر میں سنا تھا۔ عیدی پہلی، سیویاں، وہیں چکھی تھیں۔ شامی کباب، اور بریانی کا ذائقہ وہیں جانا تھا۔ خاصدان سے پان کی گلوری وہیں اٹھائی تھی اور گھر آ کے اپنی ماں جی سے خوب جھگڑا کیا تھا کہ ہمارے گھر میں عید کیوں نہیں منائی جاتی"!

ارے ہاں۔ ایک بات تو بتانا ہی بھول گئی کہ جب ہم نے زندگی بھر ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تو ایک دن میں نے اماں بی بی کو کرشن جی کا ایک فوٹو دکھایا (اس وقت تک وہ کرشن جی سے نہیں ملی تھیں) اور ان کی رائے مانگی۔ اماں بی بی کچھ دیر فوٹو کو الٹ پلٹ کے دیکھتی رہیں پھر بولیں..." اچھے خاصے ہیں۔ شکل سے معقول نظر آتے ہیں۔ ہندو تو قطعاً نہیں لگتے"! اسی زمانے میں کرشن جی نے میرا ایک فوٹو اپنی ماں جی کو دکھایا اور کہا "یہی سلمیٰ ہے..... آپ کو کیسی لگتی ہے؟" ماں جی نے عینک لگا کے تصویر کو خوب غور سے دیکھا اور بولیں..." ارے یہ ہے سلمیٰ؟ یہ تو ٹھیک ٹھاک ہے۔ بالکل مسلمان نہیں لگتی"!

یہ بات اور اس طرح کی بہت ساری باتیں ہمارے درمیان اکثر لطف اور دلچسپی کا باعث بنتی تھیں۔ سترہ سال کے شب و روز میں اکثر ایسے مواقع آئے کہ ہم دونوں کے درمیان کتنی ہی بار چھوٹی بڑی باتوں پر تکرار ہو جاتی تھی۔ لیکن ایک ہی موضوع ایسا تھا جو کبھی ہمارے درمیان نہیں آتا تھا اور وہ تھا مذہب۔ کبھی احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ ہمارے گھر میں مذہب کی بنا پر کبھی کسی اختلاف کی گنجائش ہے۔ ملازمین تک اس سلسلے میں بہت RELAXED رہتے تھے۔ ہاں مکان لینے جاتے تو اکثر یہ مشکل درپیش آتی۔ جب پتہ چلتا کہ کہیں کسی ہندو مالک مکان نے مسلمان کو اپنا مکان دینے سے انکار کر دیا ہے یا کسی مسلمان کو اپنا مکان کسی

ہنڈ کو دینے میں تامل ہے تو ایسے مواقع پر کرشن جی کئی دن بے مزہ رہتے ۔!!

عید کے دن بے حد خشوع و خضوع سے نئے کپڑے پہنتے، عطر لگاتے، پان پہ پان کھاتے اور ہر تھوڑی دیر کے بعد شیر قورمہ چکھ لیتے اور بار بار عید کے بہانے گلے لگنے اور لگانے کے مواقع ڈھونڈتے رہتے۔!!

جب تک ہم دونوں ساتھ رہے "ہمارے مذہب" کے بارے میں ہم سے کسی نے پوچھ تاچھ نہیں کی۔ اور میں سمجھتی ہوں یہی ایک صحیح اور مہذب طریقہ بھی تھا۔ لیکن کرشن جی کے بعد اس بارے میں مجھے اپنوں اور پرایوں نے طرح طرح سے عاجز کیا۔ طرح طرح کے بے مصرف اور احمقانہ سوالات کی بوچھار مجھ پہ ہوتی رہی خصوصاً اس بات پہ بیشتر لوگ جیں بہ جبیں تھے کہ جب کرشن جی نے نکاح کیا تھا تو ان کی تجہیز و تکفین اسلامی طریقے سے کیوں نہ کی گئی۔ ایک صاحب نے نکاح نامہ تک دیکھنے کی فرمائش کی۔ میں اس طرح کی باتوں کا جواب دینا تو نہیں چاہتی تھی، کہ میرے لئے یہ ذکر اور اس طرح کی باتیں صرف ناخوشگوار ہی نہیں انتہائی اذیت ناک بھی ہیں۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اس بارے میں کچھ کہنے کا وقت اب آگیا ہے۔ اس لئے کہ جب تقریباً دو سال کی کربناک مدت نے زندگی کے پرانے اور بوجھل پہئیے نے اور کچھ جیتے رہنے کی فرسودہ عادت نے کارزار حیات کے شب و روز میں گھل مل جانے پہ مجبور کر دیا ہے تو میں بھی دو چار لفظ اپنے اور اپنے کرشن جی کے دین و مذہب کے بارے میں کہنا چاہتی ہوں۔ پہلی بات یہ کہ بنیادی اعتبار سے کرشن جی مکمل طور پر ایک مارکسسٹ تھے۔ وہ کسی مذہب اور کسی کے بھی خدا کو نہیں مانتے تھے بلکہ اپنے عقیدے ہی کو سب کچھ مانتے تھے۔ آخری وقت تک ان کے عقیدے اور نظریے میں رتی برابر فرق نہیں آیا۔ اُن کے نزدیک دنیا کی سب سے قابلِ احترام مخلوق ایک ہی تھی یعنی اشرف المخلوقات۔ انسانوں کا درجہ انھیں آسمانوں سے ہمیشہ برتر نظر آتا تھا۔

رہا میرا معاملہ تو میں چونکہ عورت ہوں اس لئے فطرتاً اور سماجاً بزدل ہوں۔ مذہب اور مذہبی امور سے مجھے لگاؤ سے زیادہ خوف محسوس ہوتا ہے (کسی خاص مذہب سے مطلب نہیں ہے) مجھے مذہب ورثے میں ملا، بغیر طلب، مشورے یا مطالبے کے ملا۔ میں نے اپنے مذہب کا تعین اور احترام بعض اچھے انسانوں کے قرب سے کیا اور اسی مذہب کو معتبر اور محترم گردانتی ہوں۔ مرنے کے بعد انسان کہاں جاتا ہے۔ اس حقیقت سے میں لاعلم ہوں۔ اس کی سزا و جزا کن اصولوں یا اعمال کے تحت ہوگی اس سے بھی ناواقف ہوں۔ جو لوگ اس طرح کے امور خاص میں "سند" کا درجہ رکھتے ہیں یہ مسائل انھیں کے حل کرنے کے ہیں۔

"کیسی عذاب ثواب، حساب کتاب، انعام عتاب اور سود و زیاں کے دائرے میں، میں محصور نہیں ہوں۔ اور ایسا کرنے میں اور ایسا سوچنے میں بحیثیت ایک انسان کے حق بجانب بھی ہوں۔" جانے وہ دن کب آئے گا جب ہم بعض رشتوں کی عظمت اور منصب سے آگہی حاصل کریں گے۔ ایسا رشتہ جس پہ شرمندہ نہیں ہوا جاتا، فخر کیا جاتا ہے۔ ہمارا رشتہ تھا اور وہ عقیدہ جسے دل سے مانا جاتا ہے وہ کرشن جی تھے میں نے جنھیں بے دلیل مانا اور بے دلیل چاہا۔

جو لوگ سزا و جزا کے حصار سے نکل جاتے ہیں وہ پہلے پتھر سے نہ تو ڈرتے ہیں اور نہ ڈراتے ہیں۔!!



شکیلہ اختر

"........ وہ افسانہ آج تک میرے ذہن پر چھایا ہوا ہے۔ اس وقت میری عمر دس سال کی تھی۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں اس افسانہ کے حسن نے مجھ پر جیسے جادو کر دیا تھا.... شاید اسی افسانہ نے مجھے کہانیاں لکھنے پر مجبور کیا ہے ورنہ کہاں میں اور کہاں غفور دادا کا مدرسہ اور کہاں ہماری افسانہ نگاری ...."

حضرت بودھ کو جس جگہ نروان حاصل ہوا تھا اسی گیا ضلع کے ایک خوبصورت قصبے اردل میں میں پیدا ہوئی ہوں، جس کے سر پر سون ندی کا چوڑا پاٹ سوا حسین تاج ہے اور جس کے پاؤں میں جھلملاتی ہوئی خوبصورت نہر کا پازیب۔ یہ علاقہ قلمی آم کے باغوں، شیشم، تاڑ کی قطاروں اور نیم کے جھنڈوں سے آباد ہے۔ حد نظر تک ہریالے دھان اور سنہرے گیہوں کی کھیتیاں یہاں کی مشہور ہیں۔ سنہرے پیتے کے اونچے اونچے ٹیلوں پر سرکنڈوں کے ریشمی پھولوں کے مرغولے جب ہواؤں سے لہراتے ہیں تو اس وقت بے اختیار شعر کہنے، افسانہ لکھنے اور تصویریں بنانے کو جی مچل مچل جاتا ہے۔

زمیندار رئیس شاہ صاحبان کا اپنا ہی خاندان اس قصبے میں بسا ہوا ہے۔ رہا بسا ہوا یہ علاقہ ہے سب ہی طرح کے لوگ ہیں۔ بچپن میں آنکھ کھلی تو جہاں اماں اور ابا جان کا شفیق اور خوبصورت چہرہ دیکھا وہاں گھر کی لائبریری اور ہندوستان بھر کے رسالے اور اخبار بھی دیکھے۔ اماں اور ابا جان کا ادب سے گہرا لگاؤ بھی محسوس کیا۔ پھر چار سال کی عمر میں غفور دادا کے مدرسے میں جو قریب ہی تھا بڑے سلیقے سے دوپٹہ اوڑھا کر ایک ملازمہ کے ساتھ بھجوائی جانے لگی۔ غفور دادا بیچارے بھی خاندان ہی کے شاہ صاحب تھے مگر غریب ہو چکے تھے اونچے برآمدے میں صاف ستھری چٹائیاں بچھی رہتیں اور بچیاں اپنی اپنی حیثیت کے لحاظ سے اکٹھی ہو کر بٹھائی جاتی تھیں۔

پڑھائی بڑے دھوم دھام سے شروع ہوتی، سبق دے کر غفور دادا چھڑی گھماتے باہر نکل جاتے۔ ان کے جاتے ہی اندرونی طور پر پڑھائی رک جاتی اور کچھ بچیاں غفور دادا کی بیوی کے احکام میں جٹ جاتیں، کوئی بڑی لڑکی مصالحہ پیسنے لگتی کوئی آنگن کے کنویں سے پانی بھرنے جاتی کسی کے ہاتھ میں جھاڑو ہوتا۔ اور ہم شاہ صاحبان گھرانے کی بچیاں یہ سارا تماشا دیکھا کرتی تھیں۔ میں بچپن ہی سے انسانی برابری کی قائل رہی ہوں۔ میں نے گھر آتے ہی اماں سے شکایت کی "یہ غفور دادا کی بیوی مجھ سے کوئی کام کیوں نہیں لیتی ہیں اماں؟ کیا میرے ہاتھ نہیں ہیں؟"

اماں ہنس پڑیں "تم جو گھر میں بھی کام نہیں کرتی ہو اسی لئے وہ نہیں کراتی ہیں۔"

"تو پھر میں گھر میں بھی کام کروں گی اور آمنہ، میمونہ کے ساتھ مل کر بھی کام کروں گی۔" میں نے بغاوت میں اکڑ کر کہا۔

اماں ہماری ایسی اوٹ پٹانگ باتیں سنکر ہمیشہ ہنستی رہتی تھیں "کام کرنے سے جانتی ہو؟ ہاتھ ٹھیکرے جیسے ہو جائیں گے۔ ہاں! پھر کوئی بیاہ بھی نہ کرے گا تم سے۔"

اماں کی باتیں سنکر میں غصے میں بولی "اللہ کرے، کوئی مجھ سے بیاہ نہ کرے۔ نہیں کرتی میں کسی سے بیاہ ویاہ!" اور جب دوسرے دن مدرسے پہنچی تو اپنے اونچے استھان پر سے نیچے اترتی ہوئی میں نے آمنہ کی چٹائی پر بیٹھتے ہوئے بڑے پیار سے کہا "آج سے میں بھی تمہارے ساتھ کام کروں گی آمنہ! کنویں سے ڈول میں پانی آتے ہوئے دیکھکر مجھے بڑا اچھا لگتا ہے۔"

"ارے تم۔ تم پانی بھرو گی ــ! اس کھڑوس حکیم صاحب کی بیٹی ام ہانی نے بڑی حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم بھی۔ بادل دستے میں دنیا بھر کے جھاڑ پھونس رات دن اپنے ہاتھوں سے کوٹتی رہتی ہو ــ" میں نے اکڑ کر کہا۔

"ہائے! وہ تو عطار کو نتے چھنکتے رہتے ہیں۔ میں نے تو کبھی ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔"

میں نے بڑی کڑوی نظر سے اُم ہانی کو دیکھا "ہاں آمنہ میں چینی کی گڑیا نہیں ہوں جو ٹوٹ جاؤں گی۔" اور سامنے خلوص سے میں نے آمنہ میمونہ اور مدیحہ کے لیے نوالے شروع کر دیئے "مگر آمنہ! بہ صد ہو گئی۔ جب ہی تب اپنے بستوں میں تم لوگ اتنی سڑی بُسی چیزیں کیوں ٹھونس لاتی ہو۔ اُونہہ وہی چاول کی موٹی موٹی روٹیاں اور وہی روڑے پتھر جیسے بیکار سے بیسنے۔ کبھی تمہارے یہاں کوئی ڈھنگ کی چیز پکتی ہی نہیں ہے ؟ - بھلا لیا کیا سکتا ہے کوئی۔ بیچھے پر ذرا دانت گڑاؤ۔ تو اندر سے گیلے گیلے گودے نکلتے ہیں۔ تو بابا اپنے کپڑے کون خراب کرے گا۔ جاؤ کنوئیں سے پانی بھر دو اور بیٹھی بیٹھی پیسنے کھاتی رہو۔ اور ۔۔ اور کر ہی کیا سکتی ہو تم لوگ۔"

آمنہ کے ساتھ کام کرنے کا میرا سارا جوش ختم ہو گیا تھا اور جب میں غصے میں بھری اپنے اونچے استھان پر واپس آئی تو میرے رشتے کی پھوپھیاں محفوظ اور ساجدہ نے بڑی سرگوشیوں میں پوچھا کہ تم ابھی کس پر ناراض ہو رہی تھیں۔ کیا آمنہ نے کچھ کہا تھا ؟

"ارے کچھ بھی نہیں۔ اس آمنہ کی بچی کو گز بھر پیسے کھانے سے فرصت ہی کہاں ہے۔ بھرتی رہے پانی۔ کوئی اس کی مدد نہیں کرے گا۔"

یہی ہماری مدرسے کی زندگی تھی ۔۔ ۸ سال کی عمر میں وہاں کی تعلیم مکمل کر کے پردے میں بٹھا دی گئی۔ گھر میں علمی اور ادبی فضا تھی۔ گھر کی لائبریری میں علم و ادب سے بھری کتابیں لگی ہوئی تھیں۔

ان دنوں زمیندار لوگ نے شہروں سے اپنا ناطہ توڑ لیا تھا کیونکہ انکے کچھ بزرگوں نے شہر میں رہن بس کرا پانا گھر۔ اور باپ دادا کی دولت سب کچھ تباہ کر دیا تھا ۔۔ اور اسکول اور کالج شہر ہی میں ہوتے تھے۔

بچپن ہی سے دنیا بھر کے رسالے دیکھتی پڑھتی آ رہی تھی۔ روزانہ رات کے وقت گھی اماں آپا جان کو افسانے سنائیں اور آبا بادی اماں سو گئیں یا ابھی نہ تھے۔ خوبصورت لیمپ کی روشنی کمرے کی سفیدی کو اور بھی جگمگا رہی تھی۔ اس وقت نیرنگ خیال نے ایک دھوم مچا رکھی تھی۔ ایک رات آپا جان نے امتیاز علی تاج کا ایک بنگالی طویل افسانے کا ترجمہ سنایا۔ میں ساری رات اس افسانے کو سنکر سسک سسک کر روتی رہی تھی۔ وہ افسانہ آج تک میرے ذہن پر چھایا ہوا ہے۔ اس وقت میری عمر دس سال کی تھی۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں اس افسانے کے فن نے مجھ پر جیسے جادو کر دیا تھا۔ اب بھی یہی سوچتی ہوں کہ شاید اسی افسانے نے مجھے کہانیاں لکھنے پر مجبور کیا ہے۔ ورنہ کہاں میں اور کہاں غفور دادا کا مدرسہ اور کہاں ہمارا افسانہ نگاری۔

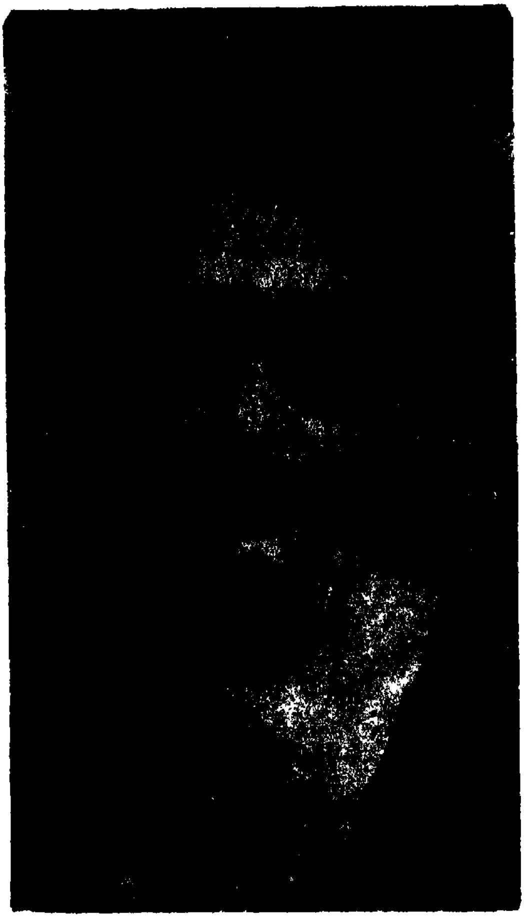
اختر صاحب میری اماں کے چچازاد بھائی تھے۔ ڈاکٹروں نے انہیں سون کنارے رہنے کے لیے ہمارے پاس بھیج دیا تھا۔ ان کے آتے ہی جیسے "پام دلا" میں بہار چھا کر رہ گئی تھی۔ انہوں نے اُنہی بڑی بہنے اور میری بہن رضیہ رضا کو پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ میر، مومن، غالب اور اقبال پر ایسے ایسے لیکچر ہونے کہ اگر وہ ہمارے پلے پڑ جاتے تو پھر آج ہم بھی اپنی کچھ صلاحیت پیدا کر سکتے تھے۔ دیوانِ غالب اور بانگِ درا کی تفسیریں ہونے لگیں۔ انگریزی، جغرافیہ، ہسٹری کی کلاسیں باقاعدہ شروع ہو گئیں۔ شعر سمجھنے اور شعر کہنے کی مشقیں ہوتی رہتیں۔ گھر کی لائبریری کھنگال کر رکھ دی گئی۔ جن قلمی نسخوں کو دیکھ کر ہمیں بخار چڑھ جاتا تھا اب انہی کو غور و فکر سے پڑھا جانے لگا تھا۔ بس۔ ہماری تعلیم کی یہی انتہا تھی۔

اب ہمارے گھر کا کوئی شوخ لڑکا یہ کہہ دیتا ہے کہ "آپ نے تو ایک کلاس بھی پاس نہیں کیا ہے" تو ہنس کر اس حقیقت کو مان ہی لینا پڑتا ہے۔

بہت چھوٹی سی عمر ہی سے مجھے لکھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ پہلے چھوٹے چھوٹے انشائیہ لکھتی رہی۔ پھر ہلکی پھلکی سی غزلیں بھی کہہ لیتی تھی۔ جب یہ چیزیں چھپ کر آتیں تو اک خلش سی دل میں ہوتی۔

پھر نہ جانے کیسے میں نے ایک افسانہ لکھ دیا جس کو "ادب لطیف" نے بڑی تعریف کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس کے بعد سے افسانے ہی لکھ رہی ہوں۔ میرا پہلا افسانوں کا مجموعہ "درپن" مکتبہ اردو لاہور نے شائع کیا تھا۔ دوسرا مجموعہ "آنکھ مچولی" بمبئی سے چھپا۔ تیسرا مجموعہ "ڈائن" پٹنہ سے شائع ہوا۔ چوتھا مجموعہ "آگ اور پتھر" الہ آباد سے چھپا۔ پانچواں میرے تین ناولٹ کا مجموعہ "تنکے کا سہارا" کے نام سے لکھنؤ سے چھپا۔ چھٹا افسانوں کا مجموعہ "لہو کے دیے" پٹنہ سے شائع ہوا ہے۔ اتر پردیش اردو اکیڈمی نے مجھ کو "تنکے کا سہارا" پر دو ہزار روپیہ انعام دیئے۔ بہار اردو اکیڈمی نے "لہو کے دیے" پر پہلا انعام ڈیڑھ ہزار روپے کا دیا ہے۔ میرا آٹھواں افسانوں کا مجموعہ "آخری سلام" زیر ترتیب ہے۔ ایک ناول بھی لکھ رہی ہوں۔ میرے افسانے ہندی میں ترجمہ ہوتے رہے ہیں۔ ایک افسانہ گجراتی اور ایک تامل زبان میں بھی ترجمہ ہو کر کافی پسند کیا گیا ہے۔





آمنہ ابوالحسن

"......... عشق وہ نگینہ ہے جسے عاشق جتنا تراشے اتنے ہی پہلو اور اتنا ہی تجلّی کا انعکاس ہو۔ خیر
اور روح کا کلی بن کر کھلنا، غیر عاشقوں کی فہم سے بالاتر ہو تو ہو، ناچیز کی زندگی کا تو حاصہ ٹھہرا جو بہ محسوس کئے
بغیر ایک سانس بھی نہیں لے سکتی کہ ——— "ہر دم تیرے انفاس کی گرمی کا گماں ہے ———"... اور
بقول کسے ——— "دلوں کا طواف کرو کہ یہی کعبہ کا طواف ہے۔"

دوستو اگر آپ میرے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں تو دو اور دو کی زبان میں وہ یوں ہے کہ سنہ ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد دکن کے ایک نہایت ذی حیثیت گھرانے میں پیدا ہوئی۔ میرے والد جناب ابوالحسن سید علی مرحوم حیدرآباد کے بے حد ممتاز ماہر قانون اور نامور سیاست داں تھے۔ چنانچہ میں بھی لازماً حیدرآبادی تہذیب و علم کی پروردہ ہوں۔ سنہ ۱۹۵۵ء میں حیدرآباد ہی کے نوجوان سال صحافی جناب مصطفےٰ علی اکبر سے میرا بیاہ ہوا جو بعد میں آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد اور پھر آل انڈیا ریڈیو دہلی کے اردو نیوز ریڈر مقرر ہوئے اور ہنوز اسی سے وابستہ ہیں۔ اپنے پیشے کے لحاظ سے نہیں بلکہ طبعاً سیاسیات سے از حد دلچسپی رکھتے ہیں۔ معاملات ادب میں دخل نہیں دیتے لیکن عمدہ ادب پاروں کا احترام ضرور کرتے ہیں۔

والد اور شوہر کے سیاسیات سے حد درجہ انہماک کے باوجود میں طبعاً کبھی سیاسیات میں دلچسپی نہ لے سکی بلکہ میرا میدان ابتدا ہی سے فنون لطیفہ کی طرف رہا۔ جیسا کہ میں اپنی پہلی کتاب کے دیباچے میں لکھ چکی ہوں کہ مزاج کے اعتبار سے بننا تو مجھے موسیقار چاہئے تھا مگر نہ جانے کس طرح کہانی کار بن گئی۔ میری بیشتر کہانیاں اچھی موسیقی ہی کی رہین منت رہی ہیں جن کے موضوعات کا تعلق اگرچہ موسیقی سے نہیں مگر موسیقی کے زیر اثر حاصل ہوئے انسپیریشن کی بدولت ہی وجود میں آئیں۔

اور جہاں تک زندگی کا تعلق ہے اچھی زیادہ گزری بُری کم۔ لیکن تھوڑی بہت جتنی کچھ بُری گزری اسے بھی میں نے اچھی سمجھ کر گزار لیا کہ مزاج میں جذبوں کی انتہا پسندی کے باوجود عفو و درگزر اور تحمل کا مادہ اپنے والد اور شوہر سے حاصل کیا۔ حالانکہ میں اپنا ایک مخصوص مزاج لیکر پیدا ہوئی مگر میرے کردار کے کمزور حصوں کی تشکیل میں میرے والد اور شوہر نے ارادی یا غیر ارادی طور پر نہایت اہم رول ادا کیا۔

اب یہی باتیں اگر آپ دو اور دو چار کی زبان کی بجائے احساس کی زبان میں سننا چاہیں تو عرض ہے کہ ——

بہت سی خوبیوں خامیوں، خوبصورتیوں بدصورتیوں کا نام دنیا ہے۔ کمزوریوں اور قوتوں کے مجموعے کا نام دنیا ہے۔ دنیا میں خوبصورتی کیوں پیدا ہوئی؟ اسی لئے نا کہ لوگوں کی نظروں کو راحت ملے۔ اُن کے ذہن مہکیں۔ بدصورتی کیوں صورت گر ہوئی کہ لوگ عبرت حاصل کریں۔ شجر کس لئے اُگے کہ انسان ان کی چھاؤں سے اپنی تھکن مٹائے۔ پھل کیوں پیدا ہوئے کہ آدمی ذائقے سے آگاہ ہو۔ چاند کیوں چمکا کہ لوگوں کی نگاہوں میں تابناکی آئے۔ انسان کیوں پیدا ہوئے کہ ان نعمتوں سے لطف اندوز ہوں اور کائنات میں ان کی اہمیت کے پیش نظر ان کی پرورش، بقا و سلامتی کے جتن کریں۔ لیکن اگر پھولوں نے مہک لیا تو کون سا کمال کیا۔ سایوں نے پناہ دے دی تو کون سا تیر مار لیا۔ چاند نے چمک لیا تو کون نئی حرکت کی اور بدصورتی نے خوفزدہ کر دیا تو کون کارنامہ کیا کہ یہ سب تو ان کے معمولات اور مقدر ٹھہرے۔ ہاں انسان پیدا ہوئے یہ البتہ بڑا کام ہوا کہ اگر انسان ہی نہ ہوتے تو اتنی گوناگوں حسین کائنات کا مصرف بھی کیا ہوتا۔؟

یہ حقیقت ہے کہ کائنات جو صدیوں سے اپنے جمال و جلال کا لوہا منوا رہی ہے بے شک وسیع و عظیم مگر وہ ایک متنفس جو عشق کی تاب و مجال رکھتا ہے اس وسیع و عظیم کائنات پر کتنا بھاری جو بجائے خود ناقابل شکست رعنائی کائنات کے احساس۔ ارتقا و بقا کے لئے یکسقدر

ضروری کہ عشق کرنے والے اسمیں ضرور موجود ہوں۔ کیونکہ تڑپنا بھی ایک تجرباتی عمل ٹھہرا۔ اور جو انسان تڑپنا نہ جانے وہ جیسے ہی اپنی پیدائش کا کا منطقی مصرف پورا کرلے مشین بنکر جیئے۔ اپنی عمر تمام کرلے لیکن جو دھوپ بکھر خود اپنی پر نہ پھیلے۔ عود و عنبر کی طرح خود اپنے آپ میں سلگے وہ بھلا زندگی کا صحیح مفہوم کیا جانے۔؟ اور فرزانوں کے اس جہاں میں وہ چند دیوانے جو فرزانگی کا تاج اپنے سر سے اتار پھینک پھانک کر تیشہ بدوش عشق کے حضور اپنی زندگی کا خراج پیش کرتے ہیں۔ میرے نزدیک دراصل کائنات کی بقاء اور حسن و جمال کے پاسدار عشق اس دنیا کی ایسی بڑی اور پہلودار سچائی جسے جھٹلانا ممکنات میں نہیں۔ عشق وہ نگینہ جسے عاشق جتنا تراشے اُتنے ہی پہلو اور اُتنا ہی تجلی کا انعکاس ہو۔ خرد کا بھٹکنا اور روح کا کلی بنکر کھلنا غیر عاشقوں کی فہم سے بالا ہو تو ہو ناچیز کی زندگی کا تو خاصہ ٹھہرا جو یہ محسوس کئے بغیر ایک سانس بھی نہیں لے سکتی کہ "ہر دم تیرے انفاس کی گرمی کا گماں ہے..." اور بقول کسے، دلوں کا طواف کرد کہ ہی کعبے کا طواف ہے۔

سچ پوچھیئے تو میں اس دنیا میں خود کو وہ خانہ بدوش سمجھتی ہوں جس کا پتہ اُڑ کوچہ کوچہ قریہ قریہ ملک میدان ضرور ہوا کرتا ہے۔ مگر جو خود مستقل نہ ہو کر بھی محبت کے لئے اپنا ایک اٹل اور بے مثال کردار ضرور رکھتا ہے۔

پیار میری فطرت۔ میرا مشاہدہ۔ میرا مطالعہ ہے۔ میری آپ بیتی مکمل نہ ہو پائے گی اگر میں یہ نہ بتاؤں کہ میرا خمیر ہی پیار سے اٹھایا گیا ہے۔ میں نے کس کس سے پیار کیا ہے جب موقع ملا ہے تو سن ہی کیوں نہ لیجیئے

میری ماں میرے اتنے بچپن میں گزر گئیں کہ ان کی مہر و محبت اور شبیہ کی بس ایک جھلک ہی یاد ہے پھر بھی میں ان سے آج تک بے پناہ پیار کرتی ہوں۔ میرے باپ میرے ہوش و حواس کے عالم میں گزرے۔ مجھے ان کی ذات سے کافی آگاہی ہے لیکن آج اُن کے نہ ہونے پر بھی میں اُن سے حد درجہ پیار کرتی ہوں۔ میرے بہن بھائی جنھوں نے خوب مجھے پیار دیا۔ غم و غصّہ دیا میرے جذبۂ پیار کی فہرست میں برابر شامل ہیں۔ میرے شوہر جنھوں نے مجھے جینے کا سلیقہ عطا کیا۔ میرے بچے جو میری کوکھ سے جنمے۔ میرے دوست جنھوں نے قدم قدم ساتھ دیا۔ وہ کتابیں جنھوں نے عالم علم کی سیر کرائی۔ وہ نظارے جن سے میں نے کیف و سرور حاصل کیا۔ کھلے میدان جنھوں نے وسعت کا مفہوم سمجھایا۔ وہ تلخیاں جن سے میں گزرے بغیر امرت کی مٹھاس محسوس نہ کر پاتی۔ وہ حاسد جنھوں نے مجھے دبانا، کچلنا مروڑ دینا چاہا۔ جن کی مدافعت نہ کر پاکر میں زندگی میں بہت پیچھے رہ جاتی۔

اپنا وہ گھر جہاں میں پیدا ہوئی۔ بچپن بتایا۔ جوانی میں قدم رکھا۔ پھر وہ گھر جہاں اپنے مستقبل کو خوش آمدید کہا اور ان دونوں گھروں کی ایک ایک چیز۔ چھوٹی بڑی معمولی قیمتی، بدنما دیدہ زیب سبھی میری ذات کا اہم حصہ ہیں۔ اگر ان میں سے کسی کو بھی کوئی نقصان پہنچتا ہے تو لگتا ہے خود میرا اپنا ایک حصہ منہدم ہو گیا ہے یا ٹوٹ گیا ہے۔ شاید اسی لئے میں ہر ہر چیز کی یوں حفاظت و دیکھ ریکھ کرتی ہوں جیسے خود اپنے جذبات کی۔ یہ محبوبیت صحیح ہے یا غلط اچھی یا بُری میں نہیں جانتی مگر میری محبت کا دائرہ اپنے استعمال کی ہر ہر چیز کے اطراف ویسا ہی مضبوط و محیط ہے جیسا چاند تاروں کے اردگرد۔

بھانگڑا رقص مجھے اس لئے بے حد پسند ہے کہ جذبات کے جوش اور عمل (ایکشن) کی سرگرمی سے مالا مال ہوتا ہے۔

کتھک ناچ اس لئے محبوب کہ زندگی کی نرمیوں لطافتوں کی طرح ننّی نزاکتوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ بنگالی گیت اس لئے جان کا حصہ کہ احساساتی سطح پر سبک رو سفینوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ مواج سمندر اس لئے دل سے قریب کہ زیست کی گہرائیوں اور اتار چڑھاؤ کے مظہر ہو

ہیں۔ لیکن ان سب سے زیادہ والہانہ شیفتگی مجھے خصوصیت سے خوبصورتی (چاہے وہ کسی شیپ میں ہو) اور موسیقی سے رہی ہے۔ لوگ شراب پی کر بے بس ہو جاتے۔ بہکتے یا گیانی ہو جاتے ہیں۔ مجھے اگر بے بس کرنا ہے یا دانشمندانہ لمحوں کے قریب لیجانا ہے تو مجھے خوبصورتی کی ایک جھلک دکھا دیجئے یا عمدہ موسیقی سے گزار دیجئے۔ ان دونوں صورتوں میں یقیناً یا تو میں کھو جاؤں گی یا ڈھونڈنے والے کو مل جاؤں گی۔ خرد کی ان منزلوں پہ پہنچ جاؤں گی جہاں انسان آنکھیں بند کرکے بھی ساری دنیا کو علانیہ محسوس کر سکتا ہے۔

کبھی کبھی اس وقت جب حیات کے لمحے میرے ہاتھ نہیں آتے تو میں خود کو اپنی دو کیفیات کے حوالے کر دیتی ہوں۔ اور شب جس طرح بھرپور مے مینا و ساغر سے چھلک پڑتی ہے یا غم انسان کی آنکھ سے آنسو بنکر ٹپک پڑتا ہے۔ میں بھی قطرہ قطرہ خود سے باہر چھلکنے لگتی ہوں اور تبھی سوچتی ہوں زندگی کا سفر کیسا سفر ہے جس کی ابتدا، و انتہا گم ہے لیکن راستہ محض نشیب و فراز......

نشیب کے دھندلکے ارے توبہ۔! اور فراز کی فراخیتیں میرے خدا—!

انہی لمحوں میں یہ بھی سوچتی ہوں کہ میں نے بھی پیدا ہو کر کون سا تیر مار لیا۔ اگر نہ پیدا ہوتی تو دنیا کا کیا بگڑ جاتا۔ کیا دنیا میں کوئی کمی رہ جاتی۔ دنیا اپنا سفر منقطع کر دیتی؟ تبھی بہت سے جذبے چپکے سے میرے کانوں میں کہتے ہیں کہ بھرا دو، اگ کا نہ اور راہ لیکر لامتناہی سمتوں میں نکل جاتے ہیں ان کی پیدائش کائنات کا وہ طربیہ جو کسی ایسے سے مات نہیں کھا سکتا۔ کوشش کرو کہ نفع حاصل کر سکو۔ ورنہ تمہاری زندگی بھی موت ہے حالانکہ سچ پوچھیئے تو میں نے کبھی کچھ بھی کوشش سے نہیں کیا۔ جو کچھ ہوا میری زندگی میں پیش آیا۔ بالکل اس طرح جس طرح مصنف اپنی کتاب لکھتا ہے۔ واقعات و حالات کی ظہور پذیریوں سے تجربہ خود بخود حاصل ہو جاتا ہے یا جیسے دو چیزوں کے ٹکرانے سے یا تو نغمہ کا پیدا ہوتا ہے یا جنگ۔

یقین مانئے میں نے کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا مگر جو کچھ ملا وہ سب ملا جو ایک خوش نصیب انسان کو مل سکتا ہے۔ ڈھونڈنے سے بھی کوئی خواہش ایسی نہیں جسے حسرت کہہ سکوں۔ جس کی تمنا و طلب میں آہ بھر سکوں۔ نفرت برائے نام ملی محبت از حد۔ عجیب بات ہے کہ جس چیز کی چاہت دل و دماغ میں پیدا ہوتی ہے وہ دیر سویر کسی نہ کسی طور پر اپنے آپ مل جاتی ہے لیکن نہ جانے کیوں پھر بھی لگتا ہے میں ادھوری ہوں۔ اور اس وقت تک رہونگی جب تک میں خود سے باہر نہیں نکل جاتی۔ زندگی کے زنداں میں مسرت و الم، فکر و بے فکری۔ وفا و جفا۔ اسیری و آزادی۔ حسن و بد نمائی۔ سود و زیاں۔ محبت و نفرت کتنا محدود دائرہ؟ ایک انسان کی تشکیل و تعمیر یا تخریب و تباہی سے بے شک گلستاں یا بیاباں مگر وہ شعور جو آفاق و افلاک کے عرفان کا محرک ہے کیا ہر نفس کا حصہ۔؟ بکھر بکھر کر بننے کے عمل میں جو حقیقت و سعادت ہے وہ ابھی کہاں حاصل۔؟ بلا شبہ میں نے اپنی ذات کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنے حلیفوں اور حریفوں میں (اگر وہ ہیں) تو بانٹ دیئے ہیں۔ لیکن ایک چھوٹا سا حصہ ہنوز کورے کاغذ کی طرح خالص میرا اپنا ہے جب سوچتی ہوں کہ اس پہ خون دل سے کیا رقم کر دوں تو احساس کہتا ہے زخموں کا قرینہ۔ اندمال کا سلیقہ۔ آہ کی گہرائی اور آہنگ کی شدت ابھی تجھے کہاں معلوم موسیقی سے محظوظ ہونا ایک وصف سہی مگر خود موسیقی بنکر دنیا کے کانوں میں سما جانا وہ معراج جو تجھے حاصل نہیں۔ خوبصورتی سے لطف اندوز ہونا ایک خوبصورت کیفیت سہی مگر خود خوبصورتی بنکر دنیا کا حصہ ہو جانا وہ عروج جو ابھی تیرا حصہ نہیں۔

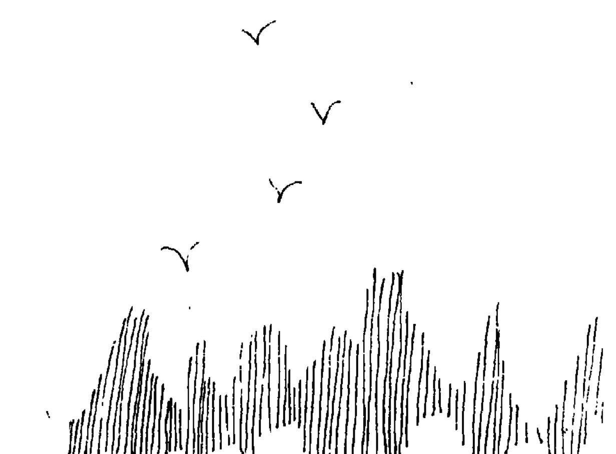
اور جو یہ نہیں تو پھر زندگی کا ہے کی۔؟

دوڑنے میں گر پڑنے کا خدشہ ہوتا ہے مگر قدم قدم بڑھ کر منزل پر پہونچنے میں دیر اور دوری سہی خدشہ تو کوئی نہیں سو دوستو میری

آپ بیتی فقط اسی قدر کہ میں پیدا تو ہوگئی مگر ابھی منزل سے اتنی ہی دور ہوں جتنا ایک نوزائیدہ وجود بڑھاپے سے۔

میں ایک کامران زندگی ضرور جی رہی ہوں مگر کامیابی کی انتہا تو وہ حد ہوگی جہاں میرا ناچیز وجود وسعت کا ایک ناقابل فراموش حصہ بن سکے۔ میں اپنی تہذیب و تمدن۔ عہد بہ عہد تاؤ۔ شخصیت اور فن میں زندگی پاؤں اور اگر زندہ رہ جاؤں تو جان لیجئے کہ بے شک میں پیدا ہوئی اور یہ اعزاز یہ فخر محدود سے چند خوش بخت انسانوں کی طرح میرا بھی حصہ ہے تاکہ زمانہ مجھے شانہ ہٹا دے گر نہ میری پیدائش بھی بیکار اور ویسی ہی کہ جو مزار تہہ زمیں ہوگئے انہی میں میرا بھی شمار ہو جو نہ اپنا اتہ پتہ رکھتے ہیں نہ کتبہ۔ لوح مزار۔ صرف مٹی ہی مٹی جو زمانے کی آمد و رفت۔ جیسا دور وسعت بر دے وہ راستہ بن جاتے ہیں جن پر قدموں کے نشان بھی شمار نہیں کئے جا سکتے۔ اور یوں روندے جانے۔ پامال ہونے، گمنامی کی قبر دب جانے سے کیا یہ زیادہ افضل نہیں کہ انسان اپنے آپ میں ہی فنا ہو جائے۔؟ یہ فنا ہونا اس لئے نہیں کہ انسان خودی کی نذر ہو جائے مگر جانا پہچانا جا کر مٹ جائے۔ وہ نقش جو برداشت نہ ہو پائے اسی لئے زندگی کے ہر اگلے قدم پر مڑ کر پچھلے قدم کو کبھی نہیں دیکھتی۔ بلکہ سامنے پھیلے ہوئے صرف اُس راستے کو دیکھتی ہوں جس کے پیچ و خم رہ رہ کے مجھے دھمکاتے ہیں کہ چل سکو گی ہم پر؟ طے کر سکو گی یہ مسافت؟ اور ہر بار اپنی ہمت کے قدموں سے کہتی ہوں چھالوں آبلوں کی پرواہ نہ کرو۔ حوصلہ رکھو۔ حوصلہ نہ توڑو۔

کہا جاتا ہے کہ انسان دنیا سے خالی ہاتھ واپس جاتا ہے۔ مگر اپنی ذات کے ہاتھوں سے ہمیشہ یہ کہتی ہوں بے شک کچھ ساتھ نہ لے جاؤ مگر وہ کچھ دے جاؤ جس کا لینا دنیا کو یاد رہے اور بھلا لگے۔ یہی میری تمنا ہے۔ طرب ہے۔ میری خواہشات کی کل متاع اور میری حیات کا عنوان۔





کشمیری لال ذاکر

"......... نفسیات کے سمندر میں ہر لمحہ رَو ئیں چلتی رہتی ہیں۔ مختلف سمتوں کی طرف۔ سرد بھی اور گرم بھی۔ کبھی لہریں بھی کنارے بن جاتی ہیں اور کبھی کنارے لہروں میں تحلیل ہو کر رہ جاتے ہیں ـــــ کون جانتا ہے کہ جن باتوں پر مجھے آج یقین ہے کل کا اُجالا انھیں جھوٹا ثابت کر دے۔ جو کچھ میں آج لکھ رہا ہوں کل اس پر افسوس کروں یا سوچوں کہ میں نے تو کچھ کہا ہی نہیں۔ ...."

میری جنم کنڈلی میں کہیں کوئی غلطی ضرور ہے۔ دن اور مہینہ تو ٹھیک ہے لیکن سال نہیں بیٹھتا۔ اس کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب برگھوسنگھتا والے جوتشی رام کرشن نے میری کنڈلی ڈھونڈنی چاہی۔ برگھورشی نے ہزاروں کی تعداد میں جنم کنڈلیاں رچی ہیں مگر اوسے ٹھیک ہو تو جوتشی رام کرشن اپنے گھر کے زمین دوز کمرے میں داخل ہو کر کنڈلیوں کے بڑے سارے ڈھیر میں سے اصلی کنڈلی نکال لاتا ہے۔ زمین دوز کمرے کے باہر ہر گھڑی ایک بڑا سا تالا پڑا رہتا ہے اور اسی وقت کھلتا ہے جب کوئی بھگت اپنی کنڈلی لکھوانے آئے اور پچاس روپے راج جوتشی رام کرشن کی ہتھیلی پر رکھ دے۔ تالا کھولنے سے پہلے وہ برگھورشی کی آرادھنا کرتا ہے۔ خوشبودار دھوپ جلاتا ہے، پھول چڑھاتا ہے، ماتھا ٹیکتا ہے اور پھر کنڈلیوں کے ترتیب سے رکھے ہوئے انبار میں سے لاکر کنڈلی لاتا ہے۔ اس میں کم سے کم آدھا گھنٹہ ضرور لگتا ہے۔ اس بیچ میں جو بھی کوئی بھگت کنڈلی پڑھوانے گیا ہو، وہ جوتشی رام کرشن کے باہر والے کمرے میں بیٹھا رہتا ہے اور آنگن میں اُگے بڑے سے پیپل کے پتوں کو گنتا رہتا ہے اور جمائیاں لیتا رہتا ہے اور اگر اس کے ساتھ کوئی دوست یا رشتہ دار ہو تو اتنا بور نہیں ہوتا جتنا اسے ہو جانا چاہیئے۔ آدھ گھنٹہ کے بعد راج جوتشی پنڈت رام کرشن جمائیوں کا بڑا سا گچھا اچھالتے بڑے خستہ سے پرانے کاغذ کے کچھ اوراق کالی روشنائی سے سنسکرت میں لکھے ہوئے ہاتھ میں لیکر باہر کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔

"تین چار کنڈلیاں نکال لایا ہوں اب آپ واقعات سُن کر معلوم کر سکیں گے کہ آپ کی ٹھیک جنم کنڈلی کون سی ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنے تخت پوش پر بیٹھ جاتے ہیں اور ایک نہایت ہی گندے اور چیکٹ ہوئے گاؤ تکیئے کو دیوار کے ساتھ ٹکا کر بیڑی سُلگاتے ہیں اور کنڈلی کے خستہ صفحات کو پڑھنے لگتے ہیں۔

میں بھی ایک بار پنڈت رام کرشن کے پاس گیا۔ میرا ایک دوست ودیا ساگر بڑا اچھا آرٹسٹ ہے اور ہاتھ دانتہ دیکھنے کے چکر میں بھی رہتا ہے۔ اُس نے ایک بار میرے چالیس روپے اڑوا دیئے۔ پنڈت سے اس کے خاص مراسم ہیں چنانچہ مجھے دس روپے کی کنسیشن مل گئی۔ چالیس میں معاملہ طے ہو گیا اور پنڈت جی کے کنڈلیاں لیکر آنے تک میں اور ودیا ساگر ایک دوسرے کو لطیفے سناتے رہے کیوں کہ بوریت کم کرنے کا اس سے بہتر طریقہ اور کوئی نہیں تھا۔

جوتشی جی کنڈلی پڑھنے لگے۔

"جب یہ بھگت کنڈلی پڑھوانے آئے گا اس کے ساتھ ایک اور آدمی ہوگا جس کے نام کا پہلا حرف "د" ہوگا۔ اس سمے وہ ایک اچھے سرکاری پد پر کام کر رہا ہوگا اور اس کے چار بھائی ہوں گے اور اس کی پتنی جیوت ہوگی۔"

"لیکن ان کی بیوی کا تو انتقال ہو چکا ہے۔" ودیا ساگر بولا۔

"تو پھر یہ کنڈلی ان کی نہیں۔" پنڈت رام کرشن نے یہ کہہ کر دوسری کنڈلی پڑھنی شروع کی کچھ کچھ باتیں ٹھیک تھیں لیکن آگے چل کر حالات ٹھیک نہیں تھے۔ چنانچہ اس کنڈلی کو بھی چھوڑ دیا گیا اس طرح چھ کنڈلیاں الگ رکھ دی گئیں، ساتویں پڑھی تو آدھے سے زیادہ واقعات

دیا۔ پہلے پھر گڑبڑ ہو گئی۔ بہت سوچ بچار کے بعد اور تقریباً ایک درجن پتریاں چھان کر راج جوتشی نے یہ کہا کہ میری جنم کنڈلی کا سال غلط تھا۔ تاریخ تیرہ تھی، مہینہ اپریل کا تھا لیکن سال انیس سو انیس نہیں انیس سو بیس ہونا چاہیئے چنانچہ یہ طے ہوا کہ پھر کبھی ایک آدھ دن کی چھٹی لیکر آؤں اور جنم کنڈلی ڈھونڈنے کی کوشش کی جائے۔ مجھے اس کے بعد توفیق نہیں ہوئی کہ میں راج جوتشی کے پاس کنڈلی تلاش کروانے جاتا، کچھ دیا ساگر کا بھی اس سے جھگڑا ہو گیا۔ نتیجے کے طور پر میرے جنم کے سال کا یقین نہ ہو سکا لیکن میں اسے انیس سو انیس ہی مانتا ہوں کیونکہ میری جنم کنڈلی کشمیر کے ایک بہت ہی مشہور جوتشی نے بنائی ہوئی ہے اور یہ میرے والد محترم نے جب بنوائی تھی جب وہ ریاست پونچھ میں سرکاری ملازم تھے اور خاص دبدبہ سے رہتے تھے۔ مجھے آج بھی اس بہت بڑی حویلی کا بہت بڑا دروازہ یاد آتا ہے جس پر بہت بڑے بڑے نکیلے کیل جڑے رہتے تھے جیسے کہ قلعے کی دیواروں پر ہوتے ہیں۔ دروازے کو بند کر دیا جاتا تھا اور ایک چھوٹی سی کھڑکی کھلی رہتی تھی جس کے ساتھ پولیس کا ایک سپاہی بندوق سنبھالے کھڑا رہتا تھا اس حویلی کے اندر ہی میرا بچپن گذرا ہے جس کے چاروں طرف بہت ہی اونچی دیوار تھی اور جس کے اندر بے شمار کمرے تھے سب چھوٹی اینٹ کے بنے ہوئے تھے اور جس کے ایک کونے میں دو بگھیاں کھڑی رہتی تھیں اور اس کے ساتھ نہایت ہی خوبصورت سفید گھوڑے بندھے رہتے تھے۔ یہ بگھیاں راجہ صاحب کی تھیں جو صرف انہی کے استعمال میں آتی تھیں۔ البتہ جب وہ ان میں بیٹھ کر بازار سے گذرتے تو لوگوں کا حق تھا کہ وہ انہیں دیکھیں اور گھوڑوں کے سموں کے بازار میں لگے مستطیل پتھروں سے ٹکرانے کی گونج کو سنیں اور عقیدت سے اپنے سر جھکا دیں۔

زندگی کے ابتدائی دور میں مجھ پر کئی متضاد قوتیں اور کیفیتیں اثر انداز رہیں، بہت نازک اور بہت بوجھل، بڑی لطیف اور بڑی کرخت بڑی وسیع اور اتنی ہی محدود، بہت دلچسپ اور بہت تھکا دینے والی بھی۔ ایک طرف میری والدہ تھیں، بڑی نازک، شائستہ، حساس اور زود رنج جو مجھے بے حد پیار کرتی تھیں اس لیے بھی کہ میں پہلوٹھی کا بچہ تھا۔ اور اس لیئے بھی کہ شفقت اور محبت ان کی طبیعت کا جزو تھیں۔ جتنا پیار مجھے ملتا تھا اتنا ہی میرے ساتھ کھیلنے والے کسی ملازم کے بچے کو بھی آس پڑوس کے بچوں سے کھیلنا مجھے ایک مدت تک نصیب نہیں ہوا کیونکہ اس حویلی سے باہر جانا مشکل تھا اور اس کے اندر بہت ہی کم لوگوں کو آنے کی اجازت تھی چنانچہ میرا ساتھ چھوٹے درجے کے ملازموں کے بچوں سے رہتا تھا جنہیں میں پیٹ بھی سکتا تھا اور جن سے ناانصافی بھی کر سکتا تھا لیکن ان شروع کے سالوں میں ماں کی انصاف پسندی اور شائستگی مجھ پر اثر انداز نہ ہوتی تو میری ذہنی ساخت خاصی مختلف اور غلط بھی ہو سکتی تھی۔ دوسری طرف والدِ محترم کی سخت گیر طبیعت تھی جس میں زیادہ دخل ان فرائض کا تھا جو انہیں اپنی ملازمت کے سلسلہ میں نبھانے پڑتے تھے۔ میں نے انہیں اکثر غصہ میں ہی دیکھا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں ان سے اس طرح کھل سکا جس طرح میں اپنی والدہ سے کھلا ہوا تھا۔ وہ مجھے گود میں لے کر پیار کرتے تو میں پھر بھی اتنا خوش نہ ہوتا جتنا ماں کی ایک ہلکی سی مسکان پر ہوتا تھا۔ ماں کو میں وسعت، روشنی اور بلندی کا مظہر مانتا رہا ہوں۔ جب وہ مجھے حویلی کی کھلی چھت پر لے جاتی اور چندا ماما کی طرف اشارہ کر کے آسمان کی وسعتیں اور اس کی بلندیاں اور اس میں پھیلی ہوئی روشنی دکھاتی تو میرا من خوش ہو اٹھتا اس لئے مجھے آج بھی رات کو چھت پر گھومنا اور ستاروں کو تکتے رہنا پسند ہے لیکن زندگی کی خوبصورتیاں اور وسعتیں بھی تو ایک نظم چاہتی ہیں جبھی ان کا آنند آسکتا ہے، یہ نظم، یہ ڈسپلن مجھے والد محترم سے ملا۔ کاش میں اسے اس مقدار میں لے سکتا جتنا مجھے لینا چاہیئے تھا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو میری طبیعت میں جو ایک پلاننگ نہ کر سکنے کا عنصر ہے وہ قدرے کم ہوتا اور میں اپنے ارادوں، کاموں، جدوجہد اور روپ ریکھاؤں کو پلان کر سکتا۔ انہیں ایک ترتیب دے سکتا۔ اور سفر شروع کرنے سے پہلے منزل کا تعین کر سکتا۔ مجھے حویلی کے اندر کھلے ہوئے پھولوں کی دلکشی اور خوبصورتی نے بھی متاثر کیا اور قلعے جیسی اونچی دیواروں کی قید نے بھی۔

کھڑکیوں میں لگے ہوکور، مستطیل اور تکون رنگدار شیشے بھی بڑے پیارے تھے لیکن ڈیوڑھی کے بڑے بڑے دروازوں پر لگے نکیلے کیل بھی کم ڈراؤنے نہیں تھے۔ میں اپنے چوبارے کی کھڑکی سے اس سپاہی کو بھی دیکھا کرتا تھا جو اپنے کندھے پر بندوق رکھے ڈیوڑھی کے آگے چکر کاٹتا رہتا تھا۔ میں اتنے زیادہ محفوظ ماحول میں رہتا تھا کہ خطرے کا احساس جاگا ہی نہیں اور جب بڑے ہوکر زندگی کا سامنا کرنا پڑا تو جانا کہ اس کا مقابلہ کرنا کتنا مشکل تھا۔ اُن میں مقابلے کی تاب زیادہ تھی جنہیں ابتدائی سالوں میں غیر محفوظ ماحول میں رہنا پڑا اور گرم ہواؤں اور سرد ریلوں سے دوچار ہونا پڑا۔ کاش میری زندگی کے شروع کا حصہ اتنا محفوظ اور ساکن نہ ہوتا۔ کہیں کسی خطرے کی پرچھائیں ہوتی، کہیں کسی جھگڑے کی بھنک ہوتی، کہیں لوکا ریلا ہوتا، کہیں کچھ ایسا ضرور ہوتا جو مجھے جدوجہد کے لئے تیار کرتا، کھوے سے کھوا ملاکر آگے بڑھنے کو اُکساتا اور یوں صرف سونے اور خواب بُننے کو نہ چھوڑ دیتا۔

ہاں تو بات کر رہا تھا اپنے جنم دن کی اور پہنچ گیا کہیں اور ہی۔ میں اس دن اور شاید اس گھڑی پیدا ہوا تھا جب ہماری قومی زندگی پر ایک بہت بڑی آفت ٹوٹی تھی اور ہمارے ملک کو ایک عظیم اور ناقابل فراموش حادثہ پیش آیا تھا۔ جلیانوالہ باغ کا قتلِ عام۔ ہماری سیاسی جدوجہد کی راہ میں ایک سنگِ میل کا نہیں ایک مینار کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم ماہ و سال کی لہروں پر وقت کے سمندر میں بہتے ہوئے کتنی بھی دور نکل جائیں یہ مینار ہمیشہ ظلم و استبداد کی اس چٹان کا پتہ دیتا رہے گا جس سے کبھی چالیس کروڑ روحوں سے اٹا ہوا جہاز ٹکرایا تھا۔ اس ٹکر کی گونج صدیوں تک فضا میں تھرکتی رہے گی۔ جنرل ڈائر کی گولیوں نے نہتے ہندوستانیوں کے سینے چھلنی کئے اور جنس، عمر اور مذہب کا کوئی امتیاز روا نہ رکھا اور بدیشی حکمرانوں کے ماتھے پر خون کا ایک ایسا ابھرا ہوا داغ لگایا جس کی چمک جنگ عالمگیر کے بھاری طوفان اور ہیروشیما پر گرائے ایٹم بم کے دم گھونٹ دینے والے دھوئیں میں بھی مدھم نہ پڑی۔

میں مسئلہ تناسخ میں یقین رکھتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ میرے جسم میں بھی جلیانوالہ باغ کے کسی ایسے ہی زخمی کی روح داخل ہوئی ہے جو پانی کی ایک بوند تک کو ترستا اور زخموں میں اٹھتی ٹیسوں سے اُلجھتا ہوا انسانی لاشوں کے ڈھیر کے نیچے دبا سسکتا ہوا مر گیا، دل میں ہزاروں تمنائیں اور حسرتیں لیے ہوئے۔ شاید اسی لیے میری روح کو سکون نہیں۔ ایک دائمی اضطراب میرے ذہن و دل کو کریدتا رہتا ہے۔ یہی ذہنی بے قراری اور نا آسودگی مجھے کسی ماحول سے مطمئن نہیں ہونے دیتی، کسی انسان سے خوش نہیں رہنے دیتی۔ کسی لمحے کو مادراں سمجھ کر اس کا پورا حظ نہیں اٹھانے دیتی۔ میں نزدیک کی چیزوں کو کم اور دور کی چیزوں کو زیادہ دیکھنے کا عادی ہوں۔ اپنے پاس کے حسین چہرے کو دیکھتا ہوں تو کسی ایسے تل، داغ یا نقش کی بے ترتیبی پر نگاہ ٹک جاتی ہے جو اس کے حسن کو کم کر رہا ہو، جو اس کی بھرپور تابانی اور دلکشی میں مانع ثابت ہو رہا ہو۔ مجھے اپنے دوست کی ساری نیکیاں اور مہربانیاں یاد رہتی ہیں لیکن کئی برس پہلے اس کی میرے ساتھ کی ہوئی ناانصافی یا زیادتی کو بھول نہیں سکتا، روح میں ایک جلن سی رہتی ہے اور اس کی تمام عنایتوں کے ساتھ اس کی یاد ایک عنوان بن کر سامنے آجاتی ہے۔ اپنے سامنے چند قدموں کے فاصلے پر پڑی بھاری چٹان مجھے نظر نہیں آتی لیکن افق کے قریب بکھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے کنکروں پر بھی میری نگاہیں جم جاتی ہیں۔ میں افق کی حدوں میں کسمساتے ہوئے کسی آنے والے طوفان کو بھانپ لیتا ہوں لیکن اپنے ساتھی کی سرخ آنکھوں میں اشکوں کی منڈلاتی ہوئی دھند کو نہیں دیکھ سکتا۔ زندگی کے ابتدائی دور میں اثر انگیز متضاد کیفیتوں نے مجھ میں DAY DREAMING کی عادت ڈال دی۔ نفسیاتی طور سے میں ایک INTROVERT بن گیا۔ تعلیم کے دنوں میں جب شام کی کھیلیں لازمی تھیں اور غیر حاضر ہونے والے طلبا کو دگنا جرمانہ کیا جاتا تھا۔ میں حاضری لگوا کر پرنس آف ویلز کالج جموں کے پہلو میں بہتی ہوئی نہر کے کنارے گھومتا رہتا اور خنک ہوا کے لطیف جھونکوں کا لطف

اٹھاتا رہتا۔ کھیل کے وسیع میدانوں میں گونجتا ہوا شور ضرور مجھ تک پہنچتا لیکن میدان میں کھلاڑیوں کے ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑنے کا نظارہ مجھے دکھائی نہ دیتا اور اگر کبھی کھیل کے میدان میں داخل ہو بھی جاتا تو سب سے پیچھے رہ کر بھی یہی سمجھا کرتا کہ میچ میں نے ہی جیتا تھا اور جیت کا سہرا میرے ہی سر تھا کیونکہ میں نے کھیل کے دوران فتح کے سپنے دیکھے تھے، جیت کے بعد تقسیم انعام کے جلسے کی روپ ریکھا بنائی تھی، تمغے بانٹے تھے۔ شیلڈ دی تھی، سب کچھ میں نے ہی تو کیا تھا۔ جیت کا یہ احساس اور فتح کے اس یقین نے مجھے زندگی کی مثبت قدروں کا پرستار بنا دیا۔ میں تخریب سے ہر پہلو میں تعمیر کی روشنی دیکھتا ہوں اور فن کی POSITTIVE VALUES کا قائل ہوں شکستوں اور ناانصافیوں سے قنوطیت کا درس نہیں لیتا رجائیت کا سبق لیتا ہوں، اسی لئے مجھے انسان کے روشن مستقبل کا اعتماد ہے۔ انسان کے خوبصورت پہلو، اس کی اچھائیاں، اس کی محبت کی چاہ عارضی طور پر منفی نظریات کے اندھیرے میں بھلے ہی چھپ جائے لیکن انسان بنیادی طور پر نیک ہے، امن کا پجاری ہے، محبت اس کا ایمان ہے۔ وہ ایک اچھا دوست، ایک اچھا پڑوسی، ایک اچھا شہری بن سکتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ دنیا کے سبھی شہری اچھے ہیں، پاپا مائیں عصمتوں کے محافظ ہیں اور اپنے بچوں کے لئے ایک حسین مستقبل کے طلبگار ہیں، یہ کبھی کبھار کے تخریبی جذبے، یہ جنگیں، یہ منفی قوتیں تو محض PASSING PHASES ہیں جو مجموعی طور پر دریا کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتے۔ میں اپنے افسانوں، ڈراموں اور ناولوں کے لئے اکثر ایسے ہی کردار چنتا ہوں جو ذہنی لحاظ سے مطمئن نہیں ہوتے جن کی روحیں بے قرار ہیں جن کے دماغ میں الجھنیں ہیں جن کی زندگی شکستوں کا ایک نیا باب ہے لیکن وہ ساحل پہ کھڑے ہو کر نیچے پھیلے فنا کے بے کنار سمندر میں کود کر جان نہیں گنواتے بلکہ سب سے اونچی چوٹی پر کھڑے ہو کر افق سے طلوع ہوتے ہوئے سورج کو دیکھتے ہیں جس کی کرنیں انہیں زندگی، روشنی اور حرارت کا پیغام دیتی ہیں۔ وہ اس چوٹی سے دھیرے دھیرے نیچے اترتے ہیں فنا کے عظیم سمندر کے پھیلاؤ کو ایک بار دیکھتے ہیں، ان کے اداس ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل جاتی ہے اور وہ ایک بار پھر کسی نئی جدوجہد کا آغاز کر دیتے ہیں، میرے کردار مرتے کم ہیں، مر مر کے زندگی کو تلاش کرتے ہیں اور جب انہیں زندگی کی یہ رمق کسی مسکراہٹ، کسی کلی، کسی کرن، کسی لہر میں مل جاتی ہے تو اسے اپنے سینے سے لگا لیتے ہیں اور زندگی کی چاہ ایک بار پھر ان کے دل میں کسمسا اٹھتی ہے، موت اچھی ہے لیکن زندگی خوبصورت ہے اور جینے کے قابل ہے اس لئے شکست خوردہ کردار زندگی کو موت پر ترجیح دیتے ہیں، منزل نہ ملنے پر کسی سنگ میل سے سر ٹکرا کر مر نہیں جاتے، بلکہ ہر سنگ میل کو سلام کرتے ہیں کہ اس نے ان کی منزل کی گواہی دی ہے۔

مجھے ماضی سے بڑا پیار ہے یہ شاید اچھی بات نہیں لیکن میں ماضی کا آنچل تھامے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا اور آپ یقین جانئے کبھی کبھی آنکھیں بند کر کے بستر میں لیٹے ماضی کے لمحوں کی یاد بے حد سکون دیتی ہے، قوت بخشتی ہے اور اتساہ دیتی ہے کم سے کم میرے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ماضی کی کسی تلخ یاد کو دہرا کر رات کی تاریکی اور خاموشی میں بند آنکھوں کے پپوٹوں سے جو ایک چھوٹا سا آنسو باہر نکل آتا ہے وہ روح کی گہرائیوں سے نکلا ہوا زہر ہے، زہر جب نچڑ جائے تو من کی کیفیت وہ ہوتی ہے جو خزاں رسیدہ بوٹے کی ہوتی ہے، جب اسے بہار کے ہاتھ مس کر جاتے ہیں اس کی نس نس میں زندگی رقص کرنے لگتی ہے، میں ان لوگوں کو حیرت سے تکتا ہوں جو اپنے ماضی کو یکسر بھول جانا چاہتے ہیں وہ ان لوگوں سے ملنا گوارا نہیں کرتے جو انہیں اس زمانے کی یاد دلاتے ہیں۔ جب وہ زندگی میں کوئی خاص سماجی حیثیت نہیں رکھتے تھے وہ ان جگہوں پر جانے سے کتراتے ہیں جن کے ساتھ ان کے ماضی سے وابستہ ہیں، وہ اپنے آپ کو ماضی سے کاٹ کر جینا چاہتے ہیں اور نہیں جی سکتے اور تلخ ہوتے ہیں۔ وہ نہ دوستوں کے کام آ سکتے ہیں نہ دشمنوں کے. شاید اپنے کام بھی نہیں۔ کیونکہ جب کوئی کشتی اپنا رشتہ اس کھونٹے سے توڑ لیتی ہے جس سے بندھی تھی وہ لہروں پر حرکت کر رہی ہے تو گھاٹ سے اس

کے سارے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں اور ماضی ایک گھاٹ ہے جہاں انسانی زندگیوں کی چھوٹی چھوٹی کشتیاں بے جان سی کھڑی ہیں اور جب رات کو ان میں بیٹھے ماجھی چراغ جلا لیتے ہیں اور راگ الاپتے ہیں تو ایک بہت بڑا کارواں اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ ماضی کی یاد آئی تو مجھے وہاں وہ مہربانیاں یاد آگئیں جو میرے قریب رہنے والوں نے مجھ پر کیں۔ ابھی ایک نا انصافی بھی یاد آرہی ہے، احمد ندیم قاسمی کا ایک شعر ذہن میں آگیا ہے

اندھیری رات میں مشعل کا کام دیتا ہے
مری جبیں پہ رہے تیری بندگی کا داغ

ندیم صاحب سے میرا بہت پرانا اور گہرا رشتہ ہے شاید کبھی ان سے ذہنی فضا میں ان کے شعر نے رنگ ابھارا ہے۔ کئی برس پہلے کی وہ رات یاد آرہی ہے جب بجلی کے اچانک فیل ہو جانے پر اس نے موم بتی جلائی تھی ہم دونوں مرقع چغتائی کی پینٹنگز دیکھ رہے تھے اور غالب کے شعر پڑھ رہے تھے اس وقت روشنی کا یوں بجھ جانا بہت برا لگا تھا لیکن یہ ایک حادثہ تھا اور حادثے کسی سے پوچھ کر نہیں آتے بس ہو جاتے ہیں۔ اس نے موم بتی جلا کر میز پر جما دی تھی۔

"اگر موم بتی پر انگلی رکھ دی جائے تو کیا ہوتا ہے؟"

"مجھے معلوم نہیں"

"رکھ کے دیکھئے تو سہی" اس نے چیتاونی دی۔

"اپنے بس کی نہیں، تم ہی دیکھ لو۔"

میں نے جان بوجھ کر اپنی نظریں دوبارہ مرقع چغتائی پر گاڑ دیں حالانکہ موم بتی کی روشنی میں پینٹنگز کے رنگ نکھر کہاں رہے تھے اور دو ایک لمحوں کے بعد جب میں نے نظریں اٹھائیں تو دیکھا کہ اس کی انگلی موم بتی کے شعلے پر رکھی تھی اور درد کی جلن سے اس نے ہونٹ کاٹ لیے تھے اور آنکھیں بند کر لی تھیں میں نے اس کا ہاتھ فوراً شعلے سے ہٹایا لیکن انگلی بری طرح جل چکی تھی اور جن نظروں سے اس نے مجھے دیکھا ان میں سیکڑوں الاؤ جل رہے تھے۔ میرے ذہن میں ان جلتے ہوئے الاؤوں کی تپش آج بھی زندہ ہے۔ آج بھی جب کبھی "مرقع چغتائی" پر نظر پڑتی ہے میری روح میں ایک چنگاری سلگ اٹھتی ہے۔ لمحات کی راکھ اگرچہ سرد پڑ چکی ہے لیکن پھر بھی کبھی کبھی ایک شعلہ سا لپک اٹھتا ہے۔ آج پھر یہ شعلہ لپک اٹھا ہے آج پھر کسی کی آنکھوں میں جلتے ہوئے الاؤ میرے قریب دہک اٹھے ہیں۔ آج کی رات میں پھر سوچنے لگا ہوں کہ زندگی کے بارے میں جھوٹے نظریے انسان کو کس قدر بھٹکاتے ہیں۔ اور ایک بات رہ رہ کر میرے ذہن میں آرہی ہے، کوئی اس سے کبھی پوچھتا ہوگا کہ اس کی یہ انگلی کیسے جلی تھی، تو وہ کیا جواب دیتی ہوگی؟ کیا اس نے بھی ماضی سے اپنا رشتہ توڑ لیا ہوگا؟ کیا وہ بھی عام لوگوں کی طرح اس حجرے سے باہر آکر دیکھنا گوارا نہیں کرے گی۔

شاید نہیں۔

لیکن میں ایسا نہیں کر سکا۔ میں شاید ایسا کر بھی نہیں سکوں گا۔

کسی اچھی چیز کو دیکھ کر اس کا احترام کرنے لگتا ہوں کیونکہ اس نے مجھے حسن کا احترام کرنا سکھایا ہے میں کسی خوبصورت چہرے کو دیکھتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ لمحہ بھر اس کی قربت بھی نصیب ہو جائے۔ ایک خوبصورت پھول تھوڑی دیر کے لئے میرے من میں ایک عجیب قسم کا ہیجان پیدا کر دیتا ہے، ایک تھرکتا ہوا مدھر نغمہ چند ساعتوں کے لیے میرے دماغ میں تھرتھری سی جگا دیتا ہے۔ ایک اچھی سی پیاری تصویر میرے

جذبات میں پل بھر کے لئے ایک ہلکی سی ہلچل پیدا کر دیتی ہے اور میری شبستانِ حیات میں بیسیوں چہروں کی پرچھائیاں، سیکڑوں پھولوں کی رنگینی، کئی نغموں کی گونجیں اور دریچوں، تصویروں کے عکس بے ترتیبی سے بکھرے پڑے ہیں اور کبھی کبھار روشنی کی ایک آدھ شعاع ان میں سے کسی ایک کو نمایاں کر کے مجھے ایک بار پھر اپنے ماضی میں واپس لے جاتی ہے۔

مذہبی جنون کا میں قائل نہیں، جنم سے ضرور ہندو ہوں اور برہمنوں کی ایک اعلیٰ ذات سے تعلق رکھتا ہوں لیکن اپنے لئے کوئی فخر کی بات نہیں سمجھتا محض اتفاق مانتا ہوں۔ میرے مسلمان دوستوں کی تعداد اگر ہندو دوستوں کی تعداد سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔ خدا کی ہستی سے منکر نہیں اسے مانتا ہوں لیکن اپنے ڈھنگ سے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم سے کوئی ایک بڑی طاقت بھی ہے جو ہماری زندگیوں پر اثر انداز ہوتی ہے لیکن یہ اثر مجموعی ہے انفرادی نہیں۔ ایک ملک اور ایک قوم تو اس کے لئے ضرور اہمیت رکھتی ہے لیکن فرد کی کوئی وقعت نہیں، وہ بڑی طاقت صرف وہی چیخیں سن سکتی ہے جو لاکھوں انسانوں کے منہ سے نکلیں اسے صرف ان آنسوؤں کا احساس ہے جو کئی ہزار آنکھوں سے بہیں۔ اسے فقط ان دعاؤں کی قدر ہے جو کروڑوں انسان مل کر کریں۔ ایک انسان اس کے لئے صفر کے برابر ہے، فرد کی کراہ، دعا، عبادت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ خدا کو متاثر کرنے کے لئے ایک عالمگیر مذہب کی ضرورت ہے۔ ایک ایسا مذہب جس میں اقتصادی، سماجی، نسلی اور کلچرل امتیاز روا نہ رکھا جائے جس میں ہر انسان کو انسان کی طرح جینے پھلنے پھولنے اور آگے بڑھنے کے حقوق اور وسائل حاصل ہوں جسے کوئی خاص لیبل لگا کر بدنام نہ کیا جائے۔ خدا ہے ضرور۔ لیکن ساتویں آسمان سے بھی کہیں اوپر بسنے والا جو مخلوق کی چھوٹی موٹی تکلیف کو محسوس نہیں کر سکتا۔ اسے انسان کی مجبوریوں کا احساس دلانے کے لئے کسی زبردست بھونچال کے جھٹکے کی ضرورت ہے اور اس سمے وہ آدم کی تخلیق پر پشیمان ہے اور اسے اپنی غلطی کا تلخ احساس بالکل ناکارہ بیٹھ کر سوچنے اور اونگھنے پر مجبور کر رہا ہے۔

اور میرا یہ بھی خیال ہے کہ مذہب ایک نجی تعلق ہے جو کسی انسان کا اپنے خدا، بھگوان یا پیغمبر سے ہو سکتا ہے۔ اسے ایک ذاتی معاملہ سمجھ کر اپنے تک محدود رکھنا چاہیئے اپنے مذہبی اصول اور عقائد دوسروں پر نہیں ٹھونسنے چاہئیں۔

آرٹ میرے خیال میں زندگی کی ایک اہم ضرورت ہے فن انسان کی تعمیری صلاحیتوں کا اظہار ہے۔ کلا ہماری زندگیوں میں ایک لطیف ملائمت، ایک پیاری دلکشی، ایک سندر نکھار اور ایک سرور انگیز تازگی لاتی ہے۔ ادب ہماری شخصیت کے تیز نکیلے کونوں کو گولائیاں دیتا ہے اور ہم دوسروں کے قریب سے گذرتے ہوئے انہیں چھیلتے نہیں، ان کی انفرادیت کو مجروح نہیں کرتے۔ ایک ادیب عام آدمی سے بہتر انسان ہوتا ہے کیونکہ وہ زندگی کے دکھ درد کو پہچانتا ہے۔ شاید اسی لئے اسے دوسروں کے چھوٹے چھوٹے غم بھی اداس کر دیتے ہیں اور بڑی ہی معمولی قسم کی خوشیاں اسے مسرت بخشتی ہیں۔ دنیا کے کسی بھی حصے میں ناانصافی ہو اسے تکلیف ہوتی ہے۔ خود اس سے چاہے سیکڑوں ہی ناانصافیاں کی گئی ہوں اور وہ انہیں ضبط سے پی گیا ہو، لیکن کسی غیر سے کی گئی زیادتی اس سے برداشت نہیں ہوتی۔ میرے نزدیک تو کسی چیز کو خوبصورتی اور سلیقے سے پیش کرنا بھی ایک طرح کا آرٹ ہے۔ جس شخص کی گفتگو، چال ڈھال اور تحریر میں سلیقہ نہ ہو مجھے اس میں دلچسپی نہیں ہوتی۔ کئی لوگوں سے پہلی ہی ملاقات میں جی بھر گیا۔ ان کی بات چیت مجھے اتنی سطحی اور عامیانہ معلوم ہوئی کہ ان سے دوبارہ ملنے کی خواہش ہی نہ ہوتی اور ایک دوسرے سے تعلقات بھی بڑھتے ہیں جب دل میں ملنے کی چاہ پیدا ہو۔ جہاں میں آجکل رہتا ہوں اس کے پچھواڑے میں ایک بڑھیا رہتی ہے اس کی عمر ستر کے قریب اور شکل و صورت بھی جیسی آپ اندازہ کر سکتے ہیں ویسی ہی ہے۔ تمام دن ڈیوڑھی کی چوکھٹ میں بیٹھ کر بچوں کو گالیاں دینا اس کا

محبوب مشغلہ ہے مگر صاحب کیا کہنے میں اس کی گالی کے! کم بخت اس سُر اور لوچ سے گالی دیتی ہے کہ مزا آجاتا ہے۔ اتنا لطف تو دعاؤں اور آشیرواد وں میں بھی نہیں ہوتا۔ ایک سیاروں سی گھٹیا قسم کی دعا سے تو ایک نامبارا ور خوبصورت گالی کھا لینا زیادہ مزا دیتا ہے۔ کئی بار تو خیال آتا ہے کہ اپنی چھت سے ایک پھوٹا سا گملا اس پر پھینک دوں اور پھر تمام دن گالیاں سنتا رہوں۔ اس کی گالیوں میں بھی دِگیتوں کے سُر سنے جا سکتے ہیں۔ ابھی تک تو میرا تحت الشعور اس قدر باغی نہیں ہوا لیکن اگر وہ اسی طرح میرے جذبات سے کھیلتی رہی تو شاید کبھی ایسی حرکت کا ارتکاب کر ہی بیٹھوں۔ جو نظریہ میں کسی کے متعلق ایک بار قائم کر لوں، اسے بڑی مشکل ہی سے بدل سکتا ہوں۔ مثلاً۔۔۔

"یہ صابر دت ہے۔ حالانکہ میرا بھائی ہے لیکن جو رائے میں اس کے
بارے میں قائم کر چکا ہوں اسے اب تک نہیں بدل پایا۔ فن اور شخصیت
کے اتنے خوبصورت نمبر نکالنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے اور یہ کام کر کے
صابر نے اپنے لئے اُردو ادب میں ایک قابلِ رشک مقام بنا لیا ہے۔ آپ
سوچیں گے کہ میری رائے کیا ہے اس کے بارے میں۔ تو یہ نہیں بتاؤں گا۔
آپ کے کہنے پر میں اس سے جھگڑا نہیں کروں گا۔"

زندگی کے ابتدائی دور میں اُبھرے ہوئے DAY DREAMING کے جذبے نے اور تو خیر کئی قسم کے نقصانات پہنچائے ہیں لیکن اس سے ایک فائدہ بھی ہوا۔ کتابیں پڑھنے کا شوق شاید اسی کا ردِ عمل ہے لیکن یہ بھی ایک مصیبت۔ کتاب کے عنوان سے زیادہ متاثر ہوتا ہوں۔ کتابوں کے عنوان چننا بذاتِ خود ایک آرٹ ہے۔ اس آرٹ میں میرے تین ادیب دوست خاصے ماہر ہیں کرشن چندر، اپندر ناتھ اشک اور دیوندر ستیارتھی۔ چونکا دینے والے عنوان سعادت حسن منٹو نے چنے ہیں۔ بعض کتابیں صرف اس لئے خرید لیتا ہوں کہ ان کے عنوان خوبصورت ہوتے ہیں۔ عنوان کتاب کا چہرہ ہے، اچھا اور جاذبِ نظر چہرہ یقیناً آپ کو اپنی طرف کھینچتا ہے لیکن کئی بار اچھے اور خوبصورت چہرے جھلاوہ بھی دے جاتے ہیں۔ یہی حال کتابوں کا بھی ہے۔ اچھے عنوان کا ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ کتاب بھی ضرور اچھی ہوگی اور نہ سا معمولی عنوان اس بات کا ہرگز غماز نہیں کہ کتاب کے اندر جو کچھ ہے وہ بھی معمولی ہے۔ اسی لئے کئی بار بہت پرانے اور اچھے لکھنے والوں نے مایوس کیا ہے اور نئے لکھنے والوں نے ہمت بندھائی ہے۔ ادھر کچھ حلقوں میں نئی کہانی اور پرانی کہانی پر کچھ دنوں سے بحث ہو رہی ہے۔ میں یہ اب تک نہیں سمجھ پایا کہ کہانی نئی اور پرانی کیسے ہو سکتی ہے۔ نئی یا پرانی تو وہ قدریں ہو سکتی ہیں جو فن کے سامنے آتی ہیں۔ اب اگر ہم یہ کہہ دیں کہ منشی پریم چند کی کہانی پرانی کہانی ہے اور جیلانی بانو کی کہانی نئی ہے تو یہ کچھ جچنے والی بات نہیں ہے۔ وہ اد ... کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے وہ نیا ہے اور پھر ہر دور کے کچھ اپنے تقاضے ہوتے ہیں جو پورے کرنے پڑتے ہیں اور پھر کچھ ایسے بنیادی تقاضے ہیں جو ہر دور میں ہوتے ہیں اور ہر دور میں انہیں پورا کرنا پڑتا ہے۔ ایک ادیب اس امر کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ادب نیا یا پرانا نہیں ہوتا۔ اعلیٰ یا گھٹیا ہوتا ہے۔ آجکل یہ جو دو سرے قسم کا ادب گھڑا جا رہا ہے اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا ضروری ہے۔ اس قسم کے ادب کو پڑھ کر ہم لکھنے والوں کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہ ہوگی۔ میرے پاس اگر اِدھر اُدھر سے کوئی گھٹیا قسم کی کتاب آجائے تو میں مانگ کر کتاب پڑھنے والے کسی دوست کو نہیں دیتا کیونکہ وہ پڑھ کر وہ کتاب کسی اور کو دے دیگا اور پھر وہ کسی تیسرے شخص کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔ اور گھٹیا بات دور تک نہیں

جانی چاہیئے۔ البتہ میرے پاس کوئی اچھی کتاب آجائے یا خریدوں تو چاہتا ہوں کہ میرے دوست ضرور اسے پڑھیں۔ اچھی قدریں اور ادب کے روشن پہلو سب تک پہنچیں، گو اس میں میرا اپنا نقصان ہے۔ اُدھار دی ہوئی کتابیں واپس نہیں آتیں۔ اس کے باوجود دوستوں کو کتابیں دے دیتا ہوں۔ کئی ہاتھوں میں سے گذری ہوئی کتاب اس عورت کی طرح ہے جس پر حق جمانے والے کئی ہوں۔ میری الماریوں میں ایسی کتابیں بھی ہیں جو کبھی شاہکار تھیں لیکن اب کھنڈر بن کر رہ گئی ہیں۔ دوستوں کی عنایتیں ہیں۔ عدم نے ٹھیک ہی تو کہا ہے ؎

دل ابھی پوری طرح ٹوٹا نہیں

دوستوں کی مہربانی چاہیئے

میری ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں کشمیر میں تھا۔ قبلہ آثر لکھنوی وہاں وزیر ترقیات تھے۔ جو کچھ برس میں نے ان کی صحبت میں گذارے ہیں وہ میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ وہ میرے شعر دیکھتے بھی تھے اور مجھے مشورہ بھی دیتے تھے لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مجھے جو کچھ کہنا ہے وہ شعر میں نہیں کہہ سکتا۔ اسے کچھ اور وسعت کی ضرورت ہے، میرا مطلب ہے میں اپنی بات اختصار میں نہیں کہہ سکتا چنانچہ میں نے کہانی لکھنا شروع کی۔ اثر صاحب نے میری کہانیاں بھی سنیں اور مجھے یہ بھی مشورہ دیا کہ انہیں چھپنے کے لیئے بھیجوں چنانچہ میں نے اپنی سب سے پہلی کہانی "سینی ٹوریم" ہمایوں لاہور میں بھیجی۔ یہ بات غالباً سن تینتالیس کی ہے۔ کہانی بھی چھپی اور اس کے ساتھ بہت سے خطوط بھی آئے، میری ہمت بندھی۔ اپندرناتھ اشک جموں سے اپنی اکھنور جاتا تھا، 'قید حیات' ڈرامے میں اکھنور کی فضا نہایت دلکشی سے جلوہ فگن ہے اس دوران میری دو ایک کہانیاں ہمایوں میں چھپ چکی تھیں، انہیں میری کہانیاں پسند آئیں۔ کہانی کے بارے میں مجھے اشک صاحب سے بڑی مدد ملی۔ اشک صاحب نے کہانی کے سلسلے میں کئی بڑی خوبصورت باتیں بتائیں اور میرا یہ خیال کہ مجھے شاعری چھوڑ کر نثر میں کام کرنا چاہیئے اور بھی تقویت حاصل کر گیا۔ اس کے بعد ہندوستان کے بہت پرچوں میں میں نے لکھا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ کسی بھی ایڈیٹر نے میری کوئی کہانی کبھی واپس نہ کی تھی حالانکہ شروع شروع میں لکھنے والے کو یہ دقتیں پیش آتی ہیں، ہاں ایک بار ایک کہانی عرش ملسیانی صاحب نے ضرور واپس کی تھی جو میں نے 'آجکل' کے لیئے بھیجی تھی لیکن اس کا میں نے برا نہیں مانا تھا کیونکہ عرش صاحب بڑے شاعر ہیں۔ لیکن افسانے اور شعر میں ایک فرق ہے جسے ہر اچھا شاعر شاید نہیں سمجھ سکتا جیسا کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر اچھا افسانہ نویس اچھے شعر کو پڑھ سکتا ہو، خود کرشن چندر نے اسے قبول بھی کیا ہے۔ لیکن جب بلونت سنگھ کہانیوں کے حصے کو دیکھنے لگے تو انہوں نے میری کہانیاں مجھ سے جھگڑ جھگڑ کر اور رعب گانٹھ کر حاصل کیں اور 'آجکل' میں چھاپیں۔ بلونت سنگھ ہیں ذرا اکھڑ قسم کے آدمی۔ ویسے ڈیل ڈول کے بھی اچھے ہیں ان سے دبنا بھی پڑتا تھا۔ اُنہوں نے میرے ایک مجموعے کا دیباچہ بھی لکھا اور میرے بارے میں کسی مضمون میں یوں کہا کہ "کشمیری لال ذاکر اردو ادب کے تیر ہیں۔" یہ مجھے معلوم نہیں کہ انہوں نے ایسا کیوں کہا۔ اپندرناتھ اشک نے میری کہانیوں کے بارے میں لکھتے ہوئے ایک بار کہا تھا کہ میری کہانیوں کی فضا کو محسوس کر کے انہیں ایسا لگتا ہے کہ یہ ایسی ہی فضا ہے جیسی چیخوف اپنے ڈراموں میں ابھارتا ہے۔ ایک خاص کہانی 'جوہڑ' کا ذکر بھی کیا تھا انہوں نے جو اس زمانے میں شیام سندر پرویز کے رسالے 'شعاعیں' میں چھپی تھی، سہیل عظیم آبادی نے ایک بار میرے بارے میں رائے دیتے ہوئے کہا۔ "نئے افسانہ نگاروں میں کشمیری لال ذاکر شاید سب سے زیادہ سنجیدہ افسانہ نگار ہیں۔" مجھے ان کی اس رائے سے اتفاق ہے کیونکہ سنجیدگی کا عنصر شروع سے ہی میری شخصیت پر اگر ہو گیا تھا جو اب تک قائم ہے۔ میں کہانیوں میں سنجیدگی کو پسند کرتا ہوں اس لیئے میرے

لکھنے کی رفتار بہت کم ہے۔ میں جب لکھتا ہوں، جب واقعی مجھے لکھنا ہوتا ہے۔ صرف اس لئے لکھنا کہ میرے کسی دوست کو اپنے پرچے کے لئے کوئی غیر مطبوعہ کہانی کی ضرورت ہے اور میں اسے ناراض نہیں کر سکتا۔ جب تک کسی کہانی میں زندگی کا کوئی فلسفہ سامنے نہ آئے کسی نظریے کی تشریح نہ ہو مجھے نہیں جچتی۔ یہ ٹھیک ہے کہ کہانی میں پلاٹ ضرور ہونا چاہیئے لیکن کئی کہانیاں اچھے مضبوط پلاٹ کے باوجود بھی کمزور رہ جاتی ہیں۔ لیکن کچھ کہانیاں جن میں پلاٹ کو اہمیت نہیں دی گئی ہوتی بڑی کامیاب رہتی ہیں۔ بات اتنی ہے کہ لکھنے والے کے پاس کچھ کہنے کو ضرور ہونا چاہیئے۔ کوئی ایسی بات جو زندگی کی زبان سے نکلی ہو اور جو اس کے کسی راز کو عیاں کرتی ہو۔ راز جھکی ہوئی نگاہ سے بھی عیاں ہو جاتا ہے اور عیاں سر ہلانے سے بھی۔ اس کا اظہار لبوں کی ہلکی جنبش سے ہو سکتا ہے اور دھڑکن سے بھی۔ راز سرگوشی میں بھی کہا جا سکتا ہے اور پورے گلے کی آواز سے بھی۔ اس کا انحصار ہے راز افشا کرنے والے پر۔ بس یہیں فرق پڑ جاتا ہے تحریروں میں، اشاروں اور کنایوں میں بھی باتیں ہو سکتی ہیں اور چھت پر کھڑے ہو کر اونچی آواز سے بھی۔ کئی چلا کر کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کئی زیر لب گنگنا کر۔ اسٹائل کوئی ہو لیکن زندگی کی ترجمانی ضرور ہو، انسانی ذہن کے اندھیرے کونوں میں چراغ لیکر ٹٹولنے کا اسی ضرور ہو، اور انسانی ذہن بھی ایک ایسی عمارت ہے جس میں کئی دروازے ہیں اور یہ ایک ایسا دروازہ بھی ہے جس سے داخل ہو کر ہم کئی عمارتوں میں گھوم سکتے ہیں۔ نفسیاتی تجزیے سے بھی کئی بہت پیاری اور خوبصورت کہانیاں ملتی ہیں۔ ممتاز مفتی نے ایسی ہی کچھ کہانیاں لکھی ہیں۔

ادھر میں نے کچھ ڈرامے بھی لکھے ہیں، ریڈیو کے لئے بھی اور اسٹیج کے لیئے بھی۔ ریڈیو پر نشر ہونے والے ڈرامے کئی دوسری علاقائی زبانوں میں بھی منتقل ہو چکے ہیں لیکن ڈرامے کے میدان میں بھی سنجیدگی کی پرت میرے ذہن سے نہیں اٹھی۔ میں نے صرف ایک مزاحیہ ڈرامہ "اس نے کہانی لکھی" لکھا۔ لیکن اس میں ہزار کوشش کے باوجود بھی وہ مزاح پیدا نہ ہو سکا جو ہونا چاہیئے تھا۔ ادھر میرے کچھ دوسرے ڈرامے "گرہن"۔ "سانچ سے ٹکراؤ"۔ "تصویر"۔ "ایش ٹرے"۔ "کچی دیوار"۔ کامیاب رہے ہیں۔ لیکن میرے کردار چاہے کہانی کے ہوں چاہے ناول کے، چاہے ڈرامے کے کھل کر نہیں ہنستے چیخ کر بات نہیں کہتے۔ اشاروں اور سرگوشیوں میں اپنا مطلب بیان کرتے ہیں اور سرگوشیوں اور اشاروں کو سب کہاں مانتے ہیں۔ لیکن جنہیں ان کا مزا آتا ہے وہ اونچی بات نہیں سنتے۔ اپنے فن کا یوں تجزیہ کرنا جانے مناسب ہے یا نہیں لیکن جب آپ بیتی ہی سنانی ہو تو سچ کہنے میں ہچکچاہٹ نہ ہو تو بات بنتی ہے۔ یہ سچ کہنا چاہے مجھے مہنگا ہی پڑے لیکن سب کہہ گیا ہوں۔

شاعری دیسے اب بھی کرتا ہوں لیکن وہی دبے دبے انداز والی۔ شعر شاعرے میں پڑھ کر داد حاصل کرنے والے میں نہ ایک چھوٹی سی مخصوص محفل میں مزا دینے والے ہیں، اپنی محفل تو کبھی کبھی کنور مہندر سنگھ بیدی سحر ہی سے جمتی ہے اور ہمارے ساتھ پانچ سات دوست اور ہوتے ہیں اور شام ہوتی ہے اور سحر صاحب کا خلوص ہوتا ہے اور پھر اپنی سحر آلود آواز میں میرے کہنے پر یہ قطعہ پڑھتے ہیں:

مقصد زیست ہے کیا کون بتائے اے دوست
ہم نے دیکھا بھی تو کیا دیکھا ہے اس جینے میں
کچھ تو کچلی ہے تمناؤں کی تشکیل میں عمر
اور کچھ اپنی مرادوں کا کفن سینے میں

اکثر لوگ مجھے مسلمان سمجھتے ہیں۔ کچھ ہی دنوں کی بات ہے مجھے ایک کالج میں ایک مجلس کی صدارت کرنا تھی۔ کالج کے پرنسپل نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا: "ذاکر صاحب نام سے مسلمان ہیں لیکن کام برہمنوں والا کرتے ہیں۔" اُن کی مراد شاید اس سے یہ تھی کہ میرا تعلق محکمہ تعلیم سے ہے اور پڑھنے پڑھانے کا کام کرتا ہوں۔ یہ نام کا چکر ہے ہی ایسا۔ بہت دنوں تک میں بیسویں صدی کے سابق مدیر خوشتر گرامی صاحب کو مسلمان سمجھتا رہا، مجھے اپنی غلطی کا احساس اس روز ہوا جب میں نے کہیں ان کا نام چھپا ہوا دیکھا۔ شیکسپیئر نے کہا تھا کہ نام میں کیا رکھا ہے گلاب کو کسی بھی نام سے پکارو اس کی خوشبو میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ گلاب کو تو شاید کوئی فرق نہ پڑتا ہو لیکن انسانوں کو ضرور پڑتا ہے، ہر ایک نام کے ساتھ اپنا ایک ماحول ہوتا ہے، ایک فضا ہوتی ہے، ایک خاص وابستگی ہوتی ہے جو کسی اور نام سے نہیں ہوتی۔ غالب کا نام آتے ہی ہمارے ذہن میں ایک خاص ماحول جم جاتا ہے۔ پریم چند کے نام سے دماغ میں ایک خاص قسم کا تاثر چھا جاتا ہے۔ بڑے غلام علی کا نام آئے تو اپنے آپ میں موسیقیت سی رچی نظر آنے لگتی ہے، امرتا شیرگل کا ذکر ہو تو رنگوں کے امتزاج ذہن میں ابھرنے لگتے ہیں۔ نام ہی اس شخصیت کا اپنا ضروری جزو ہے۔ یہ ہمارے ساتھ اس طرح وابستہ رہتا ہے جیسی ہماری پرچھائیں۔ نام اور پرچھائیں ہی تو زندگی بھر ہمارا ساتھ دیتی ہیں۔ ورنہ اور تو سب چھوڑ جاتے ہیں کوئی تاحیات ساتھ نہیں نبھاتا۔

نام کا ذکر چھڑا تو مجھے اپنے نام کی بھی یاد آگئی، میرا نام میرے والدین نے کشمیری لال رکھا، نام جیسا ہے وہ ظاہر ہی ہے اس کی تعریف میں کیا کروں۔ بہت دن تک اس کی غرض و غایت جاننے کی کوشش کی۔ آخر معلوم ہوا کہ میرے دور کے تین چار چچا تھے ان کے نام لاہوری لال، پشاوری لال، ولایتی لال تھے۔ میرا گھرانہ ٹھیٹھ گاؤں کے زمینداروں کا گھرانہ تھا۔ ہل اور کھیت اور فصل سے تعلق رکھنے والا۔ میرے کسی چچا نے لاہور یا پشاور یا ولایت نہیں دیکھا تھا لیکن نام ان کے بڑے رعب دار تھے، والدین میں کانفرنس ہوئی اور صدارت کے فرائض میری پھوپھی جان نے انجام دیئے۔ سوچا گیا کہ اوروں نے اپنے نام کے ساتھ ویسے ہی شہروں کا دم چھلا لگا رکھا تھا لیکن میں تو کشمیر میں پیدا ہوا تھا۔ وہیں پل رہا تھا اور غالباً وہیں جوان ہوں گا، کیوں نہ میرا نام کشمیری لال رکھا جائے تاکہ میرے دور کے چچاؤں کو رشک آئے۔ انہیں رشک آیا یا نہیں آیا یہ تو کبھی مجھے دریافت کرنے کی ہمت نہ ہوئی لیکن اپنے نام سے مجھے چڑ ہو گئی اور اس چڑ کے ساتھ ساتھ ہی شاید میرے ذہن نے ایک شاعر یا ایک ادیب کا روپ رکھا بنانا شروع کر دیا میرا ذوق مطمئن ہوتا گیا۔ مجھے خوبصورت نام پسند آنے لگے۔ نرم طبیعت کے لوگ اچھے لگنے لگے۔ رنگ اور بُو سے ایک راحت سے ملنے لگی اور پھر ایک روز میں شاعر بن گیا۔ شعر تو کئی کہے لیکن یہ شعر میرا پہلا شعر ہے جسے میں نے بزم ادب جموں و کشمیر کی ایک محفل میں پڑھا جس کی صدارت جناب عبدالسمیع پال اثر صہبائی مرحوم کر رہے تھے۔ انہیں میرا یہ شعر بہت پسند آیا تھا۔ اثر صہبائی اُن دنوں ریاست کشمیر ہی میں پریکٹس کرتے تھے۔ کچھ اور بھی شعر تھے لیکن وہ اب یاد نہیں ؎

تیرا تو انتظار رہا مجھ کو رات بھر

میرا بھی انتظار رہے اب جا رہا ہوں میں

اور خیر سے اپنی ایک عدد بیاض دو برس پہلے رہتک کے سیلاب میں بہہ گئی اور پانی میں کئی روز مصرعے گھلتے رہے اور غزلیں ڈھلتی رہیں۔ صابر کو جب میں نے یہ قصہ سنایا تو وہ دیر تک شرارت بھرے انداز میں قہقہے لگاتا رہا۔

شعر کہنا شروع کیا تو تخلص لازمی تھا۔ میرے نام کی طرح تخلص بھی میرا اپنا چنا ہوا نہیں۔ یہ بھی بقول عدم کسی دوست کی نشانی ہے،

ان دنوں حضرت قیس شروانی اور آذر عسکری بزم جموں و کشمیر کے روح رواں تھے۔ ان سے بڑے گہرے مراسم ہوئے جو اب بھی قائم ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا قیس شروانی نے جانے کہاں کہاں سے میرا ایڈریس تلاش کر کے مجھے ایک خط لکھا اس میں آذر عسکری کی بھی تحریر تھی جس خلوص اور محبت سے انہوں نے یاد کیا تھا اسے محسوس کر کے آنکھیں بھر آئیں۔

میرے ایک ادیب دوست نے ایک بار مجھ سے ایک سوال کیا تھا، سوال انہی کے الفاظ میں ہے۔

"تمہاری کہانیوں اور ڈراموں کے نام بڑے خوبصورت ہوتے ہیں کیا وجہ ہے؟"

"اس لئے کہ میرا اپنا نام خوبصورت نہیں۔"

اس وقت تو یہ جواب میں نے نہایت غیر سنجیدگی سے دیا تھا۔ سوچا تھا شاید یہ میری حاضر جوابی تھی لیکن اس کے بعد اس پر غور کیا تو اس کے پس منظر میں ایک بڑی عجیب سی نفسیاتی گتھی تھی۔ میرا جواب صرف حاضر جوابی نہیں تھا بلکہ ایک حقیقت کی طرف اشارہ تھا۔ ہمیں اس کی چاہ رہتی ہے جو چیز ہمارے پاس نہیں۔ اپنے نام سے کبھی پیار نہیں ہوا بلکہ کئی برسوں تک تو وہ کانٹا بن کر ذہن میں چبھتا رہا۔ اسی لئے تحت الشعور کو خوبصورت ناموں کی تلاش رہی، میرے عنوان، میرے کردار خوبصورت ہوں یہی سوچتا رہا اور اس طرح میرے من کو تسکین ملتی رہی، ایک سکون کا سا احساس ہوتا رہا۔ شاید اسی لئے میں نے اپنے بچوں کے نام خوبصورت رکھے ہیں۔ اپنی تکمیل کا یہی سادھن میرے تحت الشعور نے میرے لئے تجویز کیا اور اپنے فن کی نوک پلک سنوارنے کا جذبہ استوار کیا۔ اس لئے جو کہانی مجھے خود نہ جچے میں نہیں چھپواتا، اپنی کہانیوں اور کرداروں کے نام بدلتا رہتا ہوں۔ خوبصورتی اور تکمیل کی اس چاہ نے مجھے ذہنی طور پر آوارہ گرد بنا دیا ہے، پرفیکشن ہو یہی کوشش رہتی ہے کوئی کمزور پہلو رہ جائے، کوئی چیز اکھڑے نہیں، کہیں کوئی کونہ نہ رہ جائے جو غیر متناسب نظر آئے اور اس رنگ نے مجھے FASTIDIONS بنا دیا ہے، آداب میں، رکھ رکھاؤ میں، دفتری کارروائی میں، گفتگو میں، تحریر میں، دوستی میں غرض کہ زندگی کے سبھی پہلوؤں میں پرفیکشن ڈھونڈتا ہوں اور اسی لئے مایوس ہوتا ہوں اور کچھ اکھڑتا ہوں، ظاہر ہے کہ ایسا شخص تندرست ہے تو صبر آزما ساتھی ہوگا اور بیمار ہو جائے تو ایک ضدی مریض ہوگا۔

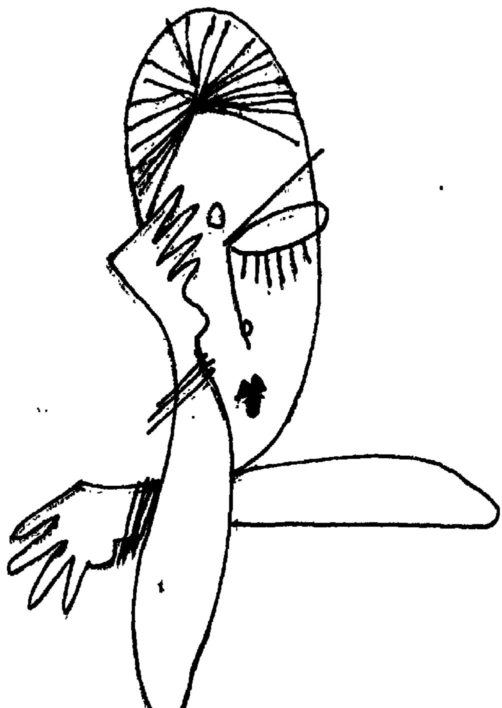
لیکن کوئی کیا ہے؟ یہ کون کہہ سکتا ہے، کہاں تک کہہ سکتا ہے، سیکڑوں بندھن ہیں، کس کس کو توڑے، کون کون سی دیوار پھلانگے، ایک نہ ایک دیوار تو ایسی آئے گی جسے وہ عبور نہ کر سکے گا اور اس کے ساتھ پیٹھ ٹیک کر سوچے گا کہ وہ اب تھک گیا ہے آگے نہیں چل سکتا اور وہ رک جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ کچھ دیر ستا لے۔ اتنا کچھ کہہ چکنے کے بعد اب میرے بھی ستانے کا لمحہ آگیا ہے کھڑکی میں سے شرد پورنیما کی چاندنی کمرے کے اندر اس لئے نہیں آرہی ہے کہ اندر بجلی کی تیز روشنی ہے۔ اب بجلی بجھا دینا چاہئے کہ چاندنی اندر آسکے جو کب سے کھڑکی کے باہر کھڑی دستک دے رہی ہے اور شرد پورنیما تو سال میں صرف ایک بار آتی ہے اور اس رات امرت برستا ہے۔

نفسیات کے سمندر میں ہر لمحہ لہریں چلتی ہیں، مختلف سمتوں کی طرف، سرد بھی اور گرم بھی۔ کبھی لہریں ہی کنارے بن جاتی ہیں اور کبھی کنارے لہروں میں تحلیل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کون جانتا ہے کہ جن باتوں پر مجھے آج یقین ہے کل کا اجالا انہیں جھوٹا ثابت کر دے۔ جو کچھ میں آج لکھ رہا ہوں کل اس پر افسوس کروں اور یہ سوچوں کہ میں نے تو کچھ کہا ہی نہیں۔ بہت کچھ کہنا باقی رہ گیا۔ یہ جن نظریوں پر مجھے اعتقاد ہے کل خود میں انہیں غلط سمجھنے لگوں۔ نئی قدریں وقت کے ساتھ ہی تو جنم لیتی ہیں۔ اور پھر آج جو راز میرے سینے میں محفوظ ہیں اور انہیں افشا نہیں کیا کل وہی اگلا سے

بنا جاتی ہیں اور روح تک کو جھلسا گئیں اور میں مجبور ہو کر انہیں باہر پھینک دیتا ہوں۔ دنیا والوں کی بے رحم نگاہوں کے سامنے جو کسی سے اٹھا کرتے وقت اکثر اپنی ذمہ داریوں کو بھول جایا کرتا ہے۔

آج "فن اور شخصیت" کے آپ بیتی نمبر کے لئے لکھے ہوئے یہ صفحات بھی تو مستقل حیثیت اختیار نہیں کر سکتے۔ زندگی کے دھارے سے جتنے رستے ہیں اور اپنے ساتھ کناروں سے کچھ نہ کچھ بہا کر لے جاتے ہیں۔ یہ صفحات کناروں سے کھرچی ہوئی ریت، کنکر، ٹوٹی پھوٹی سیپیاں ہی تو ہیں جو جا بجا ایک مقام تو ضرور رکھتے ہیں لیکن زندگی کے دھارے کا تعین نہیں کر سکتے، صرف اس کی روانی کی گواہی دے سکتے ہیں۔ یہ گواہی ہی دراصل زندگی کی حقیقی پہچان ہے۔ ہم سبھی لکھنے والے، زندگی کو پہچاننے کی ہی تو کوشش میں لگے رہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کے خد و خال دوسروں کو دکھا سکیں کبھی وہ نقوش خوبصورت نظر آتے ہیں کبھی بدصورت۔ زندگی کبھی جینے کے قابل ہوتی ہے، کبھی مرنے کا بہانہ۔ دونوں حقیقتیں اپنی اپنی جگہ اٹل ہیں اور ہمارا یہ جذبہ بھی اٹل ہے کہ ہم زندگی کو سنواریں، نکھاریں اور اسے جینے کے قابل بنائیں۔

اور اس لمحہ شرد پورنیما کی چاندنی کائنات کو سنوارنے میں مصروف ہے اور چاہتی ہے کہ میں بھی اس کا ساتھ دوں، کمبل اوڑھ کر کے لان میں جا رہا ہوں جہاں سبز سبز گھاس پر شبنم برس رہی ہوگی اور ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے یادوں کے قافلے ٹھہرائے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں آ رہا ہوں اے میرے ماضی کے حسین ساتھیو! — میرا انتظار کرو —!





سہیل عظیم آبادی

"...... کلکتہ کے چند ہونہار لکھنے والوں میں مجھے سمجھا جاتا تھا وہاں کے علمی ' ادبی حلقے میں لوگ جاننے لگے تھے لیکن اس سے روٹی لینے کی بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ آج بھی لکھنے والے صرف قلم کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتے ـــــ اُن کو کوئی دوسرا کام کرنا ہی پڑتا ہے ' اُس زمانے میں تو ایسی بات سوچی بھی نہیں جاسکتی تھی ...."

"تاجر کتب" دو لفظوں کا یہ مرکب بچپن سے میرے لئے بڑی کشش رکھتا تھا۔ جب کوئی قصے کہانی کی کتاب خریدتا اور دیکھتا کہ تاجر کتب کا نام چھپا ہوا ہے تو بڑا رشک آتا اور جی چاہتا کہ اس جگہ پر میرا نام ہوتا۔ جب میں چھوٹا تھا تو ایک دن میرے نانا مرحوم نے پوچھا تھا بڑے ہو کر کیا بنوگے۔ اور میں نے کہا تھا "تاجر کتب"۔ اور میرے جواب سے ان کو بڑی مایوسی ہوئی تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ میں ڈپٹی مجسٹریٹ یا جج بنتا۔ وہ کچھ بولے نہیں مگر ان کے چہرے پر مایوسی چھاگئی تھی۔ لیکن میں خوش تھا۔ نہ جانے کیوں جتنی تاجر کتب بننے کی خواہش تھی اس سے زیادہ نفرت ملازمت سے تھی۔ ہمارا خاندان چھوٹے زمینداروں کا تھا جن کے افراد عام طور پر پڑھ لکھ کر سرکاری ملازمتیں کرتے تھے۔ اسطرح بہت سے رشتہ دار سرکاری ملازم تھے۔ خود میرے نانا اور والد صاحب بھی۔ لیکن مجھے ملازمت سے نفرت تھی۔ کیوں؟۔ بات اس وقت سمجھ سے باہر تھی اور اب بھی میرے لئے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اس وقت نفرت کیوں تھی۔ اور جب بڑا ہو کر اسکول میں پڑھنے لگا تو یہ نفرت اور بھی بڑھتی گئی۔ خاص کر سرکاری ملازمت سے۔ لیکن اب اس کی وجہ سمجھ میں آنے لگی تھی۔ انگریز ملک پر حکمراں تھے اور ان کے مظالم کا سلسلہ جاری تھا۔ چھوٹا ہی تھا تو کانگریس اور خلافت کی تحریک شروع ہو چکی تھی ہزاروں ہندوستانی جیل جاچکے تھے۔ بڑے بڑے ہندوستانی رہناؤں کو انگریزوں نے گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا تھا۔ ہزاروں ستیہ گرہیوں کو لاٹھیوں سے پولیس نے مارا تھا اور سرکاری ملازمین سرکاری ملازمت کر رہے تھے۔ ملک کو غلام رکھنے میں سرکار کی مدد کر رہے تھے۔ یہ تمام کام قومی غیرت کے خلاف تھا۔ جیسے جیسے ملک میں آزادی کی تحریک بڑھتی رہی انگریزوں کے مظالم بڑھتے گئے۔ سرکاری ملازمت سے میری نفرت بڑھتی گئی۔ اور دل میں یہ خیال مضبوط تر بنتا گیا کہ بڑا ہو کر کوئی آزاد کام کرنا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں جب تحریک آزادی میں شدت آگئی تو یہ جذبہ اور بھی مضبوط ہو گیا۔ حالانکہ یہ جانتا تھا کہ گھر کی جائداد اتنی زیادہ نہیں کہ بڑے خاندان کے لئے کافی ہو اور کچھ نہ کچھ کام کرنا ہی ہوگا۔ لیکن کیا؟ ذہن میں یہ بات صاف نہیں تھی۔ "تاجر کتب" کا تصور ذہن میں محفوظ تھا اور سوچا تھا کہ یہی کام کرنا ہے ملازمت سے محفوظ رہ کر حالانکہ ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات نہیں تھی کہ آخر یہ کام کیسے کروں گا۔

کلکتہ میں تعلیم پا رہا تھا کہ گھر والوں سے بعض معاملات میں اختلاف ہو گیا اور تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ ۱۹۳۲ء میں مجھے کلکتہ میں رہنے کے لئے تیس روپے ماہوار ملتے تھے۔ ان دنوں یہ رقم اچھی خاصی سمجھی جاتی تھی۔ متوسط گھرانوں کے لڑکوں کو تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کے لئے عام طور پر اتنے ہی یا اس سے بھی کچھ کم پیسے ملتے تھے۔ دولت مند گھرانوں کے لڑکوں کی بات دوسری تھی۔ میں نے خود ہی گھر لکھ بھیجا تھا کہ کوئی رقم نہ بھیجی جائے۔ اور والد صاحب مرحوم بھی خفا تھے۔ اب کلکتہ جیسے شہر میں میرے لئے ہر روز کی روٹی کا مسئلہ تھا۔ یہ زمانہ تھا کہ میں لکھنے لگا تھا اور کم سے کم کلکتہ کے چند ہونہار لکھنے والوں میں مجھے سمجھا جاتا تھا وہاں کے علمی، ادبی حلقے میں لوگ جان گئے تھے۔ لیکن اس سے روٹی ملنے کی بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ آج بھی لکھنے والے صرف قلم کے سہارے پر زندہ نہیں رہ سکتے۔ ان کو کوئی دوسرا کام کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس زمانے میں تو ایسی بات سوچی بھی نہیں جاسکتی تھی۔ اس زمانے میں کلکتہ سے دو روزانہ اردو اخبار نکلتے تھے "عصر جدید" اور "ہند"۔ ہند کانگریسی اخبار تھا اور میری ذاتی دل چسپی اس سے تھی۔ عصر جدید مسلم کانفرنس کی ترجمانی کرتا تھا۔ فرقہ پرست تھا اس لئے اس سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ حالانکہ اس اخبار کے مالک مولانا شفاقت احمد عثمانی جو بہار کے رہنے والے تھے سارے بہاری نوجوانوں کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ایک دو مرتبہ انھوں نے کہا بھی کہ عصر جدید کے لئے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر دوں۔ لیکن مجھے ان کی بات پسند نہیں آئی۔ ایک تو ملازمت

اور دوسرے عصر جدید کے لئے کام کرنا مجھے پسند آیا لیکن ضرورتیں مجبور کرتی جاتی تھیں۔ اسی زمانے میں ایک قوم پرست اخبار "ہمدرد" جاری ہوا۔ ایڈیٹر تھے شفاعت اللہ خاں مرحوم جو پہلے لاہور کے مشہور اخبار زمیندار کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ اور خیالات کے لحاظ سے سخت قوم پرست تھے۔ انھوں نے مجھے بلا بھیجا اور کام کرنے کو کہا۔ ملازمت کرنے کو جی تو نہیں چاہتا تھا لیکن ضرورت تھی۔ میں نے منظور کرلیا اور کام کرنے لگا۔ لیکن ایک شکست کا احساس ہر وقت رہتا تھا کہ موقع ملے تو خود اپنا اخبار جاری کروں۔ ایک وجہ اور بھی تھی اور وہ یہ کہ "ہمدرد" قوم پرست اخبار تھا کانگریسی نہیں تھا۔ ان کے اپنے ذہنی تحفظات تھے۔ اور میں اپنے خیالات کے لحاظ سے سخت کانگریسی تھا۔ شفاعت اللہ خان بے حد مخلص آدمی تھے۔ کام کرتے تھکتے نہیں تھے ان کے کام کرنے کا طریقہ بھی عجیب سا تھا۔ میز کرسی سے ان کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ فرش پر بیٹھ کر کام کرتے جاتے تھے اور لوگوں سے باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ چائے، سگریٹ اور پان کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اور کام کا بھی۔ اس طرح کسی دوسرے کو کام کرتے میں نے نہیں دیکھا۔ شفاعت اللہ خاں صاحب کی ایک اور بڑی خوبی تھی وہ یہ کہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی بڑی ہمت افزائی کرتے تھے۔ لیکن اخبار کی حالت اچھی نہیں تھی۔ خود شفاعت اللہ خاں کو سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ ایک صاحب کو ساٹھ روپے اور ہم دو آدمیوں کو تیس تیس روپے۔ لیکن اس زمانے میں یہ رقم آج کے سو روپے سے کم پندرہ گنا زیادہ ضرور تھی۔ ہم لوگ دو تین آنے میں سیر ہو کر اچھا کھانا کھا لیتے تھے۔ کلکتہ میں ایسے ہوٹل بھی تھے جہاں ایک آنے میں بھر پیٹ کھانا ملتا تھا اور کبھی کبھی جب پیسوں کی کمی ہو جاتی تھی تو ان ہوٹلوں میں کھانا کھایا کرتے تھے۔ ان ہوٹلوں میں عام طور پر مزدور اور پھٹے حال بابو لوگ کھانا کھایا کرتے تھے ان ہوٹلوں میں کھانا تو ملتا ہی تھا اور سارے شہر کے حالات سننے کو مل جاتے تھے۔ میں زکریا اسٹریٹ میں رہتا تھا۔ اس علاقے میں ایسا کوئی ہوٹل نہیں تھا۔ لیکن زکریا اسٹریٹ اور کولوٹولا اسٹریٹ کے درمیان بولائی دت اسٹریٹ میں ایسا ہوٹل تھا۔ اس ہوٹل میں اتنی بھیڑ رہتی تھی کہ جگہ خالی ہونے کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ ہمدرد کا دفتر پاس ہی کولوٹولہ اسٹریٹ میں تھا۔

ان دنوں کلکتہ بھرا ہوا تھا۔ ہر طرح کے لوگ تھے۔ ہر طرح کی دلچسپیاں تھیں۔ کاروبار کے علاوہ سیاسی، معاشرتی اور علمی ادبی بنگالی زبان کے ادیب اور شاعر تو موجود ہی تھے ٹیگور، نذر الاسلام، سرت چندر چٹرجی کے علاوہ درجنوں لکھنے والے موجود تھے۔ اردو کے ادیبوں، شاعروں اور رسالوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ مولانا آزاد، آغا حشر، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، رضا علی وحشت، مولانا شائق احمد عثمانی اور ان کے بعد نوجوان شاعروں اور ادیبوں کی ٹولی تھی۔ ہم لوگ پابندی کے ساتھ ملتے تھے۔ آپس میں مل کر باتیں کرتے تھے اور مستقبل کے بارے میں پروگرام بناتے تھے۔ ایسے ایسے پروگرام جن کو ہوائی قلعے کے علاوہ کچھ اور نہیں کہا جا سکتا۔ مجھے یہ بات بہت اکھرتی تھی کہ نوکری کر رہا تھا۔ اس سے نجات حاصل کرنے کی بات سوچتا رہتا تھا لیکن کوئی صورت نہیں نکلتی تھی شفاعت اللہ خاں صاحب بڑے بیباک انسان تھے۔ ہم نوجوانوں کو وطن پرستی پر لکچر سناتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ اخبار نویس کو نڈر ہونا چاہیئے اور لکھتے وقت کسی کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔

ہوا یہ کہ ملتان جیل میں خان ولی خان نے بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ ان کی حالت خراب ہونے لگی۔ اخباروں میں خبریں آنے لگیں۔ شفاعت اللہ خاں صاحب کو بخار آ گیا۔ اور وہ کام کرنے سے معذور ہو گئے۔ اداریہ لکھنے کی ذمہ داری مجھ پر آ گئی۔ میں نے ایک سخت اداریہ لکھا۔ اور تیسرے دن اخبار سے ضمانت طلب کرلی گئی۔ اخبار کے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ ضمانت جمع کرتا۔ اخبار بند ہو گیا۔ اور میری بے کاری کا دور شروع ہوا۔ نوکری سے تو نجات ملی لیکن روٹی کی فکر سر پر آ پڑی۔ یہ دن عجیب سے تھے۔ دوستوں میں بھی میرے جیسے پھٹے حال لوگ بھی تھے۔ والد صاحب مرحوم نے روپے بھیجے اور بلایا لیکن میں نے روپے واپس کر دیئے اور گھر نہیں گیا۔ ضد تھی کہ خود کچھ کروں لیکن ہر طرف اندھیرا تھا۔ یہ دن کیسے گزرے انھیں اتنے دنوں کے بعد بیان کرنا آسان نہیں۔ ان

دنوں کلکتہ میں چند اخبارات تھے جن کے ایڈیٹر صرف نام کے تھے خود کچھ بھی نہیں لکھتے تھے۔ یہ حضرات بڑی مددثابت ہوئے اور وقت کسی طرح گزرتا رہا۔ مولانا شاکر عثمانی نے عصر جدید کے لئے لکھنے کو کہا لیکن عصر جدید کی پالیسی مجھے پسند نہیں تھی۔ فرقہ پرست اخبار تھا۔ اور مولانا آزاد کے خلاف لکھا کرتا تھا جن سے مجھے بڑی عقیدت تھی۔ اور یہ بھی تھا کہ ملازمت کرنا نہیں چاہتا تھا۔

اسے تفصیل کے ساتھ لکھنا مشکل کام ہے۔ میں اپنے ایک دوست ابراہیم شاہ کے ساتھ رہتا تھا۔ ان کا ایک پریس تھا، ادبی ذوق کے مالک تھے۔ انھوں نے ایک ماہانہ رسالہ جاری کرنے کا پروگرام بنایا۔ پنڈت سدرشن اپنا ماہانہ رسالہ چندن بند کر کے ایک فلم کمپنی میں کلکتہ آگئے تھے۔ ابراہیم شاہ نے اسی نام سے ڈکلریشن لے لیا اور رسالہ شائع ہوا لیکن دو تین اشاعتوں کے بعد بند کر دینا پڑا۔ اس زمانے میں مشہور فلم ایکٹر جگدیش سیٹھی کلکتہ میں تھے اور ان سے میرے بہت اچھے تعلقات تھے۔ ہم دونوں صبح کا ناشتہ تقریباً ہر روز ساتھ کرتے تھے۔ جگدیش سیٹھی تھے تو فلم ایکٹر لیکن بڑے وطن پرست انسان تھے۔ انگریزی حکومت سے انھیں سخت نفرت تھی۔ اور وہ اس نفرت کا اظہار کیا کرتے تھے۔ بہت سے معاملات میں ہم دونوں کے خیالات ایک سے تھے اور ہماری دوستی کی بنیاد یہی تھی۔ وہ سنٹرل ایونیو میں اپنی بہن اور بہنوئی کے ساتھ رہتے تھے اور میں بہت نزدیک ابراہیم شاہ کے ساتھ۔ جگدیش سیٹھی نے اس کی بڑی کوشش کی فلموں کے لئے لکھنے کا کام مجھے مل جائے۔ لیکن کہانی لکھنا اور ہے اور فلم کے لئے لکھ کر بیچ لینا اور کام ہے۔ میں کامیاب نہیں ہوا اور دن اسی طرح کٹتے رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کلکتہ میں اردو فلمیں بنتی تھیں۔ اطہر الہ آبادی، مظہر خاں، پرتھوی راج کپور، جگدیش سیٹھی، شاہ نواز اور سہگل وہاں تھے۔ ان سب سے میری ملاقات تھی۔ جی چاہتا تھا کہ فلم کے لئے کہانی لکھوں لیکن بات چاہنے سے آگے کبھی نہیں بڑھی۔ ایک کہانی لکھی ضرور۔ اور وہ فلم بھی بنی لیکن ــــ میرا کہیں نام نہیں۔

۱۹۳۶ء میں بڑے بھائی مرحوم کلکتہ گئے اور پکڑ کر مجھے گھر لے آئے۔ لیکن گاؤں میں رہنا اور زندگی گزارنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ پٹنہ چلا آیا اور اپنے ماموں سید جعفر امام صاحب کے ساتھ رہنے لگا۔ وہ اچھے وکیلوں میں تھے اور خدا نخواستہ کوئی کمی نہیں تھی۔ نئے وکیل تھے لیکن پریکٹس اچھی تھی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ پٹنہ میں رہ کر کیا کروں۔ ایک کام تو یہ کرتا تھا کہ خدا بخش لائبریری میں چلا جاتا تھا اور کتابیں یا رسالے پڑھتا تھا۔ لیکن خدا بخش اورینٹل لائبریری تحقیق کام کرنے والوں کے لئے زیادہ مفید ہے۔ کلکتہ کی زندگی نے خیالات میں وسعت پیدا کر دی تھی۔ اور میں کانگریسی ہونے کے باوجود انتہا پسند خیالات رکھتا تھا۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی بن چکی تھی۔ میں اس کا ممبر بن گیا۔ جے پی سکریٹری تھے اور بیشتر پٹنہ میں ہی رہتے تھے۔ نوجوانوں کا بڑا گروہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی میں آگیا تھا۔ ہندی کے مشہور مصنف رام ورکش بنی پوری اس میں تھے اور پارٹی کے اہم ممبروں میں تھے پارٹی کا ایک ہفتہ وار اخبار تھا "جنتا" اس کے ایڈیٹر تھے۔ سیاست میں حصہ لینے کا ایک فائدہ یہ تھا کہ کوئی ملازمت کرنے کو نہیں کہتا تھا۔

لیکن ہندوستان کے نئے آئین کے تحت جب ۱۹۳۷ء میں انتخابات ہوئے اور رنگ ڈھنگ سارے ملک میں کانگریس نے صوبائی اسمبلیوں میں اکثریت حاصل کر لی۔ اور چند ماہ کے تامل کے بعد صوبے کی حکومتیں کانگریس کے اختیار میں آگئیں تو کچھ غلطیاں بھی ہوئیں اور مسلم لیگ نے سر اٹھایا اور دیکھتے دیکھتے سارے ملک کی فضا خراب ہو گئی۔ میرے ماموں جعفر امام صاحب بہار مسلم لیگ کے سکریٹری چن لئے گئے اور دیکھتے دیکھتے گھر فرقہ پرستوں کا اکھاڑا بن گیا۔ حالات خراب ہی ہوتے گئے اور میں دوسرے محلے میں کرائے کے مکان میں چلا گیا۔ مسلم لیگی ماحول میں رہنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔

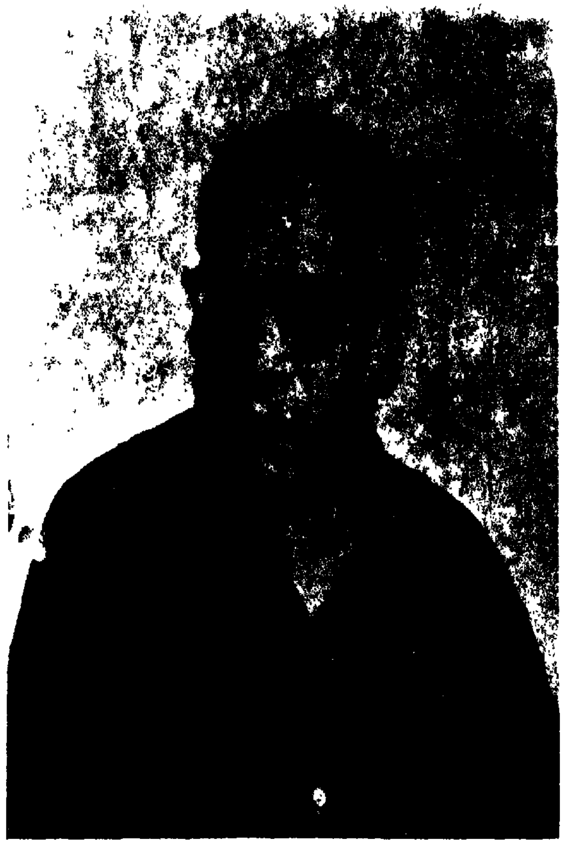
اس بات کا اقرار کرنا ضروری ہے کہ میں اپنے سیاسی خیالات میں جس قدر سخت تھا، عملی طور پر اتنا ہی دور تھا۔ جلسے جلوس میری طبیعت کے خلاف تھے بس لکھنے پڑھنے سے تعلق تھا۔ اسی زمانے میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک شروع ہوئی اور اس میں بھی شریک رہا۔ اور دن گزرتا رہا۔ گھر سے غلہ اور ادھر ا

سامان کھاتا تھا اور دونوں وقت کھانا کھا لیتا تھا۔ لیکن گھر والوں کو میرے خیالات سے ہمدردی نہیں تھی۔ ایک مشکل یہ تھی کہ ۱۹۴۰ء میں میری شادی کر دی گئی۔ اب ذمہ داری بھی سر پر تھی۔ اسی زمانے میں میری ملاقات بابائے اردو مولوی عبدالحق سے ہو گئی اور میں ان کی ہدایت کے مطابق اردو کی ترویج کا کام کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اور رانچی چلا گیا۔ وہاں چھوٹا ناگپور اردو مرکز قائم کیا۔ شبینہ مدرسے اور گاؤں میں چھوٹے چھوٹے مدرسے قائم کئے اور اردو تعلیم کا انتظام کرنا شروع کر دیا۔ حالات بہت امید افزا تھے لیکن ۱۹۴۰ء میں جنگ کا اعلان ہو گیا اور رانچی دوسرا بڑا فوجی مرکز بن گیا۔ رانچی اور اس کے آس پاس فوجی چھاؤنیاں بن گئیں اور دوسرے سارے کام ثانوی اور اس کے بعد کے درجوں پر آ گئے۔ بس کام کسی طرح چلتا رہا اور چھوٹا ناگپور اردو مرکز قائم رہا۔ انجمن ترقی اردو ہند جیسی مقتدر جماعت مدد تو دیتی تھی باقی سارا کام اللہ کے بھروسے پر تھا۔ گاؤں میں وہاں کے لوگوں کو آمادہ کر کے اسکول قائم کرنا تھا ایک دلچسپی تھی اور مسلم لیگ کے ماحول سے دور رہنے کی خواہش۔ بس سیدھی سادی زندگی گزر رہی تھی۔ جنگ کے خاتمے کے بعد تو سیاسی ماحول یکایک بدل گیا اور فرقہ پرستی جو جماعتی حیثیت رکھتی تھی، طوفان کی شکل اختیار کر گئی۔ جنگ ختم ہوئی تو ہندوستان کے اندر آزادی کے مطالبے میں بھی تیزی آ گئی اور فرقہ پرستی بھی بڑھتی گئی۔ ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو کلکتہ میں مسلم لیگ نے "ڈائرکٹ ایکشن ڈے" منایا۔ اور وہاں بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فساد ہوا، اور جو بہت دنوں تک چلتا رہا۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں بے گناہ قتل ہوئے۔ اور سارے ملک پر فرقہ وارانہ فسادات کے سیاہ بادل چھا گئے۔ پھر نواکھالی میں فساد ہوا اور مہاتما گاندھی وہاں امن قائم کرنے کے لئے تشریف لے گئے۔ اسی دوران بہار میں ہولناک فسادات شروع ہو گئے۔ اور میرا گھر بار بھی لٹ گیا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بن گیا اور بابائے اردو نہایت ہی تکلیف دہ حالات میں پاکستان چلے گئے۔ چھوٹا ناگپور اردو مرکز کو ختم کر دینا پڑا۔ اور پھر بے کاری کا سلسلہ شروع ہوا۔ میرے اکثر دوستوں نے مشورہ دیا کہ سیاسی زندگی کو اپناؤں۔ لیکن اب کرتا کیا۔ ملک آزاد ہو چکا تھا اب وہی لوگ آپس میں لڑ رہے تھے جو کبھی کندھے سے کندھا ملا کر انگریزوں کے خلاف صف آرا تھے۔ اور یہ صف آرائی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ مسلمانوں کا عجیب حال تھا۔ بہت سے لوگ پاکستان جا چکے تھے۔ بہت سے جانے والے تھے اور جو تھے ان میں کم لوگ مطمئن تھے اور میں رانچی میں بے کار وقت گزار رہا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں بہار میں جو وزارت بنی اس میں میرے عزیز ترین مرحوم دوست عبدالقیوم انصاری وزیر ہو گئے۔ وہ بھی سخت کانگریسی تھے۔ جب بھی رانچی آتے تھے تو دیر تک باتیں ہوتی تھیں۔ سوال یہ تھا کہ جو مسلمان پاکستان جا چکے وہ جا چکے لیکن جو ہندوستان میں رہ گئے تھے ان کی ذہنی آبادکاری ضروری تھی۔ ہم دونوں نے طے کیا کہ اس سلسلے میں کچھ کرنا چاہئے۔ اور میں رانچی سے پٹنہ واپس آ گیا۔ اور ایک روزنامہ اخبار جاری کیا اور تین سال تک میں اسے ایڈٹ کرتا رہا۔ لیکن مکمل نقصانات نے ہمت پست کر دی۔ اسی زمانے میں میرا ایک بچہ معمولی سے حادثے میں انتقال کر گیا۔ میں خود ٹائیفائڈ کا شکار ہو گیا۔ حالات ایسے ہو گئے کہ اخبار کا جاری رکھنا ناممکن ہو گیا۔ سر پر قرض بھی تھا۔ آخر ایک صاحب کے حوالے کر کے الگ ہو گیا۔ لیکن بے کار رہنا بھی عادت کے خلاف بات ہوئی۔ ایک ماہانہ رسالہ تہذیب جاری کیا جو پسند کیا گیا۔ بعد میں میرے دوست عبدالقیوم انصاری بھی شریک ہو گئے۔ رسالہ مقبول ہوا لیکن انتظام کی صلاحیت مجھ میں نہیں تھی۔ ایک صاحب کو منیجر بنا دیا گیا۔ پھر وہی ہوا جس کی امید نہیں تھی۔ اب پھر بے کاری۔ کوئی شغل نہیں۔ اسی زمانے میں کلکتہ کے ایک اخبار نے چاہا کہ میں وہاں جاؤں اور اس کے لئے کام کروں۔ لیکن ملازمت نہ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ یہ زمانہ قدرے سخت گزرا۔ گھر کی جائداد ۱۹۴۶ء میں فرقہ وارانہ فسادات میں تباہ ہو چکی تھی اور دوسری کوئی آمدنی نہیں تھی۔ اور ذہنی پریشانیوں میں مبتلا رہتا تھا۔ کئی بار سوچا کہ بمبئی پہنچ کر فلم کی سنہری دنیا میں قسمت آزمائی کروں۔ چند دوستوں کو خطوط بھی لکھے لیکن کوئی حوصلہ افزا جواب نہیں ملا۔ اور یہ ڈر بھی پیدا ہوا کہ شاید حالات کا مقابلہ نہ کر سکوں اور ارادہ ترک کر دیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اپنی بے کاری سے تنگ آ چکا تھا اور زندگی بے معنی معلوم ہونے لگی تھی۔

ایک دن ایک ہوٹل میں چند دوستوں کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ ہندی کے مشہور شاعر رام دھاری سنگھ دِنکر آ گئے۔ ان سے بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ راجیہ سبھا کے ممبر ہونے کے بعد زیادہ دہلی میں رہا کرتے تھے۔ انھوں نے حالات پوچھے۔ میں نے حالات بتا دیئے۔ وہ کچھ بولے نہیں لیکن میں نے اسی وقت محسوس کیا کہ وہ متفکر ہو گئے۔ دِنکر جی سے میرے تعلقات برادرانہ تھے وہ مجھ سے عمر میں بڑے تھے اور میں ان کا احترام کرتا تھا ان میں ایک بڑی خوبی تھی۔ وہ شاعروں اور ادیبوں کی ایک برادری کے قائل تھے۔ خواہ شاعر یا ادیب کسی زبان کا بھی کیوں نہ ہو اُسے وہ اپنی برادری کا سمجھتے تھے۔ اور اس کی مدد کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ ہندوستان کے تقریباً ساری زبانوں کے سیکڑوں شاعروں اور ادیبوں سے ان کے ذاتی تعلقات تھے اور وہ ان کے مسائل پر سوچا کرتے تھے۔ ان کی بھلائی کے لئے جو کچھ بھی ان سے ممکن ہوتا اس سے باز نہیں آتے تھے۔ یہ خوبی میں نے کسی دوسرے شاعر اور ادیب میں نہیں دیکھی۔ اس لحاظ سے وہ اپنے ڈھنگ کے تنہا انسان تھے۔

بات ختم ہوئی اور دِنکر جی دوسرے ہی دن دہلی واپس چلے گئے۔ چند دنوں کے بعد ان کا تار ملا "پہلی ٹرین سے دہلی پہنچو" میں دوسرے ہی دن دہلی روانہ ہو گیا اور ان سے ملا۔ انھوں نے بتایا کہ انفارمیشن اور براڈ کاسٹنگ کے وزیر ڈاکٹر کیسکر سے ان کی باتیں ہوئی تھیں اور ان کی ہدایت پر انھوں نے مجھے بلایا تھا۔ ڈاکٹر کیسکر سے میری معمولی سی جان پہچان تھی۔ اس زمانے کی جب وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے شعبہ خارجہ کے سکریٹری تھے۔ دوسرے دن دِنکر جی مجھے لیکر ڈاکٹر کیسکر کے پاس گئے۔ دس بارہ برسوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی لیکن انھوں نے مجھے پہچان لیا۔ باتیں شروع ہوئیں اور انھوں نے بتایا کہ کشمیر ریڈیو کے لئے انھیں ایک بھروسے کے لائق آدمی کی ضرورت ہے۔ اور وہ مجھے وہاں بھیجنا چاہتے ہیں۔ میں تھوڑی دیر تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکا بلکہ حیرت کے عالم میں رہا۔ کچھ سوچتا رہا کیا جواب دوں۔ ملازمت مجھے پسند نہیں تھی۔ اور ضرورتیں مجبور کر رہی تھیں۔ آخر میں نے یہی طے کیا کہ ملازمت کر لوں اور ہاں کہنے پر مجبور ہو گیا۔ اس ملاقات کے ایک مہینے بعد میں ریڈیو کشمیر میں کام کرنے چلا گیا۔

۱۹۵۵ء میں ریڈیو کی ملازمت کی اور ۱۹۷۰ء میں مدت ختم کر کے سبکدوش ہوا۔ اس مدت کے تجربے الگ ہیں۔ اچھے بھی اور بُرے بھی۔ لیکن انھیں دہرانے کا یہ موقع نہیں۔ کبھی موقع ملا تو سناؤں گا۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ بچپن میں تاجر کتب بننے کا جو خواب دیکھا کرتا تھا وہ پورا نہیں ہوا۔ دوسروں کی کتابیں کیا چھاپتا، اپنی کتابیں بھی چھاپنے کے لئے دوسرے پبلشروں کو دینی پڑیں۔ ویسے آج بھی تمنا ہے کہ اللہ موقع دے اور میں کتابوں کی اشاعت اور تجارت کا کام کر سکوں۔



رام لال

"……. یہ سب کچھ جو میں لکھتا رہا ہوں اور آئندہ بھی لکھنا چاہتا ہوں کیا میرا اظہارِ ذات ہے …؟
… میرے اندر سے ….. بہت اندر سے کوئی جواب دے رہا ہے …… اظہارِ ذات اور آپ بیتی میں
زیادہ فرق نہیں ہوتا —— اول الذکر ایک فنی لبادہ اوڑھ کر آتی ہے اور آخر الذکر بے لباس سچائی کی علامت
بن کر……"

میرے لئے میانوالی مغربی پنجاب میں ہمارا پہلا ۱۹۱۲ء کو عالم وجود میں آنا کسی بھی نقطۂ نظر سے قابلِ فخر معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن یہ بات مجھے سوچنے پر مزید مجبور کردیتی ہے کہ میں اگر منہ میں چاندی کا چمچ لیکر پیدا ہوا ہوتا تو اس وقت تک میں جتنا سوچ سکا ہوں، پڑھ چکا ہوں اور لکھ بھی سکا ہوں، وہ سب کیوں کر ممکن ہوا ہوتا۔ بدقسمتی سے میں اس خیال کا حامی ہوں کہ لکھنے والے کے لئے ایک غریب یا پسماندہ ماحول میں پیدا ہونا ضروری ہے۔ اور میں اس بات میں یقین رکھتا ہوں کہ سارے فنون بڑے بڑے شہروں کے ماحول میں ہی صحیح تربیت پا سکتے ہیں۔

اپنے بچپن میں مجھے اپنے خاندان کے اندر دو شخصیتیں زیادہ قابلِ ذکر نظر آتی ہیں۔ ایک میرے دادا دوسری میری دادی۔ میرے دادا کے چھ بڑے بھائی جو ان کی طرح مزدور تھے، انتہائی مفلس ہونے کی وجہ سے شادی نہ کر سکے۔ اور عین جوانی کے عالم میں ایک کے بعد ایک مرتے چلے گئے۔ اس زمانے میں چھوٹے بڑے شہروں میں پلیگ، ہیضہ، تپ محرقہ اور وبائی جیسی وبائیں عام تھیں، صرف میرے دادا ہی شادی کر سکے۔ اور ان ہی سے نسل در نسل ہمارے خاندان کی آبادی ۱۹۵۴ء میں (جب میرے دادا کا دسمبر کو اسّی سال کی عمر میں دہلی میں انتقال ہوا۔) چھوٹے بڑے ایک سو نفوس پر مشتمل تھی۔ میرے دادا چھوٹے قد کے مگر بہت ہی جفاکش انسان تھے۔ میں نے انھیں کبھی کبھی محنت کی خوشی میں سرشار ہو کر گاتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ لیکن وہ بہت ہی بے سُرے تھے۔ ان کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ ایک مرتبہ پلیگ پھیل جانے پر میانوالی میں ہزاروں لوگ گھروں میں پڑے پڑے مر گئے تھے۔ میرے دادا نے اپنے نوجوان ساتھیوں کے ساتھ ایک ٹولی بنالی تھی جو لوگوں کے بند کمروں کے دروازے توڑ توڑ کر اندر سے سڑے ہوئے مردے اٹھاتے تھے۔ اور انھیں شمشان میں لے جا کر جلا دیتے تھے۔ ایک گھر میں کوئی شخص کئی دنوں سے مرا پڑا تھا: جب اس کا دروازہ توڑا گیا۔ اور اندر سے تیز بدبو کا جھونکا لگنے پر بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئے۔ دادا بتاتے تھے کہ ان کا رنگ اسی واقعہ سے کالا پڑا ہوا تھا۔

چوں کہ میری ماں کا انتقال میرے بچپن (۲ سال کی عمر) میں ہی ہو گیا تھا اور میری پرورش اور میری سوتیلی ماں کے غیر ہمدردانہ سلوک سے بچانے کی ذمہ داری میری دادی نے ہی سنبھال لی تھی۔ میں نے انھیں ہمیشہ لڑتے اور جھگڑتے ہوئے ہی دیکھا۔ ان کا انتہائی غیظ و غضب کے ساتھ لڑنا اور کوسنا مجھے کبھی نہیں بھولتا۔ عام طور پر ان کے مدمقابل میری سوتیلی ماں اور دو چچیاں ہی ہوتی تھیں۔ دادی چھوٹے سے قد کی بہت ہی گورے رنگ کی خاتون تھیں۔ لیکن ان کی آنکھیں ہمیشہ خراب رہیں۔ کئی بار آنکھوں کے آپریشن کرائے۔ لوگ بتاتے تھے کہ ان کی آنکھیں خراب ہونے کی وجہ سے ہی وہ میرے دادا کی بیوی بن سکیں، ورنہ غریب ہونے کی وجہ سے ہی میرا دادا بھی غیر شادی شدہ رہ جاتے۔ لیکن میری دادی کی سی گوری رنگت اور ان کی سی بھوری آنکھیں ہمارے خاندان کے کئی لڑکوں اور لڑکیوں کو نصیب ہوتی ہیں۔ خود میری دوسری بیٹی میری دادی کا دوسرا روپ ہے۔

بچپن سے ہی ماں جیسی نعمت سے محرومی اور دوسرے لوگوں کی شفقت جس میں ترس کا مادہ زیادہ ہوتا تھا،

میرے اندر احساس کمتری کو بڑھانے کا باعث ہمیشہ بنتا رہا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا گھر سے مفلسی رخصت ہو چکی تھی۔ اپنا ایک بہت بڑا گھر تھا۔ جس کے تین حصوں میں میرے والد اور دو چچا رہائش پذیر تھے۔ اور ایک اور حصہ میں دادا اور دادی رہتے تھے۔ بازار میں کپڑے کی تین دکانیں چل رہی تھیں اور میرے والد نے ہمارے شہر میں پہلا سینما گھر بھی تعمیر کر لیا تھا۔ (جہاں میں نے نا بڑ توڑ کئی فلمیں دیکھیں اور فنون کی دنیا میں اسی سے ایک قسم کا فرار ہونا سیکھا تھا۔) لیکن میں نے ہمیشہ خود کو مجبور و مفلس ہی محسوس کیا۔ میں کسی کے سامنے فخر کے احساس کے ساتھ خاندانی آسودگی کا ذکر کر ہی نہیں سکتا تھا۔ میرا سگا چھوٹا بھائی اٹھارہ برس کی عمر میں ٹی۔ بی کے مرض میں مبتلا ہو کر ۱۹۴۳ء میں چل بسا۔ اس کی موت نے نفسیاتی طور پر میرے اندر محرومی اور تنہائی کا احساس اور بڑھا دیا۔ ان زمانے میں میں لاہور میں مغلپورہ ریلوے ورکشاپ میں اپرنٹس شپ کر رہا تھا۔ چوں کہ میرے بھائی کی موت تپ دق کی وجہ سے ہوئی تھی اور اس زمانہ میں یہ عام خیال پھیلا ہوا تھا کہ جس گھر میں یہ مرض ایک بار گھس جاتا ہے پھر کبھی نکلتا نہیں ہے۔ اس لئے میرے ماں باپ اور دادا دادی کو میرے لئے رشتہ ڈھونڈنے میں خاصی دقت پیش آ رہی تھی۔ آخر میرا رشتہ ایک ایسے خاندان میں ڈھونڈ لیا گیا جہاں میری ہونے والی بیوی کی بڑی بہن اور ایک بڑا بھائی بھی اسی تپ دق میں مبتلا تھے۔ (ان دونوں کا انتقال آزادی کے بعد ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۳ء میں انبالہ میں ہوا۔) یہ رشتہ میرے لئے مجبوری کے ساتھ سمجھوتے کے مترادف تھا۔ شاید لوگ سمجھتے تھے کہ ہم دونوں باہم میں سے کوئی ایک ضرور جلد یا بدیر اس موذی مرض کا شکار ہو جائے گا۔ لیکن بفضل خدا ہم دونوں ابھی تک صحت مند اور چاق و چوبند ہیں۔ اور ان سطور کو تحریر کرتے وقت میں اپنی بیوی (شکنتلا) کے ساتھ پینتیس سال بڑی محبت، ہنسی اور خوشی کے ماحول میں گزار چکا ہوں۔ (ہمارے تین بچے ہیں۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی کی شادی ہو چکی ہے، ہمارے ایک نواسی ایک نواسہ اور ایک پوتی ہے، ہمارے تینوں بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔)

۱۹۴۷ء میں ہندستان کی آزادی کے وقت میرے لئے لاہور چھوڑ کر نئے ہندستان کی طرف کوچ کرنا ایک اور اہم واقعہ ہے۔ کیوں کہ یہ سفر جس میں میرے ساتھ میری بیوی اور ایک چھوٹی سی بچی شامل تھیں، آگ اور خون کا سمندر پار کرنے کے برابر تھا۔ اپنی زندگی میں میں نے یوں تو کئی موتیں دیکھی ہیں لیکن جس قدر موتیں اور انسانی بے رحمی، بے حسی اور وحشت آزادی کے فسادات کے دوران میں دیکھی ہیں انھیں بھلانا مشکل لگتا ہے، مجھے فساد اور جنگ دونوں سے نفرت ہے، لیکن میرے اندر کبھی کبھی غصہ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ میں جذباتی طور پر خود کو بے شمار قتل کرتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ جی چاہتا ہے دنیا سے سارے سفاک لوگوں کا ایک ہی مرتبہ میں خاتمہ کر دوں۔ اس کے بعد اس دنیا کو پورے امن و سکون کے ساتھ پھلنا پھولنا دیکھ...

پھر سوچتا ہوں دنیا میں بے شمار ڈکٹیٹروں نے شاید اسی برہمی کی کیفیت میں اپنے ماحول کو خوبصورت بنانے کا منصوبہ سوچا ہوگا، لیکن میں ڈکٹیٹر کبھی نہیں بننا چاہوں گا۔

میری ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۳ء سے ہو گیا تھا۔ جب میری پہلی کہانی "خیام" ویکلی لاہور، میں شائع ہوئی تھی۔ میں نے شروع ہی سے اپنے لئے دو ادبی رویے متعین کر لئے تھے۔ ایک تو اپنا نام بہت ہی سادہ رہنے دیا تھا یعنی اسے خواہ مخواہ بارعب بنانے کی کوشش نہیں کی تھی، (احمد ندیم قاسمی صاحب نے جب میرے پہلے مجموعہ آئینے کا تعارف لکھا

تو انھوں نے اس میں میرے نام کی سادگی کا خاص طور پر ذکر کیا تھا۔) دوسرے میں نے افسانہ نگاری کے لئے ہمیشہ نیا احول حقیقی نگاری، اور ان کی باتیں پیش کرنا اپنا شعار بنائے رکھا ہے۔ اس مقصد کیلئے مجھے ہمیشہ اپنے نچلے متوسط طبقے کی طرف ہی دیکھنا پڑتا ہے جس کا میں ایک فرد ہوں۔ اگرچہ اونچے درجہ کا طبقہ بھی میرے سماجی تعلقات کی وجہ سے میری پہونچ سے کبھی باہر نہیں رہا۔ اور اس کے بارے میں بھی میں نے کئی افسانے لکھے ہیں۔ لیکن میں ایمانداری سے کہہ سکتا ہوں کہ اس طبقہ کے ساتھ میری ہمدردیاں محدود ہیں۔ کیوں کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ اوپر کا طبقہ عام طور پر ریاکار اور کاروباری ہے۔ اگرچہ میں تعصب سے بہت دور بھاگتا ہوں اور اس طبقاتی تعصب سے بھی نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں لیکن انسانی فطرت کی اس خودغرضی کی جبلت کو سمجھنا اور اسے کہانیوں کے وسیلے سے پیش کرنے سے باز آنا کبھی کبھی بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ میرا تعصب بھی میرے لئے ایک تخلیقی مسئلہ بن گیا ہے۔

اب تک تین سو کے قریب افسانے لکھ چکا ہوں۔ ناول، ناولٹ، ریڈیائی ڈرامے، اسٹیج کے ڈرامے، مضامین اور خاکے وغیرہ بھی لکھے ہیں۔ درجنوں کہانیاں اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندستان کی مختلف صوبائی زبانوں میں شائع ہوئی ہیں ایک کہانیوں کا مجموعہ کنٹر بھاشا میں، پانچ ہندی میں اور ایک انگریزی میں شائع ہو چکے ہیں۔ اردو میں جو کتابیں چھپ چکی ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

افسانے :۔　انقلاب آنے تک، آئینے، وہ مسکرائے گی، نئی دھرتی پرانے گیت، گلی گلی آواز تو پہچانو

انتظار کے قیدی، چراغوں کا سفر، کل کی باتیں، اکھڑے ہوئے لوگ، گذرتے لمحوں

کی چاپ، معصوم آنکھوں کا بھرم۔

ناولٹ/ناول :۔　مٹھی بھر دھوپ، کہرا اور مسکراہٹ، حریف آتش پنہاں

میری آپ بیتی میں انگریزی کا سہ ماہی 'نیو جنریشن' کی ادارت بھی شامل ہے۔ میں بلاشبہ بے شمار شہروں اور یونیورسٹیوں کے سیمیناروں میں شریک ہوا ہوں، مضامین پڑھے ہیں، مباحثوں میں حصہ لیا ہے۔ اور ہندستان (موغیر منقسم ہندستان) میں پشاور سے کلکتہ اور ڈبرو گڈھ تک، شملہ اور جموں سے بمبئی، احمد آباد، جوناگڈھ، اور میسور تک کے طویل سفر کئے ہیں۔ میری ملازمت ہی کچھ اس قسم کی ہے کہ ہر وقت سفر میں رہتا ہوں۔ اتنے قصبوں، شہروں اور گاؤں کو دیکھا ہے کہ ان کے نام تک گنانا مشکل ہے۔ غیر ممالک میں ناروے، سویڈن، ڈنمارک اور لندن کی سیاحت بھی کر چکا ہوں۔ یہ تجربہ میں نے حال ہی میں حاصل کیا ہے۔ جس کو ایک طویل سفرنامے میں قلمبند کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

اردو کی حمایت میں ایک تاریخی آل انڈیا غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس ۱۹۷۳ء میں لکھنؤ میں منعقد کرائی تھی۔ جس میں چار سو کے قریب مقامی اور غیر مقامی ہندو، سکھ، مسلم اور عیسائی ادیب شریک ہوئے تھے۔

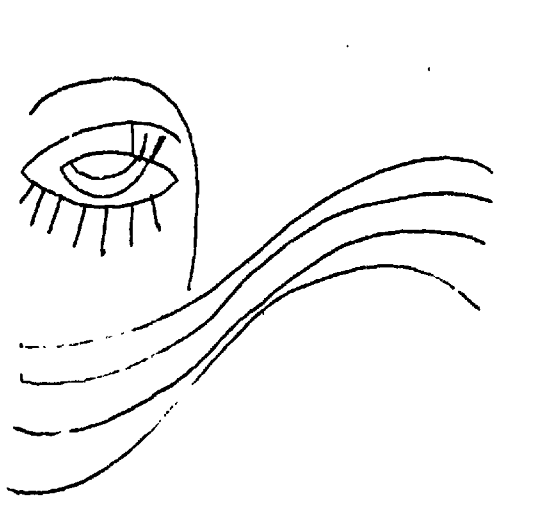
کبھی کبھی تنہائی کے لمحوں میں ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہوں تو یہ سارا ادبی سفر کوئی بہت بڑا کارنامہ نہیں معلوم ہوتا۔ ایسا لگتا ہے جتنا کچھ بیت چکا ہے وہ سب اتفاقاً ہوتا رہا ہے۔ کیوں کہ اسے اسی طرح ہونا تھا۔

زندگی کا فطری عمل بنتا ہے، ذاتی اور اجتماعی دونوں طرح کی زندگی کا۔ میں اسے شعوری طور پر زیادہ اچھا نہیں بنا سکتا تھا۔ کسی چیز کو خوبصورت اور دل کش بننے کے لیے شعوری کوشش سے زیادہ فطرت کے اپنے عمل کی ضرورت زیادہ اہم ہوتی ہے۔ جس طرح فطرت خود اپنے آپ میں زیادہ حسین ہے، اس معاملہ میں میرا اعتماد بہت مضبوط اور عقیدہ خاصا راسخ ہے، میں نے کسی خوبصورت لڑکی یا عورت کو آج تک نہیں چھیڑا۔ اس لیے نہیں کہ میں اس معاملہ میں بزدل تھا بلکہ اس لیے کہ میں صنف نازک کی فطری آزادی میں یقین رکھتا ہوں۔ میری زندگی میں جتنی عورتیں مختلف وقفوں میں آتی رہی ہیں ان میں کوئی بھی ٹوٹی ہوئی دیوار جیسی نہیں تھی۔ وہ سب کی سب پوری طرح سرکش، خوددار اور نسوانی ملائمت و ملاحت کا شاہکار تھیں۔ میں ان میں سے کسی ایک کا بھی تفصیلی تذکرہ کر کے ان کے وقار کو مجروح کرنا نہیں چاہتا۔ کیوں کہ ان کے اسی وقار نے مجھے زندگی کے مسرور ترین لمحے عطا کئے ہیں۔ لیکن میں اس سے بھی انکار نہیں کر سکتا کہ میں ان سبکو (منجملہ ان تمام لوگوں کے جن سے میں کسی نہ کسی سطح پر ملتا رہا ہوں۔) اپنی کہانیوں میں پیش کرتا رہا ہوں، اگر انھیں پورا پورا پیش نہیں کیا تو ان کی بعض خصوصیات کا تذکرہ ضرور کر دیا ہے۔ ایسے کرداروں یا انسانی خصوصیات کے آئینہ میں وہ اپنا عکس دیکھ کر ہمیشہ خوش ہی ہوئی ہیں۔ اس سے مجھے بڑا اطمینان ملتا رہا ہے، سوائے ایک خاتون کے جو ایک مرتبہ ناخوشی کا اظہار کر کے بھی اپنی حقیقی مسرت کو چھپا نہیں پائی تھی۔

آخر میں ایک سوال، اپنے آپ سے ——

یہ سب کچھ جو میں لکھتا رہا ہوں اور آئندہ بھی لکھنا چاہتا ہوں، کیا میرا اظہار ذات ہے؟

میرے اندر سے —— بہت اندر سے کوئی جواب دے رہا ہے۔ اظہار ذات اور آپ بیتی میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ اول الذکر ایک فنی لبادہ اوڑھ کر آتی ہے اور آخر الذکر بے لباس سچائی کی علامت بنکر۔





پرکاش پنڈت

"....... زندگی میں کیا کیا پاپڑ بیلے اور کن کن گھاٹوں کا پانی پیا ـــــــ اس میں سوائے میرے کسی اور کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟....... کیونکہ پاپڑ بیلے تو خود میں نے ہی کھائے اور گھاٹوں کا کھارا میٹھا پانی بھی میرے ہی حلق سے اُترا..... لیکن ......"

میں ۱۹۴۲ء کی آزادی جنگ کے ہولناک زمانے میں بھی پیدا ہو سکتا تھا اور ۱۹۴۷ء کے حصولِ آزادی کے ہنگامے زمانے میں بھی۔ لیکن میں چونکہ پیدائشی طور پر امن پسند واقع ہوا ہوں اس لیے میں نے بڑے امن و سکون کے ساتھ ۱۹۳۲ء کی سہانی صبح کو پیدا ہونا پسند کیا —— میرے مرحوم والد کا خیال تھا کہ میں نیروبی (افریقہ) میں پیدا ہوا ہوں لیکن میرا اپنا خیال ہے کہ میری پیدائش ٹالپور (اب پاکستان) میں ہوئی ہے۔ والدہ حیات ہیں لیکن ان سے اس بات کی تصدیق کروں کیسے کہ میں مرحوم والد کی روح کو اور اپنی ہٹ دھرمی کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا لہٰذا دونوں میں سے کوئی بات بھی صحیح ہو سکتی ہے۔

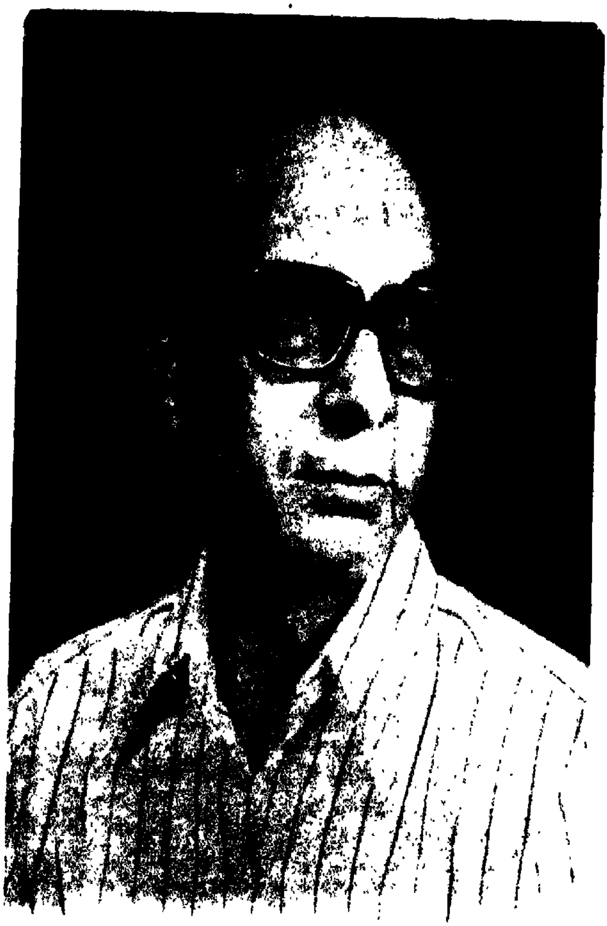
زندگی میں کیا کیا پاپڑ بیلے اور کن کن گھاٹوں کا پانی پیا —— اس میں سوائے میرے کسی اور کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے کیونکہ پاپڑ بیلے تو خود میں نے ہی کھائے اور گھاٹوں کا کھارا میٹھا پانی بھی میرے ہی حلق سے اترا۔ لیکن اس کھانے پینے کے دوران جو چھینکیں آئیں، زکام، بخار یا پیٹ درد ہوئے وہ ہندی، اردو اور پنجابی کی ڈیڑھ سو سے زیادہ کتابوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ اس لحاظ سے سنا ہے میں ہرفن مولا ہوں۔

میں نے کہانیاں بھی لکھی ہیں اور طنزیہ، مزاحیہ اور سنجیدہ مضامین بھی —— اسٹیج اور ریڈیو ڈراموں کی تخلیق بھی کی ہے، اور بچوں اور نابالغ بوڑھوں کے ادب کی بھی۔ کئی برس تک اردو کے مشہور رسائل 'شاہراہ'، 'فنکار' اور 'پریت لڑی' کی ادارت بھی کی ہے۔ اور کئی سرکاری اور غیر سرکاری انعامات بھی حاصل کیے ہیں۔ ایک شعر کہنے کی کمی تھی سو 'اردو کے لوک پریہ شاعر' وغیرہ درجنوں مجموعوں کو ترتیب دے کر اس میدان میں بھی تیر مار لیے ہیں —— اور بقول شخصے (اور وہ شخص میں ہی ہوں) ان شاعروں کے تعارف لکھ کر میں نے ہندی میں تعارف لکھنے کو ایک نیا اسلوب دیا ہے۔

—— جو ہو، کئی برس پہلے بمبئی میں فلم ڈائرکٹر بننے گیا تھا لیکن "چاندی کی دیوار" نامی فلم کے مکالمے لکھتے لکھتے ایسی ذہنی پتنگ کٹائی کہ فلموں کی بجائے ہند پاکٹ بکس پرائیویٹ لمیٹڈ کا ڈائرکٹر آ بنا۔

یعنی ——

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا!



مانک ٹالہ

"........ میں ادب میں مقصدیت کا قائل ہوں لیکن میری مقصدیت کا راستہ کسی ازم کی قربان گاہ سے ہو کر نہیں گزرتا۔ مقصدیت کے باوجود میری ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ حتی الوسع ادب کی رُوح مجروح نہ ہو......"

آزادی اور اس کے نتیجے میں تقسیم ملک کے بعد دلی پہنچا تو سب سے پہلی فکر یہ تھی کہ کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا جائے۔ جون سے دسمبر تک شملہ میں بہت مزے اڑا لیئے تھے۔ ایک روز دلی کی سڑکیں ناپ رہا تھا تو دیکھا کہ شہر کی دیواروں پر "بچپن کی غلط کاریوں" کے شرطیہ علاج والے اشتہاروں کے ساتھ ساتھ اُردو کے نئے نئے اخباروں کے پوسٹر بھی شہر کی شوبھا بڑھا رہے ہیں۔ چاندنی چوک اور اردگرد کے گلی محلوں میں ایک نئے اخبار "پیارا دیش" کے پوسٹر جابجا لگے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ میونسپل کے کچرے کے ڈرموں پر بھی ——

دل نے کہا: "چل بیٹا تیرا کام بن گیا۔"

چنانچہ میں دل کی آواز پر لبیک کہہ کر کشاں کشاں کوچہ بلی ماراں کا پتہ پوچھتا پچھاتا "پیارا دیش" کے دفتر کے نیچے پہنچ گیا۔ کوچہ بلی ماراں کی دکانیں تھیں۔ سارے کے سارے دلی کے مسلمان تھے۔ کم بخت بڑے سخت جان تھے! اتنی خون آشامی کے باوجود ابھی تک موجود تھے۔

بہرحال ہمیں کیا لینا دینا تھا اُن سے۔ اگر دلی کے ہنگاموں میں ہم یہاں ہوتے بھی تو کون سا تیر مار لیتے۔ شملہ میں ہم نے کون سی جواں مردی کے جوہر دکھائے تھے۔ شملہ میں ایک روز ایک مسلمان جوتا فروش کی دکان لوٹی جا رہی تھی۔ لوگ اپنے اپنے باپ کے بڑھیا سے بڑھیا جوتے لوٹ کر لے جا رہے تھے اور ہم بزدلوں کی طرح تماشا دیکھتے رہ گئے تھے۔ جوتا تو جوتا تسمے کی ایک جوڑی بھی لوٹنے کی ہمت نہ پڑی۔ گاندھی اور نہرو واد کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہا اور ہمیں نئے جوتوں کی ایک جوڑی تک سے محروم کر گیا۔ اور ہم وہی لاہور کے پرانے جوتے مرمت کرا کر پہنے چلے جا رہے اور اب انہیں کے بل بوتے پر بلی ماراں کے کوچے میں "پیارا دیش" کے دفتر کے نیچے پہنچ گئے تھے۔

مکان کے پہلے منزلے پر چھجے کے باہر "پیارا دیش" کا ایک بہت بڑا بورڈ لگا تھا۔ اُس کے متوازی اتنا ہی بڑا بورڈ انقلابی سوشلسٹ پارٹی کا لگا ہوا تھا۔ پہلے تو ہم نے یہی سمجھا کہ "پیارا دیش" انقلابی سوشلسٹ پارٹی کا ترجمان روزنامہ ہوگا۔ اور یہی انقلابی سوشلسٹوں سے کیا پلے پڑے گا۔ لیکن بڑھے قدم روکنا بھی راجپوتی شان کے خلاف تھا (یہ الگ بات ہے کہ ہم راجپوت نہیں ہیں) بہرحال بعد میں پتہ چلا تھا کہ مشرقی پنجاب کی کسی دیسی ریاست کے ایک چھوٹے موٹے زمیندار اور سود خور لالے کا ہونہار نونہال بی۔ اے کی ڈگری لینے کے بعد لیڈری کے شوق میں دلی تشریف لایا تھا اور کسی کے "ہتھکانے" پر اخبار جاری کر کے اپنے باپ کی کمائی ٹھکانے لگا کر اپنی لیڈری کی عمارت کھڑی کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

ہم مکان کی عمودی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے۔ باہر برآمدے کے درمیان ایک بنگالی بابو کرسی پر بیٹھے آنکھیں میچے دھوپ سینک رہے تھے۔ اور "دھوبن کی انگیا۔ چامری کا پانی" کا ورد فرما رہے تھے۔ ہم سمجھے کہ یہ یا تو اخبار کے مالک ہیں یا منیجنگ

ایڈیٹر سے کہ اخبار کے دفتر میں دونوں کا وجود بے کار ہوتا ہے۔ اسی لئے دھوبن کی انگیا کا ماپ لے رہے ہونگے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ انقلابی سوشلسٹ پارٹی کے سیکریٹری تھے۔ دوسری طرف ایک مُنڈو نما جوان چھوکرا غسل خانے سے نہا کر باہر نکلا تھا۔ کمر پر ایک میلا سا پرنا (صافہ) باندھے، دُھلے ہوئے کپڑوں کو جھٹک پھٹک کر سکھانے کے لیئے برآمدے میں بندھی ایک رسّی پر لٹکا رہا تھا۔

یہ صاحب اخبار کے مالک اور ملک کے اُفق پر نمودار ہونے والے لیڈران دا میکنگ (LEADER IN THE MAKING) تھے۔ ماشاء اللہ۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات (اس محاورے کی تک آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی)

برآمدے کے آخری سرے پر ایک بوڑھا ٹھونٹھ شخص کھدر کے میلے کپڑے اور سر پر کھدر ہی کی میلی سی پگڑی پہنے، ایک نیم شکستہ کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ دیکھنے میں دفتر کا چپڑاسی لگتا تھا۔ لیکن بعد میں پتہ چلا تھا کہ وہ اس اخبار کے چیف پیٹرن اور اسی ریاست کے سر برآوردہ لیڈر تھے اور عرفِ عام میں ریاستی گاندھی کہلاتے تھے اور پھسپھسے اور بے تکے لیڈنگ آرٹیکل لکھنے میں اخبار کے ایڈیٹر کو بھی مات کرتے تھے۔

اخبار کے ایڈیٹر بھی منشی منقا قسم کی کوئی ہستی تھے۔ لاہور میں "ویر بھارت" کے پروف ریڈر تھے۔ یہاں خیر سے ایڈیٹر بن گئے تھے۔ ان کی شخصیت بھی بڑی دلچسپ اور الف لیلوی قسم کی تھی۔ لیکن یہ قصہ طول نہ پکڑ جائے اس ڈر سے اسے یہیں ختم کرتا ہوں یہ کہہ کر کہ ہمیں بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر پونے دو سو روپے ماہوار پر کام مل گیا۔ ایڈیٹر صاحب کی اپنی تنخواہ اڑھائی سو روپیہ تھی۔

کرشن موہن سے میری ملاقات اسی دفتر میں ہوئی تھی۔ وہ اُن دنوں بے کار تھا اور نوکری کی تلاش میں دلی میں ایک رشتہ دار کے ہاں سبزی منڈی میں کئی ماہ سے ٹھہرا ہوا تھا۔ نزدیک کی رشتہ داری تھی۔ اس لئے رشتہ دار منہ پھاڑ کر کوئی دوسرا ٹھکانہ ڈھونڈنے کے لیئے بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ لیکن اُن کے رویے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اُن کے کندھوں پر بار بن چکا ہے۔ لیکن ہائے رے مجبوریاں۔ ایک حساس شاعر 'بے شرم' بن کر ان کے ہاں ٹکا ہوا تھا۔

میرے "پیارا دیش" میں آنے کے کچھ عرصہ بعد کرشن موہن بھی وہاں نوکری ڈھونڈتا آ پہنچا تھا لیکن اس وقت کوئی آسامی خالی نہیں تھی۔ اس لیئے اپنا سا منہ لیئے واپس جا رہا تھا۔ وہ اخبار کے مالک کے دفتر سے باہر نکل رہا تھا اور میں بائی چانس ایڈیٹوریل اسٹاف کے دفتر سے باہر نکلا تھا۔

اس سے پہلے کرشن موہن سے میری ملاقات نہیں تھی۔ لاہور میں حلقہ اربابِ ذوق میں اسے دور ہی سے درشن کر لیا کرتا تھا۔ اپنا تعارف کرانے کی کبھی ہمت نہیں پڑی تھی۔ ایک تو میں عادتاً کم آمیز تھا۔ اور اس زمانے میں بطور ادیب کچھ بھی نہیں تھا۔ اُدھر کرشن موہن 'ادبِ لطیف' 'ساقی' 'ہمایوں' وغیرہ ادبی رسائل میں چھپنے کے باعث اونچی ہواؤں میں تھا۔

بہرحال زندگی میں پہلی مرتبہ ہمت کر کے میں نے خود ہی کرشن موہن سے اپنا تعارف کرایا۔ اور لاہور کے حلقہ اربابِ ذوق اور کافی ہاؤس میں اُس کے درشن کرنے کی بھی بات کی۔ بڑے اخلاص سے ملا۔ "پیارا دیش" میں اپنے ناکام انٹرویو کے بارے میں بتایا اور سبزی منڈی والے رشتہ داروں کے بارے میں بھی۔ میں بھی کیا کر سکتا تھا۔ پرچہ ویسے بھی ڈانواں ڈول تھا۔ کاغذ کے خالص کوٹے کو بلیک کرنے کے باوجود اخراجات بہت زیادہ تھے۔ بہرحال جاتے جاتے وہ پریم ناتھ در کا پتہ دے گیا کہ وہاں ہر اتوار کو حلقہ ارباب ذوق کے ہفتہ وار اجلاس ہوتے تھے۔ چنانچہ میں نے ہر اتوار وہاں جانا

شروع کر دیا۔ اس طرح کرشن موہن سے تعلقات بہت استوار ہو گئے۔

پریم ناتھ در مرحوم اُس زمانے میں آل انڈیا ریڈیو میں ریڈیو کے ہفتہ وار رسالہ 'آواز' کے ایڈیٹر تھے۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے ہفتہ وار اجلاس اُن ہی کے کوارٹر میں ہر اتوار کی شام کو ہوتے تھے۔ اُن دنوں غالباً دلی میں "ترقی پسند مصنفین" ابھی تک آرگنائز نہیں ہوئی تھی (بہبئی چلے جانے کے بعد وہاں "شاہراہ" کے دفتر میں انجمن کے جلسے ہوا کرتے تھے۔ بمبئی سے دو تین مرتبہ جب دلی جانا ہوا تو اس کی کچھ میٹنگیں میں نے اٹینڈ کی تھیں۔ ان میں حاضری بہت کم ہوتی تھی) اس لئے ہنس راج رہبر اور کچھ دوسرے 'ترقی پسند' مصنفین بھی ان ہی میٹنگوں میں آتے تھے۔ پریم ناتھ در بڑی دلچسپ اور عاشقانہ قسم کی شخصیت تھے اور اُن کے سبھی بڑے بڑے مصنفین سے ذاتی تعلقات تھے۔ چنانچہ باہر کے ادیب بھی جب دلی تشریف لاتے تو نہ صرف حلقہ کے ہفتہ وار جلسوں میں مدعو کرتے بلکہ کچھ کو اپنے گھر پر ہی ٹھہراتے یا کم سے کم دو تین مرتبہ کھانے پر ضرور مدعو کر لیتے۔

ان دنوں پریم ناتھ در کا بطور کہانی کار بہت شہرہ تھا۔ اس زمانے میں اُنھوں نے کہانیاں بھی بہت اچھی اور انفرادی لکھی تھیں۔ آزادی سے پہلے "ادبی دنیا" میں پہلی ہی کہانی سے بہت شہرت حاصل کر لی تھی۔ اس زمانے میں جس کی ایک بھی کہانی "ادبی دنیا" میں چھپ جاتی تھی وہ راتوں رات مشہور ہو جایا کرتا تھا۔ پریم ناتھ در کی کچھ کہانیاں میں پڑھ چکا تھا اس لئے اُن سے غائبانہ تعارف تو تھا ہی۔ اب اُن سے ملاقات بھی ہو گئی اور انہوں نے اپنے حُسنِ سلوک سے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ میں جتنا کم آمیز تھا وہ اتنے ہی زیادہ آگے بڑھ کر دوسروں سے تعلقات استوار کرنے میں ماہر تھے۔ یہ اُن ہی کی "ہمت" تھی کہ بعد میں میرے اور اُن کے تعلقات گھر جیسے ہو گئے تھے۔

حلقۂ اربابِ ذوق، لاہور اور دلی کی ایک خاص روایت تھی کہ ان میں جو تخلیقات پڑھی جاتی تھیں اُن پر سرزنش دینے سے گریز کیا جاتا تھا اور ان میں تنقید تعمیری نقطۂ نظر سے کی جاتی تھی۔ خاص کر نئے لکھنے والوں کو بہت اچھے اور مفید مشورے دیئے جاتے تھے۔ لیکن کچھ حضرات کبھی کبھار دوسرے کی ٹانگ کھینچنے اور اپنے آپ کو لائم لائٹ (LIME LIGHT) میں لانے کی خاطر خواہ مخواہ کی بے تکی تنقید کر کے تخلیق کار کی ٹانگ گھسیٹ کر اپنے آپ کو بڑے پائے کا نقاد ظاہر کرتے تھے۔ ایک مرتبہ دلی کے حلقہ کی ایک میٹنگ میں غالباً جالندھر کے ایک صاحب جناب رام پال صاحب تشریف لائے ہوئے تھے۔ اس میٹنگ میں میں نے ایک کہانی کشمیر کے موضوع پر پڑھی تھی۔ یہ کہانی میری ابتدائی کوششوں میں سے ایک تھی اس لئے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ اُن دنوں کرشن چندر کی کشمیر کے متعلق بہت سی کہانیوں نے بہت سے لکھنے والوں کو اس طرح کی کہانیاں لکھنے کی طرف راغب کیا تھا۔ یہ کہانی کشمیر میں میری سیر و تفریح کے زمانے کے کچھ ذاتی تجربات اور کچھ ادھر اُدھر کی باتوں پر مبنی تھی۔ لیکن کہانی پر تعمیری یا تخریبی کسی بھی طرح کی تنقید کرنے کی بجائے جناب رام پال صاحب چھوٹتے ہی فرمانے لگے کہ یہ کہانی رامانند ساگر کی "کشمیر کی ڈائری" کا چربہ ہے جبکہ میرا خیال ہے رامانند ساگر نے اس قسم کی کوئی ڈائری آج تک لکھی ہی نہیں۔ سارے حاضرین اس لئے چپ بیٹھے رہے کہ اُن پر یہ 'الزام' نہ لگ جائے کہ وہ اس زمانے کے مشہور ادیبوں کی تخلیقات سے ہی بے بہرہ ہیں۔ بہرحال میرے ساتھ اُن کی گرماگرمی کے بعد یہ بحث ختم ہو گئی۔

ایک اور دلچسپ واقعہ سنیئے۔ میں نے ایک کہانی لکھی تھی "جج اکبر"۔ یہ کہانی تقسیمِ ملک کے کچھ ذاتی واقعات و مشاہدات پر مبنی ہے اور میرے دوسرے مجموعے "گناہ کا رشتہ" میں بھی شامل ہے۔ آج سے غالباً پندرہ سال پہلے لکھی تھی اور اس کی کافی سراہنا ہوئی تھی۔ اس کتاب پر تبصرہ کرنے والے بہت سے ناقدوں نے بھی اس کہانی کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔

اُن ہی دنوں میں بمبئی سے دہلی گیا ہوا تھا اور غالباً دہلی رائٹرز ایسوسی ایشن (جس کے صدر کرشن موہن ہیں) نے میرے اعزاز میں ایک تقریب رکھی۔ اس کی صدارت جناب گوپال متل صاحب نے فرمائی تھی۔ اس میٹنگ میں مَیں نے یہی کہانی پڑھی۔ اور جناب سریندر پرکاش صاحب میری ٹانگ گھسیٹنے کو لپکے اور بہت دور کی کوڑی لاتے ہوئے فرمایا کہ آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے ٹالسٹائی نے ایک کہانی لکھی تھی۔ یہ اسی کا چربہ معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ کہ مجھے ٹالسٹائی کو دہرانے کی کیا ضرورت تھی۔

سریندر پرکاش صاحب میدان مار گئے۔ باقیوں کے ساتھ مجھے بھی سانپ سونگھ گیا۔ گو بھی ہو حقیقت یہی ہے کہ نہ ٹالسٹائی نے ایسی کوئی کہانی لکھی تھی اور نہ ہی راما نند ساگر نے کشمیر پن ڈائری۔ لیکن ٹانگ گھسیٹنے والے اپنا کرشمہ دکھا گئے۔

اُردو میں ان ہی غلط روایات نے نئے اُبھرنے والے ادیبوں کی تخلیقی استعداد کو کچل کر رکھ دیا ہے۔ اُدھر ESTABLISHED ادیب بھی اس قسم کی بے ہودگیوں سے متنفر ہو گئے ہیں۔ چنانچہ حلقۂ ارباب ذوق کی طرح کے ادارے جنہوں نے ادیبوں کی طرح تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنے اور سنوارنے میں بہت شاندار رول ادا کیا تھا اپنی موت آپ مر گئے۔

بمبئی آنے کے بعد میں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی ہفتہ وار میٹنگوں میں باقاعدہ جانا شروع کر دیا تھا۔ یہ وہ پُر آشوب دور تھا جبکہ کمیونسٹ پارٹی کی تلنگانہ بغاوت اپنے پورے شباب پر تھی اور غالباً کمیونسٹ پارٹی ہندوستان بھر میں غیر قانونی قرار دی جا چکی تھی۔ لیکن کمیونسٹ پارٹی کے زیر اثر پارٹی کے بہت سے محاذی ادارے غیر قانونی قرار نہیں دیئے گئے تھے اور ملک کے مختلف حصوں میں ہڑتالیں کروانے اور گڑبڑ مچانے میں مصروف تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین بھی کمیونسٹ پارٹی کا ایک محاذی ادارہ تھی۔ اور اس کی میٹنگوں میں "ریل کا پہیہ جام کریں گے ....." کی طرز کے ادب کی بہت پرشنسا ہو رہی تھی۔

اگرچہ کمیونسٹ پارٹی کو ہوم منسٹری کے حکم سے بین کیا گیا تھا اور اس وقت ہوم منسٹر سردار پٹیل تھے لیکن پارٹی کی میٹنگوں میں عتاب کا سب سے زیادہ نشانہ پنڈت نہرو کو بنایا جا رہا تھا۔ غالباً اوپر سے آرڈر تھا کہ نہرو کا "بت" توڑے بغیر گاڑی آگے نہیں چل سکے گی۔ نہرو کی مٹی پلید کرنے کی دُھن میں نوبت دشنام طرازی کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ اس 'حملہ' میں سردار جعفری اور دشوا متر عادل پیش پیش تھے۔

ادیبوں میں خواجہ احمد عباس کو دشنام طرازی کا سب سے زیادہ نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ عباس صاحب نہ تو پنڈت نہرو کے خلاف کچھ لکھنے کو تیار تھے اور نہ ہی اپنے ہندی کے رسالے "سرگم" میں نہرو کے خلاف کوئی چیز شائع کرنے کو تیار تھے۔ سبھی ترقی پسند ادیبوں نے "سرگم" کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ عباس صاحب "سرگم" میں لکھنے والوں کو ایک معقول معاوضہ دیا کرتے تھے۔ بائیکاٹ کے باعث بے چارے بہت سارے ترقی پسند ادیب دل مسوس کر رہ گئے تھے کہ اس طرح انہیں ایک معقول آمدن سے ہاتھ دھونا پڑ رہا تھا۔

اُن دنوں کرشن چندر کا ایک ناول "سرگم" میں قسط وار چھپ رہا تھا لیکن وہ سردار جعفری سے دوستی اور اپنے ڈپلومیٹک رویہ کے باعث اس عتاب کا نشانہ بننے سے بچ گئے تھے۔ پارٹی اور انجمن کے موقف کی انہوں نے پوری طرح حمایت کی بلکہ تلنگانہ کی بغاوت کے بارے میں کہانیاں بھی لکھیں اور "ہل کے سائے" کو مرتب بھی کیا جس میں بہت سی کہانیاں بغاوت کی حمایت میں تھیں۔ لیکن اس سب کے باوجود ان کا ناول "سرگم" میں قسط وار چھپتا رہا۔ اُن پر انجمن کے سرگرم کارکن جب دباؤ ڈالتے تو وہ کہہ دیتے کہ وہ اس ناول کا معاہدہ کر چکے ہیں۔ اس کے ختم ہونے کے بعد وہ "سرگم" میں نہیں لکھیں گے۔ اس دوران میں "سرگم" ہی بند ہو گیا اور معاملہ اپنے آپ رفع دفع ہو گیا۔

اُن دنوں ادب پر کس قسم کی تنقید ہوتی تھی اس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ رامانند ساگر ترقی پسندوں کی میٹنگوں میں نہیں آتے تھے اور نہ ہی انہوں نے کبھی کھُل کر اُن کے موقف کی حمایت کی تھی۔ ایک میٹنگ میں کسی نے رامانند ساگر کے ناول " اور انسان مر گیا " پر اعتراض کیا کہ یہ ناول رجعت پسند ہے کیوں کہ ناول کا نام ہی ایسا ہے کہ اس میں انسان کو مار دیا گیا ہے۔ اس پر ایک منچلے نے کہا کہ کرشن چندر کی فسادات پر کہانیوں کے مجموعہ کا نام " ہم سب وحشی ہیں " ہے۔ اس پر یہ جواب دیا گیا کہ " ہم سب وحشی ہیں " کے عنوان میں انسان کی انسانیت کے ختم ہونے کی بات نہیں ہے۔ لیکن رامانند ساگر نے تو انسان ہی کو ختم کر دیا ہے۔ (حقیقت یہ ہے کہ فسادات کے موضوع پر جس قدر ادب بھی تخلیق ہوا تھا، ساگر کا یہ ناول سب پر بھاری تھا۔)

میں نے ۱۹۵۶ء میں افریقہ جانا شروع کیا تھا۔ کرشن موہن کو پتہ لگا تو اس نے مجھے لکھا کہ اُس کے کالج کا دوست جوگندر پال نیروبی میں ہے۔ چنانچہ اگلے برس میں اپنی بیوی کے ساتھ جوگندر پال کے ہاں جا دھمکا۔ جوگندر پال بہت ملنسار آدمی ہے اور میری طرح کم آمیز نہیں۔ اس لیئے نیروبی میں اُس کا حلقہ کافی وسیع تھا۔ اور نیروبی ریڈیو سے مہینے میں تین چار بار اس کی کہانیاں نشر ہو جاتی تھیں۔ اس لیئے اُس کے مداح بھی کافی تھے۔ ان دنوں جوگندر پال کے افسانے زیادہ تر "ساقی" کراچی میں شائع ہوتے تھے۔ ہندوستان میں وہ بہت کم چھپتا تھا۔ بہر حال جوگندر پال نے بہت جلد ہندوستان کے پرچوں میں بھی چھپنا شروع کر دیا۔ اور اس طرح ہندوستان میں بھی اسے کافی مقبولیت نصیب ہوئی۔

اُن دنوں جوگندر پال افریقہ میں رہ کر زیادہ تر ہندوستانی ماحول اور ہندوستان میں کرشن کے موضوع پر کہانیاں لکھا کرتا تھا۔ دیش سے دور رہنے اور ملک سے رشتہ کٹ جانے کے باعث اس کی کہانیوں میں وہ بات نہیں تھی جو ہونی چاہیئے تھی۔ بہر حال بطور افسانہ نویس اس میں بہت دم خم تھا۔ غالباً میں نے ہی اسے ترغیب دی تھی کہ وہ افریقی ماحول اور موضوعات پر افسانے لکھے۔ یہ مشرقی افریقہ کی آزادی سے پہلے کا دور تھا۔ چنانچہ جوگندر پال نے افریقی موضوعات پر بہت سی خوبصورت اور کامیاب کہانیاں لکھیں۔ ان کہانیوں کا ایک پورا مجموعہ چھپ کر مقبول ہو چکا ہے۔

اس پہلی ملاقات کے بعد میں کئی مرتبہ نیروبی گیا۔ اُس زمانے میں وہاں کافی اچھے ادیب تھے۔ جوگندر پال کا حلقہ بھی وسیع تھا۔ اس نے بہت سے شاعروں اور ادیبوں سے ملاقات کرائی۔ لیکن کالیداس گپتا رضا سے ایک مرتبہ بھی تعارف نہیں کرایا۔ حالانکہ نیروبی میں گپتا رضا صاحب سا شاعر اور ادیب کوئی نہ تھا۔ رضا صاحب سے ملاقات جوگندر پال کے ایک دوست چمن لال چمن نے بہت عرصہ بعد کرائی تھی۔ چمن نیروبی میں ریڈیو اسٹیشن پر اناؤنسر تھا اور خود اردو، پنجابی اور ہندی میں شاعری کرتا تھا، چمن گپتا صاحب سے وہاں کے تقریباً تمام شاعروں کی طرح اصلاح بھی لیا کرتا تھا۔

اُن دنوں غالباً گپتا صاحب کا پہلا مجموعہ کلام چھپ کر مارکیٹ میں آیا تھا اور اس پر ہندوستان کے رسائل میں اچھے تبصرے چھپ رہے تھے۔ چنانچہ چمن، رضا صاحب کو مبارکباد دینے اور ان سے ملاقات کرانے مجھے اُن کے دولت خانے پر لے گیا۔ اس سے پہلے نیروبی میں جن شاعروں سے ملاقات ہوئی تھی ان سے میں قطعاً مرعوب نہیں ہوا تھا۔ لیکن گپتا صاحب کی عروض سے واقفیت، شاعری کا ریاض اور مطالعہ، یہ سب باتیں یقیناً مرعوب کن تھیں۔

گپتا صاحب نیروبی سے نقل مکانی کرنے کے بعد ۱۹۷۰ء میں بمبئی میں بس گئے۔ اب اُن سے اکثر ملاقات رہتی ہے۔ یہاں آکر

انہوں نے ایک نئے میدان میں قدم بڑھایا ہے یعنی تنقید اور تحقیق۔ اس سلسلے میں اُن کی جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں بہت تحقیق اور چھان بین کے بعد لکھتے ہیں۔ ہمارے آج کے بہت سے نقاد اور محقق کم سے کم مطالعہ کے بعد زیادہ سے زیادہ لکھتے ہیں۔ لیکن گپتا صاحب زیادہ سے زیادہ مطالعہ کے بعد کم سے کم لیکن ٹھوس لکھتے ہیں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ اچھی اور صالح شاعری کے علاوہ تحقیق اور تنقید کا میدان ان کی افتادِ طبع کے لحاظ سے بہت موزوں ہے۔ ان کا زبردست کتب خانہ بھی اسی رجحان کا غماز ہے

اب کچھ اپنے بارے میں ——

ادب کی تخلیق کے لئے میرا ماحول بچپن ہی سے ناساز گار رہا ہے۔ ہمارے خاندان میں دور دور تک کوئی ادیب یا شاعر نہیں تھا۔ نہ کسی کو معیاری ادب پڑھنے کا شوق تھا۔ کالج پہنچنے کے بعد ادبی رسائل سے واسطہ پڑا۔ کالج کی لائبریری میں۔ نجانے مجھے لکھنے پڑھنے کا شوق کس طرح اور کیوں ہوا۔ ادبی ارتقا کی منزلیں میں نے گھٹنوں کے بل طے کی ہیں۔ میں نے سرپٹ بھاگنے کی کوشش نہیں کی اور شاید بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں کہانی براہ راست زندگی سے حاصل کرتا ہوں اور جب تک وہ میرے دل و دماغ کی گہرائیوں میں نہ اُتر جائے میں اسے قلم بند نہیں کر سکتا تاہم کہانیوں کے دو مجموعے اور دو ناول چھپ چکے ہیں اور مزید دو تین مجموعے اشاعت کے منتظر ہیں۔

میں ادب میں مقصدیت کا قائل ہوں لیکن میری مقصدیت کا راستہ کسی ازم کی قربان گاہ سے ہو کر نہیں گزرتا۔ مقصدیت کے باوجود میری ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ صحیح الوسع ادب کی روح مجروح نہ ہو اور کہانی کی تکنیک سے پورا پورا انصاف کیا جا سکے۔ زندگی میں ایک دور ایسا بھی آیا تھا کہ اپنی افتادِ طبع اور جوشِ جوانی میں "ترقی پسندی" کی رَو کے ساتھ بہہ نکلا تھا۔ لیکن وہ زمانہ میرے ادب کی تخلیق کا ابتدائی دور تھا اس لئے ذہن کی پختگی کے ساتھ ساتھ اُس دور کو جلد ہی جھٹک کر میں اپنی راہ پر گامزن ہو گیا۔

مغرب کی تقلید میں ANTI-STORY اور "جدیدیت" کی جو تحریک چلی تھی بلکہ چل رہی ہے اس کی رو میں جوگندر پال جیسے کئی ذہین ادیب بھی بہہ گئے۔ لیکن میں بغیر پلاٹ کی کہانی نہیں لکھ سکتا۔ افسانہ جو افسانہ نہیں اسے افسانہ کہہ کر کیوں متعارف کرایا جائے۔ اُسے کوئی اور نام کیوں نہ دیا جائے؟

میں طبعاً کم آمیز ہوں۔ کسی ادبی کلک میں بھی شامل نہیں اس لئے میرے مقدر میں شہرت کا خانہ ابھی تک پر نہیں ہوا لیکن یقین ہے کہ میرا لکھا بے کار نہیں جائے گا اور میری تخلیقات کسی روز اپنا مقام بنا لیں گی۔



جوگندر پال

"......... ادب کے باب میں ہم بڑھ چڑھ کر باتیں تو کر لیتے ہیں لیکن جو ادیب ادب کو محض مشغلہ بنانے کے بجائے اسے اپنے ایمان کی طرح برتتے ہیں ہم ان کے ایمان کی تقویت کا سامان نہیں کرتے ...."

پہلے غریب اپنی غریبی کو اس خوف سے خوب ڈھانپ کر رکھتا تھا کہ کہیں بے آبرو ہو کر نہ رہ جائے مگر آج یہ ہے کہ امرا بھی غریبی کو ڈریس اَپ کر کے اپنے ڈرائنگ روم میں سجا کر بٹھائے رکھتے ہیں اور اپنے ہر ملاقاتی سے اسے بڑے فخر سے متعارف کرواتے ہیں کہ اس طرح انہیں عوامی لیڈر بننے میں مدد ملے گی اور انکم ٹیکس والوں سے نمٹنا بھی آسان ہو جائے گا۔

میرے والدین کو اپنے افلاس کا بڑا مجرمانہ احساس تھا۔ بے چارے ہر دم بے سبب شرمندہ سے رہتے اور اپنی مالی بدحالی کو گھر کی ٹوٹی پھوٹی چار دیواری سے باہر نہ آنے دیتے، کہ اس عالم میں ایک آبرو بھی نہ رہی تو جیتے جی مر جانے کے لیے باقی رہ ہی کیا جائے گا۔

اپنی ماں کے پاگل پیار اور محبت سے میں خوب موٹا تازہ نکل آیا تھا اور گنڈا سنگھ ہائی اسکول کی پانچویں یا چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا اور میری اسکول فیس معاف تھی۔ ہفتے میں دو بار ان غریب بچوں کے لئے کہیں سے دودھ کا ایک کین آیا کرتا تھا جن کی فیس معاف تھی۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ دودھ کا کین اسکول میں پہنچتے ہی میں اپنی کلاس سے غائب ہو جاتا، اور کبھی پکڑ لیا جاتا تو ہم جماعتوں کے تمسخر اڑانے سے پہلے ہی اپنے ڈر سے بے وزن ہو کر ہوا میں ہچکولے کھانے لگتا۔ "وہ دیکھو! ۔ وہ موٹا جگندر بھی لائن میں دودھ پینے جا رہا ہے۔"

پھر پانچ چھ سال بعد کا ذکر ہے کہ ایک بار سیالکوٹ کے شدید سرما کے آغاز میں میرے پاس کوئی اونی کپڑا نہ تھا۔ سردی کا اتنا ڈر نہ تھا جتنا یہ، کہ کالج کے ساتھی تحقیر سے پیش آئیں گے۔ اس گتھی کو اس طرح سلجھایا کہ بہ سرِ محفل کھدر پہن کر ہی بتا دوں گا؛ درجان پہچان والوں سے کہوں گا کہ آئندہ گاندھی کا ہر فرمان بجا لانے کی ٹھان لی ہے۔ اب یا تو کھدر پہنوں گا یا اپنی کھال۔

کوئی طفلانہ عشق؟ — ان بیسیوں گئے گزرے کے سب بڑے معتبر اور — جی ہی جی میں! جو چہرہ بھا جاتا، جی ہی جی میں اُسے پاس بٹھا کے اس سے دل بھر کر محبت کر لیتا — چلو، چھٹی ہوئی، میں نے کیا ہی کیا ہے جو مجھے کوئی قصوروار ٹھہرائے گا۔

ایک بار کسی لڑکی نے سچ مچ میری طرف محبت سے بڑھنا چاہا، ذرا سا بڑھی بھی، مگر میں سرپٹ بھاگ نکلا۔ شہر کے لوگوں کو پتہ چل گیا تو وہ کیا سوچیں گے؟ باپ پتھر کوٹ کوٹ کر پڑھا رہا ہے۔ کسی نے شکایت کر دی تو اس کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔

مجھے الم غلم کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ پڑھتے پڑھتے لکھنا بھی شروع کر دیا۔ پہلی کہانی مرے کالج، سیالکوٹ کے میگزین میں چھپی تو پرچہ کئی دن اِدھر اُدھر اٹھائے پھرا۔ جو بھی ملتا اُسے بہانے بہانے سے اپنی کہانی دکھاتا۔ معمولی کہانی تھی لیکن اسٹوڈنٹ ایڈیٹر نے اپنے ایڈیٹوریل میں اس کی بہت تعریف کی تھی۔ بعد میں میں نے دیکھا کہ اپنی یہ رائے پیش کرنے کے لئے اُس نے پورے جملے کسی ادبی رسالے سے اٹھائے تھے۔ آئندہ کسی شمارے کا مدیر میرا دوست رفیق محمود تھا۔ اُس نے اپنے اداریہ میں یہ لکھ کر میری ایک اور کہانی شائع کی کہ جوگندر پال ہمارے کالج کا جانسن ہے۔ رفیق شاید ڈاکٹر جانسن کو نفسیاتی افسانہ نگار سمجھے ہوئے تھا۔ میں نے سوچا وہ اگر مجھے سارے کالج کا واحد جانسن سمجھتا ہے تو ٹھیک ہی سمجھتا ہے، اور ہمارے میگزین کے پروفیسر انچارج نے سوچا ہوگا کہ ہمارا رفیق اتنا ہونہار ہے، وہ جو سوچتا ہے، آخر سوچ کر ہی سوچتا ہے۔

میں نے ۱۹۴۵ء میں بی اے پاس کر لیا تھا۔ مولانا شاہد احمد دہلوی نے میری پہلی کہانی "تیاگ سے پہلے" اسی دوران "ساقی" میں چھاپی۔

بی ۔ اے میں تھرڈ کلاس میں آنے کا اتنا قلق نہ ہوا جتنی کہانی چھپنے کی خوشی ہوئی ۔ سید جابر علی، کرشن موہن، محمد خاں (م ۔ خ ۔ ساحری) اور میں ان دنوں سیالکوٹ کے قلعہ کے کسی لان میں بیٹھ کر اپنے محبوب ادیبوں اور شاعروں کے فن کے بارے میں گھنٹوں بحث کیا کرتے تھے ۔ کئی بار وحید قریشی بھی ہماری ان محفلوں میں شریک ہوا ۔ رفیق محمود بھی کبھی کبھی سیالکوٹ چھاؤنی سے آجاتا ۔ وہ اُس وقت "اُردو بولو، اُردو لکھو، اردو پڑھو تحریک" کا ایک سرگرم کارکن تھا اور منہ سے جھاگ چھوڑ چھوڑ کر اتنے غصیلے انداز میں بلند بانگ اُردو بولتا تھا کہ سننے والا بے چارہ دبک کر ایک طرف بیٹھ جاتا کہ اب وہ کیا بولے ۔

"اُردو" رفیق اس سے للکار کر کہتا ۔ "اگر منہ کھولنا ہی ہے تو صرف اردو بولنے کے لئے کھولو، نہیں تو چپ چاپ بیٹھے رہو ۔"

ایک دفعہ سید جابر علی نے اورینٹل کالج، لاہور میں داخلہ لینے اور اس ضمن میں مولانا صلاح الدین احمد سے مشورہ کرنے کے لئے لاہور جانا تھا ۔ مجھے بھی مولانا سے ملنے کی بڑی تمنا تھی ۔ چپکے سے اپنی کوئی کہانی جیب میں ٹھونس کر میں کلرک شپ سے اس کے ساتھ ہولیا ۔ لاہور میں جابر تو مولانا کے ساتھ فر فر باتیں کرتا رہا اور میں ایک کونے میں بیٹھ کر اُن دونوں کو سُنتا رہا ۔۔۔ نہیں، سن نہیں رہا تھا، مولانا سے باتیں کرنے کے لئے ذہن میں مناسب جملے بنا رہا تھا ۔ ان کے دفتر میں داخل ہو کر شاید بوکھلاہٹ میں سلام کہنا بھی بھول گیا تھا اور اُن کی طرف دیکھتے ہوئے بولنے کی بے چین خواہش سے خاموشی سے بیٹھ گیا تھا ۔ طے کر کے آیا تھا کہ مولانا سے کہانیوں کے بارے میں تفصیل سے باتیں کروں گا اور لوٹنے سے پہلے بڑے ادب سے "ادبی دنیا" کے لئے اپنی کہانی کا مسودہ پیش کروں گا اور وہ اسے میرے سامنے پڑھ کر، متاثر ہو کر میری طرف بڑی محبت اور توصیف سے دیکھیں گے ۔ مگر ہوا یہ، کہ اُن سے بات کرنے کی جسارت ہوئی نہ مسودہ پیش کرنے کی ۔ ایک دو بار من میں آیا کہ جابر اور مولانا کو ٹوک کر مولانا کی طرف اپنا مسودہ بڑھا دوں، لیکن ایسے کرنا بے ڈھب سا لگا اور اُن کی باتیں ختم ہونے پر آداب عرض کر کے جابر کے ساتھ باہر ہولیا، مانو اُن کے سامنے یہی لفظ ادا کرنے کے لئے سیالکوٹ سے لاہور تک سفر کیا تھا ۔

کالج کی پڑھائی کے دوران چھٹیوں میں کوئی چھوٹا موٹا کام ڈھونڈ لیتا تھا، مثلاً روز کی اجرت پر ملٹری ڈپو میں کلرکی، سپاہیوں کو رومن اُردو پڑھانے کا کام یا پھر کسی اسپورٹس کمپنی کا ایجنٹ بن کے سفر پر نکل جاتا تھا ۔ بی ۔ اے کے بعد ایک سال ملٹری اکاؤنٹس میں کلرک بن کے رہا اور پھر کسی بہتر کام کی توقع سے یہاں سے چھوڑ کر اپنے ماموں کے پاس امرتسر چلا گیا اور وہاں بھی پاؤں نہ ٹکے تو تھک ہار کر سیالکوٹ لوٹ کر ایم ۔ اے (انگریزی) میں داخلہ لے لیا ۔ بھائیا جی اب اکثر بیمار رہنے لگے تھے ۔ ماں مایوسیوں میں غوطے کھا کھا کے ہمت کر کے پھر سطح پر آجاتی کہ ہمارا بیٹا اب جوان ہو گیا ہے، اب ہمیں کیا فکر ؟ ۔۔۔ میری چھوٹی بہن درشناں اپنے ویر کو اتنی فخر مندی سے دیکھتی کہ ویر کو اپنی بے بسی پر اور جھلاہٹ محسوس ہوتی ۔ یہ حالات ہوں تو کوئی کتابیں پڑھے یا انہیں پھاڑ دے ؟

اگست ۱۹۴۷ء میں جب برصغیر تقسیم ہو گیا تو بہتوں کے مانند ہمارا ردعمل بھی یہی تھا کہ ہم سیالکوٹ میں ہی رہیں گے ۔ وہاں ہماری کوئی جائداد نہ تھی، آمدنی کے وسائل بھی خطرناک حد تک محدود تھے ۔ پر بدستور وہیں رہنے، اُنہی گلیوں، اپنی ساری یادوں کے انہی مقامات کی باشندگی کا خیال ہمیں عین فطری معلوم ہوتا تھا لیکن اُس طوفان میں ہماری چھوٹی سی کشتی بھی الٹ گئی اور ہمیں ہوش آیا تو ہم مشرقی پنجاب میں انبالہ کے ریلوے اسٹیشن پر پڑے تھے ۔ میں نے "کچھوا" اور "لوٹی چھوٹی کہانی" میں بھی قتل و خون کی یہ واردات بیان کی ہوئی ہے ۔ سارے پنجاب میں جا بجا لاشوں کے انبار ۔ ان ہزاروں لاکھوں لاشوں کے کمین، ہندو، مسلمان اور سکھ آس پاس کے خونیں منظر کی "تاب نہ لا کر نیا

سر و سامان، گھر بار، خون میں لت پت اپنے بدن بھی وہیں کے وہیں چھوڑ کر نامعلوم کہاں بھاگ گئے تھے۔ میری ماں کہاں ہے؟ بہن کہاں ہے؟ — بیوی؟ — بیٹا؟ — بھائی؟ — آؤ انسانی وجود کے کٹے ہوئے اعضا کو جوڑ جوڑ کر ان کی پھر سالم شکلیں بنائیں۔ یہ ناک نہ جانے کسی ہندو کی ہے یا مسلمان کی — یہ بازو شاید کسی سکھ کا ہے؟ ہاں، ہاں، سارا جسم جوڑتے جاؤ۔ جو اعضا جہاں بھی جڑتے ہیں، انہیں جوڑ دو اور جوڑ کر انسان کی پوری شکل پھر سے بناؤ — اور — اور پھر کسی طرح اس شکل میں جان ڈال دو اور اسے بھرپور گویائی عطا کرو تاکہ یہ اپنی گھٹی حیات پر در آوازسے بھی لٹنے والوں کو مخاطب کر کے سوال کرے کہ بھلا کیوں اسے کیوں لڑوا رہے ہو۔ تم سب کا دعویٰ ہے کہ اپنے اپنے خدا کے لئے لڑ رہے ہو۔ اگر تمہارا دعویٰ صحیح ہے تو ذرا سوچو، کون کس سے لڑ رہا ہے؟ —

ہم انبالہ میں رہائش پذیر ہو گئے۔ بھائیاجی نے اپنے ایک پرانے دوست کی مدد سے یہاں ڈیری کی ایک دکان کھول لی۔ میرا معمول تھا کہ نصف شب کے دو تین ساعت بعد میں دو اور لڑکوں کو لے کے بیس پچیس کیلومیٹر کے فاصلے پر ایک گاؤں میں جاتا اور وہاں سے ہم تینوں اپنی اپنی سائیکل پہ پندرہ کیلو کے دو دو کین لاد کر سات بجے صبح تک دکان پر لوٹ آتے۔ چند ماہ میں ہی ہماری دکان کا کام اتنا چمک اٹھا کہ نو من دودھ کی روزانہ نکاسی ہونے لگی۔ اپنی اس عرصہ کی صحت کا خیال آتا ہے تو آج بھی رگیں ویسی ہی توانائی کے احساس سے پھول جاتی ہیں اور کوئی غلط بات سن کر نہایت تہذیب سے مسکرا مسکرا کر بات کرنے والے سے گتھم گتھا ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔

زندگی کے اسی موڑ پر میری ملاقات اپنی ہونے والی بیوی سے ہوئی۔ وہ ایسٹ افریقہ کے ایک نو دولتیے پنجابی خاندان میں پل کر اونچی ہوئی تھی۔ ہمارے رہنے سہنے کا انداز اس کے لئے تعجب خیز تھا۔ "آپ کے یہاں مکھیوں اور کیڑوں مکوڑوں کے اتنے ڈھیر کیوں ہیں؟"

"جہاں آدمی بھی کیڑے مکوڑے ہوں وہاں مکھیاں اور کیڑے مکوڑے اور انسان گھل مل کر کیوں نہ رہیں؟ — لیجئے، یہ دودھ پی لیجئے، گھبرائیے نہیں، آپ کے لئے اسے خوب ابال لیا گیا ہے۔"

۱۹۴۸ء میں ہماری شادی کے چند ہی روز بعد میرے بیمار بھائیاجی چل بسے۔ دراصل پاکستان سے روانگی کے وقت سے ہی وہ اندر ہی اندر بجھتے جا رہے تھے۔ اجتماعی زندگی میں اس قدر ابتری ہو تو شخصی زندگی میں بھی سب کچھ تیز تیز کئے بنا بن نہیں پڑتی۔ بھائیاجی کی موت کے ایک ڈیڑھ ماہ کے اندر ہی میری چھوٹی بہن درشان کی شادی ہو گئی۔ میں اور میری بیوی ماں کو ساتھ لے کے کینیا کو روانہ ہونے کے لئے بمبئی آ گئے۔ میرا پہلی بار سمندر دیکھنا ہوا تھا۔ لگ رہا تھا کہ اپنی درشان کو بھیتر کہیں کھو کے دھرتی کے اس کنارے پر میں آپ ہی پانی پانی ہو کر سمندر بن گیا ہوں اور اس کنارے پر جا لگا ہوں جہاں میری بیوی مجھے اور میری ماں کو لئے جا رہی ہے۔

کینیا کے ہندوستانیوں اور انگریزوں نے وہیں اپنا اپنا ایک چھوٹا سا ہندوستان اور انگلستان بنا رکھا تھا اور افریقیوں کے بارے میں اتنا ہی جانتے تھے جتنا ہاؤس بوائے یا مالی کا کام لینے کے لئے انہیں جاننا ضروری ہو۔ انگریز قانون بناتے تھے اور اپنے قوانین کی مدد سے کینیا وائیٹ ہائی لینڈز پر قابض تھے۔ ہندوستانیوں نے اپنی چرب زبانی اور چالاکی کی بدولت تجارت سنبھال رکھی تھی اور غریب افریقی بہتر دنوں کی تاک میں لگے ہوئے تھے اور اپنی آزادی کے لئے جیسے بھی ان سے ہو پا رہا تھا برسرِ پیکار تھے۔

ہندوستانیوں اور انگریزوں کی پرائیویٹ اور پبلک پارٹیوں میں عام طور پر موٹی آمدنیوں، کاروں کے لیٹیسٹ ڈیزائنوں، نئے فراکوں، خوبصورت عورتوں اور ــــ افریقیوں کے وحشی پن کا ذکر ہوتا تھا جس سے ان کی گرینڈیور کی عیاشی، اور خود فریبی کے مضحکہ خیز امتزاج کی تصویر کشی ہوتی تھی۔ افریقی کھلے بندوں ان لوگوں سے نفرت کرتے تھے۔ میری ایک کہانی "معجزہ" میں افریقیوں کی نفرت کا بیان کچھ اس طرح ہے کہ وکٹوریہ جھیل کی سطح زمینی ہے اور نیچے میلوں گہرا پانی ہے اور اس جھیل پر چلنے سے زمین پیروں کے نیچے ڈولتی ہے۔

"تعجب ہے، جھیل کی زمین ہمارے پیروں کے نیچے ڈولتی ہے۔" ایک ہندوستانی پکنکر نے ایک افریقی سے جوش آگیں مسرت سے کہا۔

"مجھے تو اس بات پر تعجب ہے۔" افریقی نے جواب دیا۔ "کہ آپ کے پیروں کے نیچے یہی ٹکڑا کیوں ڈولتا ہے، سارا افریقہ کیوں نہیں ڈولتا ہے۔"

میں نے افریقہ میں چودہ برس اس انتظار میں ہی کاٹ دیئے کہ یہاں سے چھوڑ چھاڑ کر ہندوستان کب لوٹنا ہوگا۔ دو چار بار چھٹی پر دیس لوٹ کر ارادہ بھی کیا کہ اب واپس نہ جاؤں۔ مگر اس اثناء میں ضرورتوں کو اتنا بڑھا لیا تھا کہ دیس سے دور رہ کر ہی اُن سے پیار کئے جانا ممکن معلوم ہوتا تھا۔ جلاوطنی کی قانونی سزا آج شاید اس لیئے نہیں دی جاتی کہ ضرورتوں سے بندھے ہوئے لاکھوں لوگ آپ ہی اپنے آپ کو عمر بھر کے لئے جلاوطن کر دیتے ہیں۔

میں نے بھی چودہ سال گویا پڑھنے کی کوفت سے بچنے کے لئے وہاں پڑھا پڑھا کر گزار دیئے اور بالآخر ۱۹۶۳ء میں اپنی نیم الذہنی سے جھلا کر کام سے استعفیٰ دے کر فیملی سمیت ہندوستان لوٹ آیا، اس معصوم سی خواہش سے کہ اب فل ٹائم رائٹنگ کی زندگی بتانے کی تدبیر کروں گا۔ لیکن یہاں چند ہی ہفتوں کے قیام کے بعد ڈر لگنے لگا کہ میرے بچکانہ ارادوں سے کہیں میرے بچوں کی زندگیاں تلف نہ ہو جائیں جس سماج میں 'لکھنا' آسودہ حال اور بیکار متوسط الذہنوں کا بے ضرر مشغلہ سمجھا جاتا ہو یا اہلِ کار کی 'غلطتوں' کا ایک پارٹ ٹائم حیلہ، وہاں اچھے ادب کی تخلیق میں بھرپور شرکت سوئی سائڈ سکوینڈ والوں کے کام سے کم نہیں۔ میری بزدلی نے مجھے خبردار کیا اور میں چپکے سے کوئی مناسب نوکری دوکری ڈھونڈنے میں جُٹ گیا۔

'صبا' کے سلیمان اریب مرحوم کی دعوت پر حیدر آباد دکن ہو آیا کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں لیکچرار ہو جاؤں گا مگر وہاں دو ڈھائی ماہ کے قیام کے بعد پتہ چلا کہ میری درخواست پر غور نہیں کیا جا سکتا کیونکہ میں نے پہلی ڈگری تھرڈ کلاس میں حاصل کی ہے۔ اسے ایک خوشگوار ا ... کہہ لیجئے کہ عین انہی دنوں اورنگ آباد دکن کی ایس۔ بی ایجوکیشن کے چیئرمین شری گووند بھائی شراف کسی کی سفارش پر مجھ سے ... اور کچھ اس طرح کام کی پیش کش کی گویا انہیں اندیشہ ہو کہ میں 'نہ' کہہ دوں گا۔ میں انہیں خدا کا ایلچی سمجھ کر بلا تامل اُن کے ساتھ اورنگ آباد چلا آیا۔

اورنگ آباد دکن بڑا پُرسکون شہر ہے۔ بمبئی کے ایک اربن دوست نے مذاقاً کہا کہ وہاں تو قبریں ہی قبریں ہیں۔ وہاں کیوں کر رہو گے؟ میں نے اسے جواب دیا کہ کوئی بات نہیں، قیامت کے روز وہاں بڑی چہل پہل ہوگی۔ اس وقت آپ کا بمبئی اجاڑ دکھے گا۔ مگر اورنگ آباد دکن ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے چند سال میں بڑی پیاری بھیڑ بھاڑ کا منظر پیش کرنے لگا۔ درویشوں کے اسی شہر میں بس کر میں نے اپنے افسانوی مجموعوں "رسائی"۔ "لیکن"۔ اور "بے محاورہ" کی ساری کہانیاں لکھیں، یہیں اپنے دو ناولٹ "بیانات" اور "آمد و رفت" قلمبند کئے، یہیں میرے بچوں کی تعلیم و تربیت کے اسباب

ہوئے، مجھے گھر نصیب ہوا، قاضی سلیم، بشر نواز، نفضیل، صفی، صادق، عتیق اللہ، عصمت جاوید، شمیم احمد، قمر اقبال، حمید سہروردی اور رجا ویدہ جیسے ہم قلم دوست نصیب ہوئے، یعقوب عثمانی کی شفقتیں میرے حصے میں آئیں، محض ایک پیشہ در ہونے کے باوجود اپنے کالج اسٹاف اور اسٹوڈنٹس کی ذاتی محبتوں سے میں مالامال ہوا۔ اورنگ آباد دکن نے میرے دلیس میں مجھے پناہ دی، ورنہ یہاں آنے سے پہلے دلّی اور حیدرآباد کے مایوس کن تجربات سے گھبرا کر سوچنے لگا تھا کہ کینیا میں چین نہ آنے پر یہاں چلا آیا ہوں، مگر کہیں کے بھی بے چین ہوں، اب کدھر جاؤں؟ ——

اورنگ آباد کی مدتِ اقامت میں کئی بار ایلورہ کے غار دیکھنے گیا اور ہر بار اُن پراچین اور جاندار مورتیوں کی بستیوں میں یہی معلوم ہوا کہ میں مورت سا بنا اُن قدیم ذی نفسوں کے درمیان کہیں نصب ہوں اور میں اُنہیں نہیں دیکھ رہا ہوں بلکہ وہ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ اس تاثر کے تناؤ سے "مٹی کا ادراک" اور "پیچھے" لکھ کر مجھے نجات ملی۔

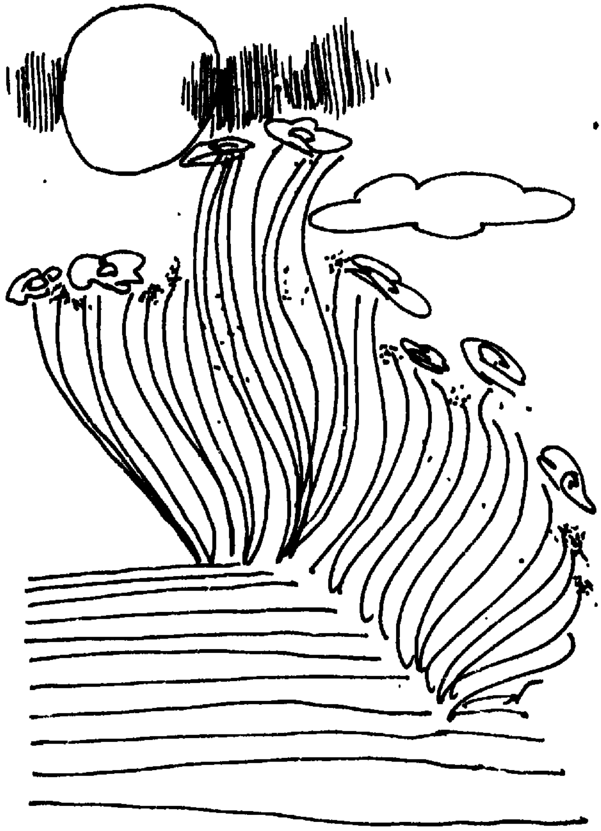
اورنگ آباد میں بڑے مزے سے کٹ رہی تھی لیکن شاید میں نے اورنگ آباد کے کام سے اسی لیے استعفیٰ دے دیا کہ اتنے مزے سے کیوں کٹ رہی ہے۔ میں نے اپنے آپ کو اپنے سے کیے ہوئے وہ سارے وعدے یاد کروائے: تم تو کہا کرتے تھے کہ کبھی نہ کبھی ضرور اپنا سارا وقت ادب کی تخلیق میں صرف کرو گے۔ کیا یہ ذمہ داری ریٹائرمنٹ کے دنوں تک التوا میں ڈالتے رہو گے۔؟ جب تمہاری ساری قوتیں زائل ہو چکی ہوں گی تو کیا اور کیونکر لکھو گے؟ کہیں اپنی آسودگی کے غلام ہو کر تو نہیں رہ گئے ہو؟ —— نہیں، تو پھر کود کیوں نہیں جاتے؟ —— تمہاری کہانیاں تمہارا نام اپنے ماتھوں پر بندیا کے مانند لگائے پھرتی ہیں مگر تم اپنے چہرے میں آپ ہی آپ نظر آ کے اِتراتے پھرتے ہو؟ —— اُن ساری کہانیوں کا کیا ہوگا جنہیں ابھی تم نے لکھنا ہے اور جو تمہاری فرصتوں کے انتظار میں کلبلا کلبلا کر دم توڑ رہی ہیں۔ میں شاید اپنے آپ کو اور ٹالتا جاتا مگر جب سارے چور پکڑ لیے جائیں تو سولی پر چڑھنے کے خیال سے راحت ہونے لگتی ہے۔

اس سال کے اوائل سے دلّی میں رہ رہا ہوں اور پیشہ وری سے نجات پا کے اپنے آپ کو کام کے لیے آزاد چھوڑ دیا ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ احباب کے اس سوال کا کیا جواب دوں، کہ کہانیاں تو لکھتے ہو مگر کرتے کیا ہو؟—— اور بخدا چوبیس گھنٹے اس رقصاں کیفیت میں یہی لگتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں کر رہا ہوں، جو کچھ ہو رہا ہے وہ اپنے آپ ہو رہا ہے۔

شروع شروع میں میرے کہانیاں لکھنے کے عمل میں میری یہ نوعمر خواہش کارفرما ہوتی تھی کہ اس طرح میں خود ایک کہانی بن جاؤں گا، مگر آج کہانیاں مجھ پر کچھ یوں مسلط ہو گئی ہیں کہ اپنے آپ کو آزادانہ لکھواتی ہیں۔ میں اپنی کہانیوں میں بس اتنا ہی موجود ہوتا ہوں کہ انہی میں غائب ہوتا رہوں، کہ جو کچھ بھی نظر آتا جائے، وہی بنتا چلا جاؤں۔ اپنی حیات میں مجھے سب کچھ نظر آنے سے رہا، لیکن مجھے یقین ہے کہ میرے نادیدہ نظاروں کو پیش کرنے، وہی نظارے بن جانے کے لیے میرے بعد آنے والوں کو آتے چلے جانا ہے۔ میرے پیش روؤں کی ناکامی نے میری پرورش میں ہاتھ بٹایا ہے، میری ناکامی میرے بعد آنے والوں کی پرورش کے اسباب کرے گی۔

اس امر سے میں کئی بار رنجیدہ ہو جاتا ہوں کہ ادب کے باب میں ہم بڑھ چڑھ کر باتیں تو کر لیتے ہیں لیکن جو ادیب ادب کو محض مشغلہ بنانے کی بجائے اسے اپنے ایمان کی طرح برتتے ہیں، ہم اُن کے ایمان کی تقویت کا سامان نہیں کرتے، یہی نہیں بلکہ ہم ایسا

سماں باندھ دیتے ہیں جس میں ثانوی ادیبوں کا اپنے مجلسی جاہ و منصب کے باعث اوّلین ادیبوں کے آگے کھڑا ہو جانا میں فطری معلوم ہو۔ اہلِ دنیا بڑے چالاک سہی مگر معاملہ دین کا ہو تو ہمیں اہلِ دین سے ہی رجوع کرنا چاہیئے۔





رتن سنگھ

"...... میں تو یہ بھی کہتا ہوں کہ ہزاروں لاکھوں سالوں تک انسانوں کی مخلوق ان سیاست دانوں کے شکنجے میں جکڑی رہی۔ کبھی یہ تلوار کی طاقت پر بادشاہ بن گئے اور کبھی ووٹ لے کر نیتا۔ کیوں نہ عنانِ حکومت ان سیاست دانوں کے ہاتھوں سے چھین کر قلم کاروں، مفکروں، کاریگروں کسانوں اور مزدوروں کے ہاتھوں میں دے دی جائے ــــــ؟......"

ویسے تو میں سوچتا ہوں۔ آپ بیتی کا لکھنا کیا ؟ جو بیت گئی سو بیت گئی۔

اور پھر پرانے زخموں کو چھیلنے سے حاصل کیا ہوگا ؟ سوئے ہوئے درد جاگ اٹھیں گے۔ جسم شکایت کریگا کہ نئے زخم کیا کم ہیں جو دبی چنگاریوں کو ہوا دے رہے ہو۔ روح تڑپے گی سو الگ۔ لیکن جب لکھنا ہی ہے تو شروع کرتا ہوں۔

"جب نال کاٹ کر مجھے ماں سے الگ کیا گیا تھا تو مجھے ایسا لگا جیسے ماں سے میرا رشتہ کٹ گیا ہے۔ تب مجھے بہت درد ہوا تھا۔ ...."

"پیدل چلتا ہوا میرا ہر قدم زمین کے ساتھ رشتہ جوڑنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فوراً ہی رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اور جواب میں ملتی ہے گرد .. درد ... ؟"

" یہ دو جملے میری کہانی کے اقتباسات بھی ہیں اور میری آپ بیتی بھی۔ رشتے ٹوٹنے کا جو درد مجھے پیدا ہونے ہی ملا تھا، گھنگھور گھٹا بن کر میرے وجود کے آکاش پر چھایا ہوا ہے۔ اِن بادلوں سے ہر وقت آنسوؤں کی بوچھار ہوتی رہتی ہے اور میں اندر سے بھیگتا رہتا ہوں۔ یہ بادل آپس میں ٹکراتے ہیں تو بجلیاں کڑکتی ہیں، کوندتی ہیں، گرتی ہیں اور میں اندر ہی اندر ٹوٹتا رہتا ہوں، سمٹتا رہتا ہوں، مرتا رہتا ہوں۔

اختصار میں تو حضور بات اتنی سی ہے جو لکھ دی گئی۔

یوں اگر آپ تفصیلات سے بھی آگاہی چاہتے ہیں کہ شمع کے روشن ہونے پر پروانے پر کیا گزری تو بات دیگر ہے۔

میری زندگی کی شمع دریائے راوی کے کنارے بسے ہوئے ایک گاؤں داؤد میں طلوع ہوئی تھی۔ کیا گاؤں تھا صاحب ؟ ایک دنیا آباد تھی اس میں۔ بلکہ مکمل کائنات، اس گاؤں میں چوہدری خان محمد رہتا تھا۔ خان محمد جو میرے چہرے کے نقوش میں اپنے جوانی کے دوست مرحوم نرنجن سنگھ کا چہرہ تلاش کیا کرتا تھا جو میرے بابا ہوتے تھے، اور ایسا کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک آتے تھے۔ اس گاؤں میں مولوی برکت علی رہتا تھا جو اگست ۱۹۴۷ء میں میرے اسٹیشن پہونچنے کے راستے پر بم پھٹ جانے کی وجہ سے جب مجھے دیر ہوگئی تو لاہور کے پلیٹ فارموں پر میری تلاش میں پاگلوں کی طرح دوڑتا تھا اور اس کی زبان پر یہی کلمہ تھا کہ اگر رتی (میرا گھر کا نام) کو کچھ ہوگیا تو میں اس کے باپ پرتاپ سنگھ کو کیا جواب دوں گا؟ اُسی گاؤں میں میرے بڑے بھائی کا دوست فیض، رہتا تھا فیض جو فسادات کے دنوں میں ہمارے گھر کے دروازے پر دیوار بن کر کھڑا ہوگیا تھا تاکہ کوئی سرپھرا ہماری طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکے۔

اُس گاؤں میں میرا دوست ....

محبت کی داستان بڑی لمبی ہے۔ دوستو۔ جس کا سلسلہ میرے بابا نہیں بلکہ پڑدادے سے شروع ہوتا ہے۔ اور میرا پڑدادا تو آپ جانتے ہی ہیں کہ کون تھا ـــ حضرت آدم۔

یہ تھا وہ گاؤں جس میں، میں نے آنکھیں کھولی تھیں۔ یہ تھا وہ ماحول جس نے مجھے پیار و محبت کا درس دیا تھا۔ اِس ماحول میں رہتے تھے۔ بابا بنو، بابا ماکھے خاں۔ بابا جھنڈے شاہ، دُلا ترکھان، رحمت لوہار، سردجان دائی، بی بی بخشاں ... نہیں نہیں۔ اِن کے نام یہ نہیں تھے۔ ان کے اصلی نام تھے۔ لالہ محبت رام، سردار محبت سنگھ یا پھر مولوی محبت دین، یا محبت بی بی اور محبت بے بے۔ جس دن اِن سب کا قتل ہوا تھا، اسی

نہ صرف راوی ہی نہیں پنجاب کے پانچوں دریا ان کے خون سے لال ہو گئے تھے۔ گنگا اور جمنا لال ہو گئی تھیں۔ بحرِ ہند اور بحرِ عرب لال ہو گئے تھے۔ کوئی اگر یہ کہے کہ یہ تو محبت رام، محبت سنگھ یا محبت دین کی آپ بیتی ہے تو میں کہتا ہوں کہ جو میرے عہد کے انسانوں پر بیتی، وہ میری آپ بیتی ہے۔ جو میرے ملک دھرتی پر گزری وہ مجھ پر بیتی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ سیاست دان جو اس تقسیم کے لئے ذمے دار تھے وہ اب بھی سمندر کے کنارے بیٹھے اپنے ہاتھوں سے ان لاکھوں کروڑوں محبت دینوں، محبت راموں اور محبت سنگھوں کے خون کو اتار رہے ہیں۔ لیکن سات سمندروں کا پانی ان کے ہاتھوں سے یہ خون کے دھبے مٹانے سے قاصر ہے۔

میں تو یہ بھی کہتا ہوں کہ ہزاروں لاکھوں سالوں تک انسانوں کی مخلوق، ان سیاست دانوں کے شکنجے میں جکڑی رہی۔ کبھی یہ تلوار کی طاقت پر بادشاہ بن گئے اور کبھی ووٹ لے کر نیتا۔ کیوں نہ عنانِ حکومت ان سیاست دانوں کے ہاتھوں سے چھین کر قلم کاروں، فنکاروں، کاریگروں، کسانوں اور مزدوروں کے ہاتھوں میں دے دی جائے جو اپنے دلوں میں انسانیت کا سچا درد رکھتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں میرے عہد کا بادشاہ سعادت حسن منٹو کو چنا جانا چاہئے تھا جس کا پاگل ٹوبہ ٹیک سنگھ واہگہ کی سرحد پر کھڑا آج بھی سیاست دانوں کو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ تمہارا تقسیم کا فیصلہ محض پاگل پن کی حرکت تھی اور کچھ نہیں۔ میں تو کہتا ہوں آج کی عنانِ حکومت کیوں نہ امرتا پریتم کو بخش دی جائے جس نے خون کی آندھی سے انسانیت کو بچانے کے لئے وارث شاہ کی روح کو پکارا تھا کہ وہ کتابِ عشق کا کوئی اگلا ورق لکھے۔ اس لئے دور کے مؤرخ کو چاہئے کہ وہ اس عہد کو کرشن چندر، یشپال، راجندر سنگھ بیدی، رام لعل اور ان تمام قلمکاروں کے نام سے منسوب کرے، جن کے قلم نے اس تاریخ پر لہو کے آنسو بہائے ہیں۔

جس وقت میں راوی کے خون میں نہایا ہوا ہندوستان سے ہندوستان آیا تھا اس وقت میری عمر سترہ سال تھی (سرٹیفکیٹ کے مطابق ۱۹ سال) جب میں ہندوستان سے ہندوستان آنے کی بات کرتا ہوں تو کسی کے سیاسی جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے۔ اس کا مطلب کوئی ہرگز یہ نہ لے کہ دونوں ملکوں کے سیاسی وجود سے انکاری ہوں۔ ہاں تو جس وقت میری عمر سترہ سال تھی اس وقت میں خون میں نہایا ہوا ہندوستان سے ہندوستان آیا تھا۔ اور آتے وقت میرے سر پر اٹھائی ہوئی گٹھڑی میں بندھا ہوا تھا میرے اپنے مکان کا ایک کمرہ جو بچپن سے میرے لئے پناہ گاہ کا کام کرتا تھا۔ اس میں بندھا ہوا تھا وہ آم کا پیڑ جس کی شاخ پر بیٹھ کر بلکہ لیٹ کر میں نے آئندہ آنے والی زندگی کے خواب بُنے تھے، اس گٹھڑی میں زمین کا وہ ٹکڑا بھی رکھا تھا جس پر کبھی مجھے بچھو نے کاٹا تھا۔ اُس میں میں نے اپنے رہٹ کے اس ردلو کو بھی رکھ لیا تھا جس میں میں ننگا نہایا کرتا تھا۔

اور ..... اور .....؟

یہ سب سامان مجھے اس لئے اٹھانا پڑا کیوں کہ بچپن سے ہی میرا ان سے بے حد لگاؤ تھا۔ میں بڑا ہی حساس بچہ تھا۔ اور حساس ہوتا کیوں نہ؟ بات پھر وہاں تک جا پہنچی ہے، جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ درد کا پہلا شعوری تجربہ مجھے ڈھائی تین سال کی عمر میں ہی ہو گیا تھا۔ جب میرے ماں باپ مجھے دادی کی نگرانی میں چھوڑ کر میرے بڑے بھائی کو ساتھ لے کر لاہور چلے گئے تھے اور پھر وہاں سے بلوچستان۔ ماں باپ سے رشتہ کٹنے کا یہ درد میرے لئے اتنا بڑا تھا کہ اب بھی اکثر مجھے خیال آتا ہے کہ شاید میں اپنے ماں باپ کی اولاد تھا ہی نہیں۔ اور یہ خیال بچپن سے میرے دل میں اس طرح بیٹھا ہوا ہے کہ کچھ پوچھئے نہیں۔ اس درد میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب سات آٹھ سال کی عمر میں، میں اپنی دادی

کے ساتھ لاہور گیا تو دادی کو پیچھے چھوڑ کر ماں سے ملنے کے اشتیاق میں جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھ کر اس کے پاس پہونچا تو ماں نے مجھے پہچانا تک نہیں. پوچھا۔ کون ہو، کہاں سے آئے ہو؟ ماں سے لپٹنے کے لئے میرے اٹھے ہوئے بازو وہیں کے وہیں گر گئے۔ اور آج بھی گرے ہوئے ہیں۔

اس طرح سے میری شخصیت کو بنانے میں سب سے بڑا ہاتھ میری دادی بلکہ میری دادیوں کا ہے۔ ایک دادی نے محبت کرنا سکھایا۔ وہ تڑکے چار بجے اٹھ کر چکی پیسنی تھی اور پھر رات کے دوسرے پہر میں چرخا کاتنے کے بعد اس کا دن ختم ہوجاتا تھا۔ اور دوسری دادی یعنی چچا کی ماں نے میری آنکھوں کو علم و دانش کی روشنی دی۔ جب ان کی نظر کمزور ہوگئی تو وہ مجھ سے وارث شاہ، قادریار، شاہ محمد، بیلو، دمودر اور پنجاب کے دوسرے قصہ گو شاعروں کا کلام پڑھوا کر سنا کرتی تھی، اور اس طرح سے آٹھ نو سال کی عمر میں ہی میرے خون میں رچ گیا۔ ہیر اور رانجھے کا پیار اور ایثار، خلی کچی پر سوار مرنے کا موت تو موت خود خدا تک کو للکارنے کا حوصلہ، اور میرے خون میں شامل ہوگیا۔ چناب کی لہروں میں ڈوبتی ہوئی سوہنی کا درد اور میرے تصور میں بس گیا اپنے کردار کی پاکیزگی اور بلندی کے ساتھ پورن بھگت جو لونا ن کی ہوس کی آلودگی اور رانی سندراں کے حسن کی آگ سے بچ کر صاف نکل گیا اور اس کے ساتھ ہی وارث شاہ، قادریار اور پنجابی کے دوسرے کلاسیکی شعراء کی فنی عظمت میرا سرمایہ بن گئی۔

اس　سرمائے کو لیکر جب میں ہندوستان پہونچا تو مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کبھی کہانیاں لکھوں گا۔ ہاں کہانیاں سننے اور پڑھنے کا شوق مجھے بیحد تھا۔ بچپن میں جب دادی نے ہم سب سے پوچھا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد ہم اس کے تعلق سے کیا باتیں کریں گے تو میں نے کہا تھا: یہی کہ تم بہت اچھی کہانیاں سنایا کرتی تھیں: اسی طرح اپنے گھر کے میراثی کی لمبی داستانیں میں راتوں کو جاگ جاگ کر سنا کرتا تھا۔ یا پھر جھنڈے شاہ کے ڈیرے میں سارنگی کی دھنوں کے ساتھ گا گا کر قصے سنانے والوں کی لمبی تانیں جب اوپر اٹھتی تھیں تو میرا لاشعور ان کو سمیٹ سمیٹ کر اپنے وجود میں بھرتا جاتا تھا۔ بغیر جانے کہ یہ درد بھری آوازیں کل میرے کس کام آئیں گی۔

اپنی گٹھری میں یہ سب کچھ رکھے ہوئے ایک اجنبی مسافر کی طرح جب لکھنؤ پہونچا تو میں ایک سادہ لوح دیہاتی سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ دیہاتی بھی ایسا جو ایک دفعہ اپنے سر پر جوتے رکھے ـــــ بھرے ہوئے شہر سے ننگے پاؤں گزرتا ہوا اپنے گھر پہونچ گیا تھا۔ اس لئے میرے لئے لکھنؤ کا ہر فرد عجوبہ تھا۔ میں بیوقوفوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر چیز کو حیران نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔ لگتا تھا جیسے میں کسی دوسری دنیا میں پہونچ گیا ہوں کہانیاں بھلا میں کیا لکھتا۔

پنجابی میں کچھ تک بندی کی تھی۔ جو نیم ادبی رسالوں میں چھپی بھی تھی، کہ ایک دن میرے ریلوے کے دفتر میں جناب رام لعل صاحب دکھائی دیئے۔ میں اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا کہ یہ وہی رام لعل صاحب ہیں جن کی کہانیاں بیسوی صدی میں چھپتی ہیں۔ ان کا کہنا تھا۔ نہیں یہ وہ نہیں ہو سکتے۔ یہ صرف رام لعل ہیں اللہ جو بیسویں صدی میں چھپتے ہیں وہ ہیں جناب رام لال　۔ اور ایک دن یہی جناب رام لال مجھے اپنی انگلی سے تھامے لکھنؤ کے ادبی ماحول میں لے گئے۔ جہاں سے ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا۔

اس نئے شہر میں میرے ساتھی بنے اقبال مجید اور عابد سہیل، احمد جمال پاشا اور حسن کمال، قاضی عبد الستار　ــــ، قیصر تمکین اور رضوان احمد، ڈاکٹر اسرار نقوی، اور آغا سہیل حسن عباس اور شارب لکھنوی، عثمان غنی اور لطیف صدیقی اور سبط اختر، اس نئی ٹولی کے علاوہ پہلے سے قدم جمائے ہوئے تھے مسیح الحسن رضوی اور منظر سلیم، ڈاکٹر قمر رئیس اور ڈاکٹر شارب ردولوی، باقر مہدی اور

حسن شمیم اور ہم سب کے سروں پر تُندے لطیف بادلوں کی طرح سایہ کرنے تھے مرحوم احتشام صاحب، آل احمد سرور، علی عباس حسینی، ڈاکٹر نوراحسن ہاشمی، ڈاکٹر محمد حسن، رضیہ آپا، ڈاکٹر اے. اے خلیل اور ڈاکٹر شجاعت علی اور ہندی کے ادیبوں میں یش پال اور امرت لال ناگر اور بھگوتی چرن ورما جیسے لوگ۔ بعد میں اضافہ ہوا سجاد ظہیر صاحب کا۔ اور پھر یہ کہ نیاز فتح پوری، اثر لکھنوی اور مسعود صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ دامق جون پوری اور مجاز مرحوم کے ترانے ہم نے اسی ادبی ماحول میں سنے۔ کیا ماحول تھا وہ۔ لگتا ہے جیسے کوئی ادبی یونیورسٹی باقاعدہ ادب کی تعلیم دے رہی تھی۔

راستہ چلتے ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے ٹوک دیا۔ "کچھ لکھا؟"

"جی نہیں"

"خوراک کی کمی ہو رہی ہے۔ پڑھنا شروع کرو۔" اور تب میں گھر آکر کہانیوں کی کتابوں میں اس طرح کھو جاتا جیسے دادی تڑکے اٹھ کر محنت سے آٹا پیسا کرتی تھی۔

کافی ہاؤس میں دیکھ کر احتشام صاحب نے اشارے سے بلا لیا۔

"ادھر کوئی کہانی نظر سے نہیں گزری؟"

اور اس سے پیشتر کہ میں کوئی جواب دوں۔ وہ خود ہی فرماتے: "اگلے ہفتے میرے ہاں جلسے میں کہانی پڑھنا۔"

احتشام صاحب تو پھر اپنی گفتگو میں لگ جاتے۔ اور میرا ذہن اسی وقت سے کسی کہانی کا تانا بانا بُننا شروع کر دیتا۔

اس طرح سے یہ قافلہ آگے بڑھا۔

ہم لوگوں میں سے کوئی اچھی کہانی، اچھی غزل یا نظم لکھ لیتا تو مہینوں نہیں مہینوں اس کا چرچا رہتا۔ تخلیق میں خامی ہوتی تو جہاں ملتے اس کو لے کر بحث چھڑ جاتی۔ چندہ اکٹھا کی گئی ایک چونی کے سہارے ہماری ساری کی ساری ٹولی پوری شام یا پوری رات دوپہر کافی ہاؤس کی کرسیاں توڑتی۔ ایک جناں گرم کافی پیتا، باقی ٹھنڈا پانی جسے بھوک لگی ہوتی۔ وہ پانی پینے سے پہلے چپکے سے ایک چمچ چینی پھانک لیتا۔ یہ تھی افلاس کے مارے ادیبوں کی اس ٹولی کی حالت۔

باقر مہدی:۔ چائے زیادہ اس لئے پیتا ہوں کہ یہ بھوک کو مارتی ہے۔

رضوان احمد:۔ پڑھنے میں تیز۔ سب سے تیز۔ اور غریبی ایسی کہ مہینوں احمد جمال پاشا کی بیٹھک میں رہتا رہا اور ایک آدمی کا کھانا دو مہینے کھاتے رہے والی آسی:۔ بوڑھی ماں اور دو جوان بہنوں کا بوجھ۔ اور گھر میں کھانے پینے اور اوڑھنے کے نام مرحوم آسی لکھنوی کی کتابوں کا ذخیرہ۔

ہانی اللہ اللہ خیر صلہ۔

عابد سہیل:۔ سب سے سخت جان۔ ٹیوشن کر کے پڑھتا تھا۔ اور بھی نہ معلوم کیا کیا دکھ جھیلتا تھا۔ لیکن بتاتا کچھ نہیں تھا۔

آغا سہیل:۔ پتلا دبلا ایسا کہ جیسے زندگی میں کبھی کھانا کھایا ہی نہ ہو۔ اب پاکستان جا کر اتنا موٹا ہو گیا ہے کہ پہچان میں نہیں آتا۔

خود میں ڈیڑھ دو سو تنخواہ۔ اور سر پر دادی، ماں باپ، چھوٹے بھائی، بہنوں اور بیوی بچوں کو ملا کر تقریباً ایک درجن افراد کی ذمے داری اور اس پر باپ کو پاگل پن کی بیماری۔ باقی تو خیر سب کچھ جھیلا لیکن ایک بار صاحب اس غریبی نے یہاں تک مجبور کر دیا کہ پاگل باپ کو پاگل خانے میں داخل

کر دینے کے لئے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنوانی پڑ گئی اس ظالم لمحے کی جب بھی یاد آتی ہے تو غم کی شدت سے میں خود پاگل ہو ہو جاتا ہوں۔

یہ سب کچھ جھیلتے ہوئے ہم وقت کے بھاری پتھروں کو آگے دھکیلتے رہے۔ اس دوران میں نے ۱۹۶۰ء میں ہائی اسکول پاس کرنے کے پندرہ سال بعد، بی، اے کر لیا۔

کیا دن تھے، وہ بھی صاحب۔ صبح چھ بجے گھر سے نکلنا۔ کالج سے سیدھا امین آباد، وہاں جمال پاشا کے ساتھ کسی ہوٹل میں ناشتہ۔ دوپہر کو کبھی فاقہ اور بھوک برداشت نہ ہوئی تو بشیشر پردیپ کے گھر کھانا۔ شام کو پھر کافی ہاؤس اور دوستوں کی محفل۔ اور پھر رات کو نو دس بجے پیسے ہوتے تو کسی سواری سے نہیں تو پیدل ہی حضرت گنج سے عالم باغ تک کا چار پانچ میل کا سفر۔

زندگی کی اس تپتی دوپہر میں ہم سب کو کہیں تھوڑی دیر کے لئے ٹھنڈک نصیب ہوتی تھی تو جمال کے گھر کے تہہ خانے میں۔ اقبال مجید، حسن کمال عابد سہیل، والی آسی، سبط اختر اور میری نا معلوم کتنی دوپہریں اسی میں گزری ہیں۔

میرے لئے اس لمبی اندھیری رات میں کہیں آسمان پر کچھ ستارے چمکتے تھے تو اس طرح کہ باقر مہدی نے اپنے مضمون میں میری کہانی کا ذکر کیا ہے۔ کبھی احتشام صاحب نے دبی زبان میں آہستہ سے کسی کہانی کی تعریف کر دی۔ کبھی ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے حوصلہ افزائی کی تو کبھی یہ ہوا کہ ظ انصاری نے شاہراہ کے لئے کہانی مانگ لی۔ نقوش میں پہلی کہانی چھپی تو جیسے سارے دکھ درد بھول گئے۔ اور پروفیسر موہن سنگھ نے جس دن ایک پنجابی گیت کی تعریف میں انگریزی میں خط لکھا تو مہینوں اس خط کو لے کر دوستوں پر رعب ڈالتا رہا۔

اب تک پنجابی میں نظمیں لکھتا چلا آرہا تھا اور اردو میں کہانیاں۔ اور دونوں زبانوں میں نقادوں نے گاہے بگاہے میری تخلیقات کا ذکر کرنا شروع کر دیا تھا لیکن پھر یہ ہوا کہ دونوں محاذوں پر مقابلہ سخت ہو گیا۔ ادھر اردو میں میرے ہمعصروں میں اقبال مجید، اقبال متین، قاضی عبدالستار، عابد سہیل، قیصر تمکین، غیاث احمد گدی، جوگندر پال، جیلانی بانو، سریندر پرکاش، انور عظیم، بڑی معرکے کی کہانیاں لکھ رہے تھے۔ ادھر پنجابی میں سکھبیر سنگھ، سوہن سنگھ میشا، جگتار جیسے لوگ نئی پنجابی نظم کے علمبردار بن کر ابھر رہے تھے۔ اس لئے مجھے فیصلہ کرنا پڑا کہ یا تو میں پنجابی میں نظمیں لکھوں یا اردو میں کہانیاں۔ اور آخر یہ سوچ کر کہ پنجاب کی زمین سے کٹ کر پنجابی زبان میں اچھی شاعری کرنا دشوار ہوگا میں نے اردو کہانی کے حق میں فیصلہ کیا اور تب سے کہانی کا ہی ہو کر رہ گیا۔

۱۹۶۲ء کے آتے آتے سخت حالات کی برف کچھ ٹوٹنی شروع ہوئی۔ میں نے ۱۲ سال کی ریلوے کی نوکری کو خیرباد کہا اور ریڈیو میں آ گیا۔ اقبال سیتاپور میں ٹیچر ہو گئے۔ جمال پاشا، عابد سہیل، منظر سلیم، عثمان غنی، قومی آواز سے منسلک ہو گئے۔ اب اقبال مجید ریڈیو میں آ چکا، جمال لیکچرر ہو کر سیوان چلے گئے، منظر روس چلے گئے اور عابد سہیل قومی آواز سے ترقی کر کے نیشنل ہیرلڈ میں پہونچ گئے۔ حسن کمال پہلے رونڈ ویز میں نوکر ہوا اور دوسری جست میں بمبئی پہونچ گیا۔ قیصر تمکین کو ایک دن ہم نے الوداعی پارٹی دے کر دہلی بھیجا ریڈیو میں نوکری کرنے کے لئے۔ دوسرے دن وہ استعفیٰ دے کر انڈین ایکسپریس میں لگ گیا۔ تیسرے دن پتہ چلا کہ وہاں سے بھی چھوڑ چھاڑ کر انگلینڈ پہونچ گیا۔

آپ کہیں گے۔ آپ بیتی میں بار بار اقبال مجید، عابد سہیل، جمال پاشا، حسن کمال اور دوسرے دوستوں کا ذکر کیوں آ جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ گوربانی کا ایک شبد ہے۔

'میرا مجھ میں کچھ نہیں جو کچھ ہے سو تیرا'۔ دراصل میرے پاس اپنا تو کچھ ہے نہیں۔ ان ہی لوگوں سے کہانیاں لکھنے کا فن سیکھا، انہی دوستوں

کی کئی میں مانگ کر ایک دن بی۔ اے پاس کیا۔ انہی لوگوں نے اچھی کہانیاں لکھنے پر ایک زبان ہو کر داد دی۔ انہی لوگوں نے خراب کہانی لکھنے پر کہا: "بکواس ہے"۔ یہاں آپ کو ایک راز کی بات بتاؤں۔ ایک دفعہ میں نے ایک گھٹیا کہانی لکھی اور عابد سہیل کو کتاب میں چھپنے کے لئے بھیج دی۔ دو چار برس بعد ملاقات ہوئی اور میں نے اس کہانی کے بارے میں پوچھا تو عابد سہیل نے ڈانٹ کر کہا: "ہٹ وہ کہانی تھی۔ اگر وہ چھاپ دیتا تو تمہاری ساری ساکھ مٹی میں مل جاتی"۔ تو بھائی اپنی ساکھ بنانے والے تو یہ دوست ہیں۔ ان کے ذکر کے بغیر بھلا میری آپ بیتی کیسے مکمل ہو سکتی ہے۔

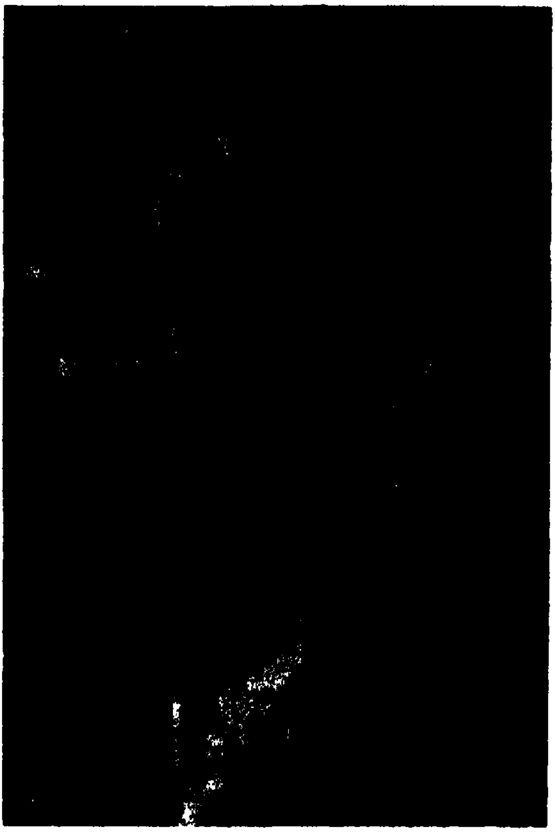
ایک بات اور۔ اور وہ یہ کہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے ڈاکٹر محمد حسن جیسا نقاد مل گیا۔ جب وہ میری کسی کہانی کی تعریف میں کچھ لکھتے ہیں یا بولتے ہیں تو میں اپنی آنکھیں اور کان بند کر لیتا ہوں۔ لیکن جب وہ میری کسی کہانی کی چیر پھاڑ کرتے ہیں تو میرا سارا وجود کان بن کر ہمہ تن گوش ہو کر ان کی بات کو سنتا ہے اور پھر برسوں اس پر غور کرتا ہے۔ میرا ایمان ہے ان کی تنقید کی آگ میں اتنی طاقت ہے کہ جو بھی کہانی کار اس آگ کی تپش کو جھیلنے کا حوصلہ رکھتا ہو، یہ آگ اسے کندن بنا سکتی ہے۔

اور پھر ڈاکٹر قمر رئیس۔ ہمارا دوستی کا رشتہ کب بھائی کے رشتے میں بدل گیا، یہ ہم دونوں کو پتہ نہیں چل سکا۔ آہستہ آہستہ استوار ہوتے ہوئے اس رشتے نے زندگی کی دشوار گزار ڈگر پر چلتے ہوئے مجھے بارہا یقین دلایا ہے کہ جہاں سے بھی تم آواز دو گے، ہمیں اپنے قریب پاؤ گے۔

آپ بیتی کے نام پر ایک بات اور کہنے کی اجازت دیجئے کہ جو مجھ پر بیتی وہ میرے بیوی بچوں پر بھی بیتی۔ میری بیوی کا جسمانی قد چھوٹا ہے لیکن ذہنی قد یقیناً مجھ سے بھی بڑا ہے۔ اس لئے زندگی کے ہر اندھیرے موڑ پر میں نے اس عورت کو اپنے لئے شمع کی مانند روشن پایا ہے۔ اس عورت نے بھوپال میں جب ایک کمرے کے مکان کو دیکھ کر کہا کہ یہ بہت اچھا ہے اور اس میں ہم چار بچوں کے ساتھ بہت آرام سے رہیں گے تو سچ پوچھئے مجھے لگا تھا جیسے اس عورت کا قد آسمان کو چھو رہا ہو۔ جیسے اس عورت کے سادے سے نین نقش میں دنیا جہان کا سارا حسن اُمڈ آیا ہو۔ اس کی ذہنی بلندی کا اندازہ آپ اس حقیقت سے لگا سکتے ہیں کہ میری جس کہانی کو سُن کر اس کے منھ سے واہ نکل گئی، اسی کہانی کو علم و ادب کی دنیا میں قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھا گیا اور جہاں اس نے کہا کہ بات نہیں بنی۔ تو پھر سمجھئے کہ بات واقعی نہیں بنی۔ اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ میرے غم کے بھاری لمحوں کے بوجھ کو جہاں اس عورت نے اپنے کندھوں پر جھیلا ہے وہاں میری کہانیوں میں بھی اس کی ذہنی بلندیوں نے رنگ بھرے ہیں۔ رہے میرے بچے تو ان کی حالت جنگل کے ان خود رَو پیڑوں کی طرح ہے جن کی نگہداشت اور پرورش قدرت خود کرتی ہے۔ ورنہ میں نے ان کا مستقبل بگاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میری ریڈیو کی نوکری میں خانہ بدوشوں کی طرح بیچارے جہاں گئے وہاں زبان اور ذریعۂ تعلیم کے فرق کی وجہ سے ان کی تعلیم بچھڑ گئی اور سال الگ ضائع ہوتے رہے۔

ایک کہاوت ہے کہ کسی نے پچھلے جنم میں موتی دان کئے ہوں تبھی اچھے دوست اور رفیق ملتے ہیں۔ میں تو اسی جنم میں مولوی برکت علی، چوہدری خان محمد، بابا بنسو، بابا ملکھے خان، سداخان دائی —— کی محبت کو قربان کر کے آیا تھا اور انہی کی محبت کا صدقہ خدا نے مجھے ایسے دوست اور رفیق عطا کئے جنہوں نے ایک اُجڈ گنوار دیہاتی لڑکے کو کہانی کار بنا کے رکھ دیا۔

ورنہ میں۔ میں تو اب بھی وہی سادہ لوح دیہاتی لڑکا ہوں جو اپنے سر پر اپنے جوتے رکھے دنیا کے بازار سے ننگے پاؤں گزر رہا تھا۔ دُنیا اسے مُورکھ سمجھ کر ہنس رہی ہے اور وہ سب کی ہنسی سے بے نیاز اپنے راستے پر اپنی منزل کی طرف چلا جا رہا ہے بڑھا جا رہا ہے۔



ویدراہی

"...... ہر شخص اپنے دائرے میں کسی چھوٹے یا بڑے سنگھرش میں لگا رہتا ہے۔ وہ کبھی تھک بھی جاتا ہے اور ٹوٹ بھی جاتا ہے۔ لیکن اُس کے سنگھرش کی داستان کبھی ختم نہیں ہوتی۔ سنگھرش کا یہ سلسلہ ہی ایک اِنسان کو دوسرے انسان سے جوڑتا ہے اور اِس سلسلے کا ہی دوسرا نام زندگی ہے۔"

میں کیوں لکھتا ہوں؟ صرف پیسہ کمانے کے لئے؟ نہیں صرف پیسہ کمانے کی بات ہوتی تو لکھنے سے زیادہ آسان اور زیادہ نافع مند کام دھندے پڑے ہیں جنھیں دوسروں کی طرح میں بھی کرسکتا ہوں۔ تو کیا میرے لکھنے سے دنیا کے ادب میں کچھ ایسے اضافے ہو رہے ہیں کہ میرا لکھنا ضروری ہے۔؟ نہیں میں کسی ایسی غلط فہمی کا شکار بھی نہیں۔ پھر کون سی ایسی تحریک یا ترغیب ہے کہ دنیا بھر کے خرافات میں گلے گلے ڈوب کر بھی مجھ سے لکھنا کبھی نہیں چھوٹا۔؟ اس کی وجہ مجھے نہیں معلوم۔ شاید یہ میری مجبوری ہے۔

کہتے ہیں فنکار پیدائش سے ہی اپنے ساتھ ایسے اثرات لے کر آتا ہے جو اُسے فنکار بننے پر مجبور کرتے ہیں۔ میں اپنے متعلق ایسی بات بھی نہیں کہہ سکتا کیونکہ مجھے بچپن سے ہی ایسا ماحول ملا کہ میرے سامنے لکھنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں تھا۔ اور لکھنے کا یہ بھوت سر پر ایسا سوار ہوا کہ اسکول کی پڑھائی بھی ادھوری رہ گئی۔

جس گھر میں میرا بچپن گذرا وہاں سے کئی رسائل واخبارات کی اشاعت ہوتی تھی۔ وہاں پریس تھا اور پبلشنگ ہاؤس بھی۔ نتیجتاً کتابوں سے مجھے جنون کی حد تک عشق ہو گیا۔ سارا جیب خرچ بھی کتابیں خریدنے پر چلا جاتا۔ چھوٹی چھوٹی کتابوں کی ایک اچھی خاصی لائبریری میری اپنی تھی۔ محلے بھر کے لڑکوں کو کتابیں پڑھنے کے لئے دینا میری ہابی تھی۔ "داستان امیر حمزہ"، "الف لیلیٰ" جیسے قصے دس بارہ سال کی عمر میں ہی پڑھ ڈالے تھے۔ اُسی دور میں بچوّں کی چھوٹی چھوٹی نظمیں اور کہانیاں لکھنے سے میرے لکھنے کی ابتدا ہوئی۔

اپنا پہلا افسانہ، جسے صحیح معنوں میں افسانہ کہنا چاہئیے میں نے پندرہ سال کی عمر میں لکھا۔ اس کا عنوان تھا "اندھیروں سے باہر" اُس میں ایک نوجوان عشق میں ناکام ہو کر خودکشی کرنے جاتا ہے۔ راستے میں اسے پتہ چلا کہ اُس کی اکیلی بہن کا خاوند مر گیا ہے اور وہ بے سہارا ہو گئی ہے۔ وہ نوجوان اپنی بہن کے لئے خودکشی کا ارادہ ترک کر کے جینے کا عزم کر لیتا ہے۔

وہ افسانہ لکھ کر مجھے محسوس ہوا تھا کہ فنِ افسانہ اظہار و بیان کا زبردست ذریعہ ہے۔ زندگی کے اس موڑ پر میں خود کوئی جینے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ دو تین سال تک میں نے انتہائی شدید درد برداشت کیا تھا۔ دم گھٹ گیا تھا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔ اُس اندھیرے سے باہر آنا میرے لئے دوسرا جنم لینے کے برابر تھا۔

ایک ہی زندگی میں کئی جنم لینے پڑتے ہیں۔ یہ میرا عقیدہ ہے۔

عقیدوں کے کئی ستارے ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتے ہیں۔ ایسا ہی ایک ستارہ ہے۔ زندگی بہرحال جینے کے لئے ہے۔ دوسرا جنم میں نے اسی عقیدے کے سہارے لیا تھا۔ اور اپنے آپ کو اس راستے پر لا کھڑا کیا تھا جس کا نام تھا "ادب"! جس سے میری دوستی بچپن کے زمانہ سے تھی۔ تقریباً پچیس سالوں سے پورے انہماک اور پوری سنجیدگی سے اُسی راستے پر چل رہا ہوں۔ کہہ نہیں سکتا کہ میں نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ لیکن اپنی سب سے بڑی کامیابی یہی سمجھتا ہوں کہ میں جی رہا ہوں۔ پچھلے پچیس سالوں میں میں نے پیار، محبت، ممتا، دکھ اور سکھ کے جو تجربات سمیٹے ہیں وہ زندگی کے نقش پا ہیں اور اُنہی کے عکس میری تحریروں میں ہیں۔ میری اپنی نظر کے ساتھ۔

اپنے بچپن کی ایک عجیب بات یاد ہے مجھے۔ لگتا تھا ایک بھول بھلیاں میں پھنس گیا ہوں میں۔ اپنے ارد گرد کی ہر چیز ایک فریب نظر محسوس ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ چلتے پھرتے انسانوں کا وجود بھی اپنے ہونے کا دھوکا دیتا ہوا نظر آتا تھا۔ کسی گلی میں چلتے ہوئے میں اچانک رک جایا کرتا تھا۔ سامنے وہی جانی پہچانی گلی ہوتی تھی، لیکن پیچھے جو گلی چھوڑ آیا تھا، وہ اپنی جگہ پر ہوگی، مجھے اس کا یقین نہیں ہوتا تھا۔ ایک عجیب بے یقینی اور بے چینی کا عالم تھا۔ چلتے چلتے مجھے احساس ہوتا تھا میں جوں جوں آگے بڑھ رہا ہوں پیچھے کا سب غائب ہو رہا ہے۔

مجھے یاد ہے میں برسوں انھیں بھول بھلیاں میں الجھا رہا تھا۔ میں نے یہ تو کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں کون ہوں، کیسے اور کیوں آیا ہوں اس دنیا میں۔ لیکن میں ہمیشہ اس واہمہ میں گرفتار تھا کہ میرے ارد گرد سب جھوٹ ہے، کہ میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو سب کچھ غائب ہو جاتا اور آنکھیں کھولتا ہوں تو سب کچھ اپنے حلقۂ وجود میں آجاتا ہے۔

مجھے یاد نہیں کہ میں کب اس طلسم خیال سے باہر آیا تھا۔ لیکن ایک عرصہ گزر گیا، لگتا ہے پرچھائیوں کا وہ جال اب کہیں دور سے بھی مجھے نظر نہیں آتا۔ اب میں ہر رات جب سوتا ہوں تو اس یقین کے ساتھ کہ یہ رات سب کیلئے ہے اور میرے ساتھ دوسرے سب لوگ بھی سو رہے ہیں، کہ صبح حسب معمول سورج نکلے گا۔ روشنی ہوگی۔ اب صرف میری نظر کو فریب دینے کے لئے مکانوں گلیوں اور شہروں کی تعمیر نہیں ہوتی۔ اور لوگ صرف مجھے ہی دھوکا دینے کے لئے چلتے پھرتے اور باتیں نہیں کرتے، یہ سب حقیقتیں ہیں۔ یہ سب سچ ہے۔ اور اپنی تحریروں کے ذریعے میں اسی سچ کا اِتہاس لکھتا ہوں۔

میں افسانوں کے لئے کرداروں کی تلاش میں سرگرداں نہیں رہتا۔ واقعات کی تلاش مجھے پریشان نہیں کرتی۔ اپنے سامنے کے کردار اور واقعات ہی اشارے سے روک لیتا ہوں۔ انھیں افسانوں میں ٹھونسنے کا جتن نہیں کرتا۔ میں خیالات مستعار لینے کا قائل بھی نہیں ہوں کہ اپنے آپ کو فلسفی کے طور پیش کروں۔ میں افسانے کو کوئی ایسا موڑ دینے کے بھی خلاف ہوں جس سے تصنع کی بو آئے۔ دیکھا جائے تو مصنف کے ہاتھ میں صرف ایک انتخاب ہی رہتا ہے کہ وہ کس کردار یا واقعہ کو افسانے کے لئے چُنے۔ باقی سارے لوازمات تو وہ کردار یا واقعہ خود اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔

ہر شخص اپنے دائرے میں کسی چھوٹے یا بڑے سنگھرش میں لگا رہتا ہے۔ وہ کبھی تھک بھی جاتا ہے اور ٹوٹ بھی جاتا ہے۔ لیکن اس کے سنگھرش کی داستان کبھی ختم نہیں ہوتی۔ سنگھرش کا یہ سلسلہ ہی ایک انسان کو دوسرے انسان سے جوڑتا ہے۔ اور اس سلسلے کا ہی دوسرا نام زندگی ہے۔ آپ چاہیں تو اسے افسانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

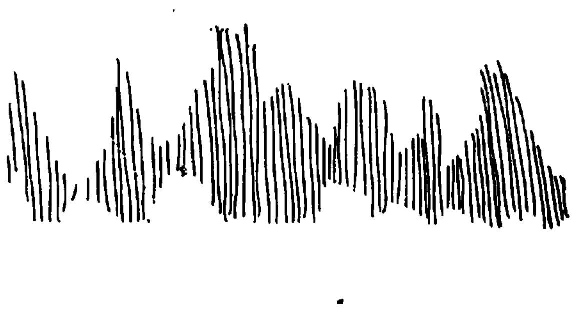
اپنے طور افسانہ لکھتے ہوئے میں خود کو دوسروں کے قریب محسوس کرتا ہوں۔ قرب کا یہ احساس میرے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ہر کہانی مجھے اپنی کہانی بھی لگتی ہے اور دوسروں کی بھی۔ میرے خیال میں دنیا کی پہلی کہانی تبھی معرض وجود میں آئی ہوگی جب کسی کے دل میں کسی کے تئیں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا ہوگا۔ افسانہ کے کرداروں اور افسانہ نگار میں ایک گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ دھرتی کی خوشبو بھی اس رشتے کو گہرا کرتی ہے۔ اور زبان کا رنگ بھی اس میں اپنا رنگ بھرتا ہے۔ مجھے یاد ہے جب میں نے اپنی مادری زبان ڈوگری میں پہلی کہانی لکھی تو مجھ پر ایک نشہ سا چھا گیا تھا۔ مجھے لگا تھا کہ تب تک میں اپنے ہی

خیر سے بے خبر تھا۔ وہ کہانی لکھ کر مجھے اپنی دھرتی کی خوشبو کا احساس ہوا تھا۔ اس کے بعد کی میری زیادہ تر کہانیاں زیادہ حقیقی تھیں۔ تخیلی یا غیر فطری نہیں۔

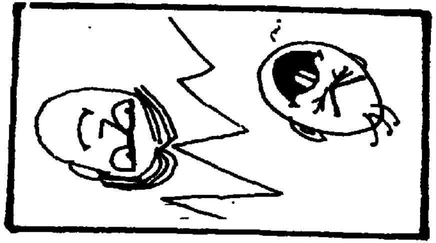
اگر مصنف ایمانداری کو لکھنے کی پہلی شرط مان کر چلے تو دھرتی یا کرداروں سے پہچان ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ زندگی کی جدوجہد مجھے اپنے شہر جموں سے ہزاروں میل دور بمبئی جیسے مہانگر میں لے آئی ہے۔ لیکن لگتا ہے یہ بھی میری ہی دھرتی ہے۔ میں کہیں بھی اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہیں کرتا۔ سمندر کی وسعت اور پھیلاؤ میں مجھے پہاڑوں کی اونچائی اور گہرائی کا احساس ہوتا ہے۔ گو یہاں کی زندگی بڑی پیچیدہ ہے۔ پرانی اور نئی تہذیب کا ٹکراؤ یہاں اپنے عروج پر ہے۔ یہاں قدروں کے بدلنے کی رفتار بہت ہی تیز ہے۔ مادہ پرستی نے انسان کو ایسے خطرناک موڑ پر لا کھڑا کیا ہے جہاں دلوں کی حرارت ہی اپنے خاتمے پر آ پہنچی ہے۔ ان بڑے شہروں میں انسان اقتصادی دباؤ سے اتنا دب گیا ہے کہ اس کی آنکھیں باہر آنے لگی ہیں۔ زندگی یہاں پُرلطف ہونے کی بجائے بے رس، بے ہنگم اور پتھر کی طرح سخت ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن کچھ بھی ہو زندگی کو ان بڑے شہروں میں بھی جیا ہی جا رہا ہے۔ جس طرح انسان مادہ پرستی کے عروج، انسانی قدروں کی بے قدری یا حالات اور حوادث کی سنگدلی سے گھبرا کر زندگی سے دامن کشاں نہیں ہوتا ویسے ہی ایک ادیب بھی ان سب کو جیتا، سہتا اور محسوس کرتا ہے۔ محسوس کرنے کے بعد وہ اُس کا اظہار بھی کرتا ہے۔ اظہار کے اس عمل میں وہ ایک ہی زندگی کو دوبارہ جیتا ہے۔ ایک ہی تجربے کے دوہرے عمل سے اسے گذرنا پڑتا ہے۔

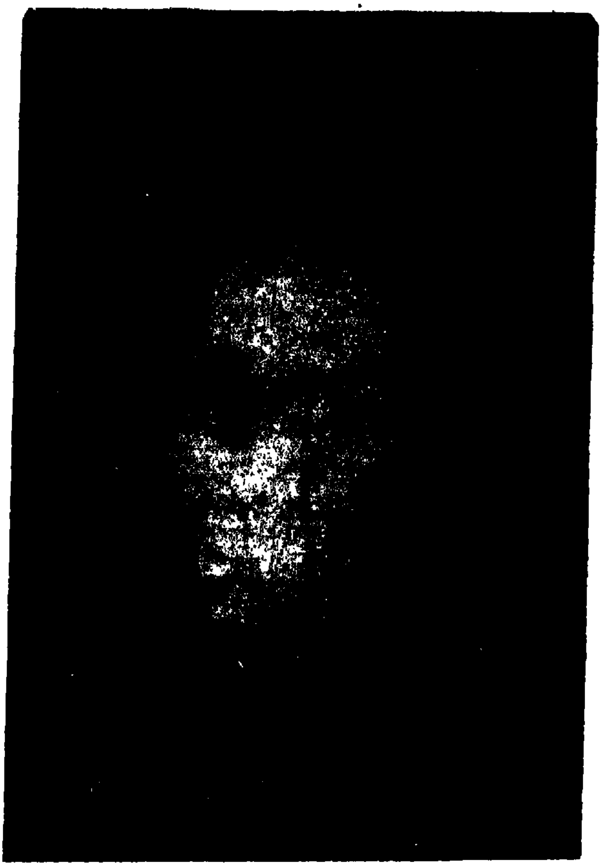
اِس دوہرے عمل سے گذرنے کے بعد بھی میری تشنگی کم نہیں ہوتی۔ کچھ اور دیکھنے، کچھ اور محسوس کرنے اور پھر اُس محسوس کئے ہوئے کو اظہار کرنے کی تمنا کبھی نہیں مرتی۔

میں کیوں لکھتا ہوں اور کیا میں واقعی اتنا اچھا لکھتا ہوں کہ اپنے لکھنے کے اس سلسلے کو جاری رکھوں؟ ایسے کئی سوال میں اپنے آپ سے کرتا ہوں۔ لیکن لکھنے کی اس تمنا کے سامنے آ کر ایسے سارے سوال خاموش ہو جاتے ہیں۔ میں خود بھی چُپ رہ جاتا ہوں۔ لگتا ہے لکھنا نہ لکھنا میرے اپنے ہاتھوں میں نہیں۔



طنز و مزاح





رشید احمد صدیقی

"......میری ایک عادت ہے کہ اُردو کا چھپا ہوا کاغذ کیسا ہی کٹا پھٹا، گرا پڑا کیوں نہ ہو میں اُسے اُٹھا کر ایک نظر دیکھ لوں گا۔ اس میں نہ دیر لگتی ہے نہ زحمت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ میں اُردو کی ہر چھپی ہوئی تحریر اکثر ترتیب سے فقرہ فقرہ یا جملہ جملہ نہیں پڑھتا بلکہ سطروں، اکثر صفحوں میں پڑھتا ہوں جیسے کوئی تحریر نہ پڑھی جا رہی ہو تصویر دیکھی جا رہی ہو۔ ان میں مجھے کوئی نہ کوئی انوکھی، دلچسپ یا بے تکی بات ضرور مل جاتی ہے..."

میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ میری پسند ناپسند، رہن سہن، گفتار و کردار اور فکر و نظر جسے بحیثیت مجموعی "شخصیت" کہہ سکتے ہیں، سب کی سب علی گڑھ میں ڈھلیں۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی سیرت کی تعمیر یا تشکیل کے لئے بہت کچھ خام مواد اپنے گھر اور اسکول سے لایا تھا لیکن اس کو تب و تاب، رنگ و آہنگ، لمس و لذت اور صورت و معنی علی گڑھ نے دیئے۔

رہنے سہنے، لکھنے پڑھنے اور کھیل کود کا زمانہ اسکول میں بڑے لطف کا گزرا۔ اچھے ساتھی، ان سے اچھے استاد اور سب سے اچھے ماں باپ، بھائی بہن ——— سبھی تو مجھے عزیز رکھتے تھے۔ ان سب کی محبت نے دل میں اپنی وقعت کچھ اس طرح سے روشن کر دی تھی اور دوسروں کی عزت و خدمت کرنے کا ایسا حوصلہ پیدا کر دیا تھا کہ تمام عمر کسی حال میں ادنیٰ درجے کی حرکت کرنے پر طبیعت مائل نہ ہوئی البتہ ریاضی اور اس کی ذریات، الجبرا، اقلیدس اور مساحت ایسے تھے جن سے تمام عمر دوستی تو درکنار کسی شرط پر مفاہمت تک نہ ہو سکی۔ ان سبھوں نے مجھے اور میرے دوستوں کو ایسا رُسوا کیا کہ ع

انگلیاں اُٹھتی تھیں دُور سے کہ وہ آتے ہیں

ہم تین چار دوست ایک ہی بنچ پر ہر درجے میں سالہا سال بیٹھتے آئے۔ ریاضیات میں ہم سب کے حاصل کردہ نمبر جوڑ دیئے جاتے جب بھی پاس مارکس تک رسائی نہ ہوتی۔ امتحانات میں ہم سب کے نمبر دوسرے مضامین میں بہت اچھے آتے تھے۔ اچھے کھلاڑی ہونے کا بھی لحاظ کیا جاتا اس لئے ترقی دے دی جاتی۔ ہم کو اس کی سخت کوفت تھی کہ دوسرے مضامین میں تو اکثر تیس چالیس فی صد تک ہماری باتیں کتابی باتوں کے مقابلے میں مان لی جاتی تھیں، ریاضیات میں آخر کیا سرخاب کا پر لگا تھا کہ ایک شوشہ، ایک صفر تک کا ہیر پھیر ہماری خاطر گوارا نہیں کیا جاتا تھا۔

انٹرنس میں نے گورنمنٹ ہائی اسکول جون پور سے کیا۔ اس عہد کے بورڈنگ ہاؤس کی زندگی آج کل کی زندگی سے بہت مختلف تھی خاص طور پر جون پور کے اس بورڈنگ ہاؤس کی، جہاں نہ خاص قسم کی کوئی نگرانی کی جاتی تھی نہ قواعد و ضوابط کی ایسی کچھ پابندی تھی۔ عموماً ہر سینئر لڑکا جونیئر لڑکے کا نگران ہوتا۔ یہ بڑی کڑی نگرانی تھی جس سے کسی کو مفر نہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر لڑکے کے نگران خواہ وہ جونیئر ہو یا سینئر، اس لڑکے کے دور یا قریب کے وہ رشتہ دار ہوتے جن میں سے اکثر کسی نہ کسی کام سے شہر آئے ہوتے اور بورڈنگ ہاؤس میں مقیم ہوتے۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی طالب علم ان کا کہنا نہ ملنے یا ان کی موجودگی میں اس سے کسی قسم کی لاپروائی یا بے راہ روی سرزد ہو جائے۔

جون پور تاریخی شہر ہے۔ وہاں شاہانِ شرقی کے آثار اب تک موجود ہیں۔ دریائے گومتی وسط شہر سے گزرتا ہے جس پر شاہی زمانے کا بڑا مضبوط پل ہے۔ پل کے ایک سرے پر پبلک لائبریری کی دو منزلہ عمارت ہے۔ اس لائبریری میں شہر کے ثقات و اشراف اتنا کتابیں پڑھنے کے لئے نہیں آتے جتنا شام کو مل بیٹھنے کے لئے جمع ہوتے، شعر و ادب کی باتیں کرتے اور بیٹھے بیٹھے شہر، قلعہ اور دریا کی سیر کرتے اور کبھی کسی دور و نزدیک بکھری ہوئی مسمار عمارتوں اور کھنڈروں کی یاد میں تھوڑی دیر کے لئے گم ہو جاتے۔

۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۴ء میں شیعہ کانفرنس کا ایک بڑا شاندار جلسہ جون پور کے شاہی قلعہ کے اندر منعقد ہوا تھا۔ تصوّر کی نگاہ میں حضرت منتی مرحوم اپنی مشہور نظم بڑے دل نشیں اور ولولہ انگیز لہجے میں سناتے نظر آتے ہیں ؎

جون پور اے مولدِ سلطانِ عادل شیر شاہ
تیرے آثارِ قدیمہ تیری عظمت پر گواہ

میں نے یہ سماں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے جون پور واقعتاً اپنی عظمتِ دیرینہ کے ساتھ ہمارے اردگرد آہستہ آہستہ اُبھر رہا ہو۔

میری طالب علمی کے زمانے میں سربرآوردہ شریف شیعہ خاندانوں کی تعداد جون پور اور مضافات میں کافی تھی۔ اسکول کے ساتھی زیادہ تر ان ہی خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اکثر ان کے گھروں پر جایا کرتا۔ گھر کے بزرگ مجھے اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے۔ سچے اور بڑی شفقت سے پیش آتے۔ کبھی اپنے خاندان یا باہر کے شعراء کا منتخب کلام یا خاندانی بیاض سے مرثیے اور سوز اس خوبی سے سناتے کہ جی خوش ہو جاتا۔ ان کا اندازِ شعر خوانی اور شعر کی خوبیوں کی توضیح اتنی مکمل اور دل نشیں ہوتی کہ آج اچھے اچھے فن کاروں اور معلموں میں نظر نہیں آتی۔ شعر و ادب کا جتنا چرچا میں نے ان خاندانوں میں دیکھا کہیں اور نظر نہ آیا۔

طالب علمی کے زمانے میں میرا دل پسند مشغلہ بالخصوص برسات کے موسم میں جب میدان میں کوئی کھیل کھیلا نہ جا سکتا، اس کتب خانے میں، جو دوسری منزل پر واقع تھا، کھڑکی سے متصل آرام کرسی پر دراز ہو کر اُردو انگریزی افسانوں اور ناولوں کا مطالعہ تھا۔ یہاں سے دریا کی طغیانی نظر آتی تھی۔ اس عمر، زمانے، ماحول و معاشرت میں اس مقام پر طرح طرح کے افسانے اور ناول پڑھنے میں جو لطف آیا وہ پھر کبھی نصیب نہ ہوا۔ کبھی ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے ان افسانوں اور ناولوں کا میں ہی مصنّف تھا۔ میں ہی ماحول اور میں ہی ہیرو! لائبریری سے باہر نکلوں گا تو میرے احترام میں پل کے نیچے بہتا ہوا پانی، پل کے اوپر چلتی ہوئی مخلوق اور فضا کا نمناک رستخیز رک جائے گا۔

مجھے ہر طرح کی چیزیں پڑھنے میں لطف آتا تھا البتہ اس زمانے میں بھی جب مجھے اردو سے کہیں کم انگریزی آتی تھی میں زبان و ادب کے اعتبار سے انگریزی کو اردو سے اونچا درجہ دیتا تھا۔ انگریزی کتاب پڑھتا تو کچھ ایسا محسوس کرتا جیسے مصنّف جو کچھ کہہ رہا ہے سچ کہہ رہا ہے۔ اور میرا ہی خواہ ہے۔ اردو کتابوں کی عبارت کا اکثر یہ اثر ہوتا جیسے مصنّف کا مقصد اپنا کرتب دکھانا ہے، مجھے کوئی فائدہ پہنچانا نہ ہو۔ یہ باتیں اور اسی طرح کی باتیں وضاحت سے نہیں بلکہ گڈمڈ ہو کر ذہن میں آتیں۔ انگریزوں سے میرا کچھ ایسا سروکار کبھی نہیں رہا لیکن انگریزی زبان و ادب سے اب بھی بہرہ مند ہوتا ہوں۔

جنگِ طرابلس کا زمانہ تھا۔ دسویں، پندرھویں اقبال کا ترانہ پڑھتا ہوا شہر سے جلوس گزرتا، شریفانہ اور پُروقار جلوس، نہ پولیس کا انتظام، نہ ایسا کوئی اژدہام، ہزار پانسو آدمیوں کا مجمع ہوتا۔ تخمیناً ایک میل کا فاصلہ آہستہ آہستہ طے کرتا اور پھر منتشر ہو جاتا۔ اقبال سے غائبانہ شغف مجھے اس جلوس اور ترانے سے ہوا۔ گو یہ بھی یاد آتا ہے کہ جون پور کی پبلک لائبریری کے برآمدے میں ایک شام اقبال کی نظم ؎

خدا سے حُسن نے اک روز یہ سوال کیا

ایک صاحب نے بڑے پُر اثر لہجے و انداز سے سنائی تھی۔ محفل پر دیر تک سکوت طاری رہا۔ بعض حضرات آبدیدہ بھی ہو گئے تھے

اور "رہے نام اللہ کا" کہتے ہوئے یکے بعد دیگرے اٹھ کھڑے ہوئے اور محفل خاموشی سے برہم ہو گئی۔

میری ایک عادت ہے کہ اردو کا چھپا ہوا کاغذ کیسا ہی کٹا پھٹا، گرا پڑا کیوں نہ ہو میں اسے اٹھا کر ایک نظر دیکھ لوں گا۔ اس میں نہ دیر لگتی ہے نہ زحمت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ میں اردو کی ہر چھپی ہوئی تحریر اکثر ترتیب سے فقرہ فقرہ یا جملہ جملہ نہیں پڑھتا بلکہ سطروں اکثر صفحوں میں پڑھتا ہوں جیسے کوئی تحریر نہ پڑھی جا رہی ہو بلکہ تصویر دیکھی جا رہی ہو۔ ان متفرق تحریروں میں مجھے کوئی نہ کوئی انوکھی، دلچسپ یا بے تکی بات ضرور مل جاتی ہے۔ اردو میں لکھنے کے اتنے انداز، اتنے فقرے، ترکیبیں، لب و لہجے اور پینترے ہیں کہ کسی نہ کسی سے کہیں نہ کہیں محظوظ یا منغص ہونا لازمی ہے۔ موضوع سیاست، قومیت، انقلاب، امراض، ادویات، عورت یا عشق جو کچھ ہو کوئی نہ کوئی فقرہ گفتنی یا ناگفتنی ضرور مل جائے گا۔

اسکول کے زمانے میں تھوڑی بہت نثر لکھ لیتا تھا۔ ایسی نثر جو اس زمانے کے معمولی اخبارات اور رسائل میں جگہ پاتی تھی۔ یہاں میں شاہ نذیر غازی پوری مرحوم کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ان کی شخصیت، قابلیت اور اسلوبِ تحریر کا مجھ پر اثر ہوا ہے۔ شاہ صاحب بڑے شریف، اونچے اور ذی علم گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ نواب عبدالمجید صاحب رئیسِ اعظم جون پور کے داماد تھے۔ سرخ و سپید رنگت، بلند قامت، متناسب الاعضا، خوبرو، خوش گفتار، نگاہ نیچی رکھتے تھے۔ گفتگو میں جوں جوں گرمی آتی آنکھیں سحر کن انداز سے کھلنے بند ہونے لگتیں جیسے والہانہ کیفیت طاری ہو۔ بڑی ستھری اور شائستہ زبان میں ترشے ہوئے فقرے جذبات کی تھوڑی سی برہمی اور لب و لہجہ کی سنجیدگی سے مل کر ادا ہونے لگتے جیسے کسی پہاڑی جھرنے سے پانی گر رہا ہو اور کبھی کبھی ہوا کے ہلکے جھونکے سے آواز کے تسلسل و ترنم میں فرق آ جاتا ہو۔

بے محل نہ ہوگا اگر میں اس کا تذکرہ بھی کر دوں کہ ہائی اسکول سے پہلے کی میری تعلیم کیا اور کیسی تھی۔ جیسا کہ اس زمانہ کے بیشتر مسلمان گھرانوں کا دستور تھا میں نے بھی قاعدہ بغدادی، کلام پاک اور تختی لکھنے کی تعلیم اپنے گھر پر اس عہد سے بھی پرانے ایک مولوی صاحب سے پائی۔ اسی طرح کے ایک دوسرے مولوی صاحب نے کچھ دنوں بعد فارسی کی کچھ کتابیں فارسی سے بھی مشکل اور زبان و بیان کے اعتبار سے "کذ خذ" اردو میں پڑھائیں۔ اسی دوران میں ایک اور مولوی صاحب سے چند رسالے عربی کے بھی پڑھے۔ قاعدہ کچھ اس طرح کا بن گیا تھا کہ جو جس طرح کے مولوی ہوں اسی طرح کی پڑھائی ہو۔ یعنی مولوی صاحب قرآن شریف پڑھا سکتے ہوں تو قرآن شریف پڑھائیں۔ فارسی جانتے ہوں تو فارسی، عربی جانتے ہوں تو عربی، صرف مسئلے مسائل سکھانے بتانے پر اکتفا کرتے ہوں تو وہی سہی۔ مقصد غالباً یہ تھا کہ مولوی صاحب کی پرورش ہو۔ گھر والوں کو ثواب ملے اور طالب علم اتنی دیر گھر اور محلے والوں کی عافیت میں خلل انداز نہ ہو۔

ان مضامین اور اسی طرح کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو، پہاڑے، حساب وغیرہ سیکھنے کے لئے دیہات کے پرائمری سے بھی پرانی سکول میں جانا پڑتا تھا جس پر پرائمری سے زیادہ پرشور ہونے کا اطلاق ہوتا تھا۔ اس بات پر اکثر ہنسی آئی ہے کہ جو زبان تمام عمر کے لئے وجہ معاش قرار پائی یعنی اردو، میں نے اسکول میں سیکھی ایسے ماسٹر سے جو اردو میں غالباً صرف اپنے دستخط کر سکتے تھے اور جو اتنے ہی کٹر برہمن تھے جتنے شریف النفس اور دردمند انسان۔ کوئی کلاس سامنے ہو وہ پڑھتے تھے بڑے زور زور سے صرف رامائن۔ وہ شاید ہندی سے بھی کچھ زیادہ لطف نہ رکھتے تھے اس لئے کہ میں نے ان کو کسی طالب علم کے قلم، پنسل، کاپی، تختی کو چھوتے نہ دیکھا۔ ان پر جو کچھ لکھا یا بنا ہوتا

دور سے دیکھ کر صحیح قرار دے دیتے۔ نہ خود کبھی سبق دیتے نہ سنتے۔ صرف رامائن سناتے۔ نہ کسی ہندو لڑکے کا لایا ہوا پانی پیتے، نہ کسی شخص یا شے کو ہاتھ لگاتے، دور سے ترس کھاتے، مسکراتے اور شفقت کرتے نظر آتے۔

بچپن میں میری صحت خراب رہتی تھی چنانچہ والدین کو جہاں کہیں "تیر بہدف" قسم کے طبیب، وید، ڈاکٹر، سیانے، فقیر، جوگی، بڑھیا، ملا یا مزار کی خبر ملی مجھے وہاں پہنچایا گیا اور علاج یا جھاڑ پھونک شروع کردی گئی۔ کم لوگوں نے طرح طرح کی اتنی دوائیں کھائی ہوں گی؛ لیپ لگائے ہوں گے، تعویذ باندھے ہوں گے، چڑھاوے چڑھائے ہوں گے، نقش گھول کر پئے ہوں گے، مزارات پر حاضری دی ہوگی جتنی میں نے آسیب سے نجات پانے کے لئے انار کے درختوں میں کسی کے لئے اتنے نقوش سلیمانی نہیں ٹھونکے گئے ہوں گے جتنے میرے لئے۔

۱۹۱۵ء میں، یہاں فرسٹ ایر میں داخل ہوا جب سے آج تک کم و بیش چالیس، بیالیس سال ان تمام چھوٹے بڑے انقلابات سے دو چار رہا جو علی گڑھ میں یا اس سے باہر دور و نزدیک پیش آتے رہے۔

ہائی اسکول کو الوداع کہنے کے بعد عدالت دیوانی میں عارضی کلرکی لی۔ اس زمانے میں گورنمنٹ کے دفتر میں کلرک ہونا بھی بڑی بات تھی۔ کلرکی کرتا رہا اور کبھی کبھی ڈبل روٹی بھی کھا لیتا۔ لیکن خوشی سے پھول نہ سکا۔ کس طرح سالہا سال کلرکی کی اور علی گڑھ کا طالب علم بھی رہا۔ کلرکی کے چکر میں کہاں کہاں گیا، کیا دیکھا، کیا گزری اور اس کا اثر مجھ پر اور میری تحریر پر کیا پڑا؟ بڑی طویل داستان ہے اور دلچسپ بھی لیکن اس کو چھیڑے کون؟ اس لئے کہ پھر اس کا سمیٹنا بہت مشکل ہوگا۔ تمام زندگی میں یہی ایک موقع ایسا آیا تھا جب میں نے کلرکی کے نقد کو طالب علمی کے ادھار پر ترجیح دی اور میرا عشق بے خطر آتش نمرود میں کود پڑا۔

پڑھنے کو کالج میں داخلہ ملا اور رہنے کو کچی بارک میں جگہ ملی۔ اس زمانے میں جون میں داخلہ ہو جاتا۔ تعطیل کلاں برسات میں ہوتی اور کالج وسط اکتوبر میں کھلتا۔ نئے پرانے طلبا کے ملنے پر جتنی تفریحیں ہونے والی ہوتیں وہ جون سے وسط جولائی تک ختم ہو جاتیں۔ یہ فطرت اور کالج کی ستم ظریفی تھی یا سازش کہ داخلے اسی زمانے میں ہوتے تھے اور ہر نیا لڑکا آگ اور پانی کی آزمائش سے گزر کر ہمیشہ کے لئے معصوم آزمودہ اور سرد و گرم چشیدہ ہو جاتا۔

کچی بارک (سید محمود کورٹ) کیا چیز تھی؛ کوئی عمارت تھی، عبادت تھی، علامت یا حادثہ، یہ سب تھی۔ ان کے علاوہ کچھ اور بھی۔ ایسی زار و زبوں عمارت اس وقت کالج کے رقبہ میں کہیں اور نظر نہ آتی تھی۔ معلوم نہیں کب کی بنی ہوئی کھپریل کی چھت، مٹی کی دیوار و در، نہایت درجہ نیچا، بودا، بوسیدہ برآمدہ جس کی کڑیاں جگہ جگہ سے گل بھی گئی تھیں اور کھسک بھی رہی تھیں جن میں لکڑی کے آڑے ترچھے طرح طرح کے پیوند لگائے گئے تھے۔ جون کی گرمی اور آندھی میں ایسا معلوم ہوتا جیسے پوری بارک مٹیالی گرم و دری دھول اور دھند میں جھول رہی ہو۔ کانپتی، کوستی، کراہتی، کھانستی!

میں نے کچی بارک پر "گل منزل" کے عنوان سے کئی نمبروں میں سے اس زمانے کے کالج میگزین (علی گڑھ منتھلی) میں مضامین لکھے تھے۔ طنز و ظرافت کے انداز میں لکھنے کی یہ میری سب سے پہلی کوشش تھی۔ اسی طرح کے چند مضامین کچھ عرصہ بعد "سیاحت برما" کے عنوان سے لکھے جو میگزین میں شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ یہ اس سفر کے تجربات یا تاثرات تھے جو ڈیوٹی ڈیپوٹیشن کے سلسلے میں کلکتہ، چاٹگانگ، میمیو کے دورے میں پیش آئے تھے۔ اب سوچتا ہوں تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس بات نے مجھ سے یہ مضمون لکھوایا، جس نے مجھے زندگی اور ادب کے اس ڈھرے پر

ڈال دیا وہی میری تقدیر تھی جو کچی بارک کی صورت میں مجھ پر منکشف ہوئی، جو میری تحریر اور طور طریقوں میں جب، جہاں اور جس طرح چاہتی ہے جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ نہ وہ مجھ سے جدا ہوتی ہے نہ میں اُسے جُدا کر سکتا ہوں۔ در اصل تمام عمر کچی بارک ہی میں رہا اور اب بھی ہوں۔

ابتدا میں مجھے کالج کی ظاہری شکل پسند نہ آئی۔ قدم قدم پر ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا جو طرح طرح کی اردو، طرح طرح کے تلفظ اور لہجے سے بولتے تھے۔ علی گڑھ میں ہندوستان کے دُور دراز گوشوں سے آئے ہوئے ساتھیوں کی اردو سننے میں آئی تو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اپنے دیار کے اشخاص کے علاوہ دوسرے لوگ غیر متمدن سے تھے۔ یہ تاثرات کلیتًہ احمقانہ تھے لیکن بہت دنوں بعد جب میں علما کم جمع رہ گیا تھا، سر اقبال مرحوم سے پہلے پہل نیاز حاصل کرنے لاہور گیا تو مرحوم کا اُردو کا لہجہ اور تلفظ سُن کر ایک لمحہ کے لئے دم بخود ہو گیا تلفظ کے ناہموار ہونے سے زبان کتنی غیر معتبر معلوم ہونے لگتی ہے۔

ایک دن مولانا (اقبال احمد خاں) سہیل سے جو ابتدا سے میرے "نگہبان فرشتہ" کی حیثیت اختیار کئے ہوئے تھے اپنے وسوسے بیان کئے۔ مولانا کمرے میں کھڑے تھے۔ اتفاق سے کمرہ بھی مولانا ہی کا تھا۔ وہیں اکڑوں بیٹھ گئے۔ بولے "ارے بھائی! ٹکسالی اُردو ہمارے دیار کیا لکھنؤ تک میں نہیں بولی جاتی۔ ہم سب تو کتابی اردو بولتے ہیں۔ رہا شعر و شاعری کا معاملہ تو یہ کچھ جونپور ہی پر موقوف نہیں ہر جگہ اس کی گرم بازاری ہے۔ ہندوستان کے دُور افتادہ خطّوں میں اردو کا شاعر ہونا پڑھے لکھے اور مہذب ہونے کی نشانی سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ لازم نہیں کہ جو شخص اُردو کا شاعر ہو وہ صحیح اور اچھی اُردو بھی بول سکتا ہے۔ اچھا دیکھو کسی دن تم کو ٹکسالی اُردو سنواؤں گا۔"

مولانا نیز ہم سب کو ذاکر صاحب مغرب کے جدید علوم اور نظریوں سے آشنا رکھتے تھے۔ لٹن لائبریری، یونین اور معلوم نہیں اور کہاں کہاں سے نئی نئی باتیں اور نئے نئے اشعار یاد کر لاتے اور ہم سب کو سناتے۔ ان سب پر مولانا تبصرہ کرتے اور صلے میں ہم سب کے لئے بہ طیب خاطر اور کبھی کبھی خوانچے والوں سے پھل، شیرینی یا کباب خرید دیتے۔ شعر و ادب کا صحیح و صالح ذوق پیدا کرنے، تنقیدی علمی انداز عام کرنے، نیز گفتگو اور روز مرّہ کے مشاغل کے آداب میں شائستگی ملحوظ رکھنے کی مولانا نے ایک روایت قائم کر دی تھی۔

ایک دن مولانا نے مجھے ساتھ لیا۔ فرمایا "چلو تم کو دلّی کی زبان سنواؤں۔" چنانچہ ساتھ ہو لیا۔ کچھ دیر تک کچّی پکّی بارکوں کے غلط کردوں میں اعتماد کے ساتھ داخل ہوتے رہے جیسے وہ کمرے اور اس میں رہنے والے مدّت سے جانے پہچانے ہوئے تھے۔ بالآخر فضل الرحمٰن قدوائی (ابجی مرحوم) کے کمرے پر پکّی بارک پہنچے۔ پوچھا "آغا حیدر حسن نہیں آئے؟" مرحوم نے ملازم بھیج کر کہیں سے آغا صاحب کو بلوایا۔ موصوف دلّی کے رہنے والے ہیں۔ علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ اب حیدر آباد میں رہ بس گئے۔ دلّی کی زبان بالخصوص بیگمات کی، دلی کے کوچے، دلّی والوں کی سیر و تفریح، شادی غمی، طور تہذیب، رسم و رواج، پہننے اوڑھنے، اُٹھنے بیٹھنے سے جتنے یہ واقف ہیں شاید ہی کوئی ہو۔ مولانا نے میری طرف اشارہ کر کے کہا "بھئی آغا حیدر ان کو دلّی کی زبان سنوانے لایا ہوں۔" پھر تو آغا صاحب نے "گُل افشانیٔ گفتار" ہی نہیں "انداز" گل افشانیٔ گفتار کا وہ رنگ دکھایا کہ میں دنگ رہ گیا۔ اور یہ سب اس طور پر نہیں جیسے کوئی رٹی ہوئی تقریر سُنا رہا ہو بلکہ جیسے ہم آپ روز مرّہ کے واقعے پر بے تکلف بات چیت کر رہے ہوں۔ یا جیسے ریشم پر موتی غلطاں ہوں۔

کچھ دنوں بعد سید آلِ عبا قادری مارہروی سے ملاقات ہوئی۔ یہ کالج میں مجھ سے روز گار تھے۔ طلاقتِ لسانی اور علم مجلسی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ بڑے بڑوں کی کور دبتی تھی۔ لکھنؤ کے ہر طبقے کی زبان پر اتنا عبور تھا کہ خود حضرات لکھنؤ ان کے اس کمال کے معترف

تھے۔ سید صاحب کے مضامین کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ جن صاحبوں کو مطالعے کا اتفاق ہوا ہے وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ آغا صاحب اور سید صاحب نے اس زمانے کے دہلی اور لکھنؤ کے احوال و معاشرت کی کیسی دلکش عکاسی کی ہے۔ آغا صاحب کے مضامین "بے پر کی" کے عنوان سے آج سے تقریباً ۲۵، ۲۶ سال قبل میں نے علی گڑھ میگزین کی طرف سے شائع کئے جو بہت پسند کئے گئے تھے۔

میری طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ میں کرکٹ کے بڑے زبردست میچ ہوئے۔ ہندوستان کی تقریباً ساری مشہور ٹیمیں آئیں اور دونوں طرف نامور کھلاڑی اپنے جوہر برسرِ کار دیکھے گئے۔ چار سال تک مسلسل علی گڑھ کی فیلڈ پر علی گڑھ کی جیت ہوئی۔

کھیل کے بعد کالج کی زندگی میں یونین کو بڑا دخل تھا جس عہد کا ذکر کر رہا ہوں اس میں انگریزی کے سب سے اچھے مقرر ذاکر صاحب اور اردو کے مولانا حسین تھے اور دونوں زبانوں میں ذاکر صاحب۔ عام خیال یہ تھا کہ انگریزی یا اردو کا کیسا ہی زبردست مقرر کیوں نہ آجائے ذاکر صاحب اور حسین صاحب علی گڑھ کی نمایندگی ہمیشہ بہتر طور پر کریں گے۔ تقریر کے کیسے کیسے معرکے ان دونوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں سر کئے جب اچھی تقریر کرنا قطع نظر اور باتوں کے بہت بڑا اور اتنا ہی مشکل فن سمجھا جاتا تھا اور خود کالج میں اچھی تقریر کرنے والے کافی تعداد میں موجود تھے۔

کالج میں طلبا کے علاوہ اسٹاف میں دو اصحاب کو انگریزی میں تقریر کرنے کی شہرت حاصل تھی۔ ایک تاریخ کے پروفیسر اے ایف رحمٰن بی۔ اے (آکسن) ممبر لیجسلیٹو کونسل اور ممبر پبلک سروس کمیشن جن کو گورنمنٹ نے سر کے خطاب سے بھی نوازا تھا اور دوسرے پروفیسر انعام اللہ خاں جو انگریزی اور منطق پڑھاتے تھے۔ اولڈ بوائے کی حیثیت سے عبدالرحمٰن صدیقی (سندھی) کا نام بڑی عزت اور محبت سے لیا جاتا تھا۔ علی گڑھ سے شیفتگی پیدا کرنے میں صدیقی صاحب کا مجھ پر بڑا احسان ہے۔

انعام اللہ خاں صاحب انگریزی اور منطق پڑھاتے تھے۔ پرانے انداز کی مرصع و مقفیٰ انگریزی بڑی روانی اور طنطنے سے بولتے تھے۔ منطق کے نوٹ لکھاتے اور زبانی سنتے۔ ایک دفعہ مجھ سے منطق کی کلاس میں برہم ہو گئے۔ بات یہ ہوئی کہ سبق سنانے کی میری باری آئی۔ منطق مجھے پسند نہیں اس لئے کہ میری منطق اکثر دوسروں کی منطق سے جدا ہوتی ہے۔ رٹنے سے یوں گھبراتا ہوں کہ اس میں مجھے تشابہ بہت لگتا ہے۔ یعنی غزل پڑھتے پڑھتے اللہ رسول کا ذکر آجائے تو مناجات شروع کر دیتا ہوں۔ ہوا یہ کہ میں نے لکھائے ہوئے نوٹ میں اپنی طرف سے پیوند لگانے شروع کر دئیے۔ وہ بھی اس طرح کہ اکثر پیوند کا سائز اصل سے بڑھ جاتا اور پیوند بھی جگہ جگہ سے خستہ و خوار۔ اس پر یک سخت کتاب بند کر دی اور بڑی سنگلاخ انگریزی اور خشمناک لہجے میں فرمایا" دیکھو جی! یا تو انعام اللہ خاں سے اچھی انگریزی لکھو اور بولو یا پھر انعام اللہ خاں کی انگریزی رٹو، بیچ کا کوئی راستہ نہیں۔"

انٹر میجیٹ میں میرے مضامین قدیم روم و یونان کی تاریخ اور وہاں کا جغرافیہ تھے جن کے لکچرر قاضی جلال الدین صاحب مرادآبادی تھے۔ موصوف ایک زمانے تک علی گڑھ منتھلی کے اردو سیکشن کے ایڈیٹر اور نگران بھی رہے۔ بڑی محبت و شفقت سے پیش آتے۔ اسٹاف میں آگیا تو مدتوں ساتھ کام کرنے کی بھی عزت و امتیاز حاصل رہا۔ بڑے ذہین، ظریف، زندہ دل اور کنبہ پرور تھے۔ مایوس و ملول نہ دیکھے گئے نہ کسی اور کو محفل میں مایوس و ملول رہنے دیتے۔ خوب سوجھتی تھی۔ اس طرح کی طباعی نے ان کی ذہانت کو ایک تفریحی یا فلسفیانہ مشغلے کی طرف پھیر دیا۔ الفاظ کی الٹ پھیر اور ان سے معنی اخذ کرنے کے ایسے ایسے نئے اصول گھڑے یا پرانوں کو زیر و زبر کیا کہ بعضوں نے ان کے ہاتھ چومے

اور بقیہ نے اپنے سر کر لئے۔ اس مہم میں راقم السطور ان کا دستِ راست تھا اور جہاں کہیں ایسے الفاظ کے لئے اصول وضع کرنے یا معنی پہنانے کی ضرورت ہوتی جو کسی طرح قابو میں نہ آتے تو مجھ سے مشورہ کرتے اور میں توجیہہ و تلبیس کے ایسے نوادر پیش کرتا کہ اپنے وقت کا بڑے سے بڑا عطائی بھی امراض یا مذہب کی نہیں کر سکتا تھا۔ میرے مشورے سے ایسے الفاظ کے لئے ایک نیا کھاتہ کھول دیا گیا تھا جس کا نام "گھپلا کھاتہ" تھا۔ میرا کہنا یہ تھا کہ بالآخر اس ڈکشنری کا نام رکھنے کا مرحلہ پیش آئے گا۔ اس وقت تک کوئی موزوں تر نام دستیاب نہ ہو سکا تو لغت ہی کا نام "گھپلا کوش" یا "کڑھپ کوش" رکھ دیا جائے گا۔ ہندی میں شاید فرہنگ یا لغت کو کوش ہی کہتے ہیں۔ فارسی میں بھی آیا ہے " درعمل کوش ہرچہ خواہی پوش"۔ چنانچہ اس کھاتے میں وہ تمام الفاظ درج کر دیئے جاتے جن کی تعبیر و توجیہہ پر نہ قاضی صاحب کا ضمیر مطمئن ہوتا نہ مجھے اپنی بخشائش کی امید باقی رہ جاتی۔ ایک خیال یہ ضرور تھا کہ ممکن ہے استدادِ زمانہ سے دونوں ہموار ہو جائیں۔

مشاعرے کی علی گڑھ میں بڑی اہمیت رہی ہے۔ محض شعر و سخن کے اعتبار سے نہیں بلکہ ایک تہذیبی روایت کے اعتبار سے بھی۔ اب سے چند سال پہلے تک شعر و ادب کی سرپرستی تمام تر والیانِ ملک اور اکابر و امراء کی ذات اور ان کی ریاست سے وابستہ تھی علیگڑھ شعراء کی ان معنوں میں تو کفالت نہ کر سکتا تھا لیکن ان کی قدر و منزلت میں بیش از بیش حصہ لیتا رہا اور اس اعتبار سے شعر و سخن کی ترقی میں علی گڑھ کا بڑا قیمتی حصہ رہا ہے جس کی نظیر شاید کسی دوسری درس گاہ میں نہ ملے۔ کسی شاعر کے کلام کو علی گڑھ میں حسنِ قبول حاصل ہو جاتا تو اس کے اچھے اور مستند شاعر ہونے کی حیثیت مسلّم ہو جاتی۔

سب سے دلچسپ پوزیشن ڈائننگ ہال کی تھی۔ یہاں کے کھانے کی جو شکایت میرے زمانے میں تھی اس سے پہلے بھی رہی تھی اور آج بھی رہی ہے۔ شکایات کے اعتبار سے ایسا سدابہار ادارہ شاید ہی کہیں اور ہو۔ طنز و ظرافت کی میری ابتدائی مشق کچی بارک اور ڈائننگ ہال ہی سے شروع ہوئی۔

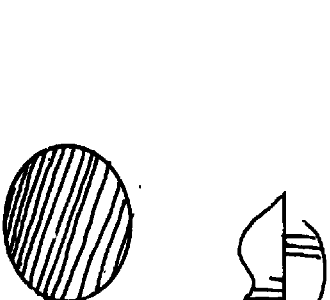
کالج کے عہد میں ڈیوٹی سوسائٹی یا انجمن الفرض کا شمار طلباء کے بڑے قابل قدر اداروں میں ہوتا تھا۔ اب بھی کچھ کم نہیں۔ ۱۸۹۰ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں اسے قائم کیا تھا۔ اس کے دو مقاصد بہت اہم تھے۔ ایک نادار لیکن ہونہار طلباء کے لئے مالی امداد فراہم کرنا دوسرے کالج کے بارے میں قوم اور ملک میں جو غلط فہمی پھیلی ہو اس کو دور کرنا۔ اس طور پر انجمن کا کام سرسید کے مقاصد کو آگے بڑھانا تھا۔ جب سے آج تک انجمن وہ فرائض یکساں تندہی سے بجا لا رہی ہے۔ ہر سال تعطیل میں طلباء ملک کے مختلف دور و نزدیک حصوں میں دورے کر جاتے ہیں اور جو کچھ جمع ہوتا ہے اسے انجمن کے فنڈ میں داخل کرتے ہیں۔

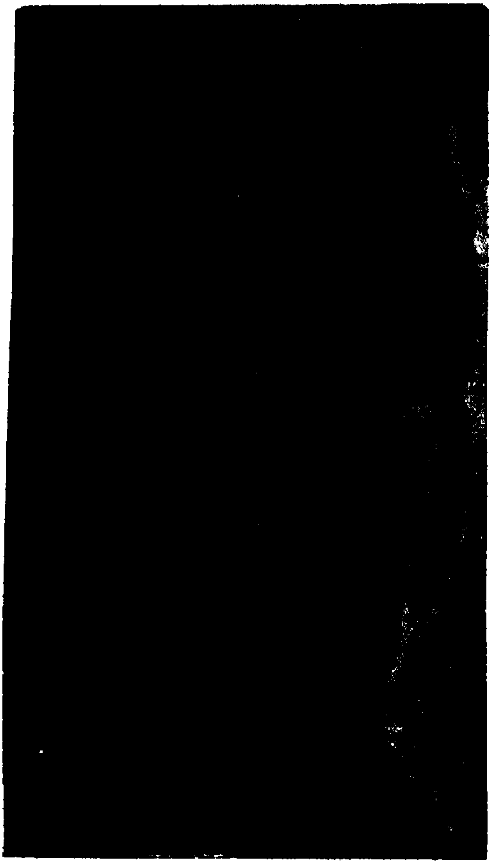
سوسائٹی سے دیرینہ تعلق کے لوازم میں ایک بات یہ بھی رہی ہے کہ مجھے طرح طرح کے مواقع اور مباحث پر کثرت سے خطوط اور مضامین لکھنے پڑے ہیں۔ ایسے خطوط لکھنے میں جس تحمل و توازن، خیر اندیشی، خوش مزاقی اور کبھی کبھی گلہ مندی یا آزردگی کا اظہار کرنا پڑتا وہ میرے طور طریقوں نیز میرے سلیقۂ تحریر کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوا۔ ان کے علاوہ کالج کے عہد سے آج تک طرح طرح کے مباحث پر جتنے مضامین، خطبے، پمفلٹ اپنے یا دوسروں کے لئے لکھنے پڑے میرا خیال ہے طالب علمی کے عہد میں علی گڑھ میں شاید ہی کسی اور کو لکھنے پڑے ہوں۔

کالج کے عہد میں کرزن ہسپتال اور یونانی مطب میں طالب علموں کے علاج کا انتظام رہتا تھا۔ ہسپتال کی وہی عمارت تھی جو آج ہے۔ حکیم صاحب کا مطب مارسین روڈ پر اس جگہ تھا جہاں اب ایک مختصر سی دو منزلہ عمارت ہے جس میں کم و بیش پندرہ سولہ سال راقم السطور مقیم رہا۔ اس زمانے میں دوا تجویز کرنے میں جتنی توجہ صرف کی جاتی اتنی مرض تشخیص کرنے میں نہیں۔ میری یہ عادت شاید اسی زمانے کی ہے جس میں ڈاکٹر صاحب کے تصرف کو بھی بڑا دخل ہے کہ یونانی علاج میں اس پر اصرار کروں گا کہ طبیب جو مرض چاہے تجویز کرلے، دوا میں اپنی تجویز کردہ استعمال کرواؤں گا۔ اس کے بہت سے فوائد ہیں۔ ایک یہ کہ طبیب کو مرض تشخیص کرنے اور دوا تجویز کرنے میں جتنی زحمت اٹھانی پڑتی ہے وہ مریض اور معالج میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس طریقے سے ایسے امراض کا بھی علاج یا انکشاف ہو جاتا ہے جن کی نہ مریض کو خبر تھی نہ معالج کو۔ تیسرے یہ کہ ہر حادثے کی بھی تصدیق ہو جاتی تھی جس میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا۔

ہسپتال میں بڑے ڈاکٹر صاحب سے ہم لوگوں کا زیادہ سابقہ نہیں رہتا تھا۔ ہمارا کھاتہ ان کے اسسٹنٹ ڈاکٹر شفاعت اللہ صاحب سے کھلا ہوا تھا جن کو محض بر بنائے قافیہ یا حلیہ تمام کالج ہلاکت اللہ کہتا تھا۔ پستہ قد، سن رسیدہ، کاٹھی مضبوط، آنکھیں تیز اور بھوری، داڑھی چڑھی ہوئی اور خضاب سے لیس، آواز مخدوش، ہاتھ میں رعشہ، نسخہ لکھتے تو انگشتِ شہادت اچھلتی رہتی۔ اس زمانے میں کوئی طالب علم دوا کے لئے ہسپتال جاتا تو دو چار دوست ادھر ادھر سے ساتھ ہو جاتے۔ ایک دفعہ میں بھی اسی طرح کی مہم میں ہمرکاب تھا۔ ساتھیوں میں سے ایک نے کہا: "قربان جایئے اس کمال پر، ڈاکٹر صاحب لکھتے بھی جا رہے ہیں اور ٹائپ بھی کرتے جا رہے ہیں"۔

گزشتہ اوراق میں جن اصحاب یا اداروں کے بارے میں عرض کیا گیا ہے ان کے علاوہ کتنے اور ممتاز و منفرد کردار ذکر ہونے سے رہ گئے جو ذہن کے دھندلے افق پر بار بار اور بے اختیار ابھرتے ہیں لیکن ان صفحات میں ان سب کا ذکر میرے لئے بڑا مشکل ہے۔





شوکت تھانوی

"......... یہاں تو مقولہ یہ تھا کہ کوڑی نہ رکھ کفن کو۔ شرافت اُسی وقت تک ساتھ دیتی تھی جب تک روپیہ ساتھ چھوڑے رہتا تھا اور جہاں جیب میں کچھ آیا بس یہ فکر رہتی تھی کہ کسی طرح یہ صَرف ہو جائے گر جائے۔ کوئی چرا لے۔ کوئی مانگ لے، مختصر یہ کہ ہمارے پاس سے جائے ——————.........."

کتنی سچی بات کہی ہے جس کسی نے بھی کہی ہے کہ ہر زمانہ میں اور دنیا کے ہر گوشہ میں ایک قطب اور ایک احمق ساتھ ساتھ پیدا ہوا کرتا ہے اور اکثر تو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی گھر میں بھائی قطب ہوتا ہے تو دوسرا احمق۔ اب ذرا اس کلیہ کی صداقت ملاحظہ ہو کہ کہاں کرشن مراری اور کہاں ایک ادبی مداری۔ سانہ ایک نہ سہی مگر مقام ایک ہی ہے۔ کرشن کا استھان بندرابن ضلع متھرا جنم بھومی بنتا ہے کس کی؟........ شوکت تھانوی کی۔

یہ ایک تاریخی لطیفہ نہیں بلکہ ایک جیتا جاگتا واقعہ ہے۔ بندرابن کے کوتوال صاحب منشی صدیق احمد مرحوم جو پہلے تو اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے مگر شادی کے بارہ سال بعد اولاد ہوئی بھی تو لڑکی۔ اپنے ارمان کی تکمیل کے لئے پھر چار سال تک بیچارے کو انتظار کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ ۲ فروری ۱۹۰۴ء کو صبح ہونے سے قبل ہی ان کی یہ تمنا بھی پوری ہو گئی اور اولاد نرینہ سے بھی ان کی نصف بہتر کی گود پُر ہو گئی۔ سپاہیوں نے گولے داغے، بھانڈوں نے ڈھول بجائے۔ نٹوں نے کرتب دکھائے۔ ایک ہفتہ تک چہل پہل رہی۔ عقیقہ کے دن نام رکھا گیا۔ محمد عمر اور تاریخی نام نکلا تنجیر احمد۔ یہ ان ہی حضرت کا نام اور تاریخی نام ہے۔ جن کو اب شوکت تھانوی کہا جاتا ہے۔ تھانوی اس لئے نہیں کہا جاتا کہ پیدائش بندرابن کے تھانہ میں ہوئی بلکہ اس لئے کہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر اس خاندان کا وطن ہے۔

پیدائش سے لے کر اس وقت تک کی زندگی جب تک کہ بچہ ہوش نہ سنبھالے دراصل اس کی ذاتی زندگی نہیں ہوتی بلکہ اس کی حیثیت ایک کھلونے کی ہوتی ہے جس سے اس کے والدین جس طرح ان کا جی چاہتا ہے کھیلتے ہیں۔ سنا ہے میرا یہ زمانہ زیادہ تر بیماریوں میں گزرا۔ والد صاحب کی رشوت کی تمام آمدنی ڈاکٹروں کی فیس اور دواؤں کی قیمت میں صرف ہو جاتی تھی۔ مال حرام بجائے حرام کیونکر صرف نہ ہوتا۔ ضعفِ معدہ کی شکایت اس قدر شدید تھی کہ ڈاکٹروں نے غذا پر نہایت سخت پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ ہماری شاعری کی ابتداء یہیں سے ہوتی ہے شاعری اور فاقہ مستی میں جو چولی دامن کا ساتھ ہے وہ یہاں بھی کارفرما ہوا اور سات سال کے اس فاقہ مست نے غیر شعوری طور پر ایک مطلع عرض کیا۔ ملاحظہ ہو ؎

نہ دانا نہ پانی میں کس سے کہوں
ارے میرے اللہ میں اب کیا کروں

میں نے اپنی ہوش کی آنکھیں بھوپال کے ایک عالی شان مکان میں کھولیں۔ بڑے لاڈ پیار میں زندگی کے دن گزر رہے تھے کہ معلوم نہیں کس نے والد صاحب کو یہ مشورہ دیا کہ لڑکے کی تعلیم شروع ہونا چاہئے۔ اور آخر کار ایک ماسٹر صاحب بلائے گئے۔ معلوم ہوتا تھا بندر کا تماشا شروع کریں گے۔ ان حضرت نے مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی ریڈروں کو رٹانا شروع کیا مگر کچھ ہی دن پڑھا سکے تھے کہ ایک دن والد صاحب نے ان کو پڑھاتے ہوئے کسی لفظ کے غلط تلفظ پر جو غور کیا تو اسی دن ماسٹر صاحب کا حساب کر دیا گیا۔ اس کے بعد ایک اور ماسٹر صاحب آئے جو چوتھے دن اس لئے نکال دیئے گئے کہ وہ ذرا سخت قسم کے آدمی تھے۔ اور مار پیٹ میں ہاتھ کھلا ہوا

تھا۔ اب ایک اور ماسٹر صاحب آئے جن کا اسم مبارک میر امجد علی تھا۔ چھوٹا سا قد، ناک کی پھنگی پر رو پہلی عینک، منہ میں کچھ دانت اور باقی پان، جیب میں گھڑی اور گھڑی کی زنجیر میں لٹکا ہوا قطب نما۔ عالم یہ تھا ہمارے ان ماسٹر صاحب کا کہ تشریف لائے، اندر سے ان کے لئے چلے آگئی، وہ نوش فرمائی، پان آگئے، وہ منہ میں رکھ لئے۔ اور پھر کتاب سامنے رکھ کر ہم کو جھومنے اور وہ لگے اونگھنے۔ کبھی کبھی اونگھتے اونگھتے ایک نعرہ بلند کیا آر۔اے۔ٹی۔ ریٹ۔ ریٹ معنی چوہا اور پھر اونگھ گئے۔ اگر وہ بالکل سوگئے تو ہم نے ان کے چہرہ پر روشنائی سے کچھ گل بوٹے بنا دیئے۔ اور اگر وہ جاگتے رہے تو ہم سلیٹ پر مرغے کی تصویر بناتے رہے اور منہ سے بکتے رہے آر۔اے۔ٹی۔ ریٹ۔ ریٹ معنی چوہا۔ مگر فلک کج رفتار کو ہمارا یہ سوراج پسند نہ آیا اور ایک دن والد صاحب نے نہایت حیرت سے یہ منظر دیکھا کہ صاحب زادے اپنے ماسٹر صاحب سے آنکھ مچولی دھپ کھیل رہے ہیں۔ چنانچہ ماسٹر صاحب دوسرے ہی دن ہٹا دیئے گئے۔

والد صاحب نے لوگوں کے کہنے سننے میں آکر آخر ہمارا داخلہ انگلو ورنیکولر اسکول کے جماعت اطفال میں کرا دیا۔ اب ہم سیاہ شیروانی اور نیلے صافے میں ایک سپاہی کے ساتھ اینگلو ورنیکولر اسکول جانے لگے۔ دوپہر کو ایک دوسرا سپاہی ٹفن کیریر میں کھانا لے کر آتا تھا۔ اور ہم پڑھنے کیا تھے۔ اسکول میں بھی گڑیاں کھیلتے تھے۔ مگر ترقی زبردستی ہمارے سر منڈھی گئی اور ہم کو درجہ اول میں جانا پڑا۔ انگلو ورنیکولر اسکول میں ہمارا بہت کم زمانہ گزرا۔ اس لئے کہ تھوڑے ہی دنوں بعد والد صاحب نے ۱۹۱۴ء میں بھوپال کی ملازمت ترک کر دی اور ہم لوگ لکھنؤ آگئے۔ البتہ اتنا ہم کو اب بھی احساس ہے کہ اسکول کی تعلیم یا پرائیویٹ ٹیوٹروں کی تمام جدوجہد سے زیادہ ہم پر اثر اس تربیت کا ہو رہا تھا جو بھائی جان مولانا ارشد تھانوی کی طرف سے ہم کو ہو رہی تھی۔ بھائی جان نے ہمارے نام لاہور کا اخبار پھول منگوانا شروع کر دیا اور یہ اخبار ہماری تمام اسکول کی کتابوں سے زیادہ ہمارے لئے مفید ثابت ہوا۔ اب بھائی جان نے ایک نئی ترکیب کی۔ چھوٹی چھوٹی کہانیاں خود لکھتے اور ہمارے نام سے پھول میں چھپنے کو بھیج دیا کرتے۔ اب تو ہمارا پوچھنا ہی کیا، مضمون نگار ہو گئے۔ اپنے نام سے چھپی ہوئی کہانیاں سب کو دکھاتے پھرتے تھے۔ دراصل ادبی ذوق اسی وقت بھائی جان نے معلوم نہیں جان بوجھ کر غیر ارادی طور پر ان صورتوں سے ہم میں پیدا کیا تھا جس کو بعد میں وہ دوسری صورتوں سے ابھارتے رہے۔

لکھنؤ بھی ہم دراصل اس وقت آئے جب ہوش تو آچکا تھا مگر آدمیت سرے سے غائب تھی اور اگر سچ پوچھئے تو باقاعدہ تعلیم اب تک شروع نہ ہوئی تھی۔ والد صاحب اس سلسلہ میں بلا کے بے پروا، والدہ صاحبہ بے چاری گھر کی بیٹھنے والی لاکھ چاہا کہ لڑکے کو کسی اچھے استاد کے سپرد کر کے کسی معقول اسکول میں بھیج دیں۔ مگر بس اتنا ہی چلا کہ حضرت مولانا عین القضاۃ کے مدرسہ فرقانیہ میں بھیج دیا۔ یہاں قرآن مجید کی تعلیم شروع ہو گئی۔ مگر پڑھائی سے زیادہ بڑے لڑکوں کی بری صحبت کے اثرات ہم نے قبول کرنا شروع کئے۔

ماسٹر پیارے لال صاحب لکھنؤ میں ہمارے پہلے پرائیویٹ ٹیوٹر تھے۔ بہت محنت سے پڑھاتے تھے۔ بہر صورت ان بیچارے نے انگریزی کی ایک آدھ کتاب کسی نہ کسی طرح ختم کرا ہی دی اور حساب وغیرہ میں اپنے نزدیک ہم کو چالو کر دیا۔ باقی مضامین بھی ضمنی طور پر ہمارے مطالعہ سے وہ بیچارے گزارتے رہے لیکن یہ امید ان کو بھی غالباً نہ ہو سکی کہ یہ بیل منڈھے چڑھ سکے گی۔

غالباً والدہ صاحبہ کے طعنوں سے تنگ آکر یا یونہی اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے ایک دن والد صاحب نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ خود ہم کو فارسی پڑھایا کریں گے۔ ہمارے لئے آمدنامہ خریدا گیا اور گھر کے باہر میدان میں والد صاحب نے ایک چارپائی پر یہ مکتب کھول دیا۔ آمد۔ آمدند۔ آمدی۔ آمدید۔ آمدم۔ آمدیم کا پہلا سبق ہم کو دیا گیا۔ پہلا دن۔ پہلا سبق اور والد صاحب سے پہلا سابقہ

مگر معلوم ہوتا تھا کہ شامت اسی پہلی ہی منزل پر استقبال کے لئے آئی ہوئی ہے۔ والد صاحب نے ایک گھنٹہ کا وقت دیا تھا۔ اس پہلے سبق کو سننے کے لئے اور یہاں آثار یہ تھے کہ صاحبزادے کورے کے کورے گویا اب تک کچھ پڑھا ہی نہیں۔ آخر طوفان امڈا۔ برق و رعد۔ زلزلہ۔ انہدام چیخ گریہ حقے کی چلم الٹ گئی۔ آمدنامے کے پرزے فضا میں ایران کی آزادی کے پرچم اڑانے لگے۔ اور ہم ہندوستان کی غلامی کی زندہ تصویر بنے اپنی موت کے منتظر سرنگوں بیٹھے ہی تھے کہ یکایک والد صاحب نے بچکر جو ہم کو جھنجھوڑا ہے تو تہذیب کا کرتہ معہ بنیائن ان کے ہاتھ میں تھا اور اس کا گریبان ہمارے برہنہ جسم پر۔ کپڑوں کے بعد اب غالباً کھال کی باری تھی کہ اس ہنگامہ کی اطلاع پاکر ماموں صاحب گھر سے نکل آئے والدہ نے کھڑکی سے جھانکنا شروع کیا۔ راہ گیر چلتے چلتے کھڑے ہوگئے اور کتے نے دُم ہلانا چھوڑ دی۔ ماموں صاحب نے آکر ہم کو وہاں سے اٹھایا اور بمشکل تمام گھر کے اندر پہنچایا۔

آمدنامہ کے سلسلہ میں جو عذاب مجھ پر نازل ہوا تھا اس کے بعد بھی والد صاحب کو اطمینان نہ ہوا اور آپ نے عذاب کے ایک مستقل فرشتے یعنی مولانا عبدالرحیم کلیم کے سپرد کرنے کا ہمارے متعلق فیصلہ کر دیا۔ لہٰذا طے یہ ہوا کہ ہم روزانہ مولانا کے در دولت پر حاضر ہوا کریں۔ مولانا نے ہم کو نہایت شفقت سے پڑھانا شروع کیا کسی قسم کی سختی نہیں فرمائی اور جو دہشت ان کی صورت دیکھ کر قائم ہوئی تھی وہ رفتہ رفتہ دور ہوگئی۔ مولانا کا پڑھانے کا طریقہ نہایت دل نشیں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی ہمارے لئے چند ہی دنوں میں آسان ہوگئی۔

محض فارسی کے بل بوتے پر زندگی بسر نہیں ہو سکتی تھی۔ والدہ صاحبہ کو سب سے زیادہ فکر تو یہ تھی کہ صاحبزادے کی عمر بڑھ رہی ہے اور باقاعدہ تعلیم کا کہیں نام و نشان نہیں۔ آخر ان کے کام ان کی ایک بہن آئیں جن کے شوہر ایک مڈل اسکول میں ملازم تھے۔ ہمارے ان خالو کا اسم گرامی تھا سید محمد رضا اور کہلاتے تھے منّن۔ ہمارے ان خالو منّن نے ایک آدھ حساب کا سوال ہم سے حل کرایا۔ کچھ اردو پڑھوائی کچھ انگریزی کا جائزہ لیا اور نہایت ناک بھوں چڑھا کر کہہ دیا "فش" یعنی کچھ بھی نہیں۔ مگر ان کو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ لہٰذا انہوں نے مشورہ دیا کہ ہمارا داخلہ ان کے اسکول میں کر دیا جائے۔ ان کے اسکول کا نام لال اسکول تھا۔ ہم باوجود نالائق محض ہونے کے چوتھے درجے میں لے لئے گئے اور پہلے ہی سال نہ جانے کیونکر چوتھا درجہ پاس کر کے پانچویں میں آگئے۔ تیسرے سال چھٹا درجہ پاس کر کے لال اسکول کو چھوڑ دیا۔ اب ہمارا داخلہ گورنمنٹ ہائی اسکول حسین آباد میں ہوا۔ پڑھنا لکھنا تو خیر یہاں بھی برائے نام تھا البتہ تمام مشاغل میں ہم پیش پیش تھے۔ والد صاحب کو ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی جو گھر ہی پر رہ کر ہماری تعلیم اور تربیت کی پوری ذمہ داری اپنے سر لے لے۔ کچھ دنوں کے بعد ایک بے بی آسٹن قسم کے بزرگ تشریف لائے۔ پتہ چلا کہ یہ حضرت ہمارے اتالیق مقرر ہوئے ہیں۔ جونپور کے رہنے والے ہیں، اسم مبارک بخشش احمد ہے۔ غریب خانہ ہی پر قیام فرمائیں گے اور چوبیس گھنٹے ہم پر نازل رہیں گے۔ چنانچہ ان بزرگ نے ہم کو اپنی نگرانی میں لے لیا اور ہماری تعلیم و تربیت شروع کر دی۔ ان کا ہر ایک سے یہ کہنا کہ یہ لڑکا بلا کا ذہین ہے اس کی ذہانت سے آج تک کام نہیں لیا گیا۔ ورنہ یہ کوئی چیز ہوتا ہم کو زبردستی ذہین اور تعلیم کا شوقین بنا رہا تھا۔ خوشامد پسندی تو خیر فطرت میں تھی ہی اسی دکھتی ہوئی رگ پر ماسٹر بخشش احمد کی نباضی نے ہاتھ رکھ دیا اور اب وہ بے پرواہ طالب علم جو تعلیم کو والدین کا استبداد سمجھتا تھا۔ تعلیم کو اپنا دلچسپ ترین شغل سمجھنے لگا۔

اب ایک بات پیدا ہوگئی تھی کہ طبیعت میں شعر سے دلچسپی اور موزونیت کا احساس خود ہم کو ہونے لگا تھا۔ ایک آدھ مصرع

کبھی کبھی خود موزوں کر لیتے تھے مگر ہوتا تھا ایسا تھرڈ کلاس کہ اس کو سنانے یا کہنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ ہمارے شاعر ہونے کی اطلاع ہمارے ہم جماعتوں کو بھی ہو چکی تھی اور ہم ان کو اپنا ہی کلام جھوم جھوم کر نہایت خوش آوازی کے ساتھ سنایا کرتے تھے اور ان پر اپنا رعب جماتے تھے ہمارے اردو ٹیچر مولوی حفاظت علی صاحب بھی ہم کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اسی زمانہ میں بھائی جان ارشد تھانوی صاحب تشریف لائے اور ان کو ہمارے اتالیق ماسٹر بخشش احمد صاحب نے ہماری شاعرانہ صلاحیت کی اطلاع دی تو ان کو کسی طرح یقین نہ آیا آپ نے امتحان لینے کے لئے ہم کو ایک مصرع دیا ؎

سب چاند تارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا

اور فرمایا کہ اس پر مصرع لگاؤ۔ ہم نے تھوڑی دیر میں اس پر مصرع تو نہیں لگایا بلکہ اپنے مصرع پر اس کو لگا کر مطلع کر دیا ؎

سب چاند تارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا
غم ناک سیاہی رات کی تھی اب اس کا اندھیرا دور ہوا

بھائی جان نے جو یہ مطلع دیکھا تو میں ان کی خوشی بیان نہیں کر سکتا۔ میری کسی صلاحیت پر میرے عزیزوں میں سے کوئی بھی اتنا خوش نہ ہوا تھا اور خود میں بھی خوش تھا کہ اس امتحان میں کامیاب ہو گیا۔ کچھ دن بعد ہم نے ایک پوری غزل کہہ کر لکھنؤ کے ایک رسالے کو اس خوشامد کے ساتھ بھیج دی کہ اس کو چھاپ دیا جائے۔ اس غزل کے چھپنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری تمام ادبی صلاحیتیں ایک مرتبہ انگڑائی لے کر بیدار ہو گئیں۔ اب غزل پر غزل کہنے لگے اور مارے غزلوں کے "ترچھی نظر" کا دفتر پاٹ دیا۔ غزلیں کہنے کے علاوہ ترچھی نظر کے افسانے پڑھ کر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم خود کیوں نہ کہانیاں لکھیں۔ چنانچہ بہت ڈرتے ڈرتے ایک افسانہ لکھ کر ترچھی نظر کو بھیجا اور ہم کو تعجب ہوا کہ وہ افسانہ من و عن چھپ گیا۔ دوسرا افسانہ، تیسرا افسانہ اور چوتھا افسانہ، ہر افسانہ چھپ جایا کرتا تھا۔ لیجئے شاعر تو تھے ہی افسانہ نگار بھی بن گئے اور ہماری ادبی زندگی کا یہ بچپن نہایت طوفان خیز امنگوں کے ساتھ پروان چڑھنے لگا۔

تعلیم سے فراغت کا آخر کہاں تک انتظار کیا جاتا۔ ارمان بھری ماں بیٹے کا سہرا دیکھنا چاہتی تھی۔ آخر والدہ صاحبہ نے والد صاحب کو اور ہمارے بزرگوں نے حکیم مولوی محمد سجاد حسین صاحب کو اس بات پر راضی کر لیا کہ آپ نکاح کر دیجئے۔ لڑکی کو رخصت نہ کیجئے گا۔ تا وقتیکہ آپ کی شرط پوری نہ ہو جائے یعنی لڑکا انٹرنس پاس نہ کر لے اور اس کے علاوہ ان پر ایسا زور دیا گیا کہ وہ بیچارے بڑی لڑکی کے عقد سے پہلے ہی منجھلی لڑکی کے عقد پر راضی ہو گئے۔ یہ واقعہ سنہ ۱۹۲۴ء کا ہے۔ چنانچہ دن تاریخ سب طے ہو جانے کے بعد نہایت سادگی کے ساتھ ہم خود ماموں صاحب اور والد صاحب کے ہمراہ رحمت منزل احاطہ خام فقیر محمد خان پہنچے اور خود ہمارے خسر صاحب نے ایک قریبی مسجد میں اپنی صاحبزادی کا نکاح ہمارے ساتھ پڑھ دیا۔

اسی زمانہ میں علی گڑھ کالج کی جوبلی منائی جا رہی تھی اور والد صاحب قبلہ علی گڑھ گئے ہوئے تھے وہاں آپ نے یکایک یہ رائے قائم کر لی کہ ہم کو علی گڑھ ہی میں داخل کر دیا جائے۔ چنانچہ ہم کو علی گڑھ سے تار دیا کہ تم فوراً آجاؤ۔ اور جوبلی کے جشن کی سیر کرو۔ تار ملتے ہی ہم علی گڑھ روانہ ہو گئے۔ جوبلی میں اپنے بہت سے دوست مل گئے۔ امین سلونوی، وصل بلگرامی، پیرزادہ فدا حسین،

ساغر نظامی، اور مولانا سیماب وغیرہ

علی گڑھ سے واپسی کے بعد علی گڑھ کا کورس ختم ہو گیا۔ طے یہ ہوا کہ سال بھر تک گھر ہی پر پوری تیاری کے بعد ایک دم علی گڑھ سے پرائیویٹ طور پر امتحان دے دیں گے۔ جب پوری طرح خود اپنے اطمینان کے قابل تیار ہو گئے تو یکایک بیمار پڑ گئے۔ بخار آیا اور جم کر رہ گیا۔ تقریباً پچیس تیس انجکشن ہوئے ہوں گے کہ ہم صحت یاب ہو گئے۔ البتہ اس سلسلہ میں یہ سال خراب ہو گیا۔

تعلیم تو اب گویا ختم ہو ہی چکی تھی اور اب ہم بالکل ہوم لبر تھے۔ خالص انشا پرداز۔ اس زمانہ میں رسالہ "ترچھی نظر" جو امین سلونوی کی ادارت میں آ کر رسالہ "نظر" بن چکا تھا اور اس کا ترچھا پن نکالا جا چکا تھا ہمارے افسانوں سے کسی ماہ خالی نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ معلوم نہیں کیا سوجھی کہ ایک مزاحیہ مضمون "میٹھے چاول" کے نام سے لکھ دیا۔ یہ مضمون بہت پسند کیا گیا۔ حالانکہ تھا بڑا عوام پسند قسم کا سطحی مضمون جس کو دیکھ کر اب بہت شرم آتی ہے۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ تم اسی طرز کے لئے اپنے قلم کو مخصوص کر لو۔

اب تک ہم صرف رسالہ ترچھی نظر اور اس کے بعد اسی کی اصلاحی شکل رسالہ نظر سے واقف تھے مگر ایک دن پاٹا نالہ کے بازار سے گزر رہے تھے کہ دھندلا سا سائن بورڈ نظر آیا جس پر لکھا تھا "رسالہ حسن ادب لکھنؤ"۔ اور سامنے ہی ایک صاحب بیٹھے تھے۔ کرتا اتارے۔ پاجامہ پہنے، سر منڈا ہوا اور کانوں میں اکھاڑے کی لگی ہوئی مٹی۔ صورت دیکھ کر پتہ چل گیا کہ آدمی ہیں پہلوان قسم کے۔ آپ خود ہی اس رسالہ کے مالک تھے، خود ہی مدیر تھے، خود ہی کاتب تھے۔ خود ہی پریس مین۔ اور آپ نے یہ بھی بتایا کہ آپ ایک معقول قسم کے آدمی کی تلاش میں ہیں جس کا نام ادارت میں دیا جا سکے۔ ہم نے ذمہ داری کو قبول کر لیا اور رسالہ کا دوسرا ہی روپ ہو گیا۔ اب جو تازہ نمبر نکلتا ہے تو سرورق پر لکھا تھا۔ ایڈیٹر ملک التحریر شیخ محمد عمر شوکت تھانوی۔ یہ ملک التحریر اس لئے تھا کہ کسی رسالہ کے سرورق پر ایڈیٹر کے بجائے..... "رئیس التحریر" ہماری نظر سے گزر چکا تھا۔ لہٰذا ہم نے اپنے لئے ملک التحریر سے کم کوئی درجہ مناسب نہ سمجھا۔ منشی واحد علی صاحب اب بھی موجود ہیں اور اخبار سرپنچ کی کتابت فرماتے ہیں۔

سنہ ۱۹۲۶ء کے اوائل ہی سے ہماری طرف سے یہ کوشش شروع ہو چکی تھی کہ کسی طرح رخصتی کی رسم پوری کر دی جائے اور ہماری سعیدہ ہمارے پاس آجائیں مگر ہمارے خسر صاحب کے حالات اجازت نہ دیتے تھے کہ یہ تقریب عمل میں آسکے۔ والدہ صاحبہ سے خط لکھوائے۔ والد صاحب نے اصرار کیا۔ اور جب سب کا نتیجہ کچھ نہ نکلا تو مارے عقلمندی کے ہم نے نہ معلوم ان کو خط میں کیا لکھ دیا کہ والد صاحب نے یہ خط دیکھا اور ہم کو گھر سے نکل جانے کا نوٹس دے دیا۔ آخر ہم نے پھر ایک نہایت مہذب قسم کا معذرت نامہ لکھا۔ اس کش مکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ رخصتی کی تاریخ طے ہو گئی اور دسمبر ۱۹۲۶ء میں ہم پھر ایک مرتبہ دولہا بن کر لکھنؤ سے مین پوری گئے۔ نہایت سادگی کے ساتھ رخصتی عمل میں آئی اور ہم اپنی سعیدہ کو لکھنؤ لے آئے۔

اب ہم خود اپنی نظر میں کچھ وقیع، کچھ بھاری بھرکم اور کچھ ذمہ دار سے معلوم ہونے لگے تھے حالانکہ غیر ذمہ داریوں کا عالم یہ تھا کہ بیوی گھر میں آ چکی تھی اور ہم محض رئیس تھے۔ نہ کمانے کی فکر نہ کچھ تدبیر مستقبل۔ تعلیم چھوٹ ہی چکی تھی۔ گھر کی خبر بھی ہم کو تھی کہ معلوم نہیں خرچ کیونکر چلتا ہے۔ والد صاحب کی معمولی پنشن کے علاوہ اور کوئی خاص آمدنی نہ تھی۔ جو روپیہ جمع تھا وہ بھی خرچ ہو چکا تھا۔ مگر ان میں سے کوئی بات بھی ہمارے ذہن میں نہ آسکی۔ ہم تو اپنے شوہرانہ ٹھاٹھ میں تھے کہ ایک علیحدہ سجا ہوا کمرہ ہم کو مل گیا تھا

جس میں معطر معطر ایک دلہن شام کو پھولوں سے لدی اور دن کو بھیگے بال پشت پر کھولے ہوئے ہم کو ملا کرتی تھی۔

ہم ان ہی رنگ رلیوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ آج بنارس کا مشاعرہ ہے تو کل گورکھپور کا مشاعرہ، آج یہ اردو کانفرنس ہے تو کل وہ مناظرہ۔ آج یہاں نظم پڑھنا ہے تو کل وہاں پیپر سنانا ہے کہ یکایک والد صاحب پھر بیمار پڑے۔ پھر آپریشن ہوا۔ میڈیکل کالج میں داخل ہوئے اور وہاں جب کوئی فائدہ نہ ہوا تو گھر پر کیپٹن نگم سے آپریشن کرایا گر مرض کسی طرح قابو میں نہ آسکا۔ وقت آچکا تھا۔ ۱۶ اپریل ۱۹۲۸ء کو روح پرواز کر گئی۔ اب ہمارا کوئی سہارا نہ تھا۔ یہ تمام آسائش، یہ تمام بے فکریاں اور یہ تمام رنگینیاں ایک دم ہم سے منہ موڑ گئیں۔

والد صاحب کی آنکھ بند ہوتے ہی ہم کو اپنی تمام ذمہ داریوں کا احساس پوری شدت کے ساتھ ہوا۔ ہم نے ماموں صاحب سے کہا کہ مجھ کو خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی کے پاس لے کر چلئے۔ وہ ہم لوگوں کے عزیز بھی ہیں اور آج کل روزنامہ "ہمدم" کے منیجنگ ڈائرکٹر ہیں۔ وہ اگر مجھ کو ہمدم کے عملہ میں لے لیں گے تو میں معمولی سے معمولی تنخواہ پر بھی کام شروع کر دوں گا۔ ماموں صاحب ان باتوں کے قائل تو نہ ہوئے مگر ہم کو لے کر خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی کے پاس گئے۔ سید صاحب نے پوری عزیزدارانہ ہمدردی فرمائی اور ہم کو اسی وقت ایک پروانہ تقرری دے دیا کہ اسے لے کر سید جالب دہلوی، ایڈیٹر ہمدم سے کل ملنا وہ تم کو مناسب کام دے دیں گے فی الحال تنخواہ ۴۰ روپیہ ماہوار ہے۔ اس کے بعد تم اپنی استعداد سے خود ترقیاں حاصل کرو۔

دوسرے دن ہم روزنامہ ہمدم کے دفتر پہنچے۔ سید جالب دہلوی کا پتہ پوچھ کر ایک کمرے میں پہنچے۔ جہاں ایک لمبی سی میز پر چاروں طرف چار آدمی بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے اور ایک پانچویں بزرگ ایک علیحدہ میز پر اخباروں کے ڈھیر کے درمیان کاغذ پر تقریباً جھکے ہوئے نہایت تیزی سے کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ ہم دیر تک آپ کی توجہ کے امیدوار بنے کھڑے رہے۔ آخر آپ نے دس منٹ کے بعد زیر قلم صفحہ ختم کرتے ہوئے ایک نعرہ بلند کیا "لے جاؤ" اور دزدیدہ نظر سے اس خاکسار کو دیکھا۔ ہم نے خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی کا خط پیش کیا۔ جس کو پڑھ کر آپ نے ہم کو پہلے تو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد ایک ہی سانس میں ہمارے خاندان کی پوری تاریخ ہم کو اس طرح سنادی گویا آپ خود اسی خاندان کے ایک فرد ہیں سید صاحب نے اپنی تقریر ختم کر کے کچھ لکھا اور آواز دی "لے جاؤ" دفتر کا ایک ملازم آیا تو اس کو وہ پرچہ دے کر ارشاد فرمایا کہ آپ کو قاضی صاحب کے پاس لے جاؤ۔

قاضی محمود حامد صاحب حسرت ہمدم کے منیجر بھی تھے اور اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی، آپ نے بغیر کچھ دریافت کئے اپنے ہی کمرہ میں ہمارے لئے ایک علیحدہ میز لگوادی۔ ہم سے چھوٹے چھوٹے شذرات لکھوانا شروع کئے اور کچھ ترجمہ کا کام ہمارے سپرد ہوا۔ خبروں کے ترجمہ میں تو کوئی خاص بات نہ تھی مگر شذرات سید جالب صاحب کے پاس بھیج دیئے جاتے تھے۔ اور ان پر سید جالب صاحب سرخ روشنائی سے اس طرح اصلاح فرماتے تھے کہ تمام سیاہ عبارت پر سرخ عبارت طاری ہو کر رہ جاتی تھی۔ شروع شروع میں حال یہ تھا کہ ہمارے شذرے کا شاید ہی کوئی لفظ سید صاحب کی سرخ روشنائی سے بچتا ہو مگر رفتہ رفتہ قتل عام کم ہوتا گیا۔

سید صاحب نے کچھ ہی دنوں کے بعد ہم سے کہا کہ آپ مزاحیہ کالم "دو دو باتیں" بھی لکھا کیجئے۔ لہٰذا ہم نے یہ کوشش بھی کی اور اس سلسلہ میں بڑے خوش نصیب ثابت ہوئے کہ سید صاحب جن کے متعلق تمام عملہ کو شکایت تھی کہ کبھی کسی کی تعریف نہ کرنا

نہیں کرتے" وہ دونا میں" دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

ابھی ہم ہمدم" ہی میں تھے اور اخبار کی ذمہ داریوں سے جو فرصت ملتی تھی اس کو دوسری ادبی دلچسپیوں میں صرف کرتے تھے مختلف رسالوں کے لئے لکھا کرتے تھے اور اب زیادہ تر نکاہی چیزیں لکھتے تھے۔ اسی زمانہ میں رسالہ نیرنگ خیال لاہور کے سالنامہ ۱۹۲۰ء کے لئے ہم نے ایک مزاحیہ افسانہ "سودیشی ریل" کے نام سے لکھا۔ شائع ہونے کے بعد اب جسے دیکھئے وہی ہم کو خط لکھ رہا ہے۔ بہت سے مقامی حضرات ملنے آئے۔ متعدد رسالوں اور اخباروں نے اس کو نقل کیا۔ ہندی، گجراتی، بنگالی اور مرہٹی اخباروں میں اس کے ترجمے شائع ہوئے۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر شیفیع صاحب کوئی بزرگ ہیں" انہوں نے اس کا انگریزی ترجمہ ولایت کے "گلوب" نامی کسی اخبار میں چھپوا دیا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اسی افسانہ نے ہم کو مزاح نگاروں میں باضابطہ طریقہ پر شامل کر دیا بلکہ اس دور کے بعض تذکرہ نویسوں نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ شوکت تھانوی کی مقبولیت کا سنگ بنیاد ان کا افسانہ "سودیشی ریل" ہے۔

سودیشی ریل کی مقبولیت کے بعد اب جس کو دیکھئے وہ ہم سے یہی مطالبہ کرتا ہے کہ کوئی سودیشی چیز لکھ دو اور تو اور خود ایڈیٹر نیرنگ خیال نے سودیشی ریل کے دوسرے حصے کا مطالبہ کیا۔ ہم نے ان تمام فرمائشوں کی تعمیل کر دی۔ مگر ان میں سے کسی میں وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ دراصل ان مضامین کا لکھنا ہی ہماری غلطی تھی مگر یہ باتیں اس وقت نہ ہم خود سمجھ سکے نہ کوئی ہم کو سمجھا سکا کہ اب پڑھنے والے ہم سے سودیشی ریل طلب نہیں کر رہے بلکہ اس کے آگے کچھ اور مانگ رہے ہیں۔

ہمدم کے بند ہونے کے بعد ہم کو ایک مرتبہ پھر دنیا میں کچھ خلا سا محسوس ہونے لگا مگر ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ ہم کو اطلاع ملی کہ روزنامہ "اودھ" اخبار کے لئے ایک اسسٹنٹ ایڈیٹر کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ہم اودھ اخبار کے دفتر پہنچے اور سید نورالحسن صاحب سے ملے۔ اسی دن ہم اس اخبار کے باوا آدم کے عملہ ادارت میں آ گئے۔

نسیم صاحب رسالہ انکشاف سے علیحدہ ہو کر ایک زمانہ رسالہ حریم کے نام سے نکال رہے تھے۔ اس رسالہ کے عملۂ ادارت میں شوکت دلہن کا نام بھی تھا اور رسالہ میں ہم برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ نسیم صاحب سے جو تعلقات قائم ہو چکے تھے وہ کسی طرح برادرانہ تعلقات سے کم نہ تھے۔ اب گویا ہمارے دوستوں میں امین سلونوی اور نسیم انہونوی ہی دو ایسے تھے جن پر ہر طرح کا پورا بھروسہ ہو سکتا تھا۔ ایک دن ہم تینوں نے مشورہ کیا کہ کیوں نہ ایک ہفتہ وار خالص مزاحیہ اخبار نکالا جائے۔ ہم نے اخبار کا نام "سرپنچ" تجویز کر دیا اور تھوڑی ہی دیر میں امین آباد پارک کے سبزہ زار پر بیٹھے ہی بیٹھے پوری اسکیم تیار ہو گئی۔ ستمبر ۱۹۳۱ء میں ہم ارباب ثلاثہ کا اخبار "سرپنچ" نہایت شاندار طریقہ پر بہت ہی خوبصورت سرورق کے ساتھ نکلا۔ سرورق پر ایڈیٹر کی حیثیت سے ہمارا نام تھا۔ اسسٹنٹ ایڈیٹر امین سلونوی اور مینیجنگ پروپرائٹر نسیم انہونوی۔ کچھ ہی دنوں میں سرپنچ نے اپنا ایک خاص حلقہ بنا لیا۔

رفیع احمد خاں، ان حضرت کو اکثر مشاعروں میں صف سامعین کی زینت بنے ہم پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ اس کے علاوہ امین سلونوی صاحب کے رسالہ نظر کے ایڈیٹوریل بورڈ میں آپ کا نام نامی اسم گرامی تھا مگر اب تک آپ سے براہ راست ملاقات نہ تھی۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں لکھنؤ میں ایک مشاعرے سے جو بلا وجہ طویل ہوتا چلا جا رہا تھا دو تین آدمی چپکے سے فرار ہوئے۔ ان میں ایک یہ خاکسار اور دوسرے رفیع احمد خاں صاحب تھے۔ ہم دونوں کو اب یہ فکر تھی کہ کسی طرح کوئی سواری مل جائے تو گھر تک پہنچ جائیں۔ اس مشاعرے کی صدارت

متین الدین صاحب ایڈوکیٹ مرحوم کر رہے تھے۔ یکایک خاں صاحب نے دیکھا۔ ان کی کار غالباً ان کو واپس لے جانے کے لئے آ رہی تھی۔ بیچ سڑک پر دونوں ہاتھ پھیلا کر کھڑے ہو گئے۔ ڈرائیور نے کار روک لی تو آپ نے پوچھا۔ "متین صاحب کی گاڑی ہے نا" اس نے کہا "جی ہاں۔" کہنے لگے۔ "فوراً چلو امین آباد۔" اور ہم سے کہا۔ "متین صاحب نے اندازہ تو بالکل ٹھیک لگایا تھا کہ راستہ میں گاڑی مل جائے گی۔" ڈرائیور نے اب کوئی بھی سوال نہ کیا اور ہم دونوں کو کار میں بٹھا کر امین آباد لے آیا۔ خاں صاحب معلوم نہیں کیا کہنے والے تھے کہ ہم نے ڈرائیور سے کہا۔ "اچھا اب جاؤ اور کہہ دینا کہ دکان بند تھی۔" ڈرائیور بے چارہ چپکا چلا گیا تو خاں صاحب نے ہنسی سے بے قرار ہو کر کہا۔ "آخری ٹکڑا قسم خدا کی حاصل مشاعرہ ہے کہ "کہہ دینا دکان بند تھی"۔ اس وقت چار بجے رات کو دکان کے بند ہونے کی وہ لاجواب رہی ہے کہ متین صاحب بھی داد دئیے بغیر نہیں رہ سکتے۔" اس ملاقات کے بعد سے اور اس مشترکہ شرارت کے بعد ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ ہم دونوں کی زندگی علیحدہ علیحدہ قطعاً مہمل ہے اور اس وقت تک کوئی مفہوم ہی پیدا نہیں ہوتا جب تک یہ دونوں مصرعے ساتھ ساتھ پیش نہ ہوں۔ ہر چند کہ خاں صاحب کے مشاغل کچھ ایسے بھی تھے جن سے ہم کو کوئی دلچسپی پیدا نہ ہو سکتی تھی مگر خاں صاحب چاہتے تھے کہ ان کے وہ مشاغل بھی ترک نہ ہوں اور ہم بھی ان کے ساتھ رہیں۔ آپ کے لئے شام کے وقت چوک جانا دفتر کی حاضری سے کسی طرح کم ضروری نہ تھا اور تقاضا یہ تھا کہ تم بھی چلو اور ہم ان کے ساتھ بلاناغہ چوک جانے لگے۔

رفیع احمد خاں صاحب کے محبوب ترین مشاغل میں سے ایک مشغلہ تاش کھیلنا بھی تھا۔ وہ روپے لگا کر تاش کھیلا کرتے تھے۔ ایک دن خاں صاحب ہم کو بھی تاش کھلانے میں کامیاب ہو گئے۔ قاعدہ ہے کہ نیا جواری ہمیشہ جیتا کرتا ہے۔ چنانچہ پہلے ہی دن دو روپے کا سرمایہ لگا کر ہم نے ۲۴ روپے جیتے۔ اب کیا تھا چسکا پڑ گیا۔ روز خاں صاحب کے یہاں پہنچ رہے ہیں اور روز کھیل رہے ہیں۔ جب عادت اچھی طرح پڑ چکی تو اب ہار شروع ہوئی اور ہارے بھی ایسا کہ طبیعت بری ہو گئی۔ تاش کے ہر کھیل کے بعد توبہ کر کے اٹھتے تھے مالی نقصان، بیوی سے خراب تعلقات، اخلاقی خسارہ ان سب پر اس وقت نظر جاتی تھی اور ہم گویا عہد کر لیتے تھے کہ اب کبھی تاش نہ کھیلیں گے۔ مگر دوسرے ہی دن جہاں آفتاب غروب ہوا راجہ نل نے کان پکڑے اور ہم کو وہیں پہنچا دیا جہاں نہ جانے کا ہم فیصلہ کر چکے تھے۔

اخبار سرپنچ بھی نکل رہا تھا۔ اودھ اخبار میں ہم ملازم بھی تھے۔ اور تاشوں کی یہ قیامت خیز مصروفیت بھی تھی کہ اسی زمانہ میں روزنامہ تیج دہلی کے ایڈیٹر مسٹر رام لال ورما نے لکھنؤ آ کر ایک لمیٹڈ کمپنی قائم کی اور ہند کے نام سے ایک روزنامہ جاری کرنے کے لئے ڈیکلریشن داخل کر دیا۔ ورما صاحب نے امین سلونوی کی معرفت ہم کو اپنے اخبار کے عملہ میں آ جانے کی [illegible] دی۔ تنخواہ بھی اودھ اخبار سے زیادہ تھی۔ ہم نے روزنامہ ہند کی اس دعوت کو منظور کر لیا۔ اپنے کام کا چارج لینے کے بعد ہم بے حد مصروف ہو گئے۔ ہم کو اخبار کا نائٹ ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ رات کے نو بجے دفتر جاتے تھے۔ صبح چار پانچ بجے تک کام کرتے تھے۔ خبروں کے اس کام کے علاوہ شذرات اور مزاحیہ کالم بھی لکھنا پڑتا تھا۔ اس کے لئے دن کو تھوڑی دیر کے لئے دفتر جانا پڑتا تھا مگر یہ تھوڑی دیر اکثر اس قدر طول کھینچ جاتی تھی کہ چوبیس گھنٹہ کی مسلسل ڈیوٹی کی نوبت آ جاتی تھی۔ مگر اب ہم کو اطمینان تھا ایک تو یہ کہ تاشوں کی طرف متوجہ ہونے کا موقع ہی نہ ملتا تھا دوسرے یہ کہ بیوی کو اب ہماری طرف سے یہ اطمینان ہو چلا تھا بلکہ اب ہم پر ترس آنے لگا کہ کہیں اس قدر شدید

محنت کا کوئی ناگوار اثر صحت پر نہ پڑ جائے۔ اخبار واقعی شاندار تھا اور انتظامات اس قدر ٹھاٹھ کے تھے کہ ہم کو اب یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی باقاعدہ اخبار میں کام کر رہے ہیں اور اخبار نویسی جس کو کہتے ہیں وہ در اصل اب شروع ہوئی ہے۔ مگر لمیٹڈ کمپنی تو تھی ہی۔ ساجھے کی ہانڈی اس کا چوراہے پر ٹوٹنا ضروری تھا۔ کچھ حصہ داروں نے وعدہ کرنے کے باوجود اپنے حصہ کی رقم نہیں دی۔ کچھ نے اخبار کی پالیسی میں مداخلت کرنا چاہی۔ مختصر یہ کہ ایسی گڑبڑ پیدا ہوئی کہ اخبار بند۔ تنخواہ غائب اور ہم پھر گھر پر۔

اپنی بک ڈپو قائم کرنے کا مستقل خیال تھا۔ اب تک ہماری تین کتابیں نکل چکی تھیں۔ موج تبسم اور بحر تبسم، نیتم انہوں نوی صاحب نے چھاپی تھیں۔ سیلاب تبسم، صدیق بک ڈپو نے۔ لہٰذا جو تھا مجموعہ طوفان تبسم اور گہرستان ہم نے خود چھاپے۔ ان کی اشاعت کے بعد اگر ہم آدمیت سے کام لیتے تو ایک چھوٹا سا بک ڈپو اپنا ذاتی ہو سکتا تھا اور اب تک جو پچیس تیس کتابیں دوسرے ناشروں نے چھاپی ہیں وہ ہم خود چھاپتے اور بچوں کے لئے کوئی مستقل سامان کر دیتے مگر یہاں تو مقولہ یہ تھا کہ کوڑی نہ رکھ کفن کو۔ شرافت اسی وقت تک ساتھ دیتی تھی جب تک روپیہ ساتھ چھوڑے رہتا تھا اور جہاں جیب میں کچھ آیا بس یہ فکر رہتی تھی کہ کسی طرح یہ صرف ہو۔ گر جائے۔ کوئی چرا لے، کوئی مانگ لے۔ مختصر یہ کہ ہمارے پاس سے جائے تو۔

ہم کوئی بیکار تو تھے نہیں کہ خواہ مخواہ بک ڈپو وغیرہ کھولتے۔ مقصد تو روپیہ لگانے سے تھا اور منافع کمانے سے۔ لہٰذا ہم نے زیادہ چلتا ہوا کاروبار تاشوں کو سمجھا۔ اس کاروبار کا نتیجہ فوراً معلوم ہوتا ہے۔ یعنی یا تو دا رسے نیارے ورنہ ہارے تو بھاگے نا نیارے۔

لکھنؤ سے عبدالرؤف صاحب عباسی کی ادارت میں ایک ہفتہ وار اخبار نکلا کرتا تھا جس کا نام تھا "حق"۔ عبدالرؤف صاحب اور آپ کے برادر محترم علی اختر صاحب عباسی ہمارے لئے اجنبی نہ تھے۔ عبدالرؤف صاحب نے یہ طے کیا کہ اپنے اخبار کو روزنامہ بنا دیں۔ اخبار کی پوری اسکیم سننے کے بعد ہم نے بھی کچھ مشورے دیئے، اور ان کے ارشاد کی تعمیل میں ان سے وعدہ کر لیا کہ مزاحیہ کالم جس کا عنوان ہم نے خود حق کی رعایت سے "حق و باطل" تجویز کیا تھا۔ لکھ دیا کریں گے۔ تنخواہ طے ہو ہی چکی تھی۔ ہم حق کے دفتر پہنچ گئے اور ملازمت قبول کر لی۔ خبروں کا ترجمہ۔ حق و باطل کا لکھنا اور شذرات کا لکھنا وغیرہ ہمارے سپرد ہوا۔ اس کے علاوہ ہر روز ایک قطعہ شاعر حق کے نام سے لکھا کرتے تھے۔

عبدالرؤف صاحب عباسی نے کچھ دن بعد طے کیا کہ ایک ادبی ماہنامہ بھی نکالا جائے اور اس کی پوری ذمہ داری ہمارے سر رہے۔ اس کا نام کائنات تجویز ہوا۔ پہلا نمبر اس قدر شاندار تھا کہ جو دیکھتا تھا داد دیئے بغیر نہ رہ سکتا۔ پانچ یا چھ نمبروں کے بعد یہ گاڑی آگے نہ چل سکی۔

۱۰ ربیع الاول ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۱ مئی ۱۹۳۸ء کو ہم نے طوفان کا نمونہ کا پرچہ نکالا اور اعلان کر دیا کہ اس کی باقاعدہ اشاعت یکم جون سے شروع ہوگی۔ بیس دن کا یہ وقفہ اشتہارات حاصل کرنے، خریدار فراہم کرنے ایجنسیاں قائم کرنے اور دوسرے تمام انتظامات کو مکمل کرنے میں صرف کر دیئے۔ اور یکم جون کو باعدہ اشاعت شروع ہوگئی۔ طوفان نے زمینداروں کی ہر ممکن وکالت کی مگر اس کا کوئی صلہ طوفان کو نہ مل سکا۔ "طوفان" طوفان بن کر آیا اور طوفان بن کر ہم کو بھی اپنے ساتھ بہا لے گیا اور اب ہم پھر گھر کے

ین تھے۔

اس بیکاری کے زمانہ میں ریڈیو کی وجہ سے نہایت باکار رہنا پڑتا تھا۔ برادرم ملک حبیب احمد صاحب ڈائرکٹر آف پروگرام تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ ہم ہی سے گانا بھی گواتے۔ وہ تو کہیئے کہ خیریت گزری کہ ہم موسیقی کے سلسلہ میں نہایت جاہل نکلے۔ البتہ ڈراموں کا محکمہ ر تقریروں کا صیغہ ہماری تحریروں سے چند ہی دن میں پاٹ دیا گیا۔ ریڈیو کے اس کام سے اس قدر آمدنی ہونے لگی کہ ہم نے خود بھی یہی سوچا ہ خیر تنخواہ کی کیا ضرورت ہے، مگر ہم کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہی روشنیٔ طبع ہمارے لئے بلا بننے والی ہے۔ چنانچہ ریڈیو کے ارباب حل و عقد نے غالباً یہ اندازہ کیا ہوگا کہ اس طرح تو یہ شخص بہت روپیہ گھسیٹ لے جائے گا۔ کیوں نہ اس کو خود ہی گھسیٹ لیا جائے۔ ایک ر جگل صاحب غریب خانہ پر آئے اور ہم سے کہا چلو ریڈیو سٹیشن ملازمت کا حکم آگیا ہے اور تم آج ہی سے اپنے کام کا چارج لے سکتے ہو۔ یوں تو ہر روز ریڈیو ہی میں وقت گزرتا تھا۔ اب تو گویا پابندی تھی۔ جو تفریح تھی وہ روزی بن گئی۔ اخبار نویسی کی زندگی کو ہیں سے خیرباد کہا اور زندگی کے اس نئے دور کی ابتداء گا بجا کر شروع کر دی۔

(تلخیص مابدولت)



کنہیّا لال کپور

"............ کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہیں رکھتا۔ ترقی پسند ہوں نہ رجعت پسند۔ اگر کچھ ہوں تو اعتدال پسند سگریٹ نوش اور گوشت خور ہوں۔ اردو میں لکھتا، پنجابی بولتا اور انگریزی پڑھتا ہوں۔ .... عمر بھر زندگی نے مجھ سے اور میں نے زندگی سے مذاق کیا ہے ...."

مشہور انگریزی نقاد ڈبلیو۔ ایچ۔ ہڈسن (W. H. HUDSON) کا قول ہے کہ ہر شخص کم از کم ایک دلچسپ کتاب لکھ سکتا ہے اور وہ ہے اس کی آپ بیتی۔ بہت سے کلیتوں کی طرح ہڈسن کا یہ کلیہ بھی مبالغے پر مبنی ہے کیونکہ ایک عام آدمی کی زندگی اتنی سپاٹ اور غیر دلچسپ ہوتی ہے کہ کوئی قاری اس میں دلچسپی نہیں لے سکتا۔ میرا تو عقیدہ ہے کہ جب تک کسی شخص کی زندگی سنسنی خیز یا عبرت انگیز واقعات سے عبارت نہ ہو اسے آپ بیتی لکھنے کی حماقت نہیں کرنی چاہیئے یا زیادہ سے زیادہ میر کے اس شعر پر اکتفا کرنا چاہیئے ؎

کہیں کیا کوئی ہم سے پوچھے جو میر　　　تم آئے تھے دنیا میں کیا کر چلے

یاد رہے ناخدائے سخن حضرت میر تقی میر نے نوے سال کی عمر پائی اور سات دواوین اپنی یادگار کے طور پر چھوڑے اس کے باوجود کسر نفسی کا یہ عالم..... کہ فرماتے ہیں ہم نے کوئی کارِ نمایاں نہیں کیا۔

میری زندگی سنسنی خیز واقعات سے یکسر خالی ہے۔ میں نے کبھی محبت کی نہ بلیک مارکیٹنگ نہ کسی کو قتل کیا اور نہ خود قتل ہونے سے بال بال بچا۔ نہ کبھی صحرا کا رخ کیا نہ پاگل خانے کا۔ وزیر بنا نہ سفیر۔ حُسن کا تعاقب کیا نہ جاہ و منصب کا۔ عمر بھر تندرست رہا نہ بیمار۔ نہ فارغ البال ہوں اور نہ رہین ستم ہائے روزگار۔ ان حالات کے ہوتے ہوئے اگر میں اپنی مختصر آپ بیتی لکھ رہا ہوں تو اس کی وجہ جواز محض یہ ہے کہ اسے پڑھ کر قارئین عبرت پکڑیں اور میری ایسی زندگی بسر کرنے سے گریز کریں۔

میں ایک روایت کے مطابق ۲۷ جون ۱۹۱۰ء اور دوسری کے مطابق یکم نومبر ۱۹۱۱ء کو پیدا ہوا۔ میرے والد لالہ ہری رام گپور مرحوم ضلع لائل پور کے ایک گاؤں میں جس کا نام چک ۴۰۸ تھا پٹواری تھے۔ یہ گاؤں پاکستان کے تاریخی شہر کمالیہ سے ۱۲ میل کے فاصلے پر ہے۔ جس گاؤں میں میرا بچپن بسر ہوا وہ تین چیزوں کے لئے مشہور تھا۔ بلوچ دھول اور کتے ان تینوں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ بلوچ نہایت نیک اور اللہ والے لوگ تھے۔ میں نے ان سے زیادہ خدا ترس انسان آج تک نہیں دیکھے۔ عام طور پر وہ کسی کی دلآزاری نہیں کیا کرتے تھے۔ ان میں سے جب کوئی نوجوان برائی کی طرف راغب ہوتا تو بوڑھے اسے سمجھاتے "خدا اور رسول کو کیا منہ دکھاؤ گے"۔ یہ محض ان کا تکیہ کلام ہی نہیں تھا بلکہ اصولِ زندگی بھی انھیں ان پڑھ بلوچوں نے مجھے انسانیت کا پہلا سبق دیا۔

بلوچ جتنے اچھے تھے کتے اتنے ہی بے شعور۔ وہ ہر وقت اور ہر شخص کو دیکھ کر بھونکا کرتے ان کی اس بدتمیزی پر میں اکثر دانت پیس کر رہ جاتا۔ چنانچہ مجھے کتوں سے اس قدر نفرت ہوگئی کہ آج تک نجیب الطرفین سے نجیب الطرفین کتے کو پسند نہیں کرتا۔ کتوں کے علاوہ دوسری قباحت دھول تھی۔ گرمی کے موسم میں جب دھول کے جھکڑ چلتے اور سر اور منہ خاک آلودہ ہو جاتے اپنے آپ کو پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ دھول سے ہر روز واسطہ پڑنے کا یہ ردِ عمل ہوا کہ میں تمام خشک چیزوں کو ناپسند کرنے لگا جیسے خشک نثر۔ خشک آدمی اور خشک موسم!

میری ابتدائی تعلیم گاؤں کے پرائمری اسکول میں ہوئی۔ میرے استاد مولوی محمد عیسٰے فارسی اور اردو کے عالم تھے۔ درسی کتب

پڑھانے کے علاوہ انھوں نے مجھے "گلستان" اور "بوستان" کے رموز سے آگاہ فرمایا۔ کبھی کبھی قرآن کی کسی آیت کا ترجمہ آسان اُردو میں سمجھانے کے بعد کہتے "دیکھو اتنے تھوڑے لفظوں میں کتنی بڑی بات کہی گئی ہے۔"

میں نے میٹرک کا امتحان ۱۹۲۰ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ سے پاس کیا اور پنجاب بھر میں دوم رہا۔ انٹرمیڈیٹ ڈی ایم کالج موگا اور بی اے۔ ڈی اے وی کالج لاہور سے کیا۔ اور یونیورسٹی میں انگریزی اور سنسکرت کے مضامین میں اوّل رہا۔ ایم اے (انگریزی) کے لئے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ جہاں سید احمد شاہ بخاری پطرس مرحوم کا شاگرد ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ بخاری صاحب کی پُرکشش شخصیت سے میں نے سب سے زیادہ اثر قبول کیا۔ موصوف نہ صرف انگریزی زبان کے مانے ہوئے مقرر اور استاد تھے بلکہ اُردو زبان کے ایک سلجھے ہوئے مزاح نگار بھی۔ بخاری صاحب سے میں نے ہر فرسودہ روایت اور ہر بے ہودہ شخص کا مضحکہ اڑانے کا فن سیکھا۔ وہ اکثر فرمایا کرتے کہ جب کوئی چیز یا انسان زاویہ قائمہ کی بجائے زاویہ منفرجہ یا زاویہ حادہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے وہ مزاح کا موضوع بن جاتا ہے۔ اردو مزاح کا ذکر کرتے ہوئے کہتے "ابھی اس کا بچپنا ہے اسے لڑکپن کی منزل تک پہنچنے کے لئے کم از کم پچاس سال کا عرصہ درکار ہے۔" بخاری صاحب کی تحریک پر میں مزاح نگاری کی طرف مائل ہوا اور اگرچہ ان دنوں میری حیثیت نوگرفتار کی سی تھی۔ انھوں نے ہمیشہ میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔

۱۹۳۱ء میری زندگی کا ایک اہم سال ہے۔ میں تب تھرڈ ایر میں پڑھتا تھا۔ والدین نے یہ سمجھتے ہوئے کہ میں اب نوجوان ہو گیا ہوں (حالانکہ نوجوان میں عمر کے کسی حصّے میں نہیں تھا) میری شادی کر دی۔ میری اہلیہ پشپاوتی ایک متوسط گھرانے میں کہ جو قصبہ کوٹ مومن ضلع سرگودھا سے تعلق رکھتا تھا۔ پیدا ہوئیں۔ چونکہ قصبے میں لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس لئے وہ تعلیم سے بے بہرہ رہیں۔ ہمارے سات بچے (اتفاق سے میں سات کتابوں کا مصنف ہوں) تین لڑکے چار لڑکیاں۔ ہماری ازدواجی زندگی نہایت خوشگوار ہے۔ کیونکہ ہم میاں بیوی نے شروع سے یہ عہد کیا تھا کہ ہم ایک دوسرے پر نکتہ چینی نہیں کریں گے۔ اپنے بجائے ہم ہمسایوں یا قومی رہنماؤں کو اپنی تنقید کا نشانہ مشق بنائیں گے۔ پچھلے میں سال سے ہم اس عہد پر قائم ہیں اور ہمارے درمیان کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔ جب ہم کسی میاں بیوی کو جھگڑتے یا ایک دوسرے سے روٹھتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ تو ہمیں ان پر بے حد رشک آتا ہے اور بسا اوقات دبی زبان میں ہم اس حسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ کاش ہمیں بھی خدا لڑنے یا روٹھنے کی توفیق دیتا۔

۱۹۳۴ء سے کہ جب میں نے ایم اے کا امتحان پاس کیا میری زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ کوشش کے باوجود مجھے کہیں ملازمت نہ ملی۔ آخر ڈی اے وی کالج لاہور میں پچھتر روپے ماہوار پر کمپوزیشن ٹیچر مقرر ہوا۔ اور ڈیڑھ سال کے بعد چھانٹی میں آ گیا۔ اب میں نے پرائیویٹ ٹیوشن کو ذریعہ معاش بنایا۔ اور ایک سستے بورڈنگ ہاؤس (ہندو ہوسٹل لاہور) میں رہنے لگا۔ یہاں نہایت ڈرامائی حالات میں کرشن چندر سے ملاقات ہوئی۔ ایک دن میں ایک سارٹیفکٹ لینے کے لئے اپنے پروفیسر ڈکنس صدر شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج لاہور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے فرمایا "میں کسی شخص کی موجودگی میں سارٹیفکیٹ نہیں لکھ سکتا۔ تم لائبریری میں جا کر بیٹھو اور آدھ گھنٹے کے بعد دوبارہ آؤ" میں وقت کاٹنے کے لئے رسالہ "ہمایوں" کا تازہ شمارہ پڑھنے لگا۔ اس میں کرشن چندر کا ایک شائع شدہ مضمون (لاہور سے بہرام گلہ تک) کو پڑھنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ آسمان ادب پر ایک نیا ستارہ طلوع ہوا ہے۔ جب میں سارٹیفکیٹ لے کر ہندو ہوسٹل پہنچا۔ تو میں نے

اس مضمون اور اس کے مصنف کا اپنے ہمسائے ماسٹر شورام بترہ سے ذکر کیا۔ وہ ہنس کر کہنے لگے "ارے یہ وہی تو کرشن چندر ہے جو آپ کے ساتھ والے کمرے میں رہائش پذیر ہے۔" بترہ صاحب نے میرا تعارف کرشن چندر سے کرایا۔ اور ہم دونوں بہت جلد ایک دوسرے سے کھل گئے۔ اکثر ہم علمی و ادبی موضوعات پر بحث کیا کرتے۔ میں چونکہ باتیں بنانے میں تیز واقع ہوا تھا۔ اس لئے عموماً کرشن چندر کو شکست تسلیم کرنا پڑتی۔ ایک روز جب ہم میں گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا تم طبعاً اور فطرتاً طنز نگار ہو لیکن افسوس کہ اپنا سارا وقت ادھر ادھر کی بکواس میں ضائع کرتے رہتے ہو۔ یہی بکواس اگر معرضِ تحریر میں آ جائے تو طنز کہلائے۔

بخاری صاحب کے بعد کرشن چندر دوسرا ادیب تھا جس نے مجھے لکھنے کی ترغیب دی۔ میں نے اس دن فیصلہ کیا کہ کرشن چندر سے بحث و مباحثہ کرنے کے بجائے میں کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔ سب سے پہلے طنزیہ مضمون کرشن کے افسانے "یرقان" پر پیروڈی بعنوان خفقان لکھا۔ اسے کرشن چندر کے علاوہ مہندر ناتھ نے بھی پسند کیا۔ لیکن اتفاق رائے سے اسے تلف کر دیا گیا۔ کیونکہ اس میں کرشن چندر پر بہت تیکھی چوٹیں کی گئی تھیں۔ انھیں دنوں مجھے ڈی اے وی کالج لاہور میں دوبارہ ملازمت مل گئی۔ جہاں میں تقسیم ہندوستان تک انگریزی کا مضمون پڑھاتا رہا۔

میرا دوسرا مضمون (اخبار بینی) مولانا چراغ حسن حسرت کے ہفت روزہ "شیرازہ" میں شائع ہوا۔ تیسرا مضمون (چینی شاعری) رسالہ ادبِ لطیف کے سالنامہ (۱۹۳۸ء) میں چھپا۔ جب کرشن چندر نے اس مضمون کو پڑھا تو ہنس ہنس کر بے حال ہو گیا۔ لیکن جس مضمون کا سب سے زیادہ شہرہ ہوا اور جس نے ادبی دنیا میں تہلکہ سا مچا دیا وہ "غالب ترقی پسند شعراء کی مجلس میں" تھا۔ یہ ۱۹۴۲ء میں رسالہ "ادبی دنیا" میں شائع ہوا۔ اور چھپنے سے پہلے حلقۂ اربابِ ذوق کے ایک اجلاس میں پڑھا گیا۔ اس مضمون سے میری ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔

میری پہلی تصنیف "سنگ و خشت" اسی سال "مکتبہ جدید لاہور" نے شائع کی۔ اسے پطرس بخاری کے علاوہ جناب احتشام حسین، جناب عبادت بریلوی۔ اور خواجہ غلام السیدین نے حوصلہ افزا الفاظ میں سراہا۔ کرشن چندر نے ایک انگریزی رسالے میں اس پر تنقید کی اور مجھے "پیچو" کا لقب عطا فرمایا۔ اس کے بعد کی تصنیفات کے نام یہ ہیں۔ شیشہ و تیشہ (۱۹۴۴ء)، چنگ و رباب (۱۹۴۶ء) نوکِ نشتر (۱۹۴۹ء) بال و پر (۱۹۵۲ء) نرم گرم (۱۹۵۰ء) اور گردِ کارواں (۱۹۶۰ء)

میرے تین مضامین پر اچھے خاصے ہنگامے ہوئے۔ پہلا مضمون "اہلِ زبان" تھا اور ادبِ لطیف کے سالنامہ میں شائع ہوا۔ اس میں یوپی کے نام نہاد اہلِ زبان پر چند کراری چوٹیں تھیں۔ اس کا چھپنا تھا کہ یو۔پی اور دہلی میں حشر بپا ہو گیا۔ جناب شاہد احمد دہلوی مدیر ساقی نے مجھ پر کفر کا فتویٰ صادر کرتے ہوئے مجھے بد زبان اور کج مج بیان کے خطاب سے نوازا اور لکھا "آج خاکِ پنجاب اہلِ زبان کے منہ آ رہی ہے لیکن اسے منہ کی کھانی پڑے گی۔" کچھ گھبرا اور کچھ جھنجھلا کر میں نے اہلِ دہلی پر ایک اور طنزیہ مضمون بعنوان "نے چراغے نہ گلے" گھسیٹ مارا۔ اس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ دہلی اور پنجاب کے رسائل میں ایک باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ ایک دوسرے کو وہ صلواتیں سنائی گئیں کہ مزہ آ گیا۔ تیسرے مضمون کا عنوان مطالبات تھا یہ حلقۂ اربابِ ذوق کے ایک اجلاس میں پڑھا گیا۔ اس میں چند زندہ دل لوگوں کے مضحکہ خیز مطالبات کا ذکر تھا۔ مثلاً ایک صاحب کا مطالبہ تھا کہ مجھے اقبال کا سب سے بڑا جلیس تسلیم کیا جائے کیونکہ اقبال نے میرا ذکر مندرجہ ذیل شعر میں کیا ہے ؎

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا

تیری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

اتفاق سے اسی مضمون میں قیامِ پاکستان کے مطالبے کی مخالفت کی گئی تھی۔ کچھ لوگوں نے اس کی آڑ لے کر خوب اپنے دل کا غبار نکالا اور مسلم لیگی روزناموں میں مجھے کشتنی اور گردن زدنی ٹھہرایا۔ مجھ پر مقدمہ دائر کرنے اور مجھے قتل کرنے کی دھمکیاں دی گئیں۔ یہ طوفان تب تھما جب میں نے گڑگڑا کر معافی مانگی اور مضمون کو تلف کرنے کا وعدہ کیا۔

۱۹۴۷ء میں میری زندگی کا تیسرا دور شروع ہوا۔ تقسیم ملک کے بعد میں نے فیروزپور میں پناہ لی اور اکتوبر ۱۹۴۷ء میں ڈی ایم کالج موگا میں یہ سمجھتے ہوئے کہ "جب میکدہ چھٹا تو پھر کیا جگہ کی قید"۔ نوکری کر لی۔ شروع شروع میں طبیعت بہت گھبرائی۔ لاہور اور موگا میں بعد المشرقین تھا۔ کہاں لاہور کی رنگینیاں۔ محفلیں۔ ہنگامے۔ اور کہاں موگا ایسا نیم ریگستانی قصبہ۔ جہاں سرکنڈوں اور ریت کے انبار کے علاوہ کوئی قابل دید چیز نہیں تھی۔ بار ہا حالات کی ستم ظریفی پر آنسو بہانے کو جی چاہا۔ لیکن سنبھلتے سنبھلتے جب طبیعت سنبھل گئی۔ تو حالات سے سمجھوتہ کر لیا تاہم یہ حقیقت ہے کہ لاہور کو چھوڑے سولہ سال ہو گئے ہیں اس کی حسین یادیں آج تک میرا تعاقب کر رہی ہیں۔ لاہور کا تصور کرتے ہی دل میں اک ہوک سی اٹھتی ہے اور زبان پر بے اختیار ناسخ کا یہ شعر آ جاتا ہے ؎

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں

ہائے کیا کروں کہاں جاؤں

موگا میں ادبی ماحول کی جستجو ظلمات میں خورشید کی تلاش کے مترادف ہے یہاں کے لوگ آرٹ اور ادب کی بجائے شراب اور دفعہ ۳۰۲ میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ یہاں وقت گذر نہیں رہا کٹ رہا ہے۔ دن کے وقت کالج میں پڑھانا۔ شام کو لمبی سیر اور رات کو مطالعہ۔ ذہنی خودکشی کرنے کے لئے یہ نہایت موزوں شہر ہے۔ یہاں آکر محسوس ہوتا ہے کہ "دماغ" نام کی کوئی چیز نہیں۔ انسان صرف جسم ہی جسم ہے۔

پچھلے سولہ سال سے موگا میں مقیم ہوں، دوست احباب اکثر سوال کرتے ہیں کہ میں نے جنت سے ہجرت کرنے کے بعد اس جہنم کو کیوں اپنا مسکن بنایا۔ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔ ماسوا اس کے کہ جب تک ہندوستان لاہور کا ثانی پیدا نہیں کرتا۔ میرے لئے ہندوستان کے تمام شہر اور قصبے برابر ہیں۔ پاکستانی احباب پوچھتے ہیں ہمیں ملنے کے لئے لاہور کیوں نہیں آتے۔ انھیں جواب میں لکھ بھیجتا ہوں ؎

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں

کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

یہ آپ بیتی نامکمل ہوگی، اگر میں قارئین کو اپنی ذات سے متعلق چند ضروری تفاصیل سے آگاہ نہ کروں۔ میں ذات کا کھتری ہوں۔ پیشہ آبا یقیناً سپہ گری نہیں بلکہ دکانداری تھا میرا قد پانچ فٹ گیارہ انچ وزن ڈیڑھ من اور رنگ گندمی ہے۔ جسم اکہرا اور بال کھچڑی ہیں جھک کر بیٹھتا چلتا اور سلام کرتا ہوں۔ کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہیں رکھتا۔ ترقی پسند ہوں نہ رجعت

پسند اگر کچھ ہوں تو اعتدال پسند۔ سگریٹ نوش اور گوشت خور ہوں۔ اردو میں لکھتا، پنجابی بولتا اور انگریزی میں پڑھتا ہوں۔ میں نے اپنی فراغت کا معتد بہ حصہ کالج کی درسی کتب کی شرح لکھنے میں ضائع کیا ہے۔

میرے مشاغل کتابیں اکٹھی کرنا، سیر اور احباب کو بنانا ہیں۔ خدا کی ہستی کا قائل ہوں اگرچہ اس کے بھیجے ہوئے کسی اوتار یا پیغمبر پر ایمان نہیں لا سکا۔ اپنے علاوہ ہر ادیب کو ادیب سمجھتا ہوں' اس کے ساتھ ہی کسی زندہ ادیب کو اقبال اور منشی پریم چند کا ہم پلہ نہیں سمجھتا۔ قسمت حکومت اور احباب کا شاکی ہوں کہ ان تینوں نے میرے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جس کا میں مستحق تھا۔ حالانکہ عمر بھر زندگی نے مجھ سے اور میں نے زندگی سے مذاق کیا ہے۔ اس کے باوجود میرا نظریہ حیات قنوطی ہے رجائی نہیں ؎

زندگی در گردنم افتاد بیدل چارہ نیست
شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن





فکر تونسوی

"...... آسمان سے ایک قلم گرا اور صدا آئی ——— "جہاں جہاں سے بھاگے ہو، وہاں وہاں واپس جاؤ اور اس قلم سے تپیا کرو اور اس تپسیا سے گھاؤ کو اور پیڑی کو اور انگارے کو حُسن، جذبے اور الفاظ عطا کرو اور میرے خدا کا حکم ہے اور یاد رکھو خدا کا حکم اٹل ہوتا ہے..........."

میرے جنم پر دیوتاؤں نے آکاش سے پھول نہیں برسائے۔ کیوں کہ وہ [illegible] تھے۔ وہاں ایک شہزادے نے جنم لیا تھا۔ یعنی جنم سے ہی میرے "دیوتاؤں" کے تعلقات [illegible]

یہ ٹھیک ہے کہ شہزادے اور ادیب کو ایک ہی تاریخ اور ایک نکھشتر میں پیدا نہیں ہونا چاہیئے [illegible] سو نقص بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن دیوتاؤں کا رول بھی غیر شریفانہ نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ [illegible] چاہیئے تھا اور اگر نہیں آتا تو خدا کو کچھ انٹیلیجنٹ دیوتا پیدا کرنے چاہیں۔

میں تونسہ میں پیدا نہ ہوتا تو لاڑکانہ میں پیدا ہو جاتا۔ ٹمبکٹو بھی کوئی بری جگہ [illegible] ہر جگہ میرا باپ چودھری نرائن سنگھ کا میر منشی دھنپت رائے ہی ہوتا۔ جس کے گھر غلام [illegible] برسانے۔ صرف اس ٹیکنیکل بنا پر کہ میر منشی کی چھت کے نیچے ڈیڑھ سو کمرے نہیں ہیں [illegible]

بیس برس بعد میرے باپ نے مجھ پر انکشاف کیا۔ "تمہارے پیدائش [illegible] جیتو ساربان نے سنائی تھی تو میرے منہ سے صرف اتنا نکلا تھا یہ ساتواں بچہ ہے اور شاید بھائیوں کی طرح بھوکوں مرے [illegible]

یعنی میرے والد (محترم) کے لیئے میری پیدائش کی اہمیت صرف [illegible] پانچواں چھٹا ساتواں نتیجہ یہ ہوا کہ دیوتاؤں کے ساتھ ساتھ ہندسوں سے بھی میرے تعلقات بگڑ گئے۔ [illegible] بڑے ہوئے ہیں

ہندسوں کو تو انسان کا مقدر نہیں بننا چاہیئے۔

مگر جیتو ساربان مجھے ہندسہ نہیں سمجھتا تھا۔ بلکہ ایک بچہ سمجھتا تھا۔ [illegible] وہ گاؤں میں واحد شخص تھا جس نے مجھے پیار سے دیکھا۔ محلے میں گڑ کی ڈانگری بانٹی اور تاشے بھی [illegible] رہا ہے۔ وہ صرف اس بات کا قائل تھا کہ خوشی بانٹنی چاہیئے۔ چاہے وہ گھٹیا [illegible]

اور پھر ایک دن مجھے یوں لگا۔ جیسے جیتو ساربان کی بیٹی بھاگو جوان ہو گئی ہے [illegible] میں نے بھی چھلانگ لگائی اور جوان ہو گیا۔ اس چھلانگ پر مجھے حیرت ہوئی اور مسرت بھی ہوئی۔ اور یہ مسرت [illegible] ہونٹوں پر گلاب کھلائے اور میرے باپ اور جیتو ساربان کی داڑھی میں ایک دم سفید بال اگ [illegible] بلکا "تاشن!" کنکر پھینکا۔ جیسے اٹھائے ہوئے وہ کنوئیں سے آ رہی تھی اس "ٹن" سے [illegible] گیا۔

"تمہیں شرم نہیں آتی؟" بھاگو نے تن تناتی چھاتی کو پلو سے ڈھانپ کر کہا۔

"آتی ہے۔" میں مسکرایا۔

وہ منہ پھیر کر شرما گئی، وہ شرمانے کی اوٹ میں مسکرایا کرتی تھی۔

اور پھر کئی دن تک ہم اپنے دل کی دھڑکنوں کی بھاشا سمجھتے رہے اور پھر دل ہی دل میں اعلان کیا کہ یہ پیار کی بھاشا ہے اور اس پیار میں جیتو ساربان کو وہی معصومیت نظر آئی جو ایک بچے میں ہوتی ہے اور اس نے میرے باپ سے کہا۔ "میر منشی! تمہارا بیٹا میری جاناں کے گھڑے پر کنکر پھینکتا ہے۔"

"اسے ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ کیوں کہ ہمارا خاندان شریف ہے۔" میرے باپ کا خیال تھا کہ جن بچوں کو باسی سوکھے ٹکڑے پانی میں بھگو کر کھلائے جائیں وہ بھی شریف خاندان کے بچے کہلا سکتے ہیں۔ مرغ، ماہی کسی کے زر خرید غلام نہیں ہوتے۔

میرا باپ الیوژن میں خوش رہنا زیادہ بہتر سمجھتا تھا۔ مگر اس خوشی کو ایک دن نمبردار کے لڑکے داؤد خاں نے زبردست جھٹکا دیا۔ جب جاناں شباب کا سر غرور بلند کئے کنوئیں سے آرہی تھی۔ اور میرے کنکر کا انتظار کر رہی تھی تو داؤد خاں نے اپنی ریشمی قمیص کے بازو جاناں کے راستے میں پھیلا دیئے۔ وہ بازو کنکر نہیں تھے۔ بلکہ داؤد انھیں آغوش محبت سمجھ رہا تھا۔ اس نے جاناں کو چیلنج دیا: "مجھ سے عشق کرو، ورنہ....."

"ورنہ.....؟" جاناں نے ورنہ "اونہہ" کے لہجے میں کہا۔ ایسی "اونہہ" وہ گاؤں میں سوائے میرے ہر ایک سے کہہ سکتی تھی مگر جیتو ساربان کے پاس صرف دو اونٹ تھے اور نمبردار کے پاس تین گھوڑیاں، پانچ بیل اور چھ شکاری کتے تھے۔ ان سبھوں نے مل کر جاناں کو سوتے میں اٹھالیا اور ایک پہاڑی کھوہ میں لے گئے۔ اور پھر پہاڑی کھوہ سے کچھ چیخیں سنائی دیں اور الوؤں نے منحوس آوازیں نکالیں اور پہاڑی کوے چلاتے ہوئے کھوہ سے بھاگ گئے اور میری چھت پر آگئے۔ یہ عشق کی معصومیت کی اور اس کی روح کی توہین تھی۔ جسے آگے چل کر شاعر و ادیب کے قالب میں ڈھلنا تھا۔

"ایسا کیوں؟ آخر کیوں؟" میں نے باپ سے پوچھا، جیتو ساربان سے پوچھا۔ دونوں نے ہم آہنگ ہو کر جواب دیا۔

"ایسا ہی ہوتا ہے بیٹا! یہ جگ کی ریت ہے، جس میں نمبردار اور تھانیدار ایک دسترخوان پر بیٹھ کر مرغی کھاتے ہیں۔ اور ان کے بچے باسی کڑھی کھاتے ہیں۔ مرغی ان کی فریاد نہیں سنتی۔ اور پھر میں راتوں رات گاؤں سے بھاگ گیا۔ اور گاؤں میں کسی کو بھی نہیں بتایا کہ میں ایسے جگ کو بدل دوں گا اور مرغی اور باسی روٹی کا فاصلہ مٹا دوں گا۔ جاناں کو بھی نہیں بتایا۔ کیسے بتاتا۔ اس نے تو کنوئیں میں چھلانگ لگا دی تھی۔ باسی ٹکڑے نے اپنی توہین کے بدلے خودکشی کر لی تھی۔

چنانچہ خودکشی سے بھی میرے تعلقات بگڑ گئے۔ ایسی جاناں سے بھی بگڑ گئے جو خودکشی کر کے سمجھتی ہے کہ اس سے تھانیدار اور نمبردار کے دسترخوان سے مرغی بھاگ جائے گی۔

اور پھر ایک دن یوں ہوا کہ میری ننھی معصوم بچی راج رانی جس کے پاس نہ راج تھا نہ وہ رانی تھی۔ صرف ایک گلاس، ایک کیلا اور کتابیں تھیں۔ بستے میں باندھے اسکول جا رہی تھی کہ یکایک خطرے کا ہارن بجا۔ آسمان پر ہوائی جہاز منڈلانے لگے۔ ان ہوائی جہازوں میں کوئی بستہ کیلا اور کتاب نہیں تھی۔ بلکہ بم تھے اور انھوں نے کہا کہ یہ جنگ ہے۔ اور اگر تم اسکول جاؤ گی تو بم پھینک کر ہم تمہیں ہلاک کر دیں گے۔ کیونکہ ہم نے کتابیں پڑھ کر ہی یہ بم بنائے ہیں۔ اور معصومیت پر یہ بم مجھے یوں لگا جیسے نمبردار کا لڑکا داؤد خاں جاناں کے گھڑے پر اپنے گھوڑے کا سم مار کر کہہ رہا ہو مجھ سے عشق کرو، ورنہ....."

اور مجھے غصہ آگیا۔ مجھے نہ معلوم تھا کہ غصہ انسان کو اندھا بنا دیتا ہے۔ پھر میں نے لاؤڈ اسپیکر اپنے کاندھے پر رکھ لیا اور گاؤں گاؤں گھومنے:" ہم امن چاہتے ہیں۔ امن۔ کس لئے؟ ننھی راج رانی کے لئے۔ اس کے بستے کے لئے پرائمری قاعدے کے لئے، معصوم آنکھوں میں گنگناتے ٹیگور اور کالی داس کے لئے۔

اور گاؤں کے اوبڑ کھابڑ راستوں پر مجھے کانٹے چبھے جھاڑیوں نے الجھایا، کیچڑ نے لت پت کیا، سوکھی سڑی چائے، اُبلی بھوک اور ہونٹوں کی پپڑیوں نے مجھے جھانسے دیئے کہ یہ مقدس کاز ہے۔ ہسٹری پلٹا کھائے۔ اور مرغی اور باسی روٹی کا فاصلہ مٹ جائے، اور کسی پھاتو کا گھڑا خودکشی نہیں کرے گا۔ اور پھر ہوائی جہاز کا بم شرم سے پگھل جائے گا اور معصوم راج رانی کا گلاسڑا کیلا ایک سیب میں بدل جائے گا اور اس سیب پر ٹیگور کی گیتانجلی لکھی جائے گی۔

لیکن جب میں امن کا لاؤڈ اسپیکر کاندھے پر رکھے چل رہا تھا تو ایک ٹیلے پر مجھے بابا گوردھن سنگھ ملا جو پندرہ برس تک کیلے کو سیب میں بدلنے کی خاطر جیل میں رہا تھا۔ اس کی معصوم پھاتو کو کسی نے ہم سے ہلاک کر دیا تھا اور وہ غصے میں آکیندری بابا بن گیا تھا اور امریکہ بھاگ گیا تھا۔ وہاں سے دخانی جہاز میں بندوقیں بھر لایا تھا مگر جہاز کو بابا اور بندوق سمیت انڈمان جیل کی دلدل میں پھینک دیا گیا تھا۔

ایسا تھا بابا گوردھن سنگھ۔ اس نے میرے کندھے پر امن کی فاختہ کو دیکھ کر استہزائیہ قہقہہ لگایا اور کہا۔

"تم بیوقوف ہو ینگ مین!"

"کیا امن کی صدا لگانا بے وقوفی ہے بابا؟"

"کیسا امن؟ کس کے ساتھ امن؟" وہ نتھنے پھڑکا کر بولا۔" جو لوگ شکاری کتے چھوڑ کر ٹیگور کے گیتوں کو بھنبھوڑتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہم امن سے کیسے رہ سکتے ہیں۔ مرغی کو تم نے پالا ہے۔ مگر اسے نمبردار کا بیٹا تھانیدار کے ساتھ بیٹھ کر کھاتا ہے۔ کیا ہم اس کے ساتھ امن سے رہیں! تمہارا باپ کیا کام کرتا تھا؟"

"چودھری نرائن سنگھ کا میر منشی تھا۔"

"بس وہی!" اس نے امن کا لاؤڈ اسپیکر زور سے گرا دیا۔" تمہارے چہرے پر جوانی میں جو جھریاں۔ وہ اسی نرائن سنگھ نے ڈالی ہیں۔ یہ جھریاں جب مٹ سکتی ہیں جب ہم نرائن سنگھ سے جنگ کریں۔ امن نہیں۔"

کیا بابا گوردھن سنگھ میرے باپ کی طرح الیوژن میں خوش رہنا جانتا تھا؟

چند ماہ بعد سنا کہ گوردھن کے تعاقب میں پولیس نے اس کی ریڑھ کی ہڈی پر گولی چلا دی۔ الزام یہ تھا کہ اس نے کسی چودھری نرائن سنگھ کی جاگیر میں آتشیں اسلحہ دبا رکھا تھا تاکہ اس کی فصل تباہ و برباد کر دے۔ اس طرح بابا گوردھن سے بھی میرے تعلقات کشیدہ ہو گئے ــــ کیا وہ تعلقات کشیدہ کرنے کے لئے ہی اس دنیا میں آیا تھا۔؟

نہایت احترام سے یہ سوال میں نے جمنی داس رنگ ساز سے کیا۔ جو مجھ سے آٹھ گھنٹے روزانہ کام لیتا تھا اور دو آنے روزانہ دیتا تھا۔ میں اس کی بھارت رنگ ساز کمپنی میں حسیناؤں کے دوپٹے اور معززین کی پگڑیاں، نارنجی، گلابی، سرئی رنگتا تھا کیوں کہ مجھے

بھوک لگتی تھی اور کمپنی کو اس بھوک کا علم تھا ۔ دو آنے میں دال روٹی تو ملتی تھی لیکن آلو گوبھی کی اسپیشل سبزی نہیں ملتی تھی ۔ ڈھابے کے مالک سری چند کو میں نے لاکھ سمجھایا کہ اسپیشل سبزی کے لیے میرا من بے حد للچاتا ہے ۔ لیکن وہ کہتا "لالچ بری بلا ہے ۔ شاستروں میں اسے پاپ کہا گیا ہے ۔"

میں نے سوچا شاستر دو آنے روزانہ پانے والوں کے لئے نہیں لکھے گئے ۔ اور ایک دن بور ہو کر میں نے جمنی داس سے کہہ دیا : "ماسٹر جی ! مجھے کبھی یوں لگتا ہے جیسے میرے آپ کے تعلقات کشیدہ ہو جائیں گے ۔"

وہ بولا : "کوئی حرج نہیں ۔ میرے تعلقات تو اس سپاہی سے بھی کشیدہ ہو گئے ہیں جو مجھ سے پانچ روپیہ ماہانہ رشوت لیتا ہے ۔ تم کیا ہو تم اتنا شعور بھی نہیں رکھتے کہ نیلی اور پیلا رنگ ملنے سے کون سا رنگ جنم لیتا ہے ۔ قرمزی یا بادامی ۔"

میں نے کہا ۔ "میں تو اتنا جانتا ہوں کہ تھانیدار کا رنگ جب کرنسی نوٹ کے رنگ میں ملتا ہے تو مچھلی کا رنگ جنم لیتا جسے آپ ہر شام شاہ دل مچھلی فروش سے خرید کر کھاتے ہیں ۔"

یہ سن کر جمنی داس نے مجھے فحش گالی دی اور ملازمت سے الگ کر دیا اور کہا : "تم دوپٹے رنگنے کا فن کبھی نہیں جان سکتے زیادہ سے زیادہ تم پگڑی اور دوپٹے کی قوس قزح پر ایک نظم لکھ سکتے ہو ۔"

لہٰذا اونہہ اور پھونہہ "

میں نے تھانیدار سے رپورٹ کی ۔ اس نے کہا اگرچہ فی الحال جمنی داس سے میرے تعلقات کشیدہ ہیں ۔ لیکن رنگوں کے متعلق اس کا نقطۂ نگاہ صحیح ہے وہ رنگوں کی بھاشا زیادہ سمجھتا ہے جبھی تو مچھلی کھاتا ہے ۔"

میں نے دل ہی دل میں تھانیدار پر اپنی "اونہہ" انڈیلی ۔ اور بھاگ گیا ، بھاگتا گیا ، بھاگتا حتیٰ کہ بے ہوش ہو کر گر پڑا ۔

دراصل بھاگتے بھاگتے میں تیل چنبیلی اسپیشل کی فرم کے قریب سے گذر رہا تھا جس کے مالک دھونی مل نے مجھے پہچان گیا سے ہو سکتے دیکھ کر میرے ہاتھ میں برش اور سیاہی کا ڈبہ پکڑا دیا کہ ہمارے تیل کا اشتہار شہر بھر کی دیواروں پر لکھ آؤ ۔ تم بہت ترقی کر جاؤ گے ۔ جس آدمی کو دو لقمے مل جائیں ۔ اسے ترقی کہتے ہیں ۔

مگر میں نے سوچا کہ دو لقمے بانٹنے کا سہرا انھیں ملتا ہے جو تیل کی ساخت میں گاہکوں سے فراڈ کرتے ہیں ۔ ایک دن میں نے دھونی مل فراڈ سے کہا ۔ "مجھے چار آنے عنایت کر دیجئے ۔ کیونکہ آج خطرہ ہے کہ اشتہار لکھتے لکھتے مجھے بھوک لگ جائے گی ۔"

وہ بولا : "میرے بزنس کا اصول ہے کہ مزدوروں کو جب پسینہ آئے اسے اجرت دے دو ۔ لہٰذا جاؤ ، پہلے پسینہ پیدا کرو ۔"

میں نے کہا : "بڑا زریں اصول ہے ۔ لہٰذا ہی ہی ہی ! "

"ہی ہی ہی ۔" اس نے میری تائید کی ۔

اور پھر دن بھر مئی جیسے کی انگارے اگلتی دھوپ میں دیواریں لکھتے لکھتے مجھ پر ہندوستان بھر کا افلاس گذر گیا ۔ مجھے پسینہ آیا ۔ پیڑیاں جمیں ۔ آنکھوں میں چنگاریاں تڑتڑائیں ۔ جسم میں پے درپے تریڑیاں آئیں ۔ ہر مسام سے بھوک کے پھول

اُڑ گئے۔ نروس سسٹم کو سیکڑوں جھکولے آئے۔ اور میں دھوبی مل کی فرم سے دس بارہ گز کے فاصلے پر غش کھا کر گر پڑا۔ میرا پسینہ دھوبی مل نے دیکھا یا نہیں لیکن جب چھتیس گھنٹے کے بعد مجھے ہوش آیا تو میں ایک ہٹ میں لیٹا تھا۔ اور ہماچل پردیش کی ایک حسینہ مجھے پنکھا جھل رہی تھی۔

میں نے پوچھا "کیا تم جنتو سابان کی بیٹی پچا تو ہو؟"

وہ پہاڑی چھیل سے اپنی پتھریلی چھاتیاں چھپاتے ہوئے بولی۔ "پہلے تم بتاؤ، تمہارا گھر کہاں ہے۔ مجھے تم پر پیار آرہا ہے۔ مجھے دُلہن بنا کر گھر لے چلو!"

میں نے کہا۔ "اس دنیا میں جنم لیتے ہی میرا گھر کھو گیا۔ جب تک میں اسے تلاش نہ کرلوں اس وقت تک تم میری دُلہن بننا ملتوی کردو۔"

لیکن اس نے بتایا کہ بہت جلدی میں ہے۔ وہ پارمنٹ میں کسی کی دُلہن بننا چاہتی ہے ورنہ وہ حرامی تو سر بازار آجائے گا۔ جو مجھے بہکا کر لایا ہے کہ میں تمہیں شہر کی راجکماری بنا دوں گا۔ لیکن یہاں لاکر اس نے میرے کنوارپن کا ریٹ مقرر کردیا۔ اس لئے آؤ... آؤ ریٹ کی اس دنیا سے بھاگ چلیں اور کسی پہاڑی کھوہ میں بیٹھ کر دُلہا دُلہن کا ازلی گیت گائیں۔"

اور میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ کل جب وہ نوسرباز نشے میں میرے رخسار کو گنا بری سمجھ کر چوس رہا تھا تو کہہ رہا تھا کہ میں انسانیت پرست ہوں۔ اس بے ہوش چھوکرے کو سڑک سے اٹھا لایا۔ کیونکہ اس کی ناک بڑی معصوم لگی، مجھے دھوکا نہ دینے والی لگی۔ میں دھوکے والی ناکوں کی خوب پہچان رکھتا ہوں۔ میں اسے اپنا شاگرد بنا دوں گا۔

مگر پھر دُلہا دُلہن کے بھاگنے سے پہلے چھاپہ مار پولیس آگئی اور نوسرباز کے شاگرد کو گرفتار کرکے لے گئی اور پھر نوسرباز کو زندگی بھر نہ پکڑ سکی۔ پولیس کو اس کی اور میری ناک کی پہچان نہیں تھی۔ جبھی ناک اور پولیس سے میرے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ آج تک کشیدہ چلے آرہے ہیں۔

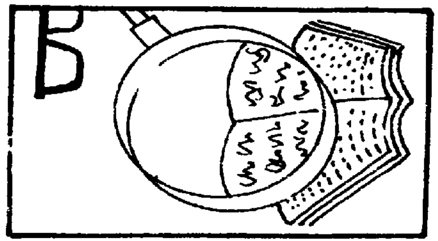
اور پھر مجھے یاد نہیں۔ میں رک گیا۔ اور جیسے مجھ پر صدیاں گزر گئیں۔ ازل سے ابد تک پھیلنے والا انسانی کارواں گذر گیا اور میں نے دیکھا کہ کچھ گھاؤ ہیں۔ کچھ پپڑیاں ہیں۔ کچھ انگارے ہیں جو میرا مسلسل تعاقب کر رہے ہیں۔ انھوں نے گیا کے جنگل میں مجھے روک لیا، وہاں شاید، ایک گھنا پیڑ تھا اور وہاں ایک بودھ، ایک گیانی بیٹھا تپسیا کر رہا تھا اور پھر گیا کے آسمان سے ایک قلم گرا اور صدا آئی۔ "جہاں جہاں سے بھاگے ہو، وہاں وہاں واپس جاؤ اور اس قلم سے تپسیا کرو اور اس تپسیا سے گھاؤ کو اور پپڑی کو اور انگارے کو حسن، جذبے اور الفاظ عطا کرو اور یہ خدا کا حکم ہے اور یاد رکھو، خدا کا حکم اٹل ہوتا ہے..."

اور اس صدا میں مسرت تھی جو میرے مساموں سے پھول کی طرح کھل اٹھی اور میں نے قلم ہاتھ میں پکڑ لیا۔ جس سے یہ پھول خوشبو دینے لگے۔ اور مجھے یوں لگا جیسے یہ میرے مقصد حیات کی خوشبو ہے۔ کیلے اور سیب کے فاصلے کو ختم کرنے والی خوشبو ہے اور اسی خوشبو پر تیرتے تیرتے میں دنیا کو یہ بتانے کا اہل ہو سکا کہ دیوتاؤں نے میرے جنم پر پھول کیوں نہیں برسائے۔ اور کہ خدا صرف ایک شرط پر ٹیلینٹ دیوتا پیدا کر سکتا ہے۔ اگر چاہتو خودکشی نہ کرے بلکہ گوردھن اپنے کی طرح نوسربازوں سے جنگ کرے۔

"فن اور شخصیت" کے
"آپ بیتی نمبر" کیلئے

نیک خواہشات کیساتھ
رامانند ساگر







قاضی عبدالودود

"...... مذاہب میرے نزدیک انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ مذہب سے بہت سے لوگوں کو اطمینانِ قلب نصیب ہوتا ہے اور بہتوں کو یہ برائیوں سے باز رکھتا ہے لیکن یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ بکثرت اصحاب جو شریعت کے احکامِ ظاہری کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے ہیں، اچھے انسان نہیں... —"

یہ مضمون معاصر کی فرمائش پر لکھا جا رہا ہے، اور کوشش کی گئی ہے کہ کل سوالات کے جو کئے گئے ہیں، جواب دیئے جائیں۔ اگر کوئی بات کہیں اور مختلف طور پر ہے تو اس سے قطع نظر کہ صریحاً اس کی تردید ہوئی ہے یا نہیں، اس جگہ جو لکھا جا رہا ہے صحیح سمجھا جائے۔

قاضی عبدالودود، بن قاضی عبدالوحید، بن قاضی عبدالحمید، بن قاضی اکرم الحق، بن قاضی امین الحق، بن قاضی کمال الحق، بن قاضی غلام یحییٰ، بن غلام شرف الدین از اخلاف ملا عبدالشکور تاج فقیہی۔

قاضی عبدالوحید متولد ۱۲۸۵ھ عربی کی تکمیل اور انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد کالج میں داخل ہوئے۔ ایف اے کے بعد میرے دادا انہیں قاضی رضا حسین[۲] کے مشورے پر انگلستان تعلیم کے لئے بھیجنا چاہتے تھے لیکن وہ کسی طرح اس پر راضی نہیں ہوئے۔ یہی نہیں۔ انہوں نے یہاں رہ کر بھی مزید انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے انکار کر دیا۔ وجہ یہ کہ ان کے خیالات میں انقلاب آگیا تھا اور وہ مغربی تعلیم کو مذہب کے لئے سم قاتل سمجھنے لگے تھے۔ "نیچریوں" (پیروان سرسید احمد خاں) کے متعلق جو ان کی رائے ہوگی، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ ندوۃ العلما تک کے سخت مخالف تھے۔ ان کے نزدیک ۲، یا اس سے بھی زیادہ فرقے جو مسلمان ہونے کے مدعی ہیں، ان میں صرف ایک ناجی ہے۔ پٹنہ میں ندوۃ العلما کا ایک سالانہ اجلاس ہوا تو انہوں نے بھی بڑے پیمانے پر ایک جلسہ کیا جس میں بریلوی صاحب اور دوسرے علما جو ان کے ہم خیال تھے، شریک ہوئے تھے۔ کلکتہ میں ندوۃ العلما کا سالانہ اجلاس ہونے لگا تو وہ کلکتہ والوں کو اس کی مخالفت پر آمادہ کرنے کے لئے کلکتہ گئے، وہاں وہ ابوالکلام آزاد کے والد[۳] سے بھی ملے تھے۔ عبدالرزاق ملیح آبادی نے ابوالکلام آزاد سے متعلق جو کتاب لکھی ہے اور جس کے بارے میں ان کا دعویٰ ہے کہ خود ابوالکلام آزاد کی لکھوائی ہوئی ہے مرقوم ہے کہ قاضی عبدالوحید اپنے کو عقائد میں بہت متشدد سمجھتے تھے۔ مگر ابوالکلام آزاد کے والد سے ملے تو انہوں نے انہیں اپنے سے زیادہ متشدد پایا۔ قاضی عبدالوحید خود بہت متشرّع تھے لیکن اس معاملے میں سخت گیر نہ تھے۔ برادری میں ایسے لوگ تھے جو علانیہ فسق و فجور میں مبتلا تھے لیکن ان سے قطع تعلق نہیں ہوا۔ ان برادری والوں سے جو غیر مقلد تھے، برادری ترک کر دی تھی۔

---

[۱] معاصر۔ پٹنہ (قاضی عبدالودود نمبر ص ۱)۔
یہ آپ بیتی دائرہ ادب پٹنہ کے شکریے کے ساتھ شائع کی جا رہی ہے۔

[۲] قاضی رضا حسین کے والد کی دوسری شادی اسد علی (جد مادری قاضی عبدالحمید) کی بیٹی سے ہوئی تھی مگر یہ لاولد رہیں۔ قاضی رضا حسین کے تعلقات سرسید احمد خاں سے تھے اور انھوں نے بڑی کوشش کی تھی کہ مسلمانان بہار مغربی تعلیم حاصل کریں

[۳] ان کی ایک تصنیف مجھے اپنے والد کی کتابوں میں ملی تھی۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ "شیطان سے ابوجہل بدتر اور ابوجہل سے وہابی بدتر ہیں۔"

انہوں نے احمد رضا خانی عقائد کی تبلیغ کے لیئے ایک ماہنامہ "تحفۂ حنفیہ" نکالا تھا جو ان کی وفات کے بعد بھی برس دو برس تک جاری رہا۔ انہوں نے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا جس پر ان کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ صرف ہوا کرتا تھا۔ یہ ان کی موت کے کچھ ہی دن بعد بند ہوگیا۔

قاضی عبدالوحید نے اپنے ابتدائی زمانے میں شعر بھی کہے۔ انہوں نے وحید الہ آبادی کی صحبت پائی تھی اور ان کا تخلص وحید تھا۔ میں نے لڑکپن میں ان کی طرحی غزلیں غازی پور کے ایک گلدستے میں دیکھی تھیں مگر اب اس کا کوئی شمارہ میرے پاس نہیں۔ شاہ مقبول احمد صاحب (کلکتہ) نے مجھے اطلاع دی ہے کہ کراچی سے جو کتاب بنام "مسلم شعرائے بہار" شائع ہوئی ہے۔ اس میں ان کا حال اور کلام ہے۔ ڈاکٹر حامد علیخاں (علیگڑھ) نے مجھ سے ان کے حالات مانگے تھے اور لکھا تھا کہ ان کے عربی اشعار میری نظر سے گذرے ہیں۔ ہندوستان کے عربی گو شعرا سے متعلق ان کا مقالہ مکمل ہوگیا ہے مگر مجھے علم نہیں کہ ان کا ذکر اور کلام اس میں ہے یا نہیں۔ ان کے عربی اشعار میں نے نہیں دیکھے۔

یہ کہا جاچکا ہے کہ وہ بہت متشرع تھے۔ میرے دادا نے کئی آدمیوں کو سودی قرض دے رکھا تھا۔ ان کی موت کے بعد انہوں نے سود کے ہزاروں روپے معاف کردیئے وہ سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور ان کے بہت روپے دوسروں پر صرف ہوا کرتے تھے۔ وہ بہت راست گفتار تھے اور معاملات کے کھرے۔ کوئی شخص اگر ان کے ساتھ بدمعاملگی کرتا تو وہ اس سے خواہ وہ قریبی عزیز ہی کیوں نہ ہو، بہت خفا ہوتے تھے اور اس کا اظہار بھی کردیا کرتے تھے۔ خدا پر انہیں بہت بھروسہ تھا۔ میرے حقیقی ماموں طاعون میں مبتلا ہوگئے مجھے ان کے پاس جانے سے بالکل نہ روکا۔ وہ تو ماموں تھے، میرے معلم کا ایک بھانجا اسی مرض کا شکار ہوگیا۔ اس کے پاس جانے کی بھی ممانعت نہ تھی۔ دونوں اسی مرض میں مرگئے۔

قاضی عبدالوحید کی شادی سید شاہ لطف الرحمٰن متوطن کاکو (قریب جہان آباد) کی بیٹی سے ہوئی میرے نانا میرے دادا کے حقیقی خالہ زاد بھائی تھے۔ قاضی عبدالوحید کی وفات ربیع الاول ۱۳۲۶ھ میں ہوئی۔ ان کے مرض الموت میں بریلوی صاحب ہمارے یہاں آئے تھے اور ان کے چہارم کے بعد بریلی واپس چلے گئے تھے۔ باقر عظیم آبادی (یہ وہی باقر ہیں جن کا ذکر داغ کی فریاد داغ میں ہے) نے ایک طویل نظم ان کی وفات پر لکھی تھی اور لفظ "مغفور" سے سال وفات نکالا تھا۔ یہ نظم تحفۂ حنفیہ میں شائع ہوئی تھی۔

قاضی عبدالحمید بخشی محلہ میں رہتے تھے۔ ان کے خالو شیخ احمداللہ کا انتقال ہوا تو ان کی ساری جائیداد ان کی زوجہ کے قبضے میں آئی۔ انہوں نے اس کے انتظام کے لئے اپنے بھانجے کو لودی کٹرا بلالیا۔ اور وہ اسی محلے میں رہنے لگے۔ وہ ایک دنیادار آدمی تھے اور ان کے مشاغل علمی نہ تھے مگر شاعری سے انہیں کچھ لگاؤ ضرور تھا۔ ایک شخص بندہ علی نشتر ان کے یہاں نوکر تھے اور میں نے سنا ہے کہ ان کے استاد انوار عالم متخلص بہ شاہ شاگرد دبیر نے اپنی زندگی کے آخری چند سال ان کے ساتھ گزارے تھے۔ ایک خط جو شاہ نے قاضی عبدالحمید کے نام لکھا تھا۔ وہ اس زمانے میں شاید نثر کا اچھا نمونہ سمجھ کر چھپوا دیا گیا تھا۔ میں نے یہ نہیں سنا کہ خود قاضی عبدالحمید نے شعر کہا ہو۔ ان کی شادی سید امجد علی ساکن جربھوا (قریب حاجی پور) کی بیٹی سے ہوئی تھی۔

قاضی محمد اسمٰعیل کا نام دہلی کے مشہور عالم کے نام پر سید احمد بریلوی کے کہنے سے رکھا گیا تھا۔ وہ ان کی ولادت کے زمانے میں پٹنہ آئے تھے۔ یہ صوفی مشرب تھے اور بریلوی صاحب کو ان کے عقائد کی اطلاع ہوتی تو بلاشبہ انہیں بدعتی قرار دیتے۔ ان کا تخلص قدیمی تھا اور ان کی نظم و نثر میرے پاس موجود ہے۔ انھوں نے ایک افسانے میں رموز تصوف بیان کئے ہیں۔

قاضی اکرام الحق سید احمد بریلوی کے مرید یا معتقد تھے۔ ان کی وفات ہنگامۂ ۱۸۵۷ء سے قبل ہی ہو چکی تھی۔ لیکن اس وقت ان کے برادر خرد واعظ الحق زندہ تھے۔ اور وہ ان ۳ علماء میں تھے جو نظر بند کئے گئے تھے۔ اس کا ذکر اس ہنگامے کی تاریخ میں ہے۔

قاضی امین الحق کی شادی قاضی امام بخش بن قاضی حسن رضا بن عابد خاں ملقب بہ فقاہت خاں؛ ہرسہ قاضی شہر پٹنہ کی بیٹی سے ہوئی تھی۔

قاضی کمال الحق کی شادی قاضی سید عوض (از سادات بارہہ) کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ یہ فارسی گو تھے۔ ان کا تخلص کمالیؔ تھا۔

ان کا کلیات ان کی زندگی ہی میں ضائع ہو گیا تھا۔ مختصر دیوان میرے پاس موجود ہے۔

قاضی غلام یحییٰ محشی شرح آداب المریدین تھے۔ ان کی اور کتابیں بھی ہیں۔ ان کے زمانے میں ایک اور غلام یحییٰ تھے جو قاضی القضات تھے۔ مقدم الذکر ان سے مختلف ہیں۔ تاج فقیہہ کا نسب نامہ الدرر المنثورہ فی تراجم اہل صادقپور (معروف بہ تذکرۂ صادقہ) میں ملے گا۔

میری عمر کے اکاسی سال گزر چکے ہیں اور سال ہشتاد و دوم گزر رہا ہے۔ یہ تخمینہ پر مبنی ہے۔ اگر میں نے کبھی اس کے خلاف لکھا ہے تو وہ بھی تخمین پر مبنی تھا۔ مجھے یقین ہے کہ صحیح وہ ہے جو اس جگہ میں نے لکھا ہے۔

میری پرورش زنان خانے میں نہیں ہوئی۔ میری قدیم ترین یادیں اپنے دادا سے وابستہ ہیں۔ ان کے بعد والدین آتے ہیں۔ ایک بات جو مجھے یاد ہے، اس سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میرے والد مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ مگر یہ واضح رہے کہ وہ ایک بار کے سوا کبھی انہوں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ متوسلات فارسی پڑھنے کے بعد میں نے عربی پڑھنا اور قرآن حفظ کرنا شروع کیا۔ میرے قدیم ترین معلموں میں سے ایک سید سلیمان اشرف تھے جو بعد کو علی گڑھ کالج میں استاد دینیات ہوئے۔ والد کی وفات کے بعد بریلوی صاحب کی طرف سے تحریک ہوئی کہ میں تعلیم کے لیۓ بریلی جاؤں مگر میں نے انکار کر دیا۔ پھلواری شریف کے ایک عالم وصی احمد جو محدث سورتی کہے جاتے تھے اور والد کے قائم کردہ مدرسے میں مدرس اوّل رہ چکے تھے۔ اسی غرض سے مجھے لینے کے لئے پٹنہ آئے۔ مگر میں پیلی بھیت جانے پر راضی نہ ہوا۔ عربی صرف و نحو میں نے پٹنہ ہی میں مکمل کر لی۔ نحو کی آخری کتاب جو میں نے پڑھی۔ شرح کافیہ ہے جو جامی نے لکھی ہے۔ منطق میں شرح تہذیب کے اتمام کے بعد میں نے قطبی پڑھنی شروع کی تھی۔ مگر وہ ناتمام رہ گئی۔ یہی حال شرح وقایہ اور مختصر المعانی کا ہوا۔ قرآن میں نے پورا حفظ کر لیا۔ یہ ٹھیک یاد نہیں کہ اس وقت میری کیا عمر تھی۔ میری والدہ نے تعلیم کے معاملے میں مجھ پر بالکل جبر نہیں کیا اور مجھے اپنی راہ پر چھوڑ دیا۔ میں نے گھر پر انگریزی شروع کی اور کچھ دنوں کے بعد شہر کے محمڈن اسکول کے درجہ پنجم میں داخل ہو گیا۔ درجہ سوم میں داخل ہونے والا ہی تھا کہ میں نے ایک صاحب کی ترغیب سے علیگڑھ جانے کا فیصلہ کیا۔ وہاں تیسرے درجہ میں میرا داخلہ تو ہو گیا مگر مہینوں کے بعد مارلین کورٹ میں جگہ لی۔ اس درمیان میں کچھ دن سر سید کورٹ کے بعض طلبہ کے ساتھ رہا۔ اور اس طرح مجھے کالج کی زندگی کے دیکھنے کا موقع ملا۔ کچھ دن میں سید سلیمان اشرف کے ساتھ رہا۔ بالآخر مجھے موریسن کورٹ میں جگہ مل گئی اور وہاں سے علیگڑھ ٹریننگ ہاؤس گیا۔ میں نے تیسرے درجے کا امتحان پاس کیا تھا کہ یہ فیصلہ ہو گیا کہ میں تعلیم کے لیۓ انگلستان جاؤں گا اور میں بلگرامی میموریل کالج میں داخل ہو گیا۔ یہ درسگاہ میجر سید حسن بلگرامی نے علیگڑھ میں ان طلبہ کے لیۓ قائم کی تھی جو تعلیم کیلئے یورپ جانا چاہتے تھے۔

یہاں انگریزی، لاطینی، جرمن اور فرانسیسی زبانیں سکھائی جاتی تھیں اور ریاضی، تاریخ وغیرہ بھی پڑھائی جاتی تھی۔ میں نے لاطینی پڑھی صرف و نحو کی ایک کتاب، ایک رسالہ GRADELIN اور ورجل کی انیڈ کا ایک ٹکڑا سبقاً سبقاً پڑھا۔ میں بلگرامی کالج میں ڈیڑھ سال رہا ہوں گا کہ بعد بلگرامی کا یکایک انتقال ہو گیا اور ان کا کالج بند ہو گیا۔ یورپی جنگ چھڑ چکی تھی۔ اس وقت یورپ جانے کا سوال ہی نہ تھا۔ میں نے پٹنہ آکر ۱۹۱۶ء میں نجی طور پر میٹرک کا امتحان دیا اور کامیابی کے بعد پٹنہ کالج میں داخل ہوا۔ میں نے میٹرکولیشن کی طرح آئی۔ اے میں بھی فرسٹ ڈویژن حاصل کیا اور بی۔ اے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ آئی۔ اے میں میرے مضامین انگریزی، اردو فارسی، منطق اور تاریخ تھے۔ بی۔ اے میں بھی یہی مضامین رہے۔ باستثنائے منطق۔ اس کے بعد میں تحریک ترک موالات میں شریک ہو گیا اور تعلیم کا سلسلہ بند ہو گیا۔

مارچ ۱۹۲۳ء میں تکمیل تعلیم کے لئے انگلستان گیا اور بیرسٹری کے مڈل ٹمپل میں داخل ہوا۔ اس وقت کیمبرج میں داخلے کا سوال ہی نہ تھا مگر میں۔ بادمیں اور چند دوستوں کے ساتھ لمبی تعطیل میں جرمنی گیا۔ وہاں کئی مہینے رہا اور میں نے جرمن سیکھی۔ اکتوبر میں کیمبرج آیا اور وہاں میرا داخلہ فٹزولیم ہاؤس میں ہو گیا۔ میں نے اکنومکس ٹرائی پوس لیا تھا۔ تعطیلات میں میں فرانس جایا کرتا تھا اور وہاں میں نے فرانسیسی سیکھی۔ کیمبرج میں ٹرائی پوس کا دوسرا حصہ لینے نہ پایا تھا کہ سخت بیمار ہو گیا۔ چند ماہ کیمبرج کے قریب ہی ایک سینی ٹوریم میں رہا۔ بعدازاں جاڑوں کے اوائل میں مئی مہینے میں مونتانا (سوئٹزرلینڈ) گیا اور وہاں رہا۔ واپسی کے بعد میں امتحان میں شریک ہوا اور مجھے سکنڈ ڈویژن ملا۔ حصہ ۲ میں میں نے علم السیاست بھی لیا تھا اور بطور خود کچھ فلسفے اور نفسیات کی کتابیں بھی پڑھیں۔

اس کے بعد میرا قیام زیادہ تر لندن میں رہا اور میں نے بیرسٹری کے امتحانات پاس کئے۔ مارچ ۱۹۲۹ء میں میں پٹنہ آیا۔ میری صحت مضبوط نہ رہی۔ میں پریکٹس نہ کر سکا اور مجھے بار بار سینی ٹوریم جانا پڑا۔ بھوالی میں میں نے ہندی رسم الخط سیکھا۔ بعد کو جب غالب سے متعلق تحقیقات مد نظر ہوئی تو میں نے فارسی ادب کا مطالعہ کیا، اور کسی قدر پہلوی بھی سیکھی۔

اب میرا حال یہ ہے کہ قرآن بہت تھوڑا سا یاد ہے۔ عربی بہت کچھ بھول گیا۔ لاطینی اب اتنی کم جانتا ہوں کہ نہ جاننے کے برابر ہے۔ کچھ الفاظ اور چند جملے جو یاد ہیں، ان کا بہت بڑا حصہ انگریزی اور فرانسیسی کتابوں میں دیکھا تھا۔ جرمن بہت کچھ بھول گیا مگر لاطینی کی طرح نہیں۔ ہندی اب میں بالکل نہیں پڑھ سکتا۔ پہلوی رسم الخط بھی بھول گیا۔ معاشیات اب میں اس قدر کم جانتا ہوں کہ پیچیدہ بحث ہو تو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ اس سے زیادہ تو مجھے فلسفہ و نفسیات سے واقفیت ہے۔

میرے والد کے زمانے میں ہفتہ وار آگرہ اخبار آیا کرتا تھا۔ لیکن مجھے یاد نہیں کہ کوئی اور اخبار اردو یا انگریزی آتا تھا یا نہیں۔ انہیں جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں، سیاست سے دلچسپی نہ تھی اور میں نے اپنے یہاں کبھی سیاسی گفتگو نہیں سنی۔ ان کی وفات کے چند سال بعد میں نے حسرت موہانی کے ماہنامے اردوئے معلّٰی کی کئی پرانی جلدیں منگوائیں۔ غرض تو یہ تھی کہ اس کے ادبی مضامین پڑھے جائیں لیکن ان کے ساتھ ان میں جو سیاسی مضامین تھے وہ بھی نظر سے گزرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں پکا کانگریسی بن گیا اور ان مسلمانوں کو جو کانگریس کی مخالفت کرتے تھے برا سمجھنے لگا۔ اس زمانے میں میں حسرت کے علاوہ مظہر الحق، محمد علی اور ابوالکلام آزاد کے مداحوں میں تھا۔ الہلال کے نئے شمارے کا جس بے چینی

سے انتظار کیا کرتا تھا وہ اب تک یاد ہے۔ میں کالج میں تھا کہ انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس دہلی میں جس کے صدر پنڈت مدن موہن مالوی تھے۔ ایک تماشائی کی حیثیت سے شریک ہوا۔ استقبالی کمیٹی کے صدر حکیم اجمل خاں نے اپنے خطبے میں مونٹیگو چیمسفورڈ اسکیم پر فارسی کے یہ اشعار چسپاں کئے تھے۔

این[1] است گلذرن بابا ازاں من   دیں گریہ مصاحب بابا ازاں تو
از صحن خانہ تا لب بام ازاں من   وز سقف خانہ تا بثریا ازاں تو

میرے گریجویٹ ہو جانے کے بعد انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے ایک خاص اجلاس میں جو کلکتہ میں ہوا تھا اور جس کے صدر لالہ لاجپت رائے تھے، ترکِ موالات سے متعلق تجویز منظور کی۔ اس کے بعد پراونشیل کانگریس کمیٹی کے عہدہ داروں اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبروں کا انتخاب درپیش تھا۔ اس وقت جو لوگ اس کمیٹی پر قابض تھے ترکِ موالات کے مخالف تھے۔ اس زمانے میں اس کے صدر ڈاکٹر سچدانند سنہا اور سکریٹری چندر بنسی سہائے بیرسٹر تھے۔ چند مسلم نوجوان جو کانگریس میں نئے نئے شریک ہوئے تھے یہ چاہتے تھے کہ کمیٹی مخالفین ترکِ موالات کے قبضے میں نہ رہے اور آل انڈیا کانگریس میں بہار کی طرف سے وہ لوگ جائیں جو اس تحریک کے موافق ہیں۔ اس وقت کوئی شخص جو ایک خاص عمر سے کم کا نہ ہو دس روپے ادا کر کے پراونشیل کانگریس کمیٹی کا رکن ہو سکتا تھا۔ بہت سے مسلمان اس کے ممبر ہو گئے اور جب انتخاب ہوا تو ایک شخص بھی جو تحریک کا مخالف تھا نہ عہدہ دار رہا نہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ممبر ہوا۔

اس زمانے میں ابوالکلام آزاد رانچی میں رہتے تھے وہ اس زمانے میں آل انڈیا کانگریس کے رکن نہ تھے وہ پہلی بار ہم لوگوں کی وجہ سے اس کے رکن ہوئے۔ ان لوگوں کے روزنامہ انگریزی اخبار بہاری نے ایک مقالہ افتتاحیہ میں بڑی برہمی کا اظہار کیا لیکن اس سے ہوتا کیا تھا۔ اصل یہ ہے کہ مخالفین تحریک کو جو پراونشیل کانگریس کمیٹی پر قابض تھے یہ وہم بھی نہ تھا کہ ہم لوگ انہیں اس طرح نکال پھینکیں گے۔ ورنہ ان کا مقابلہ ہم لوگوں کے لئے اتنا آسان نہ ہوتا۔ آل انڈیا نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس ناگپور میں ہونے والا تھا اور گرما گرم خبر تھی کہ سی آر داس تحریک کی مخالفت کی بڑی زبردست تیاریاں کر رہے ہیں۔ میں ناگپور گیا۔ وہاں یہ دیکھا کہ ہم خیال لوگوں کو بڑا اندیشہ ہے کہ تحریک کی مخالفت کی تجویز منظور نہ ہو جائے۔ لیکن نہ جانے گاندھی جی نے کیا جادو کیا کہ سی آر داس ان کے ہم عقیدہ ہو گئے اور کلکتہ میں جو تجویز منظور ہوئی تھی۔ اس پر اجلاس نے صاد کیا۔ مخالفین میں جناح بھی تھے۔ مگر بڑی اکثریت تجویز کے حق میں تھی۔ میں کانگریس سے علیحدہ اس لئے ہوا کہ بتدریج مجھ پر یہ بات واضح ہو گئی کہ ہندوؤں میں ایک بڑی جماعت ایسی ہے جو یہ فراموش نہ کر سکی ہے کہ مسلمانوں نے ان پر صدیوں حکومت کی ہے اور ان پر مظالم ہوئے ہیں۔ میں یورپ سے ہندوستان واپس آیا تو جو کچھ ہوتا گیا اس سے یہ بات واضح تر ہوتی گئی۔ میں سیاسیات سے الگ رہا لیکن جب مسلم لیگ زور آور ہوئی تو کچھ لوگ میرے پاس آئے اور شاکی ہوئے کہ صوبے کی مسلم لیگ پر وہ لوگ قابض ہیں جن کی

---

[1] اشعار غالباً ایرانی شاعر سیفی کے ہیں۔ شاعر نے دکھایا ہے کہ ایک بھائی متروکات پدری سے خود کیا لینا چاہتا ہے اور دوسرے کے لئے کیا چھوڑتا ہے۔ خود جو لینا چاہتا ہے اس کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ یہ گویا کچھ نہیں۔ دوسرے کے لئے جو چھوڑتا ہے اس کا معاملہ برعکس ہے۔ مجیب

ذہنیت ان لوگوں کی تھی جو خان بہادر یا خان صاحب ہوا کرتے تھے۔ میں ان لوگوں کے ساتھ ہوا۔ کامیابی جزوی ہوئی حالانکہ مسلم لیگیوں کی اکثریت ان لوگوں کے ساتھ تھی۔ وجہ یہ کہ مرکزی والے نہ جانے کس غلط فہمی کی بنا پر ان کی ہر خلافِ قاعدہ بات کو صحیح قرار دیتے تھے۔ میں جلد ان لوگوں سے الگ ہو گیا۔ اس وقت سے اس وقت تک میں سیاسیات سے الگ ہوں۔ اس حد تک کہ آج تک میں نے کسی الکشن میں ووٹ نہیں دیا مگر ایک الکشن میں میں نے ایک کمیونسٹ کی کانگریسی کے مقابلے میں مدد کی تھی۔ اس کی وجہ خاص یہ تھی کہ مجھے اس پر حیرت تھی کہ کانگریسی امیدوار ایکا ایک کانگریسی کس طرح ہو گیا۔

اکثریت کو میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ یہ بھول جائے کہ مسلمانوں نے اس پر ظلم کئے۔ نہیں بھول سکتی تو یہ یاد کرے کہ آریاؤں نے اس ملک کے اصلی باشندوں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا اور اس کے مقابلے میں مسلمانوں کا سلوک اس کے ساتھ کیسا تھا۔ اسے اپنے حقوق کی حفاظت کرنے والے مسلمانوں کو فرقہ پرست نہیں کہنا چاہیئے۔ ان مسلمانوں کی سرپرستی نہیں کرنی چاہیئے جن کی خود غرضی کی وجہ سے مسلمان انھیں ذلیل سمجھتے ہیں۔ رُورکیلا اور رانچی کے فسادات کے بعد میں اور خلیل احمد صاحب ڈاکٹر ذاکر حسین سے ملنے گئے تھے انھوں نے خود ہی فسادات کا ذکر چھیڑا اور ایک کتاب کے بارے میں مجھ سے پوچھا کہ کیا میری نظر سے گزری ہے۔ یہ کتاب ایک یہودی نے ان مظالم کے متعلق لکھی تھی جو یہودیوں پر ہوئے انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ نہ پڑھی ہو تو پڑھوں۔ اس کے بعد ان کی زبان سے ایک جملہ نکلا جو بجنسہ درج کیا جاتا ہے۔ "MUSALMANS SHOULD DEVELOPE TOUGHNESS" انہوں نے یہ بھی کہا کہ مسلمانوں کو مصائب کا جس طرح مقابلہ کرنا چاہیئے تھا، نہیں کیا۔ اور بلند کردار ہونے کا ثبوت نہیں دیا۔ مجھے دونوں باتوں سے اتفاق ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ مسلمان ذرا ذرا سی باتوں پر مشتعل نہ ہوں۔ اپنے مطالبات میں جائز حدود سے متجاوز نہ کریں۔ لیکن اکثریت کے خوف سے اس کے ہر مطالبے کے آگے سر تسلیم خم نہ کریں۔ انہیں اس سے ڈرنا نہیں چاہیئے کہ وہ اپنے حقوق کی حفاظت چاہیں گے تو فرقہ پرست کہے جائیں گے۔ فرقہ پرست دراصل اکثریت کے وہ لوگ ہیں جو اقلیتوں کے ان افراد پر جو اکثریت کی دلالی کرتے ہیں، ہرگز بھروسا نہیں کرنا چاہیئے اور قانون کے حدود کے اندر رہ کر ہر ممکن صورت یہ ظاہر کرنے کی اختیار کرنی چاہیئے کہ ان دلالوں کو اقلیتوں کے خیالات کی ترجمانی کا کوئی حق نہیں۔

میں نے بحیثیت علم، سیاسیات اور معاشیات کا باقاعدہ مطالعہ کیا تھا۔ اس میں کمیونزم بھی آ گیا۔ مجھے لاسکی کے اس قول سے اتفاق ہے کہ کمیونزم ایک مذہب ہو گیا ہے اور میرے لیئے یہ ممکن ہے کہ میں اسے تسلیم کر لوں کہ معاشی مساوات ہونی چاہیئے لیکن یہ کبھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ حصول مقصد کے لیئے سب کچھ جائز ہے۔ اور حقیقت وہی ہے جس سے کمیونزم کو پھیلانے میں مدد ملے۔ لینن کا قول ہے کہ معاہدے توڑے جانے ہی کے لیئے ہوتے ہیں۔ میں کبھی ایسی جماعت پر جس کا یہ عقیدہ ہو بھروسا نہیں کر سکتا۔ کمیونسٹوں نے ذرا ذرا سے اختلاف پر ایک دوسرے کو جو سزا دی ہے وہ میں بھول نہیں سکتا۔ اور فرد جس طرح غلامی کی سطح پر پہنچا دیا جاتا ہے اسے میں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ بے شک غریبی دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے لیکن حکومت کو یہ نہ چاہیئے کہ قانون سازی میں صرف اسے مدنظر رکھے کہ زیادہ ووٹ کس طرح ملیں گے۔ بہت زمانہ ہوا کہ ایچ جی ویلز نے افراد کے حقوق کا چارٹ بنایا تھا۔ میں اس سے بڑی حد تک متفق ہوں۔ سب سے بڑی بات کہ میں ورلڈ اسٹیٹ چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اگر یہ وجود میں نہ آیا تو دنیا کا خاتمہ ہو یا نہ ہو تمدن و تہذیب کا ضرور خاتمہ ہو جائے گا۔

سے

ابتداء میں میرا مذہب وہی تھا جو میرے والد کا تھا۔ ان کی وفات کے بعد میں نے سرسید احمد خاں کی "خطبات احمدیہ" اور شبلی کی "علم الکلام" پڑھی تو عجیب تذبذب میں پڑ گیا جس کا میری صحت پر بڑا اثر پڑا۔ مختلف اصحاب سے تبادلۂ خیالات، جدید یورپی ادب، جدید نفسیات کے مطالعہ کے بعد بالآخر میں جن نتائج پر پہنچا ہوں وہ یہ ہیں۔

انسان کی ذہنی صلاحیت ایسی نہیں کہ الٹی میٹ ریلیٹیز کے متعلق کوئی فیصلہ کن بات کہہ سکے۔ میں جب اس امر پر غور کرتا ہوں کہ عالم کس طرح وجود میں آیا تو مبہوت ہو جاتا ہوں۔ میں خود قاصر ہوں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ دوسرے جو کچھ کہیں اسے بے چوں وچرا باور کر لوں۔ کہا جاتا ہے کہ پیمبروں کے پاس معجزے ہوتے تھے جو لوگوں کو قائل کر دیتے تھے۔ ویسے معجزے جن کا کتابوں میں ذکر ہے، آج پیش ہوں تو میں بھی قائل ہو جاؤں۔ یہ بات مجھے بالکل قرین انصاف نظر نہیں آتی کہ مجھ سے اس کی توقع کی جائے کہ معجزوں کی جگہ ان کی رپورٹوں کو قبول کر لوں۔ مذاہب میرے نزدیک انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں اور اس کا امکان کہ انسان مرنے کے بعد پھر زندہ ہوگا، بہت کم ہے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ مذہب سے بہت سے لوگوں کو اطمینان قلب نصیب ہوتا ہے اور بہتوں کو یہ برائیوں سے باز رکھتا ہے لیکن یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ بکثرت اصحاب جو شریعت کے احکام ظاہری کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے ہیں، اچھے انسان نہیں۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ احکام ظاہری کی پابندی کریں مگر یہ نہ سمجھیں کہ یہ سب کچھ ہے۔ انھیں خدمت خلق کی اہمیت کا احساس ہونا چاہیئے اور اس میں مسلم و غیر مسلم کا امتیاز نہیں رکھنا چاہیئے۔ انھیں محرم کی فضولیات اور درگاہ پرستی سے احتراز کرنا چاہیئے اس میں کروڑوں روپے ضائع ہوتے ہیں جو دوسرے کاموں میں، جو مفید خلق ہیں، صرف ہو سکتے ہیں۔

عنفوان شباب میں میں اور چند اصحاب (سید محمود، شبیر، زبیر صدیقی، فضل علیخاں وغیرہ) نے ایک انجمن بنام انجمن ترقی اردو قائم کی تھی۔ انگلستان سے واپسی کے بعد میری تحریک پر یہ پراونشیل انجمن بن گئی۔ میں اس کا سکریٹری ہوا اور لیڈی انیس امام صدر۔ یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ نے ایک تجویز یہ منظور کی کہ مدارس میں علوم کی تعلیم ہندوستانی زبان میں ہو۔ اس سے اردو بولنے والوں کو اندیشہ ہوا کہ ہندوستانی کے نام سے ہندی رائج کی جائے گی۔ حامیان اردو نے ایک جلسہ کیا اور اس معاملے کو انجمن ترقی اردو کے سپرد کیا۔ میں نے اس سلسلے میں انجمن کے سکریٹری ڈاکٹر عبدالحق سے مراسلت کی۔ یہ طے پایا کہ مرکزی انجمن ایک کمیٹی قائم کرے اور اس کا جلسہ پٹنہ میں ہو اور وہ اس پر غور کرے۔ اس سلسلے میں جو مراسلت ہوئی تھی اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ڈاکٹر عبدالحق ہندوستانی کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ وہ علمی زبان ہو سکے۔ میں نے صوبۂ بہار میں جو اردو ہندی کا جھگڑا ہوا تھا، اس کے متعلق معلومات فراہم کر کے انہیں بھیجے تھے۔ جو کچھ میں نے، کچھ دوسرے نے اکٹھا کئے تھے۔ ڈاکٹر عبدالحق نے اپنے نام سے ایک کتابچہ چھپوایا جس میں اپنی طرف سے وہ معلومات پیش کیں۔ ڈاکٹر عبدالحق نے وہ کتابچہ کمیٹی کے ارکان کو بھیجا۔ میں نے ڈاکٹر راجندر پرشاد سے اس سلسلے میں ملاقات کی تھی اور یہ استدعا کی تھی کہ کمیٹی کے ممبروں سے ملیں۔ انھوں نے کہا کہ ضرور ملتا لیکن گاندھی جی کے یہاں جا رہا ہوں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ میں ایسی زبان لکھ سکتا ہوں جو اردو والوں اور ہندی والوں دونوں کے لیے قابل قبول ہو سکتی ہے۔ بعد کو انہوں نے مجھے بلا بھیجا اور کہا کہ گاندھی جی کو یہاں کے معاملات کی اطلاع ہو گئی اور انہوں نے مجھے تار دیا ہے کہ میں کمیٹی کے ممبروں

سے ملوں۔ ان کے لئے ایک وقت مقرر ہوگیا۔ کمیٹی کا جلسہ ہوا تو ڈاکٹر عبدالحق نے اس کی صدارت کے لئے ڈاکٹر سید سلیمان ندوی کا نام پیش کیا اور مجھ سے کہا کہ اعتراض جلسے سے ارکان کمیٹی کو مطلع کروں۔ میری تقریر کے بعد پروفیسر مجیب نے جو ایک رکن تھے کہا کہ یہ تو کوئی بات ہی نہیں۔ میں نے جواباً کہا کہ ڈاکٹر عبدالحق کے کتابچے سے آپ کو یہ سب معلوم ہو چکا تھا۔ ان امور کی کچھ اہمیت ہی نہیں تو پٹنہ آنے کی زحمت ہی کیوں گوارا کی۔ جلسہ صبح کے وقت ہوا تھا۔ اور ڈاکٹر راجندر پرشاد سے ملنے کا وقت دوسرے دن مقرر تھا۔ ڈاکٹر عبدالحق نے کہا کہ ہم لوگوں کو اس کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ اور کچھ تجویزیں منظور کر لینی چاہئیں جو ان کے سامنے پیش کی جا سکیں۔ بغیر اسکے کہ کافی غور و فکر سے کام لیا جائے چند تجویزیں منظور ہو گئیں۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد آئے تو ان کے ساتھ بلدیو سہائے (جنھوں نے سنڈیکیٹ سے متعلق تجویز پیش کی تھی اور جو بعد کو ایڈوکیٹ جنرل ہوئے) اور ایک صاحب جو اس زمانے میں پراونشیل کانگرس کمیٹی کے صدر تھے، ان کے ساتھ تھے، کمیٹی کی منظور کردہ تجویزیں میرے پاس تھیں۔ میں نے انہیں ڈاکٹر عبدالحق کے حوالے کیا کہ وہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کو دکھائیں۔ انہوں نے آہستہ سے یہ کہا کہ ان سے "وکیلانہ" گفتگو کرنی چاہیئے۔ اس کے بعد ہی ایک مسودہ غلام السیدین نے جو کمیٹی کے ایک رکن تھے نکالا، ڈاکٹر عبدالحق کو دکھایا۔ انہوں نے مجھے دیکھنے کو دیا۔ اس کے بعد یہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کو دیا گیا۔ انہوں نے سرسری طور پر اسے دیکھا اور اس کے بعد اس پہ ڈاکٹر راجندر پرشاد اور ڈاکٹر عبدالحق کے دستخط ہو گئے یہی راجندر پرشاد عبدالحق پیکٹ ہے۔ اس کے بموجب ہندوستان کی زبان ہندوستانی قرار پائی جو ہندی اور اردو دونوں رسم الخطوں میں لکھی جائے گی۔ ہندی میں اگر کوئی علمی اصطلاح آئی تو اس کے ساتھ ہی قوسین میں اس کا اردو بدل ہوگا اور اردو کی تحریر میں ہندی بدل۔

میں نے کہا کہ اس معاہدے کا تعلق تو سارے ہندوستان سے ہے، بہار میں جو معاملہ درپیش ہے اس کا کیا ہوگا۔ بلدیو سہائے نے جواب دیا کہ اردو والوں کے مفاد کے تحفظ کے لئے انجمن کی پراونشیل شاخ جو باتیں پیش کرے گی منظور کر لی جائیں گی۔ یہ معاہدہ انجمن ترقی اردو کی مقرر کردہ کمیٹی کے سامنے آنے سے قبل ہی وجود میں آگیا اور کمیٹی کی منظور کردہ تجویزیں ڈاکٹر راجندر پرشاد کو دکھائی ہی نہ گئیں۔

غلام السیدین اور پروفیسر مجیب ڈاکٹر محمود کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے جو اس زمانے میں صوبۂ بہار کے وزیر تعلیم تھے۔ مجھے یقین ہے کہ معاہدہ کا مسودہ ڈاکٹر راجندر پرشاد، ڈاکٹر عبدالحق اور بعض دیگر اصحاب نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ اس کی خبر اگر نہ تھی تو مجھے اور بعض دوسرے ارکان کمیٹی کو۔ اس کے بعد سنڈیکیٹ یا وزیر تعلیم نے ایک ہندوستانی کمیٹی بنائی جس کے صدر ڈاکٹر سچدانند سنہا اور ڈاکٹر عبدالحق اس کے ایک رکن مقرر ہوئے۔ صوبہ کی انجمن ترقی اردو کا کوئی رکن اس میں نہیں لیا گیا۔ سنہا کمیٹی نے باتفاق ڈاکٹر عبدالحق جو فیصلے کئے ان میں سے ایک یہ تھا کہ جامع اللغات اور فرہنگ آصفیہ میں جو ہندی الفاظ ہیں اور ناگری پرچارنی سبھا کی شبد ساگر میں جو عربی فارسی الفاظ ہیں ہندوستانی سمجھے جائیں۔ ایسے ایسے الفاظ ہندوستانی قرار دیئے جانے لگے جو اردو والوں نے خواب میں بھی نہ سنے تھے۔ بلدیو سہائے نے صوبے کی انجمن کے بارے میں جو کچھ کہا تھا بالکل فریب نکلا۔ بے چینی پھیلی۔ اور ایک جلسے میں یہ منظور ہوا کہ اس معاملے پر غور کرنے کے لیے ایک کانفرنس منعقد کی جائے۔

اس جلسے میں ایسے حامیان اردو بھی تھے جو انجمن کے رکن نہ تھے۔ صوبے کی انجمن کی طرف سے ایک کمیٹی مقرر کی گئی جو ان الفاظ کے متعلق جو فیصلۂ مذکور کی رو سے ہندوستانی قرار پانے میں اپنی رپورٹ دے۔ میں نے دونوں کتابوں سے بہت سے ایسے الفاظ نکالے جو اردو والوں کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتے۔ تماشا یہ کہ سنہا کمیٹی کے منظور کردہ الفاظ پر مرکزی انجمن کے اخبار میں بھی اعتراض چھپے تھے۔ یہ رپورٹ چھپی اور اسی زمانے میں یا اس کے بعد الہ آباد کے ایک ماہنامے میں بھی شائع ہوئی۔ پٹنہ میں کچھ لوگ تھے جنھوں نے اس موقع

سے خالی فائدہ اٹھانا چاہا۔ ڈاکٹر عبدالحق کو اطلاع دی کہ کانفرنس کی اصلی غرض آپ کے خلاف ملامت کی تجویز منظور کرانی ہے۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا تھا کہ ان لوگوں نے اسے ناکامیاب بنانے کے لئے ان سے ہزاروں روپے وصول کیے۔ قاضی محمد سعید مجلس استقبالیہ اور صوبے کی انجمن کے سکریٹری تھے۔ ان لوگوں نے ان کا اعتماد حاصل کیا اور مجلس استقبالیہ کے رکن بنانے شروع کیے۔ مجلس استقبالیہ کا صدر چننے کے لئے ارکان مجلس کا جلسہ تھا۔ میں اس میں شرکت کے لئے گیا۔ مجھے دیکھتے ہی مسعود عالم ندوی نے کہا کہ آپ کو صدر ہونا چاہیئے۔ میں نے انکار کیا۔ یہ بظاہر موافق تھے لیکن دراصل مخالف۔

ڈاکٹر سید سلیمان ندوی کی ایک کتاب پر مختار الدین احمد صاحب (فی الحال پروفیسر) نے تبصرہ لکھا تھا اور ان کی بہت سی غلطیوں کی نشاندہی کی تھی۔ اس سلسلے میں ان سے بھی کچھ غلطیاں ہوئی تھیں اور ان کا لہجہ قابل اعتراض تھا۔ میرے ان کے تعلقات تھے اور مسعود عالم ندوی وغیرہ خلاف۔ واقعہ یہ سمجھے کہ میرا لکھا یا لکھوایا ہوا ہے۔ یہ لوگ اس بنا پر مجھ سے عداوت رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ صدارت کے لئے میرا نام پیش ہو اور مجھے شکست دی جائے۔ انجمن کی طرف سے ایک شخص کا نام پیش ہوا۔ ان لوگوں کی طرف سے ایک اور شخص کا نام پیش ہوا جو کسی حیثیت سے بھی ان کے برابر نہ تھے اور یہ صاحب کامیاب ہوئے۔ اگر میرا نام پیش ہوتا تو شکست مجھے ہوتی۔ یہ لوگ سمجھے کہ اب سب کچھ ان کی مرضی کے مطابق ہوگا۔ لیکن کانفرنس انجمن کی منعقد کردہ تھی اور اس زمانے میں میں اس کا صدر تھا۔ انجمن نے طلبہ کے لئے بہت رعایت کردی اور بہت سے طلبہ استقبالیہ کمیٹی کے رکن ہوئے۔ سبجکٹس کمیٹی کے ارکان کے انتخاب کے لئے جو جلسہ ہوا اس میں مخالف جماعت کا ایک شخص بھی منتخب نہ ہوا۔ لیکن صدر مجلس استقبالیہ کے خطبے میں بہت سی غلط باتیں تھیں اور ڈاکٹر عبدالحق کی مدح سرائی کی گئی تھی۔ کانفرنس کے صدر لاہور کے مشہور اخبار نویس ظفر علی خاں تھے جو ڈاکٹر عبدالحق سے ملے ہوئے تھے۔ سبجکٹس کمیٹی کے جلسے میں انہوں نے ایک تجویز پیش کی جس میں ڈاکٹر عبدالحق کی خدمات کا اعتراف تھا اور مجھے اسے پیش کرنے کے لئے کہا۔ میں نے قطعاً انکار کردیا۔ وہ تجویز جو منظور ہوئی اس میں ڈاکٹر عبدالحق کا نام نہ تھا۔ مگر سنہا کمیٹی کے فیصلوں سے سخت ناپسندیدگی ظاہر کی گئی تھی۔

اس کے کچھ دنوں بعد ناگپور میں مرکزی انجمن کی طرف سے ایک کانفرنس منعقد ہونے کا اعلان ہوا۔ یہاں جو کچھ ہوا تھا اس کی مفصل روداد ناگپور مختلف اصحاب کو بھیجی گئی اور وہاں خود مرکزی انجمن کی منعقد کردہ کانفرنس نے سنہا کمیٹی کے فیصلوں کو ناپسند کیا۔ سید ضمیر الدین احمد صوبے کی انجمن کے ایک رکن نے ڈاکٹر سنہا کو اس کی خبر دی تو وہ سخت حیران ہوئے کہ جو فیصلے خود ڈاکٹر عبدالحق کی اتفاق رائے سے ہوئے ہیں خود ان کی کانفرنس نے اسے ناپسند کس طرح کیا۔ تقسیم ہند کے بعد جب قاضی عبدالغفار مرکزی انجمن کے سکریٹری ہوئے تو اپنی مصلحتوں کے اقتضا سے انہوں نے یہاں کے کچھ لوگوں کو ملا کر ایک اور صوبے کی انجمن قائم کرائی۔ مگر پرانی انجمن بھی کئی سال تک باقی رہی۔ اور اردو ہندی کے اظہار رائے کے لئے ایک بڑی کانفرنس بھی اس کی طرف سے منعقد کی گئی تھی۔

میرے والد کو جس زمانے میں میں با شعور ہوا، شعر و شاعری سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ مگر ان کے خالو سید شاہ محمد حسین، رقم جوان کی جائیداد کے منتظم بھی تھے اکثر شعر پڑھا کرتے تھے۔ اور یہی حال نشتر کا بھی تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ کس طرح حسرت موہانی کا اردوئے معلیٰ میں نے دیکھا اور اس کے کئی پرانے مجلدات منگوائے اور ان میں شعرائے اردو سے متعلق جو مضامین تھے پڑھے، شعر العجم کی جلدیں بھی دیکھیں۔ بعد کو

مجھے غالب سے دلچسپی ہوئی اور میں نے اتنی بار اس کا دیوان دیکھا کہ اس کا بڑا حصہ مجھے یاد ہوگیا تھا۔ میں نے پہلا مضمون جو شعرائے اردو کے بارے میں لکھا، پٹنہ کے ایک ماہنامے میں، جو جلد ہی بند ہوگیا، شائع ہوا تھا۔ اس میں اور کچھ نہ تھا۔ گلزار ابراہیم مولفہ علی ابراہیم خاں خلیل نے شعرائے عظیم آباد کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا کچھ حصہ نقل کر دیا گیا تھا۔ معارف میں گارساں دتاسی کی تاریخ ادبیات کے ماخذ کے متعلق خود اس کے بیان کا ترجمہ شائع ہوا۔ میں نے ایک خط میں جو بنام مدیر معارف تھا اس کے اغلاط کی نشاندہی کی جو میری اجازت سے مدیر نے چھاپ دیا۔ اس کا جواب معارف میں نکلا۔ اس کے کچھ ہی دن بعد انگلستان چلا گیا اور جواب الجواب شائع نہیں ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں میری معلومات زیادہ نہ تھیں اور میرے بعض اعتراضات غلط تھے، رہا دتاسی تو اس کے متعلق بعد کو میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ یورپ میں میں نے بہت سے پرانے اور نئے شعراء کا کلام دیکھا۔ لیکن میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے یورپی شاعری کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔ یورپ کے متعدد کتب خانوں میں جو شعرائے اردو کے تذکرے اور دواوین ہیں، ان میں سے بیشتر کے متعلق میں نے یادداشتیں لکھیں جن کا بڑا حصہ ضائع ہوگیا ہے۔ یورپ جانے سے قبل میں نے چند شعر بھی کہے تھے۔ ان میں سے کچھ فارسی کا ترجمہ تھے۔ ایک شعر جو میں نے لڑکپن میں بیت بازی کی ضرورت کے لئے لکھا تھا یہ ہے ؎

ژولیدہ بال کیوں ہیں چہرہ ہے کیوں پریشاں
مرگِ رقیب کی کیا تم نے خبر سنی ہے

پروفیسر مختار الدین احمد نے میرے متعلق نقوش میں جو مضمون لکھا تھا، اس میں جو میرے اشعار منقول ہیں، ان میں سے کچھ ترجمہ ہیں، نہ جانے کیوں انہوں نے یہ بات نہیں لکھی۔ شعر اب بھی میں موزوں کر لیتا ہوں مگر میں شاعر نہیں۔ یورپ سے واپسی کے بعد پٹنہ میں مستشرقین کی کانفرنس ہوئی۔ اس کے لیے میں نے ایک بسیط مقالہ مصحفی پر لکھا تھا۔ اس وقت تک مصحفی کے تذکرے شائع نہیں ہوئے تھے اور اس کے دواوین بھی غیر مطبوعہ تھے۔ میں نے اپنے مقالے میں ان سب سے کام لیا تھا۔ مدیران اردو معارف نے اسے اشاعت کے لئے لینا چاہا تھا مگر میں اس پر کچھ اضافہ کرنا چاہتا تھا اور اس کے بغیر اشاعت مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ اضافہ ہوا نہیں اور مقالہ ضائع ہوگیا۔

میں نے ۱۹۳۶ء میں صوبے کی انجمن ترقی اردو کی طرف سے ایک رسالہ "معیار" نکالا تھا۔ اس کے پانچ چھ شمارے نکلے۔ اس* کے بعد یہ میری خرابی صحت کی وجہ سے بند ہوگیا۔ میں نے مصحفی کے آٹھوں دیوانوں کا انتخاب ایک خاص نقطہ نظر سے کیا۔ اس میں چار پانچ ہزار اشعار تھے۔ پروفیسر سرور نے جب وہ انجمن ترقی اردو کے سکریٹری ہوئے تھے، اسے شائع کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن پھر ادھر متوجہ نہ ہوئے۔ اب اس کے چند اوراق باقی رہ گئے ہیں۔

میں نے جب جب پریکٹس شروع کرنی چاہی، بیمار ہوگیا، بالآخر میں نے اس کا خیال ہی دل سے اٹھا دیا۔ اور ادبی تحقیقات کو بطور مشغلہ اختیار کیا۔ میں نے اسے تنقید پر کیوں ترجیح دی، اس کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ میں نے اپنے کو اس کے لئے زیادہ موزوں سمجھا ہوگا۔ جب غالب سے متعلق تحقیقات کا شوق ہوا تو فارسی کی طرف توجہ ہوئی اور میں نے فارسی زبان و ادب کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔ میں نے پٹنہ، رامپور، علی گڑھ، دہلی، حیدرآباد، بمبئی، لاہور، کراچی اور ڈھاکہ کے کتب خانوں کے اردو مخطوطات کا معتدبہ حصہ دیکھا ہے۔ میں نے

ان سے متعلق جو یادداشتیں لکھی تھیں وہ کچھ ہیں، کچھ ضائع ہو گئیں۔ جو ہیں وہ بھی اس طرح منتشر ہیں کہ ان سے کام لینا مشکل ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین جس زمانے میں بہار کے گورنر تھے، ادارۂ تحقیقات اردو کا کتب خانہ قائم ہوا۔ اس کا افتتاح انھوں نے کیا تھا۔ اور جس جلسے میں یہ رسم انجام ہوئی تھی اس کی صدارت شری کرشن سنہا نے کی تھی جو اس زمانے میں بہار کے چیف منسٹر تھے۔ اس موقع پر ایک ادبی نمائش بھی ہوئی تھی۔ اس میں جو مخطوطات پیش ہوئے تھے۔ ان کی فہرست جو قاضی محمد سعید نے تیار کی تھی، چھپ چکی ہے۔

"غالب بحیثیت محقق" کم و بیش ۲۵۰ صفحات کا مقالہ ہے جو نقد غالب مرتبہ پروفیسر مختار الدین احمد میں شامل ہے۔ جہاں غالب کے عنوان سے میں نے دو ڈھائی سو صفحے لکھے ہوں گے۔ یہ غالب انسائیکلوپیڈیا اگر مکمل ہو جائے تو ہزار صفحوں سے کم کی نہ ہو مگر اس کی تکمیل کی بالکل امید نہیں۔ اس کے علاوہ بھی میں نے غالب کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ غالب نے فارسی، اردو میں برہان قاطع کے متعلق جو رسالے لکھے تھے، میں نے یکجا کر کے "قاطع برہان و رسائل متعلقہ" کے نام سے شائع کر دیئے ہیں۔ ارادہ تھا کہ ایک دوسری جلد میں اس کتاب کے مباحث سے مفصل بحث کی جائے۔ مگر اب تک یہ ارادہ قوت سے فعل میں نہیں آیا۔

غالب کے علاوہ جن شعرا سے مجھے خاص طور پر دلچسپی رہی ہے، سودا، میر، مصحفی اور انشا ہیں۔ ذکر میر و نکات الشعراء مؤلفہ میر پر جو تبصرہ میں نے لکھا ہے چھپ چکا ہے۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی کتاب متعلق میر کی مفصل تنقید عیارستان میں ہے۔ سودا، مصحفی اور انشا کے متعلق بھی بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ اور ان کے متعلق اتنا مواد میرے پاس یا میرے علم میں ہے کہ کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ تعین زمانہ کے تحت میں نے سو ڈیڑھ سو صفحے لکھے ہوں گے اور کئی سو صفحے اور لکھ سکتا ہوں۔ یہی حال لسانیات سے متعلق مباحث کا ہے۔ میرا ایک طویل مقالہ "آزاد بحیثیت محقق" ہے اور میں نے ڈاکٹر اختر اورینوی کی کتاب متعلق زبان و ادب بہار پر ایک طویل تبصرہ لکھا تھا۔ فارسی مخطوطات کے بارے میں میرے بہت سے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ فارسی کی خدمت کے اعتراف کے طور پر صدر ہندوستان نے مجھے سرٹیفکیٹ آف آنر دیا تھا۔ میری ایڈٹ کی ہوئی کتابیں دیوان جوشش، دیوان رضا اور قطعات دلدار ہیں۔ مصحفی کا دیوان ہشتم ایڈٹ کر رہا ہوں یہ کتب خانہ خدا بخش کی طرف سے شائع ہوگا۔

میرے والد کو داستان امیر حمزہ کے مطالعے کا شوق تھا اور ان کے پاس اس کی بہت سی جلدیں تھیں۔ میں نے یہ سب بڑی دلچسپی سے پڑھیں۔ بوستان خیال کی ایک جلد کہیں اور ملی مگر اس میں میرا دل نہ لگا۔ بعد کو میں نے شرر، سرشار کے ناول اور رینالڈس کے ناول کے تراجم دیکھے۔ پریم چند کی بہت سی کہانیاں بھی پڑھیں۔ بعنوان شباب میں میں نے خود رومانی انداز کی ایک کہانی لکھی۔ اس کا عنوان مجھے یاد نہیں۔ یہ آگرہ اخبار میں ایک فرضی نام (جذبات حسرت کا مصور) سے چھپی تھی۔ میں بلگرامی ٹیوٹوریل کالج میں داخل ہوا، تو میں نے بہت سے انگریزی ناول دیکھے اور یہ سلسلہ پٹنہ واپس آنے کے بعد بھی جاری رہا۔ یورپ میں شاعری کی بہ نسبت مجھے ناول دیکھنے کا زیادہ شوق رہا اور انگلستان، فرانس، اٹلی، اسپین، ناروے، روس، جرمنی اور امریکہ کا شاید ہی کوئی بڑا ناول لکھنے والا ہو جس کے ناول میری نظر سے نہ گزرے ہوں۔ میرے زمانۂ اقامت یورپ میں جیمس جوائس اور مارسل پروست کا بہت چرچا تھا۔ یورپ سے واپسی کے بعد بھی میری دلچسپی باقی رہی اور میں نے "معیار" کے لئے خود بھی ایک کہانی لکھی جو ایک فرضی نام سے اس میں شائع ہوئی۔ کہانی کا عنوان "ایک [illegible] نوجوان" ہے۔

میں نے دو تین کہانیوں کا انگریزی سے ترجمہ بھی کیا ہے۔

بلگرامی ٹیوٹوریل کالج میں میں سینیئر کیمبرج کی تیاری کر رہا تھا۔ اور مرچنٹ آف وینس نصاب میں تھا۔ بیجر بلگرامی نے اسے اسٹیج کرایا اور مجھے بھی ایک پارٹ دیا۔ اس زمانے میں مجھے یہ ڈراما قریب قریب سب یاد تھا۔ بی اے کے لئے میں نے "ایز یولائک اِٹ" پڑھا۔ مجھے ڈراموں سے واقعی دلچسپی اس وقت ہوئی جب میں نے انگلستان میں تھیٹر میں ڈرامے دیکھے۔ میرے زمانۂ اقامت انگلستان میں کوئی اہم ڈراما وہاں اسٹیج ہوا ہو، ایسا نہ تھا جو میں نے نہ دیکھا ہو۔ یونانیوں کے ڈراموں سے لیکر پراندیلو (اطالوی تمثیل نگار جس کا اس زمانے میں بڑا چرچا تھا) تک کوئی بڑا تمثیل نگار نہیں جس کے ڈرامے میں نے نہ دیکھے ہوں۔ تنقیدی ادب کی بھی بہت سی کتابیں میری نظر سے گزری ہیں۔

میں نے دوران قیام یورپ میں فرانس، سوئزرلینڈ، جرمنی، ہالینڈ اور اٹلی کے کچھ حصے دیکھے ہیں۔ ان ممالک میں سب سے زیادہ میں فرانس سے واقف ہوں۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد میں نے یہاں کے بہت سے شہر دیکھے جہاں عموماً میں ریسرچ کے سلسلے میں گیا۔ تقسیم ہند کے بعد کراچی، حیدرآباد، سندھ، لاہور اور ڈھاکہ گیا ہوں۔

قاضی عبدالوحید نے تین بیٹے اور ایک بیٹی چھوڑی۔ میں سب سے بڑا اور میرے بعد میری بہن عائشہ۔ ان کی شادی خان بہادر سید محبوب عالم سے ہوئی جو قاضی اسد علی کے بیٹے کے نواسے تھے۔ ان کے یہاں ۱۹۲۲ء میں ایک بیٹی انجمن آرا عرف احمد پیدا ہوئی اس کے بعد وہ چند روز بیمار رہ کر قضا کر گئیں۔ میری والدہ کو ان سے جتنی محبت تھی کسی اور اولاد سے نہ تھی۔ ان کی موت کے بعد ایک بار خودکشی کی کوشش کی۔ ۱۹۲۴ء میں ان کی وفات ہو گئی۔

تقسیم ہند کے بعد سید محبوب عالم کراچی چلے گئے۔ ان کی تو وفات ہو چکی ہے۔ ان کی بیٹی اور ان کی اولاد وہاں ہے۔ قاضی محمد سعید ان کے بعد تھے۔ انہوں نے تحریکِ ترکِ موالات کے زمانے میں سرکاری مدرسے میں پڑھنا چھوڑ دیا اور جامعہ ملیہ میں داخل ہو گئے۔ وہاں سے انہوں نے بی اے کی ڈگری لی۔ انگلستان سے میری واپسی کے بعد وہ برلن گئے اور برلن یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ ان کا موضوع نشے کا فلسفۂ تعلیم تھا۔ وہاں وہ بہت دن رہے مگر اپنا کام مکمل نہ کر سکے۔ جنگ سے کچھ قبل وہ ہندوستان آئے۔ ممکن تھا کہ پھر وہاں جاتے لیکن جنگ چھڑ گئی۔ یہاں وہ ہم لوگوں کی مشترک جائداد کا انتظام کرتے رہے۔ صوبے کی انجمن ترقی اردو کے سکریٹری رہے اور ادارۂ تحقیقات اردو کے قائم کرنے والوں میں ایک وہ بھی تھے۔ ۱۹۴۶ء میں اس صوبے میں جو فسادات ہوئے اور ایک ریلیف کمیٹی قائم ہوئی اس کے وہ سکریٹری تھے اور انہوں نے اپنا کام بڑی جانفشانی سے کیا۔ وہ اس کا اعلان نہیں کرتے تھے لیکن مجھے خوب معلوم ہے کہ ہزاروں روپے اپنے بھی ریلیف میں خرچ کئے۔ بعد کو یہاں مشورت کمیٹی کی جو شاخ قائم ہوئی تھی اس سے ان کا گہرا تعلق تھا اور الکشن کے متعلق جو کمیٹی قائم ہوئی تھی اس کے وہ سکریٹری تھے۔ وہ مجرد رہے۔ اور یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ انھوں نے اپنے کو قومی خدمت کے لئے وقف

کر دیا تھا۔ ۱۹۲۸ء میں ان کی وفات ہوگئی۔ ان کے بعد قاضی محمد فرید تھے۔ کیمبرج میں معاشیات اور تاریخ کی ڈگریاں لینے کے بعد ہندوستان واپس ہوئے تو انہیں بہار میں کوئی نوکری نہ ملی۔ امرتسر کے اسلامیہ کالج میں مل گئی اور انہوں نے لاہور میں شادی کرلی۔ بعد کو وہ پشاور میں نوکر ہوئے اور بالآخر کراچی یونیورسٹی میں معاشیات کے پروفیسر اور صدر شعبہ ہوئے۔ ان کی وفات ۱۹۶۶ء میں ہوئی۔ ان کی بیوی اور ان کی اولاد پاکستان میں ہے۔

میری عمر پندرہ سولہ سال کی تھی کہ میری والدہ نے میرا عقد نکاح شاہ نظام الدین کی بیٹی سے جو خان بہادر سید ضمیر الدین احمد (صدر گلی شہر پٹنہ) کی نواسی تھیں کر دیا۔ رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ ایک آدھ برس بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ اس کے کئی برس بعد میری شادی شاہ رشید اللہ کی بیٹی سے ہوئی۔ یہ اپنے زمانے کے سربرآوردہ وکیلوں میں سے تھے۔ اور کچھ دن سرکاری پلیڈر بھی رہے تھے۔ یہ دراصل غازیپور کے رہنے والے تھے۔ شادی یہاں ہوئی تو یہیں بس گئے۔ ان کی وفات ۱۹۶۲ء میں ہوئی۔ میری اولاد صرف ایک ہے، قاضی محمد مسعود جو سوشیولوجی میں ایم۔ اے ہیں اور قانون کا امتحان پاس کر چکے ہیں۔

منطق نے بتایا کہ تناقض و تضاد کیا ہے۔ اور صحت فکر کے لئے مغالطوں سے بچنا کس قدر ضروری ہے۔ نفسیات نے سکھایا کہ اعمال کے محرکات لازماً وہ نہیں ہوتے جو ظاہر میں نظر آتے ہیں۔ شخصیت کا مسئلہ کس قدر پیچیدہ ہے اور کسی انسان کے متعلق رائے قائم کرنا کس قدر مشکل ہے۔ قانون شہادت کی تعلیم یہ ہے کہ واقعات اور آراء میں تمیز کی جائے۔ یہ دیکھا جائے کہ گواہ جو کچھ کہتا ہے وہ کس حد تک ذاتی مشاہدے پر مبنی ہے اور کس حد تک سماعت پر۔ گواہوں کے بیانات پر کسی اچھے وکیل کی جرح جس شخص نے دیکھی ہے اسے اس کا احساس ہوا ہوگا کہ جو باتیں پہلے بڑے اعتماد سے کہی گئی تھیں وہ کتنی ناقابل قبول تھیں۔ گواہ صادق القول ہو۔ جب بھی اس کا امکان رہتا ہے کہ اس کا مشاہدہ صحیح نہ ہو اور اس کا بیان غلط فہمی پر مبنی ہو۔ ان لوگوں کو جو تحقیقات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ میں یہ مشورہ دوں گا کہ وہ اسٹینلی گارڈنر کے وہ ناول دیکھیں جس میں پیری میسن گواہوں پر جرح کرتا ہے۔ جدید یورپی اور امریکی (کمیونسٹوں کا ادب اس میں شامل نہیں) ادب کی روح کا اظہار ایک یورپی نقاد کے قول کے مطابق، ایک بڑی علامت استفہام سے ہوتا ہے۔ کوئی بات محض اس لئے قبول نہیں کی جاتی کہ مدت دراز سے لوگ اسے مانتے آئے ہیں۔ ہر مسئلے پر از سر نو غور کیا جاتا ہے۔

عنفوان شباب سے قطع نظر، مجھے کوئی شخص ایسا نہیں ملا جس کی "اِقْتَدَيْتُ بِهٰذَا الْإِمَام" کہہ کر پیروی کرنے لگوں۔ وہ لوگ جو ابتداء میں مجھے بہت بڑے نظر آتے تھے ان میں سے بہت سے پست نظر آنے لگے۔ میں نہ جانے کتنی کتابوں سے متاثر ہوا۔ اور جن لوگوں سے زیادہ تعلقات رہے، میں نے ان کا اثر بھی قبول کیا ہوگا۔

میرا خیال ہے کہ ادب کو سیاسی و معاشی عقائد کی تبلیغ کا ذریعہ نہیں بنانا چاہئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ادیب کا کوئی عقیدہ نہ ہو۔ ادیب کا اپنے عہد کے مسائل سے اس قسم کا تعلق نہیں ہونا چاہیے جو ایک پارٹی کے ممبر کا ہوتا ہے۔

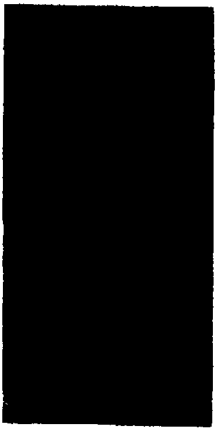
شاعری ہو یا تمثیل یا کہانی، اس میں جدت ہو تو ٹھیک ہے مگر جدت محض برائے جدت نہیں۔ میں ایسے ادب کا جو لکھنے والے کے سوا کسی کی سمجھ میں نہ آسکے قائل نہیں۔ نثر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ لکھنے والے کا مافی الضمیر وہ غلط ہو یا صحیح بالکل واضح طور پر ظاہر ہو جائے۔

میں چاہتا ہوں کہ ورلڈ اسٹیٹ وجود میں آئے۔ میری یہ بھی خواہش ہے کہ معاشرت بھی ایک طرح کی ہو۔ میں مغربی لباس پہنتا ہوں۔ مغربی کھانے کو بہ حیثیت مجموعی مشرقی کھانوں پر ترجیح دیتا ہوں۔ یہ صحیح نہیں (جیسا کہ پروفیسر مختارالدین احمد نے لکھا ہے) کہ میری محبوب غذا مرغ پلاؤ ہے۔ مشرقی کھانوں میں میں کباب کو بہت پسند کرتا ہوں۔ بعض اوقات مجھے جانوروں کا گوشت کھانا نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ میں نے ایک بار مہینوں تک گوشت نہ کھایا۔ مگر اس پر قائم نہ رہ سکا۔ آم میرا محبوب پھل ہے لیکن یہ صحیح نہیں کہ میرے نزدیک سب سے اچھا آم سپیا ہے (بہ قول پروفیسر مختارالدین احمد) کم از کم دس آم ہیں جنہیں میں اس سے بہتر سمجھتا ہوں۔ سردہ، ناشپاتی، اسٹرابری، چیری، سنگترا، انناس بھی مجھے بہت مرغوب ہیں۔ سگریٹ پینا میں نے انگلستان جا کر شروع کیا۔ میں ترکی سگریٹ کو امریکی سے بہتر سمجھتا ہوں۔ سگار کا مجھے کبھی شوق نہیں رہا۔ چار پانچ برس سے میں نے سگریٹ پینا بالکل بند کر دیا ہے اور اس سے مجھے کچھ تکلیف نہیں ہوئی۔ شراب میں نے کیمبرج میں پینی شروع کی۔ وہاں میرے بہت کم دوست تھے جو نہ پیتے ہوں۔ میں دو تین بار حد اعتدال سے متجاوز ہو گیا۔ اور اس کا برا اثر ہوا۔ اس کے بعد میں نے کبھی زیادہ نہیں پی۔ میں برگنڈی کو اور شرابوں کی بہ نسبت زیادہ پسند کرتا تھا۔ دو تین برس سے میں نے شراب پینا بالکل بند کر دیا ہے اس سے بھی مجھے کچھ تکلیف نہیں ہوئی۔

میں نے کرکٹ، ٹینس وغیرہ کھیلے۔ لیکن اس قسم کے کسی کھیل میں آگے نہ بڑھ سکا اور میں نے انہیں کھیلنا ترک کر دیا۔ شطرنج کا مجھے بہت شوق تھا لیکن میں اچھا شاطر نہ بن سکا اور مدتوں سے میں نے اس کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ برج میں نے انگلستان جاتے ہوئے جہاز پر سیکھا اور اس کے بعد یہ میرا محبوب کھیل ہو گیا۔ نہ جانے کتنی بار میں نے رات رات بھر برج کھیلا ہے۔ اس کا شوق ہندوستان واپسی کے بعد بھی رہا مگر اب اس سے کچھ تعلق نہیں۔ گزشتہ ۲۵ سال میں میں نے صرف ایک بار برج کھیلا۔

میں نے اشخاص اور معاملات کو ان کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ کامیابی ہوئی بھی ہو تو جزوی ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنے آپ کو بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے مگر جیسا کہ بودلیر نے کہا ہے، اس کے لئے بڑی جرأت کی ضرورت ہے۔ نہ جانے کس حد تک میں کامیاب ہو سکا ہوں۔





مجنوں گورکھپوری

"...... میرے پندار کو ان انکشافات سے جو صدمہ پہونچا اس کا اندازہ ہر شخص نہیں کر سکتا۔ بس یہ جی چاہتا تھا کہ ڈوب مروں۔ مشکل یہ تھی کہ بات اپنے قابو سے باہر ہو چکی تھی اور میں کاغذ اور سیاہی کی دنیا میں مجنوں مشہور ہو چکا تھا———......"

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

آج ایک لطیف اور نازک کسک کے ساتھ کئی روز سے مجھے رومی کا یہ شعر یاد آرہا ہے۔ کسی زمانے میں مجھے اس مثنوی کے جس کو پہلوی زبان کا قرآن کہا گیا ہے بیشتر حصے پورے کے پورے یاد تھے۔ اس وقت بھی جی چاہتا ہے کہ آگے کے شعر پڑھتا چلا جاؤں لیکن فی الحال میرا مطلب اسی شعر سے ادا ہو رہا ہے۔ اس تحریر کے پڑھنے والے کہیں گے کہ یہ بردستی کی کھینچ تان کیسی ؟ رومی کی مثنوی جس کو بانسری کا الم نامہ THE TRAGEDY OF THE REED کہا کرتا ہوں۔ تمثیلی کلام ہے جس کا موضوع حقیقت اور عرفانِ حقیقت ہے۔ روحانیت کے رموز و نکات کو مادی دنیا کے عارضی اور کثیف معاملات و مسائل سے تعبیر کرنا اور عالم بقا کے حقائق و معارف کو اس دارِ فنا کے حالات و حوادث پر منطبق کرنا کیا معنی رکھتا ہے ؟ یہ اعتراض ایک خاص مقام اور ایک خاص زاویہ نگاہ سے درست اور بجا ہوگا لیکن اور ایک بات بھی قابل لحاظ ہے۔ شاعری کی رمزیت کو بہت جامع اور ہمہ گیر ہونا چاہیئے اور عظیم المرتبت اور جلیل القدر شاعری میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ بلاغت دراصل اسی کا نام ہے۔

عام طور سے حقیقت کے اسرار مجاز کے پردے میں تلاش کئے جاتے ہیں۔ مادی اور جسمانی زندگی کے استعارات میں روحانی تجربات و واردات بیان کرنے کا دستور بہت عام ہے۔ خسرو، جامی، سعدی اور حافظ وغیرہ کے سادہ اور معمولی سے معمولی اشعار کی جب تک عارفانہ تاویل کرکے ان میں تصوف کا مفہوم نہ پیدا کیا جائے ہماری تسکین نہیں ہوتی۔ چاہے خود شاعر نے شعر لکھتے وقت شعوری طور پر اس کا کوئی لحاظ نہ رکھا ہو۔ میرا میلانِ طبع اور میری عادتِ فکر اس کے برعکس رہی ہے، عالم صور کی رنگینیوں میں ایک "جلوہ بے رنگ" دیکھنا ایک بہت پرانی رسم ہے۔ میں ہمیشہ عالمِ حقیقت کی بے رنگی یا یک رنگی میں عالمِ مجاز کی جملہ رنگینیاں تلاش کرتا رہا۔ بڑے سے بڑے عارفانہ بصیرت رکھنے والے شاعر کے نازک سے نازک شعر میں مجھے اس وقت تک لذت نہیں ملی جب تک کہ وہ ہمارے مادی وجود کے عامۃ الورود تجربات پر بھی محیط نہ ہو اور ان پر بھی صادق نہ آتا ہو۔

شعر کی زبان سادہ سے سادہ ہوتے ہوئے بھی استعاری ہوتی ہے یعنی اس میں صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ سطح تک ایک ہی انداز کے متعدد تجربات و مواقع پر صادق آسکے اور میں اپنے مطالعے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ دنیا کی تمام شائستہ زبانوں میں بہترین اشعار ایسے ہی ہوتے ہیں۔ شعر کی اصلی عظمت یہی ہے۔ مثال کے طور پر رومی کا یہی شعر لیجئے جس کو میں لکھ چکا ہوں۔ اس وقت اپنے ذہن سے نکال نہیں سکتا۔ حالانکہ اس وقت مجھے یہ سوچنا اور بتانا ہے کہ میرا اصلی وطن کہاں ہے۔ گزشتہ تیس سال کے اندر مجھ سے نہ جانے کتنی بار پوچھا جا چکا ہے کہ اپنے قلمی نام کے آگے گورکھپوری کیوں لکھتا ہوں۔ پوچھنے والوں میں زیادہ تعداد بستی کے لوگوں کی ہے۔ میں نے اس کا جواب دینے سے ہمیشہ پہلو بچایا۔ جن دنوں میں رسالہ "ایوان" نکالتا

تھا اور فرصت اور ذہنی اطمینان کی فراوانی تھی اور میں تفصیل کے ساتھ لکھ سکتا تھا۔ اس وقت بھی اس سوال کو ٹالتا ہی رہا۔ لیکن ابھی دو چار روز ہوئے میرے دیرینہ مہربان جناب تارا شنکر ناشاد نے جو سکسیریا انٹر کالج بستی میں معلم ہیں۔ مجھ سے کچھ اس طرح دریافت کیا ہے کہ آج میں اس سوال کا جواب دے کر سبکدوش ہو جانا چاہتا ہوں جس سے آج تک گریز کرتا رہا لیکن قبل اس کے کہ میں اصل سوال کی طرف رجوع کروں ایک اور بات قابلِ ذکر ہے جو اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ذرا زمانہ میں اُلٹے پاؤں چلئے اور اب سے کم و بیش چالیس سال پہلے کے ایک نہایت اہم اور فیصلہ کُن واقعہ کی رُوداد سُنیئے۔ ابھی "جوانی کی راتیں" اور "مرادوں کے دن" بھی اچھی طرح نہیں آئے تھے یعنی پندرہ سولہ برس کا بھی سن نہ تھا لیکن شعر و سخن کا حوصلہ نشہ کی طرح عروج پر تھا اور ساری ہستی پر چھایا ہوا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں اساتذہ کے فارسی اور اُردو اشعار اس طرح یاد تھے کہ انھیں کی سانسیں لیتا تھا۔ خود بھی شعر کہنے کی دھن میں رات دن کھویا رہتا تھا۔ فارسی یا اُردو کا شاید ہی کوئی بڑا شاعر ایسا ہو جس کی مشہور سے مشہور اور مشکل سے مشکل غزل پر میں نے دو چار شعر نہ کہے ہوں۔ اکثر اساتذہ کے مصرعوں پر میں خود اپنے مصرعے لگا لیتا تھا۔ خود مطالب ادا کرنے کے لیے تخلیقی اُپج کی گرمی ہر لمحے مجھے بے چین رکھتی تھی اور میں اس بے چینی میں عجیب لذت محسوس کرتا تھا۔ غرض کہ عجیب سرشاری اور مدہوشی کا زمانہ تھا۔

شعر کہنے کے لیے ایک عام اور دیرینہ رسم تخلّص رکھنا بھی ہے۔ میں اپنے کو اس رسم کی پابندی سے آزاد رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن پھر سوچا۔ دوسروں نے بھی سمجھایا کہ جب سرسیّد جیسے نثری مزاج رکھنے والے نے اپنے لیے "آہی" کا تخلّص ضروری سمجھا۔ جب سیّد جالب دہلوی جیسے غیر شاعر نے اپنے لیے ایسا غیر شاعرانہ تخلّص اس طرح رکھ لیا کہ آج ان کا اصلی نام کسی کو یاد بھی نہیں اور جب شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کا ایک شعر بھی حافظہ میں رہ جانے کی قابلیت نہیں رکھتا، بغیر تخلّص کے نباہ نہ سکے تو پھر میں کس شمار قطار میں؟ میرے لیے بھی کوئی نہ کوئی تخلّص ضروری ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا تخلّص ہو؟ میرا مطالعہ اس وقت بڑا وسیع تھا۔ اور جو تخلّص ذہن میں آتا تھا۔ اس تخلّص کے کم سے کم نصف درجن شاعر گزر چکے ہیں۔ آخر کار میں نے ایک روز جھنجھلا کر کہا کہ میں ایسا تخلّص رکھوں گا جو مجھ سے پہلے کسی نے نہ رکھا ہو اور جس کو آئندہ رکھتے ہوئے ہر شخص ہچکچائے یعنی مجنوں۔ یہ غالباً ۱۹۱۹ء کا ذکر ہے جب کہ میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ میں نے تو جھنجھلاہٹ میں یہ کہا تھا اور شاید یہ بات رفت و گزشت ہو جاتی اور میں کوئی تخلّص نہ رکھتا لیکن میرے ایک بچپن کے عزیز اور دوست تھے جو میرے ساتھ ہی رہتے تھے اور جو ابھی حال ہی میں کلکٹری سے پنشن لے کر گھر بیٹھے ہیں، ان کا نام احمد حسن ہے اور وہ مشہور انشاء پرداز مہدی حسن افادی الاقتصادی کے بیٹے ہیں۔ وہ یہ تخلّص لے اڑے اور مجھے اس شہر میں احباب کے حلقے میں اس نام سے پکارنا شروع کیا۔ آخر کار میں نے سنجیدگی کے ساتھ یہ قلمی نام اختیار کر لیا اور اسی نام سے شعر کہنے لگا۔ کوئی آٹھ دس سال بعد معلوم ہوا کہ مجھ سے سینکڑوں برس پہلے فارسی میں ایک مجنوںؔ مشہدی گزر چکے ہیں جو غالباً جامیؔ کے ہمعصر تھے اور جو اتنے برگزیدہ اور قابلِ احترام تھے کہ تذکرہ نگار ان کے نام کے ساتھ "مولانا" کا اضافہ کرنا ادب کی رُو سے ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا ایک شعر مجھے اس وقت بھی یاد آ رہا ہے خوب ہے ؎

بہ وادیٔ روم و نار زار می گریم
بدیں بہانہ زہجران یار می گریم

اسی زمانے میں یہ بھی پتہ چلا کہ اُردو میں بھی ایک مجنوں گزر چکے ہیں اور میر تقی میر کے شاگردوں میں تھے اور اتنے شعر کہتے کہ میر جیسے بے دماغ نے اُن کو اپنی شاگردی میں لے لینا مناسب سمجھا۔ یہ مجنوں عظیم آبادی تھے۔ بعض حسن کو میر ضیا کا شاگرد بتاتے ہیں۔ ان کا بھی ایک شعر سننے کے لائق ہے۔

دن میں سو سو بار اس کے روبرو جانا مجھے
اس میں سودائی کہے یا کوئی دیوانہ مجھے

میرے پندار کو ان انکشافات سے جو صدمہ پہنچا اس کا اندازہ ہر شخص نہیں کر سکتا۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ ڈوب مروں۔ مشکل یہ تھی کہ بات اپنے قابو سے باہر ہو چکی تھی اور میں کاغذ اور سیاہی کی دنیا میں مجنوں مشہور ہو چکا تھا۔ ایک تسکین یہ تھی کہ چلو میرے سوا بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ اس تخلص کا کوئی اور شخص گذر چکا ہے مگر یہ تسکین بھی نہیں رہی۔ میرے بعد ایک لکھنوی حضرت کو بھی شوق ہوا کہ وہ اپنے کو اس تخلص سے رسوا کریں۔ میں ان کی ہمت اور توفیق کی داد دیتا ہوں۔

مجنوں تو میں ضرور ہوا لیکن یقین مانئے کسی مقامی نسبت کا خیال دور تک میرے ذہن میں نہیں تھا اور اس کا الزام میرے سر نہیں آتا۔ میں اپنے کو اس زمانہ میں کسی مخصوص جگہ سے منسوب کر ہی نہیں سکتا۔ وہ زمانہ ایسا تھا جبکہ انسان کی نظر بلند ہوتی ہے اور اس کے فکر و احساس میں کائنات کی سمائی ہوتی ہے۔ میری تخئیل بے حد وسیع اور ہمہ گیر تھی اور میں اپنے تخئیل کے نشے میں چور تھا۔ اور مصلحت اندیشی اور مصالحت کوشی کا منزلوں زندگی میں پتہ نہ تھا۔ اس زمانہ میں واقعی ؎

اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں

اور "فضا کے پیچ و خم" میں تھک کر رہ جانے کا دھندلے سے دھندلا اندیشہ نہیں تھا۔ بڑے حوصلہ اور بڑے نشاط کے ساتھ محسوس کرتا تھا اور بڑے زعم کے ساتھ دعویٰ تھا کہ ؎

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلّی نہ صفاہاں نہ سمرقند

جب پہلے پہل میں نے اقبال کا یہ شعر پڑھا تو میں اپنا تخئیل کھو چکا تھا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کہیں سے وہ پھر مجھے پکار کر اپنا سراغ دے رہا ہے۔ پھر ایسا آدمی جو صدق دل سے اپنے کو مرد آفاقی سمجھ رہا ہو، اپنے نام کے آگے گورکھپوری کیسے لگا سکتا تھا؟

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُردو کے اخبار و رسائل نے میرے نام کے آگے اوّل اوّل گورکھپوری اضافہ کیا۔ اس لئے کہ میرے مراسلات گورکھپور ہی کی ڈاک سے روانہ ہوتے تھے۔ یہ ۱۹۲۰ء کی بات ہے۔ ایک عرصہ تک یہ ہوتا رہا کہ میں اپنے کو صرف "مجنوں" لکھتا رہا اور رسالے برابر "مجنوں گورکھپوری" چھاپتے رہے۔ یہاں تک کہ مجنوں گورکھپوری مشہور ہو گیا اور مجھے بھی اس کو قبول ہی کر لینا پڑا۔

اب سوال یہ ہے کہ میں گورکھپوری ہوں یا نہیں۔ جواب میں اگر اصرار کے ساتھ کہوں میں گورکھپوری ہوں تو کوئی منطقی یا قانونی

غلطی نہ ہوگی۔ لیکن جو مجھ سے یہ سوال کرتے رہتے ہیں اور جن کو مجھے گورکھپوری ماننے میں تامل ہے، وہ بڑی حد تک حق بجانب ہیں۔ میرا خمیر یقیناً بستی کی خاک سے ہوا۔ ایک دور افتادہ اور سیلاب زدہ گاؤں میں جو گھاگھرا اور کنواؤں کے کنارے تحصیل خلیل آباد ضلع بستی میں واقع ہے اور بلدہ عرف ملکی جوت کہلاتا ہے پیدا ہوا جہاں متمدن اور تعلیم یافتہ لوگوں کا بہت کم گذر ہوتا تھا۔ میری ددھیال کی یہی سرزمین ہے جہاں بدویت اور بربریت کے جملہ علامات و آثار اب تک اسی طرح پائے جاتے ہیں۔ جس طرح اب سے سو سال پہلے پائے جاتے تھے۔

مگر میری تربیت اور میرے مزاج و کردار کی تعمیر بستی ہی کے دوسرے موضع میں جو خلیل آباد اور گھگھرے کے درمیان لکھنؤ جانے والی پختہ سڑک کے کنارے واقع ہے اور منجھریا کہلاتا ہے۔ یہاں سے ایک میل کے فاصلے پر آمی ندی کے کنارے گورکھپور اور بستی کی سرحدیں ملتی ہیں۔ یہ جوار واقعی میری تربیت گاہ ہے، جہاں میں اپنی دادی کے ہاتھوں وہ بنا جو آج تک ہوں۔ عرصے سے یہاں آنا جانا چھوٹا ہوا ہے لیکن میری روح اس چھوڑے ہوئے دیار کی طرف اب بھی کھنچتی رہتی ہے۔ اس کے ساتھ میرے بڑے نازک جذبات اور سربلند ترین تخئیلوں کی یادیں وابستہ ہیں۔ ۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۴ء میں ایک چھوٹی سی نظم اسی کی یاد میں کہی گئی تھی جس کے دو اشعار یہ ہیں ؎

دفن تیری جھاڑیوں میں میرے دل کا راز ہے
تیری ہر موجِ ہوا میں میری ہی آواز ہے

تیرا ہر گوشہ کہ منزل گاہِ الہامات ہے
مکتبِ عرفان ہے یا گہوارۂ جذبات ہے

یہیں میں نے چودہ سال کی عمر تک بہترین تعلیم پائی۔ یہیں میرا شعور بالغ ہوا اور یہیں میرے اندر وہ ذوقِ جمال پیدا ہوا جو تمام مخالف حوادث و حالات کے باوجود آج تک جی کا روگ بنا ہوا ہے۔ یہی علاقہ میرے افسانوں کا جغرافیہ ہے اور اسی جگہ میرے بہترین افسانے لکھے گئے ہیں۔ جب میں انگریزی تعلیم کے لئے گورکھپور چلا آیا۔ اس طرح کہ پھر زیادہ تر گورکھپور رہنے لگا۔ تو بھی ایک مدت تک کوئی چھوٹی یا بڑی تعطیل ایسی نہیں ہوتی تھی جو میں یہاں آکر نہ گزارتا رہا ہوں کہ مٹی اور روح "THE SOIL AND THE SOUL" کے درمیان اندرونی نسبت اور باطنی اختلافات سے جو انکار کرے اس کو قائل کرنے کے لیے یہاں اور سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ وہاں ایک زبردست مثال میں بھی ہوں۔ طرح طرح کے معاملات اور موانع عرصے سے مجھے اس کی اجازت نہیں دیتے کہ میں اپنے دل و دماغ کی اس اولین تربیت گاہ کی طرف رجوع کروں اور میں اپنی عملی اور ظاہری زندگی میں عرصے سے کہنے کے لیئے اس کو بالکل فراموش کئے ہوئے ہوں مگر میری ہستی کی ایک ایک تہ میں اس کی یاد بسی ہوئی ہے اور ایک دن بھی ایسا نہیں گزرتا کہ میں اس یاد سے بے چین نہ رہتا ہوں۔

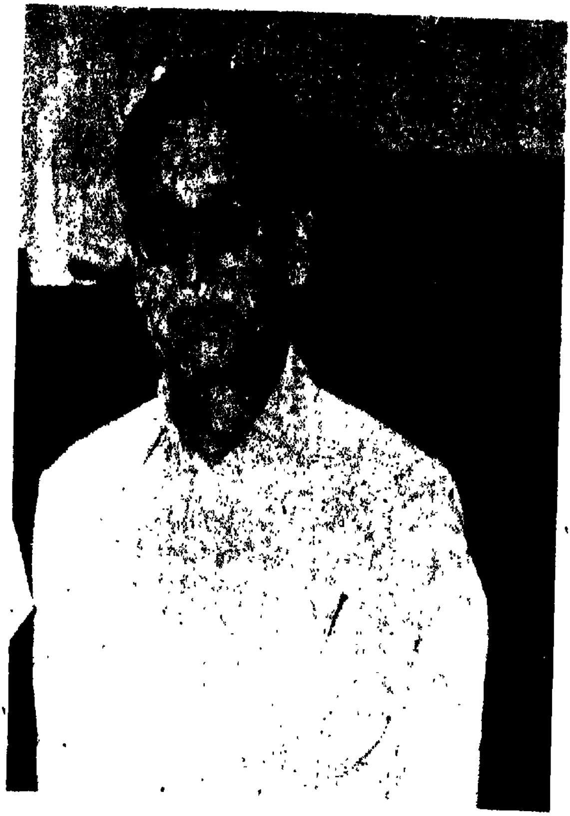
اگر میری ابتدائی تعلیم اور پرورش بستی میں ہوئی تو میری تعلیم کی تکمیل گورکھپور میں ہوئی اور پھر نہ صرف میں بلکہ میرے خاندان

کے تمام قریبی رشتہ دار معاش اور کاروبار کے سلسلے میں گورکھپور میں رہے۔ اگر میں صرف اتنا کہہ دوں کہ بستی میرا اصل وطن سہی، گورکھپور میرا وطن مالوف ہے تو بات ختم ہو جاتی ہے لیکن اتنا ہی نہیں ہے۔ اصلیت اس سے بہت زیادہ ہے اور جو نسبت مجھے گورکھپور سے ہے۔ اس کی جڑیں زیادہ گہری اور مضبوط ہیں۔ میری ددھیال ضلع بستی ہے اور ننہیال شہر گورکھپور، دادا اور باپ کی طرف سے مجھے بستی سے تعلق ہے اور دادی اور ماں کی طرف سے میں گورکھپور کا ہوں۔ اس سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ بیک وقت مجھے بستی اور گورکھپور دونوں سے جو نسبت ہے وہ تنہا میری ذات سے نہیں ہے بلکہ دو پشت پرانی ہے۔ میری دادی جن کا ذکر میں ایک سے زائد بار کر چکا ہوں۔ گورکھپور کے ایک ایسے خاندان کی تھیں جو علم و فضل اور فقر و درویشی میں اپنا ایک ممتاز مقام رکھتا تھا۔ خود میری دادی بڑی فاضل اور درک و بصیرت والی ہستی تھیں۔ عورتیں تو ایک طرف مردوں میں بھی بہت کم لوگ نکلیں گے جو ایسی پختہ اور جید شخصیت کے مالک ہوں۔ میری تربیت انھیں نے کی اور عربی فارسی اور ہندی میں مجھے جو کچھ استعداد ہے وہ انھیں کی دین ہے۔

مجھے اپنے گورکھپوری ہونے کے بارے میں جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ اب لوگ جو چاہیں سمجھیں اور مجھے جہاں سے چاہیں منسوب کریں۔ میں نے اپنی باشعور عمر کا وہ حصہ جس کے لیئے سعدی نے عمر عزیز کے چالیس سال کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ گورکھپور ہی میں بسر کیا لیکن جس سرزمین کو میری زاد بوم ہونے کی برکت یا نحوست حاصل ہے۔ اس سے اصلی اور اندرونی طور پر میں کبھی بھی اپنا دل ہٹا نہ سکا۔ اس کا خیال اور اس کی یاد اب تک میرے دل کا داغ بنی ہوئی ہے اور آج جب کہ میں انتہائی ضبط سے کام لیکر چند سطور لکھ رہا ہوں۔ میرے قلب و روح کی جو کیفیت ہے۔ اس کو "رومی بانسری" ہی کی آواز میں بیان کیا جا سکتا ہے ؎

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش
باز جوید روزگار وصل خویش

ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ اس کو رجعتی میلان یا ماضی پرستی کی علامات سمجھیں لیکن بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کو صرف واقعات سمجھنا چاہیئے اور خواہ مخواہ ان کی تاویل میں وقت ضائع نہ کرنا چاہیئے۔



گیان چند

"......... میں اصولاً ادھار نہیں لیتا۔ دکاندار سے سامان لینے جاؤں گا اگر اتفاق سے جیب میں پیسے کم ہوئے تو گھر واپس آکر لے جاؤں گا اور تبھی مزید خریدوں گا۔ میں نے مکان بنایا، موٹر خریدی ...... لیکن کبھی قرض نہیں لیا ...."

مولد و خاندان: میرا وطن قصبہ سیوہارا ضلع بجنور، یو، پی ہے۔ مذہب جین اور ذات اگروال ہے۔ سوداؔ کی ایک ہجو کا پہلا مصرع ہے ع ایک تھا بنیا ساہوکار، نام تھا اس کا گیان چند۔ اس مصرع کا مجھ پر پورا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ میں بھی قوم کا بنیا ہوں۔ میرا شجرہ یوں ہے۔ گیان چند بن بحال سنگھ بن بہاری لال بن پدم سین بن موہن لال بن منگنی رام بن سیتارام، اس سے اوپر کے نام معلوم نہیں۔ منگنی رام دھام پور سے سیوہارہ منتقل ہوئے تھے۔ باپ اور دادا اُردو سے نابلد تھے لیکن پردادا حکیم پدم سین فارسی کے عالم تھے۔ سنا ہے کہ وہ شعر بھی کہتے تھے اور زیرک تخلص کرتے تھے۔ ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کئی فارسی مخطوطات گھر میں محفوظ تھے۔ والدہ کا نام پاروتی تھا اور وہ غیر جین سناتنی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ میرے والدین کے پانچ لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہوئیں۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی ایک سال سے کم کی عمر میں گزر گئے اس لئے ہمارے شعور میں ہم تین بھائی اور چار بہنیں ہیں۔ میں سب سے چھوٹا ہوں۔ ایک بہن اور ایک بھائی کا کینسر سے انتقال ہو گیا ہے۔ میری جنم پتری کھو گئی ہے لیکن میری یادداشت اور روایات کے مطابق میری تاریخ ولادت ۱۹ ستمبر ۱۹۲۳ء ہے۔ دوپہر بارہ بجے کے قریب میں نے اس دنیا میں آنکھیں کھولیں۔

تعلیم۔ میں نے مسلم قدرت اسکول سیوہارہ سے ۱۹۳۷ء میں آٹھواں درجہ پاس کیا۔ اس زمانے میں سیوہارے میں مڈل اسکول ہی تھا۔ پارکر ہائی اسکول مرادآباد سے ۱۹۳۹ء میں ہائی اسکول پاس کیا۔ اردو اور ریاضی میں امتیاز کے ساتھ فرسٹ ڈویژن ملا۔ اسکول میں اُردو، فارسی کے اُستاد مولوی ظفر حسین عاصی تھے۔ امروہے کے رہنے والے تھے اور بڑے عالم تھے۔ گورنمنٹ انٹر کالج مرادآباد سے سیکنڈ ڈویژن میں ۱۹۴۱ء میں انٹر کیا۔ مضامین تھے اُردو، فارسی، انگریزی، منطق۔ اُردو کے استاد کوئی فاروقی صاحب تھے جن کا پورا نام یاد نہیں رہا۔ فارسی کے استاد مولوی فدا علی یا فدا حسین تھے اور ان کے بعد سید لقا علی نے پڑھایا۔ ڈگری تعلیم کے لئے الٰہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ جنرل انگلش، انگریزی ادب، اُردو اور سیاسیات کے مضامین لیے۔ بی۔ اے ۱۹۴۳ء میں سیکنڈ ڈویژن میں کیا۔ اردو کے اساتذہ ڈاکٹر حفیظ سیّد اور سید اعجاز حسین تھے۔ ایم اے اردو ۱۹۴۵ء میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن میں کیا۔ ایم اے کے اساتذہ میں پروفیسر سیّد ضامن علی، ڈاکٹر حفیظ سیّد، ڈاکٹر سید اعجاز حسین اور ڈاکٹر سیّد رفیق حسین تھے۔

ایم اے میں میرے ہم جماعتوں میں سیّد مجتبیٰ حسین بھی تھے۔ بڑے قابل تھے۔ اب وہ کراچی میں پڑھاتے ہیں اور ان کے مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ ایم اے کے دوران انھوں نے مجھے ریسرچ کا موضوع سجھایا، اردو داستانیں، چنانچہ ایم اے کرنے کے بعد میں نے اسی موضوع پر ضامن صاحب کی نگرانی میں ڈی فل میں داخلہ لیا۔ میں نے جون ۱۹۴۷ء میں اپنا مقالہ داخل کر دیا۔ ممتحنین تھے پروفیسر ضامن علی، مرزا جعفر علی خاں اثر اور ڈاکٹر عندلیب شادانی ڈھاکے والے۔ چونکہ ڈھاکہ پاکستان میں چلا گیا اس لئے وہاں سے رپورٹ آنے میں بہت دیر لگی۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں میری ڈی فل کا اعلان

کا اعلان ہوا۔ میرا خیال ہے کہ یہ ملک میں اُردو کا آٹھواں پی ایچ ڈی یا ڈی فل تھا۔ میرے اساتذہ میں ڈاکٹر رفیق حسین ملک کے پہلے اردو ڈی فل اور ڈاکٹر اعجاز حسین پہلے ڈی لٹ تھے۔ ۱۹۵۴ء میں میں نے آگرہ یونیورسٹی سے سوشیالوجی میں ایم اے کیا جس میں سیکنڈ ڈویژن ملی۔ یہ ایم اے میں نے پرائیویٹ طور پر کیا۔

غالباً ۱۹۵۶ء میں میں نے آگرہ یونیورسٹی ہی میں ڈی لٹ کے لئے داخلہ لیا۔ جس زمانے میں میں نثری داستانوں پر کام کر رہا تھا مجھے محسوس ہوا تھا کہ منظوم داستانوں یعنی مثنویوں پر بھی کام ہونا چاہیئے۔ مجھ سے ایک سال بعد ایک طالب علم ملخ ناتھ ورما نے الہ آباد یونیورسٹی میں ریسرچ میں داخلہ لیا اور میری تجویز پر اردو مثنویوں کا موضوع لیا۔ ڈاکٹر اعجاز حسین ان کے نگراں تھے۔ ورما صاحب ایک سال بعد ریسرچ کو تیاگ کر چلے گئے۔ میں نے ڈی لٹ کے لئے وہی شمالی ہند میں اُردو مثنوی کا موضوع لیا۔ کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ الہ آباد میں سید محمد عقیل اسی موضوع پر ڈاکٹر اعجاز حسین کی نگرانی میں ڈی فل کے لئے کام کر رہے ہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ انھیں ڈی فل کی ڈگری مل گئی ہے۔ میں نے کسی ذریعے سے ان کا مقالہ منگا کر دیکھا۔ اندازہ ہوا کہ ان کا کام تنقیدی نوعیت کا ہے میں تحقیقی پہلو پر زور دینا چاہتا تھا اس لئے میں نے اپنا کام جاری رکھا اور ۱۹۵۸ء میں مقالہ یونیورسٹی میں داخل کر دیا۔ ممتحنین تھے پروفیسر عبدالقادر سروری (عثمانیہ یونیورسٹی)، پروفیسر آل احمد سرور (علی گڑھ) اور جناب کلیم الدین احمد۔ پہلے دو حضرات نے مقالے کو پاس کر دیا۔ اور کلیم صاحب نے نظر ثانی کے لئے واپس کرنے کی سفارش کی۔ ان کے بعد مقالہ چوتھے ممتحن ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی (بمبئی) کے پاس بھیجا گیا۔ انھوں نے بھی مقالے کو ترمیم کے لئے واپس کرنے کی سفارش کی۔ نتیجتہً مقالہ مجھے واپس کر دیا گیا۔ کلیم صاحب کی رپورٹ بہت مفصّل تھی۔ میں ان کے کئی اعتراضات کو تسلیم نہیں کرتا لیکن بقیہ کو قبول کرتا ہوں۔ ان کا ایک اعتراض یہ تھا کہ اس مقالے میں مثنوی کی تاریخ ہے، ارتقا نہیں۔ میں اس اعتراض کو پوری طرح نہیں سمجھا لیکن اگلی بار میں نے ایک باب اردو مثنوی کا ارتقا کے عنوان سے اضافہ کیا جس میں مثنوی میں رجحانات سے ارتقا کا دھا (؟) پیش کیا ہے۔ معلوم نہیں ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کو کس لئے ڈی لٹ کا ممتحن بنایا گیا وہ ایک کالج کے استاد تھے اور خود ڈی لٹ بھی نہیں تھے۔ ان کا اعتراض تھا کہ سیاسی اور سماجی پس منظر کا باب بہت مختصر ہے اگلی بار میں نے یہ بات بہت مفصّل لکھ دیا۔ ڈاکٹر محمد حسن نے میری کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے، اس باب کے طول پر اعتراض کیا ہے۔ زمانے کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جب میں جموں یونیورسٹی میں پروفیسر تھا ایک بار غلطی سے ریڈر کی پوسٹ کا اشتہار ہو گیا۔ ڈاکٹر مدنی نے بھی درخواست دی اور ایک ذاتی خط میں مجھے لکھا کہ اگر آپ مجھے اس پوسٹ کا اہل سمجھتے ہوں تو لے لیجئے۔

اگر مقالہ ترمیم کے لئے واپس کیا جاتا ہے تو کم از کم چھ ماہ کے بعد دوبارہ داخل کیا جا سکتا ہے۔ آگرہ یونیورسٹی میں قاعدہ تھا کہ ڈی لٹ کا رجسٹریشن کرایا جائے تو جلد از جلد چھ ماہ کے بعد ہی مقالہ داخل کر سکتے ہیں۔ میں نے اپنا پہلا رجسٹریشن منسوخ کرایا اور دوسری بار عنوان کی خفیف سی تبدیلی کے بعد نیا رجسٹریشن کرایا۔ کچھ عرصے کے بعد مقالہ داخل کر دیا۔ ممتحنین تھے پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر آل احمد سرور اور سید احتشام حسین۔ مقالہ پاس ہو گیا اور ۱۹۶۰ء کے اوائل میں مجھے ڈگری مل گئی۔ اس طرح کاغذی قواعد کے لحاظ سے میری یہ ڈی لٹ کی ڈگری پہلی کوشش ہی پر ملی ہے اور مقالہ ترمیم کے لئے واپس نہیں کیا گیا لیکن

نت یہی ہے کہ یہ ترمیم شدہ مقالہ ہے۔ نقشِ ثانی میں نقشِ اوّل سے صرف یہ فرق ہے کہ سیاسی اور سماجی پس منظر کا باب
بفصل ہے اور چوتھا باب "اردو مثنوی کا ارتقا" نیا اضافہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ مقالہ اسی شکل میں ہے جیسا کہ پہلی بار تھا۔
لٹ کے دوسرے مقالوں کو سامنے رکھ کر آپ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اس مقالے کا نقشِ اوّل ڈی لٹ کے شایانِ شان تھا
ہیں۔ میں نے ۱۹۶۱ء میں ساگر یونیورسٹی کے گرمائی اسکول لسانیات میں درس لیا اور ۱۹۶۲ء میں کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ
سکول میں شامل ہو کر ایڈوانس لسانیات کا سرٹیفکیٹ لیا۔

تاہل۔ ۱۹۵۳ء میں سہارنپور میں شادی کی۔ اہلیہ کا نام اُرملا ہے۔ اور یہ بھی غیر جین سناتن دھرمی خاندان کی ہیں۔ شادی
سال انھوں نے ہندی میں ایم اے پریویس کیا تھا۔ بعد میں ایم اے فائنل کر کے تکمیل کر لی۔ اولاد میں ایک لڑکی اور دو لڑکے ہیں۔
کی شادی ہو گئی اور وہ امریکہ میں رہتی ہے۔ بڑے لڑکے نے تعلیم مکمل کر لی ہے اور وقتِ تحریر وہ ملازمت کی تلاش میں ہے۔ چھوٹا
تعلیم حاصل کر رہا ہے۔

مت: ۱۹۵۰ء میں یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد میں تین سال بے روزگار رہا۔ جولائی ۱۹۵۳ء میں حمیدیہ کالج بھوپال میں اردو کا لکچرر
۔ یہ ایک سرکاری ڈگری کالج تھا۔ میرا گریڈ ۲۰۰ تا ۴۵۰ تھا۔ ۱۹۵۳ء میں ترقی پا کر ۳۰۰ تا ۶۰۰ کے گریڈ میں ہو گیا۔ ۱۹۵۶ء
حمیدیہ کالج میں اردو ایم اے کا کلاس کھولا گیا اور میں کالج پروفیسر مقرر ہوا۔ اسی سال وکرم یونیورسٹی اجین قائم ہوئی اور حمیدیہ
اسی سے ملحق ہو گیا۔ ۱۹۵۹ء میں مجھے ترقی دے کر گورنمنٹ ڈگری کالج سیہور کا پرنسپل مقرر کیا گیا لیکن میں نے یہ ترقی
ی لی۔ اور پروفیسری پوسٹ پر رہا حالانکہ اس سے میرا مالی خسارہ ہوا۔ جولائی ۱۹۶۵ء میں میں جموں کشمیر یونیورسٹی کے
ں ڈویژن میں پروفیسر اردو مقرر ہوا۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء میں میں نے وہاں چارج لیا۔ اور نیا شعبہ قائم کیا۔ ۱۹۶۹ء میں جموں
یورسٹی کشمیر یونیورسٹی سے الگ ہو گئی۔ جموں میں گیارہ سال کی ملازمت کے بعد اکتوبر ۱۹۷۶ء میں میں الٰہ آباد یونیورسٹی
پروفیسر و صدر شعبہ ہو کر واپس آ گیا۔ اگست ۱۹۷۸ء میں یہاں کے وائس چانسلر نے مجھے الٰہ آباد یونیورسٹی کی
وائس چانسلری پیش کی۔ میں نے معذرت کر لی۔ چند روز کے بعد پھر انھوں نے کسی کو میرے پاس بھیجا جس نے
ے رضامند کرنا چاہا لیکن میں نہ مانا۔ دسمبر ۱۹۷۸ء میں حیدر آباد کی نئی مرکزی یونیورسٹی نے مجھے اردو پروفیسری کی پیش کش کی۔
انکار کرتا رہا۔ میرے دوستوں نے اصرار کیا اور مجھے مجبور کیا کہ میں اس اسامی کو قبول کر لوں۔ آخر فروری ۱۹۷۹ء کے وسط میں میں نے
عارضی منظوری دے دی ہے اور ۲۶ مارچ ۱۹۷۹ء کو (بشرطِ حیات) وہاں کا چارج لوں گا۔ اپریل میں وہاں دیکھ کر طے کروں
کہ مجھے وہاں رہنا چاہیے یا الٰہ آباد واپس آ جانا چاہیے۔

صانیف: میری ذیل کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

اردو کی نثری داستانیں، انجمن ترقیِ اردو پاکستان کراچی ۱۹۵۴ء۔ میں اس کتاب سے بہت ناآسودہ تھا۔ اس کو میں نے
سر نو لکھا اور بہت سے اضافے کیے۔ طبع دوم یعنی ترتیب نو انجمن ترقیِ اردو پاکستان سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی۔ اب اس پر
ید نظرِ ثانی کی ہے اور اسے شائع کرانے کی فکر میں ہوں۔

(۲) تحریریں، تنقیدی و تحقیقی اور چند انشائی مضامین کا مجموعہ۔ فروغِ اردو لکھنؤ ۱۹۶۴ء

(۳) اُردو مثنوی شمالی ہند میں۔ انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۶۹ء۔ یہ ڈی لٹ کا مقالہ ہے۔ اس کا مسودہ میں نے انجمن کو ۱۹۶۱ء میں دے دیا تھا جہاں سے یہ ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔

(۴) تفسیرِ غالب۔ جموں کشمیر کلچرل اکیڈمی سری نگر۔ اس کتاب پر تاریخ اشاعت ۱۹۷۱ء درج ہے لیکن یہ دراصل مارچ اپریل ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔ اس میں غالب کے قلم زد کلام کی شرح ہے۔

(۵) لسانی مطالعے ۱۹۷۳ء۔ یہ لسانیاتی مضامین کا مجموعہ ہے جسے ترقی اردو بورڈ کے لئے نیشنل بک ٹرسٹ نے شائع کیا۔

(۶) تجزیے۔ ۱۹۷۳ء مکتبۂ جامعہ نئی دلی۔ یہ تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔

(۷) رموزِ غالب۔ ۱۹۷۶ء مکتبۂ جامعہ نئی دلی۔ یہ غالب سے متعلق میرے مضامین کا مجموعہ ہے۔

(۸) حقائق ۱۹۷۸ء۔ یہ تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے جسے خود میں نے شائع کیا۔

زیرِ طبع۔

(۹) ذکر و فکر۔ یہ بھی تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کی کتابت ہو رہی ہے اور اس سال میں ضرور شائع ہو جائے گا۔ اسے بھی میں ہی شائع کر رہا ہوں۔

(۱۰) 'عام لسانیات' یہ ایک ضخیم کتاب ہے جو برسوں سے ترقی اُردو بورڈ میں زیرِ طبع ہے۔ چند ماہ میں 'اُردو مثنوی شمالی ہند میں' کا دوسرا ایڈیشن بھی آنے والا ہے۔

میں نے زمانۂ طالب علمی میں کثرت سے شعر کہے جو شائع نہیں کئے۔ ۱۹۵۴ء یا ۱۹۵۵ء کے بعد شاعری ترک کر دی۔ اس کے بعد پانسات غزلیں ہی کہی ہوں گی۔ جملہ اشعار تقریباً ساڑھے تین ہزار ہیں جن میں کوئی پانسو رباعیاں ہیں۔ کبھی فرصت ہو تو ان کا انتخاب کر کے اصلاح و ترمیم کر دوں اور پھر ایک مجموعہ ترتیب دوں۔

انعامات: میری کتابوں پر حسبِ ذیل انعامات ملے۔

۱۔ یوپی اردو اکیڈمی سے 'اردو مثنوی شمالی ہند میں' اور تفسیرِ غالب پر دو دو ہزار کے انعامات اور لسانی مطالعے پر تین ہزار کا انعام۔

۲۔ تفسیرِ غالب پر ایوانِ غالب کے غالب انسٹی ٹیوٹ سے پانچ ہزار کا انعام ملا۔

۳۔ تجزیے پر جموں کشمیر کلچرل اکیڈمی سے دو ہزار کا انعام ملا۔

چونکہ میں خود یوپی اُردو اکیڈمی کی انعامی کمیٹی کا رکن ہو گیا اس لئے میری تازہ کتابوں کو انعام کے لئے داخل نہیں کیا جا سکا۔

کمیٹیوں کی رکنیت:

۱۔ انجمن ترقیِ اردو ہند کی جنرل کونسل کا آخری لائف ممبر۔

۲۔ بھارتیہ گیان پیٹھ کی اردو کمیٹی کا رکن۔

۳۔ ساہتیہ اکادمی کی اردو کمیٹی کا رکن۔

۴۔ یوپی ہندوستانی اکیڈمی کا وائس پریزیڈنٹ۔

۵۔ فروغ اُردو کی نگراں کمیٹی کا رکن رہ چکا ہوں۔

۶۔ ترقی اُردو بورڈ کا رکن۔

بعض دوسرے اداروں اور کمیٹیوں کا بھی رکن ہوں لیکن وہ قابلِ ذکر نہیں۔ دراصل اب میں کمیٹیوں کی رکنیت چھوڑتا جا رہا ہوں کیونکہ سفر نہیں کرنا چاہتا۔ کہاں تک گردش کیجئے اور کیوں کیجئے؟ حتی الامکان پاؤں توڑ کر بیٹھنا چاہتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں نے قسم کھا کر امتحان کے پرچے بنانا اور کاپیاں دیکھنا ترک کر دیا ہے۔ تدریسی ملازمت میں جلبِ زر اور تجارت کے یہی دو ذریعے ہوتے ہیں۔ کمیٹیوں کی رکنیت اور امتحان کا کام۔ میں نے انھیں دونوں سے اجتناب کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ میرے کچھ اور ریکارڈ ہیں۔

۱۔ آج تک میں نے کسی سے امتحانی کام کی درخواست نہیں کی۔

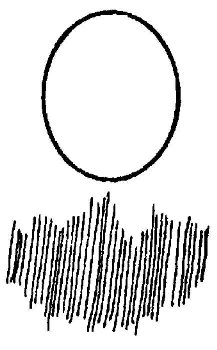
۲۔ میں نے کبھی کسی سے کسی کمیٹی کی رکنیت کی التجا نہیں کی۔

۳۔ میں نے کبھی کسی سے اپنی کسی کتاب یا تحریر پر تبصرہ کرنے کو نہیں کہا۔

۴۔ میں اصولاً اُدھار نہیں لیتا۔ دکاندار سے سامان لینے جاؤں گا، اگر اتفاق سے جیب میں پیسے کم ہوئے تو گھر واپس آ کر لے جاؤں گا اور تبھی مزید خرید کروں گا۔ میں نے مکان بنایا، موٹر خریدی اور اس کے ایک ماہ بعد ہی ریفریجریٹر۔ کبھی قرض نہیں لیا۔

۵۔ کبھی کسی الیکشن میں کھڑا نہیں ہوا۔ تعلیمی زندگی میں بھی کسی بزم کے عہدے کے لئے الیکشن نہیں لڑا۔ انجمن ترقی اُردو کی مجلسِ عام کے لئے میرے علم کے بغیر میرا نام تجویز کیا گیا۔ ووٹ پڑے، میں منتخب ہوا اور اخبار سے مجھے معلوم ہوا کہ میں مجلسِ عام میں لے لیا گیا ہوں۔

مجھ اکھڑے ہوئے آدمی کی بے رنگ زندگی کی یہ بے کیف روداد ہے جسے ۱۸ مارچ ۱۹۷۹ء کو ننگِ قرطاس کیا۔





گوپی چند نارنگ

"........میرے نزدیک تحقیق میں سب سے زیادہ اہمیت تحقیق کی ضرورت کے واضح احساس کی ہے۔ تحقیق برائے تحقیق گھانس کھودنے کا شغل ہے۔ ادبی تحقیق وہی کارآمد ہے جو کسی نفسیاتی، تاریخی یا سماجی مسئلے کو حل کرنے کی طرف قدم اٹھائے یا کسی ایسی صداقت کے چہرے سے نقاب اٹھائے جس سے دوسری اہم صداقتوں کا پتہ چلانے میں مدد ملے........."

ترقی یافتہ ملکوں میں آئی بی ایم (I.B.M) مشینوں کی وبا نہایت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اعداد و شمار کی دنیا میں ان کی ضرورت سمجھ میں آسکتی ہے، لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ انسان کی شخصیت کا تجزیہ بھی اب سوراخ دار کارڈوں کا محتاج ہو کے رہ گیا ہے۔ حال میں ایک جعلی مصنف مارک اسے پرنی (MARK EPERNAY) کی کتاب "دی مک لینڈرس ڈائی من شن (THE MCLANDRESS DIMENSION) شائع ہوئی ہے۔ اس کا مرکزی کردار ہارورڈ یونیورسٹی کا ایک ذہین پروفیسر مک لینڈرس ہے۔ جس کی شہرت کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ اس نے "مک لینڈرس کوافی شنٹ" (MCLANDRESS COEFFICIENT) کا نیا نظریہ دریافت کیا ہے۔ مختصراً اس نظریے کو "مک ایل سی (MC. ELSEE) بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ شخصیت کے تجزیے کا مشینی نظریہ ہے۔ اس رُو سے یہ جاننے کی کوشش کی جاتی ہے کہ دیئے گئے وقت میں ایک شخص اپنی تقریر یا تحریر تک اپنے خیالات کو اپنے علاوہ دوسرے موضوعات پر مرکوز رکھ سکتا ہے یعنی عام غور و فکر میں وہ کتنی بار صیغۂ متکلم کا استعمال کرتا ہے اور کتنی بار اپنی ذات و شخصیت کی طرف پلٹ آتا ہے۔ ان اعداد و شمار کی مدد سے یہ پتہ چلانا دشوار نہیں کہ کون شخص اپنی انا کا زیادہ شکار ہے اور کون کس حد تک غیر جانب داری سے دوسرے مسائل پر یک سو ہو کر سوچ سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کتاب کے اصلی مصنف ہندوستان میں امریکہ کے سابق سفیر گال برتھ ہیں جو خود ہارورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور جن کا شمار چوٹی کے ماہرین اقتصادیات و معاشیات میں ہوتا ہے بہرحال اس نظریے کی رُو سے بعض نہایت دلچسپ نتائج برآمد ہوئے ہیں، مثلاً صدر کینیڈی مرحوم اپنی ذات کو محض ڈھائی منٹ تک بھول سکتے تھے۔ ان سے کہیں بہتر ریکارڈ فلمی اداکارہ الزبتھ ٹیلر کا ہے یعنی تین منٹ، اور بیچارے راک فیلر تو ۴۰ سیکنڈ سے زیادہ نہیں ٹِک سکتے۔ اس نظریے کی مدد سے اگر اردو شاعروں اور ادیبوں کا "مک ایل سی" دریافت کرنے کی کوشش کی جائے تو جہاں ایک طرف تفریح کا خاصا سامان فراہم ہو جائے گا وہاں کئی ماتھوں پر بل پڑ جائیں گے اور بھوئیں بھی تن جائیں گی۔ ظاہر ہے آپ بیتی نمبر کے صفحات اس سلسلے میں بہترین مواد کا کام دے سکتے ہیں! لیکن اس میں ایک خطرہ بھی ہے، وہ یہ کہ ادیب اور شاعر کچھ عجیب مخلوق واقع ہوئے ہیں۔ جب انھیں "میں" کے موضوع پر بولنے کو کہا جائے تو "میں" سے زیادہ انھیں "تو" کا خیال رہتا ہے۔ بہرحال اگر کسی کو ہوس کسی کو "برہنہ" دیکھنے کی ہے تو وہ زیادہ آس نہ لگائے، کیونکہ اس حمام سے جو بھی نکلے گا، "صیغۂ متکلم" میں ملبوس نکلے گا۔

ایک زمانہ تھا کہ کسر نفسی اور کم نمائی کو مشرقی آداب میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ جمہوری دور میں اسے قابل اعتنا سمجھا جائے یا نہیں مگر "مک ایل سی" کے نظریے نے (تفریحاً ہی سہی) اسی بنیادی خوبی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فارسی داں نے بھی کیا خوب کہا ہے ؎

آنکس کہ بداند و بداند کہ نداند　　　اسپِ طربِ خویش بہ افلاک رساند
وانکس کہ بداند و بداند کہ بداند　　　او ہم خرکِ لنگ بہ منزل برساند
وانکس کہ نداند و بداند کہ بداند　　　در جہل مرکب ابدالدہر بماند

یعنی جو شخص جانتا ہے اور جانتا ہے کہ میں نہیں جانتا، وہ تو اپنا طرب کا گھوڑا آسمانوں تک لے جاتا ہے۔ اور جو شخص جانتا ہے اور جانتا ہے کہ میں جانتا ہوں، وہ بھی اپنے لنگڑے گدھے کے ساتھ منزل تک جا پہنچتا ہے۔ اور جو شخص نہیں جانتا اور جانتا ہے کہ میں جانتا ہوں، وہ ہمیشہ جہل مرکب کا شکار رہتا ہے۔ گویا اصل عالم وہ ہیں جنھوں نے اپنا اشتہار لگانا پسند نہیں کیا (باوجود تقاضوں کے) دوسرے درجے پر وہ معقول لوگ ہیں جو عالم ہیں اور جنھوں نے ان صفحات میں خود کو عالم تصور کیا ہے تیسرے درجے پر مجھ جیسے جاہل ہیں جو کچھ نہ جاننے پر بھی اپنے جاننے اور نہ جاننے والوں کے لیئے ذہنی اذیت کا باعث بنتے ہیں!!

قلم اُٹھاتے وقت سب سے پہلے ہی خیال آیا کہ آپ بیتی کو خاندان کے ذکر سے شروع کیا جائے یا وطن کی "خاکِ پاک" کو مقدم سمجھا جائے۔ پھر یہ بھی خیال آیا کہ بعض روایتوں کی رُو سے تاریخ پیدائش سے بسم اللہ کرنا زیادہ مناسب ہے۔ سماجی مسلّمات بھی خوب ہیں، اکثر و بیشتر سُنی سُنائی پر یقین کر لیا جاتا ہے اور پھر غضب یہ کہ دوسروں سے بھی یقین کرنے کو کہا جاتا ہے، اور چار و ناچار ہر شخص کر بھی لیتا ہے بہرحال مجھے معلوم نہیں کہ میں کب پیدا ہوا۔ اتنا یاد ہے کہ چوتھے درجے میں جب نئے اسکول میں داخل ہوا تو نیا فارم بھرنے کی ضرورت پیش آئی۔ والد صاحب نے تاریخ پیدائش یکم جنوری ۱۹۲۱ء لکھوا دی۔ نوروز کا نوروز، سالگرہ کی سالگرہ۔ اس دن سے یہی تاریخ پیدائش چلی آتی ہے۔

والد صاحب بلوچستان سروس میں افسر خزانہ تھے، سنتا آیا ہوں کہ میری پیدائش تحصیل دکی میں ہوئی۔ اس کے سال ڈیڑھ سال بعد والدین وہاں سے موسیٰ خیل آ گئے۔ کچھ یاد نہیں دُکی کیسا گاؤں یا شہر تھا، البتہ موسیٰ خیل کے کچھ دھندلے سے نقش ذہن کی سلوٹوں میں ابھی باقی ہیں۔ تحصیل کے مکانوں کے پیچھے کا بڑا سا باغ جس میں انار، ناشپاتی اور شفتالو کے درخت اور انگور کی بیلیں تھیں چاروں طرف چھوٹے بڑے پہاڑ، مختصر سا بازار جس میں ڈاک کی لاری رکا کرتی تھی۔ سب بچے اسی میں چڑھ جاتے اور ڈاک گھر سے بازار تک کی سیر کرتے۔ مغرب میں پتھریلی سڑک تھی جو فورٹ سنڈے من کو جاتی تھی۔ اسی کے راستے میں ندی پر وہ پل تھا جس کے نیچے گہرے نیلے پانی میں ہم کنکر پھینکتے تو مچھلیوں کے سنہرے پر چمکنے لگتے۔

شمال میں چھوٹا سا اسکول تھا جس میں پڑھائی کم اور انسپکٹر کے استقبال کی تیاری زیادہ کی جاتی تھی۔ اُردو کا پہلا قاعدہ یہیں پڑھا۔ پڑھاتے عبدالعزیز صاحب تھے، ماسٹر، ہیڈ ماسٹر، کلرک سبھی کچھ وہی تھے۔ میں اس زمانے میں اُستاد سے کچھ کچھ ڈرا کرتا تھا۔ اس سے بھی کئی گنا زیادہ ڈر امتحان کا تھا۔ جس کے بارے میں معلوم ہی نہیں تھا کہ ہے کیا بلا؟ کچھ کچھ یاد ہے کہ جب پہلی جماعت کا امتحان ہوا تو میں گھر میں دبکا رہا۔ بعد میں والد صاحب اور بڑے بھائی صاحب پکڑ کے لائے اور کہا بیچارے کا سال برباد ہونے سے بچائیے۔ عبدالعزیز صاحب نے قاعدے کا دوسرا صفحہ کھولا اور قدرے سختی سے کہا۔ یہاں سے سُناؤ۔ دہشت تو طاری تھی ہی، میں نے بدحواسی میں قاعدہ بند کیا اور بجائے پڑھ کے سُنانے کے جیسے جماعت میں رٹا کرتا تھا۔ زبانی ہی سُنانا شروع کیا۔ ابھی پورا سبق نہ سُنا پایا تھا کہ انھوں نے کہا۔ بس بس تم پاس۔ نہ صرف پاس بلکہ اوّل! والد صاحب نے گلے لگا لیا۔ آنسو پونچھے اور کندھے پر بٹھا کر گھر لے آئے۔ وہ دن اور آج کا دن، کتاب میری بہترین رفیق اور دمساز بن گئی۔

میں تیسری جماعت میں تھا کہ دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ حکومت ہند بلوچستان کے قبائلی علاقوں میں بے دریغ لٹریچر

تقسیم کرتی تھی۔ یہ سارا پشتو اور اُردو میں ہوا کرتا تھا۔ اُردو پڑھنے کا چسکا یہیں سے پڑا۔ دہلی سے جو رسالہ آجکل کے نام سے شائع ہوتا ہے اُس کا ابتدائی نام نن پرون تھا اور یہ پشتو رسالے کے ضمیمے کے طور پر شائع کیا جاتا تھا۔ اسے سب سے پہلے میں نے اسی زمانے میں دیکھا۔ پھول اور غنچہ سے میری شناسائی بعد میں ہوئی۔

پرائمری کے بعد میں لیہ ضلع مظفر گڑھ چلا آیا، کیونکہ جن علاقوں میں والد صاحب کی ملازمت تھی وہاں بعض جگہ ہائی اسکول نہیں تھے۔ گو بیچ بیچ میں مَیں دو تین سال کے لیئے کوئٹہ پشین کے اسکولوں میں بھی پڑھتا رہا لیکن زیادہ وقت لیہ ہی میں بسر ہوا۔ اُردو لازمی مضمون تھا، سنسکرت اختیاری۔ پنڈت جی خالی پرچے پر بھی تنتوں میں سے نوّے نمبر دیا کرتے تھے۔ اُردو کے اُستاد مولوی مرید حسین تھے۔ میں نے انہیں کبھی غصّے میں آپے سے باہر ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ کسی کو بے جا پیٹتے بھی نہیں تھے۔ نہایت نرمی اور ہمدردی سے گفتگو کرتے اور پدرانہ شفقت سے پڑھاتے تھے۔ خدا جانے اب زندہ بھی ہیں کہ نہیں۔ سفید پگڑی باندھتے تھے، لمبا قد، چھریرا بدن، کھچڑی داڑھی، سردیوں میں خاکی رنگ کا موٹا اونی کوٹ پہنتے تھے۔ بات بڑے دل نشیں انداز میں کرتے تھے۔ اقبال اور چکبست کی نظمیں انھوں نے جس انداز میں پڑھائی تھیں، اب تک یاد ہے۔ نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار اور راشد الخیری کی کتابیں انھیں بے حد پسند تھیں اور ہمیں بھی پڑھنے کو کہا کرتے تھے۔ اُردو سے محبت کی پہلی چنگاری انھیں نے روشن کی۔ ادبی دنیا، ہمایوں اور ادبِ لطیف کے تازہ شمارے جماعت میں پڑھنے کو لا دیا کرتے تھے۔ میرے اس زمانے کے ساتھیوں میں ایک صاحب ریاض انور تھے، جن کا کلام بعد میں پاکستان کے اُردو رسائل میں شائع بھی ہوتا رہا۔ سنا ہے اب وکالت کو پیارے ہو گئے ہیں اور شعر کم کہتے ہیں جرح زیادہ کرتے ہیں۔ مڈل کے بعد بھی میں مرید حسین صاحب سے اُردو پڑھنا چاہتا تھا، لیکن ہیڈ ماسٹر کے حکم سے سائنس کی جماعت میں بیٹھنا پڑا۔ دوسرے اُستاد جن کی شخصیت سے مَیں بے حد متاثر ہوا، سعادت مند صاحب تھے۔ وہ ڈرل سے ڈرائینگ کے ماسٹر تھے۔ واٹر کلر اور چہرے کی تصویر اُتارنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ چند لڑکے آدھی چھٹی کے وقت ان کے پاس جمع ہو جاتے اور وہ واٹر کلر سے تصویر کھینچنے کی مشق کراتے۔ افسوس اس ذوق کی تکمیل نہ ہو سکی۔ لیکن اب بھی پُرانا شوق جاگ اٹھتا ہے تو کاغذ اور رنگ کے ضائع ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہتی۔

گورنمنٹ ہائی اسکول کے ہال کمرے میں سامنے کی دیوار پر آنرز بورڈ تھا۔ اس پر ہر سال میٹرکولیشن امتحان میں اوّل آنے والے طالب علم کا نام اور نمبر لکھے جاتے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ بورڈ دیوار پر نہیں، آسمان میں لگا ہوا ہے۔ اور ہر وہ طالب علم جس کا نام اس پر درج ہے، بہت بڑا فرشتہ ہے۔ بہر حال اوّل آنے کی میری ہوس ۱۹۴۶ء میں پوری ہوئی نام لکھا گیا کہ نہیں، مجھے معلوم نہیں، کیونکہ نتیجے کے اعلان سے بہت پہلے میں وہاں سے جا چکا تھا اور فلک بے انصاف دیا بانصاف نے پھر اس اسکول کی زیارت کا موقع ہی نہیں دیا۔ پہلے پہل میں سنڈے من کالج کوئٹہ میں داخلہ کے لیئے پہنچا۔ یہاں اچھے نمبروں کی بنا پر فیس تو معاف ہو گئی، وظیفہ نہ ملا، میں نے لائل پور زراعتی کالج کا رُخ کیا، یہاں میرے پہنچنے سے پہلے ہی داخلہ نمٹ چکا تھا۔ وہاں سے دہلی چلا آیا۔ اتنے میں آزادی کا آفتاب نکلا اور میں اور میرے گھر والے ایک دوسرے کے لیئے اندھیرے میں آ گئے۔ اس دوران میں میں مجبوراً "جیکی کی مشقت" میں لگ گیا اور جب جب وقت ملتا کچھ پڑھ بھی لیتا۔ اس طرح ایف۔ اے اور بی۔ اے کی منزلیں تمام ہوئیں۔ تین چار سال کے بعد گھر والوں سے ملاقات ہوئی اور زندگی پھر ایک توازن کے ساتھ شروع ہوئی۔ والدین ایک جگہ رشتہ ٹھہرا چکے تھے کہ کالج میں ایک لڑکی سے شناسائی

ہوئی۔ تقریباً آنا جانا اور اٹھنا بیٹھنا شروع ہوا۔ جب مخالفت ہونے لگی تو عشق کے آثار پیدا ہونے اور جب ایک آدھ بندش بھی عائد ہو گئی تو زندگی فلمی ہیرو کی پیروڈی سی ہو کر رہ گئی۔ بہرحال پرانا رشتہ منسوخ اور نیا مقرر ہوا۔

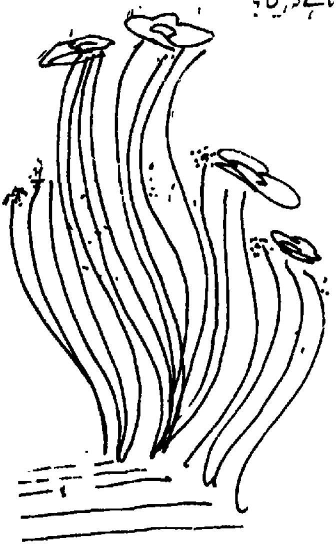
شادی سے پانچ برس پہلے یعنی ۱۹۵۲ء میں دہلی کالج میں ایم اے کے لئے داخل ہوا۔ یہاں اپنے کرم فرما ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی سے ملاقات ہوئی جن کی محنت کوشی، ذوقِ مطالعہ اور کام کی دھن نے میرے شوق کو مہمیز کیا۔ رسائل میں لکھنے کی لت لڑکپن سے پڑ چکی تھی۔ ابتدا افسانہ نگاری سے ہوئی۔ پہلا افسانہ کوئٹہ کے ہفتہ وار بلوچستان سماچار میں شائع ہوا۔ نام تو اب بھول چکا ہوں، البتہ اتنا یاد ہے کہ اس دن پاؤں زمین سے کچھ اوپر ہی اوپر تھے۔ رائے دینے یا دل بندھانے والا سوائے بڑے بھائی کے اور کوئی نہ تھا۔ ویسے ان ہی کو دکھا کر یوں محسوس ہوا گویا ۔۔۔ ساری دنیا کو میں دکھا آیا ۔

اس کے بعد چند اور کہانیاں بھی وہیں شائع ہوئیں۔ دہلی آکر ریاست، بیسویں صدی وغیرہ میں لکھتا رہا۔ گھر کے قریب ایک سرکاری لائبریری تھی "کلاس فور" یعنی چپراسیوں کے لیئے! شاید اسی لیئے اردو ہندی کتابوں کا اس میں خاصا ذخیرہ تھا۔ سارا سارا دن وہیں پڑا رہتا۔ یاد ہے کہ اردو فارسی کے بعض امتحان میں نے یا تو اس لائبریری کی وجہ سے دیئے یا پھر اردو بازار کے بعض مہربان کتب فروشوں کی نوازش سے جو کتاب چند دن پڑھنے کے لیے دے دیتے تھے یا پھر ادھار پر معاملہ کر لیتے تھے۔ سنجیدہ مضمون نگاری کی ابتدا میں نے نگار، نوائے ادب اور آجکل سے کی۔ پہلا مضمون نگار میں اکبر الٰہ آبادی پر غالباً ۱۹۵۰ء میں نکلا۔ اردو میں اتحاد پسندی کے رجحانات پر جو مقالہ آل انڈیا اورینٹل کانفرنس احمد آباد میں پڑھا تھا، وہ نوائے ادب میں بھی شائع ہوا۔ آج کل میں پہلا مقالہ غزل سے متعلق شائع ہوا۔ دہلی کالج میگزین کے دلی کالج نمبر میں مدیر معاون کی حیثیت سے شریک رہا اور اس کے لیئے بھی دو مضمون لکھے، لیکن ادبی دنیا یا ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز ایم۔ اے کی منزل سے گزرنے کے بعد ہوا۔ حکومت ہند سے پی ایچ ڈی کے کام کے لیئے وظیفہ ملنا، تحقیق کے دشت ویراں میں صحرانوردی شروع کرنا، برسوں دہلی یونیورسٹی میں اردو کے ایک استاد اور ایک طالب علم کے سوا دور تک کسی کا نظر نہ آنا، رفتہ رفتہ کامیابی کے آثار پیدا ہونا، شعبۂ اردو کا قائم ہونا اور اللہ کے بعض نیک بندوں کا اس کی بنیادوں کو اپنی محنت کے خون سے سینچنا، چندے حکومتِ ہند کی ملازمت کرنا، پھر کیمپ کالج اور سینٹ سٹیفنز کالج سے کام کی ابتدا کرنا، دہلی یونیورسٹی میں ملازم ہونا، لسانیات کی تربیت حاصل کرنا، ریڈر مقرر ہونا اور وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے وسکانسن یونیورسٹی (امریکہ) بلایا جانا؛ یہ سب تو آپ بیتی سے زیادہ جگ بیتی ہے جس کے بارے میں اس وقت مفصل لکھنا نہ تو مناسب ہے نہ ممکن۔

آخر میں چند باتیں اپنے ادبی مسلک کے بارے میں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو اردو کے مستقبل کے بارے میں نوحہ گر کو ساتھ رکھتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ ہے کہ میرا میدان تخلیق نہیں، تحقیق ہے۔ دوسری وجہ میری نفسیاتی کمزوری ہے۔ یعنی رجائیت پسندی، اور تیسرے یہ کہ میں ان تہذیبی اقدار کو عزیز رکھتا ہوں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاط اور ارتباط سے وجود میں آئی ہیں۔ یہ بات ہندوستان کا مقدر ہو چکی ہے کہ اس کی سماجی اور تہذیبی زندگی یک رنگ نہیں ہو سکتی۔ اس میں بنیادی وحدت تو موجود ہے لیکن اس کی ظاہری کثرت کو یک رنگ کرنے کی جتنی کوششیں کی گئی ہیں، بار بار ناکام رہی ہیں۔ اس ملک کا فطری ارتقا مختلف عناصر کی آزادانہ نشو و نما کے ساتھ ساتھ ہوا ہے۔ تیرھویں اور چودھویں صدی سے مختلف عناصر میں ارتباط پیدا کرنے کی سعادت کھڑی بولی کو نصیب ہوئی تھی جسے بنا سنوار کے اردو نے ایک اعلیٰ ادبی منصب تک پہنچایا۔ میرا ایمان ہے کہ نئے ہندوستان کو آج بھی جذباتی ہم آہنگی اور تہذیبی شیرازہ بندی کے لیئے اردو کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی انگریزی

اور ہندی کی ان چار پانچ سالوں کے ارتقا میں اُردو نے کس طرح ادبی قدروں کو نکھارا، اس کی پشت پر کن سماجی اور فکری قوتوں کا ہاتھ رہا، اس نے متضاد تہذیبی عناصر سے رس لے کر کس طرح ذوق و احساس کی آسودگی کا سامان پیدا کیا۔ اور شائستگی اور لطافت کے کیا کیا معیار پیش کئے۔ ان سب امور سے عمرانی علمی انداز میں بحث کرنا اور اُردو کی چار سالہ فکری اور تہذیبی تاریخ لکھنا میری زندگی کا مقصد ہے۔ میرا پی ایچ ڈی کا مقالہ اور میری مطبوعہ کتاب "ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں" اسی وسیع تر کام کی نہایت ادنیٰ اور معمولی شقیں ہیں۔ میرے نزدیک تحقیق میں سب سے زیادہ اہمیت تحقیق کی ضرورت کے واضح احساس کی ہے۔ تحقیق برائے تحقیق گھاس کھودنے کا شغل ہے۔ ادبی تحقیق وہی کارآمد ہے جو کسی نفسیاتی، تاریخی یا سماجی مسئلے کو حل کرنے کی طرف قدم اٹھائے یا کسی ایسی صداقت کے چہرے سے نقاب اٹھائے جس سے دوسری اہم صداقتوں کا پتہ چلانے میں مدد ملے۔ ہمارے ہاں تحقیق اس وقت شخصیت کی راہوں پر چل رہی ہے اور اس کی وجہ مقاصدِ تحقیق کے صالح شعور کا فقدان ہے۔

لسانیات پر میرا کام عشقِ ثانی کی حیثیت سے ۱۹۵۰ء میں شروع ہوا جب میں نے معراج العاشقین کا نیا ایڈیشن لسانیاتی نوٹ، مقدمے فرہنگ اور حواشی کے ساتھ شائع کیا۔ اس کے بعد مونوگراف "اُردو تعلیم کے لسانیاتی پہلو" اور دوسرا "اُردو نے دہلی کی کرخنداری بولی" پر شائع ہو چکا ہے۔ امریکہ میں لسانیات کی بڑی دھوم ہے۔ یہاں کے ماہرین نظریاتی سطح پر برطانیہ اور دوسرے یورپی ملکوں کے ماہرین سے آگے نکل گئے ہیں۔ لسانیات کی حدیں منطق اور ریاضی سے ملنے لگی ہیں اور کمپیوٹر کا استعمال ہو گیا ہے۔ اس وقت ماہرین کی سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ ایسا مشینی ذہن تیار کر دیں جو کسی بھی زبان کی صرف و نحو اور اصوات کا تجزیہ اور وضاحت خود بخود کر سکے۔ اس سلسلے میں لسانیات کی دنیا طلسمات کا سا منظر پیش کرتی ہے جہاں کل آسمان تھا وہاں آج زمین ہے، جہاں کل زمین تھی وہاں سناٹا ہے۔ ارادہ تھا کہ صوتیات پر کام کی ابتدا کروں گا۔ لیکن منتظر ہوں کہ اس نیستی قدر کے کارخانے میں "سکون" بھی میسر آتا ہے کہ نہیں؟





ظ۔ انصاری

"...........میں نے جی کڑا کر کے ایک رات تہیہ کیا کہ اگر واقعی کوئی بڑا کریم و رحیم پروردگار ہے تو اُس سے ملاقات کر لی جائے۔ صبح کا سپیدا نمودار ہونے میں ابھی دیر تھی۔ محلّے کی اپنی پیاری مسجد میں پہنچا۔ اندر کوئی نہیں تھا۔ میں نے اندر سے کُنڈی لگا لی۔ محراب میں سر ٹیکا۔ رقّت طاری کی۔ سجدے کو اِتنا طول دیا کہ نمازیوں نے دروازہ پیٹ پیٹ کر مجھے چونکا دیا۔ اُٹھا۔ آواز دی۔ کوئی جواب نہ آیا۔ بازگشت بھی نہ آئی۔ دو اگربتیاں محراب میں ٹھنسی ہوئی تھیں۔ دونوں نکال لیں اور پکار کر کہا: "لے، ہم تیری اگربتیاں چُرا کر لیے جا رہے ہیں، اگر تو ہے اور بگڑی بنا نہیں سکتا تو کچھ بگاڑ کر دکھا..........."

امّاں نے آواز دی "بیٹے، پانی گرم ہوگیا ہے۔ چلو، میں نہلا دوں۔"

میں نے چڑکر جواب دیا: "امّاں اب میں بڑا ہوگیا ہوں۔ خود نہالوں گا۔ آپ بس کرسی دیجیے!"

وہ سُنی ان سنی کر کے غسلخانے میں بارہ برس کے بڑے بیٹے کو نہلانے آئیں۔ نہلا چکیں تو سفید پاجامہ دیا پہننے کو۔ میں نے پہننا چاہا۔ اسر میں شکن پڑے ہوئے تھے۔ دُھلائی بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے پاجامہ چیر ڈالا اور کیچڑ میں پھینک کر چھپ چھپ کر دیا۔ "اگر یہی پہننا ہے تو نہانے نہلانے کی ضرورت کیا! جاؤ، ہم ننگے پھریں گے۔"

امّاں نے میری پیٹھ پر دو ہنٹر رسید کیے اور ایک کونے میں جا کر رونے بیٹھ گئیں۔ آٹھ آٹھ آنسو روتی رہیں۔ ان دنوں وہ بہت رونے لگی تھیں۔ روتی اور بَین کرتی جاتیں۔

... ہائے میرے اٹھارہ جوڑی کو ڈکا مکان،

... ہائے میرے ہاتھی سے جڑا و صندوق ...

... ہائے یہ — ہائے وہ ...

سوز اور مرثیہ بہت اچھا پڑھتی تھیں۔ دور دور سے بُلاوے آتے۔ بڑے تام جھام سے سوز خوانی کے لئے جایا کرتیں۔ غمِ حسین سے انھوں نے صرف رونا پیٹنا ہی نہیں سیکھا تھا، ان کی فریاد میں لے بھی ہوتی تھی۔

جب آتی گرمیوں میں ہم پانچ آدمی گھنٹہ گھر میرٹھ کے باہر سوا چار روپے مہینے کرائے کے کچے مکان میں اُتارے گئے تو اس کا کھلا آنگن، نیچی دیواریں اور نیم کے پیڑ دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ ایک تو مکان کی تبدیلی، پھر کچّی مٹی کی سوندھی مہک، پھر درختوں کی چھاؤں۔ البتہ غم کی ہلکی سی لکیر بھی بے فکر سینے پر کھنچ گئی، نوکر اور نوکرانی دونوں غائب۔ برتنوں کے صندوق پہلے ہی کم ہو چکے تھے، شام کو دسترخوان نہیں بچھا۔ فانوس دار لالٹین نہیں جلی۔ مٹی کے تیل کی چیکٹ کُپّی دھواں دیتی رہی اور میرے شاندار، کم سخن ابّا، شیروانی کے بٹن کھولے، گردن جھکائے، سالن کے پیالے میں لقمے ڈبوتے رہے۔ امّاں اُنھیں ڈانٹ رہی تھیں: سہارن پوری گنوار۔ پہلے سالن میں ہاتھ ڈبوئیں گے، پھر شوربا پئیں گے۔ پھر ڈکار لیں گے۔ توبہ ہے خدایا میری۔ جانگلوش سے واسطہ پڑا۔ تینوں بچّے بھی یہی سیکھ رہے ہیں۔

ابّا نے کڑکڑاتے گھی اور شکر کے قوام والا پیالہ میری طرف سرکایا اور خود اُٹھ کر ہاتھ دھو لیے۔

دن گزرتے گئے۔ ہم بہن بھائی محلّے کے بچّوں سے نہیں ملتے تھے۔

.... دوسرے دن جمعہ تھا۔ مدرسے کی چھٹی کا دن۔ ایک عمر رسیدہ ہمسائی اندر جھانکی۔ اماں سے سلام دعا کی۔ ویسے تو وہ ان کم ذات عورتوں کو منھ نہ لگاتیں، مگر وقت دیکھ کر کچھ پسیج گئیں۔ قلم دوات دے کر مجھ سے کہا "جاؤ میاں، ذرا ان کا خط لکھ آؤ۔ پتہ ٹھیک لکھنا۔"

اندر ایک قصباتی سی عورت، چاندی سونے کے زیوروں سے لدی ہوئی، گلفام، پھل پھول سے لدی ڈال کی طرح، ناک میں نتھ ڈالے، سجیلے بستر پر بیٹھی تھی۔ اس نے مجھے وہیں پاس بٹھا لیا۔ کان میں کہا "ان کو خط لکھوانا ہے۔ جو بولوں، وہ لکھنا۔" وہ چپکے چپکے بولتی رہی۔ میں اسکول کی کاپی کے ورق پھاڑ کر لکھتا گیا۔ کئی ورق چل کر خط پورا ہونے میں آیا۔ سلام لکھنے سے پہلے میں نے موقع محل دیکھتے ہوئے فارسی کا ایک شعر بھی جوڑ دیا ؎

گر صد ہزار لعل و گہر می دہی، چہ سود

دل را شکستۂ، نہ کہ گوہر شکستۂ

ان دنوں (فارسی میں) رقعات عالمگیری پڑھی تھی۔ کیا سادہ اور دل نشیں انداز تھا اورنگ زیب کی تحریروں کا۔ گلستانِ سعدی اور حضرت عبداللہ انصاری کے طرزِ بیان کے بعد یہی عالمگیری اندازِ تحریر مجھ پر چھا گیا تھا۔ ایک لفظ بھرتی کا نہیں۔ ایک آواز بے سُری نہیں۔ بس کام کی بات کہ قلم سے ٹپکے اور زبان زد ہو جائے۔ واہ!

(اورنگ زیب کو پرچہ لگا کہ مغل شہزادے نے اپنی سید زادی دلہن کو ڈانٹا اور برے کلمے کہے۔ اس پر بوڑھے باپ نے بدمزاج بیٹے کو خط میں تنبیہ اور تنخواہ میں چھٹنی کی ہے۔ وہیں یہ شعر لکھا کہ برخوردار، اب تاکہ جڑاؤ موتیوں کے ہار بھی دو تو دل دکھانے کا بدلہ نہیں ہو سکتا۔ دل توڑا ہے، موتی نہیں توڑے۔)

وہ نازنین کرید کرید کر پوچھنے لگی۔ تم نے کیا بڑھا دیا، مطلب بتاؤ۔ میں نے شعر پڑھا، مطلب بتایا۔ اس نے مجھے چھاتی سے کھینچ کر پیار کیا۔ اتنی خوشبو، اتنی گرمی اور نرمی تھی اس کے بدن میں کہ میرے پسینے چھوٹ گئے شرم کے مارے۔

چلتے وقت ماں بیٹی نے الگ الگ دو پیسے فیس کے میری ہتھیلی پر رکھے۔ فیس قرار پائی۔ پوسٹ کارڈ لکھائی ایک پیسہ، لفافہ دو پیسے۔ لمبا خط اور اچھا لکھو (مطلب یہ کہ شعر و یر بھی کھپ جائے) تو اوپر سے مٹھی بھر ریوڑیاں۔ لو صاحب، جمعہ کے جمعہ اس گھر کے دروازے پر گلی میں چارپائی ڈال کر بیٹھ جاتا۔ پاس پڑوس کی عورتیں آگے پیچھے لائن لگوا کر خط لکھواتیں۔ دھوپ اترنے تک بیس پچیس کمائی ہونے لگی۔ تب تک مجھے معلوم نہ تھا کہ پاکٹ منی یا جیب خرچ جیسی کوئی چیز بھی ہوتی ہے۔ گھر میں آ، اماں کے سامنے ساری جیب الٹ دیتا۔

موسم بدلا۔ سردیاں آ گئیں۔ جمعہ کی صبح سے پہلے ہی بلاوے آنے لگے۔ اس افلاس نگری میں ٹھیکیدار صاحب کے دو منزلہ پختہ مکان میں آمد و رفت شروع ہو گئی۔ ان کی جوان لڑکیاں لحاف میں چھپ چھپ کر خط لکھوانے لگیں اور مٹھی بھر ریوڑیوں کی خاطر میں نے ایک سے ایک گرم اور کرارے شعر یاد کرنے اور لکھنے شروع کر دیئے۔

مجھ کم بختی مارے کو کیا خبر کہ ہرنیوں کی ڈار میں ایک، جو رازدارانہ خط لکھواتی ہے اور میرے گلے میں ہاتھ ڈال ڈال کر کھلکھلاتی ہے، لہلہاتی ہے، وہ بیٹی نہیں، بڑے میاں کی نئی جورو ہے۔ ایک خط پکڑا گیا۔ لکھنے والے کی طلبی ہوئی۔ محلے ٹولے میں بدنامی کر لڑکا ابھی سے ...۔ پٹائی بھی ہوئی مگر منہ سے نہ پھوٹا کہ جناب، یہ خط میں نے اسے نہیں، اس نے اپنے کسی کو میرے قلم سے لکھوایا ہے۔ لڑکی نے آنسوؤں میں میرا ہاتھ کھینچ کر اسے زور سے چوم لیا اور اندر جا چھپی۔ آمد و رفت بند۔ جمعہ والی مستقل

آمدنی بند ہونے کو ہوگئی۔ مگر کوئی کسک سی، نامعلوم چُبھن رہ گئی۔ برسوں بعد پتہ چلا کہ وہ فارسی کی عاشقانہ شاعری کا ان فیکشن یعنی قبل از وقت جذبۂ اُلفت تھا جیسے بدن کے خلیوں کی خوراک نہیں مل سکی اور وہ مُکس گیا۔

نو یوں گویا مفلسی اور عاشقی، دونوں جاں گداز نشتر میری روح میں اس وقت پیوست ہوئے جب کھیلنے کھانے کے دن تھے، جب اُن نشتروں کو پلانے کے لئے جسم میں پورا لہو بھی نہیں تھا۔ مارچ کا مہینہ آیا تو صبح اور شام کی ہوا سے دل میں میٹھا میٹھا درد اُٹھنے لگا۔ میں پھٹے جوتوں کے باوجود چھاؤنی کی مال روڈ پر اور باغیچوں میں تنہا پھرتا اور اپنے ہم سبق بڑے بڑے لڑکوں سے کتراتا تھا۔ مظاہر اور مناظر پر خاموشی سے سوچنے کا چسکا بھی تبھی لگا۔ ایک صاحب، جو بعد میں کرنل کے فوجی عہدے پر پہنچے، آج تک مجھے اُن دنوں کے ایک جملے سے یاد رکھے ہوئے ہیں:

سامنے سے موٹر آرہی تھی۔ ہم دونوں خاموش ٹہل رہے تھے۔ کار برابر سے گزر گئی تو گرد و غبار منھ میں بھرا۔ میں نے کہا: دیکھئے..... صاحب، وہ جو ہوتی ہے نا سرمایہ داری، وہ ایسی ہوتی ہے کہ سامنے سے اتنی تیز روشنی، آنکھیں چُندھیا جائیں اور پیچھے کیچڑ مٹی۔ ہم راہگیروں کے لئے۔ "سرمایہ داری" کا لفظ نیاز کے "نگار" کی راہ سے پہلی بار مجھ تک پہنچا تھا۔

٭

آپ بیتی لکھتے ہیں وہ لوگ جنھوں نے کوئی بڑا کام کیا ہو، بڑا نام پایا ہو۔ اپنے وقتوں کے سورما رہے ہوں یا سورماؤں میں رہے ہوں۔ برٹرینڈ رسل ہوں، چرچل ہوں، فرینک ہارلیس یا ایلیا اہرن بورگ یا جوش ملیح آبادی ہوں۔ ہم کون! ادنا درجے کی اوقات، اوسط درجے کے کام۔ واقعات کی کھتونی کھول کے بیٹھیں اور کوئی پوچھے کہ "بھیّا کیستی ؟" تو اپنے گریبان پر گردن بار ہو جائے۔ کوئی بڑا تیر مارتے تو نیر گردوں کے لئے اپنی آپ بیتی کا ہدایت نامہ چھوڑ جاتے۔ اب خیریت اسی میں ہے کہ سیدھے سبھاؤ اپنے معمولی پن کی نمائش کر دیں اور (خدانخواستہ) بڑے بوڑھوں کی طرح، پچھلے چارے کی جگالی جلدی سے بند کر دیں۔ کسی نہ کسی کو تو اس منظر سے لطف ضرور آئے گا۔

دراصل بات یہ ہے کہ ابھی "آپ بیتی" لکھنے کے رتبہ اور وقت کو نہیں پہنچے ہیں ہم۔ ایوگے نی یوتی شینکو ۲۳ برس کی عمر میں کچی آپ بیتی لکھ ڈالی تو وجہ یہ کہ مغرب میں اس کے نام کی دھوم مچ گئی تھی۔ یا تو آدمی اتنی شہرت کے طلسم میں گرفتار ہو چکا ہو یا پھر اتنا بوڑھا کہ آئندہ کے لئے گزشتہ کی صرف یادیں بچی ہوں۔ ہمارے دشمن ہوں بوڑھے۔ ہم کیوں بوڑھے ہونے لگے! وہ دن آنے سے پہلے، ہم تو جام چھلکا کے، تلچھٹ چھوڑ کے، یہ جا، وہ جا۔

٭

میں نے پوچھا: امّاں، یہ جو ہمارے نانا ہیں۔ یہ ہمیں پیار کیوں نہیں کرتے؟

جواب ملا: سُنّی ہیں وہ۔ تمہارے نانا مر گئے۔ یہ ان کے بھائی ہیں۔ ہمارے بھائیوں کو بھی انھوں نے سُنّی خارج کر لیا!"

ابا کے آبائی مکان سے ملا ہوا ایک اور شاندار مکان تھا۔ اس میں ایک مونچھوں والے کالے سے کوئی صاحب رہتے تھے۔ ہم بھائی بہنوں کو دیکھتے ہی گود میں اُٹھا لیتے تھے۔ بڑی شفقت کرتے۔ میں نے بہت کُریدا۔ پتہ نہیں چلا۔ ایک زمانے خاندان کے باہمی ناچاقی

کی بھنک کان میں پڑی تو راز کھلا کہ وہ ایک ہی دادا کی اولاد تھے ۔ مگر سُنّی ۔ بڑے دلیپ سُنّی ۔ چھی چھی! پھوپی مجھے ماں سے زیادہ پیاری تھیں ۔ سہارن پور کے اجڑے قصبے "نانوتہ" میں رہتی تھیں ۔ رام پور، نانوتہ، تھانہ بھون، جلال آباد کاندھلہ کیرانہ، یہ مسلم زمینداروں کی گڑھیاں تھیں جمنا کے کنارے کنارے ۔ کبھی انھوں نے سرحدی چھاؤنیوں کا کام کیا ہوگا ۔ پنجاب کی سرکشی (سکھ خالصہ تحریک) اور فوجی یلغار کا نشانہ بنتی رہیں ۔ نانوتہ تو سرہند کی طرح اینٹ مٹی کا ڈھیر ہو کر رہ گیا ۔ خون اور خاندان کی حفاظت کرنے والے چند سیّد زادے اور پیرزادے اب تک وہیں پڑے تھے ۔ ساہوکاروں کے مقروض، علم اور حوصلہ سے معذور ۔ انھی میں سے ایک معزز سیّد خاندان میں میری پھوپی بیاہی گئیں ۔ بیوگی کی پہاڑ سی زندگی انھوں نے کچھ بھائی کی مدد سے، کچھ اپنے سگھڑ پن سے عزت آبرو کے ساتھ بسر کی اور پانچ بچے پال کر بڑے کر دیتے ۔ مجھے اپنی ددھیال کا سیدھا سچا گنوارپن، کھردرا لہجہ، بے تحاشا پیار، بھونڈے اطوار، ٹوٹے پھوٹے کھنڈر مکان، اپنی ننھیال کے نستعلیق طور طریقوں سے، بریلی اور لکھنؤ کے شہری رکھ رکھاؤ سے، نمائشی سلیقے سے کہیں زیادہ پسند تھے ۔ بالغ ہونے سے پہلے ہی میرے رشتے کی بات دونوں سمتوں میں پکّی ہو چکی تھی ۔ جنگی پر دادا کے سلسلے کا پہلا بیٹا تھا، ننھیال والوں سے زیادہ ددھیال والوں کو اپنی نسل چلنے کی فکر لگی ہوتی تھی ۔

پہلی بار گھر (میرٹھ) سے نکلا تو بلا ٹکٹ اور بگٹٹ اسی طرف پہنچا ۔ سادات کے محلّے میں تب تک کوئی دسویں پاس نہ تھا ۔ صرف شیخوں میں ایک تعلیم یافتہ جیالے بزرگ تھے ۔ جن کے گھر میں علمی ادبی کتابوں کی ایک الماری اور الماری میں اقبال کی "بانگ درا" نکلی ۔ لے آیا، راتوں رات پڑھ کر تیسرے دن واپس کرنے گیا تو شیخ صاحب نے پوچھا، کہو ۔ برخوردار کیا سمجھے ؟ "نام بڑا اور درشن تھوڑے ۔ ان سے زیادہ تو جوش ملیح آبادی پسند ہیں ۔" یہ کہہ کر میں نے اقبال کی فارسیت پر دھاوا بول دیا ۔

"جوش تو شیعہ ہے، تم بھی پکّے رافضی نکلو گے ۔" تب تک میرے مونچھیں نہیں نکلی تھیں ۔ صرف رواں سا آیا تھا ۔ مجھے ایک تو اجنبی ملا فانی کی زبان سے لفظ "برخوردار" بُرا لگا کہ ایسے نوجوان کو، جو فارسی شاعری کا سارا خوان چٹ کر چکا ہو، یہ اقبال کی فارسی سے مرعوب کرنا چاہتے ہیں ۔ دوسرے یہ کہ بات شاعری کی اور معیار سنّی شیعہ کا ! لاحول ولا قوۃ !

اونچے نیچے ٹیلوں میں، ملبے سے اٹھائی ہوتی دیواروں اور چونے کے پلستر سے جوڑے ہوئے صرف چند مکان سلامت رہ گئے تھے ۔ وہیں چھتّے کے باہر آمنے سامنے دو تخت پڑے تھے جن پر اس اُجاڑ قصبے کے پانچ سات معززین آلتی پالتی مار کر حقّہ گڑگڑایا کرتے تھے ۔

عصر کی نماز ہو چکی ہے ۔ محرّم کا مہینہ ہے ۔ حقّہ تازہ ہو کر ابھی آیا نہیں ۔ میر صاحب زوّار تھانیدار سادہ سوگوار لباس میں ایک مونڈھے پر براجمان ہیں ۔ بار بار پہلو بدل رہے ہیں ۔ ان کے پیشِ خدمت منحنی سے میر صاحب چلم سلگا رہے ہیں کہ لٹے میلے مطروح گاڑھے میں لپٹا ہوا ادھیڑ عمر کا ایک قصباتی مسلمان تخت کے پاس سے ٹھٹکے بغیر گزرا ۔ گزرتے میں اس نے آواز بلند کہا ۔ "السلام علیکم ۔" اور گزر گیا ۔ میر صاحب نے گردن موڑے بغیر ترچھی نظر سے اسے دیکھا ۔ پھر مجھے کچھ اشارہ کیا ۔ میں نہیں سمجھا ۔ پھر خود لپک کے پکارا ۔ "اِدھر آئیو بے !" وہ اسی شان سے تنا ہوا واپس آیا ۔ میر صاحب اتنے میں اپنا بوٹ پاؤں سے نکال چکے تھے ۔ ایک ہاتھ میں اس کا گریبان اور دوسرے ہاتھ میں بوٹ کا منہ ۔ دے تڑاتڑ ۔ "ابے مُلّا ہے ۔ چار پیسے پلّے میں آگئے تو یوں

بگڑ کے چلتا ہے؟ نہ آداب عرض، نہ تسلیمات، نہ حضور، نہ سرکار، پتھر سا مار دیا۔ السلام علیکم! اس گھر کے ادب آداب تم کمینوں کے ہاتھوں یوں خاک میں ملتے دیکھیں گے ہم؟" میر صاحب غصے میں لال انگارہ ہو رہے تھے۔ اتفاقاً ادھر سے شیخ صاحب گھوڑی پر سوار آپہنچے۔ "جانے دیجئے۔ غصہ تھوکیے تھانیدار صاحب۔ چھوٹے آدمیوں کا زمانہ آرہا ہے اب۔ ہمارے آپ کے دن گئے۔" "کہیں نہیں گئے دن جی۔ آپ وہابیوں نے ان لوگوں کو سر چڑھا رکھا ہے۔ ان کی آنکھ کا پانی مر گیا ہے ورنہ کیا مجال تھی کہ ہمارے سامنے پہ پلنگ پر بیٹھ جائیں۔ آپ اسلام کے نام پہ انھیں ساتھ اُٹھاتے بٹھاتے ہیں۔ آج ہم سہیں گے تو کل آپ وہابی حضرات کو بھی سہنا پڑے گا۔" میری ڈکشنری میں "وہابی" کا لفظ موٹے حرفوں سے لکھا گیا۔ اور مہینہ بھر بعد جب میں میرٹھ واپس آیا تو آتے ہی میں نے وہابیوں کے مشہور عالم مولوی عاشق الٰہی کے اُٹنگے پاجامے والے لڑکوں سے میل جول شروع کر دیا۔ ایک دن تو اُنھی کی مسجد میں نماز پڑھی ہاتھ باندھ کر۔ گر نماز آدھی تیتر آدھی بٹیر ہو گئی ہوگی کیونکہ مسجد کے موذن نے لمبی داڑھی کھجا کر درشت لہجے میں بتایا "نماز سیکھو، ایسے نہیں ہوتی ہے۔ مقبول نہیں ہوگی۔"

*

ہماری نوعمری میں لڑکیاں نہیں ہوا کرتی تھیں، بہو بیٹیاں ہوتی تھیں۔ اور اُن کو ہم نے جھکی ہوئی نظروں سے دیکھنا سیکھا تھا۔ گلی سے باہر پختہ مکانوں میں ایک صاف ستھرا کنبہ آکر رہا جس میں میرے ہم عمر لطافت، فصاحت یا نفاست نام کے دو ذہین خوش منظر گورے چٹے لڑکے بھی تھے۔ مشق اور انتظار سے میں نے معلوم کر لیا کہ کون کب اسکول جاتا ہے کس وقت آتا ہے۔ رفتہ رفتہ اُن کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے لگا۔ جس دن ملاقات نہ ہوتی، دن اُداس گزرتا۔ ہجر و وصال کے اشعار ہجوم کرتے۔ عربی کے خشک علم فقہ، حدیث و تفسیر، منطق و فلسفہ کے طالب علم پر۔ جو عنقریب "فاضل" کا آخری امتحان دینے والا تھا، فارسی شاعری اپنا رنگ چڑھا چکی تھی۔ ایک روز ان کے گھر تین پھیرے کئے۔ تیسرے پھیرے میں ایک شعر لکھ کر بیٹھک میں ڈال آیا۔ ؎

بلا سیلابِ خوں را از شگافِ سینہ بیروں کن
کہ امشب سودہ ام بر دیدہ خاکِ آستانے را

نظیری نیشاپوری (آف احمد آباد) کا شعر ہے۔ پوری غزل جان لیوا۔ وہ پُرزہ باپ کے ہاتھ لگا۔ خوش ذوق آدمی تھے۔ سمجھا نپ گئے۔ میرے ہمدرد اور ہمراز بن گئے۔ نئی نئی کتابیں دینے لگے۔ اُنھی میں دو کتابیں کسی آریہ مسافر کی تھیں بلیغ زبان میں حق کی تلاش اور نیم فلسفیانہ مسائل کا بیان۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ مصنف پنڈت سدرشن تھے)۔ بڑا مزا آیا۔ فکر کو نئی چاشنی ملی۔ آریہ سماجیوں کے ساردہ میں شوق سے جانے لگا۔ درمیانی طبقے کے تعلیم یافتہ اور جوشیلے مجمع میں اکثر مسٹر جنّا کا نام آتا۔ ان کے بیانات خصوصاً دو قومی نظریے کی نکتہ چینی پر سنائی دینے لگی۔

ایک معمول سا بن گیا تھا کہ سالانہ امتحان آنے سے ذرا پہلے میری کورس کی کتابیں یکے بعد دیگرے کھوئی جاتی تھیں اور امتحان ختم ہونے کے بعد، نمازی، پرہیزگار نکھٹو لڑکے (جو عمر میں مجھ سے کافی بڑے تھے) گم شدہ کتابوں کا اتہ پتہ بتا دیا

کرتے تھے۔ اس کارِ خیر کے عوض مجھے تو چندی جمعرات پہ مٹھائی منگا کر بانٹنی پڑتی تھی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ اس فماش کے لڑکے مسلم لیگ کی حمایت کرنے اور صاف کہنے لگے کہ ایک آریہ سماجی نام نہاد مولوی کا مال حلال ہے۔ مائی موذی نصیب نمازی۔

ٹاؤن ہال کے لان پر کیس کے ہنڈے اور لاؤڈ اسپیکر لگے دیکھے تو میں رک گیا۔ ایسا پہلے کئی بار ہوا تھا۔ شام پڑے وہاں جمِ غفیر ہو گیا۔ مجلس احرار، جمعیتہ العلما و اور کانگریس کے ہم خیال مسلمانوں میں بڑا جوش تھا۔ نمایاں ہونے کی کوشش میں اسٹیج کے ایک سرے پر (جان پہچان والوں کی مدد سے) میں بھی جم گیا۔ ذرا دیر بعد ایک بلند قامت، موٹے تازے، عبا قبا والے مولوی صاحب اسٹیج پر گویا آسمان سے اُترے۔ مختصر استقبالیہ تقریروں کے بعد جیسے ہی انھوں نے بلند آواز سے کہا: بھائیو، اور ایک کے ۱۰۳ باقی میری بہنو!.... آج میں دیکھ رہا ہوں کہ شاید مسلم لیگیوں کی شہ پر پولیس والوں کی پوری پلٹن بھی یہاں...... کہ اشرف بیرسٹر کی قیادت میں پہلوانوں کا ایک گروہ اسٹیج پر حملہ آور ہوا۔ عطاء اللہ شاہ بخاری چلے جاؤ۔ عطاء اللہ شاہ بخاری، نہیں سُنیں گے، مسلم لیگ زندہ باد۔ ایسی دھکا پیل ہوئی کہ میں اپنے پرانے جوتے چھوڑ کر بھاگا۔ بھاگم بھاگ گھر پہنچا۔ ابا جاگ رہے تھے۔ بے چین تھے۔

"جوتے کہاں ہیں؟"

"کھو گئے وہاں ٹاؤن ہال میں"

"وہاں رات کو کیا کر رہے تھے؟"

انھوں نے واقعی چاندی کی موٹھ والی چھڑی گھما کر میری پیٹھ پر رسید کر دی۔ اور پھر آنکھوں پر رومال رکھ کر اندھیرے میں ہو گئے۔ اس گھر میں چاندی کی یہ آخری شے تھی جو میں نے سال بھر بعد رات کی تاریکی میں کسی مہاجن کے ہاتھ بیچی اور فاقہ شکنی کا انتظام کیا۔

مجھے غم سے رات بھر نیند نہیں آئی۔ بارہ بجے کا عمل ہو گا کہ ٹاؤن ہال کے لان پر جلسے کی اصل تقریر در و دیوار سے ٹکرا کر باجے کی طرح بجنے لگی۔ عطاء اللہ شاہ بخاری کوئی تین چار گھنٹے بڑے مزے میں بولتے رہے۔ کبھی مولانا روم کے شعر لہک کر پڑھتے کبھی آیات و احادیث، کبھی وارث شاہ کی ہیر۔ کبھی بھڑک اُٹھتے: ارے کون ہے تمہارا لیڈر؟ اس سے پوچھو، ختنہ بھی ہوئی اُس کی؟ جس کی سنّتیں نہ پوری ہوں وہ سنّتِ نبوی کو کیا جانے گا۔ سنو، مہاتما گاندھی نے کہا۔ بھائی جینا، پہلے انگریز سے نپٹ لیں۔ پھر....

میں ایک ایک لفظ اپنے حافظے میں چُنتا گیا۔ نیند سے بوجھل پپوٹوں میں وہ تقریر میں نے ریکارڈ کی طرح بھر لی اور دوسرے دن نوجوان اور پختہ عمر ہم جماعت مولویوں کو جا کر صاف جتا دیا کہ کانگریس ہندوستان کی آزادی کی مجاہد ہے اور اب سے ہم کھدّر پہنیں گے (آریہ مسافر نے گوشت خوری پہلے ہی ترک کرا دی تھی) اور کانگریس کے لئے کام کریں گے۔ ایک مولوی ہادی حسن (اسی عربی کالج کے ٹیچر مہدی حسن کا لڑکا) جس سے میری لڑائی تھی، بڑھ چڑھ کر مذاق اُڑانے لگا۔ ہی ہی ہی۔

زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ ہادی حسن کے والد کا انتقال ہو گیا اور بیٹے نے باپ کی جگہ کے لئے درخواست دی۔ درخواست نامنظور ہوئی تو میں نے گھر گھر جا کر بڑے لڑکوں کو اشتعال دلایا کہ بیٹا باپ سے زیادہ سند یافتہ ہے۔ یہ جگہ اُسے نہ ملی تو ہم ہڑتال کر دیں گے۔ انصاف! انصاف!

پہلی بار میں نے اینٹوں کے ڈھیر پر چڑھ کر ایک جوشیلی تقریر کی۔ اور سالانہ سرکاری امتحان سے ہفتہ بھر پہلے ہڑتال ہوگئی تالے پڑ گئے۔

آج بھی یاد کرتا ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ دادا جان مرحوم کی یہ بڑی لاٹھی اُٹھائے، بال بڑھائے، کھدر کا کُرتا پاجامہ پہنے ہیں آگے آگے، اور مجھ سے بڑے لڑکے پیچھے پیچھے جلوس نکلا۔ جج صاحب (ٹرسٹی) کی کوٹھی پر پہنچا۔ ہندوستان ٹائمز کے نامہ نگار نے انٹرویو لیا۔ ایک بزرگ نے روک کر لاٹھی چھینی اور غالب کے لفظوں میں پھبتی کسی:

بے طفلِ خود معاملہ، قد سے عصا بلند ہے

ہادی حسن کی درخواست منظور ہوئی۔ ہڑتالیوں کے کئی مطالبے (مثلاً یہ کہ انگریزی کی دسویں کلاس بھی پھر سے کھولی جائے) مانے گئے۔ اور امتحان ختم ہونے پر پتہ چلا کہ میرا دو مہینے کا وظیفہ سوخت ہوگیا۔ رجسٹر میں غالباً دو مہینے کی غیر حاضری لگا دی تھی اللہ رسول کے سخت گیر منشیوں نے۔

یورپ میں جنگ چھڑ چکی تھی۔ اناج مہنگا ہو چلا تھا۔ وظیفہ قابلیت بند ہونے کے سبب گھر میں فاقے ہونے لگے۔ میں نے قرض اُدھار کرکے سوا دو روپے کا ایک نیا جوتا خریدا، ساڑھے سولہ روپے کی پرانی سائیکل خریدی۔ میرٹھ کالج ہاسٹل میں فارسی کے دو ٹیوشن مل گئے۔ ایک انٹر کا، ایک بی اے کا۔ خود انگریزی پڑھنے اور رہٹوری، موسیٰ بن علی اور سکینہ کو پڑھانے جانے لگا۔ دونوں گروپ چھ چھ روپے مہینے دیتے تھے۔ کبھی دیتے، کبھی بھول جاتے۔ وہ رئیس زادے تھے۔ ہم بگڑے رئیس۔ تقاضے کی ہمت نہ پڑتی اور گھر پہنچ کر سات بھوکے چہرے دیکھنے پڑتے۔ ایک روز نہیں جا سکا۔ زبردست جلوس دیکھنے میں لگ گیا۔ آگے موٹر کار پر مسٹر جناح جو بعد میں قائدِ اعظم بنے تھے۔ ان کے بعد ہاتھی پر ڈاکٹر امبیڈکر۔ اونٹ، گھوڑے، باجے گاجے۔ زاہدیوں نے زوردار استقبال کیا اور بینر پر یہ شعر لگایا:

وراثت میں پہنچا ہے حقِ ریاست
محمد علی سے محمد علی کو

یعنی مولانا محمد علی جوہر سے محمد علی جناح کو۔ جلوس میں ہلڑ بہت تھا۔ کانگریسیوں کے جلوسوں کی سی تنظیم نہ تھی۔
اب تو میں بالکل ہی کانگریسی ہوگیا۔ مزاج میں عربی والوں کی خشونت اور سخت گیری کچھ نہ کچھ تو سمائی ہوئی تھی۔ اپنے عزیزوں سے بھی بگڑاتی چلی گئی۔

محرّم کی خاص مجلس پڑھنے کے لئے باہر سے کوئی بڑے مجتہد آئے ہوئے تھے۔ وہ ممبر پر جلوہ افروز ہوتے اور میں نے نیچے سے ایک رقعہ تہ کیا ہوا اُن کی طرف بڑھا دیا۔ عربی میں لکھا تھا (تاکہ عام اہلِ ایمان کی گرفت میں نہ آئے) کہ دسہرے اور عاشورے میں، دونوں کی رسموں میں، تعزیہ داری اور مندروں کی آرائش میں..... وغیرہ وغیرہ میں اگر کوئی مشابہت ہے تو پھر واقعۂ کربلا نے سچّی توحید کا پیغام کیسے پہنچایا؟ یہ اور ایسے ہی کئی دلآزار سوال تھے۔ جن کا برسرِ ممبر جواب چاہا تھا۔

جواب انھوں نے دیا۔ اور پوچھا کس کے سوالات ہیں؟ میں نے ہاتھ اُٹھا کر ہامی بھرنے کا انجام سوچ لیا تھا۔ انجام اُسی دن سامنے آیا۔ محلّے میں سلامتی سے گزرنا دشوار ہو گیا۔ لیکن اس سے زیادہ دشوار تھا یہ طے کرنا کہ صاحبزادے وہابی ہو گئے ہیں یا آریہ سماجی۔ پڑھنے لکھنے کے ڈبو دیا۔

انھی دنوں برطانوی حکومت ہند کی جنگی پالیسی کے خلاف گاندھی جی کی انفرادی ستیہ گرہ چل رہی تھی۔ میں نے ستیہ گرہیوں کے جتھوں کو دیکھا۔ ان کے صبر و ضبط کا اثر لیا۔ ڈاکٹر صادق کمبو اور مقصود زاہدی میں ایک میرے سیاسی فلاسفر بنے۔ دوسرے ادبی بڑے بھائی۔ دونوں کا قومی سیاسی حلقوں میں آنا جانا تھا۔ بعض مکانوں میں ہم گئے جو بالکل قلعہ بند تھے۔ آنگن چھوٹے اور اُن کے اوپر لوہے کے جنگلے۔ کمبوہ دروازے سے تحصیل سی پٹ بازار کو جاتے ہوئے آدھا شہر طے ہو جاتا۔ اس پختہ آدھے شہر میں کہیں ایک آدھ مسلمان کا گھر تھا۔ درمیان میں کہیں کوئی مسجد ویران۔ اور چاروں طرف اونچے اونچے مکان بعضوں میں ڈیوڑھی پر گائے بندھی ہوتی۔ اندر قدم رکھتے ہی ظاہر و باطن دونوں میں اونچی نیچی دیواریں کھڑی ہوتی۔ پیاس لگے تو گلاس اور کٹورے کی دیوار۔ چین سے بیٹھنا چاہیں تو گھٹنے ہوتے کمرے کو ٹھڑیوں کی قید۔ ہندو جوائنٹ فیملی کا چلن تو تھا ہی، فیملی بڑھنے کے ساتھ ساتھ مکانوں کے کمرے اور چوبارے بڑھتے بڑھتے ساری دھوپ اور ہوا روک لیتے۔ پھر ایک طرف میرے کئی دیش اور سناتنی دوست، بزرگ یا شاگرد، اور دوسری طرف یہ نیا حلقہ آریہ سماجیوں، کانگریسیوں کا، جو رفتہ رفتہ چھوت چھات سے تو نکل رہا تھا لیکن عقیدے کی شدت اور اپنی راست بازی کے جوش نے بے لوچ دیواروں کا روپ دھار لیا تھا۔ یہ ہندو دہابی تھے۔

بھولوں گا نہیں کہ میں عجب کشمکش میں مبتلا رہا۔ خیالات ان لوگوں سے میل کھاتے تھے۔ دل ان سے ملنے کو چاہتا تھا ... مگر کچھ تو نشست و برخاست کے آداب میں اور کچھ حد بندیوں اور پابندیوں کی کثرت میں درمیانی طبقے کے اس ہندو ماحول سے گھٹن ہوتی تھی۔ میری حالت ان ویران مسجدوں کی سی ہو کر رہ گئی جو یاد دلاتی تھیں کہ یہ محلّے، یہ حویلیاں اور باڑے کبھی خوشحال مسلمانوں کی ملکیت ہوں گے۔ انھوں نے خوش باشی، بے فکری اور غفلت میں اڑا دیئے۔ اب اُن کی اولاد شہر کے باہر پوروں اور کچے مکانوں میں پڑی اناج کی بوریاں ڈھو رہی ہے۔ اور نئے خریدار اس اناج کی کھڑی فصلیں خرید رہے ہیں۔ صرّافہ اور بزازے چلا رہے ہیں، مل اور فیکٹری چلا رہے ہیں اور قومی آزادی کی خاطر چرخہ اور اندولن چلا رہے ہیں۔ جو خود چلے گا وہی چلائے گا بھی۔ ...ی طبقاتی تقسیم کا فلسفہ تو کئی سال بعد پڑھنے کو ملا۔ آنکھوں نے اور سوچ نے اس کے بنیادی باب پہلے ہی دکھا دیئے تھے۔

۴

مکر اور جھوٹ سے طبیعت کو سخت نفرت تھی اور اب دیکھا کہ رفتہ رفتہ مکر اور جھوٹ روز کی عادت بننے لگے۔ پیٹ بھی ہے، مگر دوسرے کے گھر بہانہ کر رہے ہیں کہ رات پلاؤ زیادہ کھا لیا تھا۔ ہاضمہ خراب ہے۔ کچھ کھائیں گے نہیں۔ باپ نے ہمارے بیٹے کو اپنی نایاب اور قیمتی جیبی گھڑی تحفے میں دی۔ ایک خوبصورت سے لڑکے نے پوچھا۔ ہمیں ایک دن کو دے دو گے؟ کہا۔ ایک دن نہیں، ایک مہینے کو لے لو۔ ہمارے گھر میں تو ایسی کئی کئی گھڑیاں رکھی ہیں۔ دن میں کئی کئی جھوٹ گڑھنے لگا۔ تخیل کو بڑی راحت ملتی ہے ایسی باتوں سے۔ نماز گنڈے دار ہو چلی تھی۔ کسی کا ساتھ ہوا تو گئے، پڑھ آئے۔

بابا صبح چار بجے اٹھتے، صبح تک نمازیں اور مناجاتیں پڑھے جاتے۔

تجھے فضل کرتے نہیں لگتی بار

نہ ہو تجھ سے مایوس امیدوار

میں نے جی کڑا کر کے ایک رات تہیہ کیا کہ اگر واقعی کوئی بڑا کریم و رحیم پروردگار ہے تو اس سے بات کر لی جائے۔ صبح کا سپیدا نمودار ہونے میں ابھی دو پہر تھی کہ میں ڈیڑھ کی اپنی پیاری مسجد میں پہنچا۔ اندر کوئی نہیں تھا۔ میں نے اندر سے کنڈی لگا لی۔ محراب میں سر ٹیکا۔ رقت طاری کی۔ سجدے کو اتنا طول دیا کہ نمازیوں نے دروازہ پیٹ پیٹ کر مجھے چونکا دیا۔ اٹھا۔ آواز دی۔ کوئی جواب نہ آیا۔ بازگشت بھی نہ آئی۔ دو اگربتیاں محراب میں ٹھنسی ہوئی تھیں۔ دونوں نکال لیں۔ اور پکار کر کہا:

"لے، ہم تیری اگربتیاں چرا کر لے جا رہے ہیں۔ اگر تو ہے اور بگڑی بنا نہیں سکتا تو کچھ بگاڑ کر دکھا!"

یہ میری پہلی چوری تھی۔ صبح سویرے، خدا کے گھر میں، خدا کے مال پر ہاتھ صاف کیا اور پھر کتنی بار کی مشق میں ہاتھ بالکل صاف ہو گیا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ دل صاف نہیں رہتا۔ دھبہ سا رہ جاتا ہے۔

انہی حلقوں میں ایک دبلے پتلے روشن، تنومند جوان آدمی ملے۔ "سونڈھی" کہلاتے تھے۔ دیکھنے میں کانگریسی لیکن بات کرو [illegible] اور ان کے اندولن کے سخت دشمن۔ "دس نو کسی بنیا" سے شروع ہوتے۔ ایک ہفتہ وار انقلابی اخبار نکالتے "کیرتی لہر" نام کا۔ اخبار کے دفتر گیا۔ دیکھا کہ خود مضمون لکھتے ہیں۔ خود کاپی جاتے ہیں اور کوئی مددگار نہ ہو تو خود ہی مشین چلا کر چھاپتے بھی ہیں۔ تھوڑے دن ان کے ساتھ کام کیا۔ صبح پڑھنے جاتا، دوپہر کو ان کا ہاتھ بٹاتا، تیسرے پہر پڑھانے کی پھیری پر نکلتا۔ شام کے بعد کبھی ... یا ادبی بیٹھک جمتی۔ رات گئے گھر لوٹتا۔ اب چونکہ سات آدمی کے کنبے کی روٹی روزی کا سہارا تھا، چاہے کچھ کرو کوئی نہیں ٹوکتا تھا۔ کامریڈ سونڈھی کمیونسٹ انقلابی تحریک کے جانباز کارکن تھے۔ انھی کی بدولت مجھے کارل مارکس، اینگلس، پلیخانوف کی تحریریں (اردو میں) پڑھنے کو ملیں۔ باری علیگ کے اشتراکی کتابچے اور "کمپنی کی حکومت" ہاتھ آئی۔ سچ یہ ہے کہ ایک نئی سلطنت ہاتھ آئی۔ اور میں نے طے کیا کہ گھر بار سے بے نیاز ہو کر شہر سے باہر نکلا جائے۔ مرچیں کترنے اور کپڑا کاٹنے کی قینچی سے میں اپنی مونچھیں اور زبان کی قینچی سے بڑوں کے کان کترنے لگا تھا۔ خواہ مخواہ بڑا بننے کو میں نے بلا ضرورت ایک نازک سا چشمہ بھی ناک پر دھر لیا۔

دہلی سے کوئی سو کلو میٹر پر خورجہ مغربی یوپی میں پٹھانوں کا خاص قصبہ ہے۔ اس چھوٹے سے قصبے سے چار پانچ خان بہادر، کوئی چالیس انسپکٹر آف پولیس، کئی ایس پی اور آئی سی ایس اٹھے۔ اسے میں نے اپنے اگلے منصوبے کے لئے چنا۔

نیک دل کرسی نشین رئیس حسین علی خان نے بڑا سا مکان مع فرنیچر حوالے کیا۔ نئی وضع کا اسکول کھلا۔ علی گڑھ کے چند مخلص نوجوان اپنے وطن میں گرمی کی چھٹیاں گزارنے آئے تو اسکول کی تحریک آگے بڑھی۔ کل وقتی، جز وقتی ٹیچر رکھے۔ کام یوں چلتا تھا کہ دو سائن بورڈوں کی ضرورت پڑی تو رات کو نکلے اور دو دکانوں کی چھت پر چڑھ کر تار کاٹے، بورڈ اتارے، پیچھے سے رنگ و روغن کیا، نام لکھا، دوسرے دن لگا دیئے۔ "کچھ بگاڑ کر دکھا!"

جاں بورڈ رہے تھے۔ اُن کے ناشتے کے لئے پیسے پورے نہیں پڑتے۔ انھیں لالہ جی کی دوکان پر لے گئے۔ کھلایا پلایا۔ چلتے وقت مظفر خاں کو آگے کر دیا جو اپنے کوٹ کے اندر تیز ابی ڈنڈا لگائے پھرتے تھے۔ اپنے وقت کے دو دن کوئی لزوٹ (دان نوستان) تھے ہر ایک کی خاطر مرنے مارنے پر کمربستہ۔ اور ہماری خاطر تو۔ بس! یہاں آس پاس کے مقامات سے کئی پختہ کار صاحب علم آ پہنچے۔ ان میں ایک جینتی لال این بھی تھے۔ اُردو فارسی ادب کے رسیا۔ انھوں نے خبر دی کہ آپ جو صبح سویرے ہندوستان کے پار جایا کرتے ہیں تو خفیہ پولیس آپ پر نظر رکھتی ہے۔ ہوشیار رہیئے۔ ابھی ہوشیاری کی نوبت نہ آئی تھی کہ گاندھی جی نے کوئٹ انڈیا کا (۸ اگست ۱۹۴۲ء کو) نعرہ لگا دیا۔ رات رات میں گرفتاریاں۔ ہر طرف بھاگ دوڑ ۔۔۔ آغا ظفر خان تھے ختم کے نکتے۔ کھدّر پوش۔ بظاہر میرے ہمدرد، بباطن پٹھانوں کر سو گھنے پہ مامور۔ انھوں نے باتوں ۔۔۔ مجھ سے نکال لیا کہ اس تحریک کے شورش پسندوں سے رابطہ رکھتا ہوں۔ ایک روز تیسرے پہر کو میں اسی مکان کے ۔۔۔ بند کئے اندرونی کمرے میں تین سینئر طلبا کو خاقانی کا سنگلاخ قصیدہ پڑھا رہا تھا۔ (ارادہ تھا کہ اس کے بعد غائب ۔۔۔)

صبحدم چوں کلہ بند د آہِ دود آسائے من
چوں شفق در خوں نشیند چشمِ شب پیمائے من

۔۔۔ بہت سی ہوئی۔ پھر سناٹا۔ میں پڑھاتا رہا۔ تھک گیا تو میں نے کہا: دیکھو بھائی جینتی لال، اب معلوم نہیں کہاں ملیں۔ ۔۔۔ نوں کو اطلاع کیوں کر دوں۔

۔۔۔ ہوا تھا کہ ایک ہیڈ کانسٹبل (خفیہ) اور دو وردی والے داخل ہوئے۔ ہیڈ کوئی پرانا خاندانی مسلمان تھا۔
۔۔۔ لوگ دیر سے باہر ٹھہرے آپ کی آواز سن رہے تھے۔ میں نے بڑے استادوں سے فارسی پڑھی ہے۔ مگر واہ ۔۔۔۔
۔۔۔ آپ پڑھاتے رہیں ۔۔۔ سنتا جاؤں۔ اسی لئے ہم رُکے رہے۔

۔۔۔ رے بچاؤ کی فکر پڑ گئی۔ بتانے لگا کہ کوتوالی میں دہلی سے ایس پی اور ڈی آئی جی آئے ہیں۔ تین آدمیوں کے نام ۔۔۔ ہے۔ آپ تیسرے ہیں۔ مگر میری مانیں تو بچ سکتے ہیں۔ جب میں اندر لے جاکر پیش کر دوں گا تو گول کھمبے کی آڑ میں کھڑا ۔۔۔ ہے۔۔۔ وں کا جواب دیتے وقت آپ میرا اشارہ سمجھ لیجئے گا۔ میرا ذمہ، صاف بچا لوں گا۔

۔۔۔ ی سد۔۔ یہ ہیں وہ۔ پورا نام نہیں بتاتے۔
۔۔۔ سا نام ۔۔ ہے۔ ظ انصاری
۔۔۔ یہاں یہاں نام درست کرنے آئے ہیں کیا؟
۔۔۔ نے یہاں فتنہ برپا کر رکھا ہے۔
۔۔۔ سے برپا ہے جب قومی رہنماؤں کو غیر ملکی حکومت نے مجرمانہ گرفتار کیا۔

۔۔۔ نہیں۔

ں: آپ چند لڑکوں نے کل کے لئے کوئی خلافِ قانون سازش کی ہے؟

ہَکھیا: بالکل نہیں مجھے خبر نہیں۔

ب: ناکام رہی تو سازش، کامیاب ہو جاتے تو انقلابی عمل۔ اور ہاں بیٹھے ہیں "لڑکوں" نہیں ہوں۔ لڑکوں کا باپ ہوں۔
اِل بچوں والوں کو پڑھاتا ہوں۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس ہنس دیا۔ تناؤ میں کچھ ڈھیل پڑی۔

اور دو چار سوال ہونے چٹ پٹے سے۔ گوں کھیے کی آڑ نے بہتیرے اشارے کئے کہ یوں نہیں یوں۔ لیکن زندگی میں اس سے پہلے اور
کے بعد جب بھی ایسے فیصلہ کن مرحلے آئے۔ اور آئے تو بہتیرے۔ تب اندر ہی اندر کسی نے دستک دی اور کہا، لاؤ اپنا ہاتھ۔ یہ
بات، لا بایاں ہاتھ: یہ رے بلائیں اور آفتیں۔ اب جو مٹھی چاہے کھول۔ تجھے اختیار ہے۔ میں بائیں مٹھی کھولتا رہا ہوں (سوائے
موقعوں کے)

اس دن بھی یہی کیا۔ رات کو حوالات، دوسرے دن بلند شہر جیل۔

صاف ستھری جیل تھی۔ مجھے تو بڑی پسند آئی۔ ڈھائی سو کانگریسی تھے اور ہائے افسوس کہ ان میں صرف ایک مسلمان (مرتضیٰ علی
قی کے وکیل)۔ میں تو یونہی جا پہنچا۔ کانگریس کا ممبر تک نہیں تھا۔ نہ اس کے بعد بنا۔

کہیں بھی اتنے سارے آدمی ایک درجے میں سرفروش نہیں ہوتے۔ سجانو پرتاپ سنگھ کے والد بزرگوار ٹوڈر سنگھ
، جنھیں میں چھوٹتے ہی شیخ جی کہنے لگا۔ وہ دو دن میں مجھ پر شفقت فرمانے لگے۔ دو ساد ھو تھے سبزی اور دودھ پر گزارا کرنے
لے۔ انھوں نے اپنے حصے کا ایک ایک کیلا کھلانا شروع کر دیا۔ ٹھاکر بلبھدر سنگھ تھے (جہاں بھی ہوں، خدا انھیں خوش رکھے)
یہ سماج کا لٹریچر لے آئے۔ سوامی دویکانند سے، ان کے کام سے تعارف کرایا۔ دیوناگری پڑھانے بیٹھ گئے۔ میرے کھانے پینے
نیال رکھنے لگے۔ بنارسی داس تھے (انشورنس ایجنٹ) جو کافی عرصے تک یو پی کے منسٹر رہے اور اب اسپیکر ہیں۔ انھیں
یشہ تھا کہ یہ کم عقل نہ کانگریسی، نہ سوشلسٹ، پھر اسے کیوں ہمارے ساتھ رکھا ہے، کوئی خاص نیت تو نہیں؟

دن بھر تو پروگرام کی باقاعدگی کی بدولت گزر جاتا۔ رات ستانے آتی۔ گھر والوں کو روٹی کون دے گا؟ ایک روز ڈپٹی
بلر نے، کہ خاص قدر دانی کرنے لگا تھا، بلا بھیجا۔ کہا۔ آپ کی والدہ ابھی روتی ہوئی گئی ہیں۔ صبح سے رو رہی تھیں گیٹ پر۔
، نے کہا: ہندوستانی شیعہ پر سوگواری طاری ہے تیرہ سو برس سے۔ اس نے حسین کی عزا کو عمر بھر کا عزاخانہ بنا رکھا ہے۔
انھیں یہ بدکلامی بری لگی۔ اگر میں اُن کی جگہ ہوتا مجھے بھی بُری لگتی۔

پھر میں نے کہا: ڈپٹی صاحب۔ خدارا بتلایئے۔ مجھے شرم نہ آئے گی کہ یہاں دو سو سے اوپر آدمی گرفتار ہیں۔ نوجوان کچھ پچاس
اسّی تو ہوں گے ہی۔ کسی کی ماں جیل کے پھاٹک پر رونے نہیں آتی۔ سنسکرت پاٹھ شالہ کا جو لڑکا میرے ساتھ پکڑ کر لایا گیا
، اس کی ماں ہمت بندھانے آئی تھی ابھی چار دن پہلے۔ ڈپٹی صاحب، آپ سیّد زادے ہیں۔ کیا یہی تعلیم ملتی ہے آپ کو سیّد سجاد
اسیری سے؟ آپ کو عادت ہو گئی حضرت زینب اور شہر بانو کو بین کرتے اور سینہ پیٹتے دیکھنے کی۔ لکھنوی مرثیے نے اس سوگوارانہ

عادت کو اور مقبول عام کر دیا........ خدا جانے کیا کیا کہا اور چلا آیا۔

ارتضیٰ علی بڑے خوش وقت، مرنجاں مرنج، گول گپا آدمی تھے۔ مگر اندر سے سنجیدہ۔ پوچھا۔ کیا سوچتے ہو؟

"سوچنا کیا ہے حضرت۔ اگر ہماری مائیں اتنی بے حوصلہ ہیں۔ اگر متوسط طبقے کے مسلمانوں میں سے اتنی بڑی سیاسی تحریک کے میدان میں سو پچاس آدمی بھی ایک ضلع سے نہیں نکل سکتے تو زندگی کی دوڑ میں ان کا مقام ظاہر ہے۔ کل جب ملک آزاد ہوگا (اس کی آزادی کو مسٹر جناح روکیں گے نہیں) تو یہ بے حس تماشائی کہاں پاؤں ٹکائیں گے۔ یہ سوچتا ہوں۔ وہ بولے" واہ شم بیتی۔ تم سوچ بھی سکتے ہو؟" "شم بیتی" ان کا محبوب لفظ تھا جس میں ہر اچھے برے معنی سما جاتے تھے۔ وہ خود بھی کچھ کم "شم بیتی" نہیں تھے۔

ایک دن جیل میں کسی معاملے پر ہنگامہ ہوگیا۔ پولیس کے پرے دھپ دھپ کرتے لاٹھیاں تانے آپہنچے۔ ہم سب C اور B کلاس والے بیرک کے قاعدے توڑتاڑ، گھیرا بنا کر پرارتھنا کے لئے کھڑے ہوگئے۔

جھنڈا اونچا رہے ہمارا
وشو وِجئی ترنگا پیارا

ایس پی مشہور پولیس افسر رشید الظفر اس دستے کے کماندار تھے۔ انھوں نے حکم دیا "DIPERSE!" کوئی اپنی جگہ سے نہ ہٹا۔ انھوں نے پھر حکم دیا۔ "گانا بند کیجئے!" کسی نے نوٹس نہیں لیا۔ انھوں نے لاٹھی چارج اور فائرنگ کی دھمکی دی تو قیدیوں میں سے کسی سنگھ صاحب (ایم ایل اے) نے مہر خاموشی توڑی۔ اور چیک کر کہا: مسٹر ایس پی، یہ ہماری کانگریسیوں کی عبادت ہے، پوجا ہے۔ کیا آپ اپنی نماز بیچ میں سے توڑ دیں گے۔؟

جوں توں کر کے قصہ رفع دفع ہوا۔ پولیس جیلر وغیرہ کو خفیہ ہدایات دے کر چل دی۔

سنا جاتا تھا کہ سید ارتضیٰ علی فوں فاں کرتے ان ایم ایل اے کے سامنے پہنچے: "یہ سیاسی پرارتھنا ہے۔ یہ ایک پولٹکل پارٹی کا گانا ہے۔ اسے نماز سے کیا نسبت؟ آپ نے نماز کا نام کیوں لیا۔ نماز میرا دین ایمان ہے۔ مسٹر سنگھ، میں اس کے لئے جان دے سکتا ہوں۔ ترنگے جھنڈے والے گانے کے لئے جان نہیں دونگا۔

بڑوں بوڑھوں نے بمشکل انھیں ٹھنڈا کیا اور ایم ایل اے صاحب نے اپنے الفاظ واپس لیے۔ لیکن میرے سینے کی تختی پر سیاہ صوف کی پوری ایک گانٹھ اور بڑھ گئی۔ داغ پڑا رہ گیا۔

مگر ابھی دو ایک دھماکے ہونے باقی تھے۔

صبح کا وقت۔ ستمبر کے آخری دنوں کی نرم دھوپ۔ ایک ننھے پیارے لال۔ سب لوگ انھیں نفاست کی نسبت سے پیارے لال نفیسی کہتے تھے۔ نفیسی کے گھر سے شہد کی بوتل آئی ہوئی تھی، وہ انھوں نے دھوپ میں رکھ دی۔ پھر اندر گئے شیو کا سامان لائے۔ وہ بھی ایک چوکی پر لگا دیا۔ پھر کہیں چل دیئے۔

میں نے شیو کرنے لوگوں کو دیکھا تھا، تب تک خود شیو کی نہ ضرورت سمجھی تھی، نہ کیا تھا۔ اس دن جی میں کیا آئی، کہ نفیسی

جی کا سیفٹی ریزر لگا کر خود اپنے گال چھیلنے بیٹھ گیا۔ ٹھوڑی سے لہو ٹپکنے لگا۔ کسی نے مشورہ دیا۔ منھ دھو کر شہد لگا لو۔ جلدی جلدی چھپکے مارے، اُنھی کی شہد کی بوتل، کاک نکال کر سونگھی اور ابھی زخموں پر "مرہم" لگانے نہ پایا تھا کہ فینسی نمودار ہو گئے۔ دیکھا۔ سکتے میں آ گئے۔ اس وقت انھوں نے نہ ٹیو کیا، نہ بوتل بند کی۔ سرک گئے۔

جب میدان خالی پایا، آئے اور آہستہ سے بوتل مع شہد لے جا کر غلاظت کے ڈھیر کی آڑ میں ڈال آئے۔ دوسرے دن سے اُن کے چہرے پر داڑھی اور میرے باطن میں جھاڑی اُگنے لگی۔ یعنی مرنے جینے کا ساتھ اور اتنا فاصلہ! "اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے"!

دن کے ہنگامے میں، ظاہر ہے کہ نوجوان زیادہ پُرشور اور نمایاں تھے۔ بیرکیں بند ہونے کے بعد باہر سے وارڈر، دو پولیس والے اور ایک افسر لالٹین اور سنگین لیے بھڑاق سے اندر آتے۔ گالیوں کی طرح نام منھ سے نکالے۔ ایک، دو، تین چار — کُل نو نام تھے۔ فلاں نام اِس حالت ولد فلاں — نکل آؤ باہر۔ ایک ایک دو دو کو نکال کر تاریک احاطے میں لے جاتے ذرا دیر بعد خوفناک آہوں اور کراہوں کی دہشتی سلاخوں سے پتہ چلتا کہ درخت میں باندھ کر اُنھیں کوڑے لگائے گئے ہیں۔ رات کے ہولناک سناٹے کو کاٹتی ہوئی چیخیں — اور پھر سناٹا۔ یعنی قیدی بے ہوش۔ سب سے زیادہ کوڑے بنارسی داس کے پڑے۔ اس سے پہلے کہ میرے باہر نکالے جانے کی باری آئے۔ ایک اور وارڈر دوڑتا ہوا آیا اور نام پکارنے والے کے منھ پر ہاتھ رکھ کر کچھ کھسر پھسر کی۔ میرے نام سے ملتا جلتا ہر دوار کے ایک نیک طینت، فرشتہ سیرت سادھو کا نام تھا۔ پچھلے وارڈر نے وہ نام پکار دیا۔ سادھو جی دست بستہ نکالے گئے۔ جب بیرک کے احاطے میں بندھ کر پہلے بھرپور کوڑے پر انھوں نے جان گداز آہ بھری تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُس لمحے کی پوری سوانح عمری اپنے ڈرامائی کانفلیکٹ کے ساتھ میرے حافظے میں آج تک لرزتی ہے۔ اور میں کچھ نہیں بتا سکتا کہ کوڑے کا نشانہ غلط پڑنے، اپنی کھال بچ جانے پر وہ اطمینان کی لرزش تھی یا شرم و ذلّت کا کرنٹ — یا دونوں۔ دوسرے دن راز کھلا کہ وہ ڈپٹی جیلر، جو میری زبان دانی کے قدرداں اور اتّاں کے آنسوؤں سے دل گرفتہ تھے، انھوں نے آنِ واحد میں بیک جنبشِ قلم قربانی کے بکرے بدل دیے تھے۔ گرہ پر گرہ پڑتی چلی گئی۔ اور جب ان گانٹھوں کو کھلنا نصیب نہ ہوا تو کسی تیز دھار کے چھلکے کی طلب بڑھنے لگی جو ایک وار میں ساری گانٹھیں کاٹ ڈالے۔

کمیونزم — مارکسی نظریہ — کہاں ملے — کیسے ملے۔ اور کیا خبر وہاں بھی جھول جھپّا ہو۔ جب مسجدوں کے حجروں میں بے دردی اور بے دینی کا یہ حال ہے تو بالشویک یوں بھی کسی دین کو نہیں مانتے۔ اُن سے کیا ملنا ہے۔ پھر بھی جانا چاہیے۔ بتا جاتے . . . . .

(۱۴ اکتوبر ۱۹۴۲ء تک)

ایں رشتہ بانگشت نہ پیچی کہ درازست!

(باقی پھر)



کالیداس گپتا رضا

"...... بہر حال یہ خاک ہمیشہ سے اُڑتی آئی ہے اور ہمیشہ اُڑتی رہے گی۔ ہم میں اجتماعی کام کرنے کی صلاحیت بہت کم ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ آنے والے پچاس برسوں تک بھی اُردو کی عظمت انفرادی طور پر کئے ہوئے کام ہی کے سہارے باقی رہے گی۔ اجتماعی کام کے سہارے نہیں ......"

مصرع طرح تھا کہ

پاس آ آ کے دور جاتے ہیں

مئی (۱۹۳۹ء) کا مہینہ تھا، شدت کی گرمی تھی۔ شام کو غروبِ آفتاب کے بعد ہوسٹل (ایل۔آر۔ ڈی۔ اے۔ وی ہائی اسکول۔ جالندھر شہر) کی چھت پر نیاز احمد، مدن لال، گوربچن سنگھ، محمد اسمٰعیل، رمیش وغیرہ کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا کہ مجھے گرہ سوجھ گئی۔ میں نے ذرا اونچی آواز سے کہا ؎

وہ مرا ظرف آزماتے ہیں
پاس آ آ کے دور جاتے ہیں

میرے ان دوستوں میں سے کسی کو شعر و شاعری سے شغف نہ تھا۔ وہ اپنی ناکامی اور میری کامیابی پر دل مسوس کر رہ گئے۔ ماش کی دال اور بینگن کے بھرتے کی رکابیاں دھری رہ گئیں۔ دیوار کی اوٹ سے ماسٹر رتن[1] نے سنا اور وہ ہمارے پاس آ گئے۔ رمیش نے ماش کی دال کی رکابی اور ایک پراٹھا ان کی طرف بڑھا دیا۔ دیکھتے ہی فرمایا ؎

ماش کی دال تو نہیں مرغوب
بھرتہ بینگن کا خوب کھاتے ہیں

چند ماہ پہلے رسالہ "مستانہ جوگی" لاہور میں ایک غزل پڑھی تھی۔ بیدار خدا حافظ، رفتار خدا حافظ۔ ردیف بہت پسند آئی۔ بے اختیار سات آٹھ شعر کہہ ڈالے۔ یہ میری پہلی مکمل غزل تھی۔ صرف مطلع یاد ہے ؎

کہتا ہے تجھے دل سے بیمار خدا حافظ
اے پیار خدا حافظ، اے یار خدا حافظ

میرے گاؤں[2] (مکندپور، ضلع جالندھر) میں محرم میں عاشورے کے روز تعزیہ بڑی دھوم دھام سے اٹھایا جاتا تھا۔ سبھی ہندو برابر کے شریک ہوتے تھے۔ ہماری بیٹھک کے سامنے جگہ نسبتاً کشادہ ہے۔ وہاں تعزیہ ذرا زیادہ وقت کے لیے رکتا تھا۔ بیٹھک سے متصل اُپادھیائے براہمنوں کا کنواں (پادھیاں دا کھوہ) تھا اُس پر میرے والدِ محترم دو سبیلیں لگاتے تھے ایک لال شکر کی اور دوسری سفید شکر کی۔ میرے والد کٹر آریہ سماجی تھے اور ہمارا سب کا مسلک یہی تھا، مگر بزرگوں کی اس روایت کو

---

[1] پنڈت ہری کرشن رتن ایم۔اے، ایم۔او۔ایل۔ ہمیں اردو و فارسی کا درس دیا کرتے تھے۔ اچھے شاعر تھے، نہایت شریف اور قابل اُستاد تھے۔ [2] اہلِ مکندپور، مکندپور کو گاؤں کہا کرتے تھے اور آس پاس کے گاؤں والے شہر۔ حقیقت میں اسے قصبہ کہنا چاہیے۔

جو کئی پشتوں سے جاری تھی پورے اہتمام سے انجام دیتے تھے ۔ میں نے خود ان سبیلوں پر گھنٹوں کھڑے رہ کر سینکڑوں تشنگانِ رہِ کربلا کی پیاس بجھائی ہے ۔ میری دادی پورے رمضان بھر حاجتمند مسلمانوں کے لیئے افطار کا سامان فراہم کرتی تھیں ۔ گاؤں کے مسلمان نسبتاً غریب تھے اس لیئے ان کی ثقافتی دیکھ ریکھ خوشحال ہندوؤں کا قومی فریضہ بن گیا تھا اور سب لوگ بلا لحاظ مذہب و مسلک اسے مستحسن نظروں سے دیکھتے تھے ۔ یہ سلسلہ تقسیم ہندوستان (۱۹۴۷ء) تک جاری رہا ۔ عاشورے میں ایک سوزخواں خاص طور پر شرکت کرتے تھے ۔ میرا یہ مصرع ان کی مکمل خارجی تصویر پیش کرتا ہے ۔ ع

سیاہ رنگت، متین چہرہ، بلند قامت دراز گیسو

جب وہ ہماری بیٹھک کے سامنے رک کر سوز خوانی کرتے تو میرا دل بھر آتا ۔ اشعار کی معنویت اور موزونیت میرے اندر چھپے ہوئے شاعر کو بیدار کر کے جیسے کسی بھری پُری محفل میں لا کھڑا کرتی ۔ اکیلے میں بھی ان کا وہی ازلی سوز و گداز مجھے جھنجھوڑتا رہتا ۔ میری فرشتہ سیرت والدہ بھی ہمیشہ زیردستوں سے وفا کی نصیحت کرتیں جو دل میں گڑ جاتی ۔ میری غزلوں کے ایسے شعر شاید اسی تاثر کی دین ہیں ۔ یہ تاثر بچپن سے لے کر آج چوراسی سال کی عمر تک، برابر کار فرما ہے ؎

سانے سکے کی باتیں، اب ہونٹوں پہ لانا کیا
رات گئی سو بات گئی، اب دن میں دہرانا کیا
دل کے اندھیرے گوشوں کو چاندنی رات اُٹھا لے کیوں
یادوں سے پُرنور کرو، چاند کی شمع جلانا کیا

جب بگولے نقشِ پا بن کے اُڑے
خارِ خونخوردہ نشاں دینے لگا
کوئی کہہ بیٹھا حدیثِ زندگی
اِک دیا بجھ کر دھواں دینے لگا

وقتِ آخر ہے نہ اڑ جائے کہیں غم کی مہک　　دو گھڑی اور اسے زُلفوں میں بسائے رکھنا
سر سے پا تک یہ ترے زخمِ وفا۔ کیا کہنا　　اپنے آنگن میں یہی پھول سجائے رکھنا

اضافہ ہو گیا ہے دیکھ کتنا　　مرے اشکوں سے تیری دلکشی میں
وہی قاتل، وہی وحشی، وہی جبر　　نہ آئی آدمیت آدمی میں

آلام ہمہ جہت اب آلام　　دُکھ جزوِ حیات بن گیا ہے
آتے جاتے رُلا رہا ہوں　　نالہ خیرات بن گیا ہے

ہنستے چہروں میں پنہاں الم ۔ الاماں　　کون ہنستا ہے دل سے کلی کی طرح
یاس کس دستِ غیبی کی ہے منتظر　　راستے میں لگی پالکی کی طرح

اُڑتا پھرتا غبار ہر سُو　　یہ دشتِ رواں کبھی چمن تھا
دُنیا مقتل بنی تھی اور دِل　　اپنے ہی خیال میں مگن تھا

چل پڑی موت اپنے مسکن سے　　زندگی کیسی بے خبر ہو گی
وقت آنے دو روپ نکھرے گا　　سائے پلٹیں گے دوپہر ہو گی

مرا وجود ہے مبہم مگر وجود تو ہے　　افق کے پار سہی اور میں کہیں نہ سہی
ازل سے گردِ سفر بن گیا ہوں صحرا ہوں　　کوئی بگولہ مجھے ڈھونڈتا نہیں نہ سہی

تجھ بن میرے ارماں ایسے　　گل ٹوٹے اُجڑے آنگن کے
باجے گا جے کا کیا سُننا　　بول سنو دل کی دھڑکن کے
نیلے ہونٹ اور پیلا چہرہ　　رنگ ہی کتنے ہیں تر دامن کے

میں پہلے ہی سے اپنے شعر سنانے میں بہت شرم محسوس کرتا ہوں اور میری یہ روش آج تک قائم ہے۔ اس لیئے میرے اردگرد کے (۱۹۴۲ء) بہت کم لوگ جانتے تھے کہ مجھے شعر کہنے کا شوق ہے۔ حالانکہ اس وقت میں استاد سے اصلاح لینی شروع کر چکا تھا اور ذکرِ شعر باقاعدہ کرتا تھا۔ میں نے موسیقی کی تعلیم بطورِ خاص حاصل کی تھی۔ خوشحالی کا زمانہ تھا۔ میرے یہاں خوب خوب محفلیں ہوتیں۔ روزانہ کے حاضر باشوں میں ایک گویّا جیمنے خاں تھا۔ راگ کی واقفیت کے علاوہ وہ ایسا خوش آواز تھا کہ اس کی آواز سن کر چہچہاتے ہوئے پرندے بھی شرما جاتے۔ اُسے ایک دن معلوم ہوا کہ میں شعر بھی کہتا ہوں۔ اصرار سے ایک نظم سنی "محبِّ وطن کی دعا" جسے اس نے پسند کیا اور اپنی بیاض میں لکھ لیا۔

ہمارے گاؤں سے موضع کھٹکڑ کلاں صرف تین کوس کے فاصلے پر ہے۔ یہ وہی کھٹکڑ کلاں ہے جس نے شہیدِ اعظم

بھگت سنگھ[1] کو جنم دیا۔ جب کی بات بیان کر رہا ہوں اس وقت بھگت سنگھ کی شہادت کو تیرہ چودہ برس ہو چکے تھے۔ اس سال بیساکھی سے پوتر دن پر دیش بھگتوں نے "بھگت سنگھ شہیدی میلہ" کی بنیاد ڈال دی۔ ہزاروں لوگ جمع ہوئے۔ کھٹکڑ کلاں میں ریلوے لائن کے اس پار آم کے درختوں سے جھنڈے سے لگا ہوا سادہ مگر وسیع اسٹیج تیار ہو گیا۔ اس وقت کے نامی لیڈروں میں ڈاکٹر ستیہ پال نے جلیانوالا باغ امرتسر کی المناک داستان دہرائی جو بیس پچیس سال پہلے اسی روز انگریز کے خونخوار قلم سے لکھی گئی تھی۔ ماسٹر کابل سنگھ نے بھگت سنگھ کی دل بڑھا دینے والی باتیں سنائیں۔ لاہوری رام پردیسی نے اپنا مشہور و مقبول "انگریزی حکومت کا سیاپا (نوحہ)" سنایا۔ لوگ دیوانے ہو ہو گئے۔ حسینے خاں بھی اسی جوش و خروش میں اسٹیج پر وارد ہو گیا۔ وارد کیا ہو گیا بس چھا گیا۔ نظم تھی وہی "محب وطن کی دعا"۔ حُبّ الوطنی اور اردو دونوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ جب حسینے خاں ان مصرعوں پر پہنچا ؎

اے تری رحمت کے صدقے مجھکو یہ انعام دے

جان تک قربان کر دوں میں وطن کے واسطے

تو اس کی بے حد سُریلی اور بار دار آواز چند لمحوں کے لئے "انقلاب زندہ باد" کے فلک شگاف نعروں میں گم ہو کے رہ گئی۔

نظم کے ۹ بند ہیں۔ پہلا اور آخری بند سن لیجئے ؎

وقف میں کیوں ہوں نگارِ سحرِ فن کے واسطے
عشرتِ جاں کے لیے آرامِ تن کے واسطے
مہ وشانِ رقص و لطفِ انجمن کے واسطے
جان تک قربان کر دوں میں وطن کے واسطے

کر رہا ہوں میں گناہِ عشقِ ملکی برملا
کوئی دن ایسا بھی میرے دیس پر لا اے خدا
جس دن اٹھ جائے جنازہ ہند سے انگریز کا
اور سازِ دل کی جھنکار(وں) سے اُٹھے یہ صدا
جان تک قربان کر دوں میں وطن کے واسطے

ملک تقسیم ہو کر آزاد ہو گیا۔ میں جون ۱۹۴۹ء میں مشرقی افریقہ چلا گیا وہاں سے ۱۹۷۰ء میں واپس لوٹا اور بمبئی میں سکونت اختیار کر لی اور جب سے اب تک بمبئی ہی میں رہ رہا ہوں۔

---

[1] بھگت سنگھ کے والد سردار کشن سنگھ میرے پتاجی کے بڑے شناسا تھے۔ میں نے انھیں کئی بار اپنے یہاں پتاجی کے ساتھ محوِ گفتگو دیکھا ہے۔ بھگت سنگھ کے گھر بھی ایک سے زیادہ دفعہ گیا ہوں اور ان کی ماتاجی (سورگباشی پنجاب ماتا) کے ہاتھ کا کھانا بھی کھا چکا ہوں۔

۱۹۷۰ء سے اُردو تحقیق کا شوق ہوا۔ تاریخ سے شروع ہی سے دلچسپی رہی ہے اس لئے اس میدان میں اترنے کے لئے مجھے مشقت تو بہت اٹھانی پڑی مگر ایک نومشق کی سی محنت نہیں کرنی پڑی۔ افریقہ کا کتب خانہ وہیں چھوڑ آیا تھا جو پچانوے فیصد انگریزی کتابوں پر مشتمل تھا۔ یہاں آکر از سر نو ذاتی کتب خانے کی بنیاد ڈالی۔ کتابوں کے جمع کرنے کیلئے طرح طرح کے پاپڑ بیلے۔ میں خود اپنے ذخیرۂ کتب کے متعلق کیا کہہ سکتا ہوں مگر ڈاکٹر گیان چند صاحب کے خیال میں اب یہ کتب خانہ ہندوستان کے ذاتی کتب خانوں میں پہلے نمبر پر ہے۔ اس میں (ابھی تمام کتابوں کا کیٹ لاگ نہیں بن سکا) ایک اندازے کے مطابق دس ہزار سے زائد کتابیں، رسالے اور دو سو سے زائد مخطوطے ہوں گے۔ میرا غالبیات کا ذخیرہ شاید دنیا بھر کا سب سے بڑا غالب کلکشن ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی تمام کتب کی تفصیلی فہرست شائع ہوگی۔ کام شروع ہو چکا ہے۔

میری تعلیم کچھ زیادہ نہیں۔ میں نے اردو فارسی پنجاب یونیورسٹی کے ادیب فاضل اور منشی فاضل تک انگریزی لنڈن یونیورسٹی سے میٹرکولیشن تک پڑھی مگر اس نصابی تعلیم کی کمی کو میں نے ایک حد تک اکتسابی تعلیم سے پورا کیا۔ میرا اندازہ ہے کہ میں نے کم و بیش تین ہزار کتابیں اردو فارسی انگریزی کی حرف بحرف پڑھی ہوں گی اور تقریباً اتنی ہی کتابوں کا جزوی طور پر مطالعہ کیا ہوگا۔ مختلف رسائل بھی ہزاروں کی تعداد میں نظر سے گزرے ہونگے۔ حوالے کی کتابوں کی ورق گردانی تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ کاروبار کے علاوہ ہر روز تقریباً دس گھنٹے پڑھنے لکھنے کی نذر ہوتے ہیں۔

مشاعروں اور اجتماعوں سے گھبراتا ہوں۔ اگر محفل چند ہی افراد پر مشتمل ہو تو لطف اندوز ہوتا ہوں اور اس میں کچھ کہہ سن بھی لیتا ہوں۔ نام و نمود سے کوئی غرض نہیں۔ گوشہ نشینی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ کام بہت ہوتا ہے اور ڈھنگ کا ہوتا ہے۔ پروپگنڈہ کبھی میرا شعار نہیں رہا۔ پرماتما کی مہربانی سے مالی حالت اطمینان بخش ہے مگر میں نے مال و متاع کو کبھی اپنا نام اچھالنے کیلئے استعمال نہیں کیا۔ دس تصانیف اب تک منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں اکثر پر انعام بھی مل چکا ہے مگر مجھ پر آج تک نہیں کھل سکا کہ کتابوں پر انعام دینے کا طریقہ کیا ہے اور انعام دینے والوں کو یہ کیسے کر معلوم ہوا کہ میری یہ کتاب اول نمبر کی ہے اور وہ کتاب دوسرے درجے کے انعام کے لائق ہے اور یا واقعی میری کوئی کتاب اس لائق بھی تھی کہ اس پر انعام دیا جاتا۔

بہرحال یہ خاک ہمیشہ سے اُڑتی آئی ہے اور ہمیشہ اُڑتی رہے گی۔ ہم میں اجتماعی کام کرنے کی صلاحیت بہت کم ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ آنے والے پچاس برسوں تک بھی اُردو کی عظمت انفرادی طور پر کیئے ہوئے کام ہی کے سہارے باقی رہے گی اجتماعی کام کے سہارے نہیں۔ تصانیف کے نام یہ ہیں :

(۱) شعلۂ خاموش (مجموعہ کلام) ۱۹۶۸ء
(۲) شورشِ پنہاں (مجموعہ کلام) ۱۹۷۰ء
(۳) شاخِ گل (") ۱۹۷۴ء
(۴) اُجالے (") ۱۹۷۵ء
(۵) THE SIELENT FLAME (انگریزی) ۱۹۷۵ء
(۶) مکتوباتِ جوشؔ ملسیانی بنام رضا (نثر) ۱۹۷۶ء
(۷) منشوراتِ جوشؔ ملسیانی (نثر) ۱۹۷۷ء
(۸) ہندوستانی مشرقی افریقہ میں (") ۱۹۷۷ء
(۹) دعاے صباح (فارسی منظوم ترجمۂ غالب) نثر "
(۱۰) متعلقاتِ غالبؔ (") ۱۹۷۸ء

"چکبست اور باقیاتِ چکبست" اس وقت زیرِ طبع ہے۔ جنوری ۱۹۷۹ء تک شائع ہو سکے گی۔ اور بہت سا کام تیار ہے مگر فائنل ایڈیٹ کا منتظر ہے۔ تقریباً اسّی مضامین (بیشتر تحقیقی) لکھے ہوں گے جو مختلف رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ اگر صحت نے اجازت دی تو اگلے آٹھ دس برسوں میں بھلا بُرا بہت سا تحقیقی کام منظرِ عام پر آجائے گا۔

میرا تعلق نکودر (ضلع جالندھر پنجاب) کے مشہور اگروال خاندان سے ہے۔ میرے بزرگ (میری ساتویں پشت ہے) ضلع حصار (ہریانہ) کے ایک گاؤں کھرک پونیاں سے ہجرت کر کے نکودر آ بسے تھے۔ یہاں آ کر بہت عزت اور شہرت پائی۔ امارت میں بھی اور شرافت میں بھی۔ خاندانی پیشہ ساہوکاری تھا۔ مجھے ابھی دو برس پہلے تک اپنی صحیح تاریخ ولادت کا علم نہ تھا مگر پرانے کاغذات سے اصل یادداشت نکل آئی تو معلوم ہوا کہ میرا جنم ۲۵ اگست ۱۹۲۵ء کو پانچ بجے بعد دوپہر ہوا تھا۔

میری شادی نیروبی (مشرقی افریقہ) میں ۴ اگست ۱۹۵۶ء کو ساوتری دیوی سے ہوئی۔[1] میرے خسر سورگیہ لاجپت رائے گپتا ایک مدت سے تنزانیہ کے شہر اروشا میں مقیم تھے۔ میرے دو بچے ہیں۔ لڑکا وِپل اور لڑکی ریتا۔ اس وقت دونوں ہی کالج میں زیرِ تعلیم ہیں۔

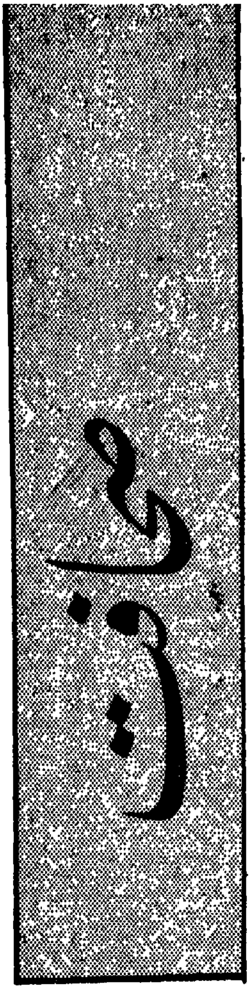
خاندانی پیشہ ساہوکار تھا۔ اب بھی وہی ہے۔ اب اسے ساہوکارہ نہیں بنکنگ کہا جانے لگا ہے۔ چلو یوں ہی سہی۔ ذہن میں بہت کچھ محفوظ ہے۔ چند برسوں میں سب لکھ ڈالوں گا۔ شاید اب یہی مناسب ہو گا۔ دل بھی یہی کہتا ہے ؎

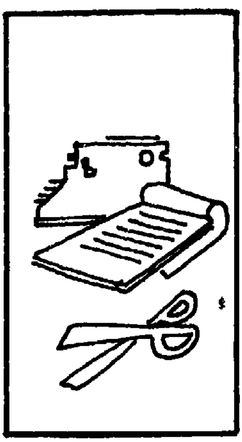
ہے عمرِ اخیر اور نہ دیکھو بھالو
آنکھوں میں ہیں جو خواب انھیں کو پالو
جی کھولو، قلم ہاتھ میں لو، الٹو ورق
محفوظ ہے جو ذہن میں سب لکھ ڈالو

---

[1] استاذی قبلہ جوش ملسیانی مرحوم نے میری شادی پر یہ قطعہ لکھ کر بھیجا تھا ؎

ڈاک نے مجھ کو سنایا مژدہ
ہونے والی ہے رضا کی شادی
کالے کوسوں کا سفر ہے اے جوش
بھیج دو خط میں مبارک بادی







نیاز فتح پوری

"...... دُنیا کے وہ عناصر جن پر زندگی کا انحصار ہے، چار ہیں۔ آب، آتش، خاک، باد ــــ اور اگر ان میں سے کوئی ایک بھی آپ کا دشمن ہو جائے، تو زندہ رہنے کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن یاد رکھیے، کرمیں نے ان چاروں عناصر کی شدید گرفت میں آجانے کے بعد بھی ان کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوا ...."

آپ نے کہنے کو تو کہہ دیا کہ "اپنی سرگزشت لکھ کر بھیج دو" لیکن آپ کو کیا خبر کہ اس کی تعمیل "جوئے شیر" لانے سے کم نہیں۔ معلوم نہیں غریب فرہاد، خسرو کی فرمائش کی تعمیل کر سکا تھا یا نہیں لیکن میں قطعاً معذور ہوں۔

میری عمر اس وقت ۸۰ سال کی ہے اور پانچ سال کی عمر سے لے کر اس وقت تک ۷۵ سال کے تمام واقعات میرے ذہن میں محفوظ ہیں اس لیئے اگر اس پون صدی کے دنوں کا شمار کیا جائے جو ۲۷۳۷۵ ہوتے ہیں اور ہر دن کے لیئے اوسطاً میں صرف ایک سطر لکھنے پر قناعت کروں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ۱۵ سطر کے مسطر پر میں نے ۲۵۰۰ صفحات کی کتاب لکھ دی۔ حالانکہ میں نے اپنی زندگی کے کچھ دن ایسے بھی گزارے ہیں کہ ان کا ایک ایک لمحہ پوری "داستانِ ہوشربا" ہے اور "شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں" تو پوری "تاریخ ظلمات" ہے۔ پھر بتایئے کہ یہ سب کچھ لکھنے کے لیئے "کہاں سے جگر آئے"۔ لیکن چونکہ طفیل صاحب کا اصرار بھی قضائے مبرم سے کم نہیں اس لیئے سرگزشت تو خیر کیا اپنی سخت جانی کے چند واقعات سنا کر اس مصیبت کو ٹالنے کی کوشش کرتا ہوں۔

دنیا میں غالباً کوئی ایسا شخص نہیں جو کسی نہ کسی حادثہ سے دوچار نہ ہوا ہو۔ حادثہ سے میری مراد اعزہ و اقربا کی موت نہیں کیونکہ اول تو موت کوئی حادثہ نہیں زندگی کا انجام ہے (اور اگر ہو بھی تو یاد رکھیئے کہ اس وقت تک میں دو سو سے زیادہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو سپردِ خاک کر چکا ہوں۔) بلکہ حادثہ سے مراد وہ آفاتِ ارضی و سماوی ہیں جو خلافِ توقع بالکل اچانک سامنے آ جاتے ہیں اور ان کا نتیجہ اکثر و بیشتر موت ہی ہوا کرتا ہے۔ پھر اگر میں یہ کہوں کہ حوادثِ اربعہ عناصر کی کوئی صورت ایسی نہیں جو مجھے پیش نہ آئی ہو تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ مجھ سا سخت جان، مجھ سا خوش نصیب انسان کوئی اور مشکل ہی سے آپ کو نظر آئے گا۔

دنیا کے وہ عناصر جن پر انسانی زندگی کا انحصار ہے، چار ہیں:۔ آب، آتش، خاک، باد اور اگر ان میں سے کوئی ایک بھی آپ کا دشمن ہو جائے تو زندہ رہنے کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن یاد رکھیئے کہ میں نے ان چاروں عناصر کی شدید گرفت میں آ جانے کے بعد بھی ان کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوا۔

(۱) طالب علمی کا زمانہ ہے اور میں اپنے وطن فتحپور میں ہوں، عمر بارہ سال کی ہے اور سنہ ۱۸۹۶ء۔ ہر جمعہ کی صبح کو چند ساتھیوں کے ساتھ آبادی سے باہر نکل کر دن بھر باغ و صحرا میں چکر لگانا، زندگی کا معمول ہے۔ ایک مرتبہ بارش کے زمانے میں ہم سب ایک باغ میں جمع ہیں اور فکر یہ ہے کہ صرف آموں سے پیٹ بھریں۔ چونکہ یہ باغ میرا ہی تھا اس لیئے سوال سرقہ کا بھی نہ تھا۔ آم کا ایک درخت وسیع پختہ کنوئیں کے کنارے واقع تھا۔ اسی پر سب چڑھ گئے اور آم توڑنے میں مصروف ہو گئے۔ دفعتاً پورب کی طرف سے ایک سیاہ آندھی اٹھی اور آناً فاناً اتنی تاریکی ہو گئی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ اسی کے ساتھ ہوا کی تیزی کا یہ عالم ہو گیا کہ درخت جس پر ہم لوگ سوار تھے پرِ کاہ کی طرح ہلنے لگا اور اس کی شاخیں چرچر کرنے لگیں۔ کچھ خبر نہ تھی کہ ہم لوگ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ ہوش و حواس، بصارت و آواز سب گم۔ چند منٹ نہ گزرے تھے کہ شاخیں ایسی چرچراہٹ کے ساتھ

جیسے کوئی مہیب دیو چیخ رہا ہو ایک ایک کر کے زمین پر آ رہیں۔ اتفاق سے وہ شاخ جس پر میں بیٹھا ہوا تھا کنوئیں پر گری اور بجائے اس کے کہ زمین سے ٹکرا کر میرا پاش پاش ہو جاتا، میں کنوئیں کے خلا میں لٹک گیا۔ کنواں کافی گہرا تھا اور اگر شاخ میرے ہاتھ سے چھوٹ جاتی تو میں یقیناً ڈوب جاتا، لیکن میں نے اپنے حواس بجا رکھے (آندھی بھی اب گذر گئی تھی) اور پھر شاخ پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ تو پاؤں اب بھی پانی کی سطح کو چھو رہے تھے۔ کافی دیر کے بعد لوگ ہماری تلاش میں نکلے اور جب انہوں نے مجھے کنوئیں سے باہر نکالا تو میں نے دیکھا کہ میرے تمام ساتھی شاخوں میں الجھ کر ختم ہو چکے تھے۔

(۲) رامپور میں ہوں، میرے والد بھی پنشن لینے کے بعد وہیں وکالت کر رہے ہیں اور مولانا وزیر محمد خاں سے فلسفہ و الٰہیات پڑھ رہا ہوں۔ یہ بات ۱۸۹۸ء کی ہے۔ مولانا مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور رات کو بھی میں انہی کے مکان کے بیرونی کمرہ میں سوتا تھا کیونکہ میں صبح زیادہ دیر میں اٹھنے کا عادی تھا اور والد مرحوم بہت صبح تہجد کے وقت بیدار ہو کر سب کو جگا دیتے تھے۔

میرا معمول تھا کہ رات کو سونے سے قبل کم از کم دو گھنٹہ ضرور مطالعہ کتب میں صرف کرتا۔ جاڑوں کا زمانہ تھا کہ ایک رات میں کتاب دیکھتے دیکھتے سو گیا اور چراغ گل نہ کر سکا (اس وقت بجلی کیا لالٹین کا رواج بھی کم تھا) رامپور میں سردی زیادہ ہوتی ہے اس لیئے دو دو رضائیاں ملا کر مجھے اوڑھنا پڑتی تھیں، انہی میں لپٹ کر غافل سو گیا۔ کمرہ میں میرے سوا کوئی نہ تھا۔ صبح تین بجے دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ دم گھٹ رہا ہے اور گھبرا کر آنکھ کھولی تو دیکھا کہ سارے کمرہ میں دھواں بھرا ہوا ہے۔ میرا بستر، میری رضائیاں اور تکیے نصف جل چکے ہیں اور میرے جسم کے کپڑے بھی سلگ رہے ہیں۔ معلوم نہیں کس وقت چراغ کی بتی بستر پر آ گری اور کپڑوں نے آگ پکڑ لی۔ چونکہ کمرہ چاروں طرف سے بند تھا اور ہوا کے گزرنے کی کوئی صورت نہ تھی اس لیئے آگ شعلہ نہ بن سکی اور میں بالکل محفوظ رہا۔

(۳) اب سے پورے ۶۳ سال قبل (۱۹۰۰ء) کا ذکر ہے۔ میں مرادآباد کے پولیس ٹریننگ اسکول میں ٹریننگ پا رہا ہوں اور معمولاً ہر تعطیل میں رامپور اپنے والد کے پاس چلا جاتا ہوں۔ زیادہ تر ریل سے اور کم تر تانگے پر۔ رامپور اور مرادآباد کا فاصلہ بہت کم ہے زیادہ سے زیادہ چودہ میل اور ان دونوں شہروں کے درمیان سڑک کا راستہ بڑا آباد رہتا تھا۔ تانگے، یکے، بیل گاڑیاں وغیرہ بھی چلتے تھے۔ مرادآباد دریائے رام گنگا پر واقع ہے اور رامپور دریائے کوسی پر اور یہ دونوں بارش کے زمانے میں بہت پرشور اور خطرناک ہو جاتے ہیں اس لیئے اس زمانہ میں کشتیوں کے ذریعہ سے ان کو عبور کرنا خطرہ سے خالی نہیں ہوتا، تاہم جانے والے جاتے ہی تھے۔ علی الخصوص غلہ وغیرہ تو عموماً کشتیوں ہی پر پار ہوتا تھا۔

جب جولائی ۱۹۰۰ء میں اسکول ایک ہفتہ کے لیئے بند ہوا تو معمولاً میں نے رام پور جانے کا قصد کیا۔ میرے ساتھیوں میں چند ایسے بھی تھے جنہیں رام پور سے ۳۰ میل اور آگے بریلی جانا تھا اور ریل پر جانا تھا۔ انہوں نے اصرار کیا کہ میں بھی ان کے ساتھ بریلی چلوں لیکن میں نے انکار کر دیا اور دفعتاً یہ خیال پیدا ہوا کہ اس مرتبہ کیوں نہ ریل کی جگہ یہ سفر تانگے پر کیا جائے۔ اس سال بارش غیر معمولی طور پر بہت زیادہ ہوئی تھی اور رام گنگا کی طغیانی نے کشتی کے سفر کو بہت خطرناک بنا دیا تھا۔ لوگوں نے مجھے سمجھایا بھی کہ یہ ارادہ ترک کر دوں لیکن میں نہیں مانا۔ کیونکہ میری فطرت شروع ہی سے ایسی تھی کہ جب امن و خطرہ کی دونوں راہیں میرے سامنے ہوتی تھیں تو میں ہمیشہ خطرہ کی راہ اختیار کرتا تھا اور آخر کار میں نے فیصلہ کر لیا کہ رام گنگا کو کشتی ہی پر عبور کروں گا۔

اس وقت رام گنگا کا یہ عالم تھا کہ حدِ نظر تک پانی ہی پانی نظر آتا تھا اور اس کی پُرشور اونچی اونچی لہریں سمندر کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ یوں تو ساحل پر متعدد کشتیاں رہتی تھیں لیکن بارش کے زمانہ میں صرف باربرداری کی بڑی کشتیاں کام کرتی تھیں اور دن میں صرف ایک بار آتی جاتی تھیں۔

میں صبح آٹھ بجے ساحل کو عبور کرنے کشتی کے ایک کونہ میں بیٹھ گیا اور وہ چل پڑی۔ معلوم ہوا کہ کم از کم چار گھنٹے اس کے دوسرے کنارہ تک پہنچنے میں لگیں گے۔ اس وقت دریا کا پاٹ ایک میل سے کم نہ تھا اور حالت یہ تھی کہ کشتی جتنی آگے بڑھتی جاتی تھی پانی کی زبردست لہریں اٹھ اٹھ کر اسے پیچھے دھکیل دیتی تھیں اور وہ کانپ کانپ کر رہ جاتی تھیں۔ خدا خدا کر کے دوپہر تک وہ وسط دریا میں پہنچی جہاں اس کے دھاروں کا پورا زور تھا لیکن شومئی قسمت کہ ٹھیک اسی وقت کشتی کی تہ میں ایک بڑا سوراخ پیدا ہو گیا اور ایک بلند فوارہ پانی کا اچھلنے لگا۔ ملاحوں نے انتہائی کوشش کی کہ یہ سوراخ کسی ترکیب سے بند ہو جائے لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے اور اب اس کے سوا کوئی دوسری صورت باقی نہ رہی کہ جو پانی کشتی میں آ رہا ہے اسے اُلیچ اُلیچ کر باہر پھینکتے رہیں۔ چونکہ خطرہ جان کا تھا اس لئے سبھی مسافر اس کام میں لگ گئے لیکن پانی اتنی تیزی سے اندر آ رہا تھا کہ اس کا مقابلہ ممکن نہ تھا۔ آخر کار رفتہ رفتہ پانی اتنا بڑھا کہ غلّے کے بورے سب نصف ڈوب گئے اور جو جانور کشتی میں کھڑے تھے پانی ان کے گھٹنوں تک پہنچ گیا۔ مسافروں کی پریشانی، عورتوں کی گریہ وزاری، بچوں کی چیخ و پکار نے قیامت برپا کر رکھی تھی اور میں بھی ایک کونہ میں بیٹھا ہوا اپنی حماقت پر افسوس کر رہا تھا۔

کشتی کی رفتار اب بہت سست ہو گئی تھی کیونکہ اس پر پانی کا وزن بھی بڑھتا جاتا تھا اور چپوؤں سے کام لینا بھی ملاحوں کے لیے ممکن نہ تھا۔ تاہم چونکہ ہوا کا رُخ موافق تھا اس لیے وہ آہستہ آہستہ آگے سرکتی جا رہی تھی۔

رام گنگا کے بعض دھارے تو بیچ میں تھے لیکن ایک سب سے زیادہ خطرناک دھارا مشرقی ساحل کے قریب تھا اور اب کشتی کا رُخ اسی طرف تھا۔ ——— لوگوں کو بالکل یقین تھا کہ کشتی اس دھارے سے صحیح و سلامت نہ گزر سکے گی اور اس یقین کے تحت سراسیمگی کا جو عالم ہونا چاہیئے وہ انتہائی نقطہ تک پہنچ گیا تھا اور چیخ پکار، ہائے وائے نے طوفان کے شور کو بھی دبا دیا تھا۔

مجھے کیا سبھی کو یقین تھا کہ بچنے کی اب کوئی صورت باقی نہیں اور فرطِ مایوسی سے ہر شخص نڈھال تھا۔ میں نے سوچا کہ جان تو جاتی ہی ہے کیوں نہ کوئی آخری کوشش جان بچانے کی کی جائے۔ میں سمجھتا تھا کہ جس وقت کشتی مشرقی دھارے پر پہنچے گی تو یقیناً ڈوب جائے گی اس لئے میں نے مسافروں سے کہا کہ جان بچنے کی صورت اگر کوئی ہے تو صرف یہ کہ جو لوگ پیرنا جانتے ہیں وہ اپنے آپ کو دریا میں ڈال دیں اور ساحل تک کا فاصلہ (جو ۱۰۰ گز سے کم نہ تھا) پیر کر عبور کریں۔ یہ کہہ کر میں نے پانی میں چھلانگ ماری اور میرے ساتھ دس بارہ آدمیوں نے اور بھی۔ میرا یہ فعل یقیناً خودکشی کے مترادف تھا لیکن اس کے سوا کوئی دوسری صورت مفر کی تھی بھی نہیں۔

جس وقت میں پانی میں کودا تو ایک لہر مجھے سیدھی تہ تک لے گئی لیکن چونکہ میں فنِ شناوری سے واقف تھا اور زمانہ بھی عنفوانِ شباب کا تھا اس لیئے میں ہاتھ پاؤں چلا کر اُبھرا اور موجوں سے لڑتا بھڑتا ساحل کی طرف بڑھا۔ چیخ و پکار کی آواز اب بھی میرے کانوں میں آ رہی تھی۔ لیکن پھر مڑ کر میں نے کشتی کو مع اس کے مسافروں کے نگل چکا تھا اور کچھ نظر نہ آیا۔

(۴) ۱۹۰۹ء میں میرا تعلق ریاست باؤنی کدورہ (بندھیل کھنڈ) سے ہوگیا تھا۔ نواب ریاض الحسن خاں کا عہد حکومت تھا۔ اس وقت میرے بہنوئی محمد سلیمان خاں موددہا (ضلع ہمیرپور) کے تھانہ میں مامور تھے اور میں ہر پندرھویں دن اپنی بہن کو دیکھنے وہاں چلا جاتا تھا۔ فاصلہ صرف دس بارہ میل کا تھا جسے میں گھوڑے پر طے کرتا تھا۔ یہ سفر میری انتہائی تفریح کا ہوتا تھا کیونکہ بالعموم میں شام کو چلتا تھا اور راستہ کے سنسان جنگلوں کو طے کرتا ہوا رات کو ۹ بجے موددہا پہنچتا تھا۔ گھوڑے کی سواری کا مجھے بڑا شوق تھا اور جب اس کا موقع نہ ہوتا تھا تو پھر میں پیدل سفر کرتا تھا۔ چنانچہ میری عمر کا وہ حصہ جو بندھیل کھنڈ میں بسر ہوا یا تو گھوڑے کی سواری کے لیئے وقف تھا یا پیدل چلنے کے لیئے اور اسی سلسلے میں جن جن مصائب سے دوچار ہونا پڑا وہ ایک علیحدہ مستقل داستان ہے جس کے چھیڑنے کا یہ موقع نہیں۔ اس وقت تو صرف اس حادثہ کا ذکر سن لیجیئے جو ایک بار کدورہ سے موددہا جاتے ہوئے پیش آیا۔

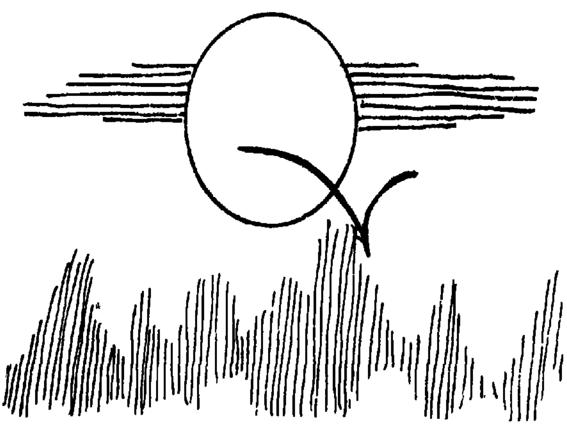
میں شام کو کدورہ سے چلا لیکن ذرا دیر سے، اس لیئے جب میں جاگیر بیری کے قریب پہنچا جو کدورہ سے صرف تین میل دور تھی تو آفتاب غروب ہو چکا تھا اور رات کا دھندلکا شروع ہو گیا تھا۔ جاگیر بیری ایک اونچی پہاڑی پر دریا کے کنارے واقع ہے اور موددہا جانے کے لیئے اس دریا کو عبور کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس دریا کے دونوں کناروں پر دور دور تک ریت پھیلی ہوئی ہے اور میں ریت کے اس حصہ کو معمولاً پیدل طے کرتا تھا تاکہ گھوڑے پر زیادہ بوجھ نہ پڑے لیکن اس مرتبہ دیر ہو جانے کی وجہ سے میں گھوڑے ہی پر سوار رہا اور اس کو تیز تیز چلانے لگا۔

اس دریا کے متعلق مشہور تھا کہ اس کے کناروں پر کہیں کہیں چور بالو بھی پائی جاتی ہے۔ چور بالو سے مراد وہ رتیلا حصہ ہے جو بظاہر صاف و مسطح نظر آتا ہے لیکن پانی کی سطح سے قریب تر ہونے کی وجہ سے بڑا خطرناک ہوتا ہے اور اس پر پاؤں رکھتے ہی آدمی ہو یا جانور اندر دھنسنے لگتا ہے۔ میں نے بارہا اس دریا اور اس کے ریگستانی حصہ کو طے کیا لیکن کبھی چور بالو سے واسطہ نہیں پڑا۔ اس مرتبہ چونکہ مجھے جلدی تھی اس لیئے معمولی راستہ سے ہٹ کر میں نے مختصر راستہ اختیار کرنا چاہا اور گھوڑے کو اسی طرف ڈال دیا۔ تھوڑی دور چل کر مجھے ایک رتیلی تنگنائے ملی اور میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی تاکہ وہ اس کو پھاند کر گزر جائے۔ میں تاریکی میں اس کی چوڑائی کا صحیح اندازہ نہ کر سکا تھا، زیادہ سے زیادہ میں اسے تین گز سمجھتا تھا حالانکہ وہ چھ گز سے کم نہ تھا۔ پھر میرے ایڑ لگانے پر گھوڑے نے جست تو کی لیکن وہ اس فاصلہ کو عبور نہ کر سکا اور اس کے اگلے پاؤں رتیلے حصہ کے اندر ہی رہے۔ خیر یہ تو کوئی بات ایسی نہ تھی کہ میں اس پر دھیان دھرتا لیکن جب اس کے بعد دفعتاً گھوڑا اندر دھنسنے لگا تو مجھے پتہ چلا کہ میں چور بالو میں پھنس گیا ہوں۔ چور بالو سے جان بچانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ اس سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں نہ مارے جائیں (کیونکہ اس طرح آدمی اور اندر دھنستا چلا جاتا ہے) بلکہ اپنے آپ کو بالو پر چت یا پیٹ ڈال دیا جائے۔ اگر میں گھوڑے پر سوار نہ ہوتا تو بیشک اس ترکیب پر عمل کر سکتا تھا لیکن اب کہ گھوڑا سینہ تک دھنس چکا تھا اور میں بھی اس کے ساتھ گھٹنوں گھٹنوں بالو کے اندر غرق تھا، کیونکر اس پر عمل کر سکتا تھا۔ غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ گھوڑے کو بچانا تو ممکن نہیں اس لیئے اس کے ساتھ اپنی جان کیوں گنوائی جائے۔ میں نے آہستہ آہستہ اپنے دونوں پاؤں رکاب سے نکال کر اوپر لٹکا لیے اور فوراً چور بالو پر بے حس و حرکت لیٹ گیا لیکن لگام بدستور اپنے ہاتھ میں رہنے دی۔

کہ ممکن ہے اس کے جھٹکا دینے سے گھوڑا کسی وقت اوپر آجائے۔ اتفاق کی بات کہ اسی وقت بیری کے دو راجپوت گھر لوٹتے وقت میرے پاس سے گزرے اور میں نے انہیں آواز دی۔ وہ غریب دونوں دوڑتے ہوئے آئے اور انہوں نے اپنی پگڑی کھول کر اس کا ایک سرا میری طرف پھینکا۔ اسے مضبوط پکڑلوں اور جب میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑلیا تو انہوں نے مجھے آہستہ آہستہ گھسیٹنا شروع کیا اور میں اس جوہڑ یا لو سے نکل گیا۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ گھوڑے کو کیونکر نکالا جائے، سو اس کے لئے انہوں نے یہ ترکیب نکالی کہ پگڑی کا ایک سرا پھندا بنا کر اس کی گردن میں ڈالا اور دوسرا سرا پکڑ کر قریب ہی ایک اونچی جگہ پہنچ کر لگام کو جھٹکا دینے لگا۔ گھوڑا تھک کر اس قدر بے جان ہوگیا تھا کہ اس جھٹکے سے بھی اس کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی اور آخرکار وہ دھنستے دھنستے غائب ہوگیا۔

خیر گھوڑے کی جان جانے کا صدمہ تو مجھے ہونا ہی تھا لیکن اب یہ فکر لاحق تھی کہ دس میل کا صحرائی راستہ کیونکر رات کو طے کیا جائے، اس لئے مجبوراً مجھے یہ سفر ملتوی کرنا پڑا اور رات بھر بیری ہی میں بسر کرنے کے بعد صبح کو کدورہ پہنچا اور ساری سرگزشت نواب صاحب کو سنائی اور وہ حسب معمول صرف مسکرا کر رہ گئے۔

یہ تھے میری زندگی کے وہ چار حادثے جن کا تعلق صرف اربعہ عناصر سے تھا لیکن اس سے ہٹ کر میں کن کن خطروں سے گزرا ہوں ان کی داستان بہت طویل ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ ایک بار ریلوں کے تصادم میں بھی زخمی ہوا، ڈاکوؤں نے بھی مجھے بارہا گھیر لیا اور شکار کے سلسلہ میں خدا جانے کتنی بار شیر دل نے رحم کھا کر مجھے زندہ چھوڑ دیا۔ ہر چند میں شیر کا شکار کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوا لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ بھی کبھی مجھے اپنا شکار نہیں بنا سکے۔ سب سے آخری واقعہ بھوپال کا ہے جب شیر مجھ سے ایک گز کے فاصلہ پر کامل ایک گھنٹہ تک بیٹھا رہا اور میں گودی (گڑھے) کے اندر چھپا ہوا کپکپاتا رہا۔





شاہد احمد دہلوی

"...... میں اتنی ادبی اور موسیقی کی انجمنوں کا صدر، سکریٹری یا مجلسِ عاملہ کا ممبر رہا ہوں کہ اب ان کی تعداد بھی یاد نہیں۔ گوشہ گیری کے باوجود مجھے اب بھی بخشا نہیں جاتا۔ رانڈیں تو بہتیری بیٹھیں مگر رنڈوے بیٹھنے بھی دیں۔ شاہد احمد دہلوی کو تو نشان کا ہاتھی سمجھا جاتا ہے، یہ بھی اللہ کی مہربانی ہے............."

ضلع بجنور (یو۔پی) کے ایک گمنام سے قصبہ ریہڑ میں غریب مولویوں کے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو شفیق باپ نے پرانے دستور کے مطابق اسے قرآن شریف پڑھایا اور عربی فارسی کی چند ابتدائی کتابیں سبقاً سبقاً پڑھائیں۔ مولویوں کا یہ گھر اتنا غریب تھا کہ اس سے اس بچے کا بار بھی نہ اٹھا سکتا تھا۔ بچہ بے حد ذہین اور پڑھنے کا شوقین تھا۔ باپ نے سوچا کہ دلّی چل کر بچے کو کسی درسگاہ میں داخل کر دیا جائے۔ اس زمانے میں دلّی کی مسجدوں میں پڑھانے کا انتظام بھی ہوتا تھا۔ مولوی صاحب اپنے بچے کو لے کر دلّی پہونچے اور کسی شناسا کی مدد سے بچے کو پنجابی کڑے کی مسجد میں بٹھا دیا۔

یہ واقعہ ۱۸۵۷ء سے چند سال پہلے کا ہے۔ بچے کی عمر اس وقت ہوگی کوئی آٹھ دس سال کی۔ باپ اسے مسجد کے مُلّا کے حوالے کر کے اپنے گھر چلے گئے۔ مسجد ہی میں طالب علم رہتے تھے۔ رہتے کیا خاک تھے، رات کو کسی کونے کھدرے میں یا صحن میں پڑ رہتے۔ مسجد کا مُلّا بڑ بے رحم تھا۔ قمچی سے لڑکوں کی کھال ادھیڑنے میں اُسے بڑا مزہ آتا تھا۔ یہ دیہاتی لڑکا کڑکڑاتے جاڑوں میں اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح ٹاٹ کی صفوں میں لپٹ کر رات کو پڑ رہتا۔ بچہ ہی تھا، کبھی صبح کو آنکھ نہ کھلتی تو مُلّا ایک لات رسید کرتا تو لڑکا لڑھکتا چلا جاتا اور صف بھی بچھ جاتی۔ طالب علموں کے کھانے کا یہ انتظام تھا کہ محلے کے گھروں سے ان کی روٹی بندھی ہوئی تھی طالب علم جاتے اور گھروں سے روٹیاں مانگ لاتے اور جیسی بھی روکھی سوکھی ملتیں اللہ عزیز کر لیتے۔ دیہاتی لڑکے کو جس گھر سے روٹی ملتی تھی وہ ایک جید عالم مولوی عبدالقادر کا گھر تھا۔ مفت کی روٹیاں بھلا مروڑنے کون دیتا ہے؟ مولوی صاحب کی بیوی اس طالب علم سے بازار کا سودا منگواتیں، کوڑی پھرواتیں، گھر کا پانی بھرواتیں اور مسالا پسواتیں۔ ان کی ایک لڑکی پانچ چھ سال کی تھی اسے بہلانا اور کولہے پر چڑھائے چڑھائے پھرنا بھی طالب علم کے ذمے تھا۔ لڑکی بڑی نٹ کھٹ اور چلبلی تھی۔ اگر مسالہ ذرا موٹا رہ جاتا تو اسی بٹے سے لڑکے کا ہاتھ کچل دیتی۔ غریب "سی" کر کے رہ جاتا۔ مگر تعلیم کے شوق میں مُلّا کی لاتیں بھی کھاتا اور لڑکی کی مار بھی سہتا۔ راتوں کو مسجد کے ٹمٹماتے دیے کی روشنی میں پڑھتا۔ جب یہ میسر نہ آتی تو گلی کی لالٹین کے نیچے کتاب لیکر بیٹھ جاتا اور اپنی آنکھوں کا تیل نکالتا رہتا۔ دو ایک سال یوں گذرے۔ پھر اتفاق سے دلّی کالج کی طرف گذر ہوا تو دیکھا کہ داخلہ ہو رہا ہے۔ ایک صاحب بہادر بیٹھے ہیں اور ان کے ساتھ کالج کے استاد بھی بیٹھے ہیں۔ لڑکوں کا باری باری زبانی امتحان لے رہے ہیں اور پاس فیل کر رہے ہیں۔ یہ کم عمر طالب علم بھی ہجوم میں گھس کر آگے بڑھنے لگا کہ کسی نے دھکا جو دیا تو گر پڑا اور رونے لگا۔ صاحب نے جو اسے روتے دیکھا تو چمکار کر اپنے پاس بُلا لیا۔ پوچھا "تم کیا چاہتے ہو؟" لڑکے نے کہا "میں بھی کالج میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔" صاحب نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا اور بولے "تم ابھی چھوٹے ہو۔ یہاں کی کتابیں نہیں پڑھ سکو گے۔" لڑکے نے کہا "میرا بھی امتحان لے لیا جائے۔" صاحب نے ایک کتاب میز پر سے اُٹھا کر دے دی۔ کہا "اسے کہیں سے پڑھو۔" لڑکے نے کتاب کھول کر فر فر پڑھنا شروع کر دیا۔ سب حیران ہوئے۔ صاحب نے پاس بیٹھے ہوئے مولانا کی طرف دیکھا۔ مولانا نے ایک اور کتاب آگے بڑھا دی۔ لڑکے نے اس میں سے بھی بے جھجک پڑھنا شروع کر دیا۔ سب بہت خوش ہوئے

اور لڑکا دلی کالج میں داخل ہوگیا۔ شوق اور ذہانت کے پر لگا کر لڑکا اڑا اور کالج کی ساری منزلیں طے کرگیا۔ پھر مدرس بنا، انسپکٹر بنا اور ترقی کرکے ڈپٹی کلکٹر بن گیا۔ اسی اثنا میں مولوی عبدالقادر صاحب نے دیکھ لیا کہ لڑکا ہونہار ہے۔ اپنی لڑکی سے اس کی شادی کردی۔ یہ وہی لڑکی تھی جو اس لڑکے کا کولہا توڑا کرتی اور مرچوں بھرے بٹے سے اس کا ہاتھ کچل دیا کرتی تھی۔

ملازمت ہی کے زمانے میں ان صاحب نے کتابیں لکھیں جو اپنی مقبولیت کے سبب ان کی شہرت و عزت کا باعث ہوگئیں۔ سر سالار جنگ اس زمانے میں حیدرآباد دکن میں اعلیٰ قابلیت کے لوگوں کو شمالی ہند سے بلا بلا کر بڑے بڑے عہدوں پر مامور کر رہے تھے۔ ان صاحب کو بھی دگنی تگنی تنخواہ پر انہوں نے بلا لیا اور اس ریاست میں بھی انہوں نے اپنی عمدہ کارگزاری سے بلند ترین رتبہ حاصل کیا۔ چند سال بعد جب دکن سے وظیفہ لے کر دلی آئے تو لکھ پتی تھے اور علم و فضل کے آسمان پر سورج بن کر چمک رہے تھے۔

آپ سمجھے بھی یہ کون بزرگ تھے؟ یہ تھے خان بہادر شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد ایل ایل ڈی۔ ڈی او ایل۔ جن کی کتابیں "مراۃ العروس" "توبۃ النصوح" وغیرہ اور جن کا ترجمۂ قرآن رہتی دنیا تک باقی رہیں گے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ہاں لڑکیاں تو کئی ہوئیں مگر لڑکا صرف ایک ہی ہوا جس کا نام انہوں نے بشیر الدین احمد رکھا۔ میاں بشیر انگریزی محاورہ کے مطابق چاندی کا چمچہ منہ میں لیے پیدا ہوئے۔ دونوں ماں باپ ان پر پروانہ وار نثار تھے۔ ابتدا میں ڈپٹی صاحب ہی نے انہیں عربی اور فارسی پڑھائی۔ اردو میں بچوں کے لیے مناسب کتابیں نہیں تھیں اس لیے شفیق باپ نے بیٹیوں کے لیے مراۃ العروس لکھی اور بیٹے کے لیے منتخب الحکایات۔ حسن اتفاق سے محکمہ تعلیمات کا ایک بڑا انگریز افسر دورہ کرتا ڈپٹی صاحب کی طرف آ نکلا۔ اس نے میاں بشیر سے پوچھا "کیوں میاں کیا پڑھتے ہو؟" میاں بشیر لپک کر اپنی کتاب اٹھا لائے۔ صاحب نے کتاب کو کہیں کہیں سے پڑھا۔ میاں بشیر نے کہا "آپا کی کتاب بھی لاؤں؟" صاحب نے کہا "ہاں لاؤ" میاں بشیر نے مراۃ العروس کا مسودہ بھی لا کر صاحب کو دے دیا۔ اسے بھی صاحب نے جستہ جستہ دیکھا۔ اتنے میں ڈپٹی صاحب بھی آگئے۔ صاحب نے کہا "مولوی صاحب آپ نے ایسی عمدہ کتابیں لکھی ہیں انہیں چھپوا دیجیے تاکہ دوسروں کو ان سے فائدہ پہنچے۔" بعد میں یہ کتابیں چھپیں اور حکومت نے ان پر انعام دیئے۔ اور یہ کتابیں لاکھوں کی تعداد میں اب تک چھپ چکی ہیں۔

جب میاں بشیر نے میٹرک پاس کیا تو ڈپٹی صاحب دکن سے پنشن پا چکے تھے۔ میاں بشیر نے آگے پڑھنا چاہا اور حیدرآباد جا کر ملازم ہوگئے۔ لڑکپن ہی میں ان کی شادی دلی کے ایک رئیس خاندان میں ہوگئی۔ دس بارہ سال گزر گئے مگر ان کے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔ خاندان کی عورتوں میں چر مم چہ غم ہونے لگی۔ شدہ شدہ بات ڈپٹی صاحب تک بھی پہونچی۔ وہ خود میاں بشیر کی بے اولادی سے افسردہ تھے۔ بہو کے علاج بھی ہوئے مگر معلوم ہوا کہ ان بہو سے اولاد نہیں ہوگی۔ ہار کے میاں بشیر سے دوسری شادی کے لیے کہا گیا۔ میاں بشیر نکاح ثانی کے لیے راضی نہ ہوتے تھے۔ انہیں اپنی بیوی سے محبت تھی۔ بھلا اس کے سینے پر مونگ دلنے کے لیے سوکن کو کیوں لا بٹھاتے؟ کچھ عرصہ اور گزر گیا تو ڈپٹی صاحب نے خود بیٹے کو سمجھایا اور شرعی مسائل سے بھی قائل کیا۔ سنگ آمد و سخت آمد، باپ کا کہنا ٹل نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا بادلِ نخواستہ سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ دلی کے غریب سیدوں کے ایک خاندان کی دبی دبائی لڑکی مل گئی۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ ہوگیا۔ میاں بشیر ان چھوٹی بیگم کو اپنے والدین کے پاس دلی میں چھوڑ کر دکن اپنی ملازمت پر چلے گئے۔ وہاں اُن کے ساتھ بڑی بیگم رہتی تھیں۔ چھوٹی بیگم

سسرال میں چھوٹی دلہن کہلائیں۔ انہوں نے ساس اور خسر کی اوّل دن ہی سے ایسی خدمت کی کہ دونوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔ میاں بشیر جوگی کا سا پھیرا دلّی کا لگا جاتے۔ دس سال بیت گئے۔ چھوٹی دلہن کی کوکھ بھی ہری نہ ہوئی۔ اب تو بڑی دلہن کی بن آئی۔ طعنوں تشنوں سے انہوں نے سسرال والوں کے دلوں پہ ناسور ڈال دیئے۔ پھر اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ چھوٹی دلہن کا پیر بھاری ہو گیا۔ اب تو سارے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور چھوٹی دلہن کی بڑی اللہ آمین ہونے لگی۔ بڑی دلہن کوئیوں پر لوٹ گئیں اور کوئی بہتان ایسا نہ تھا جو انہوں نے چھوٹی دلہن پر نہ تراشا ہو۔ مگر غریب سیدانی نے صبر کیا اور منہ سے اُف تک نہ کی۔ نویں مہینے اللہ نے چاند سا بیٹا دیا۔ اندھیرے سے گھر میں اس چراغ سے روشنی پھیلی اور بڑی دھوم سے اس کی خوشی منائی گئی۔ بھلا ڈپٹی صاحب کے ہوتے کسی اور کی کیا چلتی؛ میاں بشیر کی بے رخی بھی ختم ہوئی اور چھوٹی بیگم سے بھی التفات کرنے لگے۔ ڈپٹی صاحب نے بچے کا نام مُنذر احمد رکھا۔ چھوٹی دلہن دلّی ہی میں سسرال میں رہیں۔ بڑی دلہن کا زور ابھی نہیں ٹوٹا تھا۔ وہ میاں کے ساتھ حیدرآباد میں رہتی رہیں۔ بچہ یہاں دادا دادی کی آنکھ کا تارا اور سارے خاندان کا دلارا بنا رہا۔

ماں کی ممتا تو ہوتی ہی ہے، باپ کی بھی ممتا ہوتی ہے۔ میاں بشیر اب کے جو دلّی آئے تو گلگوتھنا سا بچہ دیکھ کر ان کی ممتا نے جوش مارا۔ جب دکن واپس جانے کو ہوئے تو اماں کے ذریعہ ابّا سے اجازت چاہی کہ چھوٹی دلہن کو بھی اپنے ساتھ لیتے جائیں۔ انہیں کیا عذر ہوتا، بخوشی اجازت دے دی۔ چھوٹی دلہن جب حیدرآباد پہنچیں تو بڑی دلہن کو ان کے ساتھ رہنا گوارا نہ ہوا۔ وہ اپنے میکے سدھاریں۔ سوا سال ڈیڑھ سال بعد چھوٹی دلہن کے ہاں دکن ہی میں ایک اور لڑکا پیدا ہوا۔ ڈپٹی صاحب نے نام مبشر احمد رکھا۔ جب تیسرے بچے کے آثار ظاہر ہوئے تو چھوٹی دلہن دلّی آگئیں اور بڑی دلہن حیدرآباد چلی گئیں۔ تیسرا بچہ جب (۲۲ مئی ۱۹۰۶ء) پیدا ہوا تو ڈپٹی صاحب نے نام شاہد احمد تجویز کیا۔ وہ شاہد احمد ہی خاکسار ہے جو آپ کو آج آپ بیتی سنا رہا ہے۔

تین سال تک کی مجھے کوئی بات یاد نہیں ہے۔ ہاں چار سال کے بعد کی بہت سی باتیں یاد ہیں۔ مجھے یہ یاد ہے کہ چار سال کی عمر میں میری آنکھیں اتنی بری طرح دُکھنے آئیں کہ میں اُجالے میں آنکھیں کھول ہی نہیں سکتا تھا۔ اور ان میں جب دوا لگائی جاتی تو ایسی مرچیں لگتی تھیں کہ میں چیخیں مارنے لگتا تھا۔ یہ واقعہ بھی انہی دنوں کا ہے کہ ہم اوپر چھت پر کھیل رہے تھے۔ نیچے گراموفون بجنا شروع ہوا۔ سب بچے گدا گد گدا گد نیچے بھاگے۔ ایک سات آٹھ سال کی بچی جو مجھ پر نوکر تھی مجھے گود میں اٹھا کر نیچے لے چلی۔ جب وہ زینے اترنے لگی تو میں "جلدی چل جلدی چل" کہہ کر اس کی گود میں اچھلنے لگا۔ جلدی میں اس کا پاؤں جو پھسلا تو دونوں کوئی بیس سیڑھیوں پر سے لڑھکتے ہوئے صحن میں آپڑے۔ میری اماں "ہے ہے میرا بچہ" کہہ کر ننگے پاؤں سر بھاگیں۔ انہوں نے مجھے گود میں اٹھایا تو میرے سر سے خون کا فوارہ جاری تھا۔ ابّا مجھے فوراً لے کر ڈاکٹر کے پاس بھاگے۔ سر کے پچھلے حصے میں زخم تھا۔ ڈاکٹر نے سات ٹانکے لگائے۔ ڈیڑھ انچ لمبا زخم کا نشان اب بھی باقی ہے۔

اماں کا غمناک چہرہ آج بھی میری آنکھوں میں پھرتا ہے۔ اماں بڑی سنجیدہ خاتون تھیں۔ مجھے ان کا ہنسنا یاد نہیں ہے۔ یہ بھی یاد ہے کہ وہ صبح کی نماز کے بعد روزانہ قرآن شریف خوش الحانی سے پڑھا کرتی تھیں۔ غرارہ پہنا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں غرارے سولہ سولہ کلیوں کے ہوتے تھے۔ فرش پر چلنے میں پیچھے گھسٹتے تھے۔ یہ تو میں نے نہیں دیکھا کہ فرشی پاجاموں کو پیچھے سے لونڈیاں اٹھائے چلتی ہوں۔ اماں تو آگے سے پائنچے اٹھا کر بائیں ہاتھ پر ڈال لیا کرتی تھیں۔ گھر میں مامائیں ملازم تھیں مگر اماں سالن خود بگھارتی تھیں۔ سالن دو قسم کا پکتا تھا، ایک بھنا ہوا

اور ایک شوربہ دار۔ ایک دال بھی ضرور ہوتی تھی۔ گھر ہمیشہ صاف ستھرا چندن سا رہتا تھا۔ بڑے دالان میں چاندنی کا فرش رہتا تھا اور چھوٹے دالان میں چوکیاں بچھی رہتی تھیں۔ چوکیوں پر دری چاندنی کا فرش ہوتا تھا۔ دونوں دالانوں کی کڑیوں میں ہاتھ سے کھینچنے کے پنکھے لٹکے رہتے تھے جنہیں کھینچنے کے لیے مہاریاں آتی تھیں۔ لُو کے زمانے میں خس کی ٹٹیاں بڑے دالان پر لگ جاتی تھیں اور ایک چھوکرا انہیں تر کرتا رہتا تھا۔ جاڑوں میں پنکھے اور ٹٹیاں اتر جاتیں اور روئی کے موٹے موٹے پردے باندھ دیئے جاتے۔ رات کو یہ پردے چھوڑ دیئے جاتے۔

میرا جی چاہتا تھا کہ اماں مجھے اپنی گود میں ہر وقت لیئے رہیں۔ مگر وہ پچکار کر گود سے اُتار دیا کرتی تھیں۔ جب میری بیٹھو پر کی بہن بشریٰ پیدا ہوئی تو اس کا لاڈ پیار زیادہ ہونے لگا۔ میں اس سے جلنے لگا تھا اور اماں سے کہا کرتا تھا۔ "یہ چھی کی، یہ گندی۔" اماں میرا دل رکھنے کے لیے مجھے خوب پیار کرتیں۔ ابا سے مجھے ڈر لگتا تھا، وہ غصیل آدمی تھے، ان کی آواز گرج دار تھی، ان کی ڈانٹ سے نوکروں کا دم نکلتا تھا۔ ترکی پٹھے اور تاہی تھرائے، ہم سبھی اُن سے ڈرتے تھے۔ ویسے وہ سب بچوں سے بڑی محبت کرتے تھے، گود میں بھی لیا کرتے تھے، ساتھ سلاتے بھی تھے۔ پیار بھی کرتے تھے مگر ان کا خوف دل سے دور نہ ہوا۔ جوان ہونے اور باپ بن جانے کے بعد بھی ان سے ڈر لگتا تھا اور بے بلائے کبھی اُن کے سامنے نہیں جاتے تھے۔ جب وہ گھر میں آتے تو ہم اِدھر اُدھر دبکتے پھرتے۔

دادا ابا صرف اتنے یاد ہیں کہ جب ابا ہمیں لے کر دلّی آیا کرتے تھے تو کوچہ نواب مرزا والے مردانہ مکان میں ہمیں اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ پیش دالان میں دو منشی بیٹھتے تھے۔ پس دالان میں دروازے اور رنگ برنگ شیشوں والے بستے لٹکا کر کمرہ بنا دیا گیا تھا۔ اس میں داہنی طرف ایک پلنگ بچھا ہوا تھا اس پر ایک چھدری ڈاڑھی والے بڑے میاں بیٹھے رہتے تھے۔ ابا اس کمرے میں داخل ہوتے ہی ان بڑے میاں سے لپٹ جاتے اور رونے لگتے۔ ہم حیران کھڑے سوچتے رہتے کہ ابا رو کیوں رہے ہیں اور یہ بڑے میاں کون ہیں۔

پھر ابا ان سے الگ ہو کر ہم سے کہتے، "دادا ابا کو سلام کرو۔" ہم سلام کرتے تو وہ باری باری سے سب کو پیار کرتے اور صندوقچہ میں سے نکال کر ایک ایک اشرفی ہمیں دیتے۔ دادا ابا کے ملازم خدا بخش نے صحنچی میں بہت سارے کبوتر پال رکھے تھے۔ ہم کمرے میں سے باہر نکل کر کبوتر دیکھنے لگتے اور ابا بہت دیر تک دادا ابا سے باتیں کرتے رہتے۔

دادی اماں ہمیں بالکل یاد نہیں ہیں۔ ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ دادا ابا کی دیکھ بھال کے لیے ہماری اماں دلّی ہی میں رہنے لگی تھیں۔ زنانی ڈیوڑھی اور مردانہ گھر دونوں دادا ابا ہی کے بنوائے ہوئے تھے۔ ان دونوں گھروں کے درمیان ایک مکان چچا اشرف حسین کا آگیا تھا۔ اشرف حسین صاحب میرے والد کے خالہ زاد بھائی تھے۔ اماں صبح کا ناشتہ اور دونوں وقت کا کھانا دادا ابا کے لیے خود لے کر گلی میں سے جایا کرتی تھیں۔ بشریٰ کے بعد ہمارا ایک اور بھائی پیدا ہوا جس کا نام دادا ابا نے منیر احمد رکھا تھا۔ اچھا خاصا کھیلتا ماتا بچہ دو دنوں میں چٹ پٹ ہو گیا، اسے نمونیہ کھا گئی۔ رشتہ کنبہ کی عورتیں دیدے مٹکا مٹکا کے اور ہاتھ نچا نچا کر کہتیں: "اے اب تو چھوٹی دلہن چار چار بچوں کی ماں بن گئیں۔ لو بیوی ان کا مان نہ ہوگا تو اور کس کا ہوگا۔" ایسی ٹوک لگی کہ وہ بچہ ہی اپنی جان سے جاتا رہا۔ صبح ہوتے اس بچے کا انتقال ہوا۔ میری اماں بڑی صابر سیدانی تھیں۔ انہوں نے اپنے روزانہ کے معمول میں فرق نہیں آنے دیا۔ صبح وقت مقررہ پر دادا ابا کا ناشتہ لے کر گئیں۔ انہیں ناشتہ کرانے کے بعد ان سے ضبط نہ ہو سکا اور رونے لگیں۔ دادا ابا نے گھبرا کر پوچھا "کیوں چھوٹی دلہن خیر تو ہے؟" اماں نے کہا "منیر اللہ کو پیارا ہو گیا۔" دادا ابا اس واقعہ کا ذکر ہر آئے گئے سے کیا کرتے

تھے کہ "چھوٹی دلہن کے صبر و ضبط کو شاباش ہے۔ بچہ مرا پڑا ہے اور ناشتہ تیار کر کے خود لا رہی ہیں اور مجھے کھلا رہی ہیں۔ پہلے نہیں بتایا کہ میں کہیں ناشتہ نہ چھوڑ دوں"

میرے بعد ایک لڑکا دلّی ہی میں اور ہوا جس کا نام سراج الدین احمد دادا ابا ہی نے رکھا۔ یہ گود میں تھا کہ اماں حیدرآباد چلی گئیں۔ ۱۹۱۲ء میں دادا ابا کی بائیں طرف فالج گرا اور وہ دو تین ہی دن میں چل بسے۔ یہاں انہی دنوں میں میری سب سے چھوٹی بہن صفیہ پیدا ہوئی۔ اماں اچھی خاصی تھیں۔ دادا ابا کے انتقال کی وجہ سے دلّی روانہ ہو گئے۔ خبر نہیں جاپے میں کیا بگاڑ ہوا کہ اماں ہم سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر ایکا ایکی سدھار گئیں۔ ابا کو تار دیا گیا، شاید ریل ہی میں ان کو مل گیا۔ اچھا بھلا چھوڑ کر گئے تھے، آئے تو جنازہ صحن میں رکھا ہوا تھا۔ کہرام مچ گیا۔ ابا ایک ایک بچے کو گلے لگاتے اور روتے رہے۔ شام تک اماں کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ اماں کی پروردہ ایک چھوکری تھی برتی۔ اماں نے اسے ملازمہ بنا کر نہیں بیٹی بنا کر پالا تھا۔ اور اس کی شادی بھی ابا کی پیشی کے ایک چپراسی مخدوم صاحب سے کر دی تھی۔ ہم سب بچے انہی دونوں سے ہلے ہوئے تھے۔ ان دونوں نے اس موقع پر کچھ ایسی جان توڑ کر خدمت کی کہ ہم اماں کے غم کو بھول گئے۔ صفیہ صرف بارہ دن کی تھی، اس کے لیے فوراً ایک انّا تلاش کی گئی۔ انّا کا دودھ اسے راس آ گیا اور اس نے پالا بھی اسے اپنی بچی کی طرح۔ ابا کو گھر کے در و دیوار کاٹنے کو دوڑتے تھے۔ اس لئے انہوں نے کوشش کر کے حیدرآباد سے اپنا تبادلہ کرا لیا۔ ضلع رائچور کے اوّل تعلقدار مقرر ہو گئے۔

رائچور پہنچنے کے بعد ہمیں کانونٹ اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ ابا ہمیں خود بھی پڑھاتے تھے اور ایک ماسٹر بھی ہمیں پڑھانے آتا تھا ایک یوروپین گورنس ہم پر رکھی گئی۔ یہ ہم سے انگریزی میں بات کرتی تھی اور ہمارے کھانے، لباس، کھیل، سیر ہر بات کا خیال رکھتی تھی۔ کانونٹ اسکول میں صرف ہم ہی ہندوستانی بچے تھے، باقی سب لڑکے لڑکیاں یوروپین تھیں۔ ایک سال کی الٹا پلٹی ہی میں ہم انگریزی روانی سے بولنے لگے تھے۔

۱۹۱۵ء میں ہم ابا کے ساتھ دلّی آئے تو مطبع مجتبائی میں ابا کی ملاقات ڈاکٹر ضیاء الدین سے ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں مشورہ دیا کہ بچوں کو علی گڑھ میں داخل کر دیجیے۔ چنانچہ ہم تینوں بھائیوں کو ایم اے او اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ ظہور وارڈ کا پانچ نمبر کا کمرہ ہمیں دیدیا گیا۔ بڑے بھائی ساتویں میں داخل ہوئے اور منجھلے بھائی اور میں پانچویں میں۔ بشریٰ عبداللہ صاحب کے زنانہ اسکول میں داخل کر دی گئیں۔ ہماری خدمت کرنے کے لئے مخدوم صاحب کو بھی ساتھ کر دیا گیا۔ مجھے اور منجھلے بھائی کو یہ یکسر تبدیلی بے حد ناگوار گذری۔ سوائے انگریزی کے ہم باقی سارے مضمونوں میں پھسڈی تھے۔ لہٰذا کالج کے ایک طالب علم کو ہمیں پڑھانے کے لئے مقرر کیا گیا۔ یہ سرحد کے ایک صاحب عبدالحق تھے جو بعد میں ریلوے میں اے ٹی ایس ہو گئے تھے۔ انہوں نے ہمارے ساتھ بہت محنت کی اور ہمیں اس لائق کر دیا کہ کلاس میں چل جائیں۔

ہمارے ساتھ بورڈنگ میں بھی اور کلاس میں بھی امتیازی سلوک کیا جاتا تھا۔ ماسٹر ناظر حسن اور ماسٹر عزیز الحسن لڑکوں کو بے دردی سے مارتے تھے مگر ہم پر ان کی نظرِ کرم ہی رہی۔ مولانا اسلم جیراجپوری ہمیں فارسی پڑھاتے تھے اور ہمیں غیرت دلاتے رہتے تھے کہ " دیکھو تم کس دادا کے پوتے اور کس باپ کے بیٹے ہو۔ اگر تم نہیں پڑھوگے تو لوگ کیا کہیں گے" ناچار پڑھنا پڑتا تھا۔

بورڈنگ میں ہر قسم کا آرام اور بہت باقاعدگی تھی۔ پانچوں وقت کی نماز وقت سے پڑھنی ہوتی تھی۔ روزانہ شام کو ہاکی فٹ بال اور کرکٹ کھیلنا ہوتا تھا۔ مگر علی گڑھ میں جب تک رہے طبیعت اچاٹ ہی رہی۔ دو سوا دو سال یہاں پڑھنے پائے تھے۔ عدم تعاون کی تحریک شروع ہو گئی اور مولانا محمد علی نے علی گڑھ ہی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کر دیا۔ اسی زمانے میں ابا نے ہمیں علی گڑھ

سے اٹھالیا اور دلی کے عربک اسکول میں داخل کردیا۔ ابا پنشن لے کر دلی آ گئے تھے اور دادا ابا کی اور اپنی کتابیں چھپوا رہے تھے۔ اسی زمانے میں ابا نے دلی کے چیف کمشنر بیلی کی فرمائش پر تاریخ دلی لکھنی شروع کی تھی۔ کئی کئی گھنٹے روزانہ لکھتے تھے اور دلی کے سارے کھنڈروں میں گھومتے پھرتے تھے۔ تین ضخیم جلدوں میں یہ تاریخ مکمل ہوئی تو بیلی صاحب نے اس پر سرکار سے انعام دلوایا۔ خان بہادر کا خطاب بھی دینا چاہتے تھے مگر ابا نے اسے منظور نہیں کیا، کیونکہ خطاب یافتہ کو گورنمنٹ کا پٹھو سمجھا جاتا تھا۔ مولوی عبدالاحد خاں نے خان بہادر کا خطاب واپس نہیں کیا تھا تو دلی کے مسلمانوں نے انہیں ان کے مرنے پر کسی قبرستان میں دفن نہیں کرنے دیا تھا۔ اس پر بڑا ہنگامہ ہوا اور پولیس کی نگرانی میں ان کی میت دفن کی گئی۔

عربک اسکول میں میں نے چار سال پڑھا۔ ساتویں جماعت میں ہمارے کلاس ماسٹر تھرڈ ماسٹر کہلاتے تھے۔ یہ بھی بید مرکھنے تھے۔ چالیس پچاس لڑکوں کی کلاس کو اس سرے سے اس سرے تک ادھیڑ کر رکھ دیا کرتے تھے۔ ناک چپٹی تھی اس لئے "نکٹے" کہلاتے تھے۔ اسکول کے لڑکے بڑے شریر ہوتے ہیں ماسٹروں کے نام ایسے موزوں رکھ دیتے ہیں کہ چپک کر رہ جاتے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب فضل الدین دلی کے تقریباً کل مسلمان خاندانوں کے اُستاد تھے۔ اسکول میں تو لڑکوں کی نگرانی کرتے ہی تھے شہر میں بھی ان کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ ایک عجیب وصف ان میں یہ تھا کہ جب کسی طالب علم کو اتنا کا خیال آجاتا تھا کہ کہیں ہیڈ ماسٹر صاحب نہ آجائیں اسی وقت ہیڈ ماسٹر صاحب نمودار ہوجایا کرتے تھے۔ لہٰذا لڑکوں نے ان کا نام "قطب" رکھ دیا تھا۔ ایک ماسٹر صاحب تھے جو اس طرح بولتے تھے جیسے ان کے منہ میں کوئی چیز بھری ہوئی ہو۔ ان کا نام "آلو" رکھ دیا گیا تھا۔ ایک اور صاحب تھے جن کی شکل اور ڈاڑھی بجو جیسی تھی۔ ان کا نام "بجو" پڑ گیا تھا۔ ایک "دوزخ کے چیتے" تھے۔ اور ایک اور صاحب "اللہ میاں کی اونٹنی"۔

دسویں جماعت میں کچھ تو پڑھا کم اور کچھ اس وجہ سے کہ امتحان سے تین مہینے پہلے ابا نے میری شادی کردی میٹرک میں فیل ہوگیا۔ اس سال ہمارے اسکول کا نتیجہ بہت برا رہا تھا۔ شاید ۴۰ لڑکوں میں سے ۲۳ پاس ہوئے تھے۔ ابا نے مجھے اور منجھلے بھائی کو عربک اسکول سے اٹھا کر مشن اسکول میں داخل کردیا۔ اگلے سال ۱۹۲۳ء میں میں نے اچھے سیکنڈ ڈویژن میں میٹرک پاس کرلیا۔

ابا کی یہ خواہش تھی کہ ہم میں سے کوئی وکیل بنے، کوئی ڈاکٹر اور کوئی انجینئر۔ بڑے بھائی منیر احمد نے وکالت کو پسند کیا، منجھلے بھائی نے انجینئری کو اور میں نے ڈاکٹری کو۔ بڑے بھائی نے بی۔ اے کے بعد ایل۔ ایل۔ بی پاس کرلیا اور رام کشور ایڈووکیٹ کے ساتھ کار آموزی بھی کی۔ مگر ان کی زبان میں لکنت ہے اس لئے ایک کل ہند مقابلہ میں بیٹھے اور انہوں نے سب پرچوں میں بہت اچھے نمبر لئے۔ زبانی امتحان میں لکنت ہی کی وجہ سے انہیں کم نمبر ملے۔ لہٰذا منتخب نہیں ہوسکے مگر گھر بیٹھے اپنی نمبروں کی بنیاد پر ان کے پاس ریلوے سے آفر آگیا اور بعد میں ترقی کرتے کرتے ریلویز کے صدر محاسب ہوگئے اور راب کے ڈی۔ اے میں مشیر مالیات ہیں۔ منجھلے بھائی میٹرک سے بددل ہوکر حیدرآباد چلے گئے اور سب انسپکٹر پولیس ہوگئے۔ جب حیدرآباد میں پولیس ایکشن ہوا تو وہ اضلاع میں ایس پی تھے۔ زوال حیدرآباد کے بعد سخت معتوب ہوئے۔ بمشکل قید ہونے سے بچے مگر ملازمت سے برخاست کئے گئے۔ ہندوستان کے ہندوستان ہی میں رہے اور دلی میں ان کی تین چار لاکھ کی جائداد کسٹوڈین نے ضبط کرکے کوڑیوں کے مول نیلام کردی۔ بینک میں ان کا چالیس پچاس ہزار روپیہ تھا وہ بھی ڈوبا۔ اذیت ناک حالات میں وہیں اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

چچا اشرف حسین کے دو لڑکے تھے، ایک افضل حسین اور دوسرے اجمل حسین۔ افضل حسین محکمہ زراعت میں تھے اور اجمل حسین ڈاکٹر تھے۔ ڈاکٹر اجمل سے میری بہن بشریٰ کی شادی ہوئی تھی۔ جب میں نے ۱۹۲۳ء میں میٹرک پاس کیا تو ڈاکٹر صاحب لاہور کے میڈیکل کالج میں پڑھاتے تھے۔ ان کے مشورے سے ابا نے مجھے لاہور کے ایف سی کالج میں داخل کر دیا۔ ابا خود مجھے لے کر لاہور گئے تھے۔ ابا ہی کے ساتھ جا کر میں نے پیسہ اخبار کے ایڈیٹر محبوب عالم مرحوم اور ممتاز علی مرحوم، ایڈیٹر تہذیب نسواں کو پہلی بار دیکھا۔ ان دونوں بزرگوں سے ابا کے گہرے تعلقات تھے۔ تہذیب نسواں کے دفتر میں تاج، پطرس اور سالک کو دیکھا جن سے کوئی دس سال بعد خود میرے اچھے تعلقات ہو گئے تھے۔ اسی دفتر میں حفیظ جالندھری، غلام عباس اور چراغ حسن حسرت سے ملاقات ہوئی تھی۔

ایف سی کالج سے میں نے ایف ایس سی (میڈیکل) پاس کیا۔ ابا کا ارادہ مجھے ایڈنبرا بھیجنے کا تھا مگر دو بڑے حادثے یکے بعد دیگرے اسی زمانے میں پیش آ گئے۔ ابا کی داہنی طرف فالج کا اثر ہو گیا اور وہ اسے موت کا پیام سمجھنے لگے تھے۔ پہلے جاپے کو ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ میری بیوی کو پلوری ہوئی اور اس نے اتنا طول کھینچا کہ ان کا ڈھی سے چمڑہ لگ گیا۔ ڈاکٹر اجمل کے مشورہ سے انہیں لاہور لے گیا۔ ڈاکٹر صاحب ہی کے ہاں میرا قیام تھا۔ دو ایک دن بعد ڈاکٹر صاحب چار اور ڈاکٹروں کو گھر لے آئے۔ انہوں نے معائنہ کیا۔ پھیپھڑے کے غلاف میں سے پانی نکالا۔ اس کا معائنہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس میں پیپ پڑ گئی ہے۔ اس لیے یہ ایک اور مرض ہو گیا ہے جس کا نام ایمپائما ہے۔ تجویز آپریشن کی ہوئی۔ گھر پر ہی آپریشن ہوا۔ داہنی جانب کی دو پسلیاں کاٹ ڈالی گئیں اور زخم کو دھو کر ٹانکے لگا دیئے گئے۔ مگر زخم نہیں بھرا اس لیے ٹانکے کاٹ کر اسے کھلا زخم بنا دیا گیا۔ ربر کی نلکی کا بالشت بھر ٹکڑا زخم میں ڈال دیا گیا اور روزانہ اس کی ڈریسنگ ہونے لگی۔ دو مہینے تک یہ سلسلہ جاری رہا، صحت بالکل گر گئی اور کوئی امید زیست کی نہ رہی۔ ڈاکٹر صاحب نے گھبرا کر کہہ دیا کہ انہیں دلی لے جا کر لیڈی ہارڈنگ زنانہ ہسپتال میں داخل کر دیا جائے۔ مریضہ کو دلی کے لیڈی ہارڈنگ ہسپتال میں داخل کر دیا۔ ابا نے روپے کا بالکل منہ نہیں کیا۔ بڑے اچھے کمرے میں انہیں رکھا۔ بچے پر ایک تجربہ کار دایہ رکھی۔ میں انہیں داخل کرا کے لاہور چلا آیا۔ مجھے اپنی بیوی سے محبت تو تھی ہی مگر اب محبت سے زیادہ ان پر ترس آتا تھا کہ الٰہی یہ کس عذاب میں گرفتار ہو گئیں۔ زندگی کی کوئی آس نہیں رہی تھی۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اب ان کی سناؤنی آتی ہے کہ اب آتی ہے۔ مگر اللہ کی شان کہ وہاں ایک سکھ ڈاکٹرنی نے اس توجہ سے ان کا علاج اور ڈریسنگ کی کہ وہ روبصحت ہونے لگیں۔ جب میں کوئی چار یا پانچ مہینے بعد دلی گیا تو وہ بظاہر بالکل تندرست ہو چکی تھیں مگر پہلو کا زخم ناسور بن گیا تھا اور اس کے اچھے ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔ لیڈی ڈاکٹر گوبند کور نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ یہ مرض کیا ہے اور کیوں اچھا نہیں ہو سکتا۔ اب صرف یہی کیا جا سکتا تھا کہ ناسور کو ربر کی ٹیوب کے ذریعہ روزانہ دھویا جائے۔ اور عام صحت کو گرنے نہ دیا جائے۔ بیوی ہسپتال ہی میں رہیں اور میں نے لاہور جا کر میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا۔ ابا اور بیوی کی بیماری سے طبیعت ویسے ہی اچاٹ ہو رہی تھی کہ سڑے ہوئے مردوں پر کام کرنا پڑا۔ گوشت کھانا چھوٹ گیا، ہاتھوں میں سے دواؤں کی بو آتی رہتی تھی۔ کام سے اور اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ میں نے ڈاکٹر اجمل سے کہا "مجھ سے یہ پڑھائی نہیں چلے گی۔" انہوں نے ہمیشہ ہمت بندھائی مگر میں نے ابا کو لکھ دیا کہ "آپ کی خواہش کی تکمیل میں میں نے ڈاکٹری پڑھنی شروع کی مگر یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔" ابا کو افسوس ہوا مگر انہوں نے مجھ سے اصرار نہیں کیا۔ خط لکھوا دیا (فالج کی وجہ سے خود نہیں لکھ سکتے تھے) کہ نہیں پڑھ سکتے تو دلی آ جاؤ۔ میں نے کتابیں اور ہڈیوں کا ڈھانچ اونے پونے ہم جماعتوں

کے ہاتھ بیچا اور گھر چلا آیا۔ ابا آدھے بھی نہیں رہے تھے میں اُن کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کے رو دیا۔ ابا نے پیار کیا اور آبدیدہ ہوگئے۔ پوچھا "اب کیا کرنے کا ارادہ ہے؟" میں نے کہا "بی۔ اے اور ایم۔ اے کروں گا"۔ بولے اچھا، جیسی تمہاری مرضی۔"

ابا تھوڑا سا چل پھر لیتے تھے۔ اس لاچاری میں بھی دوسرے ہسپتال کا پتہ لگا بھی میں کر لیتے تھے۔ شام کو میں ابا کے ساتھ ہسپتال گیا بیوی کی صحت بہت اچھی ہوگئی تھی۔ گوبند کور سے ابا نے اور میں نے باتیں کیں۔ انہوں نے کہا "آپ انہیں گھر لے جا سکتے ہیں۔ میں دوائیں لکھ دوں گی اور ڈریسنگ کا طریقہ بتا دوں گی"۔ اگلے دن انہوں نے میرے سامنے ڈریسنگ کی۔ پہلو میں ایک سوراخ تھا جس میں ٹیوب پڑی ہوئی تھی۔ اس ٹیوب کو نکال کر دوسری صاف ستھری ٹیوب زخم میں ڈالی گئی اور بڑی پچکاری سے زخم کو دھو کر گاز اور روئی رکھ کر پٹی باندھ دی۔ ڈریسنگ دن میں صرف ایک دفعہ کرنی تھی۔ بیوی گھر آگئیں اور چودہ سال تک میں ان کی ڈریسنگ کرتا رہا۔ دیکھنے والوں کو معلوم نہ ہوتا تھا کہ ان کے پہلو میں ناسور ہے۔ ۱۴ سال میں ان کے ہاں پانچ بچے اور ہوئے مگر یہ ناسور ان کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھاتا رہا۔ دنیا بھر کے علاج کر لیے، حیدر آباد لیجا کر ایک پہاڑ میں رہنے والے سادھو کو بھی دکھایا، اس کی دوا بھی استعمال کی، کچھ نقصان ہی ہوا۔

دلی کے مشہور سرجن ڈاکٹر جوشی کو دکھایا اس نے کہا "اب صرف یہی صورت ممکن ہے کہ میں ان کی ایک طرف کی پوری بارہ پسلیاں نکال دوں۔" بیوی بیچاری اس پر بھی راضی ہو گئی تھیں مگر تین دن ہسپتال میں رکھنے کے بعد ڈاکٹر جوشی نے بھی جواب دے دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اتنے بڑے اپریشن کے بعد بھی یقین نہیں ہے کہ ناسور نہیں رہے گا۔ پھر اس اپریشن میں جان جانے کا بھی خطرہ تھا۔ لہٰذا روزانہ کی ڈریسنگ ہی پر زندہ ہیں۔ اور ایک دن وہ آیا کہ ایک دم سے بتاشے کی طرح بیٹھ گئیں۔ سارے جسم میں ناسور کا زہر پھیل گیا اور تین دن کی شدید تکلیف کے بعد رخصت ہو گئیں۔

بیمار بیوی کی خدمت کرنا تو خیر میرا فرض تھا مگر میں سمجھتا ہوں کہ کبھی کبھی جو میں بیزار ہو جاتا تھا اور برے برے خیالات دل میں لاتا تھا تو شاید اللہ میاں مجھے اس لئے معاف کر دیں کہ میں نے اپنی دائم المرض بیوی کو سوکن کا دکھ نہیں پہنچایا۔ حالانکہ ان دنوں بیسیوں لڑکیاں مجھ سے شادی کرنے کی خواہش مند تھیں۔ میں ان سب کو بہلاتا ہی رہا اور ان سے محبت جتاتا رہا۔ مگر بیوی کے انتقال کے بعد بھی میں نے ان میں سے کسی سے شادی نہیں کی، اور نہ اپنی بھری جوانی میں کوئی بے راہ روی اختیار کی۔ ویسے دس سال کی عمر سے میں افلاطونی عشق کا مریض ہوں اور چاہنے سے زیادہ چاہا گیا ہوں۔ حد یہ ہے کہ بیوی کے مرنے کے بعد بعض شادی شدہ سابقہ محبوبائیں اس پر بھی آمادہ تھیں کہ اپنے شوہر سے طلاق لے کر مجھ سے شادی کر لیں۔ ع

اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی

دلی آجانے کے بعد میں نے بی۔ اے (آنرز) انگریزی ادبیات میں کیا اور فارسی (آنرز) کے دو پرچے بھی کئے۔ ہندو کالج اور مشن کالج دونوں کشمیری دروازے کے قریب آمنے سامنے تھے۔ دونوں میں ہماری کلاسیں ہوتی تھیں۔ بر ۱۹۲۹ء میں مشن کالج میں ایم اے (فارسی) میں داخلہ لیا۔ میں اس مضمون کا اکلوتا طالب علم تھا۔ یہاں کے استادوں میں دو قابل ذکر ہیں۔ ایک ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی (حال وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی) اور دوسرے شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن مرحوم۔ ڈاکٹر قریشی نے دو ایک ہی سبقوں میں اندازہ لگا لیا کہ مجھے ان سے پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا مجھ سے کہہ دیا کہ اگر آپ کوئی دشواری محسوس کریں تو مجھ سے پوچھ لیا کریں۔ اس کی نوبت کبھی نہ آئی۔

شمس العلماء دراصل عربی کے پروفیسر تھے وہ مروّت میں مجھے پڑھاتے تھے کیونکہ دادا ابا کی سفارش پر انہیں مشن کالج میں پروفیسری ملی تھی۔ مگر انہوں نے شرط یہ لگائی کہ علی الصباح میرے گھر آجایا کرو۔ میں نے مولوی صاحب سے کچھ کم ایک سال پڑھا۔ غضب کا حافظہ تھا ان کا۔ منہ لپیٹے پڑے رہتے اور وقایع نعمت خان عالی اور اخلاق جلالی جیسی دقیق کتابیں مجھ سے آگے آگے "منہ زبانی" پڑھتے جاتے۔ ترجمہ میں انگریزی میں کرتا جاتا۔ مولوی صاحب انگریزی نہ تو لکھ سکتے تھے اور نہ بول سکتے تھے مگر مجھے ٹوک کر ایسا صحیح لفظ بتاتے کہ میرا انگریزی دانی کا سارا گھمنڈ کرکرا ہو جاتا۔ رمضان کا مہینہ تھا، ایک دن مولوی صاحب خبر نہیں کس جھونجھ میں تھے کہ مجھ سے اڑ گئے۔ مجھے عربی نہیں آتی تھی اس لئے اخلاق جلالی اٹک اٹک کر پڑھ رہا تھا۔ ایک جگہ بالکل ہی نہیں چلی تو میں رک گیا۔ مولوی صاحب کمبل اوڑھے اوڑھے بولے "رک کیوں گئے؟" میں نے کہا "جی عربی ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا؟"

"کیا خبر قرآن کی کوئی آیت ہی ہو۔"

"جی تو پھر؟"

"غلط سلط پڑھوں گا تو گناہ ہوگا۔"

"جی آپ پڑھئے، گناہ ثواب مجھ پر۔"

میں نے فرّاٹے کے ساتھ اردو کی طرح عربی کو پڑھ دیا۔

مولوی صاحب بولے "سبحان اللہ! اور جناب ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے ہیں!"

مجھے مولوی صاحب کا یہ طعنہ بہت برا لگا۔ میں نے چیخ کر کہا "کیا یہ میرا قصور ہے کہ میں ڈپٹی نذیر احمد کے ہاں پیدا ہوا، وہ ہوا کریں عربی کے عالم فاضل، مجھے عربی نہیں آتی۔"

مولوی صاحب نے محسوس کر لیا کہ مجھے ان کا کہنا ناگوار گزرا۔ رسان سے بولے "تو بھئی پہلے عربی پڑھ لو۔" پھر بولے۔

"ہاں پڑھو۔"

میں منہ تھتھا کر بیٹھ گیا۔

پھر انہوں نے کہا "جی پڑھیے۔"

میں نے کہا "میں نہیں پڑھتا وڑھتا۔ اور میں کل سے نہیں آؤں گا۔"

مولوی صاحب اٹھ بیٹھے۔ بولے "جناب کو غصہ بہت جلدی آجاتا ہے۔"

اس کے بعد مولوی صاحب بہت دیر تک سمجھاتے بجھاتے رہے۔ مگر میں "سلام علیکم" کہہ کر وہاں سے چلا آیا۔ پھر نہ مولوی صاحب کے ہاں گیا اور نہ کالج گیا۔

کئی مہینے بعد مولوی صاحب لال کنواں کے بازار میں سامنے سے آتے دکھائی دیئے۔ میں اپنے ماموں حشتی صاحب کے ساتھ جا رہا تھا، میں کترا کر نکل جانا چاہتا تھا کہ حشتی صاحب نے السلام علیکم کہہ کر مولانا کی طرف مصافحہ کرنے کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے۔

مولانا نے کہا: "نہیں، پہلے ناراض استاد زادہ سے۔" یہ کہہ کر میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں ان کا ہاتھ لیا تو انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا اور فرمایا: "میاں تم تو سچ مچ ناراض ہی ہو گئے۔" اور مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

ابا نے ہم میں سے ہر ایک کے لیے بنک میں پچاس پچاس ہزار روپیہ چھوڑا تھا۔ جائداد کا کرایہ الگ تھا جو تقسیم ہو کے فی لڑکا کوئی تین سو روپے مہینہ ہوتا تھا۔ یہ تین سو روپے اس زمانے کے ہیں، جب بیس سیر کا آٹا، روپے سیر گھی، چار آنے سیر بکری کا گوشت، آٹھ سیر کا دودھ، ڈھائی سیر کی شکر اور کنجڑے کے ہاں سے ایک پیسے میں چار سودے ملتے تھے۔ میری شادی پر انیس روپے تولہ سونا تھا۔ گریجویٹ کو اگر چالیس روپے کی ملازمت مل جاتی تھی تو اسے کھاتا پیتا آدمی سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا ہم اپنے آپ کو رئیس زادہ سمجھتے تھے۔ نوکری کرنے کا میں نے کبھی خیال نہیں کیا۔ بڑے بھائی ملازم ہو چکے تھے، منجھلے بھائی حیدر آباد جا چکے تھے۔ خیال تھا کہ دادا ابا اور ابا کی کتابیں ہی اتنی ہیں کہ اگر کتب خانہ ہی کا کام سنبھال لیا جائے تو سینکڑوں روپے مہینے کی یافت ہو سکتی ہے۔ ڈگری لینے کے بعد میں نے ایم اے میں داخلہ لے لیا تھا۔

میاں انصار ناصری جو مجھ سے پانچ چھ سال چھوٹے ہیں، نواب بہادر میر ناصر علی صاحب "صلائے عام" کے پوتے ہیں اور رشتے میں میرے بھانجے ہیں، میرے پاس اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ انہیں بھی لکھنے پڑھنے کا شوق تھا اور مجھے بھی۔ انہوں نے ایک دن کہا کہ لاہور سے کیسے اچھے اچھے رسالے نکل رہے ہیں۔ ہمایوں، نیرنگِ خیال، عالمگیر اور ادبی دنیا۔ مگر دلی سے کوئی اچھا پرچہ نہیں نکلتا۔ یہ بات گھٹ میں اتر گئی اور ہم اس پر آمادہ ہو گئے کہ رسالہ ہم نکالیں۔ فوراً جاننے والوں اور نہ جاننے والوں کو خط لکھنے بیٹھ گئے کہ ہم ایک رسالہ نکال رہے ہیں، اس کے لیے مضمون بھیجو۔ نام بہت سوچے۔ میاں انصار نے کہا: "ساغر ہے، پیمانہ ہے، صہبا ہے، مینا ہے، مگر ساقی نہیں ہے۔" میں نے کہا تو بس ساقی ہی نکالیں گے۔ ڈیکلریشن لے لیا اور کام شروع کر دیا۔ رتی بھر تجربہ نہیں تھا۔ دوسروں کے سہارے کام کیا، ڈھائی تین سال میں پچیس ہزار روپے کا گھاٹا ہوا۔ بڑے بھائی نے بلا کر پاس بک اور چیک بک حوالے کی اور کہا تم جانو اور تمہارا کام۔ شاید دو ڈھائی ہزار روپے بنک میں باقی رہ گئے تھے۔ پریس اور کاغذی کے واجبات ادا کرنے کے بعد کوئی پانسو روپے بچے۔ شام کو انصار اور فضل حق قریشی حسبِ معمول آئے تو انہوں نے مجھے خاموش اور افسردہ پایا۔ میں نے انہیں بتایا کہ ساقی بند کرنا پڑے گا۔ فضل حق نے کہا کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ساقی میں نقصان ہو۔ آپ حساب کتاب خود سنبھالیے۔ یہ سارا روپیہ خورد برد ہوا ہے اور واقعی اسی بچے ہوئے پانسو سے پرچہ چلتا رہا اور اسی کی الٹ پھیر میں میں نے کتابوں کا کام شروع کیا جو پندرہ سال میں بڑھ کر تقریباً سوا لاکھ پر پہنچا اور روپے کی ریل پیل ہو گئی۔ مجھے اپنے کاروبار سے پندرہ سو سے دو ہزار تک کی ماہوار آمدنی تھی کہ ۱۹۴۷ء کا انقلاب آیا اور یہ سارا کاروبار اس کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اس انقلاب میں جائداد بھی گئی، مسلمانوں کے ایک بنک میں روپیہ تھا، وہ بھی ڈوبا اور ہم بیک بینی و دو گوش مرتے گرتے لاہور پہنچ گئے۔

دلی سے لاہور تک پہونچنے میں ہم پر کیا گزری؟ اسے میں نے تفصیل سے "دلی کی بپتا" میں لکھ دیا ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ ۵ ستمبر سے ۱۵ ستمبر تک ہم گھر میں مقید رہے۔ اس کے بعد ایک فوجی ٹرک میں رائفلوں کی حفاظت میں گھر سے نکل کر پرانے قلعہ میں کھلے آسمان تلے جا پڑے۔ تین دن قلعہ میں رہے، جہاں اسی ہزار دلی والے اس طرح بند تھے جیسے چوہے دان میں چوہے۔ شہر میں مسلمانوں کے محلے کے محلے

صاف ہو چکے تھے۔ قرول باغ، سبزی منڈی، پہاڑ گنج میں نام کو مسلمان نہیں رہا تھا۔ فوجی گولیاں چلا رہے تھے اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ پرانا قلعہ بھر گیا تو ہمایوں کے مقبرے میں مسلمان بھرنے شروع ہوئے اور ایک لاکھ آدمی اس میں بھی سما گئے۔ بے موسم کی بارش ہو رہی تھی ہیضہ پھیلا ہزاروں اس کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ہمارے ریلوے کے پاس نکل آ گئے تو تین دن پرانے قلعہ میں رہنے کے بعد ہمیں ایک ٹرک میں بھر کر نظام الدین کے اسٹیشن پر پہنچایا گیا۔ یہاں ایک تھرڈ کلاس گاڑی میں اوپر تلے ٹھونس دیا گیا۔ سب کی تلاشی کے بعد ریل روانہ ہوئی تو خیال یہی ہوا کہ رات کے ۹ بجے تک لاہور پہنچ جائیں گے مگر شام ہوا، اندھیرا ہو گئی۔ ریل میں اندھیرا رہا۔ ریل جوں کی چال چلتی رہی۔ گرمی، بھوک اور پیاس سے بچے بلک رہے تھے۔ بڑے چڑچڑے ہو کر لڑنے مارنے پر آمادہ ہو رہے تھے مگر نیند نے سب پر غلبہ پا لیا۔ بیٹھے ہی بیٹھے کوئی اونگھ گیا اور کوئی سو گیا کہ رات کے دو بجے گاڑی ایک دم سے جھٹکے سے ساتھ رک گئی۔ ایک شور قیامت برپا ہو گیا۔ خبریں آ ہی چکی تھیں کہ گاڑیاں کٹ رہی ہیں۔ بچے دھاڑنے لگے، عورتیں چیخنے لگیں، مرد انہیں خاموش کرنے کے لئے ان دونوں سے زیادہ چیخنے لگے۔ کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ ساری کھڑکیاں چڑھ گئیں اور ان کے آگے سامان چنا جانے لگا۔ باہر سے گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کس کی ماں نے دھونسا کھایا تھا کہ باہر جھانک کر دیکھتا۔ ویسے ہی جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ حبس اور گرمی کا یہ حال ہو گیا کہ چوٹی کا پسینہ ایڑی میں آنے لگا۔ باہر موت ناچ رہی تھی اور ہم ہر گھڑی یہ سوچ رہے تھے کہ اب ہماری باری آئی کہ اب آئی۔ ایک گھنٹے تک یہی کیفیت رہی، اس کے بعد گولیاں چلنی بند ہو گئیں اور گاڑی کھسکی اور کھسک کر لدھیانہ کے اسٹیشن پر پہنچی تو باہر سے آواز آئی کہ اب گاڑی صبح کو یہاں سے روانہ ہو گی۔ جو پلیٹ فارم پر اترنا چاہے اتر سکتا ہے۔ ڈبوں میں جام ہونے والے لوگ کھڑکیوں میں سے کود کود کر اترنے لگے۔ میں بھی اترا۔ دیکھا کہ ہم سے ایک ڈبہ آگے تک چھ ڈبے بالکل خالی پڑے ہیں اور پلیٹ فارم پر کئی عورت مرد زخمی پڑے تڑپ رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ حملہ آوروں نے آدھی ریل لوٹ لی اور مسافروں کو مار ڈالا۔ پندرہ منٹ اور انہیں لوٹنے کے مل جاتے تو ہمارا ڈبہ بھی صاف ہو جاتا۔ زندگی تھی بچ گئے۔

دس بجے کے بعد گاڑی چلی اور دو گھنٹے چل کر جنگل میں رک گئی۔ معلوم ہوا کہ انجن میں اب دم نہیں رہا۔ دوسرا انجن آئے گا تو ریل کو لے جائے گا۔ کئی گھنٹے گاڑی کھڑی رہی۔ دوسرے انجن نے آ کر اسے امرتسر پہنچایا۔ ایک گھنٹہ یہاں بھی کھڑی رہی اور سکھ بلبلاتے پھرتے رہے۔ مگر فوجی دستے کی وجہ سے دور رہے۔ مغرب کے وقت گاڑی پاکستان میں داخل ہوئی۔ تو اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعرے بلند ہوئے۔ رات کو آٹھ بجے کے بعد لاہور پہنچے تو کئی لاکھ مہاجر اسٹیشن پر اور باہر دور تک پڑا ہوا تھا۔ شہر میں کرفیو تھا اس لئے رات پلیٹ فارم کے ایک کونے میں گزاری۔ بیوی بچے تھک کر چور ہو گئے تھے پڑ کر سو گئے۔ صبح کو تانگا کر کے مشہور ادیب ایم اسلم کے گھر پہنچے۔ وہ اطلاع پاتے ہی گھبرا کر نکل آئے اور ہمیں جو برے حال اور بانکے دھیاڑے دیکھا تو آب دیدہ ہو گئے۔ فوراً اپنا بالاخانہ کھلوایا اور ہمیں اوپر پہنچایا۔ اپنے مکان سے قریب ایک مکان مجھے الاٹ کرا دیا۔ مگر اس میں جانے نہ دیا۔ بیس بائیس دن اپنے ہاں سب کو مہمان رکھا۔ اس کے بعد ہم اپنے گھر میں آئے۔

دس مہینے لاہور میں رہے مگر ہمارے عزیز کراچی چلے گئے تھے اس لئے ہم نے بھی کراچی کو ترجیح دی۔ دو سال کی بیکاری میں کل اندوختہ ختم ہو گیا۔ چند ہمدرد دوستوں کو معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے ریڈیو پاکستان میں نگرانِ موسیقی رکھوا دیا۔ میری دوسری بیوی میٹرک پاس تھیں۔ انہوں نے ایک اسکول میں نوکری کر لی۔ اور شام کو ایک کالج میں پڑھنے بھی لگیں۔ انہوں نے چپ چپاتے چھ سال میں ایم اے کر لیا۔ خدا کے فضل

سے ایک آسودہ حال گھر کی صورت بن گئی ۔

میرے خاندان میں دور دور تک موسیقی سے کسی کو لگاؤ نہیں ہے مگر مجھے بچپن ہی سے اس کا شوق ہے میٹرک پاس کرنے کے بعد ابا نے میرا جیب خرچ بیس روپیہ مہینہ کر دیا تھا ۔ میں نے دس روپے مہینہ ایک اُستاد کو دے کر باقاعدگی سے ہارمونیم اور راگ راگنیاں سیکھنی شروع کر دیں ۔ ۲۵ سال تک میں اچھے استادوں سے دلی میں گلوکی اور ساز ، موسیقی سیکھی ، ۱۹۳۷ء سے ریڈیو پر گانا بھی شروع کر دیا تھا مگر اسیں ۔ احمد کے نام سے ۔ کیونکہ میرے خاندان والے اسے اچھا نہیں سمجھتے تھے ۔ پھر دیں سے دینا بھی مشکل ہے ۔ میں نے اس فن کو حاصل کرنے میں بہت وقت اور روپیہ صرف کیا ۔ یوں سمجھئے کہ میرا آدھا وقت ادب میں اور آدھا تحصیلِ موسیقی میں گزرا ۔ کلاسیکی موسیقی ایک نہایت دشوار علم اور فن ہے ۔ جسے کماحقہ حاصل کرنا عطائی کے لیے تقریباً ناممکن ہے ۔ مگر میں نے مشق و مزاولت سے اچھے استادوں کی رہنمائی میں اس فن کے عملی پہلو پر عبور حاصل کیا اور اردو ، فارسی اور انگریزی کتابوں سے اس کے علمی پہلو پر دسترس حاصل کی اور ایک وقت وہ آگیا کہ اکثر پیشہ ور فن کار مجھ سے راگ راگنیوں کی صحت کرنے آنے لگے ۔ آل انڈیا ریڈیو کے بیشتر اور پاکستان کے تمام ریڈیو اسٹیشنوں سے میرے پروگرام نشر ہوتے رہے ہیں ۔ ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہونے کے بعد سینکڑوں غنائیے لکھے اور چھ سال سے موسیقی کے آسان سبق ہفتہ وار نشر کر رہا ہوں کہ مسلمانوں کا یہ ساختہ پرداختہ بے مثل فن ناقدری اور کس مپرسی کا شکار نہ ہو جائے ۔

میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ یہ موسیقی کہاں سے اور کیوں میرے پیچھے لگ گئی ۔ گو میں اس معمہ کو حل نہ کر سکا ۔ یہ ضرور ہوا کہ میں اس شوق میں پڑ کر تقریباً سبھی برائیوں سے بچا رہا ۔ ادب اور موسیقی کے علاوہ میرا اور کوئی مشغلہ ہی نہ رہا ۔ سینما ، تھیٹر ، کلب ، ریس ، شراب ، جوا ، کوڑی بازی ، کسی کے لئے کوئی فرصت ہی نہیں ملی ۔ پاکستان بننے کے بعد اس کی کم مجھ میں آئی تو یہ آئی کہ ادب ذریعہ معاش نہیں بن سکے گا ۔ دلی میں بھی نہیں تھا ، مگر جائداد ، کاروبار اور سرمایہ سے محروم ہونے کے بعد موسیقی ہی کے سہارے زندگی بسر کرنا مقدر تھا اس لیے مجھے اس آنے والے دور کے لئے تیار کیا گیا تھا ۔ ڈاکٹر اور پروفیسر بننے کے بدلے ادیب اور موسیقار بنا ۔ یہ مقدرات ہیں جن میں دم مارنے کی گنجائش نہیں ۔

میری ادبی خدمت کی عمر بھی چالیس سال ہے ۔ ساقی کو جاری ہوئے اب پورے ۴۲ سال ہو چکے ہیں ۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننا مجھے اچھا نہیں لگتا اس لیے مجھ سے مت پوچھئے کہ ساقی نے اُردو کو کیا دیا ؟ میرے ہم عصروں سے پوچھ لیجئے یا ۴۲ سال کے فائل دیکھ لیجئے ۔ ساقی ہی میری زندگی کا حاصل ہے ۔ بیس پچیس سال پہلے ساقی فیشن میں داخل تھا ۔ گھر گھر ساقی کا چرچا تھا ۔ دنیائے ادب سے متعارف ہونے کے لیئے ضروری تھا کہ ساقی میں اپنی چیزیں شائع کرائی جائیں ۔ ہر عروج کے بعد زوال ہوتا ہے ۱۹۵۸ء کے انقلاب میں ساقی پر بھی ادبار چھایا ۔ لاہور پہنچتے ہی میں نے ڈیکلریشن کی درخواست دے دی تھی ، مگر پریس برانچ میں چوہدری محمد حسین بیٹھے ہوئے تھے ۔ انہوں نے مجھے دس مہینے جھلایا اور ڈیکلریشن نہیں دیا ۔ یہ وہی بزرگ تھے جو علامہ اقبال کی صحبت میں رہ کر بھی اپنی اصلاح نہ کر سکے ۔ بے باک اور جدت پسند ادیبوں کو گرفتار کرانا اور ان پر فحش نگاری کے مقدمے چلانا ان کا شیوہ تھا ۔ منٹو اور عصمت چغتائی سے انہوں نے باپ مارے کا بیر باندھ لیا تھا ۔ ان کی رپورٹ پر تلاشی اور گرفتاری کے وارنٹ لاہور سے جاری ہوتے ۔ لاہور ، بمبئی اور دلی پر پولیس چھاپہ مارتی ۔ ایڈیٹروں ، پبلشروں اور کتب فروشوں کی بھی پولیس تلاشی لیتی اور لکھنے والوں کے ساتھ انہیں بھی گرفتار کرتی ، ضمانتیں

یعنی اور ان پہ مقدمے قائم کر کے لاہور کھینچ بلاتی۔ ایک دفعہ مجھ پر بھی ان کی نظر کرم ہوئی۔ منٹو کی کتاب دھواں اور عصمت کی کتاب چوٹیں میں نے شائع کی تھی۔ مجھے پیشن گوئی مل گئی تھی کہ پنجاب کی سی آئی ڈی چھاپہ مارنے والی ہے۔ میں نے یہ کتابیں اپنے کتب خانے سے ہٹوا دیں۔ ایک دن ایک سب انسپکٹر صاحب دلی پولیس کے چند سپاہی ساتھ لے کر آدھمکے۔ مجھے وارنٹ دکھایا اور کہا کہ "میں نے آپ کو گرفتار کر لیا ہے۔"

میں نے کہا "تو پھر؟"

بولے "پانچ ہزار کی شخصی ضمانت دیجئے۔"

میرے پاس میرے رشتے کے بھائی علامہ مضطر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ضمانت کا کاغذ لکھ دیا۔ اس کے بعد انہوں نے دفتر کی تلاشی لی۔ وہاں کیا رکھا تھا۔ بے نیل و مرام چلے گئے۔ ان کے دو مہینے بعد ایک دن جو میں اپنے دفتر آیا تو دیکھا کہ ایک سردار جی تلاشی لینے کے بعد خالی ہاتھ میرے پاس آئے۔ بولے "آپ ہی شاہد احمد ہیں؟"

میں نے کہا "جی ہاں۔"

پوچھا "دھواں اور چوٹیں کہاں رکھی ہیں؟"

"ہٹا دی ہیں۔"

بہت متعجب ہو کر بولے "ہٹا دی ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ آپ آنے والے تھے۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"اپنی سی آئی ڈی سے۔"

وہ کھسیانی ہنسی ہنس کر ڈھیلے پڑ گئے "ہٹی ہیں تو ایک ایک کتاب پڑھنے کے لئے دے دیجئے۔"

"کتابیں دینے والے شکار پور میں رہتے ہیں۔"

پھر بڑے زور سے ہنسے اور بالکل ہی کھل گئے "آپ تو بڑے ہوشیار آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ مجھ سے پہلے بھی ایک سب انسپکٹر آپ کی تلاشی لے کر خالی ہاتھ چلا گیا۔ مجھے کچھ تو دیجئے۔"

میں نے کہا "میں آپ کو صرف بیان دے سکتا ہوں۔"

بچارا بہت زچ ہوا۔ ضمانت اور بیان لے کر چلا گیا۔ دو مہینے کے بعد ہم سب کے نام لاہور کی عدالت سے سمن آ گئے۔ میں میرا منشی اور کاتب سب ملزم ٹھہرائے گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پریس کے مالک اور چند کتب فروش بھی پھانس لئے گئے ہیں۔ دس بارہ ملزموں کی پوری برات تاریخ پر لاہور پہنچی۔ عدالت نے اگلی تاریخ دے دی۔ اسی طرح ہم سب کو کئی پھیرے کرائے گئے۔ ایک پیشی پر منٹو

اور عصمت بھی بمبئی سے آ گئے۔ کافی فیس دیکر ہم سب نے ایک ہندو ایڈوکیٹ کو اپنا وکیل بنایا۔ بیان ہوئے۔ جرح ہوئی۔ سارے ادیب تو ہمارے صفائی کے گواہ تھے، پولیس نے دو گمنام اخبار نویسوں کو گواہی میں پیش کیا تو وہ بچارے ٹھیک سے اردو بھی نہیں پڑھ سکتے تھے۔ وکیل نے انہیں ایک مضحکہ بنا دیا۔ رائے بہادر صاحب جو کرسیٔ عدالت پر بیٹھے تھے مسکراتے رہے مگر انہیں حکومت نے ہدایت کر دی تھی کہ سب پر جرمانہ ضرور کیا جائے۔ چنانچہ منٹو اور عصمت پر دو دو سو جرمانہ اور باقی سب پر بیس بیس روپے جرمانہ ہوا۔ میں نے سات سو روپے وکیل کو دے کر ہائی کورٹ میں اپیل کی۔ جج انگریز تھا، اس کے سامنے کالی شلوار، دھواں اور لحاف کا انگریزی ترجمہ پیش ہوا تو اس نے فیصلہ لکھا کہ ان افسانوں میں کچھ بھی فحش نہیں۔ میں نے ان کتابوں کے نئے اڈیشن فوراً چھاپ دیئے۔ وکیل نے کہا "آپ سب کے جرمانے واپس ہو سکتے ہیں۔ میں درخواست دے دوں؟"

میں نے کہا "آپ جرمانے واپس لے لیجئے۔ ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے۔"

تقریباً ڈھائی ہزار روپیہ ان پیشیوں میں ضائع ہوا مگر میں خوش تھا کہ چوہدری صاحب کو منہ کی کھانی پڑی۔ منٹو پر انہوں نے اور بھی کئی مقدمے چلائے مگر شاید ایک ہی جرمانہ قائم رہا، باقی سارے مقدمے اپیلوں میں خارج ہو گئے۔ دلی میں ترقی پسند اور جدت پسند ادیبوں کا لیڈر مجھے سمجھا جاتا تھا۔ جب سجاد ظہیر نے ترقی پسند تحریک شروع کی تو ان کی خواہش کے مطابق میں نے ہی ترقی پسند مصنفین کی پہلی انجمن قائم کی تھی اور میں ہی اس کا سکریٹری تھا۔ رسالہ شاہجہاں کو میں نے اس انجمن کا آرگن بنا دیا تھا۔ جب اس کے مقاصد نے غلط رخ اختیار کیا تو میں نے اس انجمن کو ختم کر دیا اور "بزم تہذیب ادب" اس کے بدلے قائم کر دی جس میں پروفیسر مرزا محمد سعید جیسے جلیل القدر حضرات بھی شریک ہوتے تھے۔

اس بزم میں ڈرامہ اور اسٹیج کو بھی فروغ دیا۔ ہم نے چھ ڈرامے اسٹیج کئے اور کچھ رقم عربک کالج بلڈنگ فنڈ میں دی۔ میں نے بھی ان میں سے بعض ڈراموں میں ایکٹنگ کی تھی۔ کریپ کی داڑھی مونچھیں چپکانے سے میرا منہ سوج کر کپا ہو گیا تھا۔ آٹھ دن تک گھر میں منہ چھپائے پڑا رہا تھا۔ اس کے بعد کے ڈراموں میں نئی بنائی داڑھی پہن کر پارٹ کرتا تھا۔ فضل حق قریشی ڈراموں کی روح رواں ہوتے تھے۔ مردانہ رول بھی ادا کرتے تھے اور زنانہ بھی۔ ان کے علاوہ جبار غازی، موسیٰ اقبال اور ماسٹر ممتاز حسین تھے۔ یہ تینوں حضرات بعد میں جماعت اسلامی میں شریک ہو کر تمام "خرافاتوں" سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔

میں اتنی ادبی اور موسیقی کی انجمنوں کا صدر، سکریٹری یا مجلس عاملہ کا ممبر رہا ہوں کہ اب تو ان کی تعداد اور نام بھی یاد نہیں رہے۔ گوشہ گیری کے باوجود مجھے اب بھی بخشا نہیں جاتا۔ رانڈیں تو بہتیری بیٹھیں مگر رنڈوے بیٹھنے بھی دیں! شاہد احمد دہلوی کو نشان کا ہاتھی سمجھا جاتا ہے۔ یہ بھی اللہ کی مہربانی ہے، ورنہ میں تو ادب اور موسیقی کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔ خرابیٔ صحت اور بڑھتی ہوئی عمر کے باوجود بھی جو خدمت مجھ سے ہو سکتی ہے کرتا رہتا ہوں اور انشاء اللہ کرتا رہوں گا۔

۱۹۵۸ء کے اواخر میں جمیل الدین عالی کو ایک کل پاکستان جماعت ادیبوں کی بنانے کا خیال آیا تو انہوں نے چند مقامی مصنفین کو اپنے گھر بلایا۔ اس پہلے اجتماع میں صرف آٹھ ادیب شریک ہوئے تھے۔ قرۃ العین حیدر، قدرت اللہ شہاب، جمیل جالبی، عباس احمد عباسی، میں اور دو ایک اور۔ اس جماعت کے مقاصد پر گفتگو کرنے کے بعد اس کا نام پاکستان رائٹرز گلڈ

(ادارۂ مصنفین پاکستان) تجویز ہوا۔ مجھے اس کا کنوینر بنایا گیا۔ کیونکہ مجھے ادب میں نوپارٹی مین سمجھا جاتا تھا۔ میں نے پہلا کنونشن بلایا اور کوئی پانسو دعوت نامے جاری کئے۔ یہ دعوت نامے ہر زبان کے ادیبوں اور شاعروں کو بھیجے گئے تھے۔ خدا کے فضل سے سبھی شریک ہوگئے اور کراچی میں دو دن تک اس کی مختلف نشستیں ہوئیں، گرما گرم بحثیں ہوئیں، دستور بنا، گلڈ کی شاخیں کراچی لاہور اور ڈھاکہ میں قائم ہوئیں۔ مشرقی پاکستان سے تقریباً ۲۵ ادیب اس کنونشن میں شریک ہوئے تھے۔ الیکشنوں میں بڑا ہنگامہ رہا۔ یہ بھی طے ہوا کہ مرکز کراچی میں رہے گا۔ مجھے مرکز کا ایک رکن چنا گیا۔ دو نشستوں کی صدارت پروفیسر مرزا محمد سعید دہلوی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق نے کی۔ آخری نشست میں صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے نہ صرف شرکت فرمائی بلکہ جلسے سے نہایت حوصلہ افزا خطاب بھی کیا۔ گلڈ نے ہر زبان اور ہر خیال کے ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا۔ یہی گلڈ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ حکومت نے ایک لاکھ روپے سالانہ کی امداد گلڈ کے لیے منظور کی، اور یہ امداد غیر مشروط ہے۔ پانچ سال میں گلڈ کی متعدد ذیلی شاخیں قائم ہو چکی ہیں اور ادیبوں کی بہبود کے لیے گلڈ سرگرم عمل ہے۔ چار سال مرکزی گلڈ کی رکنیت کے بعد مجھے کراچی علاقائی گلڈ کا سکریٹری چنا گیا۔ یہ عہدہ گلڈ کا سکریٹری مرکزی مجلس عاملہ کا رکن بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا اب میرے سپرد گلڈ کی دو خدمتیں ہیں۔ جمیل الدین عالی گلڈ کے روح رواں ہیں۔ انہی کی کوششوں سے پچیس پچیس ہزار سالانہ کے آدم جی اور داؤد انعامات سال کی بہترین تصانیف پر ادیبوں اور شاعروں کو دینے کے لیے گلڈ کو حاصل ہوئے۔ سکریٹری جنرل قدرت اللہ شہاب کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ وہ آجکل ہالینڈ میں پاکستانی سفیر ہیں۔ گو ہماری آنکھوں سے دور ہیں مگر ہمارے دلوں سے قریب ہیں۔

ایک قابل ذکر انجمن جس کی بنیاد مولانا رازق الخیری ایڈیٹر عصمت اور میں نے مل کر رکھی۔ انجمن ادبی رسائل پاکستان ہے۔ ادبی رسائل کا تعلق تہذیب و ثقافت سے ہوتا ہے اس لیے ان کے مسائل اخباروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ پاکستان میں اخباروں کی ایک سے زیادہ انجمنیں ہیں مگر ادبی رسائل کی کوئی انجمن نہیں تھی۔ اس کی ضرورت کو محسوس کر کے مولانا خیری نے مجھے یاد فرمایا اور مجھ سے مشورہ کیا۔ در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست۔ ہم نے کراچی کے تمام ادبی اور غیر فلمی رسائل کے ایڈیٹروں کو عصمت کے دفتر میں آنے کی دعوت دی اور مولانا نے اس انجمن کی ضرورت اور اس کے مقاصد بیان کئے۔ اتفاق رائے سے انجمن قائم ہوگئی اور وقتی طور پر مولانا خیری کو انجمن کا صدر اور مجھے سکریٹری چنا گیا۔ اس کی ایک مجلس عاملہ بھی بنا دی گئی اور ممبر سازی کی مہم شروع ہوگئی۔ ہم نے اس انجمن میں پاکستان میں بولی جانے والی تمام زبانوں کے ادبی رسائل کو شریک کر لیا۔ اردو، انگریزی، بنگالی، پنجابی، پشتو، بلوچی، سندھی اور گجراتی میں شائع ہونے والے ادبی رسالوں کو انجمن کا ممبر بنا لیا۔ ان کی تعداد کم و بیش ایک سو تھی۔ اس کا پہلا سالانہ جلسہ لاہور میں کیا گیا۔ ملک فیروز خاں نون اس وقت وزیر اعلیٰ پنجاب تھے۔ انہوں نے نہ صرف افتتاحی جلسے میں شرکت فرما کر حاضرین سے خطاب کیا بلکہ یہ بھی کہا کہ اگر اس انجمن کو غیر نفع ساز انجمن رجسٹر کرا لیا جائے تو پانچ ہزار کا عطیہ بھی دیں گے۔ انجمن رجسٹرڈ بھی ہوگئی اور عطیہ بھی مل گیا۔ انجمن نے اپنی بساط بھر رسائل کی خدمت کی، مثلاً جس زمانے میں کاغذ کا کال پڑا تو انجمن نے رسالوں کا کوٹہ حکومت سے مقرر کرایا بلکہ لاہور کے دو ایک رسالوں کو یہاں سے کاغذ بھی بھجوایا۔ سرکاری اشتہارات رسالوں کو نہیں ملتے تھے۔ محکمے کے سکریٹری سید ہاشم رضا صاحب سے اس قدغن کو دور کرایا۔ اور کئی رسالوں کو سرکاری اشتہارات ملنے لگے۔ کمپنیوں اور کارخانوں میں انجمن کے وفد گئے اور جو لوگ ان کے کرتا دھرتا تھے انہیں

باور کرایا کہ رسائل میں اشتہار دینا بھی ان کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ محکمہ اطلاعات کے جتنے بھی سکریٹری اور وزیر آئے سب سے مل کر ادبی رسائل کی اہمیت و افادیت انہیں بتائی اور انہیں رسالوں کی مشکلات کی طرف متوجہ کیا۔ مگر جب وہ انجمن کے لئے کچھ کرنے کو ہوئے تو ان کی وزارت ختم ہو گئی یا حکومت ہی بدل گئی۔ پچھلا سالانہ اجلاس لاہور میں ہوا تھا جس میں اس وقت کے سکریٹری اطلاعات و نشریات سید ہاشم رضا صاحب نے اپنے خطاب میں بڑے کام کی باتیں کہیں اور اپنے محکمے سے انجمن کے اخراجات کے لئے روپیہ بھی دیا۔ لاہور میں جب بھی انجمن کا جلسہ ہوا انجمن کے سرگرم رکن محمد طفیل صاحب مدیر نقوش نے سارے انتظامات کئے اور بیشتر اخراجات بھی اپنے ذمہ لیئے۔ اس انجمن سے جہاں اور کئی فائدے ہوئے یہ فائدہ بھی ہوا کہ تمام زبانوں کے ادبی کام کرنے والے مدیر ایک دوسرے سے قریب آگئے اور ان کے بہت سے باہمی اختلافات دور ہو گئے۔ مگر حکومت کی نظر میں جو درجہ ادبی رسائل کو حاصل ہونا چاہیئے وہ ابھی تک حاصل نہیں ہوا ہے۔ اور اس کے لئے انجمن جدوجہد کر رہی ہے۔

۱۹۵۸ء کی گرمیوں میں ایک دن این ایم خان چیف کمشنر کراچی نے مجھے یاد فرمایا۔ میں ان کے دفتر گیا تو انہوں نے کہا کہ سیٹو نے چند ایسے لوگوں کے نام پاکستان سے مانگے ہیں جو پاکستانی ثقافت سے سیٹو کے ممبر ملکوں کو روشناس کرا سکتے ہوں۔ میں چند نام کراچی سے بھیج رہا ہوں، ان میں آپ کا بھی نام شامل ہے۔ آپ مختصراً اپنے کام کا تعارف انگریزی میں لکھ کر مجھے جلدی بھیج دیجئے۔ سیٹو اور سنٹو کے نام تو سنے تھے مگر مجھے کچھ نہیں معلوم تھا کہ یہ کہاں ہیں اور ان کا کام کیا ہے۔ خان صاحب سے میں نے زیادہ بات نہیں کی مبادا میری لاعلمی ان پر ظاہر ہو جائے۔ گھر آ کر اپنے "کارنامے" لکھ کر انہیں بھیج دیئے۔ کئی مہینے گزر گئے، کسی قسم کی اطلاع نہ ملی۔ سوچا کہ اور بیسیوں تجویزوں کی طرح یہ تجویز بھی سرد خانہ میں ڈال دی گئی ہو گی۔ میں اسے بھول بھی گیا کہ اچانک مجھے سیٹو کے سکریٹری جنرل پوٹے سیراسن کا تار اور اس کے بعد چٹھی ملی کہ سیٹو نے تھائی لینڈ اور فلی پینیز میں پاکستان پر لکچر دینے کے لئے آپ کا انتخاب کیا ہے۔ آپ بتایئے کہ جلد از جلد کب روانہ ہو سکتے ہیں اور اپنے لکچروں کی تفصیل لکھیئے۔ میں اس اطلاع سے ایسا بولایا کہ گھنٹوں کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ سوچا کہ میاں جھکنڈ میں پڑ رہے ہو۔ انکار کردو کہ میں نہیں آ سکتا۔ مگر جب اس کا ذکر چند مخلص احباب سے کیا تو انہوں نے تاکید کی کہ اس پیش کش کو فوراً قبول کر لو۔ فرسٹ کلاس کا کرایہ ملے گا اور ۲۵ ڈالر روزانہ۔ اچھا اس کو بھی چھوڑ دو۔ یہ دیکھو کہ یہ کتنا بڑا اعزاز ہے کہ پورے پاکستان میں سے اس اہم ذمہ داری کے کام کے لئے تمہیں چھانٹا گیا ہے۔

میں نے سیٹو کی پیش کش کو قبول کرنے کی اطلاع سکریٹری جنرل کو دے دی۔ اور دس بارہ لکچروں کے موضوعات بھی انہیں لکھ دیئے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آگیا کہ سکریٹریٹ میں ڈاکٹر صمد شاہین ریسرچ آفیسر ہیں انہیں ایک مفصل خط لکھ کر دریافت کیا کہ معلوم کر کے لکھیں کہ یہ کیا معاملہ ہے اور اگر میں بنگ کاک آؤں تو کس ہوٹل میں ٹھہروں۔ دونوں خطوں کے جواب ایک ساتھ آئے۔ سیٹو کے دفتر نے لکھا کہ آپ کے موضوعات بہت پسند آئے۔ آپ کو اکیس دن تھائی لینڈ میں اور اکیس دن فلی پینیز میں رہنا ہو گا۔ تفصیلی پروگرام یہاں پہنچنے پر بنایا جائے گا۔ جلد از جلد آیئے۔ فروری سے اس علاقے میں گرمی شروع ہو جاتی ہے۔ مجھے اپنے سارے کام سمیٹنے تھے، سارے لکچر لکھنے تھے۔ موسیقی کے ریکارڈ بنا کر ساتھ لے جانے تھے اور

کپڑے بھی بنوانے تھے۔ صمد شاہین صاحب نے لکھا تھا کہ آپ کے لئے سریانون ہوٹل میں کمرہ روک لیا گیا ہے۔ یہ ہوٹل ہمارے گھر کے بالکل قریب ہے۔ جلد آنے کی کوشش کیجئے۔

میں اپنے ساز و سامان سے لیس ہو کر وسط فروری میں روانہ ہو گیا۔ مجھے کے۔ ایل۔ ایم سے روانہ ہونا تھا اور اسی کی اطلاع میں نے سیٹو اور صمد صاحب کو دی تھی مگر ائیرپورٹ پہنچ کر معلوم ہوا کہ آج کے۔ ایل۔ ایم بارہ گھنٹے لیٹ ہے۔ ایک گھنٹہ بعد ائیر فرانس جانے والا تھا، میں اس سے روانہ ہو گیا۔ صبح کے اندھیرے میں بنگ کاک پہنچا تو ایک کسٹم آفیسر نے بتایا کہ آپ کو لینے سیٹو کے دو افسر آئے تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ کے۔ ایل۔ ایم نہیں آ رہا تو واپس چلے گئے۔ میرا سامان نہیں دیکھا گیا کیونکہ مجھے وی۔ آئی۔ پی قرار دیا گیا تھا۔ کسی نے مجھے ائیر فرانس کی شہر جانے والی بس میں بٹھا دیا اور اس سریانون ہوٹل پہنچا دیا۔ بڑا ہوٹل تھا اور کمرے کا کرایہ ۳۵ روپے روزانہ تھا، کھانے کے علاوہ۔ ناشتہ کے بعد میں سیٹو کے دفتر گیا۔ ڈاکٹر صمد شاہین کو اطلاع کرائی۔ وہ فوراً آ کر گلے ملے "آپ کس جہاز سے آئے ہیں اور یہاں کا کلچرل آفیسر آپ کو لینے گئے تھے۔" میں نے انہیں تبدیلی کی وجہ بتائی، بہت سی باتیں ہوئیں، کافی پی۔ اس کے بعد وہ مجھے شعبہ ثقافت میں لے گئے۔ اور وہاں کے کارکنوں نے مجھے سکریٹری جنرل اور سفیر پاکستان مسٹر برک سے ملوایا جو اتفاق سے وہاں موجود تھے۔ برک صاحب بولے "آپ کا انتخاب سیٹو کے آٹھ ممبر ملکوں کے سفیروں اور سکریٹری جنرل نے بہ اتفاق رائے کیا ہے۔"

"آپ کا شکریہ۔" میں نے کہا

بولے "جی نہیں۔ آپ پر کسی نے کوئی احسان نہیں کیا ہے۔"

روداد طویل ہے۔ مختصراً یہ کہ تھائی لینڈ میں میں نے بارہ لکچر دیئے۔ ایک ڈھائی گھنٹے کا لکچر پاکستان کی موسیقی پر مع نمونوں کے دیا۔ بعض باتیں خود گا کر بھی بتائیں۔ اس لکچر میں دوسرے ملکوں کے سفیر بھی شریک ہوئے تھے اور دو سو کے قریب چیدہ چیدہ صاحب ذوق بلائے گئے تھے۔ ہندوستانی سفارت خانے کا اسٹاف بھی تھا۔ لکچر ختم ہونے پر سوال جواب بھی ہوئے۔ جلسہ برخواست ہونے پر سب سے پہلے برک صاحب نے آ کر ہاتھ ملایا اور اتنی تعریف کی کہ میں شرمندہ ہو گیا۔ بنگ کاک کے علاوہ مجھے بعض نزدیک اور چھوٹے شہروں میں بھی بھیجا گیا۔ صوبوں کے گورنروں نے استقبال کیا۔ تھائی لینڈ کے لوگ بالکل مشرقی مزاج کے ہیں۔ ان کی اپنی ایک تہذیب ہے۔ بدھ مت کے پیرو ہیں۔ لاکھوں بدھ کی مورتیاں ان کی عبادت گاہوں میں ہیں اور ان پر اتنا سونا چڑھا ہوا ہے کہ اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ تھائی لینڈ میں سب اپنی ترقی یافتہ زبان تھائی بولتے ہیں۔ ذریعہ تعلیم بھی تھائی ہے۔ بہت کم لوگوں کو انگریزی آتی ہے۔ لکچر کے بعد اکثر مقامی لوگ مجھ سے پوچھتے تھے کہ کیا آپ نے لندن یا آکسفورڈ میں پڑھا ہے؟ میں کہتا نہیں، اپنے ہی ملک میں پڑھا ہے اور ہمارے ملک میں ہر شخص کم از کم تین زبانیں جانتا ہے۔ ایک انفارمیشن آفیسر اور ایک کار میرے لئے ہر وقت موجود رہتی۔ مجھ سے سب خوش ہوئے اور میں سب سے خوش ہوا۔

صمد شاہین اور ان کی بیگم ممتاز شیریں نے مجھے یہ بھلا دیا کہ میں ایک اجنبی دیس میں ہوں۔ انہوں نے کہا کہ آپ رہیے ہوٹل میں تاکہ آپ کو زیادہ آرام ملے مگر کھانا آپ ہمارے ساتھ کھائیے۔ میں نے تکلف برتا تو انہوں نے بتایا کہ ہوٹلوں میں کھانا سور کی چربی میں پکتا ہے۔ لہٰذا شکریہ کے ساتھ میں ۱۲ دن تک انہی کے ساتھ کھاتا رہا۔ خالی وقت بھی انہی دونوں کے ساتھ گزرا۔ ان کا یہ احسان

احسان ایسا ہے کہ میں اس سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ رخصت کرنے بھی دونوں میاں بیوی ایئرپورٹ تک رات کے چار بجے آئے۔

منیلا پہنچا تو پاکستان کے سفارت خانے کے فرسٹ سکریٹری مسٹر حسین اور سیٹو کے ایک افسر نے پذیرائی کی اور مجھے منیلا ہوٹل میں پہنچا دیا۔ سٹریانون کی طرح یہ بھی ایک اوسط درجے کا ہوٹل تھا مگر کمرہ کوئی ۵۰ روپے روز کا تھا۔

شام کی چائے پر محکمہ تعلیمات کی ایک خاتون افسر ہمارے فرسٹ سکریٹری کے ساتھ آگئیں اور میرے لیکچروں کا پروگرام مجھے بتا گئیں۔ ان کے جانے کے بعد میں اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مغرب کے بعد ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ کاؤنٹر والے نے اطلاع دی کہ سفیر پاکستان آپ سے ملنے آئے ہیں۔ رات کی دعوت کا بلاوا حسین صاحب ان کی طرف سے مجھے پہلے دے چکے تھے۔ میں کپڑے پہن کر نیچے اترا تو دیکھا کہ پیر علی محمد راشدی صاحب سامنے کھڑے ہیں۔ میں نے ان سے مصافحہ کرنا چاہا تو انہوں نے گلے لگا لیا۔ ان کے ساتھ ان کے چھوٹے بھائی پیر حسام الدین راشدی بھی تھے۔ اصل میں میری ملاقات انہی سے تھی اور میں نے اپنی آمد کی اطلاع بھی انہی کو دی تھی۔ وہ بھی لپٹ گئے۔ دونوں کے ساتھ ان کی کوٹھی پر آیا۔ ہسپانوی وضع کی شاندار کوٹھی تھی۔ مزے مزے کی باتیں ہوتی رہیں۔ جب ہم کھانے کے کمرے میں پہنچے تو راشدی صاحب کی بیگم بھی آگئیں۔ یہ مشرقی پاکستان کی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ انگریزی بہت اچھی بولتی ہیں۔ ادب اور موسیقی کا خاص ذوق رکھتی ہیں۔ گلڈ کے کنونشن میں مشرقی پاکستان کے مشہور ادیبوں سے میری ملاقات ہو چکی تھی۔ بیگم راشدی نے ان میں سے کئی کو پوچھا۔ چند فنکاروں کا تذکرہ بھی ہوا کہ اچانک بیگم راشدی نے پوچھا "شاہد صاحب کہاں ٹھہرے ہیں؟" اور جواب کا انتظار کیے بغیر بولیں "یہیں کیوں نہیں آجاتے۔ یہ برابر والا کمرہ خالی ہے۔ آپ کھانے کے بعد جا کر انہیں یہیں لے آئیے۔ ہوٹلوں کا کھانا یہاں ٹھیک نہیں ہوتا۔" راشدی صاحب نے کہا "ہاں یہیں آجائیں تو ٹھیک ہو گا۔" پھر انہوں نے بتایا کہ یہاں بھی سور کی چربی ہی چلتی ہے۔ بیگم نے کہا "ان کے ہوٹل جانے کی ضرورت نہیں ہے، کار بھیج کر سامان منگوا لیجیے۔" میں نے کہا "میرا سامان کمرے میں پھیلا ہوا ہے۔ صبح مجھے بلوا لیجیے۔" غرض اگلے دن میں راشدی صاحب کی کوٹھی میں آگیا۔ بیگم اور دونوں بھائیوں نے مجھے پھول پان کی طرح رکھا۔ یہاں کی یونیورسٹی اور میوزک یونیورسٹی میں میرے لیکچر ہوئے اور چند چھوٹے شہروں میں بھی۔ ۲۲ دن عزت و آرام سے فلپینز میں گزارے۔ اس ملک کی کوئی اپنی تہذیب مجھے دکھائی نہیں دی۔ امریکی تہذیب یہاں والوں نے اختیار کر لی ہے اور انگریزی بولتے ہیں۔ مذہباً عیسائی ہیں۔ اب انہیں اپنی مادری زبان "تغالو" کو ترقی دینے کا احساس ہوا ہے۔ ایک بہت دولت مند لوگوں کے ادارے نے مجھے لنچ دیا۔ اس کے صدر نے انگریزی میں کہا "میں اپنی زبان تغالو میں تقریر کروں گا۔ مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ معزز مہمان کس زبان میں بولیں گے۔" پھر خدا جانے انہوں نے اپنی مختصر تقریر میں کیا کہا۔ سب نے تالیاں بجائیں۔ میں نے جوابی تقریر کرنے سے پہلے انگریزی میں کہا "مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کو اپنی زبان اتنی پیاری ہے کہ اس کے آگے آپ اپنے مہمان کی بھی کوئی پروا نہیں کرتے۔ مجھے بھی اپنی زبان ساری دنیا کی زبانوں سے پیاری ہے۔ اس لیے میں اردو میں بولوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے پاکستان سے متعلق اردو میں پانچ سات منٹ کی تقریر کی۔ سب نے خوش ہو کر تالیاں بجائیں اور کھانا شروع ہو گیا۔

میں ۲۲ دن فلپینز میں رہا اس کے بعد اپنے خرچ سے جاپان چلا گیا۔ ۲۵ سال پہلے میں نے پروفیسر برلاس کی مدد سے ساقی کا "جاپان نمبر" شائع کیا تھا۔ پروفیسر برلاس میرے رشتے کے بھائی تھے اور ان کی بیگم بھی ننھیال کے رشتے سے میری بہن

ہوئی تھیں۔

پروفیسر برلاس ٹوکیو میں اردو کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے ۱۸ سال جاپان میں اردو پڑھائی تھی۔ جاپان نمبر کے شائع کرنے کے بعد ہی سے مجھے جاپان دیکھنے کی خواہش پیدا ہوگئی تھی۔ جاپان میں میں سولہ سترہ دن رہا۔ برلاس صاحب کے زمانے کا جاپان اب کہاں؟ جنگ کے بعد امریکی تسلط نے جاپان کی قدیم ثقافت کو بہت کچھ ختم کر دیا۔ ٹوکیو ایک کروڑ آبادی کا شہر ہے اور دنیا کے بڑے سے بڑے شہروں کا مقابلہ کرتا ہے۔

میں نے عید الفطر کی نماز ٹوکیو کی ترکی مسجد میں پڑھی۔ سو سوا سو مسلمان موجود تھے۔ پاکستانی سفارت خانے نے عید کی دعوت میں مجھے بھی بلایا تھا۔ سب سے ملاقات ہوئی۔ میرے دوران قیام ہی میں ولی عہد کی شادی ہوئی۔ اور اتفاق سے اپریل کا پہلا اور دوسرا ہفتہ ہی موسم اور پھولوں کے لحاظ سے ایسا ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے سیاح جاپان آتے ہیں۔ چیری بلاسم کی بہار اسی موسم میں دیکھی جاتی ہے۔ جاپان کے لوگوں کو دیکھ کر قائل ہونا پڑا کہ یہ قوم کبھی نہیں مر سکتی۔

جاپان سے واپسی میں میں ہانگ کانگ ٹھہرا۔ یہ فری پورٹ ہے اور یہاں دوسرے ملکوں کی درآمد کی ہوئی چیزیں تقریباً آدھی پونی قیمت پر مل جاتی ہیں۔ جاپان کے پاکستانی سفارت خانے میں دو ایک حضرات ایسے مل گئے تھے جو غائبانہ مجھے جانتے تھے۔ انہوں نے بڑی خاطر تواضع بھی کی تھی۔ ان سے میں نے ہانگ کانگ میں پاکستان ٹریڈ کمیشن کے ایک کارکن کے نام تعارفی چٹھی لے لی تھی۔ میں ہانگ کانگ میں اس دفتر کو تلاش کرتا چلا جا رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی "کیا دیکھ رہے ہو؟"

اردو سن کر میرے کان کھڑے ہوئے۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک بڑے میاں چلے آرہے تھے۔ میں نے کہا "پاکستان ٹریڈ کمیشن کا دفتر دیکھ رہا ہوں۔"

بولے "وہ دیکھو، وہ اونچی سی بلڈنگ جو دکھائی دے رہی ہے۔ بس وہی ہے۔"

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور پوچھا "کیا آپ یہیں رہتے ہیں؟"

بولے "ہاں، کئی سال سے۔"

دفتر میں اختر صاحب سے ملا۔ بہت خوش ہوئے۔ بولے "پہلے کھانا کھاتے ہیں۔ آیئے۔" گھر سے ان کا کھانا آیا ہوا تھا۔ انہوں نے ایک صاحب کو ٹیلی فون کیا اور زبردستی مجھے کھانے میں شریک کیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم کافی پی رہے تھے کہ ایک صاحب آ گئے۔ اختر صاحب نے ان سے تعارف کرایا اور بتایا کہ "یہ صاحب اپنے والد کے ساتھ کئی سال پہلے یہاں آکر بس گئے تھے۔ ان کا کام ہی یہ ہے کہ آنے جانے والوں کو ان کی پسند کا سامان دلواتے ہیں۔ چلیئے ان کے ساتھ چل کر آپ کا سامان بازار میں دیکھ لیتے ہیں۔"

دو دن ہم نے کئی دکانوں میں سامان دیکھا۔ تیسرے دن اُن صاحب نے رات کو اپنے گھر کھانے کی دعوت دی۔ دن کو میرا سارا سامان مجھے خرید دیا۔ رات کو اختر صاحب کے ساتھ اُن کے گھر گیا۔ انہوں نے اپنے والد سے ملوایا۔ کبھی ہندوستان میں سرکاری ملازم تھے۔ پھر یہاں آکر بس گئے۔ اور یہیں شادی بھی کر لی۔ کمیشن ایجنٹ کا کام شروع کیا۔ اللہ نے برکت دی۔ لڑکے نے کام کو فروغ دیا اور سارا کام خود سنبھال لیا۔ کھانے کے بعد وہ مجھے ایک کمرے میں لے گئے۔ اس میں میرا سارا سامان آیا رکھا ہوا تھا۔ بولے "یہ سامان ایک مہینے کے اندر آپ کو کراچی میں مل جائے گا۔"

چار بجے رات کو دھواں دھار بارش میں یہ صاحب میرے ہوٹل میں آئے اور مجھے ہوائی جہاز پر سوار کرکے رخصت ہوئے۔ مجھے گھر سے نکلے دو مہینے ہو گئے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ پر لگ جائیں اور اڑ کر پہنچوں مگر سخت بارش اور کہر تھی اس لئے جہاز چار گھنٹے لیٹ روانہ ہوا۔ میں فرسٹ کلاس پسنجر تھا۔ حسبِ معمول اعلیٰ درجے کی شرابیں پیش کی گئیں۔ میں نے کہا "میں مسلمان ہوں، شراب نہیں پیتا اور نہ سور کا گوشت کھاتا ہوں۔"

ایر ہوسٹس نے حیرانی سے دیکھا۔ بولی "تو آپ کے لئے کافی لاتی ہوں۔"

پھر مجھے سگریٹ پیتے دیکھا تو کریون اے کی بہت ساری ڈبیاں دے گئی۔ کھانے کے وقت آکر کہا "نو پورک؟"

میں نے کہا "نو"

بولی "بیف اینڈ مٹن؟"

میں نے کہا "یس"

غرض یہ کہ اس نے چھوٹی موٹی چیزوں کی بھرمار کر دی۔ دوپہر کو بنکاک پر جہاز ٹھہرا، صمد شاہین اور ممتاز شیریں کی تپاک مہمان نوازی یاد آگئی۔ شام کو کلکتہ اترا اور رات کے ایک بجے کراچی۔ میں ہی ایک اترنے والا مسافر تھا۔ کسٹم والے بڑی شرافت سے پیش آئے۔ میرے ساتھ بہت سامان تھا مگر انہوں نے دیکھ بھال کر چھوڑ دیا کیونکہ کوئی چیز خلافِ قاعدہ نہیں تھی اور پاکستانی اجازت نامہ کے مطابق سامان تھا۔ باہر نکلا بیوی بچے اور عزیزوں اور دوستوں کا ہجوم تھا۔ چھ کاروں میں سب بھر کر آئے۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ بامراد و شاد کام اپنے گھر واپس پہنچ گیا۔ مجھے اس کی خوشی زیادہ تھی کہ میں نے اپنے ملک کی ایک اہم خدمت انجام دی۔ مشرق کے ملکوں میں پاکستان کو لوگ جانتے ہی نہیں۔ میری شیروانی اور ٹوپی کو دیکھ کر لوگ پوچھتے تھے "ARE YOU FROM INDIA?"

اور میں کہتا تھا "NO, FROM PKISTAN" تو وہ سوچ میں پڑ جاتے کہ یہ کونسا ملک ہے؟

پاکستان واپس آنے کے بعد پھر وہی روزانہ کنواں کھودنا اور پانی پینا۔ ایک مہینے بعد ڈھاکہ میں "یوم امیر خسرو" منایا گیا۔ مجھے بہ اصرار بلایا گیا۔ شاعروں کو تو فیس بھی مل جاتی ہے، صدر کو کوڑی بھی کوئی نہیں دیتا۔ مگر اردو، موسیقی اور خسرو کا معاملہ تھا اس لئے ڈھاکہ گیا۔

امیر خسرو کی موسیقانہ اختراعات پر خطبۂ صدارت دیا اور ان کے وضع کردہ موسیقی کے اسلوبوں کو عملاً پیش کیا۔ کئی مقامی محفلیں ہوئیں۔ انجمن ترقی اردو میں بھی ایک اجتماع ہوا اور کچھ بولنا پڑا۔ اردو کے سرگرم کارکنوں کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ میرے پرانے استاد ڈاکٹر عندلیب شادانی نے کھانے پر بھی بلایا اور پرانی یادیں تازہ ہوئیں۔ شرکت و صدارت کے سلسلے میں حیدر آباد سکھر، خیرپور، نواب شاہ، ملتان، لاہور، پنڈی کے چکر کاٹے اور ادبی ہنگامے رہے۔

۱۴ اگست ۱۹۶۳ء کو اخباروں میں اعلان ہوا کہ اس سال عطیۂ صدر "امتیازِ ادب" مجھے دیا گیا اور اس اعزاز کے ساتھ پانچ ہزار روپے بھی ہیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اتنا بڑا اعزاز بھی ملا اور بروقت مالی امداد بھی ہوئی۔ مجھے بچی کی شادی کر کے ۲ ستمبر کو اسے کینیڈا روانہ کرنا تھا اور یہاں روپے پیسے کے باب میں خیریت ہی تھی سخت پریشان ہو کر اپنے ہم زلف کی ضمانت پر

نیشنل بنک جا کر ممتاز حسن صاحب کی سفارش سے ایک ہی دن میں قرض حاصل کیا تھا جسے ادا کرنے کی بظاہر کوئی سبیل نہیں تھی کہ غیب سے انعام کا انتظام ہوا۔ جو اخراجات پہلے ہو چکے تھے اُن کے علاوہ فی الوقت اتنی ہی رقم خرچ ہوئی تھی۔ چھ سو شریک ہونے والوں کی مہمانداری کی گئی تھی۔ بھرم بندھا رہا اور اللہ نے عزت رکھ لی۔ رقم ملتے ہی بنک کا قرضہ ادا کر دیا اور پھر ہاتھ جھاڑ کر بیٹھ گیا۔ میرا بھروسا تو خدا پر ہے۔ وہی ساری مشکلیں حل کر دیتا ہے۔

میری عمر اس وقت ۷۰ سال کی ہے۔ بہت گئی تھوڑی رہی، اللہ باقی بھی ساتھ خیر کے گزار دے۔ سر چھپانے کو جگہ موجود ہے کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا مل جاتا ہے۔ اُجلے پوشی سے گزر ہو جاتی ہے۔ مادی دولت نہیں ہے تو کیا غم؟ سکونِ قلب کی دولت سے تو مالامال ہوں۔ بس یہ آرزو ہے کہ میرے سب بچے اپنے اپنے ٹھکانے سے ہو جائیں اور میں حج بیت اللہ سے مشرف ہو جاؤں۔ بس پھر میں اطمینان سے مر سکوں گا۔





گوپال مِتّل

"...... خدا جانے اس کا سبب میرا اپنے مسلمان دوستوں پر کامل اعتماد تھا یا دیوانگی کی کوئی ترنگ کہ میں نے اُسے بتا دیا کہ جس شخص کو وہ یہ رُوداد سُنا رہا ہے۔ وہ ایک ہندو ہے۔ اُس کا لہجہ فوراً ہی بدل گیا کہنے لگا کہ اگر تم سے پرسوں ملاقات ہوئی ہوتی تو میں تمھیں ضرور قتل کر دیتا۔ لیکن کل پاکستان قائم ہو گیا ہے اب تم میرے مہمان ہو ...."

میرے مزاج اور ذہن کی تشکیل میں میری ابتدائی زندگی کے ماحول کا بڑا دخل ہے۔ اس ماحول میں جو عوامل کارفرما تھے، ان کی منطقی توضیح میرے لئے ممکن نہیں، کیونکہ منطق کو عمل کی کسوٹی ماننے کا ان دنوں رواج سرے سے تھا ہی نہیں۔ کفر و ایمان میں کوئی واضح خطِ امتیاز موجود نہیں تھا۔

میری ولادت ریاست مالیر کوٹلہ کی ہے۔ یہ غالباً واحد ریاست تھی جس کی بنیاد کسی صاحبِ سیف و سناں نے نہیں بلکہ ایک مجذوب حیدر شیخ نے رکھی تھی۔ شیخ وہ اپنے روحانی مرتبے کی وجہ سے کہلاتے ہیں۔ ویسے نسباً وہ پٹھان تھے۔ میرے والد کا کہنا تھا کہ مجذوبیت کی شان حکمران خاندان میں بدستور برقرار ہے۔ خاندان کے افراد میں سے کسی نہ کسی میں مجذوبیت کی ادا ضرور ہوتی تھی۔ اتنا میرے ذاتی علم میں بھی ہے کہ نواب احمد علی خاں مرحوم کے ایک بھائی تعویذ تقسیم کیا کرتے تھے۔ شیخ حیدر کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کی وفات کے بعد ان کا مقبرہ راتوں رات خود بخود تعمیر ہو گیا تھا اور اس میں چونے یا گارے کا مطلق استعمال نہیں ہوا۔ ایسا ہوا کہ نہیں، اس سے بحث نہیں لیکن ریاست کے ہندو مسلمان سبھی اس پر متفق تھے کہ یہ محض روایت نہیں۔

یہ بھی مشہور تھا کہ حیدر شیخ کے نام پر جو شخص بھی اولادِ نرینہ کے لئے منّت مانتا ہے، خدا اس کی مراد ضرور پوری کرتا ہے۔ منّت پوری ہونے کے بعد شیخ کے مزار پر بکرے کی قربانی دینا ہوتی تھی لیکن منّت ماننے والوں میں بہت سے ہندو بھی ہوتے تھے جن کے لئے قربانی دینا آسان نہیں تھا۔ درمیانی راہ یہ نکالی گئی تھی کہ منت ماننے والا ہندو بکرے کی گردن میں سُرخ دھاگا باندھ کر اسے مقبرے میں چھوڑ دیتا۔

کہا جاتا ہے کہ جب سرہند کے صوبہ دار نے گورو گوبند سنگھ کے بیٹوں کو دیوار میں چنوانے کا حکم جاری کیا تو ریاست کے اس وقت کے حکمران نے احتجاج کیا تھا اور "آہ" کا نعرہ بلند کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سکھ ریاستوں میں گھرا ہونے کے باوجود ریاست مالیر کوٹلہ کی سرحدوں پر کبھی کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ ریاست کے نوابوں نے اپنی شانِ کج کلاہی کو بھی برقرار رکھا۔ والد سناتے تھے کہ ایک بار ریاست پٹیالہ کا کوئی ہندو اہلکار مہاراجہ کے عتاب سے بچنے کے لئے مالیر کوٹلہ بھاگ آیا۔ پٹیالے کی پولیس نے ریاستی حکام کی اجازت سے ریاست کی حدود میں داخل ہو کر اسے گرفتار کر لیا۔ جب اسے گرفتار کر کے لے جایا جا رہا تھا تو اس کی زبان سے نکلا: "افسوس! مالیر کوٹلہ والوں نے بھی پناہ نہیں دی" یہ لفظ کسی مسلمان لکڑہارے نے سن لیے، وہ کلہاڑی لے کر پٹیالہ پولیس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔ اور اہلکار سے کہا "لالہ! بیٹھ جا" بات نواب صاحب تک پہنچی تو فرمایا کہ "مہاراجہ پٹیالہ سے کہنا، ہم نے ان کا ایک مفرور رکھا، وہ ہمارے دو مفرور رکھ لیں۔ اتنی سی بات پر میں بھائیوں سے کیا جھگڑا کروں؟" چنانچہ لالہ جی مالیر کوٹلے ہی میں رہے اور اپنی باقیماندہ زندگی وہیں بڑے مزے میں بسر کی۔

حکمران خاندان کے افراد پگڑی سکھوں کی طرح باندھتے تھے لیکن ان کی باقی عادات پاس پڑوس کے مہاراجاؤں سے کافی مختلف تھیں۔ رعایا کی بہو بیٹیوں کو اپنی بہو بیٹی سمجھتے تھے۔ قدیم دور کے بارے میں میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا لیکن نواب احمد علی خاں مرحوم نے شادیوں کے معاملے میں بھی شرعی حدود سے تجاوز نہیں کیا۔ ان کے معالج خصوصی میرے کرمفرما

تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ نواب صاحب کی شراب نوشی بھی صرف اس حد تک تھی کہ رات کے کھانے کے بعد برانڈی کا ایک پیگ لے لیا کرتے تھے۔

اپنے مذہب کے احترام کے باوصف، حکمراں خاندان میں مذہبی تعصب بالکل نہیں تھا بلکہ انتہا درجے کے روادار لوگ تھے۔ محل میں صرف عیدین ہی نہیں، ہولی اور دیوالی کے تہوار بھی منائے جاتے تھے۔ جو رواداری حکمرانوں میں تھی وہی رعایا میں بھی تھی۔ محرم کے دنوں میں ہندوؤں کی سبیلیں، مسلمانوں کی سبیلوں سے کچھ زیادہ ہی ہوتی تھیں۔

فرقہ وارانہ فساد ریاست میں کبھی نہیں ہوا۔ ایک بار کشیدگی ضرور پیدا ہوئی تھی جو باہر سے آنے والے پرچارکوں اور مولویوں کی شرارت کا نتیجہ تھی۔ مولویوں نے مسلمانوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ وہ ریاست کے حکمراں ہیں۔ نواب صاحب نے بہت سمجھایا کہ بھائی حکمراں تو میں ہوں، باقی لوگ خواہ وہ ہندو ہوں، مسلمان ہوں یا سکھ ہوں، میری رعایا ہیں۔ لیکن کچھ مسلمانوں کا گرما ہوا خون اعتدال پر نہ آسکا۔ آخر نواب صاحب کو سختی کرنا پڑ گئی۔ اس پر ایک مولوی صاحب نے مالیر کوٹلے کو دارالحرب قرار دے کر ہجرت کا فتویٰ صادر کر دیا۔ ظاہر ہے جن مسلمانوں نے اس فتوے پر عمل کیا انھیں کافی پریشانیوں کا سامنا ہوا لیکن پھر رفتہ رفتہ سب واپس آگئے۔

۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں بھی مالیر کوٹلے کی زمین انسانی خون سے آلودہ نہیں ہوئی۔ جو مسلمان مالیر کوٹلے کی سرحد میں داخل ہو جاتا تھا، فسادی اس کا تعاقب چھوڑ دیتے تھے۔ یہ انتظام نواب صاحب نے کر ہی رکھا تھا کہ ان کی ہندو رعایا کو مہاجرین کے ہاتھوں کوئی گزند نہ پہنچے۔

ریاست کے ہندو مسلمانوں کے مراسم کچھ اس قسم کے تھے کہ بے تعصبی کا لفظ بھی ان کی پوری وضاحت نہیں کرتا۔ ایک دوسرے کے عقائد کا احترام وہ اس حد تک کرتے تھے کہ بعض صورتوں میں خود اپنے عقائد کا احترام بھول جاتے تھے۔ مثلاً شب برات کے موقع پر ہمارے گھر مسلمان احباب حلوہ لے کر آتے تھے۔ حلوے کا تھال ہندو حلوائی کے سر پر ہوتا۔ آنے والا دوست دروازے کی کنڈی کھٹکھٹاتا، والد صاحب باہر نکلتے تو ان سے مصافحہ کر کے ایک طرف کھڑا ہو جاتا۔ حلوہ گھر میں پہنچانا ہندو حلوائی کا کام تھا۔ انھیں کبھی خیال نہیں گزرتا تھا کہ اس طرح وہ ہندوؤں کے چھوت چھات برتنے کے حق کو تسلیم کر رہے ہیں ۔۔۔ اس ماحول میں پلنے بڑھنے والا مذہبی منافرت اور تعصب کے مرض کا شکار کیونکر ہو سکتا ہے؟ چنانچہ اب، لوگ جب میری بے تعصبی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جیسے وہ مجھے کوئی سند عطا کر رہے ہوں، تو مجھے حیرت بھی ہوتی ہے اور ہنسی بھی آتی ہے۔

میری ابتدائی تعلیم مالیر کوٹلے ہی میں ہوئی۔ اپنے اساتذہ میں سب سے زیادہ ممنون میں منشی کریم بخش کا ہوں جنھوں نے مجھے فارسی پڑھائی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر کوئی لڑکا "گلستاں" اور "بوستاں" صحیح ڈھنگ سے پڑھ لے تو سمجھو اسے پوری فارسی آگئی اور یہ بھی کہ "گلستاں" اور "بوستاں" صحیح ڈھنگ سے صرف وہی پڑھا سکتے ہیں۔ انھوں نے دو شادیاں کی تھیں۔ میں شام کے وقت پڑھنے جاتا، کبھی ایک گھر پہ کبھی دوسرے گھر پہ۔ ان کا طریقِ درس واقعی نرالا تھا۔ کبھی ایک شعر

کی وضاحت میں پورا گھنٹہ صرف کر دیتے اور اس دن کا درس اسی شعر پر ختم ہو جاتا، اور کبھی صفحے کے صفحے پڑھا دیتے۔ شعروں کی تشریح وہ کچھ اس انداز سے کرتے تھے کہ اس میں زیر درس شعروں کے علاوہ بھی بہت کچھ آجاتا تھا۔ مثنوی مولانا روم تک۔ ظاہر ہے جس لڑکے کو "گلستاں" "بوستاں" اس ڈھنگ سے پڑھائی جائیں گی وہ وہاں قناعت نہیں کرے گا۔ اس لئے ان کا یہ کہنا غلط نہیں تھا کہ جو لڑکا ان سے یہ دونوں کتابیں پڑھ لے اسے پوری فارسی آجاتی ہے۔

منشی جی کے عقائد عجیب و غریب تھے۔ گوشت خوری کے وہ سخت خلاف تھے لیکن اسلامی طریقۂ طبخ کو وہ دنیا میں افضل ترین مانتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ جو طریقۂ طبخ گوشت جیسی چیز کو اتنا لذیذ بنا دیتا ہے وہ سبزیوں کو تو اور بھی لذیذ بنا سکتا ہے۔ اپنے سبھی ہندو دوستوں کو وہ اسلامی طریقۂ طبخ سے آگاہی حاصل کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ گوشت کے معاملے میں تو میں ان کی رائے کا قائل نہ ہو سکا لیکن یہ صحیح ہے کہ اگر بعض سبزیاں اسی طریقے سے پکائی جائیں جس طرح گوشت پکایا جاتا ہے تو لذیذ تر ہو جاتی ہیں۔

مذہباً وہ شیعہ تھے۔ اتنے کٹر شیعہ کہ ان کی شاعرانہ صلاحیتیں صرف مرثیوں پر ہی نہیں بلکہ سرسیوں[1] پر بھی صرف ہوتی تھیں۔ کبھی موج میں ہوتے تو سرسیہ بھی سنانے بیٹھ جاتے۔ ظاہر ہے کہ "گلستاں" کے باب پنجم کی تشریح وہ جس تفصیل سے کیا کرتے تھے اس کے بعد سرسیہ سنانے میں کوئی حجاب مانع نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کے بیٹے کا نام محمد جان تھا جو میرا ہم عمر بھی تھا اور دوست بھی، لیکن عجیب بات ہے کہ جو لطف منشی صاحب کی معیت میں میسر آتا تھا وہ محمد جان کی صحبت میں کبھی میسر نہیں آیا۔

مالیر کوٹلے میں سنیوں کی اکثریت تھی، اس سے منشی جی اتنے چڑے کہ ایک وقت ایسا آیا جب وہ اسلام ہی سے بیزار ہو گئے اور اپنے لڑکے کا نام محمد جان سے بدل کر گیان چند رکھ دیا۔

نویں جماعت میں میں لاہور چلا گیا۔ وہاں میرے اردو اور فارسی کے معلم جناب مولا راج تھے۔ ششماہی امتحان میں اردو کے پرچے میں میرا مضمون انھیں اتنا پسند آیا کہ اسے دسویں جماعت کے لڑکوں کو جا کر سنایا اور یہ پیشگوئی کی کہ بڑا ہو کر یہ لڑکا ادیب اور شاعر بنے گا۔ لاہور سے میرا دل کچھ ہی مہینے میں اچاٹ ہو گیا اور میں پھر مالیر کوٹلے پہنچ گیا۔ یہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر قریشی صاحب کا کرم تھا کہ انھوں نے مجھے نویں جماعت ہی میں داخلہ دے دیا۔ ورنہ میں ایک سال پیچھے رہ جاتا۔ قریشی صاحب ہمیشہ مجھ پر مہربان رہے۔ لیکن جہاں تک ان کی ضابطہ پسندی کا تعلق تھا، وہ اس میں کسی رعایت کے قائل نہیں تھے۔ یاد پڑتا ہے کہ ایک بار صرف پانچ منٹ دیر سے پہنچنے پر انھوں نے مجھے ساری کلاس کے سامنے بید لگائے تھے۔

مالیر کوٹلے میں شعر و شاعری کا اچھا خاصا ذوق تھا۔ شیخ بشیر حسین بشیر جو ریاست کے اعلیٰ اہلکار بھی تھے، اپنی کوٹھی پر مہینے میں دو بار طرحی مشاعرے کا اہتمام کرتے تھے اور ان کے شاگردوں کی اچھی خاصی فوج موجود تھی۔ شیخ بشیر داغ کے انداز میں شعر کہتے تھے دلّی ان کا آبائی وطن تھا اور ان کا خیال تھا کہ اگر وہ اچھی ملازمت کی تلاش میں دلّی نہ چھوڑتے تو داغ کو واقعی ایک جانشین مل جاتا۔

---

[1] ایک صنف سخن جس میں حضرت علی کے سوا باقی خلفا کی قدح کی جاتی ہے اور بہت واشگاف لہجے میں۔

دوستوں کے کہنے پر ایک بار ان کے مشاعرے میں میں بھی شریک ہوا۔ جو غزل پڑھی تھی اس کا ایک شعر آج تک یاد ہے :

جو بظاہر کشتگانِ شیوۂ تسلیم ہیں
ایک چنگاری نہاں ان کے بھی آب و گِل میں ہے

اس شعر پر مجھے داد تو ملی لیکن اس کے بعد مشاعرے میں شرکت کا دعوت نامہ کبھی نہیں ملا۔ غالباً شعر کے مفہوم میں کوئی خطرناکی تلاش کر لی گئی تھی۔ بہرحال میں نے جلال میرزا خانی سے مل کر جو تقریباً میرے ہم عمر تھے، ایک متوازی انجمن قائم کر لی۔ اور اس انجمن کے زیرِ اہتمام مالیر کوٹلے میں پہلی بار غیر سرکاری طور پر کل ہند مشاعرہ ہوا جس میں اختر شیرانی اور اُس دور کے متعدد دوسرے نامور شاعروں نے شرکت کی۔

ایف۔ اے۔ امتحان پاس کرنے کے بعد مجھے پھر لاہور جانا پڑا کیونکہ مالیر کوٹلے میں ایف۔ اے۔ کے بعد تعلیم کا انتظام نہیں تھا۔ لاہور پہنچ کر طبیعت کا لاابالی پن کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا۔ ذوقِ شعری کی وجہ سے شاعروں اور ادیبوں میں گھر جانا تو قدرتی تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ کشتی رانی اور برج کھیلنے کا چسکا بھی پڑ گیا۔ ان تمام باتوں کے باوجود اگر میں بی۔ اے کے امتحان میں کامیاب ہو گیا تو اسے ایک اتفاقی حادثہ سمجھنا چاہیئے۔

بی۔ اے۔ کرنے کے بعد فکرِ معاش لاحق ہوئی تو لدھیانے جا کر "صبحِ امید" کے نام سے ایک ادبی رسالہ جاری کر دیا۔ ریاست مالیر کوٹلہ کا باشندہ ہونے کی وجہ سے مجھے براہِ راست ڈیکلریشن چونکہ نہیں مل سکتا تھا اس لئے ڈکلریشن ایک مقامی دوست منصور لدھیانوی کے نام پر لیا گیا۔ منصور بہت اچھے غزل گو تھے اور شعر و ادب، بالخصوص غزل پر اچھی ناقدانہ نظر رکھتے تھے۔ "صبحِ امید" کے پہلے شمارے میں انھوں نے حالی کی غزل گوئی پر مضمون لکھا تھا وہ بہت پسند کیا گیا تھا۔ منصور کے علاوہ لدھیانے میں جن دوستوں کا قرب حاصل ہوا، ان میں نظیر حسین خان نظیر لدھیانوی، بال مکند عرش ملسیانی اور ایم۔ حسن لطیفی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

نظیر لدھیانوی اور عرش ملسیانی نے دفتر اور رہائش کے لئے مجھے اپنے پڑوس ہی میں جگہ لے دی تھی۔ گلی کے ایک کونے پر عرش کا مکان تھا اور دوسرے نکڑ پر نظیر کا۔ نظیر مدیرِ اعزازی کی حیثیت سے میرے شریکِ ادارت بھی تھے اور واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے میری سرگرم مدد کی۔

"صبحِ امید" شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو پسند آیا۔ لاہور سے اختر شیرانی اور دوسرے دوستوں نے اس کے لئے اپنی چیزیں بھیجی تھیں اور اسد ملتانی نے خیر مقدمی رباعی کہی تھی جو مجھے آج تک یاد ہے :

برخیز کہ گردوں بہ مرادت گردید
برخیز کہ رُخ نمود صبحِ امّید
تا جوش زند خوں بہ رگ و ریشۂ تو
برخیز و بخور بادہ ز جامِ خورشید

سب سے بڑی داد مجھے اس شمارے کی یہ ملی کہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے اپنے سہ ماہی رسالے "اردو" میں اس پر تبصرہ کیا۔ تبصرہ مجموعی طور پر ہمارے حق میں تھا البتہ دو ایک مضامین کے طرزِ نگارش کو (جو میری یا نظیر کی تصنیف نہیں تھے) زیادہ شوخ قرار دیا گیا تھا۔ تبصرے میں "صبح امید" کے اغراض و مقاصد پر بحث تھی۔ پرچے کا ایک مقصد ہم نے اُردو زبان کا تحفظ قرار دیا تھا۔ بابائے اُردو نے اس کا خیر مقدم کیا تھا اور اس پر مسرت کا اظہار کیا تھا کہ ابھی ایسے ہندو موجود ہیں جو اُردو زبان کے تحفظ و ترقی میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ میں اس تبصرے پر بہت خوش تھا لیکن اپنے ہندو ہونے کا ذکر مجھے پسند نہیں آیا تھا کیونکہ زندگی ایسی رہی تھی کہ ان خطوط پر کبھی سوچا ہی نہ تھا۔

لدھیانے میں جن لوگوں سے اس زمانے میں تعلق رہا ان میں ایم۔ حسن لطیفی کی شخصیت انتہائی دلچسپ ہی نہیں بلکہ عجوبۂ روزگار تھی۔ موصوف مغرب سے صحافت کی تعلیم حاصل کر کے آئے تھے۔ اچھے شاعر تھے اور علم کی بھی ان کے پاس فراوانی تھی۔ لیکن صحافت کی ڈگری کے ساتھ ساتھ وہ یورپ سے یہ خبط بھی لے کر آئے تھے کہ وہ مہدیٔ موعود ہیں۔ وہ تنہا نویسی کے اصول پر ایک پندرہ روزہ پرچہ نکالتے تھے۔ اس میں ان کی نظمیں بھی شائع ہوتی تھیں اور مضامین بھی۔ پرچے میں وہ اپنے مہدیٔ موعود ہونے کا پروپیگنڈہ کرتے تھے اور "نظریۂ مہدویت" کے نام سے انھوں نے ایک کتابچہ بھی لکھا تھا۔ پرچے پر مقامِ اشاعت لدھیانے کی بجائے ارضِ لُد لکھا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ بشارتوں کے مطابق مہدیٔ موعود ارضِ لُد سے اُٹھے گا اور لدھیانہ ہی ارضِ لُد ہے۔ کتابچے سے ان کا مہدیٔ موعود ہونا خواہ ثابت نہ ہوتا ہو لیکن ان کے کثیر المطالعہ ہونے کا ثبوت ضرور ملتا تھا۔ انھوں نے ماضی کی بشارتوں کا سہارا لے کر بڑے پرپیچ استدلال سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ ان کی ذات میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو مہدیٔ موعود میں پائی جانی چاہئیں۔ اپنے دعوٰیٔ مہدویت کی تائید میں وہ اقبال کا یہ شعر بھی استعمال کیا کرتے تھے:

ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار
وہی مہدی وہی آخر زمانی

اس سے خیال ہوتا تھا کہ مہدویت ان کے نزدیک وہبی نہیں بلکہ اکتسابی چیز تھی اور ان کے دعوے میں صرف جنون ہی کو دخل نہیں تھا۔ شاید انھوں نے اپنے طور پر ایک چال چلی تھی جو ناکام ہو گئی۔ اسباب خواہ کچھ ہوں نتیجہ عبرتناک تھا۔ مہدویت کے پرچار میں ان کی دولت بھی ٹھکانے لگتی گئی اور صحت بھی۔ جب میں ان سے ملا تھا تو وہ دھان پان سے رہ گئے تھے۔ سنا ہے کہ تقسیم کے بعد وہ پاکستان چلے گئے تھے۔ پھر ان کا کیا حشر ہوا، خدا ہی جانتا ہے۔

"صبح امید" کا صرف ایک شمارہ نکلا۔ اس کے بعد میں کچھ دن تک لدھیانے میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ پھر مالیر کوٹلے میں چند روزہ قیام کے بعد لاہور کا رُخ کیا۔ لاہور پہنچ کر ایک گونہ اطمینان ہوا کہ میرے ادیب اور شاعر دوست "صبح امید" کی ناکامی پر میرا مذاق نہیں اُڑا رہے تھے۔ انھیں مجھ سے ہمدردی تھی اور وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ مجھ میں ادبی کام کرنے کی صلاحیت ہے لیکن اس پر وہ سبھی متفق تھے کہ شعر و ادب کو ذریعہ معاش بنانا ممکن نہیں۔ ایک اچھا مضمون لکھ کر یا اچھا شعر کہہ کر داد وصول کی جا سکتی تھی، معاوضہ نہیں۔ میرزا عظیم بیگ چغتائی کے چچیرے بھائی فہیم بیگ چغتائی اور احسان دانش میرے اچھے

دوست تھے لیکن وہ دونوں خود پریشان حال تھے۔ اختر شیرانی کا معاملہ یہ تھا کہ:

میں تو خود اپنے بھی کوئی کام آسکتا نہیں

صرف حفیظ جالندھری تھے جن سے کچھ توقع کی جا سکتی تھی۔ انھوں نے میری مدد میں کسی بخل سے کام بھی نہیں لیا۔ اس دور کے بہترین ادیبوں سے میرا تعارف کرایا جن میں محمد دین تاثیر، پطرس بخاری، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، عبدالمجید سالک، پنڈت ہری چند اختر بھی شامل تھے۔ یہ لوگ مروّت سے پیش آئے لیکن معاش کا مسئلہ ان دنوں ستارہی پڑھا۔ آخر روزناموں کے دفتروں کا رُخ کیا اور وہاں کام مل بھی گیا لیکن طبیعت لگی نہیں۔ ادبی زندگی از سرِ نو شروع کرنے میں احسان دانش میرے معاون ہوئے۔ انھوں نے میرا تعارف مولانا تاجور نجیب آبادی سے، جنھیں بعد میں شمس العلما کا خطاب ملا، کرایا۔ غالباً تیسری یا چوتھی ملاقات میں مولانا تاجور نے مجھے مشورہ دیا کہ میں ان کے ادبی جریدے "شاہکار" کی ادارت سنبھال لوں۔ یہ پیش کش میرے لیے نعمت سے کم نہیں تھی اور میں نے اسے شکرگزاری کے ساتھ قبول کر لیا۔

"شاہکار" میں میری تنخواہ صرف تیس[30] روپے تھی لیکن دفتر میں میرے لیے باقاعدہ حاضری ضروری نہیں تھی۔ میری ذمہ داری صرف اتنی تھی کہ پرچہ مرتب کرکے اسے بروقت شائع کر دوں۔ "شاہکار" کے بیشتر لکھنے والے ایسے تھے جن کی تحریروں پر نظرِ ثانی کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ خانہ پُری کے لئے ابومحمد امام الدین رام نگری کے مضمون ہر وقت موجود رہتے تھے جو آٹھ آنے فی صفحہ کے حساب سے چھپتے تھے۔ ابومحمد امام الدین کے علاوہ آسی رام نگری کے مضامین بھی اکثر شمارے میں چھپتے تھے۔ ان دونوں حضرات کے بھیجے ہوئے بیشتر مضامین ہندی جرائد سے ترجمہ شدہ ہوتے تھے۔ ان کی طرف سے یہ اجازت بھی تھی کہ یہ مضامین کسی بھی نام سے شائع کئے جا سکتے ہیں۔ اگر کسی مہینے مضامین کی قلت ہوتی تو ان حضرات کے مضامین مختلف ناموں سے شائع کر دیئے جاتے۔ یہ نام زیادہ تر فرضی ہوتے لیکن کئی بار ایسا بھی ہوا کہ مولانا تاجور نے کسی کو نوازنا چاہا تو مضمون اس کے نام پر شائع کر دیا۔ ادارتی نوٹ "مختصرات" کے عنوان سے مولانا خود لکھتے تھے لیکن مجھے ہدایت تھی کہ اگر بروقت یہ مجھے نہ ملیں تو میں خود ہی لکھ دیا کروں۔

مجھے ملازم رکھتے وقت مولانا نے یہ وعدہ بھی فرمایا تھا کہ تنخواہ کے علاوہ مجھے منافع میں بھی ۲۵ فیصد کا شریک سمجھا جائے گا لیکن جتنی مدت میں وہاں رہا، مولانا کے بیان کے مطابق پرچے میں خسارہ ہی ہوتا رہا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے نہ تو ان کے وعدے پر کبھی سنجیدگی سے بھروسا کیا اور نہ کبھی اس کی یاددہانی ہی کرائی۔

تنخواہ کی کمی کے مسئلے کا حل جلد ہی نکل آیا۔ "شاہکار" کے دفتر کے قریب ہی ایک مکان پر "جگت لکشمی" کا سائن بورڈ نظر آیا۔ یہ ایک ہفت روزہ فلمی جریدہ تھا جسے کرن دیوان، جو آگے چل کر فلمی ہیرو بنے، نکال رہے تھے۔ کرن دیوان سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ انھیں کسی ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو اُن کے اخبار کے لئے ایڈیٹوریل وغیرہ لکھ دیا کرے۔ میں نے تیس[30] روپے ماہوار پر یہ ذمہ داری قبول کر لی۔

"جگت لکشمی" باقاعدہ شائع نہیں ہوتا تھا اور کرن دیوان اکثر مالی مشکلات میں مبتلا رہتے تھے۔ مجھے تنخواہ بھی باقاعدگی سے نہیں ملتی تھی اور اوسطاً بیس پچیس روپے ماہوار ہی پڑتے تھے لیکن دفتر کو کرن دیوان خوب سجا کر رکھتے تھے۔ میں اپنا زیادہ

وقت وہیں گزارتا اور "شاہکار" کا کام بھی وہیں بیٹھ کر کرتا تھا۔ ملنے والوں کا بھی، جو اکثر "شاہکار" کے سلسلے میں آتے تھے وہیں جمگھٹا رہتا۔

مولانا تاجور کا سلوک میرے ساتھ بہت مشفقانہ تھا۔ انھوں نے "شاہکار" کے قارئین سے میرا تعارف بہت اچھے لفظوں میں کرایا اور میری نثر اور میری شاعری کی دل کھول کر تعریف کی۔ ایک مرتبہ تو انھوں نے میرے ایک شعر پر ایک اچھا خاصا مضمون لکھ دیا۔ شعر تھا۔

مجھے زندگی کی دُعا دینے والے
ہنسی آرہی ہے تری سادگی پر۔

میرا یہ شعر زبان زدِ خاص و عام ہے اور میرا خیال ہے کہ اس کی مقبولیت میں مولانا کی تحریر کا بڑا دخل ہے۔

ادارتی معاملات میں بھی مولانا تاجور نے مجھے پوری آزادی دے رکھی تھی۔ میرا نام پرچے پر مدیر معاون کی حیثیت سے چھپتا تھا لیکن مضمون نگاروں کو خطوط میں اپنے ہی نام سے لکھتا تھا اور مضامین کو رد یا قبول کرنے کا بھی مجھے پورا اختیار تھا۔

مولانا تاجور کا دل مذہبی اور علاقائی تعصب سے بالکل پاک تھا۔ پنجاب میں اُردو کے فروغ میں ان کا حصہ مولوی محمد حسین آزاد کے بعد غالباً سب سے زیادہ ہے۔ ان کے دوستوں اور نیازمندوں میں مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہندو اور سکھ تھے اور یو، پی والوں سے کہیں زیادہ پنجابی۔ ایک بار اپنے نوٹ میں اُردو کے پنجابی اہلِ قلم کے متعلق انھوں نے کچھ سخت باتیں لکھ دیں۔ یہ نوٹ مجھے ملا تو میں نے احتجاج کیا کہ جس رسالے کا مدیر معاون پنجابی ہو اس رسالے میں یہ تحریر شائع نہیں ہونا چاہیئے۔ مولانا کا فوراً جواب ملا کہ آپ رسالے کے ایڈیٹر ہی اور میں آپ کا مضمون نگار، آپ کو میری تحریر مسترد کرنے کا حق بھی ہے اور اس میں ترمیم کا بھی۔ یہ ان کی کشادہ دلی کی ایک مثال ہے۔

دفتری امور کے سلسلے میں مولانا سے کچھ زیادہ ملنا نہیں ہوتا تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ان کے فیضانِ صحبت سے محروم رہا۔ جب بھی کوئی اہم ادیب یا شاعر ان سے ملنے آتا وہ مجھے بھی بلا لیتے۔ شام کے بعد یوں بھی میں اکثر ان سے ملنے چلا جاتا تھا۔ اگر میں یہ اعتراف نہ کروں تو بڑی ناشکرگزاری ہوگی کہ میرے ادبی ذوق کی نشوونما میں ان صحبتوں کا بڑا دخل ہے۔

مولانا دھڑلّے کے آدمی تھے اور ظاہر ہے کہ ایسا آدمی دوستوں کے ساتھ دشمن بھی بناتا ہے۔ اور دشمن دوستوں سے زیادہ بااصول اور سرگرم ہوتے ہیں۔ مولانا کے سب سے بڑے حریف حفیظ جالندھری تھے۔ دونوں میں ہمیشہ چپقلش رہی۔ لاہور کے تقریباً سبھی ادیب اور شاعر ان میں سے کسی ایک کے دوست اور دوسرے کے دشمن تھے۔ میں ان معدودے چند لوگوں میں تھا جن کے ان دونوں کے ساتھ اچھے مراسم تھے۔ یاد پڑتا ہے کہ جب میں نے "شاہکار" کی ملازمت اختیار کی تو اس کے بعد پہلی ہی ملاقات میں حفیظ نے پوچھا تھا:

"تم وہاں بیٹھ کر میری برائی کرتے ہوگے؟" جواب میں میں نے کہا تھا:

"کیا کبھی میں نے تمہارے سامنے تاجور کی بُرائی کی ہے؟" میرے اس جواب نے حفیظ کو مطمئن کر دیا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ

میں نے یہ اصول بنائے رکھا کہ ان کی باہمی چپقلش سے الگ رہ کر دونوں ہی کے ساتھ اپنے نیازمندانہ تعلقات قائم رکھوں۔

مولانا تاجور کا یہ کہنا تھا کہ جن لوگوں نے ان کی ملازمت کی وہ ان کی ملازمت چھوڑنے کے بعد گردشِ روزگار کا شکار رہی رہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میرا شمار ان لوگوں میں نہیں لیکن میں اُن سے لڑ کر الگ نہیں ہوا تھا۔ ملازمت کا تعلق ختم ہونے کے بعد بھی وہ مجھے اپنے نیازمندوں کے زمرے میں شمار کرتے رہے۔ اور میرے دل میں بھی آج تک ان کے لئے ویسا ہی احترام ہے۔

کرن دیوان کے ساتھ بھی میرا اچھا نباہ ہوا۔ میں ان کی مالی مشکلات سے آگاہ تھا اس لئے جس ماہ وہ مجھے پوری تنخواہ نہ دے سکتے تھے میں کوئی احتجاج نہیں کرتا تھا۔ "جگت لکشمی" سے وابستگی کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ ایک آراستہ کمرہ اٹھنے بیٹھنے کے لئے میسّر آگیا تھا سینما کے پاس بھی مجھے مل جاتے تھے۔ خود بھی دیکھتا اور کبھی کبھی اپنے ادیب دوستوں کو بھی ساتھ لے جاتا۔ ادارتی صفحات پر میری اجارہ داری تھی۔ دوستوں کے حق میں اور دشمنوں کے خلاف جو چاہتا، لکھ دیتا۔ صرف فلمی معاملات میں مجھے کرن دیوان کی مصلحتوں کا ساتھ دینا ہوتا تھا۔

فلمی جرائد میں ان دنوں یہ عام رواج تھا کہ افسانے اور نظمیں غزلیں وغیرہ ادبی جرائد سے نقل کر لی جاتی تھیں۔ "جگت لکشمی" میں بھی یہی ہوتا تھا اور ادیب یا شاعر اس پر معترض نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ اُلٹے خوش ہوتے کہ انھیں ایک اور حلقے میں شہرت مل رہی ہے۔ کرشن چندر میرے دوست تھے۔ ان کا ہر افسانہ میں "جگت لکشمی" میں نقل کر دیا کرتا تھا۔ ایک بار انھوں نے "قبر" کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا۔ میں نے اس افسانے کو "سچّی کہانی" کے عنوان سے شائع کر دیا اور کچھ ضمنی عنوان بھی قائم کر دیئے۔ جس روز "جگت لکشمی" کا یہ شمارہ شائع ہوا اس کے دوسرے تیسرے دن کرشن چند، اور کنہیّا لال کپور سے ملاقات ہوئی تو کپور بُری طرح برہم تھے۔ ہوا یہ تھا کہ کرشن چندر نے کہانی میں ان کا ہی نہیں، ان کے گاؤں کا نام بھی لکھ دیا تھا۔ یہ کہانی "سچّی کہانی" کے عنوان سے شائع ہوئی تو رشتہ داروں اور جان پہچان کے لوگوں میں پروفیسر صاحب کی کافی رسوائی ہوئی۔ بہرحال کپور کا غصّہ دیرپا نہیں تھا وہ جلد ہی من گئے۔ کہنے لگے جب میں نے یہ پرچہ دیکھا تو پہلے جی میں آیا کہ اس کی تمام کاپیاں خرید کر جلا ڈالوں۔ لیکن پھر سوچا کہ بس سے تو "جگت لکشمی" کو الٹا فائدہ پہنچے گا مقدمے کی سوجھی تو خیال آیا اور رسوائی ہوگی۔ تمہاری پٹائی اس لیے نہیں کر سکتا کہ تم مجھ سے طاقتور ہو، لہٰذا معاف ہی کئے دیتا ہوں۔

"شاہکار" کے دفتر کے قریب ہی ایک ریستوران تھا جو عرب ہوٹل کہلاتا تھا۔ یہ لاہور کے آڑے ترچھوں کا اڈّہ تھا۔ ان میں زیادہ تر ادیب، شاعر اور صحافی تھے جو ایسے اداروں میں کام کرتے تھے جہاں تنخواہ قلیل ملتی تھی، بروقت نہیں ملتی تھی اور کسی ماہ ناغہ بھی ہو جاتا تھا۔ لیکن یہ اپنے حال میں مست رہتے تھے اور اپنی زندہ دلی پر غمِ زمانہ کی پرچھائیں نہیں پڑنے دیتے تھے۔

عرب ہوٹل بڑا ہی غریب نواز تھا۔ دو کباب، نصف نان اور چائے کی ایک پیالی میں صبح کا ناشتہ ہو جاتا تھا اور بھُنے ہوئے گوشت کی نصف پلیٹ اور ایک نان میں ایک وقت کا کھانا۔ وہاں کے بیٹھنے والوں میں بھائی چارہ بھی بہت تھا۔ اگر کسی کی جیب میں پیسے نہ ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ سگریٹ، چائے یا کھانے سے محروم رہے۔ چراغ حسن حسرت اس مجلس کے میر تھے۔ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ "الہلال" میں کام کیا تھا۔ "زمیندار" میں وہ فکاہات کے عنوان سے مزاحیہ کالم لکھتے تھے جس کی ان دنوں بڑی دھوم تھی۔ اس کالم میں اتحاد پارٹی کا انھوں نے جو قصیدہ لکھا تھا وہ زبان زدِ خاص و عام تھا:

تیرا یار نریندر ناتھ ۔ اتحاد پارٹی

سارے ٹوڈی تیرے ساتھ ۔ اتحاد پارٹی

اپنے اسی انداز میں انھوں نے پنجاب کا سیاسی جغرافیہ بھی لکھا جس میں پنجاب کی سیاسی شخصیتوں پر بہت دلچسپ چوٹیں کی تھیں اور زبان پر انھیں بلا کا عبور تھا۔ کچھ دیومالائی کہانیاں بھی لکھی تھیں۔ یہ کہانیاں انھوں نے ٹھیٹ اُردو میں لکھی تھیں لیکن اگر اس کتاب کو دیوناگری میں چھاپ دیا جاتا تو ہندی والے انھیں ہندی کا بڑا لکھاڑی ماننے پر مجبور ہو جاتے۔ ادب اور سیاست میں ان کی معلومات وافر تھیں۔ قدرتی تھا کہ ایسا آدمی مبتلائے زعم ہو جائے چنانچہ وہ اپنے سوا کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور قول و فعل کے ہر تضاد کو اپنے لئے روا رکھتے تھے۔ ان کا عام شیوہ تھا کہ رمضان کے دنوں میں عرب ہوٹل میں چائے کی پیالی سامنے رکھ لیتے چسکیاں لیتے رہتے اور روزے کے فضائل بیان کرتے جاتے۔ ان کے کمال کے سبھی معترف تھے اس لئے کوئی حرف گیری نہیں کرتا تھا۔

میری ان کی ملاقات کی ابتدا نوک جھونک سے ہوئی۔ مجھے ان دنوں نزلہ اکثر رہتا تھا۔ کسی نے مجھے بہکا دیا کہ دائمی نزلے کا تیر بہدف علاج کسی مشہور ڈاکٹر نے یہ بتایا ہے کہ آدمی سر پر پگڑی باندھنے لگے۔ میں نے اس نسخے کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ انھی دنوں عرب ہوٹل میں میری آمد و رفت شروع ہوئی۔ دوسرا تیسرا دن تھا کہ حسرت صاحب نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا کر کہا: "جوتشی جی! ذرا میرا ہاتھ تو دیکھ دیجئے!" میں نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور چند منٹ غور سے دیکھنے کے بعد جواب دیا: "حسرت صاحب! میں مجبور ہوں۔ آپنے تو کثرتِ استعمال سے اپنے ہاتھ کی لکیریں ہی مٹا ڈالی ہیں۔" عرب ہوٹل کے قلندر غالب کے طرفدار ہی لیکن سخن فہم بھی تھے۔ میرے فقرے پر اس زور کا قہقہہ پڑا کہ چھت ہل گئی۔ خود حسرت صاحب نے بھی بات کا مزہ لیا اور اس کے بعد ان کی میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی۔

عرب ہوٹل کے حاضر باشوں میں ایک انتہائی دلچسپ شخصیت باری علیگ کی تھی جو خود کو اشتراکی ادیب لکھتے تھے۔ اصلی نام غالباً عبدالباری تھا۔ اشتراکی بنے تو عبدیت پر سے ان کا ایمان اٹھ گیا اور صرف باری رہ گئے۔ "کمپنی کی حکومت" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو کئی بار چھپی۔ کچھ کتابچے بھی انھوں نے لکھے اور مختلف اخباروں میں کام بھی کرتے رہے تھے۔ بڑے ہی آزاد خیال اور قلندر صفت آدمی تھے۔ جن دنوں وہ "شہباز" میں کام کرتے تھے، کچھ دوستوں نے کہا کہ اگر وہ پینٹ اتار کر "شہباز" کے دفتر سے عرب ہوٹل تک چلے آئیں تو ایک شاندار دعوت ہوگی۔ باری واقعی تیار ہو گئے اور جو کہا تھا کر گزرے۔ (۳۱) کا طریقہ انھوں نے یہ اختیار کیا کہ چلتے چلتے سینہ کوبی کرتے جاتے تھے اور یا علی یا علی کے نعرے بھی لگاتے جاتے تھے۔ راہگیروں نے مجذوب سمجھ کر نظر انداز کر دیا اور وہ شرط جیت گئے۔

سیاسی بحث میں قلندروں کے درمیان تلخی پیدا ہوتے کبھی نہیں دیکھی۔ اس کی وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ وہ اپنے محدود دائرے سے باہر کی ہر چیز کو غیر حقیقی سمجھتے تھے۔ اگر کبھی کوئی ناواقفِ آدابِ قلندری محفل میں آ دھمکتا اور کسی بات پر مشتعل ہو اٹھتا تو رنگ محفل دیکھ کر اس کی طبیعت از خود اعتدال پر آ جاتی تھی۔ احسان دانش کے ایک شاگرد نے موچی دروازے کے پاس "منزل" کے نام سے ایک ریستوراں کھول رکھا تھا۔ کبھی کبھی قلندروں کا قافلہ ادھر بھی جا نکلتا۔ ایک دن محفل وہاں سجی ہوئی تھی اور حسبِ معمول

دنیا کی ہر چیز کا مذاق اڑایا جا رہا تھا کہ یکایک پاس کی میز سے ایک نوجوان اٹھا اور خالی کرسی پر بیٹھ کر جوتوں سمیت اپنے دونوں پاؤں قلندروں والی میز پر دے مارے۔ وہ خاکسار تحریک میں نیا نیا شامل ہوا تھا اور یہ دیکھ کر اسے بڑا اشتعال آیا تھا کہ یہ لوگ سیاسی لیڈروں کا ذکر اس بے حرمتی سے کر رہے ہیں۔ چھوٹتے ہی بولا "تم کفر بک رہے ہو، میں تمہیں قتل کر دوں گا!" اس سے پوچھا گیا کہ آخر اسے یہ یقین کیوں ہے کہ وہ قاتل ہی ہوگا، مقتول نہیں۔ تو اس نے جواب دیا "میں سچا مسلمان ہوں۔ اگر قتل ہوا بھی تو جنت میں جاؤں گا" اس مرحلے پر میری رگِ ظرافت پھڑکی اور ملتجیانہ انداز میں میں نے اس سے کہا "صاحبزادے! اس عمر میں جنت میں نہ جانا، جنتی کہیں آپ کو غلمان نہ سمجھ بیٹھیں!" اس فقرے پر قلندروں کا جو حال ہوا وہ تو ظاہر ہے لیکن اس نوجوان کا ردِ عمل بھی مزید اشتعال کی بجائے مجبوری کی ہنسی میں ختم ہوا۔ کوئی تین چار مہینے کے بعد مجھے انارکلی میں ملا تو بالکل بدلا ہوا تھا۔ بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور رازدارانہ انداز میں اپنے رکا "شفیق صاحب! میں نے وہ سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ اب میں شراب پیتا ہوں اور آشنا ہوں ــ" میں نے بارہا دیکھا ہے کہ انتہا پسند طبائع جب ایک انتہا پسندانہ روش کو خیرباد کہتی ہیں تو فوراً ہی وہ دوسری انتہا پر پہنچ جاتی ہیں۔ کیا انسان بیچ کا راستہ طور پر کبھی دلنشیں ہی نہیں ہے؟

اختر شیرانی کا آغاز شروع ہو چکا تھا۔ وہ اپنے دور کے مقبول ترین شاعر تھے۔ ایک امیر اور انتہائی ذی وقار باپ کے بیٹے تھے اور شاعری ان کے لئے بیشہ نہیں مشغلہ تھے۔ ان کی شاعری کے رومانی ماحول، ان کی مے نوشی اور آوارہ مزاجی نے انھیں شعر و ادب کی دنیا کا رومانی شہزادہ بنا دیا تھا۔ رومانی شہزادہ بننا آسان ہے لیکن بنے رہنا اتنا آسان نہیں۔ لوگ رومانی شہزادے سے ہر وقت مافوق الفطرت کارناموں کی امید رکھتے ہیں۔ اور یہ کسی گوشت پوست کے انسان کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔

مولانا حافظ محمود خان شیرانی سے قریب قریب ان کا قطع تعلق ہو چکا تھا۔ جو شخص دوسروں کو پانی کی طرح شراب پلاتا تھا وہ اپنی شراب کے لئے دوسروں کا دست نگر تھا۔ اس بنا پر لوگ اختر سے کنی بھی کترانے لگے تھے لیکن جو لوگ ان پر اس قسم کے الزام لگاتے ہیں کہ انھوں نے باقاعدہ دریوزہ گری شروع کر دی تھی، وہ غالباً ذاتی تجربہ بیان کرنے کی بجائے سنی سنائی باتیں دہراتے ہیں۔ اختر نے شرافتِ نفس کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ روپے پیسے کو وہ آخری وقت تک حقارت سے دیکھتے رہے۔ اور کسی کے خلاف دستِ سوال بڑھا دینا ان کے بس ہی میں نہیں تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ دوپہر کے وقت میں اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا کہ کرشن اشکؔ نے آ کر کہا کہ نیچے اختر شیرانی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ نیچے گیا تو اختر شیرانی تانگے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے آؤ چلیں۔ میں نے کہا اوپر جا کر کپڑے بدل آؤں۔ کہنے لگے نہیں ایسے ہی چلو۔ میں بات کو ہی ٹالتا تھا۔ تانگے میں بیٹھ گیا۔ جب تانگہ آدھ گھنٹے کے قریب چلتا رہا تو میں نے پوچھا کہ آخر کہاں جانا ہے؟ تانگہ تو کہیں رکتا ہی نہیں۔ بولے پیسے جو نہیں۔ میں نے کہا: اختر صاحب جب میں نے کپڑے بدلنے کی بات کی تھی تو مطلب یہی تھا کچھ پیسے لے لوں۔ آپ کے انکار سے میں سمجھا ضرورت نہیں۔ بہرحال تانگہ اس وقت انارکلی سے گزر رہا تھا۔ وہاں میرے ایک

٭ ... سمجھے ... دلی آگئے تھے۔ یہیں انتقال کیا۔ صحافت کے علاوہ شاعری سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔

عزیزی دکان تھی۔ میں نے اس سے پندرہ روپے اُدھار لے لیے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر "ملاپ" اخبار کا دفتر تھا۔ اچانک اختر کی نظر تنبیر پر پڑ گئی۔ تنبیر انھیں اپنے دفتر میں لے گئے اور جب وہ واپس آئے تو ان کی جیب میں دس روپے کا نوٹ تھا لیکن شام تک سب روپے خرچ ہو چکے تھے۔ جو بھی ملا اختر نے اس کی دعوت کر ڈالی۔

اختر بلا نوش بھی تھے، آوارہ گرد بھی۔ لیکن طبعاً انتہائی شریف تھے۔ میں نے ان کی زبان سے کسی خاتون کے لیے نازیبا کلمہ کبھی نہیں سُنا اور اُن کی عشق کی داستانیں بھی اکثر قیاسی ہیں۔ سلمیٰ، عذرا، ریحانہ، ایک شاعر کے ذہنی ہیولے تھے۔ بہت ممکن ہے کہ ان کا مزنوا اختر نے کہیں دیکھ لیا ہو لیکن وہ پوری طرح مادّی طور پر متشکل کبھی نہیں ہوئے۔ اختر تصوف کی شاعری کے سخت خلاف تھے اور ایک مرتبہ ان کے کسی شعری مجموعے میں سے میں نے تصوّف کا ایک شعر ڈھونڈ نکالا تھا تو سخت برہم ہوئے تھے لیکن محبّت کی جسمانیت کے وہ زیادہ قائل نہیں تھے۔ ان کی شاعری سے محبّت کا جو پہلو اُبھر زیادہ اس کی اُلوہیت کا ہے۔ جس کا ایک ثبوت وہ نظم ہے جو انھوں نے "ایک شاعرہ کی شادی" پر کہی ہے۔ اس نظم میں شکایت یہ نہیں ہے کہ وہ اختر کی بجائے کسی اور کی ہو گئی بلکہ انھیں غم اس بات کا ہے کہ شاعرہ جیسی مطہّر شخصیت جسمانی محبّت میں ملوث ہو گئی:

ظلمتِ حرص و ہوس حور کو بہکا ہی گئی
تیرے بستر پہ بھی آخر کو شکن آ ہی گئی

میں نے اختر کو اچھی بُری، ہر جگہ دیکھا ہے۔ طوائف کے کوٹھے پر بھی میں نے انھیں کبھی ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہوتے نہیں دیکھا۔ اگر بہت زیادہ پیے ہوتے تو اس کا ہاتھ پیٹھ سے لگا کر رونا شروع کر دیتے۔ ایسے موقعوں پر یہ مصرعہ اکثر ان کے وردِ زبان ہوتا تھا:

کیسے خانہ خراب ہیں ہم لوگ

بلانوشی اور لاأبالی پن کی روایت کے نئے وارث عبدالحمید عدم تھے۔ اختر شیرانی کی طرح وہ بھی چلتی پھرتی بوتل تھے۔ طبیعت ان کی انتہائی موزوں تھی۔ بلا کے زود گو تھے اور بہت عمدہ شعر بے تکلفی سے کہہ جاتے تھے۔ شراب سے انھیں بہت تعلق تھا۔ ہر وقت پیتے تھے، بے تحاشا پیتے تھے۔ لیکن شراب بالعموم ان پر کوئی ناگوار اثر نہیں ڈالتی تھی۔ ان کے بہترین اشعار بھی شراب ہی کے موضوع پر ہیں۔

عرب ہوٹل کے بعد ادیبوں کا دوسرا اڈہ نگینہ بیکری تھی۔ نیلا گنبد لاہور میں چائے کی یہ مختصر سی دکان یو۔پی کے ایک قوم پرست مسلمان چلا رہے تھے۔ شروع شروع میں یہاں آنے والوں میں زیادہ تر کانگریسی مسلمان ہی تھے لیکن پھر مسلم لیگی بھی آنے لگے اور اس طرح یہ دکان سیاسی مناظرہ بازی کا اڈہ بن گئی۔ ادیبوں کا اڈہ یہ تب بنی جب چراغ حسن حسرت جو عرب ہوٹل کی مجلس کے ممبر تھے، سرکاری ملازمت میں چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی مجلس بھی درہم برہم ہو گئی اور وہاں سے اکھڑ کر نگینہ بیکری میں آ جمی۔

باری علیگ جو پہلے عرب ہوٹل کے نواح میں رہتے تھے، اب پُرانی انارکلی میں رہنے لگے تھے اور ان کا مکان نگینہ بیکری سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ خود میں نے بھی انارکلی میں مکان لے لیا تھا۔ عرب ہوٹل یہاں سے کافی دور تھا اس لئے میں نے اور باری علیگ نے نگینہ بیکری ہی میں ڈیرے ڈال دیئے۔ باری علیگ کی کشش مولانا صلاح الدین کو بھی کھینچ لائی جن کے جریدے "ادبی دنیا"

کا دفتر بھی قریب ہی مال روڈ پر تھا۔ مولانا صلاح الدین کے ہمراہ عاشق بٹالوی اور کچھ اور ادیب بھی آنے لگے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ جو اُن دنوں اورینٹل کالج لاہور میں تھے۔ پہلے ہی وہاں بیٹھا کرتے تھے۔ اس طرح اچھی خاصی محفل جمنے لگی۔ جو ادیب وہاں باقاعدگی سے نہیں بیٹھتے تھے وہ بھی ہفتے میں ایک دو بار ضرور اُدھر آنکلتے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ان دنوں داڑھی رکھتے تھے اور شیروانی پہنتے تھے۔ سیاست میں قوم پرستانہ اندازِ نظر رکھتے تھے اور ان کے متعلق یہ مشہور تھا کہ مجلسِ احرار کے بہت قریب ہیں۔ مسلمانوں کی اس روش پر وہ اکثر چوٹ کیا کرتے تھے کہ اپنی ساری کوتاہیوں کا الزام وہ ہندوؤں کے سر پر ڈال دیتے ہیں۔ ان کا مخصوص نعرہ تھا: "سب گوپی چند[1] نے کیا ہے"

مولانا صلاح الدین سیاسی بحث میں اگرچہ شریک نہیں ہوتے تھے لیکن ادبی گفتگو میں ضرور حصہ لیتے تھے۔ انھیں سب سے زیادہ تشویش اُردو کے مستقبل کے بارے میں تھی۔ شروع شروع میں ان کا خیال تھا کہ تقسیمِ ملک سے اُردو کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا لیکن پھر وہ محسوس کرنے لگے کہ تقسیم میں اُردو کی فلاح کے لئے ایک اشارۂ غیبی ہے۔ جب اہلِ زبان پنجاب پہنچیں گے تو پنجابیوں کو مفت کے استاد میسر آجائیں گے اور اُردو کو فروغ حاصل ہوگا۔ ملک تقسیم ہوا، لاہور جلنے لگا اور مسلمانوں کے لٹے ہوئے قافلے وہاں پہنچنے لگے۔ لیکن مولانا کی گفتگو کا محور ایک ہی رہا: پنجاب میں اُردو کا کیا بنے گا؟

اس قسم کی باتیں سن کر شروع شروع میں ان پر قساوتِ قلب کا گمان گزرتا تھا۔ ایک ایسے وقت میں جب سارا ملک مقتل بنا ہوا تھا کوئی شخص انسانی مصائب سے اتنا بے پروا ہو جائے کہ اسے اُردو کے مستقبل کے سوا اور کچھ سوجھے ہی نہیں؟ ستم بالائے ستم یہ کہ مولانا کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی اور غم یا غصے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔

ہندوؤں کو لاہور سے بھاگتے دیکھ کر انھوں نے صرف اسی قدر کہا: متل صاحب! یہ لوگ آخر کیوں بھاگ رہے ہیں؟ اس بار مجھے اور بھی عجیب سا لگا۔ لیکن اسی شام مجھے باری علیگ کی زبانی ایک ایسی بات معلوم ہوئی کہ میں حیرت میں ڈوب گیا۔ مولانا کا اپنا مکان لاہور کے ایک ہندو محلّے میں تھا اور جب ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے مکانوں کو آگ لگا رہے تھے تو ان کا مکان بھی جل کر راکھ ہو گیا تھا اور ان کی پیشانی پر کوئی شکن نہیں اُبھری تھی

جب مولانا کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی ہوتی اور وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مصائب سے بے پروا صرف اردو کے مستقبل کے بارے میں پریشانی کا اظہار کیا کرتے تو وہ دوسروں کے مصائب ہی سے نہیں اپنے مصائب سے بھی بے نیاز ہوتے تھے۔ انھوں نے اردو کے غم کو اتنا اپنا لیا تھا کہ باقی غموں سے بے نیاز ہو گئے تھے۔

مولانا صلاح الدین کی برہمی دیکھنے کا اتفاق صرف ایک بار ہوا۔ فسادات کے دنوں میں میرے معمولات میں فرق نہیں آیا تھا میں نیلا گنبد کی اسی دکان پر چائے پیتا رہا۔ اور مسلمانوں کے ریستورانوں میں کھانا بھی کھاتا رہا۔ شبانہ آوارہ گردی کا سلسلہ

---

[1] ڈاکٹر گوپی چند بھارگو جو پنجاب اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے۔

بھی جاری تھا۔ ایک رات تقریباً ایک بجے مال روڈ کے کسی ریسٹوران سے نکل کر گھر آرہا تھا اور نشے میں دُھت تھا۔ نیلا گنبد کے قریب پہنچا تو سامنے سے باری علیگ اور مولانا صلاح الدین آتے دکھائی دیئے۔ سامنا ہوا تو مولانا نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا اور جو کچھ بُرا بھلا کہہ سکتے تھے، کہہ ڈالا۔ بس پٹائی ہی نہیں کی۔ اس کے بعد باری علیگ مجھے گھر تک چھوڑ آئے۔

دوسرے دن بھی ملاقات ہوئی تو مولانا صلاح الدین برہم تھے اور جب تک میں نے یہ وعدہ نہیں کیا کہ اب رات کے وقت گھر سے باہر نہیں نکلا کروں گا، ان کے چہرے پر مسکراہٹ واپس نہیں آئی۔

باقی بہت سی چیزوں کی طرح قلندروں نے فسادات کو بھی کافی دنوں تک غیر حقیقی ہی سمجھا۔ جیسے ہی میں نگینہ بیکری میں داخل ہوتا، باری نعرہ لگاتے:

کافر آیا چُھری نکالو

فسادات نے انتہائی زور پکڑا تو بھی انارکلی کا علاقہ محفوظ رہا۔ اس لئے نگینہ بیکری کی محفل برہم نہیں ہوئی۔ انارکلی میں فساد نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہاں کے ہندو اور مسلمان دکانداروں میں سمجھوتہ ہوگیا تھا کہ بازار کو تباہ نہیں ہونے دیا جائے گا۔ چنانچہ جب باقی شہر جل رہا تھا، تب بھی انارکلی پر آنچ نہیں آئی۔ کاروبار البتہ یہاں بھی معطل تھا اور کھانے پینے کی اکّا دکّا دکانوں کو چھوڑ کر کوئی دکان کھلی نظر نہ آتی تھی۔

ایک دن، دوپہر کو میں گھر پر بیٹھا تاش کھیل رہا تھا کہ کسی نے اطلاع دی کہ آتش زنی اور لوٹ مار کا سلسلہ انارکلی میں بھی شروع ہوگیا ہے۔ کچھ غنڈے راجہ برادرز کی دکان کا، جو میرے گھر کے قریب ہی تھی، تالا توڑ رہے تھے اور آگ لگانے کی کوشش بھی کی جا رہی تھی۔ ان دونوں فائر بریگیڈ اور پولیس کی مدد حاصل کرنا ممکن نہیں تھا اس لئے یہ یقینی نظر آتا تھا کہ اگر آگ لگ گئی تو سارا بازار جل کر رہ جائے گا۔ لیکن کراکری کی مشہور دکان بیجا مل اینڈ سنز کے مالک کی عقل کام کر آڑے آگئی۔ اس نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو جو ایک انگریز تھا، براہ راست ٹیلی فون کر دیا۔ وہ کچھ سپاہیوں کو لے کر جائے واردات پر پہنچا اور اپنے ہاتھ سے مشین گن چلا کر تین فسادیوں کو ہلاک کر دیا، باقی بھاگ گئے۔ آگ البتہ لگ چکی تھی مگر یہ پھیلی نہیں جو واحد دکان جلی وہ کسی ہندو کی نہیں بلکہ مسلمان کی تھی۔

فسادیوں کی لاشیں اگلے دن بھی بازار ہی میں پڑی رہیں۔ شاید لوگوں کو عبرت دلانے کے لئے۔ تینوں لاشیں نچلے طبقے کے مسلمانوں کی تھیں جو لباس اور وضع قطع سے پیشہ ور غنڈے معلوم ہوتے تھے۔

انارکلی کو بچانے میں ایک انگریز افسر کی تنہا فرض شناسی کو دخل تھا۔ لیکن یہ بات بدستور سُنی جاتی رہی کہ فسادات انگریز کرا رہے ہیں۔

انارکلی کے دکانداروں کا سمجھوتہ اس واقعے کے بعد بھی برقرار رہا اور خنجر زنی کے اکّا دکّا واقعات کو چھوڑ کر یہاں فساد نہ ہوا۔ ہندو بہرحال سہمے ہوئے تھے اور اس سکون کو آنے والے طوفان کا پیش خیمہ سمجھ رہے تھے۔ فسادات کی در پردہ تیاری کا شبہ ایک مسلمان رئیس کے بیٹوں پر تھا۔ جس کی انارکلی میں کافی جائداد تھی۔ ان میں سے ایک کبھی کبھی نگینہ بیکری میں بھی آیا کرتا

اس واقعے کے دو تین دن بعد ملا تو کہنے لگا: متل صاحب! کیوں نہ آج چائے گھر چل کر پی جائیں۔ میں ساتھ ہو لیا۔ ان لوگوں کی کوٹھی بہت بڑی تھی اور خود اس کا کمرہ اوپر کی منزل پر تھا۔ جہاں پہنچنے کے لئے کئی زینوں کو عبور کرنا پڑتا تھا۔

کمرے میں پہنچتے ہی کہنے لگا: تم جانتے ہو کہ میں تمہیں یہاں کیوں لایا ہوں؟ میں نے کہا: قتل کرنے کے لئے۔ میرے جواب پر ہنس پڑا اور یہ ہنسی اس کی دلی مسرت کی آئینہ دار تھی۔ کہنے لگا کہ میں خوش ہوں کہ کم از کم ایک ہندو مجھے قاتل نہیں سمجھتا۔ میں تمہیں یہاں آج اس لئے لایا تھا کہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کردوں۔ یہ بتاؤں کہ مجھ پر فساد کی درپردہ تیاریوں کا جو الزام ہے وہ غلط ہے۔

انارکلی پُرسکون سہی لیکن اندرونِ فصیل قیامت کا عالم تھا اور ہندوؤں کے بازار یکے بعد دیگرے جلائے جا رہے تھے۔ جب تک ہندوؤں کو یہ خیال رہا کہ لاہور ہندوستان ہی میں رہے گا وہ وہاں ڈٹے رہے لیکن جب لاہور کے بارے میں فیصلہ ہو گیا کہ وہ پاکستان میں جائے گا تو ان کے قدم اکھڑ گئے۔ پھر اونچی سطح پر خواہ مضمر طور پر ہی سہی، تبادلۂ آبادی کا فیصلہ بھی ہو گیا اور جانے والوں کے لئے سرکاری ٹرک مہیا کر دیئے گئے۔ اب ہندوؤں کے وہاں رہنے کا سوال ہی نہیں تھا۔

میرا اُٹھنا بیٹھنا چونکہ زیادہ تر مسلمانوں میں تھا اس لئے وہ مسلمان جو میرے ذاتی دوست یا شناسا نہیں تھے، مجھے مسلمان ہی سمجھتے تھے اور ایک بار ایک دلچسپ صورتحال پیدا ہو گئی۔ ۱۵ اگست کو میں نگینہ بیکری میں صبح کا ناشتہ کر رہا تھا اور محفل جمی ہوئی تھی کہ یکایک دو تین غنڈہ صورت مسلمان داخل ہوئے اور ہماری میز کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ پھر ہماری گفتگو میں بھی شریک ہو گئے۔ اور اپنے قتل و غارتگری کے کارنامے فاتحانہ انداز میں سنانے لگے۔ ان میں سے ایک خصوصیت سے میری طرف مخاطب تھا اور ایک گردوارے پر حملے کی روداد سنا رہا تھا۔ اس کا بیان تھا کہ گردوارے والوں کے پاس اسلحہ کافی تھا اور وہ اپنے بچاؤ کے لئے متواتر گولیاں چلاتے رہے۔ لیکن گولیاں آخر ختم ہو گئیں جس کے بعد وہ اور اس کے ساتھی دیوار پھاند کر گردوارے کے اندر گئے اور سکھوں کو ایک ایک کر کے ذبح کر ڈالا۔

خدا جانے اس کا سبب میرا اپنے مسلمان دوستوں پر کامل اعتماد تھا یا دیوانگی کی کوئی ترنگ کہ میں نے اسے بتا دیا کہ جو شخص کو وہ یہ روداد سنا رہا ہے وہ ایک ہندو ہے۔ اس کا لہجہ فوراً ہی بدل گیا، کہنے لگا کہ اگر تم سے پرسوں ملاقات ہوئی ہوتی تو میں تمہیں ضرور قتل کر دیتا لیکن کل پاکستان قائم ہو گیا ہے، اب تم میرے مہمان ہو۔ میرے گھر چلو، میں تمہاری تواضع کروں گا اور اگر کوئی تم پر انگلی اٹھائے گا تو اس کا سر کاٹ دوں گا۔ اپنی انٹی سے نکال کر اس نے مجھے کچھ گولیاں بھی دکھائیں۔ کہنے لگا: یہ ان میں سے چند گولیاں ہیں جو تمہارے بھائی بند ہم پر چلاتے رہے ہیں۔

قلندروں پر فسادات کا صرف اتنا اثر ہوا کہ اب میری آمد پر "یا علی مدد" کا نعرہ بلند نہیں کرتے تھے، صرف ذبح بنانے کی دھمکی دیتے تھے جس پر میں کہا کرتا تھا: ابے چل! تو خود کسی نواب محمد دین کا کمیرا ہو گا۔ یہ خوش فہمی ابھی قائم تھی کہ جو ہندو بھاگے بھی ہیں واپس آ جائیں گے اور لاہور ویسا کا ویسا ہی رہے گا۔

لیکن اس خوش فہمی نے زیادہ دن ساتھ نہیں دیا۔ لاہور سے ہندو بھاگ ہی نہیں رہے تھے، باہر سے مسلمان آ بھی رہے تھے۔

لاہور کا نقشہ یکسر بدل رہا تھا۔ مجھے ذمّی بنانے کی دھمکی دینے کی بجائے یاری اب اپنے اس ڈر کا اظہار کرنے لگا تھا: یار متل: کہیں داڑھی نہ رکھنا پڑ جائے۔

فسادیوں نے اس بستی پر جس میں پروفیسر برج نرائن رہتے تھے، حملہ کیا تو انھوں نے یہ دلیل دے کر فسادیوں کو آتش زنی اور قتل و غارت سے باز رکھنے کی کوشش کی کہ جن مکانوں کو تم جلا رہے ہو وہ پاکستان کا اثاثہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ فسادی پہلے تو پروفیسر صاحب کی بات مان کر واپس چلے گئے لیکن وہی خود یا فسادیوں کی کوئی دوسری ٹولی دوبارہ آئی تو پروفیسر صاحب انھیں قائل کرنے میں ناکام رہے اور سب سے پہلے خود ہی قتل ہوئے۔

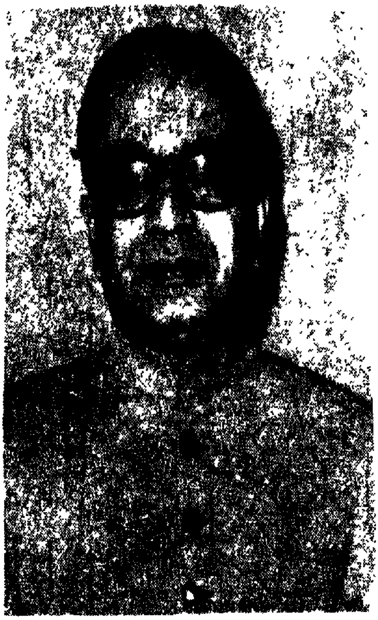
پروفیسر برج نرائن عالمی شہرت کے ماہر اقتصادیات تھے۔ جہاں بیشتر ماہرین اقتصادیات یہ کہتے تھے کہ پاکستان اقتصادی طور پر کبھی مستحکم نہیں ہو سکے گا اور اس کا وجود بڑا ہی ناپائدار رہے۔ وہاں پروفیسر برج نرائن نے اس نظریے کی حمایت میں متعدد مضامین لکھے تھے کہ پاکستان اقتصادی طور پر خود کفالتی کا اہل ہوگا۔ وہ پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کئے ہوئے تھے اور ان کی بے تعصبی کا کٹّر سے کٹّر مسلم لیگی قائل تھا۔ بہت ممکن تھا کہ وہ زندہ رہتے تو پاکستان کے اقتصادی استحکام کا کام انھی کے سپرد ہوتا۔ لیکن قضا و قدر کو یہ منظور نہیں تھا۔

پروفیسر برج نرائن کی موت میرے لئے زبردست دھچکا تھی۔ وہ میرے استاد تھے اور میرے مزاج کی تشکیل میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ گھر والے لاہور میں رہنے کو پہلے بھی تیار نہیں تھے، اب میرے قدم بھی ڈگمگا گئے اور جب امرتسر جانے والا لاریوں کا آخری قافلہ روانہ ہوا تو اس میں میں بھی سوار تھا۔ مجھے الوداع کہنے کچھ مسلمان دوست بھی آئے تھے۔ ان میں سے دو ایک کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ ایک ہمسفر نے سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہا: سالے پہلے مار مار کر بھگاتے ہیں پھر روتے ہیں۔ مجھے غصّہ آ گیا اور میں نے کہا: بکومت۔ یہ فیصلہ میں آج تک نہیں کر سکا کہ یہ جھاڑ میں نے اسے ڈالی تھی یا خود اپنے آپ کو۔ کیونکہ دل اندر ہی اندر کچھ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ میں قلندروں کو جُل دے کر جا رہا ہوں۔

قافلہ امرتسر پہنچا تو وہاں بھی جلے ہوئے مکان نظر پڑے۔ لاہور میں پیشانی پر نورِ شہادت پیدا نہیں ہوا تھا لیکن یہاں آ کر ندامت کے قطرے ضرور نمودار ہو گئے۔ پتہ چلا کہ اسی قافلے میں راج بلدیو راج بھی شامل ہیں۔ جہاں قافلہ رکا تھا وہاں اچھا خاصا بازار لگا ہوا تھا۔ ہم دونوں منہ ہاتھ دھو کر چائے پینے بیٹھ گئے۔ قافلے والے لٹے لٹا کر آئے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لٹیرے خود ان میں بھی موجود ہیں۔ کسی کا ٹرنک غائب تھا کسی کا بستر۔ ہم اس پر طنزیہ انداز میں تبصرہ کر رہے تھے کہ قریب ہی سے آواز آئی: اب لاہور پر حملہ کرنے چلیں گے۔ میں نے پوچھا: راج! ہم حملہ کرنے کب جا رہے ہیں؟ کہنے لگا: بھئی! کبھی مشاعرہ پڑھنے چلیں گے۔

راج بلدیو راج کے بارے میں مجھے علم نہیں لیکن میں مشاعرہ پڑھنے لاہور جا چکا ہوں۔

دلّی میں کچھ دنوں تک "ملاپ" اور "تیج" میں کام کرنے کے بعد مارچ ۱۹۵۳ء میں میں نے "تحریک" جاری کیا جس کا حال ہی میں سلور جبلی نمبر شائع ہوا ہے۔ "تحریک" کے بارے میں کیا لکھوں، میری داستانِ رسوائی کا یہ حصّہ بے شمار لوگوں کو قریب قریب ازبر ہے۔



عابد علی خاں

"..... آدمی کے جینے کے لئے ایک فلسفۂ حیات کی ضرورت ہوتی ہے اور جو فلسفۂ حیات مجھے ملا ہے وہ اس زبان کا عطا کردہ ہے۔ ویسے میرے اسلاف نے " با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام" کے شعار کو اپنایا تھا۔ میں ان ہی کی خاکِ پا کو سرمۂ چشم بنائے ہوئے عصری ہندستان میں اردو والوں کو ان کا مستحقہ مقام و مرتبہ دلانے کے لئے جد و جہد میں شامل ہوں اور ——— ......"

اپنی ہی شخصیت اور اپنی ہی ذات کے بارے میں کچھ لکھنا بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ اور اپنی سرگذشت کہاں سے شروع کیجائے اس کا تعین کرنا بہت مشکل ہے۔ زندگی کا ہر سال اگر کسی سے اٹھنے کے دھرے کا حساب کرتا تو ہر آدمی اپنے آپ سے مکمل نظر آتا کیونکہ ہم سمجھوتے کیے تاہم احوال میں وطن بنی کیا ہے جس پر سر افکار ہیں۔ باوا آدم سے روایت چلی آرہی ہے کہ لوگ اپنا ذکر اپنے اسلاف سے کرتے ہیں۔ تاہم کرشن چندر نے تھوڑی ڈھارس بندھائی کہ ہر آدمی ایک تاریخ ہوتا ہے۔

میری تاریخ کا نقطۂ آغاز ۱۹۲۰ء ہے۔ کسی گھرانے میں پیدائش محض اتفاق ہی تو ہوتی ہے۔ اور یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا کہ میں نے حیدرآباد کے ایک جاگیردارانہ گھرانے میں ایک ایسے وقت جنم لیا جب کہ جاگیردارانہ نظام، نظام دکن کے اقتدار کے تحفظ کا دوسرا نام بنا ہوا تھا۔

میرے والد ماجد نواب میر محمود علی خاں نے بھی جن کے پدر محترم یعنی میرے دادا حافظ علی خاں انتخاب جنگ سے جو نظام ششم نواب میر محبوب علیخاں کے مدرسہ عالیہ میں ہم جماعت اور حضور نظام نواب میر عثمان علیخاں آصف جاہ ہفتم کے اتالیق تھے اور نانا عابد علی خاں (نواب صولت جنگ) سے غالباً دور بینی ورثہ میں حاصل کی تھی اور جاگیردارانہ نظام کے تعلق سے نوشتۂ دیوار پڑھنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ اسی لیے تو انھوں نے اپنے دور کے بیشتر جاگیرداروں کے لڑکوں کے برخلاف ہم تمام بھائیوں کو کالجس کی راہ دکھائی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ جاگیرداروں کے بچے یا تو ان کے لیے قائم کردہ ایک علیحدہ درسگاہ جاگیردار کالج میں پڑھا کرتے تھے یا ثانوی درجہ تک ان کی تعلیم مدرسہ عالیہ میں ہوا کرتی تھی۔ میری بھی ابتدائی درسگاہ یہی "مدرسہ عالیہ" رہی اور یہیں سے میں نے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ جاگیردارانہ گھرانوں کی روایات کے مطابق مجھے اعلیٰ تعلیم کے لیے نظام کالج میں داخلہ لینا چاہیے تھا لیکن میں نے اردو ذریعہ تعلیم کی واحد اور منفرد یونیورسٹی جامعہ عثمانیہ کا انتخاب کیا اور اسی مادر جامعہ نے جس میں "انقلابی شاعر" مخدوم کے نغمے گونجا کرتے تھے مجھے امارت اور غربت کے فرق و تفاوت سے واقف کرایا۔ میں نے جامعہ سے گریجویشن کی تکمیل کی اور زمانہ طالب علمی میں خلیفہ عبدالحکیم، پروفیسر شیو موہن لال اور ڈاکٹر ولی الدین جیسے بلند قامت دانشوروں کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنے کا شرف حاصل رہا۔

جامعہ عثمانیہ ہی میں مخدوم سے ملنے کا موقع ملا تھا اور جب فارغ التحصیل ہو کر باہر نکلا تو انہیں کی سنگت اور صحبت میں ادب و سیاست کی تحریکات سے اولاً نظری اور پھر عملی دلچسپی بڑھنے لگی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب کہ قاضی عبدالغفار صاحب حیدرآباد سے روزنامہ "پیام" نکالا کرتے تھے۔

"پیام" اگرچہ حیدرآباد کے کئی اخباروں میں سے ایک اخبار تھا لیکن سیاسی بیداری اور ترقی پسند جمہوری تحریکات کا علمبردار بھی تھا۔ "پیام" سے اور قاضی صاحب سے ربط کے علاوہ دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کی سرگرمیوں نے انقلاب کے تصور سے مجھے روشناس کرایا۔ ۱۹۴۳ء میں دوسری جنگ عظیم اپنے شباب پر تھی۔ "نازی ازم" اور "فاشزم" کے مقابلہ میں سوشلزم صف آرا تھا۔ میری زندگی کا سب سے

بڑا واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۴۲ء میں مجھے اپنے شہر کی انجمن ترقی پسند مصنفین کا سکریٹری بنا دیا گیا۔ انہی دنوں حیدرآباد میں ترقی پسند مصنفین کی عظیم الشان پہلی کل ہند تاریخی کانفرنس بھی منعقد ہوئی۔ میں نے ۱۹۴۷ء تک یہ فرائض ادا کیے۔ میں نے کمیونزم کو انسانی دکھ درد کی نجات کے ایک نسخہ کی حیثیت سے قبول تو کرلیا لیکن کمیونسٹ پارٹی کی باقاعدہ رکنیت قبول نہیں کی۔ کیونکہ میں شروع ہی سے جماعتی سیاست کو ناپسند کرتا رہا ہوں۔

یہ بھی میرے لئے ایک اعزاز تھا کہ کمیونسٹ پارٹی کا باقاعدہ رکن نہ ہونے کے باوجود میں نے ہندوستان میں پارٹی پر سے پابندی اٹھائے جانے کے بعد بمبئی میں منعقد ہونے والی پہلی پارٹی کانفرنس میں مخدوم کے ساتھ شرکت کی اور بمبئی ہی میں قیام کے دوران مجھے بنّے بھائی (سجاد ظہیر مرحوم) اور پروفیسر نورالحسن سے جو ہمارے ملک کے وزیر تعلیم بھی رہ چکے ہیں قریب ہونے اور ان سے کھل کر مسائل پر تبادلہ خیال کرنے کا موقع ملا۔ اس موقع پر مجھ سے خواہش کی گئی تھی کہ میں کارل مارکس کی کتاب (WAGE LABOUR AND CAPITAL) کا ترجمہ کروں۔ یہ میرا پہلا قلمی کام تھا جو کتابی شکل اختیار کرسکا۔ اس کے بعد میں نے "جمہوریۂ چین" اور چین کی شخصیتوں پر دو اور کتابیں لکھیں۔

اس حال و ماحول میں سرکاری ملازمت کی پابندیاں کب تک گوارا کرتا اور ارباب مجاز بھی ایک ایسے آدمی کو کب تک سرکاری عہدہ پر باقی و برقرار رکھتے جو سرِعام انقلابیوں کا بااعتماد دوست تھا۔ گھر والے بھی میری ان سرگرمیوں پر تشویش کا اظہار کرنے لگے تھے اور میرے والد کو اپنے دوست احباب سے پتہ چل گیا تھا کہ میں کن لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہوں۔ اپنے گھر والوں اور اپنے ماحول سے ذہنی تصادم کی داستان اس مرحلہ پر اختتام کو پہنچی جب کہ ریاست حیدرآباد میں شخصی حکمرانی کا تاروپود بکھر کر رہ گیا اور یہ ریاست آزاد ہندوستان کا ایک جزو بن گئی۔ اپنی افتاد طبع کے اعتبار سے میں نے "صحافت" کو اپنا پیشہ بنانے کا فیصلہ کیا اور ۱۹۴۸ء میں سرکاری ملازمت سے مستعفی ہوکر ۱۵ اگست ۱۹۴۹ء سے روزنامہ "سیاست" نکال رہا ہوں۔ ۵۸ برس کی عمر کے اس "کینوس" پر آپ کو نہ جانے کتنے ہی اچھے برے "رنگ" ملیں۔ جاذب نظر بھی اور آنکھوں میں چبھنے والے بھی۔ لیکن اس "کینوس" کو ایک لکیری تصویر ہونا ہے اور یہ لکیر میرے فکری ارتقاء کی نمائندگی کرتی ہے۔

میرا اخبار جس دن شائع ہوا تھا اس دن سے کافی عرصہ تک اس کی ۵۰۰ کاپیاں ہی مشکل سے فروخت ہوتی تھیں لیکن آج اس اخبار کا حلقۂ اشاعت وسیع ترین ہوگیا ہے۔ "سیاست" ان گنے چنے اخباروں میں سے ہے جو اپنی تعداد اشاعت اور درجہ بندی کے لحاظ سے متوسط درجہ کے زمرہ سے تعلق رکھتا ہے۔

"سیاست" آج میری میراث نہیں رہا ہے یہ اس کے بے شمار پڑھنے والوں کی آواز بن گیا ہے اور آج تک بھی اسے وہ تمام طبقے اپنا ترجمان سمجھتے ہیں جنہیں سیکولرازم اور سوشلزم پر ایقان ہے۔

میری کشمکش حیات کی کہانی سیاست کے کاغذی پیرہن پر دوڑنے والی سطروں کے بیچ بیچ میں ابھرتی ہے۔ بڑے عجز و انکسار سے میں کہہ سکتا ہوں کہ ایک اردو اخبار کے لیے یہ بات کچھ کم قابل فخر نہیں کہ اس کی خبروں کی ترتیب اس کے اداریے نوٹ اور اس کا گٹ اپ جہاں اہل علم اور دانشوروں کا دامان نظر پکڑ لیتا ہے تو دوسری طرف خبر رسانی کے قومی اداروں اور ترسیل و ابلاغ کے عصری وسائل تنظیم جدید

سے کسی بھی مرحلہ میں "سیاست" کے ایڈیٹر کی رائے کو وقعت و اہمیت دی جاتی ہے۔ چنانچہ قومی پریس کے نمائندوں کے دوش بدوش پریس ٹرسٹ آف انڈیا اور یو این آئی کے انضمام اور علیحدگیوں دونوں مرحلوں پر میں بھی ان کے ڈائرکٹروں میں شامل رہا اور یہ اعزاز اُردو میں صرف "سیاست" ہی کو نصیب ہوا لیکن اس افتخار سے بڑھ کر یہ بات میرے لیئے قابل عزت ہے کہ "سیاست" ملک کا واحد اُردو اخبار ہے جسے کم و بیش تمام ہندوستانی زبانوں کے عظیم ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا قلمی تعاون حاصل ہے۔ اور اس میں ان کی تخلیقات شائع ہوا کرتی ہیں۔ اپنے پڑھنے والوں کے کنبہ کی طرح "سیاست" نے اپنے لکھنے والوں کا ایک خاندان بھی بنا لیا ہے۔ انگریزی اخبارات کے ساتھ ساتھ "سیاست" کے ایڈیٹر کو بھی ایسے مباحث اور ایسے سیمناروں میں اظہار خیال کی دعوت دی جاتی ہے جن میں قومی مسائل زیر بحث رہتے ہیں۔ اب اُردو صحافت کے معیار کو بلند سے بلند تر کرنا اور اس زبان کے تحفظ و ترقی کے لیئے اپنی بساط کے مطابق کوشش کرنا ہی میرا مقصدِ حیات ہے۔ سیاست کی آواز اور اس کے اثر کے باعث حکومت امریکہ نے ۱۹۶۸ء میں صدارتی انتخابات کے معائنہ کی دعوت دی۔ سوویت یونین بھی دو مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا۔ یوروپ کے شہر اور مشرق بعید بھی جا چکا ہوں۔ صدر جمہوریہ جناب فخرالدین علی احمد کے ہمراہ مشرقی یوروپ اور یوگوسلاویہ اور نائب صدر مسٹر پاٹھک کے ساتھ افغانستان اور خلیجی ممالک کے دورہ کا موقعہ ملا۔

میرے نصب العین کے سماج میں چونکہ شہر حیدرآباد کی وضعداری اور بھائی چارگی کی روایات کو سب سے بلند مقام حاصل ہے اس لیئے میں پوری دیانت داری اور خلوص سے کوشش کرتا ہوں کہ "سیاست" کو صحت مند روایات اور نئی قدروں کا ایک خوشگوار امتزاج بناؤں۔

اُردو سے میری والہانہ محبت کو آپ میری مادری زبان ہونے کے سبب قرار دے لیں لیکن میں نے ایسا محسوس کیا ہے کہ یہی وہ زبان ہے جس نے ہمارے ملک میں مختلف تہذیبوں کے ارتباط و اختلاط کے عمل میں تیزی پیدا کی اور جس میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ عصری تقاضوں کو بڑی آسانی سے قبول کرسکتی ہے۔ اس لیئے میں اس کی نشو و نما اور اس کے ارتقا کی ہر تحریک سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ ویسے انجمن ترقی اُردو کے شریک معتمد اور آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کی مجلس عاملہ کے اگزیکیٹیو چیرمین کی حیثیت سے مجھے اُردو اور اُردو والوں کی خدمت گزاری کا شرف حاصل رہا ہے۔ لیکن ان دنوں پرائمری سے ثانوی درجوں تک ماڈل اسکول اور کوچنگ سنٹروں کے قیام کی جدوجہد میں معروف ہوں اور اپنے دوست احباب کے ساتھ کندھے پہ جھولی لٹکائے اُردو تعلیمی ٹرسٹ کے لئے ہر صاحب خیر سے اُردو کے لیئے اس کا حق صرف ایک روپیہ مانگتا پھرتا ہوں۔

میں نے پہلے ہی بتایا ہے کہ میری تعلیم اس دور کے طبقہ اشراف کی روایات کے مطابق انگریزی ماحول میں ہوئی تھی اور میں نے اپنی مرضی سے اچانک اپنا ذریعہ تعلیم بدل کر ملک کی پہلی اُردو ذریعہ تعلیم مادر جامعہ کو اپنایا تھا اس لیئے میں اُردو میں کسی حد تک "ہمہ دانی" کا دعویٰ تو نہیں کرسکتا لیکن اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ اُردو میرا ایمان ہے میرا سرچشمۂ وجدان ہے اس وارفتگی نے مجھ سے کچھ ایسے کام بھی کرائے جو میری بساط سے بہت بڑے تھے۔

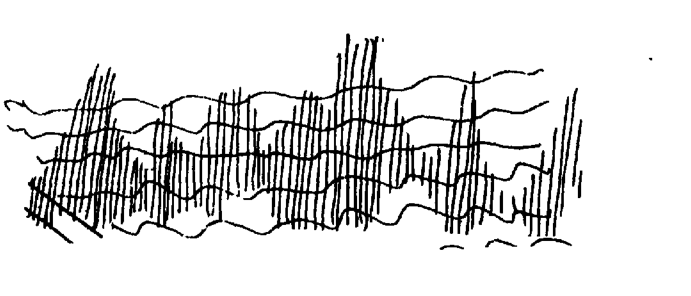
میں نے یہ سوچ کر کہ اردو کی اچھی تخلیقات کے لیئے سرمایہ کی فراہمی ادیبوں اور لکھنے والوں کے بس کی بات نہیں ہوتی اور اُردو کے شاعر و ادیب اپنی بے پناہ صلاحیتوں کے باوجود افلاس کے دلدل سے نکلنے نہیں پاتے ان کی امداد و اعانت کے لیئے "ادبی ٹرسٹ" کے قیام کا اعلان کر دیا۔ سوال یہ تھا کہ سرمایہ کہاں سے آئے؟ لیکن جو تحریک پورے خلوص سے شروع کی جاتی ہے اس کے پھلنے پھولنے کی راہیں

نکل ہی آتی ہیں۔ چنانچہ میری اس جراءت رندانہ کی حوصلہ افزائی کرنے والے کچھ اور لوگ بھی مل گئے اور میں جو یکہ و تنہا ایک مشکل سفر پر چل پڑا تھا بہت جلد اپنے آپ کو ایک کاروان کا جزو محسوس کرنے لگا۔ میں نے اس ٹرسٹ کے کارپس کی فراہمی کے لیے ہر سال ایک کل ہند مشاعرہ کے انعقاد کا انتظام کیا اور ۱۹ سال قبل پہلا مشاعرہ ہی اپنے نظم و ضبط، ہندوستان کے مشہور شاعروں کی شمولیت و شرکت اور اردو نوازوں کی اعانت سے بڑا کامیاب رہا۔ اب ادبی ٹرسٹ کے مشاعرے سارے ملک میں مشہور ہوگئے ہیں۔ میں بڑے فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ ان مشاعروں کو سننے کے لیے ایسے سرکاری حکام اور قومی قائدین بھی بے چین رہا کرتے ہیں جنھیں اردو کی شاعرانہ موشگافیاں تو دور کی بات ہے اردو زبان بھی نہیں آتی۔ اس ٹرسٹ کے زیر اہتمام اب تک ۸ مطبوعات شائع ہو چکی ہیں اور شاعروں، ادیبوں کی بروقت امداد اور اردو آرٹس کالج اور اردو کے دیگر کالجوں پر زائد از دو لاکھ روپے جاری کیے گئے۔ اب ادبی ٹرسٹ کا کارپس ڈیڑھ لاکھ روپیہ سے زیادہ ہوگیا ہے۔

حکومت نے مسٹر اندر کمار گجرال (موجودہ سفیر ہند برائے سوویت یونین) کی صدارت میں گجرال کمیٹی تشکیل دی تھی تو مجھے بھی اس کا ایک رکن نامزد کیا گیا۔ مجھے افسوس ہے کہ گجرال کمیٹی کی ضخیم رپورٹ اب تک منظر عام پر نہیں آسکی ہے تاہم میرا ضمیر مطمئن ہے کہ اس کمیٹی کے اجلاس میں میں نے کسی مصلحت کو پیش نظر رکھے بغیر اردو والوں کی انتہائی دیانت داری سے نمائندگی کی اور اس سیکولر زبان کو اس کے حقیقی روپ میں پیش کیا اور بعض ایسی تجاویز منظور کرانے میں کامیاب رہا جن کو نیک نیتی سے روبہ عمل لانے کی صورت میں مجھے یقین ہے کہ اردو والوں کے کئی ایک مسائل طے پا سکتے ہیں۔

مجھے اردو والوں سے کوئی شکایت نہیں کیونکہ ہر مرحلہ پر مجھے ان کا مکمل اعتماد حاصل رہا ہے اور "سیاست" کو محض ایک اخبار کی بجائے ایک ادارہ بنانے میں انھوں نے مجھے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا گراں بہا تحفہ دیا ہے۔

آدمی کے جینے کے لیے ایک فلسفہ حیات کی ضرورت ہوتی ہے اور جو فلسفہ حیات مجھے ملا ہے وہ اس زبان کا عطا کردہ ہے ویسے میرے اسلاف نے "با مسلمان اللہ اللہ با برہمن رام رام" کے شعار کو اپنایا تھا۔ میں انہیں کی خاک پا کو سرمہ چشم بناتے ہوئے عصری ہندوستان میں اردو والوں کو ان کا مستحقہ مقام و مرتبہ دلانے کے لیے جدوجہد میں شامل ہوں اور اپنے ضمیر کی آواز کو اپنا رہنما بنا کر اس راستہ پر چلنے کی بساط بھر کوشش کرتا ہوں جو عدل و انصاف کا راستہ ہے۔ میری تمنا یہی ہے کہ اس راستہ کے کسی موڑ پر مجھے آبلہ پائی کا گلہ کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے اور میرے ساتھ جدوجہد کرتے والوں کی ہر منزل سہل اور آسان ہو۔ میرے بھلے برے کی تفصیل میں نے پیش کر دی ہے۔





حسن کمال

"......... میں خود میں فی الحال اتنی ہمت نہیں پاتا کہ اپنی تمام کمزوریوں، خامیوں اور موقع پرستیوں کی داستان سناؤں، جو چاہے انچاہے زندگی نے مجھ پر مسلط کر رکھی ہیں اور اگر ان کا ذکر نہ کروں تو آپ بیتی میں لکھوں کیا ـــــــ؟ ...."

ڈیر صابر دت۔

اپنے کئی نمبروں کی کامیابی قبول کرو، اور "آپ بیتی نمبر" کے لئے نیک تمنائیں۔

تم نے مجھ سے میری آپ بیتی بھی مانگی تھی۔ میں نے سوچا تمہاری خواہش پوری ہی کر دوں، لکھنے بیٹھا تو پسینے چھوٹ گئے۔ "کردہ گناہوں" کے خوف اور "ناکردہ گناہوں" کی تمنا نے حوصلہ پست کر دیا۔ سوچا اگر سچ سچ لکھ دوں تو میرا سماجی بائیکاٹ ہو جائے گا۔

قصہ یوں ہے کہ "ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے" سب کی کہانی ایک جیسی ہے۔ ناانصافی، نابرابری اور موقع پرستی پر مبنی سماجی حالات میں پلنے بڑھنے والے ہم اور تم بھی تو اس سماج کی غلاظتوں کے مرکب ہیں۔ ہماری داستانِ حیات بھی اسی چھین جھپٹ اور چوہا دوڑ (RAT RACE) کا حصہ ہے، جو زمانہ کا طرۂ امتیاز ہے۔

میں خود میں فی الحال اتنی ہمت نہیں پاتا کہ اپنی ان تمام کمزوریوں، خامیوں اور موقع پرستیوں کی داستان سناؤں، جو چاہے انچاہے زندگی نے مجھ پر مسلط کر رکھی ہیں۔ اور اگر ان کا ذکر نہ کروں تو "آپ بیتی" میں لکھوں کیا؟ جس دن اپنے اندر اتنی جرأت پیدا کر لی، اس دن تمہیں اور تمہارے رسالے کے قارئین کو ضرور اپنی آپ بیتی سناؤں گا۔

"روسو" کے اعتراضات کے بارے میں تم نے ضرور سنا ہوگا (ویسے کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ذاتی نمائش اور شہرت کے لئے روسو نے خاصا جھوٹ بھی بولا ہے)۔ آپ بیتی کے لئے روسو کی سچائی کا ایک حصہ تو ضرور ہونا چاہئے۔

اگر میں اس حقیر حصہ کو بھی قلمبند کر دوں، تو کیا سماج مجھے برداشت کرے گا؟ چھوڑو ابھی تمہاری ہماری عمر ہی کیا ہے۔ ہم اختر الایمان کے "شیشہ کے آدمی" ہیں اور ابھی ہمارے صرف کھانے کھیلنے کے دن ہیں۔

اپنی ایک نظم کا درمیانی حصہ یاد آ گیا،

باتیں، لڑائی جھگڑے، شرابیں، مباحثے
اک دوسرے کی کاٹ، بھلا اپنا، جوڑ توڑ
جینے کی دوڑ دھوپ، کمانے کی بھاگ دوڑ
ہر چیز چھین لینے، جھپٹ لینے کی ہوس
اب اور اپنا حال لکھوں کیا، سمجھ لو بس

اللہ کا لاکھ شکر ہے میں خیریت سے ہوں۔

اور تمہاری خیریت کا طالب۔

تمہارا دوست
حسن کمال
(بقلم خود)



کلام حیدری

"......۱۹۷۱ء میری زندگی کا وہ موڑ ہے جب میرے کیریئر میں بحران آیا۔ ایک زلزلہ ..... ایک قیامت ......شاید خدا نے مجھے سبق دیا ہو کہ ادب میرا منتظر ہے اور اگر میں اپنی بقیہ زندگی میں ادب کو کچھ نہ دے سکا تو میری زندگی کا اصلی مقصد فوت ہو جائے گا۔ اس لئے میں اپنے آپ کو سمیٹنا چاہتا ہوں اور ادب میں ڈوب جانا چاہتا ہوں............"

میں نے یہ سوچا ضرور تھا کہ کبھی اپنی آپ بیتی لکھوں گا، لیکن ایسا خیال کبھی نہیں آیا کہ ۱۹۷۸ء میں جب کہ میری عمر اڑتالیس سال کی ہے ۔ مجھے آپ بیتی، مختصر ہی سہی لکھنی پڑے گی ۔ "فن اور شخصیت" کے خالق اور مدیر صابر دت کی یہ فرمائش ہوئی تو میں یہ سوچ کر بیٹھ گیا کہ میں صابر دت کی دل شکنی نہیں کر سکتا، کیونکہ صابر دت کا تعارف میرے بہت ہی پیارے محترم بھائی کرشن چندر نے کرایا تھا۔

مجھے اپنی تاریخ پیدائش یاد نہیں ہے، لیکن مجھے میری ماں نے بتایا ہے کہ میں جولائی ۱۹۳۰ء دھیڑہ میں پیدا ہوا۔ مجھ سے پہلے میری ایک بہن پیدا ہوئی تھی یعنی میری آپا، جو ساڑھے تین سال کی عمر میں اپنے بھائی کی آمد کا انتظار کئے بغیر دنیا سے چلی گئی۔ اس کا نام قرۃ العین تھا۔ میں اپنی پیدائش سے لیکر آج تک آپا قرۃ العین کو تلاش کرتا ہوں۔ مگر وہ مجھے آج تک خوابوں کے سوا اور کہیں نہیں ملی۔ میری قرۃ العین آپا، جن کی میں کوئی تصویر نہیں بنا سکتا، ہر چند کہ میرا تصور ہمیشہ کچھ آڑی ترچھی لکیریں کھینچا رہتا ہے لیکن میری آپا قرۃ العین کا کوئی مجسمہ نہیں بن سکا۔ چار پانچ سال کی عمر سے لے کر آج اڑتالیس سال کی عمر تک میرا تصور اپنی آپا کو ڈھونڈتا ہے۔ شاید اس اذیت سے مجھے مرنے کے بعد پناہ ملے گی۔

میں نے اپنے نانا کے ساتھ رہ کر پانچ برس کی عمر سے لے کر بارہ سال کی عمر تک تعلیم پائی۔ قصبہ جلیسر کے محلہ نوشیان کے ہر مکان کی ایک ایک اینٹ مجھے آج تک یاد ہے، اس کا منہدم اور کھنڈر قلعہ بھی مجھے یاد ہے۔ اختر منزل کی وہ بڑی عمارت بھی یاد ہے جو بذات خود ایک محلے کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ کسی بہت بڑے جاگیردار کی ملکیت تھی، جس کے احاطوں میں مونگ پھلیاں لگتی تھیں۔ جلیسر گھنگھروؤں کا شہر ہے اور ان گھنگھروؤں کی موسیقی آج بھی میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔

میں اپنی اس گوالن متیا کی خوشبو کو بھی نہیں بھول سکتا، جو مجھ سے ہمیشہ گھی اور مکھن کی طرح لپٹی رہتی تھی۔ شیر خوارگی کے زمانے میں میری وہ گوالن متیا جس کا بیٹا کلدیپ مجھ سے شاید چند دن چھوٹا یا بڑا ہوگا، کبھی مجھ سے نہیں بھلایا جا سکتا۔

اسکول کے تین چار برسوں میں ماں باپ سے الگ رہ کر گمراہ ہونے اور بھٹکنے کے سارے راستے کھلے رہتے ہیں، لیکن نہ جانے ایسا کیوں ہوا کہ میں بھٹکا تو گورنمنٹ اردو لائبریری کی بلڈنگ میں پہنچ گیا۔ جہاں افسانوں، ناولوں، داستانوں کی کتابیں اور رسالوں کے فائل سے چن چن کر صرف افسانے پڑھتا رہا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ شام کو لائبریری اس وقت کھلتی جب میں اس کے برآمدے میں اس کے کھلنے کا دس دس منٹ، پندرہ پندرہ منٹ تک انتظار کرتا رہتا۔ اور جب لائبریری کا آخری دروازہ بند ہونے لگتا تو باہر چلا آتا۔ اسکول کے ان چار برسوں میں آٹھواں کلاس پٹنہ مسلم ہائی اسکول سے پاس کیا، لیکن نویں جماعت میں رام موہن رائے سیمنری میں داخلہ لے لیا، یہ سنہ ۴۲ء تھا۔

ابا مرحوم کی پوسٹنگ اس سے پہلے دانا پور میں تھی، جہاں ملٹری کنٹونمنٹ تھا اور چھوٹی چھوٹی چھٹیوں میں بھی وہاں جاتا تو سپاہیوں کو دیکھ کر پتہ نہیں کیوں اس وقت کے کچے ذہن میں بھی اپنی غلامی کا شدید احساس ہوتا۔ دانا پور اسٹیشن پر آنے جانے والی گاڑی

کے ڈبوں پر FOR EUROPIANS ONLY لکھا ہوا دیکھتا تو مایوس کن سی اضمحلالی کیفیت طاری ہو جاتی۔ کھگول ریلوے سینما ہال میں صرف انگریزی فلمیں دکھائی جاتی تھیں، اس سینما ہال میں بھی انگریزوں کے لئے ایک الگ مخصوص کلاس تھا جس میں بیٹھنے کی مجھے خواہ مخواہ خواہش ہوتی۔ میں نے لنشے میں چور ٹامیوں کو ٹم ٹم سے لڑھک کر گرتے دیکھا۔ دانا پور (کھگول) کی ریلوے کالونی کا لان اور اس کی چمن آرائی اس وقت دیکھنے کے لائق ہوا کرتی تھی۔ یہاں میرا ایک دوست تھا منظور عالم، جس کے یہاں رسالوں کے انبار لگے رہتے تھے۔ کیونکہ اس کے چچا "خیام" وغیرہ میں افسانے لکھا کرتے تھے۔ رحمت علی صابر نور محاری لاہور سے نکلنے والے مقبول ماہنامہ ملا اور ہفتہ واروں میں کثرت سے چھپتے تھے۔ منظور عالم اور میں ریلوے کالونی کے لان، اس کے فواروں اور اس کی چمن آرائیوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے شام کو وہاں ضرور جاتے۔ وہیں، دانا پور اور اس کے اطراف میں بسی اینگلو انڈین عورتوں اور لڑکیوں کو اس طرح سے دیکھتے کہ جیسے وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہوں یا کسی FAIRY LAND سے ابھی ابھی اتر کر آئی ہوں۔ اپنی غلامی کا شدید تر احساس اس ماحول میں جانے کدھر سے جڑ پکڑتا رہا۔

یہاں تک کہ اچانک اگست ۱۹۴۲ء میں جمعہ کا دن تھا الفنسٹن سینما پٹنہ میں فلم چل رہی تھی کہ فلم کے بیچ کا میٹنی شو ہو رہا تھا کہ انقلابیوں کا وہ جلوس سینما ہاؤس پر ٹوٹ پڑا۔ اس جلوس پر پٹنہ سکریٹریٹ کے پاس فائرنگ ہوئی تھی اور کئی نوجوان شہید ہوئے تھے۔ فلم بند ہوگئی، الفنسٹن سینما ہاؤس کے سب دروازے کھل گئے تھے اور ہاتھوں میں ترنگے جھنڈے لئے ہوئے لوگ ہال میں داخل ہو گئے۔ پتہ نہیں کیسے ایک جھنڈا میرے ہاتھ لگ گیا اور اسے لئے جب میں ہال کے باہر انقلاب زندہ باد کے نعروں کے درمیان نکلا تو اس وقت تک پورے پٹنے پر ٹامیوں کا تسلط ہو چکا تھا۔ بی این کالج کے پاس انہوں نے ایک بیریئر بنایا تھا۔ ایسے بیریئر شاید شہر کے مختلف حصوں میں بنائے گئے تھے۔ مجھے پوربی پٹنے کی طرف جانا تھا، اس لئے میں نے اس بیریئر کو پار کرنا چاہا تو ایک ٹامی نے مجھ سے پوچھا: "گاندھی والا یا جناح والا"۔ مجھے گاندھی اور جناح کا فرق معلوم نہیں تھا۔ میں نے کہا "جناح والا"۔ اس نے مجھے پار جانے دیا اور گاندھی والوں کو نہ صرف یہ کہ پکڑ لیا بلکہ بے تحاشہ ان کو مارنا شروع کیا۔ جب تک اپنے گھر سے پر نہیں پہنچا اس وقت تک راستے بھر یہ سوچتا رہا کہ گاندھی اور جناح میں کیا فرق تھا کہ اس نے جناح والے کو چھوڑ دیا اور گاندھی والے کو پکڑ لیا۔ گھر پہنچ کر مجھے اس فرق کا پتہ چل گیا اور میں نے محسوس کیا کہ میں جناح والا نہیں ہوں، گاندھی والا ہوں۔

دوسرے دن رام موہن رائے سیمنری کے دونوں گیٹوں پر طلباء کا بڑا سا جلوس تھا اور گیٹ بند تھے تو میں نے گیٹ کے ایک تالے کو ایک بڑے سے پتھر سے مار مار کر توڑ دیا۔ گیٹ کھلتے ہی میں آگے آگے تھا اور میرے پیچھے ہزاروں غلامی سے نجات پانے کے لئے بے قرار لوگ تھے۔

چند دنوں کی ہلچل کے بعد بے شمار لوگ جیلوں میں تھے، اور پٹنہ کے ہر کالج کے میدانوں میں ٹامیوں کی فوج مشین گنوں اور رائفلوں سے مسلح پڑاؤ ڈالے ہوئی تھی۔ پٹنہ سے ہر جگہ جانے کے راستے مسدود تھے۔ کئی دنوں بعد اسٹیشن سے ایک بس ملی تو اس سے میں بہار شریف پہنچا۔ بہار شریف سے ایک ٹم ٹم پر برہ بگہا کے لئے روانہ ہوا تو ایک ہی میل پر ٹم ٹم کا ایک پہیہ نکل گیا۔ ٹم ٹم کی سواریاں سڑک پر لڑھک گئیں۔ ان میں، میں اور میرے ایک خالہ زاد بھائی تھے۔ وہاں سے آٹھ میل پیدل چل کر ہم دونوں ملک چک پہنچے، جہاں میری خالہ کا گھر تھا۔

میری یہ خالہ اردو اور فارسی کے علاوہ تاریخ پر اتنا عبور رکھتی تھیں کہ وہ آئی اور بی اے تک کے گھر کے طالب علموں کو فارسی پڑھاتی تھیں۔ پہلی جنگ عظیم کی پوری تاریخ ان کو اس طرح یاد تھی کہ جیسے وہ ہر محاذ پر خود رہی ہوں۔ دوسری جنگ عظیم میں انگریزوں سے انتہا نفرت کی بنا پر ہٹلر سے انہیں اتنی محبت تھی اور اتنی عقیدت تھی کہ وہ ہر لمحہ ہٹلر کی اقبال مندی کی دعائیں مانگا کرتی تھیں۔ اور چھوٹے بڑے تما

محاذوں کی جو اطلاعات ان تک اخباروں سے پہنچتی تھیں، وہ انہیں اس طرح یاد تھیں کہ جیسے وہ ہر چھوٹے بڑے محاذ کی ہر جنگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئی ہوں۔

یہ میری وہ خالہ تھیں جن کے علم کا دبدبہ میرے اوپر بہت زیادہ تھا اور جن کے یہاں میں نے اپنی اُس آپا کا بدل تلاش کر لیا تھا جو میرے پیدا ہونے سے پہلے دنیا سے جا چکی تھی۔ شاہدہ باجی کی محبت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے مجھے اپنے بھائیوں کے زمرے سے ایک لمحے کیلئے بھی خارج نہیں سمجھا۔ دیکھنے میں مضبوط تنومند اور بے حد خوبصورت، میری شاہدہ باجی نے میری قرۃ العین آپا کی جگہ لے لی تھی۔ میری آمد کی مسرت سے وہ ایسی کھل اٹھتیں کہ جیسے انہیں بڑی نعمت مل گئی ہو، اور باورچی خانے میں بے انتہا مصروف ہو جاتیں، انہیں معلوم تھا میں کون کون سی چیزیں پسند کرتا ہوں، انہیں معلوم تھا کہ میں کن باتوں سے دکھی ہوتا ہوں۔

شاہدہ باجی کی جب شادی ہوئی تو مجھے یاد ہے، کسی لمحے بھی رویا نہیں، اور اس سے زیادہ خوشی مجھے اپنی چھوٹی بہن عفیفہ کی شادی میں بھی نہیں ہوئی۔ ان کے شوہر عبدالقیوم ملک اپنے وقت کے بہار کے نامی گرامی فٹ بال پلیر رہے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد ان کو پاکستان جانا پڑا۔ میری شادی کے موقع پر جب شاہدہ باجی ۱۹۵۵ء میں بڑے دھوم دھام سے خاص طور پر پاکستان سے آئیں، تو میں رو پڑا۔ سابق مشرقی پاکستان اور موجودہ بنگلہ دیش کی تمام اذیتوں کو میری بہن وہاں جھیلتی رہی اور میں یہاں تڑپتا رہا اور جب اپنی پیاری بچیوں اور لڑکوں سمیت کراچی پہنچ گئیں تو مجھے لگا میں نے دوسری زندگی پائی۔ میری آپا قرۃ العین کو خدا نے مجھ سے چھین لیا۔ مجھے کوئی شکایت نہیں ہوئی، کیونکہ خدا سب سے بڑا ہے اور اس کی مصلحتیں انسانی عقل سے بالا ہیں۔ لیکن میری شاہدہ باجی کو ملک کی تقسیم نے چھین لیا، اس کا مجھے اتنا دکھ ہے جس کا پرتو میری کئی کہانیوں میں اس طرح آیا ہے کہ کوئی دل والا روئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اگست ۱۹۴۶ء کے بعد جب نومبر ۱۹۴۶ء میں حالات نارمل ہوئے اور میں واپس پٹنہ گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ رام موہن رائے سیمنری سے مجھے نکال دیا گیا ہے۔ میں نے پرائیویٹ طور پر مسلم ہائی اسکول سے نویں درجے کا امتحان پاس کیا اور دہیں دسویں درجے میں نام لکھا لیا۔

دسویں اور گیارہویں کے بہترین دوستوں میں یوں تو بہت سے نام ذہن میں رینگ آتے ہیں لیکن حافظ علی رضا جیسا مخلص ساتھی اور دوست مجھے کوئی نہیں ملا، حافظ علی رضا لندن میں عرصۂ دراز سے اپنی جرمن بیوی اور بچوں کے ساتھ خوش و خرم ہے۔ چند سال پیشتر جب حافظ علی رضا گیا آیا تو یہ سو فیصدی وہی حافظ علی رضا تھا، جو اسکول میں میرا ساتھی، ہمدرد اور دوست رہا تھا۔ لندن میں اس کے کئی مکانات ہیں سفوز کا ڈسٹ اکاؤنٹنٹ ہے اور لندن میں بھی اپنی مہمان نوازی اور دوستی کے سلسلے کو اُسی طرح برقرار رکھے ہوئے ہے جس طرح پٹنے کے رمنہ روڈ کی ایک چھوٹی سی کوٹھری میں رکھتا تھا۔ حالانکہ حافظ علی رضا ایک غریب طالب علم تھا اور آج وہ ایک بے حد خوشحال لندن کا باشی ہونے کے باوجود مزاجاً، عادتاً اور طبیعتاً وہی ۴۴-۱۹۴۳ اور ۴۵ء کا حافظ علی رضا ہے—!

میٹرک پاس کر لینے کے بعد میں نے "کلکتے" کا رخ کیا اور وہاں ایک نائٹ کالج میں کامرس پڑھنے لگا، یہ ۱۹۴۵ء کا اگست یا ستمبر کا مہینہ تھا۔ کلکتہ میں میرا کوئی نہیں تھا۔ سوائے ایک دوست کے جس کا نام ریاض تھا اور جو سیول سپلائز کے محکمے میں ملازم تھا۔ اس نے مجھے خط پہ خط لکھ کر کلکتے بلایا اور میں دو سال تک اس کے ساتھ اس طرح رہا کہ حساب دوستاں دل سے باہر کبھی نہیں ہوا۔

۱۹۴۶ء میں کلکتے میں مسلم لیگ کے ڈائرکٹ ایکشن کے نتیجے میں جو بھیانک فرقہ وارانہ فساد ہوا، اُسے میں نے اتنے قریب سے

دیکھا ہے۔ میں فرقہ وارانہ فسادکی المناکیوں کے تمام پہلوؤں کو لئے ہوئے ایک ایسا دکھی انسان ہوں جس کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ مذہبی جنون آدمی کو درندہ کیسے بنا دیتا ہے۔ اس فرقہ وارانہ فساد کو قریب سے دیکھنے کا موقع مجھے اس لئے ملا کہ میں نے ریڈ کراس میں اپنا نام لکھا لیا تھا، اور انڈین پولیس کے ساتھ سڑکوں پر پورے کلکتے کے چھوٹے بڑے محلوں، گلیوں، بازاروں، تنگ مکانوں میں زندگی سے بیزار بچے کھچے لوگوں کو رفیوجی کیمپ میں لانے کا کام کرتا تھا۔ میں مشکل سے دو ہفتے ریڈ کراس کے ان کاموں میں رہا، لیکن ان پندرہ دنوں کا ایک ایک لمحہ داستان بن سکتا ہے۔ پہلے روز جب ہم ٹرک لے کر نکلے تو سڑکوں پر سے لاشوں کو کھینچ کھینچ کر سڑک کے کنارے کر کے ٹرک کے گذرنے کا راستہ بنانا پڑتا تھا۔

بہار کے فرقہ وارانہ فساد کے بعد مسلم لیگ کے زیر اہتمام جو رفیوجی کیمپ بنے تھے ان کا احوال یہ تھا کہ رفیوجیوں میں کھچڑیاں بٹتی تھیں اور مسلم لیگی لیڈر دال کے قائدین اسی بلڈنگ کی اوپری منزل پر پلاؤ اور قورمے تناول فرماتے تھے، بے کس اور بے سہارا جوان لڑکیوں کو سہارا دینے کا لالچ دے کر کتنے ہی بوالہوسوں نے اپنی ہوس پوری کی۔ کبھی موقع ملا تو ان المیوں کو لکھ کر اپنے دل اور ذہن کا بوجھ ہلکا کر دوں گا۔

۱۹۴۷ء میں کلکتے سے آئی کام پاس کرنے کے بعد میں نے سینٹ زیویرس کالج کے تھرڈ ایئر کامرس میں داخلہ لیا اور ان ہی دنوں میں نے ایک ماہنامہ "نغمہ ولو" کے نام سے نکالا اور نکالتا رہا۔ پر ایک دن میرا دوست جس کے ساتھ میں یہ رسالہ نکالتا تھا۔ میرے کچھ حساب کتاب پوچھنے پر یہ کہہ گیا کہ ڈکلریشن اُس کے نام سے ہے اس لئے قانونی طور پر وہ رسالہ اسی کا ہے۔ میں نے یہ سننے کے بعد ایک رکشے پر اپنا سامان رکھا اور کلکتے کے ایک کھولا باڑی میں جا کر رہنے لگا۔ رسالہ بند ہو گیا، اور میرا وہ دوست کراچی چلا گیا۔ سنا ہے وہاں وہ کوئی تیسرے درجے کا رسالہ نکالتا ہے اور کبھی کبھی فلموں کے گانے لکھتا ہے۔ خدا اُسے خوش رکھے۔

ستمبر ۱۹۴۸ء میں جب مشرقی پاکستان جانے کے لئے کسی اجازت نامے اور پرمٹ کی ضرورت نہیں تھی اور میں سمجھتا تھا کہ دونوں ممالک برابر اسی طرح رہیں گے، میں اکیلے رنگ پور چلا گیا اور اسٹیشن کے ٹھیک سامنے مشرقی بنگال کے قاعدے سے بانس کی دیواروں اور پھوس کی چھاؤنی کے ساتھ ایک ریسٹوران کھولا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ رنگ پور اسٹیشن کے اسٹیشن ماسٹر میرے ریسٹوران میں آئے اور مجھ سے پوچھا کہ "آپ انگریزی پڑھے ہوئے ہیں؟" میں نے انہیں بتایا کہ "میں آئی کام پاس ہوں۔" پھر یہ پوچھا کہ "یہ پوچھنے کی آپ کو ضرورت کیا پڑی؟" کہنے لگے "میں روز آپ کو دیکھتا ہوں کہ آپ بک اسٹال سے انگریزی اخبار خریدتے ہیں اور اپنے ریسٹوران میں بیٹھے ہوئے پڑھتے رہتے ہیں۔ تو مجھے تعجب ہوا کہ آپ کے اغل بغل اور آگے پیچھے جو ٹی کالی، ہوٹل اور ریسٹوران دیگر رفیوجیوں نے کھول رکھے ہیں ان میں اور آپ میں فرق ہے۔"

میں نے رنگ پور کالج میں داخلہ لینا چاہا تو معلوم ہوا کہ کالج بالکل بند ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہاں نوّے فیصد پروفیسرز ہندو تھے جو سب کے سب بھاگ گئے یا بھگا دیئے گئے۔ ریسٹوران کی آمدنی اچھی خاصی تھی، مگر باورچیوں کے نخروں اور ملازموں کی شرارتوں نے مجھے عاجز کر دیا تھا۔ وہاں ایک پشاوری خان تھے جن کا سینما ہاؤس تھا، وہاں میرے ایک رشتے کے بھائی چیف آپریٹر تھے۔ میں نے اُس سینما میں سینما آپریٹری سیکھنا شروع کر دیا۔ پشاوری خان صاحب کو پتہ نہیں میری سنجیدہ خدمت گذاریوں نے کیسے متاثر کر دیا کہ انہوں نے مجھے سینما کا منیجر بنا دیا اور مجھے ایسا لگا کہ شاید میرا مستقبل رنگ پور ہی سے منسلک ہو گیا۔ خان صاحب کی مہربانیاں اور ان کی عزت افزائی مجھے برابر یاد آتی ہے ـــ لیکن ایک دن ایسا ہوا کہ میں نے اخباروں میں پڑھا کہ ہندوستان اور پاکستان میں آنے جانے کے لیئے پرمٹ سسٹم جاری کیا جا رہا ہے۔ میرے

، مدر کا خالص ہندوستانی اپنی شہریت کو بدلنے پر رضامند نہیں ہوا اور میں نے اچانک رنگ پور چھوڑ دیا۔ میں سیدھا اپنے ابا مرحوم کے پاس جنکی پوسٹنگ ان دنوں رانچی تھی، پہنچ گیا۔ رانچی کالج میں مَیں نے تھرڈ ایئر آرٹس میں داخلہ لیا۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں کو قریب سے دیکھنے کے بعد جبکہ میرا ذہن سیاسی طور پر کوئی راستہ ڈھونڈ رہا تھا، میری ملاقات اختر پیامی سے ہو گئی جس کی نظمیں ان دنوں "نیا زمانہ" میں چھپا کرتی تھیں۔ یہ ۱۹۴۸ء تھا۔

لکھنے لکھانے کا سلسلہ کلکتے سے شروع ہو چکا تھا، مگر میں نے بغیر فرمائش کے اپنے افسانے کر ایڈیٹروں کے پاس دوڑنے اور خوشامد کرنے کو اپنے مزاج کے خلاف پایا۔ فضل حق قریشی کے زمانے کے غیر منقسم ہندوستان کے "آج کل" میں میرے کئی افسانے نقلی ناموں سے شائع ہوئے۔ "جدید اُردو" کلکتے میں پہلی بار میرا افسانہ "بھابی" شریکِ اشاعت ہوا۔ رانچی کالج کے ماحول نے مجھے بڑی تیزی کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین اسٹوڈنٹ فیڈریشن اور یہاں تک کہ کمیونسٹ پارٹی سے قریب کر دیا۔ رانچی میں بعض کم جاننے والے لوگ اختر پیامی کو کلام حیدری اور کلام حیدری کو اختر پیامی سمجھتے اور کہتے تھے۔

میرے والد کا انسپکٹر کا کوارٹر کمیونسٹ پارٹی کے انڈر گراؤنڈ کامریڈوں کے چھپنے کی محفوظ جگہ سمجھی جاتی تھی۔ رانچی کالج کے دو سال میں ہم نے اتنے کام کئے کہ لگتا ہے جیسے ہم نے وہاں دس سال کام کیا۔

بی اے ٹسٹ کا امتحان چھوڑ کر میں اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے ایک جلسے یا رانچی ڈیلیگیٹس کے لیڈر کی حیثیت سے پٹنے میں صوبائی کانفرنس میں شریک ہوا، جلوس نکلا، جلوس پر لاٹھیاں چلیں، میرے دوست گھائل ہوئے، قید ہوئے، دوسرے دن ہم نے پٹنہ جیل پر نہایت قلیل تعداد میں دھاوا بولا۔ وہاں فائرنگ ہوئی۔ وہاں سے رانچی لوٹا تو اپنے پچھلے امتحانات کے ریکارڈوں کی بنا پر بی اے کا یونیورسٹی امتحان دینے کی اجازت ملی۔ جس دن یونیورسٹی کا فارم بھرا وہ تاریخ ۲۴ رجنوری ۱۹۵۰ء تھی۔ ۲۴ اور ۲۵ رجنوری ۱۹۵۰ء کی درمیانی رات میں تین بجے باہری دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا، تو اپنے آپ کو پولیس کی حراست میں پایا۔ رانچی جیل میں مجھے اور میرے ساتھیوں کو جو اُس رات گرفتار ہوئے تھے، سیاسی قیدی بنا کر نہیں رکھا گیا بلکہ سیل میں بند کر کے رکھا گیا۔

۲۶ رجنوری جبکہ ہندوستان میں جمہوریت کے قیام کا اعلان کیا گیا تو مجھ جیسے محبِ وطن جیل کی سیل میں بند تھے۔ ہم نے ہندوستان میں جمہوریت کے پہلے دن کے اُس سورج کو نکلتے ہوئے نہیں دیکھا جس کے لئے ۱۹۴۲ء میں ایک میں ایک نویں کلاس کے لڑکے نے اسکول کا گیٹ توڑا جس کے لئے ۱۹۴۶ء میں جہازیوں نے بغاوت کی، جس کے لئے پٹنہ سکریٹریٹ کے پاس نوجوان نامیوں کی سنگینوں کے آگے اپنے سینے سپر کر دیئے تھے۔ درمیان میں ایک بات رہ جاتی ہے کہ ۱۹۴۹ء کی انجمن ترقی پسند مصنفین کی آل انڈیا کانفرنس بھیمڑی میں۔ رانچی سے دو مندوبین نے شرکت کی۔ ایک مَیں اور دوسرا وحید الحسن جو اس وقت فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا اور ان دنوں مشہور رائٹر دیولوجسٹ ہے۔

جیل سے چھوٹا تو بی اے کے امتحان کو شاید دس بارہ روز رہ گئے تھے۔ امتحان دیا اور خدا جانے کیسے اُردو میں فرسٹ کلاس آنرز کے ساتھ یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن لاکر پاس ہو گیا۔ ان دنوں بہار میں صرف ایک یونیورسٹی، پٹنہ یونیورسٹی تھی۔

ستمبر ۱۹۵۰ء میں پٹنہ یونیورسٹی میں اردو ایم اے میں داخلہ لیا جہاں میری ہی طرح آنا دہندوستان کی جیل میں رہ کر آئے ہوئے منظر شہاب بھی تھے۔ منظر شہاب میرے ان چند دوستوں میں سے ہیں جس نے دوست ہونے کا نام کبھی نہیں لیا مگر زندگی کے ہر قدم پر دوست رہا۔ انور عظیم بھی دوسر

میں رہے مگر ان کی دوستی کا مزاج اور معیار الگ ہے۔ وہ بھی مجھے عزیز ہے، وہ میرا ساتھی ہے۔ ایم اے میں ہم تینوں نے ایک ساتھ امتحان دیا۔ میرے لئے کسی کا فرسٹ ہونا، کسی کا سکنڈ ہونا، کسی کا تھرڈ ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا مگر شاید انور عظیم کے ذہن میں یہ بات پختہ تھی کہ ایم اے میں وہ ٹاپ کریں گے۔ ہم ایم اے کا امتحان دے کر الگ ہو گئے اور جب ایم اے کا رزلٹ نکلا تو میں فرسٹ کلاس فرسٹ تھا، انور عظیم فرسٹ کلاس سکنڈ اور منظر شہاب فرسٹ کلاس تھرڈ۔ حالانکہ شاید ہم دونوں سے زیادہ مستحق فرسٹ کلاس فرسٹ کا منظر شہاب تھا۔ مگر وہ شاعر اور فلسفی، امتحان گاہ میں بھی اپنی شاعری اور فلسفے میں الجھ کر رہ جاتا تھا، اس لئے کوئی جواب طویل اور کوئی جواب مختصر اور کسی سوال کا جواب ہی ندارد۔ یہ تھا منظر شہاب جو جمشید پور کے ایک بڑے کالج کا آج پرنسپل ہے۔

میں نے اکتوبر ۱۹۵۲ء میں پورنیہ کالج میں اُردو کے لکچرر کی حیثیت سے جوائن کیا اور ۱۹۵۸ء تک وہاں لکچرر رہا۔ اسی درمیان میری شادی ہو گئی۔ گمان یہ نہیں تھا کہ درس و تدریس کی دنیا سے نکل کر میں کاروبار اور صنعت کی دنیا میں آجاؤں گا، پر ایسا ہوا۔ کلکتے کے ماحول، ریسٹوران کے تجربے، سینما کی نیجری، ان سب نے مل کر میرے ذہن پر کچھ ایسا اثر ضرور ڈالا تھا کہ میں کاروبار کی جانب راغب ہو سکتا تھا۔ شادی ہونا ایک اہم بات تھی کیونکہ یہاں سے زندگی کا نیا باب شروع ہوتا ہے۔ مگر یہ نیا باب میری کتاب زندگی میں جس طرح شروع ہوا اُسے بیان کرنے کا ابھی موقع نہیں ہے۔

اس سلسلے میں ایک لطیفہ سناتا چلوں کہ کلکتے سے ایک بار کوئی صاحب جو ادیبوں کا انٹرویو لیتے پھر رہے تھے، میرے پاس تشریف لائے اور انہوں نے مجھ سے پہلا سوال یہ کیا ــ" کیا آپ نے اپنی شادی میں ایک لاکھ روپے لئے تھے؟"

میں نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا ــ" آپ کو غلط اطلاع ملی ہے، میں نے اپنی شادی میں ایک لاکھ نہیں، سات لاکھ روپے لیے تھے۔" خیریت ہوئی کہ انہوں نے اس کی تفصیل نہیں پوچھی ورنہ بتاتا کہ ایک لاکھ کی میری بیوی ہے، ایک ایک لاکھ کی میری تین عدد سالیاں ہیں، ایک لاکھ کے میرے ڈاکٹر آبا ہیں (سسر)۔ ایک لاکھ کی میری ممی (ساس) اور ایک لاکھ کے میرے بڑے سالے ڈاکٹر خالد خیر ہیں اور یہ ساتوں لاکھ میرے لئے ہر سال ضرب ہوتے چلے جاتے ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ شادی کے بعد سے اب تک ارب اور کھرب پتی ہو گیا ہوں۔

ڈاکٹر ابوالخیر مرحوم کا مارکٹ ویلیو یہ تھا کہ وہ گیا ضلع کے مشہور ترین ڈاکٹر تھے جو اگر چاہتے تو اپنی شہرت کے ذریعہ جانے کتنا کماتے۔ ان کی قناعت پسندی نے ان سے اتنی مفت دوائیں بٹوائیں، اتنے گھرانوں کو فائدے پہنچائے کہ ان پر سے کروڑوں روپے نچھاور کر دیئے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر ابوالخیر نے اپنے رشتہ داروں، گاؤں والوں، دوستوں، یاروں کو اتنا کچھ دیا کہ گیا شہر کا کوئی آدمی آج تک انہیں نہ فراموش کر سکا اور شاید فراموش کر بھی نہیں سکتا۔

عجیب بات ہے کہ نانا ابا مرحوم کے بعد اگر مجھے ان جیسی شخصیت کوئی ملی تو وہ ڈاکٹر ابا ہی کی شخصیت تھی۔ وہی پاکبازی، وہی پاک طینتی، وہی فراخ دلی، وہی فیاضی، وہی قناعت پسندی، وہی محنت سے محبت، وہی روشن دماغی، وہی دلیری، وہی بردباری اور ان سب میں سے کسی طرح کم انکساری نہیں! یہ ان کی جرأت مندی تھی کہ انہوں نے مجھے نسبتاً اچھی ملازمت سے استعفیٰ دے دینے کی حوصلہ مندی بخشی۔ اور میں بے خطر ایک صنعت کار بن گیا۔ ان کی دور رس نگاہ مردم شناسی نے پتہ نہیں مجھ میں کیا پایا کہ میرا انتخاب صنعت کار کے لئے کیا۔ اور میں نے کالج سے دو سال کی چھٹی لے کر ۱۹۵۶ء میں کنکریٹ پائپ بنانے کا کارخانہ اس وقت کھولا، جب بہار میں صرف تین کارخانے تھے۔ ڈاکٹر ابا کے انتقال کے بعد مجھے ایسا لگا کہ جیسے تیز دوپہر میں اچانک رات ہو گئی ہے، کہ میرے اندر جرأت مندی ختم ہو گئی۔

۱۹۵۸ء میں میں نے کالج سے استعفیٰ دے دیا، جب تک میرا کارخانہ مستحکم بنیادوں پر قائم ہو چکا تھا۔ میں ۱۹۵۸ء سے لے کر ۱۹۶۲ء تک اپنی صنعتی مصروفیات میں مشغول رہا اور ادبی طور پر سوائے پڑھنے کے تقریباً کوئی ادبی کام نہیں کیا۔

میری سالی نزہت منصور نے امریکہ سے Educational Psychology میں ایم اے کیا۔ نزہت نوری کے نام سے افسانے لکھتی ہے۔ اُس کی زبان، اُس کے اپنے حُسن کے مطابق ہے۔ میری دوسری سالی قیصرا حمد بی اے آنرز ہے، جس نے کبھی کوئی ادبی مقالہ لکھا تو تعریفوں کے ڈھیر لگ گئے۔ میری تیسری سالی فرشاہ حق، ڈبل ایم اے ہے۔ اور تاریخ میں فرسٹ کلاس فرسٹ ہے۔ اس کے ساتھ میرا پیار دیا ہی ہے جیسے گود میں کھلائے ہوئے بچے کے ساتھ۔ اور شاید اُس کا پیار ایسا ہے کہ جیسے وہ اپنے حیدر بھائی کے بغیر اپنے آپ کو نامکمل سمجھتی ہے۔ میری ممی کا یہ عالم ہے کہ جیسے ان کا ایک بیٹا نہیں ہے بلکہ دو بیٹے ہیں، اور مجھے یہ شرمساری ہے کہ میں ان کی محبت کے آگے سوائے سرنگوں رہنے کے اور کوئی خراج پیش نہیں کر سکتا۔

اپنی بیوی کے بارے میں لکھتے ہوئے مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں جیسے اپنی تعریف خود کرنے لگ جاؤں۔ زندگی میں شعلوں سے لہلہاتی راہوں پر چلنے کی صلاحیت مجھ میں اس لئے آج تک ہے کہ اس کے پھول سے ہاتھ میرے شانوں پر ہیں۔

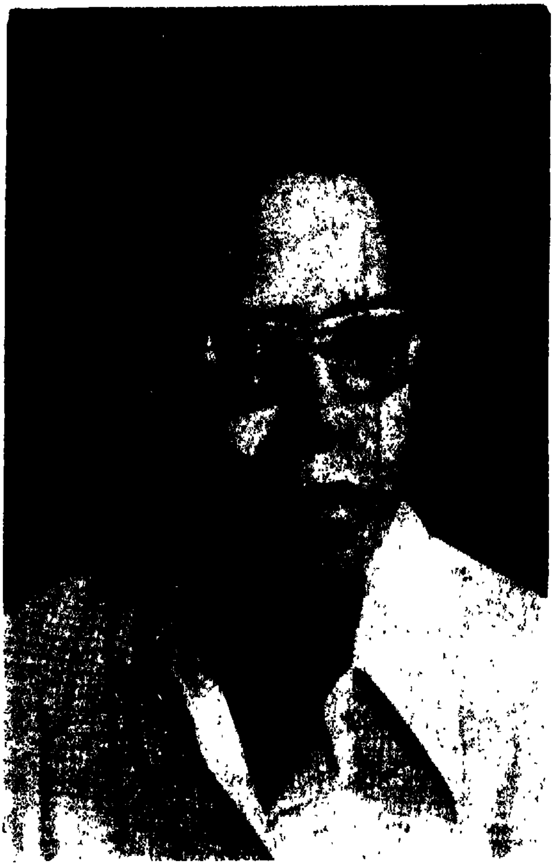
۱۹۶۳ء سے میں نے ہفتہ وار "مورچہ" کا آغاز کیا اور ادبی و تہذیبی دنیا میں اسے جو وقار حاصل ہے اسے بتانے کی میری ضرورت نہیں۔ اس کے دو تین سال بعد میں نے ادبی ماہنامہ "آہنگ" جاری کیا۔ اس کی بابت بھی میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ اس کی بابت سب کچھ کہنے کا حق مجھ سے زیادہ اس کے قارئین کو ہے۔

کلچرل اکیڈمی کا قیام بھی مورچہ کے ساتھ ہی ساتھ وجود میں آیا، جس کے نقوش بعد میں اُبھرتے چلے گئے۔ اور جس ادارے نے کلیم الدین احمد اور خلیل الرحمٰن اعظمی جیسے ادیبوں کی کتابیں شائع کرنے کا فخر حاصل کیا۔

۱۹۷۱ء میری زندگی کا وہ موڑ ہے جب میرے کیریر میں بحران آیا۔ ایک زلزلہ۔ ایک قیامت۔ اور اگر اس کا الزام میں کسی کے سر دوں تو میری جان نکلنے لگتی ہے۔ مگر ۱۹۷۱ء کے بعد سے وہ صنعت کار کلام حیدری نام جاں ہو گیا جو ۱۹۷۱ء سے پہلے کم از کم گیا کے پیمانے پر اپنی ایک خصوص جگہ رکھتا تھا۔

شاید خدا نے مجھے یہ سبق دیا ہو کہ ادب میرا منتظر ہے اور اگر میں اپنی بقیہ زندگی میں ادب کو کچھ نہیں دے سکا تو میری زندگی کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ اس لئے میں اپنے آپ کو سمیٹنا چاہتا ہوں اور ادب میں ڈوب جانا چاہتا ہوں۔

شاہدہ حیدری جب میرے بچے کو جنم دینے والی تھی تو میں نے ہاتھ اُٹھا کر اپنے پروردگار سے یہ دعا کی تھی کہ مجھے بیٹی دینا اور میری دعا اس طرح قبول ہوئی کہ میری ایک ہی بیٹی ہے، مگر جو میری طمانیت کے لئے کافی ہے۔ اس نے میری زندگی میں جو گُل بوٹے کھلائے ہیں، ان سے میرے گھر کے در و دیوار، میرے گھر کا ہر کونہ معطر ہو گیا ہے۔ وہ آئی ایس سی کا فائنل امتحان دے چکی ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ اس کے ذریعہ اب میرے گھر میں کوئی بیٹا بھی آ جاتا۔ خدا نے میری کون سی دعا قبول نہیں کی ہے، جو یہ دعا قبول نہیں کرے گا؟ چنانچہ ایسا ہوا کہ میں اپنی اس تمنا سے بھی خود کو مطمئن پا رہا ہوں، جیسے خدا نے خود سے میرے پاس بیٹا بھیج دیا ہے۔ اس گھر میں اُس کا پہلا قدم چاہے جب بھی پڑے مگر وہ قدم ایسے ہوں گے جن کے نقوش ذہن میں لئے ہوئے میں بڑے غرور اور فخر کے ساتھ اپنی زندگی پوری کر کے خوشی خوشی دفن ہو جاؤں گا۔



رِضوانؔ احمد

"......... میرا خُدا پر کامل اعتماد ہے۔ میں اکثر یہ ضرور محسوس کرتا ہوں کہ اخباری دنیا میں قدم رکھ کر میں نے خُود کو ایک پُرشور طوفان میں ڈھکیل دیا ہے۔ کیونکہ جب تک میرے ہاتھوں میں قلم رہے گا۔ میرا ضمیر مجھے سچ بولنے پر مجبور کرتا رہے گا۔ میں تھپیڑوں پر تھپیڑے کھا رہا ہوں اور تنِ تنہا طوفانوں کا مقابلہ کر رہا ہُوں............"

۱۰

میری زندگی ایک کھلا ہوا اخبار ہے جسے کوئی بھی پڑھ سکتا ہے۔

حالانکہ میری پیدائش ایک ایسے گاؤں میں ہوئی جہاں اخبار، رسالے یا کتاب کے مقابلے میں لاٹھی، بلم، بھالے، گنڈاسے، پستول اور بندوق کی زیادہ اہمیت تھی اور اب بھی ہے۔ میں آزادی ملنے کے تین ہفتوں بعد یعنی ۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو اتر پردیش میں ضلع بارہ بنکی کے ایک چھوٹے سے گاؤں "موئی" میں پیدا ہوا۔ اس طرح میں نے ایک آزاد ملک میں آنکھیں کھولیں۔ ملک کی تقسیم کا کوئی اثر میرے گاؤں پر نہیں پڑا کیونکہ آج تک وہاں کا کوئی فرد پاکستان نہیں گیا۔ اس گاؤں میں جو قومی یکجہتی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ میری تربیت میں بارہ بنکی کے اس چھوٹے سے گاؤں "موئی" کی بہت اہمیت ہے جو میرا آبائی وطن بھی ہے اور میری اولین تربیت گاہ بھی۔

میں اپنی زندگی میں اپنے دادا مرحوم مولانا نثار احمد خاں نثار بھٹیؔ سے بے حد متاثر رہا ہوں۔ وہ اردو، فارسی، عربی، ہندی اور سنسکرت کے جید عالم تھے اور ان زبانوں میں شاعری بھی کرتے تھے۔ ان کی طبیعت اس قدر موزوں تھی کہ لوگوں کو خطوط تک زیادہ تر منظوم ہی لکھا کرتے تھے۔ وہ گاؤں کے واحد شخص تھے جنہیں پڑھائی لکھائی کے علاوہ مقامی سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ گاؤں کا ماحول یہ تھا کہ بات بات پر لاٹھیاں نکل آتی تھیں اور سر کھل جاتے تھے۔

میری ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی اور بعد میں گاؤں کے مکتب میں داخل کروا دیا گیا۔ میرے ہوش سنبھالنے سے قبل ہی زمینداری کا خاتمہ ہو چکا تھا اور موئی کی بیشتر آبادی چھوٹے چھوٹے زمینداروں پر ہی مشتمل تھی۔ لگان کی وصولی پر گزارا ہوتا تھا۔ میرے خاندان کی بھی ساری زمین نکل چکی تھی۔ گاؤں پر ویرانی کا گمان ہوتا تھا۔ مگر زمینداری جانے کے باوجود لوگوں کا ٹھسا وہی تھا۔ صوبائی شان و شوکت سب کو اندر سے کھوکھلا کر رہی تھی۔

میں جب زندگی کے بکھرے اوراق سمیٹتا ہوں تو مجھے سب سے پہلے اس بات کا خیال آتا ہے کہ میرے دروازے کی چوپال کے باہر سردیوں میں ایک بڑا سا الاؤ جلتا تھا جس کے گرد محلے کے سارے افراد جمع ہو جاتے تھے۔ انھیں دنوں دادا مرحوم نے بچوں کے لئے ایک حمد لکھ کر دی تھی جسے میں سب بچوں کے ساتھ مل کر پڑھا کرتا تھا اس کے کچھ شعر اب بھی یاد ہیں۔

اے میرے مولا اے مرے داتا ؞ تجھ سے ہے ہم سب کا ناتا
تو ہی مارے تو ہی جلائے ؞ تو ہی سب کے آڑے آئے
ڈوبے تردں کا تیرا سہارا ؞ ٹوٹی ناؤ کا کھیون ہارا

اور اسی طرح سے بالکل سلیس اردو میں بہت سے اشعار تھے۔ اس اجڑی بستی اور کردہ دیہات میں علم کی کچھ روشنی تھی تو دادا مرحوم کی وجہ سے۔ والد صاحب قبلہ (حکیم مشتاق احمد خان غبار بھٹیؔ) بھی اس میں کچھ حصہ لیتے تھے لیکن وہ اکثر گاؤں سے باہر

رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن میں ہی دو طرحی مشاعرے دادا مرحوم نے کروائے تھے۔ ایک کا مصرعہ طرح تھا ؏
"ہمارا آشیاں جلتا چمن میں روشنی ہوتی" اور دوسرا تھا ؏ "زمانہ لے رہا ہے کروٹیں شائد فضا بدلے"

گاؤں میں پڑھے لکھے لوگ ہی کتنے تھے۔ بس چند افراد الٹا سیدھا لکھ پڑھ لیتے تھے۔ پر شاعر کہاں سے آتے اور وہ بھی طرحی غزل کہنے والے۔ اس کا حل یہ نکالا کہ دادا مرحوم نے ہفتہ عشرہ کے اندر بیس بائیس غزلیں کہہ ڈالیں اور کسی میں پندرہ اشعار سے کم نہیں۔ بس طرحی مشاعرے ہو گئے اور خوب جم کر ہوئے۔

دادا مرحوم کے بہت سے شاگرد تھے۔ ان میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ اسی زمانے میں دادا مرحوم کے پاس سلام مچھلی شہری اور اسرار الحق مجاز بھی آتے تھے۔ سلام ان دنوں فیض آباد میں زیر تعلیم تھے اور مجاز مرحوم کا وطن ردولی میرے گاؤں سے محض دس بارہ میل کے فاصلے پر ہے، اس لئے ان کا آنا جانا اکثر ہوتا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ اس زمانے یہ مختصر فاصلہ ہی عبور کرنا منزل ہفت خواں طے کرنے سے کم نہیں تھا۔

میں اپنی زندگی میں اپنے نانا مرحوم صادق حسین خاں سے بھی بہت متاثر ہوا تھا۔ ان میں غیرت، خودداری اور انا غضب کی تھی۔ ٹوٹ جاتے تھے لیکن جھکتے نہیں تھے۔ ان کی اس آن کے باعث ہی ساری زمینیں چلی گئیں۔ عزیز و اقارب نے منہ موڑ لیا۔ انہوں نے بہت تکلیفیں اٹھائیں لیکن نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلایا اور نہ کسی کے آگے جھکے۔ اگر کہیں نہ جانے کی قسم کھالی تو زندگی بھر نہیں گئے۔ لاٹھی لڑنے میں مشاق تھے۔ ان کے سر پر زخم کے نصف درجن سے زائد نشان تھے جو دور سے ہی نظر آتے تھے۔ سر گھٹا ہوتا تو ایک لمبی سی لکیر آر پار نظر آتی تھی۔ بچوں سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ دراصل ان کے گیارہ بچے ہوئے لیکن ان میں کوئی بھی سال بھر سے زیادہ زندہ نہیں رہا۔ اس زمانے میں شادیوں کے موقع پر نوٹنکیاں ہونے کا عام رواج تھا۔ وہ نوٹنکی کے بے حد شائق تھے۔ مجھے اور دوسرے بچوں کو بھی دکھانے لے جاتے تھے۔ نوٹنکی میں تمام مکالمے منظوم ہوتے تھے۔ اس زمانے میں میں نے جو کھیل دیکھے ان میں خدادوست سلطان، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، تقدیر کا فیصلہ اور نیکی و بدی وغیرہ تھے۔ نوٹنکی کی خاص بات یہ تھی کہ ان میں عام طور پر برائی اور اچھائی کا تصادم دکھایا جاتا تھا۔ اس تصادم میں ہمیشہ آخر میں نیکی کی فتح ہوتی تھی۔

اس زمانے میں کہانیاں قصے بھی خوب خوب سنائے جاتے تھے۔ لوگ دن دن بھر طلسم ہوشربا پڑھوا کر سنا کرتے تھے مجھے بھی کہانیاں سننے کا بے حد شوق تھا۔ ہمارے گاؤں میں کچھ لوگ دریاں بیچنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ وہ رات رات بھر چلنے والی کہانیاں سناتے تھے۔ میں نے جو سنیں ان میں کوڑیا سوداگر، ڈھولا مارو، سدابرج اور طوطا پری، مجھے خاص طور پر پسند تھیں۔

میری ایک نانی جن پر اکثر پاگل پن کے دورے پڑ جاتے تھے انھیں کہانیاں سنانے کا بے حد شوق تھا۔ ہم لوگ انھیں "بڑی نانی" کہا کرتے تھے۔ ان کا کہانی سنانے کا مخصوص انداز تھا۔ ان کی کہانیوں میں منظوم مکالمے ہوتے تھے اکثر پورے پورے گیت ہوتے تھے، جنھیں وہ گا گا کر سناتی تھیں۔ اسے دوہا چھینکنا کہا جاتا تھا۔ منظوم سوال و جواب ہوتے تھے۔ افسوس کہ اب یہ کہانیاں مجھے یاد نہیں ہیں۔ بڑی نانی کے گھر میں ایک گراموفون تھا جس پر پہلے وہ ریکارڈ بجاتیں پھر خود وہی گا کر سناتیں۔

پھاگن کا مہینہ آتا تو گاؤں میں آلہا شروع ہو جاتا۔ لوگ دن دن بھر بیٹھ کر آلہا سنتے تھے۔

آلہا اودل بڑے لڑیّا جن سے ہار گئی تروار
کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ تیگا بولیں رن میں چھپک چھپک تروار

ڈھول بجاکر آلہا گانے کا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ اس میں بڑا جوش ہوتا ہے ــــــــــ ناچ رنگ کی محفلیں بھی خوب جمتی تھیں۔ رنڈی۔ بریوں اور بیڑنوں کے ناچ ہوتے تھے۔ شادیوں کے موقع پر خاص طور سے لڑکی کے علاوہ رنڈی کا ناچ بھی ہوتا تھا۔ جس سے بہاتو کی تفریح و دلبستگی کا سامان ہوتا تھا۔

میرے گاؤں میں عام طور پر لوگ اردو اور ہندی پڑھتے تھے۔ لیکن ان کے بول چال کی زبان دوسری تھی۔ یہ زبان لکھنؤ اور بارہ بنکی کے گرد و نواح میں بولی جاتی ہے۔ اس کا کوئی رسم الخط نہیں ہے۔ یہ لکھی نہیں جاتی ہے لیکن اس میں کہانیاں بھی کہی جاتی ہیں اور نظمیں بھی۔ لوگ ان کی تخلیق کرتے ہیں۔ سناتے ہیں اور بھول جاتے ہیں۔ اس زمانے میں مجھے بہت سی نظمیں یاد تھیں۔ یہ نظم غالباً زمینداری کے جانے کی یادگار ہے۔

مونچھیں اینٹھیں بھوئی دھروا باندھیں لٹرھی پگڑی

اور یہ نظم تو اس زمانے میں بچے بچے کی زبان پر تھی۔

گاندھی بابا کے بلہاری اب جمانہ[1] بدل گا　　　　[1] (زمانہ)
ایک جمانہ رہے پڑھی لکھنؤ پڑھنے جائے
اب تو شکھیا کی سب ہیں گھر گھر ٹریننگ پائے
گاندھی بابا کے بلہاری اب جمانہ بدل گا

وہاں کی کہانیوں اور شاعری میں اس معاشرے کی سچی تصویر نظر آتی ہے۔ افسوس ہے کہ آج تک اس ادب کو صفحۂ قرطاس پر منتقل نہیں کیا گیا۔ اور سینہ بہ سینہ چلتے چلتے اس کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔ ایک اور مشہور نظم ہے۔

پہنے کرتے پر پتلون، آدھا پھاگن، آدھا جون
بھیّا عائیں گے رنگون، آدھا پھاگن، آدھا جون
باہر فیشن خوب بنائیں، ہر دم فلمی گانے گائیں
من میں بجے گراموفون، آدھا پھاگن آدھا جون
گھر میں چار رہے نہ لونی، باہر نا دیکھے ہر کوئی،
بٹوا چلے ہیں دہرا دون، آدھا پھاگن آدھا جون،
بابا سوکھی روٹی کھائیں، بٹوا انڈا خوب اڑائیں،
اماں کھائیں آلو بھون، آدھا پھاگن آدھا جون،

اس گاؤں کا محرم یادگار ہوتا تھا حالانکہ وہاں شیعہ فرقے کا ایک بھی مسلمان نہیں ہے۔ وہاں مہینوں قبل سے تعزیے بنانا شروع ہو جاتے تھے۔ ۲۵ اور ۲۰ فٹ اونچے تعزیے بنائے جاتے تھے۔ محرم ہندو مسلمان مل کر مناتے تھے۔ تعزیے بنانے

والے ماہرِ فن تھے۔ میں نے ویسے خوبصورت تعزیے پھر کہیں نہیں دیکھے۔ بانس کی پتلی پتلی تیلیوں کو خوبصورت انداز میں باندھ دیا جاتا تھا۔ پہلے ان پر سادہ کاغذ چڑھا جاتا تھا پھر پھول بوٹے لگائے جاتے تھے۔ کسی پر کٹنگ کا کام ہوتا تھا اور کسی پر ابرک کا۔ ابرک پر سفیدے سے لکھائی بھی کی جاتی تھی۔ مولی تعزیے بھی بنائے جاتے تھے۔ لوگ کام کرتے کرتے تھک جاتے تھے تو ڈھول تاشے اور جھانجھ اٹھا لیتے تھے۔ جھنم جھنم جھنم جھنم خوب بجائے جاتے تھے۔ ساتویں محرم کو علم کھڑے کئے جاتے تھے۔ خوبصورت جھلملاتے کپڑے اور جھلملاتے ہوئے پھل جن پر پاک پنجتن کا پنجہ بنا ہوا۔ پرسوز آواز میں مرثیے اور نوحے پڑھے جاتے تھے۔ دادا مرحوم محرم پر صرف نوحے اور مرثیے لکھتے تھے۔ ہر بار ایک بیاض بھر جاتی تھی۔ مرد نویں محرم کو پایک (پیک) بنتے تھے اور عورتیں چوکیاں بھرتی تھیں۔ سٹنیں کربلا کے واقعات کو اتنی پرسوز اور دردناک آواز میں گاتی تھیں کہ سننے والے رو دیتے تھے۔ اسے 'دہا' ردا بھی کہا جاتا تھا۔ جب سے کمر لگا دی جاتی تھی پھر کوئی پایک دسویں محرم کی شام تک لیٹ یا بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ مسلسل ہم گھنٹوں تک دوڑنا پڑتا تھا۔ ان کی کمر میں گھنٹیاں بندھی رہتی تھیں۔ دوڑتے وقت گھن گھن گھن کی آواز کے ساتھ بجتی تھیں۔ پایک بننے میں ہندو مسلمان کی کوئی تخصیص نہیں تھی بلکہ زیادہ تعداد ہندوؤں کی ہوتی تھی۔ تعزیے بھی ہندو مسلمان سبھی رکھتے تھے۔ پکے چوک کا تعزیہ سب سے بڑا ہوتا تھا۔ یہ تعزیہ سب سے آگے آگے چلتا تھا۔

میرے گاؤں میں ایک درگاہ ہے۔ کہتے ہیں کہ شاہ بیکا شاہ کا مزار ہے۔ اس کے بارے میں عجیب و غریب روایتیں مشہور ہیں۔ میرے نانا مرحوم علاقے کا انسائیکلو پیڈیا تھے۔ سب کے شجرۂ نسب انھیں زبانی یاد تھے۔ وہی عجیب عجیب کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ یہ مزار ہے کہ قرب و جوار کے لوگ اس مزار کے بے حد عقیدت مند ہیں اور کسی بھی شخص کے یہاں شادی بیاہ ہو خواہ وہ کسی مذہب کا ماننے والا ہو پہلے "بیکا شاہ" کے مزار پر بارات کی حاضری ضروری ہے۔

میرے گاؤں کے ہندو "برہم بھوج" بھی کرواتے تھے۔ اس موقع پر اکثر رامائن کا پاٹھ ہوتا تھا۔ اس میں بھی ہندو مسلمان سبھی حصہ لیتے تھے۔ میں خود بھی اکثر رامائن کے پاٹھ میں شامل ہو چکا ہوں۔ تلسی کی "رام چرت مانس" کی چوپائیوں کا بیشتر حصہ مجھے زبانی یاد ہو گیا تھا۔ مجھے ان کی بلندیٔ فکر، تشبیہات و استعارات کا اچھوتا پن بے حد پسند تھا۔

مجھے دس سال کی عمر میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے کانپور بھیج دیا گیا تھا جہاں میرے بابا مرحوم مختار احمد خاں ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ یہ میری خانہ بدوش زندگی کا آغاز تھا۔ کانپور ایک بہت بڑا شہر تھا اور میں قصباتی تہذیب کا پروردہ۔ اس لئے اس شہری ماحول میں میرا بہت دنوں تک دل نہیں لگا۔ میں نے وہاں صرف تین سال تعلیم حاصل کی اور پھر اپنے گاؤں لوٹ آیا۔ اسی زمانے میں والد صاحب کا ٹرانسفر دلی سے پٹنہ ہو گیا اور ہم لوگ یہاں آ گئے۔ یہیں سے میں نے کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کی۔ اردو میں ایم اے کیا اور ابتک ادب کا ایک طالب علم ہوں۔ طبیعت میں سرکشی ہے اس لئے نوکری کرنے کی خواہش بھی نہیں ہے۔ اب تک خانہ بدوش ہوں۔

میں نے ابتدا میں شاعری کی تھی اور دادا مرحوم و والد صاحب سے اصلاح بھی کرتا تھا لیکن جہاں میں نے کہیں نظم یا غزل سنائی لوگ کہتے تھے کہ ان کے دادا یا والد نے لکھ کر دی ہوگی۔ یہ بات مجھے بہت بری معلوم ہوتی تھی کہ لوگ صلاحیت کا اعتراف کرنے کے بجائے الزام تراشی کرتے ہیں۔ اس لئے میں نے شاعری سے توبہ کر لی۔ ۱۹۶۳ء میں پہلا افسانہ لکھا "پستی کی بلندی" یہ افسانہ "صبح نو" پٹنہ میں

شائع ہوا اور اسے "نقوش" کراچی نے بھی ڈائجسٹ کیا۔ پھر ہندو پاک کے مختلف ادبی رسائل میں کم و بیش چار درجن افسانے شائع ہوئے۔ ۱۹۷۷ء میں افسانوں کا مجموعہ "مسدود راہوں کے مسافر" چھپ کر منظرِ عام پر آیا۔

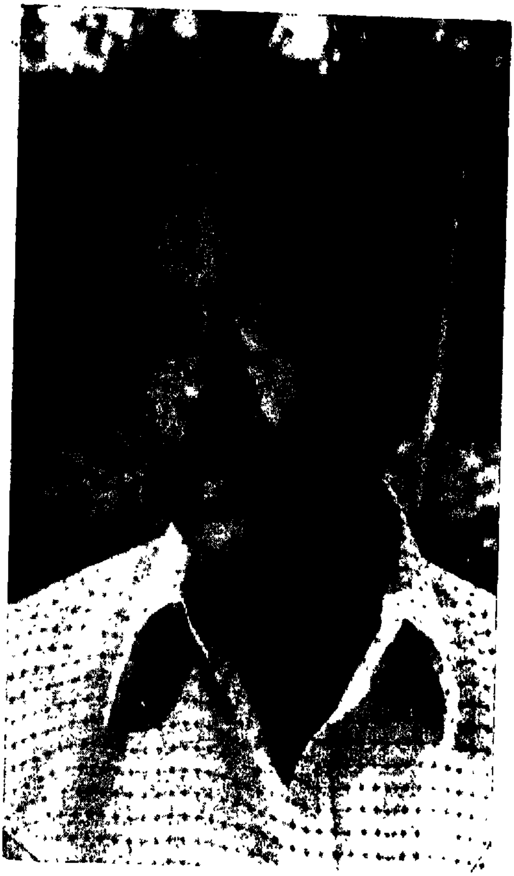
میری صحافت کا آغاز تو ۱۹۶۷ء میں ہوا جب میں نے پٹنہ سے رسالہ "زیور" جاری کیا۔ جو ۱۹۷۵ء تک برابر شائع ہوتا رہا۔ اس میں محترمہ عزیزہ امام (ممبر پارلیمنٹ) نے میری بہت مدد کی۔ لیکن حقیقتاً میری صحافت کا آغاز ۱۹۷۹ء سے ہوا جب میں نے "عظیم آباد ایکسپریس" جاری کیا۔ یہ اپنے پہلے شمارے سے ہی بہت متنازعہ اخبار بن گیا کیونکہ اس کا لب و لہجہ دوسرے اخباروں سے بہت مختلف اور منفرد تھا۔ یہی اخبار میرا سب سے بڑا دوست ہے اور سب سے بڑا دشمن بھی کیونکہ اسی کی وجہ سے میرے بہت سے دوست اور بزرگ ناراض ہو گئے ہیں۔ دراصل یہ چار سال میری زندگی کا ایک طوفانی دور ہیں۔ میں نے اخبار نکالتے وقت ایک عہد کیا تھا کہ حق اور سچ بولوں گا۔ کمزوروں کے حق میں آواز اٹھاؤں گا اور انھیں انصاف دلانے کے لئے اپنے قلم کو وقف کر دوں گا۔ حالانکہ اب تک میں یہ سب کچھ نہیں کر سکا ہوں۔ اس راہ میں مجھے بے حد دشواریوں کا بھی سامنا کرنا پڑا ہے۔ میرا خود اور قلم سب لہولہان ہو گئے ہیں۔ لیکن میں آج بھی ہمت نہیں ہارا ہوں۔ دل برداشتہ بھی نہیں ہوں۔ کیونکہ ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔

میرا خدا پر کامل اعتماد ہے۔ میں اکثر یہ ضرور محسوس کرتا ہوں کہ اخبار کی دنیا میں قدم رکھ کر میں نے خود کو ایک پرشور طوفان میں ڈھکیل دیا ہے کیونکہ جب تک میرے ہاتھوں میں قلم رہے گا میرا ضمیر مجھے سچ لکھنے پر مجبور کرتا رہے گا۔ میں تھپیڑوں پر تھپیڑے کھا رہا ہوں اور تن تنہا طوفانوں کا مقابلہ کر رہا ہوں۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

یہ ضرور ہے کہ ادھر کچھ عرصے سے میں ایک خود فراموشی کی کیفیت کا شکار ہوں۔ اس لئے وہ باتیں بھی بھولتا جا رہا ہوں جنہیں یاد رکھنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ دو سال سے میں نے کوئی افسانہ بھی نہیں لکھا۔

ہم کو بھی کیا کیا مزے کی داستانیں یاد تھیں
لیکن اب تمہیدِ ذکرِ دردِ ماتم ہو گئیں



محمود ایوبی

"........ فرقہ وارانہ فسادات نے ہماری نسل کے لوگوں کے قلب و ذہن پر بہت ہی خراب اثر ڈالا لوگ وطن سے بے وطن ہوتے رہے یا پھر تارک الدنیا ...... جماعت اسلامی یا تبلیغی جماعت کے پیروکار بن گئے۔ لیکن ہم لوگوں نے جو اس تعصب، تنگ نظری اور بے انصافی کو مٹانے کا عزم رکھتے تھے کسی اور راستے کو چنا........."

اپنے بہت سارے بھائیوں کی طرح اپنی بھی قطعی تاریخ پیدائش نہیں معلوم۔ بس موٹے موٹے حساب سے مارچ ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوا۔

آموں کے باغ سے گھرے ایک محلے —— اور انتہائی صابر و شاکر ماحول میں۔ دور نزدیک کے رشتہ دار زمیندار تھے مگر اپنا خانوادہ صوفیا کا تھا۔ بہت پہلے خاندان میں کوئی زندہ پیر گزرے تھے مگر والد قانون کے پیشہ میں تھے۔ وہ ایک درمند دل کے مالک، وضعدار مزاج اور بہت بے نیاز آدمی تھے جو حرص و ہوس سے بچنے اور سادگی اور قناعت کی زندگی بسر کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔

والد کی تلقین اور پھر صحابہ کرام اور بعض خلفاء کی ایماندارانہ معاشی اور اخلاقی جرأت مندی نے ایسا اثر ڈالا کہ آج تک دنیا کے پیچھے بھاگا اور نہ دنیاوی نقصانات یا عہدے و منصب کے چھوٹنے کا ملال ہوا۔

یہ جان کر کہ غزنوی میں اپنا ایک ہم نام بادشاہ گزرا تھا جو سومنات پر تابڑ توڑ حملے کر کے دولت سے مالا مال ہو گیا تھا۔ اپنا نام بالکل نہیں جچنے لگا —— دوسرے مناسب اور موزوں نام کی تلاش میں سرگرداں تھا کہ ایک نام بہت بھایا — محمد صلعم —— والدہ سے مشورہ کیا تو وہ بگڑ اٹھیں اور سمجھایا کہ یہ مبارک نام اپنے پیغمبر صاحب کا ہے دوسرا کوئی یہ نام نہیں رکھ سکتا۔ ہاں ان کا نام لیوا ضرور بنے۔

حضور کی زندگی کے حالات نے بھی قلب و نظر پر خوب اثر ڈالا مگر عقل و شعور کا دامن چھوڑے بغیر۔ تاریخ و تحریکات کے پس منظر میں ان کے کارناموں پر عاشق ہوں مگر بزی عقیدت کے بغیر۔

گوتم بدھ کے حالات سے بھی اس حد تک متاثر ہوا کہ اپنے یہاں کے خاموش اور پرسکون ماحول میں جہاں چڑیوں کی چہکار، ہواؤں کی سرسراہٹ اور پتوں کے ٹوٹ کر گرنے کی آواز بھی صاف سنائی دیتی ہے دھونی رمایا کرتا تھا توجہ اور ارتکاز کی کمی نے جس طرح بعد میں، وہ اس وقت کے چونچال پن نے بھی نروان کی دولت سے محروم رکھا۔

والد روزی کی تلاش اور سماج سیوا میں بے حد مصروف رہتے تھے اس لئے ہم بھائیوں کی تعلیم کی طرف خود تو دھیان نہیں دے سکتے تھے ہاں کسی بھی ضعیف یا ضرورتمند آدمی کو سہارا دے کر ہم لوگوں کا استاد مقرر کر دیتے تھے۔ یہ پریشان حال اور پراگندہ ذہن لوگ اپنے ہی مسائل میں اتنے الجھے رہتے تھے کہ ہم لوگوں کی تعلیم و تربیت پر بہت کم توجہ دے پاتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تقریباً بے استادہ رہنا پڑا۔ ہاں کچھ دنوں اپنے ایک نانا سے جنہیں آخری دور میں ڈپٹی نذیر احمد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا موقع ملا تھا۔ کچھ دنوں اردو فارسی پڑھی۔ کاش اور پڑھ سکتا۔

مونگیر سے علی گڑھ تک کے تعلیمی دور پر نظر ڈالتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ فطری ذہانت کے باوجود ایک اوسط طالب علم رہا جس نے برائے نام کنسیشن اور رعایت کے لئے طلباء کی تحریک میں حصہ لیا اور نہ بہت پڑھاکو رہا۔ بلکہ ساحل پر کھڑا رہنے والا

ایک حساس آدمی، جو معاملات کو سمجھتا تھا بر بھیڑ کا جزو نہیں بننا چاہتا تھا۔

عام طور پر ایسے طالب علم کتابی کیڑے بن جاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ کالج تک کوئی استاد ملا جو پڑھنے کا ذوق پیدا کرتا اور نہ اپنے گھر یا پڑوس کے گھر داستانوں اور ناولوں کا ذخیرہ تھا کہ انہی سے اپنا دل بہلاتا۔ ایک بات ضرور ہوئی ایک بھائی تھے جو گھوم گھوم کر روسی کتابیں بیچا کرتے تھے اُن کی دستگیری کی خاطر والد کمیونسٹ لٹریچر خرید کر لایا کرتے تھے۔ وہ صاحب تو اب اچھی بری کتابوں کے باضابطہ دوکاندار بن گئے اور کمیونزم سے تائب ہو گئے، مگر ابتدائی عمر میں میں نے روسی اور مارکسی لٹریچر کا جو ٹوٹا پھوٹا مطالعہ کیا وہ زندگی کے ہر موڑ پر مدد پہنچاتا رہا ہے اور ساتھ ہی آزردہ خاطر بھی کرتا ہے

ان کتابوں کے طفیل بہت ساری زبانوں کے ادب اور ملکوں کی تاریخ کا جی بھر کے مطالعہ اور ڈگریوں سے لیس ہو کر جب طالب علمی کا دور گزر چکا تو پھر روزگار کا مسئلہ آیا ــــــ

والد چاہتے تھے کہ میں اُن کے قانون کے پیشے میں آ جاؤں ــــــ

اُن کے گرد لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ وہ فیس لے کر کام کرتے تھے اور بہت سوں کو اپنی جیب سے آنے جانے کا خرچ دیا کرتے تھے۔ ایسے لوگ اپنی جھونپڑیوں میں اُن کی تصویر لگا کر آج تک اُن کی پوجا کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اس پیشہ میں بھی ایمانداری اور انسانیت پرستی کی گنجائش ہے۔

مگر مجھے تو فوج کی ملازمت پسند تھی۔ نہ رشوت نہ ظلم بلکہ نیک اور اعلیٰ مقصد کے لئے اپنا خون بہانے کو بھی تیار۔ میں فوج میں نہیں جا سکا۔ اُس وقت کے مسلمان نوجوان "غدار" اور "پاکستانی" کہلانے کی بجائے پاکستان سدھار جاتے تھے! لیکن میں اتنا بھی بزدل یا کیریرسٹ نہیں تھا۔

اسکول میں گیا ــــ ٹیوشن اور درسی کتابیں لکھنے کا شوق ــــ پڑھانے سے کوئی مطلب نہیں۔ جس کی وجہ سے معمولی اور ادنیٰ قسم کے سیٹھوں کا جو مجلسِ انتظامیہ میں رہتے رعب۔ یہ رنگ ڈھنگ بالکل پسند نہیں، نتیجہ میں لڑائی جھگڑا۔

کالج میں گیا ــــ سیاست، توڑ جوڑ، خوشامد ــــ توبہ بھلی!

لڑکیوں کے کالج میں گیا ــــ چھوٹے شہروں کی بیاہی ہیلا لیکچرر یا اُٹھتی جوانی والی طالبات ...... معمولی سے کچھ بہتر شکل اور جرأت والے مردوں پر مر مٹنے کو تیار .... بھاگو بھائی بھاگو!

اس بھاگم بھاگ کی وجہ ڈر بھی تھا۔ کیسا؟ آگے بتاتا ہوں ــــــ

دوسری بات تو وہ تھی جو سجاد انصاری بتا گئے تھے کہ حضرت یوسف کوئی غیر معمولی شکل و صورت کے آدمی نہیں تھے بلکہ صرف مردانہ انانیت کے مالک تھے۔ عورتوں کے پیچھے بھاگنا تو درکنار، نظر اُٹھا کر بھی دیکھنا گوارہ نہیں کرتے تھے۔ جب ہی زنانِ مصر تلملا اُٹھی تھیں اور انھیں مصری قید و بند کی صعوبت جھیلنی پڑی تھی ــــــ اور یہاں تو اسیرِ زلفِ گرہ گیر ہونا بھی پسند نہیں تھا

جبکہ راہ میں زلفوں کے بے شمار دام بچھائے گئے ...... لیکن کہ نام یاد رکھنا مشکل ہوگیا اور اپنی آسانی کے لئے ان مہربان ہستیوں کا رول نمبر دینا پڑا۔ اس بھیڑ میں چند ایسے لوگ بھی ہیں جن کے نہ صرف نام ہیں بلکہ وہ تمام نرم و نازک اور لطیف تفصیلات بھی یاد ہیں جو دلچسپ بھی ہیں اور دلکش بھی جیسے :

- وہ کسان لڑکی جو مکئی کے بھٹے کھلایا کرتی تھی۔
- وہ دو بہنیں جو میری زیادہ سے زیادہ خاطر کرنے کے لئے آپس میں جھگڑا کرتی تھیں۔
- وہ حرفہ لڑکی جو کاندھے پر ہاتھ رکھ کر یہ دعا مانگا کرتی تھی کہ میرے اس کے علاوہ سارے لوگ مرجائیں۔
- وہ صاحبہ جنہوں نے گھر یا ٹنڈے سے ہمارا BUSI بنایا تھا۔
- اور جھکی جھکی آنکھوں والی وہ لڑکی ....

سچ پوچھا جائے تو محبت تو مجھے صرف ایک ہی لڑکی سے ہوئی ...... نوزیہ یعنی اپنی لڑکی سے۔ اور عشق بھی جس میں جنس کا زبردست دخل ہوتا ہے ایک ہی ہستی سے ہوا ———— عرشیہ سے جو ہماری جیون ساتھی اور بہترین رفیق ہے۔

اور وہ ڈر جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے ———— فسادات کا تھا۔ معمولی معمولی بات پر ہندستان میں فسادات ہوتے رہے ہیں اور خاص کر لڑکیوں کے لئے۔ ان فرقہ وارانہ فسادات نے ہماری نسل کے لوگوں کے قلب و ذہن پر بہت ہی خراب اثر ڈالا ہے۔ لوگ وطن سے بے وطن ہوتے رہے یا پھر تارک الدنیا...... جماعت اسلامی یا تبلیغی جماعت کے پیروکار بن کر۔

لیکن ہم لوگوں نے جو اس تعصب، تنگ نظری اور بے انصافی کو مٹانے کا عزم رکھتے تھے کسی اور راستے کو چنا ———— مزدوروں کا محاذ کڑی سے کڑی محنت کرنے والے لوگوں کی خدمت کا ڈھونگ بھرنے والوں، چکنی چپڑی باتیں کرکے محنت کشوں کا دل خوش اور ہر خدمت کا صلہ ان کے خون پسینہ کی کمائی سے لینے والوں کی صف میں آگئے۔ یہ بھی خدا کے کیسے نیک بندے ہوتے کہ اچھی باتیں سن کر خوش ہوتے اور خراب باتوں سے بھی مایوس اور بددل نہیں ہوتے ———— ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے چندہ دیکر لیڈروں کا ناشتہ منگوانے ———— بیس بائیس سال پہلے کیا ہوا وہ ناشتہ آج تک ہضم نہیں ہوا ہے۔

بہتر یہ سمجھا کہ قلم کو ہتھیار بنالوں۔ تخلیقی اور تنقیدی مضامین تو اپنے گنے لوگوں کے لئے ہوتے ہیں۔ صحافت کے ذریعہ وسیع تر آبادی کے عقل و شعور کو بیدار کرنے چلے تو پتہ چلا کہ اردو صحافت میں آکر "بول" میں لگے ہیں۔ اور اب تو طوطے کی طرح رٹنے کا سلسلہ ہے، زبان سے نہیں قلم سے ...... لکھنے والا طوطا بن کر رہ گیا ہوں۔

۲۱ سال پہلے ۱۴ اور ۱۵ اگست کی آدھی اور درمیانی رات کو جہاز کل کارخانے اور ریلوں کی ایک ساتھ بجتی سیٹیوں اور سائرنوں کو بھی سنا تھا اور ۱۹۵۰ء کی ۲۶ جنوری کو مٹھائیاں بھی کھائی تھیں اور آتش بازیوں سے بھی لطف اندوز ہوا مگر آزادی کا سچا احساس اور خوشی ۱۹۶۷ء میں ہوئی جب کئی ریاستوں میں "باپو" اور "چاچا" کے نام لیواؤں کا راج سنگھاسن ڈانواڈول ہوا، تو مغربی بنگال میں بھی یہ خوشگوار تبدیلی آئی۔ ایسا لگتا تھا کہ ایک سال پہلے تک ظلم و جبر کا جو سلسلہ تھا اور ہم درمیانہ طبقہ والے بونس اور بھتہ کے نئے "جدوجہد" کرتے

بچے اور راج بھون کے سامنے خود کو گرفتار کرنے کے لئے پیش کیا تھا وہ رنگ لایا ـــــــ حالانکہ یہ کارنامہ دبے کچلے عوام کا تھا۔ ۴۷ء میں ملنے والی آزادی کی خوشی تو غربت میں ڈوب گئی تھی۔ ۶۷ء میں سُرخ پرچم لہرایا۔ سارے لوگوں کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا اور چھا گیا۔ بھول گئیں۔ پر یہ بھی سراب نکلا۔ عوامی جوش کے سہارے اُوپر آنے والے چند لوگوں کی خوشنودی کے لئے اپنی ہی حکومت کو دشمن کہنے اور عوام کا مقدر بدلنے والے جن ساتھیوں سے ہاتھ ملایا تھا اُن ہی کے "رجعت پسندانہ" رویہ کی شکایت کرنے لگے۔

مسائلِ غم ہجراں اور بھی ہیں .... اور بھی ہیں

عوام کا مقدر بدلنے والے شاہین تیغ کفن بردوش آ گئے۔ مایوسی کے اندھیرے کو دُور کرنے کے لئے اپنے خون کا چراغ جلانے .... سرکار کی تیوریاں چڑھ گئیں .... سپاہی، فوج، سنگین، رائفل اپنے ہی جگر گوشوں کا سینہ چھلنی کرنے لگی .... بنگلہ دیش کا مسئلہ ایک عذاب۔

یار دوست کہتے اپنا لہجہ مدھم کرو .... اخبار بند

چوری چھپے میٹنگیں ہوتیں .... محاصرہ اور تعاقب

روزی کا سہارا تو چاہیئے .... گڈس ٹرانسپورٹ کمپنی میں خود کو چھپا لیا۔ لو یہاں تو پولیس کے چھوٹے بڑے اہلکاروں کا زیادہ دخل ہے اور اُن کی چھید کرنے والی نظریں تعاقب کر رہی ہیں .... دُور افتادہ علاقے کے ایک کیمیکل کمپنی میں ملازمت۔ سدھارتھ شنکر رے کا زمانہ جب کانگریسی زنگر دٹوں کی بن آئی تھی اور قانون اُن کے گھر کی لونڈی تھا۔ کارخانہ کی یونین پر اُن کا قبضہ۔ کارخانہ کا مالک جو فراٹرم خاں بنتا تھا۔ یونین لیڈر کے سامنے بھیگی بلی بنا اُن کی ہر جائز و ناجائز مطالبات کو پورا کرنے کو تیار۔ سارے مزدور مجھ سے خوش ..... مالک مجھ سے بیزار ..... یوں کہ میں صحیح اور صاف باتوں کا عادی۔

لہٰذا اس رزق سے موت اچھی جس سے پرواز میں آتی ہو کوتاہی۔

ایک ساتھ تین اخباروں میں خون جلانے کے بعد ریڈیو، ٹی وی اور اشتہاری ایجنسیوں کا چکر۔ ضرورتیں تگنی کا ناچ نچا رہی تھیں۔ صبح سے شام تک مشقت اور رات کہیں گزار لیتا .... فٹ پاتھ پر بھی اور بھٹیار خانہ کا کھانا۔ ڈی کلاس ہو کر آنے پر یہ باتیں بالکل نہیں کھلیں ـــــــ مگر .... باپ مر گئے ...... جا نہیں سکا۔

ٹی بی نے آدبوچا۔ ڈاکٹر نے کہا کیس بگاڑ کر آئے ہو اسپتال جاؤ۔ اسپتال میں گھڑکیوں اور جھڑکیوں کے درمیان کہا۔ پھیپھڑے کاٹے جائیں گے۔ دن جس کسی طرح گزر جاتا۔ کمزوری کے باعث بس کے انتظار میں تیورا تیورا کر گر پڑتا۔ رات کو کسی کی تلاش ہوتی کہ کسی دم بھی موت کے فرشتے کے آ جانے کا کھٹکا لگا رہتا تھا۔ بیوی بچے تیرہ سو کیلو میٹر دور ـــــــ باپ ماں اور بھائی بہن اور بھی فاصلے پر۔ کروٹ بدلنے میں بھی زحمت ہوتی۔

ایسے میں ایک انجان آدمی کھڑکی کے راستے آتا۔ ہُم .... پتہ نہیں کوئی آدمی تھا یا آدمی کی تمنا یا ایک "ہلوسی نیشن" اس کے آنے پر بڑی ڈھارس بندھتی۔ ایک دن بریف کیس میں سو سو روپے کی ان گنت گڈیاں لے کر آیا۔ روپے کے بدلے میری جان کا سودا کرنے

میں نے منہ پھیر لیا۔ کہ کنکریٹ کے اس جنگل بمبئی میں بچپن کا گوتم مال و منال یا گلیمر کی تلاش میں نہیں آیا ہے۔ اس کے بعد وہ آیا اور نہ سکھیاں۔ آخری بار چرنی روڈ پر بس کے انتظار میں جب غشی طاری ہونے لگی تو خود کو سنبھالا اور ایسا سنبھالا کہ بیماری بھی دور ہو گئی۔ شاید قوت ارادی کا کرشمہ تھا۔

۴۴ سال کا ہو جانے پر لگتا ہے کہ ساری عمر رائیگاں گئی اور رہ بھی کم گئی ہے اس لئے اپنی جائے پیدائش جہاں کا ماحول اتنا پرسکون و پُرفضا ہے کہ چڑیوں کی چہکار، ہوا کی سرسراہٹ اور پتوں کے ٹوٹ کر گرنے کی آواز بھی صاف سنائی دیتی ہے، دامن دل کھینچتی ہے۔ وہ لوگ بھی بہت یاد آتے ہیں جو اپنے ہیں مگر بیچ میں وقت اور جگہ کی دوری حائل ہو جانے پر غیر جیسے ہو گئے ہیں۔ جانے وہاں کیا کچھ بدلا؟ ملک میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اگلی نسل کا کیا ہوگا....... اس نسل کا جس سے ہماری چودہ سال کی لڑکی اور دس سال کے لڑکے کا بھی تعلق ہے۔ انھیں تو اور بھی برے دن دیکھنے ہوں گے شاید........

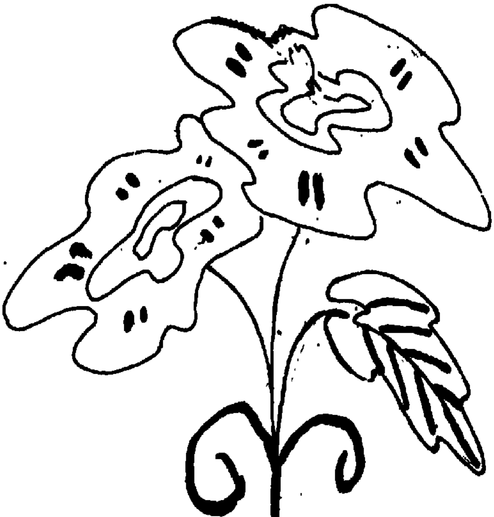
سال چھ مہینے پر بیوی بچوں سے جب ملاقات ہوتی ہے تو سب اپنا اپنا حال سناتے ہیں۔

ایک دن بیوی کہنے لگی ——

"ناصر کی بدمعاشیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اب یہ ہمارے قابو میں نہیں رہتا۔ لے جاؤ اپنے ساتھ .... یہاں پھیری والوں اور خوانچہ والوں کے ساتھ مل کر اُن کا مال بیچنے لگا ہے......."

یہ سن کر ہمیں یک گونہ اطمینان ہوا..... بیوی سے کہا ——

"روکو مت اُسے ...... خرید و فروخت کی عادت پڑنے دو۔ سفید پوش بابو بن کر ضمیر کا سودا تو نہیں کرے گا۔"



آپ بیتی نمبر

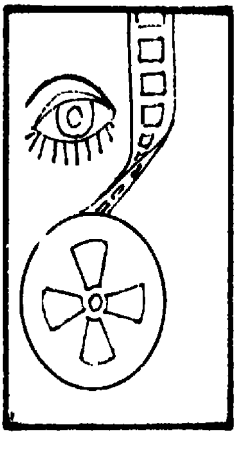
کیلئے

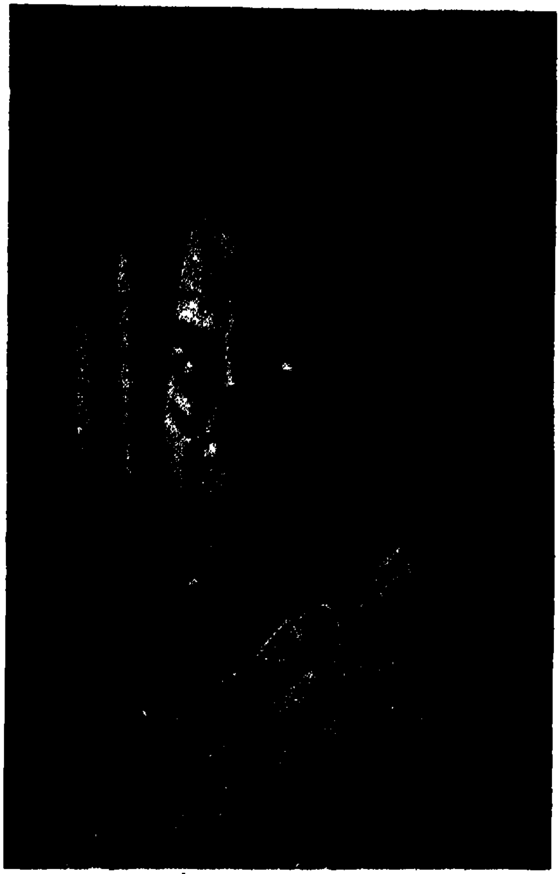
نیک خواہشات کیساتھ

پرتاپ پرسوانی

[سال کی سب سے بڑی پوجا — "پیٹ پوجا" کے خالق]

فلم





سلیم خان

"...... بمبئی نے برسوں میرا امتحان لیا۔ بہت آزمایا۔ لیکن میں بھی ڈٹا رہا۔ بھاگ کر جاتا بھی کہاں ......؟
میں تو اپنے پیچھے کے سارے پُل توڑ کر آیا تھا ————"

میں قلم لے کر بیٹھا ہوں' اور اپنی زندگی کو دوبارہ دیکھنے کے لئے' یادوں کی کھڑکیاں کھولتا ہوں —— یادیں ' ہزاروں یادیں ...س طرح چاروں طرف سے آنے لگتی ہیں' جیسے ہل اسٹیشن پر کمرے کے کھولتے ہی بادلوں کے ٹکڑے اندر آجاتے ہیں اور یادوں کے ان بادلو... دھند میں مجھے اپنے والد کی آواز سنائی دیتی ہے ۔ وہ مجھ سے ہمیشہ کہا کرتے تھے ——" بیٹا جب تک تمہارے پیشے پر تمہاری زندگی کا ...ہے گا تم اپنے پیشے میں پھلو پھولو گے ۔ لیکن اگر تمہاری زندگی پر تمہارے پیشے کا اثر ہونے لگا تو تمہاری زندگی کی خوبصورتی کم ہو جائیگی —— میں آج اس بات کو پوری طرح سمجھ سکتا ہوں۔

میری زندگی ' میرے سوچنے کے ڈھنگ ' میرے جینے کے انداز پر میرے والد کا بہت گہرا اثر ہے اور اگر ان کے سوا میں نے کسی سے اپنے راستوں کے لئے روشنی حاصل کی ہے تو وہ تھے —— مرحوم پروڈیوسر ڈائریکٹر امیش کول' جنہوں نے میرے دماغ کے ...ہت سے جالوں کو صاف کیا ہے ' ویسے تو زندگی میں سب سے بڑی اسٹیج خود زندگی ہوتی ہے ۔ زندگی کی اونچ نیچ ' سردی گرمی سے انسان جو سیکھتا ہے ' وہ شاید کسی کتاب سے نہیں سیکھ سکتا ۔ وقت کے اندھیرے اجالے ہی انسان کی نظر کو اتنا تیز کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے کو بھی ...جان سکے اور دوسروں کو بھی ۔ زندگی کے سارے سبق میری یادوں کے اوراق پر لکھے ہیں۔

میں اندور میں پیدا ہوا ۔ چار بھائیوں اور تین بہنوں میں سب سے چھوٹا ہوں ۔ میرے والد ڈی آئی جی پولیس تھے ۔ بہت سخت طبیعت ' کسی سے زیادہ بات نہ کرنے والے ' ہمیشہ اپنے کام میں مصروف ۔ اور میری ماں! ..... جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہمیشہ میں نے انھیں بیمار دیکھا ۔ میرے بہن بھائی مجھ سے کافی بڑے تھے ۔ میں ان کے ساتھ بھی کھیل کود نہیں سکتا تھا ۔ اس لئے میرا بچپن کچھ اکیلا اکیلا سا تھا ۔ گھر کے کسی کونے میں بیٹھ کر دن بھر ایسے سپنے دیکھا کرتا تھا ' جو صرف بچے ہی دیکھ سکتے ہیں۔

جب میں چھ یا سات برس کا تھا تو ایک دن ہمارے گھر میں ایک پھیری والا پھل بیچنے آیا ' اور میں نے اس کی نظر بچا کر ایک سیب چرا لیا ۔ یوں تو گھر میں کھانے کو بہت سے سیب ملتے تھے مگر انگریزی میں کہاوت ہے چوری کے سیب زیادہ میٹھے ہوتے ہیں ۔ مجھے سیب پانے سے زیادہ اپنی اس ہوشیاری کی خوشی تھی ۔ میں نے کسی کو اپنا یہ کارنامہ بتا دیا ' اور اس نے میری ماں کو ۔ ماں نے مجھے بلایا اور سزا سنائی —— پیدل بھاگتے ہوئے اس پھیری والے کے پاس جاؤ اور کہو " مجھے معاف کر دو ' میں نے تمہارا یہ سیب چرایا تھا ۔"

میں نے پہلے تو انکار کرنے کی کوشش کی ' لیکن ماں اتنے غصے میں تھیں کہ مجھے ان کے کہنے پر عمل کرنا ہی پڑا ۔ میں کیسے لکھوں کہ اس پھیری والے کو اس کا پھل واپس کرتے ہوئے اور اپنا گناہ قبول کرتے ہوئے مجھے کتنی شرمندگی ہوئی ۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ اس شرمندگی نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا ۔ میں نے پھر کبھی چوری نہیں کی —— اور ایک بار جب میں کافی بڑا ہو گیا تھا اپنے دوست کے ساتھ ایک ہوٹل میں گیا ' اور اس نے ہوٹل کے کاریڈور سے ایک بلب نکال لیا ۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ بلب واپس لگا دو ۔

وہ سمجھا کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔ لیکن جب بات سمجھ گیا تو وہ کچھ ڈر گیا اور اس نے بلب واپس لگا دیا لیکن وہ مجھے ایسے دیکھتا رہا، جیسے میں کوئی پاگل ہوں، جو اتنی ذرا سی بات پر اتنا بگڑ گیا۔ وہ بالکل نہیں سمجھ پایا کہ کسی ہوٹل کے کمرے سے بلب کو نکال لینے میں کیا ہرج ہے۔ شاید اس نے بچپن میں کبھی سیب نہ چرایا ہوگا یا شاید اسے میرے جیسی سزا نہیں ملی ہوگی۔

بچپن میں کبھی کبھی میری آنکھ رات کو کھل جاتی تھی اور میں دبے پاؤں اٹھتا اور ماں کے کمرے میں جا کر ان کے پاس لیٹ جاتا جب وہ فوراً کسی کو بلا کر مجھے واپس بھیج دیتیں تو مجھے اتنا برا لگتا کہ میں سوچتا ——— کیسی ہیں میری ماں! اس کے دل میں میرے لئے ذرا بھی پیار نہیں ہے۔ وہ مجھے بالکل نہیں چاہتیں ...... میں تب چپ چاپ بستر پر پڑا یہی سوچتا رہتا۔ لیکن جب بڑا ہوا تو مجھے پتا چلا کہ انھیں ٹی بی تھی ——— ٹی بی، جس کا اس زمانے میں کوئی علاج نہیں تھا، جو ایک انسان سے دوسرے انسان کو لگ سکتی تھی۔ کتنی بدنصیب تھی وہ ماں، جو اپنے بچوں کو اپنے پاس اس لئے نہیں آنے دیتی تھی کہ کہیں ان کو یہ بیماری نہ لگ جائے۔ وہ ماں جو اپنے بچوں کو گلے نہیں لگا سکتی تھی۔ اس لئے کہ وہ ان سے پیار کرتی تھی۔

میں نو برس کا تھا، جب اسی بیماری نے ان کی جان لے لی اور میں نے اپنے ڈی آئی جی باپ، جن کے رعب سے لوگ کانپتے تھے، کو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا۔ پتا نہیں، مجھ میں کہاں سے ہمت آ گئی، میں ان کے پاس گیا اور ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ مجھے لپٹا کر رونے لگے۔ اس دن کے بعد سے، دھیرے دھیرے میں ان کے بہت قریب آ گیا، اور میں نے جانا کہ اس رعب دار اور سخت انسان کے اندر کتنا پیار کرنے والے باپ کا دل ہے۔ میری ماں کے بعد وہ بھی کچھ اکیلے سے ہو گئے تھے۔ روز اپنے کام سے واپس آتے اور میں اپنے اسکول سے۔ اور پھر دن بھر وہ مجھے اپنے ساتھ رکھتے۔ گھنٹوں مجھ سے باتیں کرتے رہتے۔ جہاں جاتے مجھے ساتھ لے جاتے، مجھے انہوں نے اپنا کچھ کچھ دوست سا بنا لیا تھا۔

میں میٹرک میں تھا کہ وہ بھی میری ماں کے پاس چلے گئے ———

میں بڑا ہو چکا تھا۔ کالج میں تھا لیکن سب کچھ الجھا الجھا سا لگتا تھا۔ کوئی راستہ سامنے نہیں تھا کوئی منزل نہیں تھی۔ کیا کرنا ہے۔ کیوں کرنا ہے، کس کے لئے کرنا ہے؟ ...... کبھی سوچتا پائلیٹ بن جاؤں، کبھی سوچتا پروفیسر بنوں گا۔ بس دن بیت رہے تھے۔ اور میں آنکھوں پر پٹی باندھے وقت کے ساتھ چل رہا تھا۔ جہاں چاہے لے جائے۔ اس سمے وقت مجھے کسی بھی طرف پہنچا سکتا تھا۔ اور انہی دنوں میری ملاقات پروڈیوسر ڈائرکٹر مرحوم کے امرناتھ سے ہو گئی۔ انہوں نے مجھے بمبئی آ کر ان کی فلموں میں کام کرنے کی دعوت دی۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں کبھی ایکٹنگ کروں گا۔ لیکن اندھیرے میں ایک راستہ دکھا، تو میں نے سوچا یہی سہی۔

میں بمبئی آ گیا تو ملاقات مہیش کول صاحب سے ہو گئی۔ میں نے ان سے بہت کچھ پایا۔ نہ صرف فلم کے بارے میں بلکہ زندگی کے بارے میں بھی۔ ان کی مدد سے میں نے سیکھنا سمجھنا شروع کیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ میں جیسے بھی بنا، جس سانچے میں بھی ڈھلا اس میں مہیش کول صاحب کا بڑا ہاتھ ہے۔

بمبئی نے برسوں میرا امتحان لیا، بہت آزمایا۔ لیکن میں بھی ڈٹا رہا۔ بھاگ کر جاتا بھی کہاں! میں تو اپنے پیچھے کے سارے پل توڑ کر آیا تھا۔ کئی برسوں کی ٹھوکروں، پریشانیوں، ناکامیابیوں کے بعد قسمت مہربان ہوئی اور آج تو وہ لوگ بھی مہربان

ہیں جن کا میری پریشانیوں میں خاصا ہاتھ تھا۔

کبھی کبھی کوئی دوست پوچھتا ہے کہ ایسے لوگوں سے مل کر بدلہ لینے کی بھاؤنا پیدا نہیں ہوتی؟ تب مجھے بچپن کی ایک بات یاد آ جاتی ہے۔

...... کبوتر پالنے کا مجھے بڑا شوق تھا اور میرے پاس بہت سے کبوتر تھے۔ لیکن ایک بلی روز رات کو میرا ایک آدھ کبوتر مار ڈالتی تھی۔ ایک رات تو وہ کبوتروں کے ڈربے میں گھس گئی اور بہت سے کبوتروں کو اس نے مار ڈالا۔ میں چھوٹا سا تھا مگر اتنا غصہ آیا کہ اب بلی کو نہیں چھوڑوں گا۔ کئی دن کی کوشش کے بعد میں نے اس بلی کو پکڑ لیا۔ میرے گھر کے کمپاؤنڈ میں ایک سوکھا مگر بہت گہرا کنواں تھا۔ بلی کو میں نے اسی میں ڈال دیا۔ اچھا ہے کنوئیں میں ہی تڑپ تڑپ کر مر جائے گی!

...... رات بھر بلی کنوئیں میں چلاتی رہی۔ دھیرے دھیرے میرا غصہ ختم ہو گیا، اس کی جگہ خیال آنے لگا کہ بلی کتنی تکلیف میں ہوگی! بھوکی ہوگی۔ اسے کنوئیں میں پھینک کر میں نے اچھا نہیں کیا۔ مجھے اپنے کئے پر شرم آنے لگی۔ دوسرے دن رسی باندھ کر میں اس گہرے اندھے کنوئیں میں اترا۔ مگر جب میں نے اس بلی کو پکڑنے کی کوشش کی تو بے چاری گھبرائی ہوئی نے مجھے اتنے پنجے مارے، نوچا کاٹا کہ میں ہی جانتا ہوں کہ کس طرح میں اسے باہر نکال لایا! ...... اب کسی سے بدلہ لینے میں ڈرتا ہوں کہ بعد میں خود ہی مجھے کنوئیں سے بلی باہر نکالنی پڑے گی!

کچھ برس پہلے کی بات ہے کہ میں کافی بیمار ہو گیا تھا اور ڈاکٹر نے مجھے اسپتال میں رہنے کی رائے دی۔ کچھ لوگ اسپتال سے بہت ڈرتے ہیں۔ میں بھی انہی میں سے ایک ہوں۔ ایمبولنس آ گئی تھی اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اب میں کبھی اپنے گھر نہیں لوٹ سکوں گا۔ اچانک میں نے دیکھا، میرے بہت سے دوست اور پڑوسی میرے پاس کھڑے ہیں۔ ان میں سے کئی لوگوں کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ میرے لئے پریشان ہیں۔ میں تو حیران سا رہ گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ بمبئی میں کسی کو کسی کی فکر نہیں ہوتی۔ لوگ کہتے ہیں کہ بمبئی میں ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کا نام تک نہیں جانتا۔ لیکن وہ سب میرے لئے پریشان تھے، دکھی تھے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرا دل موم بن کر پگھل کر میری آنکھوں سے بہہ گیا!

میں جانتا ہوں، مجھ میں بہت سی کمیاں ہیں، بہت سی برائیاں ہیں، لیکن ان کا حساب تو میں رکھتا ہوں۔ اور یہ لوگ ہیں، جو میری ساری خرابیوں، کمزوریوں کے ساتھ مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ بمبئی آ کر تم نے کیا پایا؟ کیا کمایا! ..... پیسہ؟ نام؟ عزت؟ تو میں کہوں گا کہ میری سب سے بڑی کمائی ہے، ان اچھے دوستوں کی دوستی!



جاوید اختر

"..... لوگ جب اپنے بارے میں لکھتے ہیں تو سب سے پہلے یہ بتاتے ہیں کہ وہ کس شہر کے ہیں۔ میں کس شہر کو اپنا شہر کہوں — پیدا ہونے کا جرم گوالیار میں کیا ہے... لیکن ہوش سنبھالا لکھنؤ میں، پہلی بار ہوش گنوایا علی گڑھ میں۔ پھر بھوپال میں رہ کر کچھ ہوشیار ہوا۔ لیکن بمبئی آکر کافی دنوں تک ہوش ٹھکانے رہے۔"

لکھنا مشکل کام ہو یا نہ ہو، لیکن اپنے بارے میں لکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ کم سے کم میرے لئے تو ہے۔ سچ لکھوں گا تو میری ساری برائیاں آپ کو پتا چل جائیں گی اور اپنی تعریف لکھوں گا تو جھوٹ پکڑا جائے گا۔ کیا کروں، کیا نہ کروں ——— سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ لکھنا تو پڑے گا ہی ———

لوگ جب اپنے بارے میں لکھتے ہیں تو سب سے پہلے یہ بتاتے ہیں کہ وہ کس شہر کے رہنے والے ہیں۔ میں کس شہر کو اپنا شہر کہوں؟ ——— پیدا ہونے کا جرم گوالیار میں کیا ہے، لیکن ہوش سنبھالا لکھنؤ میں۔ پہلی بار ہوش کھویا علی گڑھ میں، پھر بھوپال میں رہ کر کچھ ہوشیار ہوا۔ لیکن بمبئی آکر کافی دنوں تک ہوش ٹھکانے رہے۔ کسی شہر میں پانچ چھ سال سے زیادہ نہیں رہا۔ بمبئی میں دس برس ہو چکے ہیں۔ کبھی کبھی ڈرتا ہوں، کہیں قسمت میں ایک آدھا ٹرانسفر اور تو نہیں لکھا ہے! ویسے تو بمبئی ایسا کمبل ہے، جو کسی کو چھوڑتا نہیں، لیکن کبھی اس نے چھوڑنا بھی چاہا تو میں نہیں چھوڑوں گا۔ مرنا تیری گلی میں، جینا تیری گلی میں۔ (ابتک جو میں نے لکھا ہے، اگر آپ نے پڑھ لیا ہے تو میں آپ کے صبر اور آپ کی شرافت کی داد دیتا ہوں۔ آیئے میں اپنی زندگی کا چھوٹا سا فلش بیک بنا لیتا ہوں۔ اس لئے آپ کا کام یعنی پڑھنا بھی آسان ہو جائے گا اور میرا کام بھی۔ یعنی لکھنا۔)

سین نمبر ۱۔ مقام لکھنؤ۔ کردار، میرے نانا، دوسرے گھر والے اور میں ——— میری عمر شاید سات یا آٹھ برس ہے۔ باپ بمبئی ہے، ماں قبر میں۔ دن بھر گھر کے آنگن میں اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ کرکٹ کھیلتا ہوں۔ شام کو ٹیوشن پڑھانے کے لئے ایک ڈراؤنے سے ماسٹر صاحب آتے ہیں۔ انہیں پندرہ روپے مہینہ دیا جاتا ہے (یہ بات بہت اچھی طرح یاد ہے، اس لئے کہ روز بتائی جاتی تھی) صبح خرچ کرنے کے لئے ایک ادھنا اور شام کو ایک اکنی دی جاتی تھی، اس لئے پیسے کی کوئی سمسیا نہیں ہے۔ صبح رام جی لال بنئے کی دوکان سے رنگین گولیاں خریدتا ہوں اور شام کو سامنے فٹ پاتھ پر خوانچہ لگانے والے بھگوتی کی چاٹ پر اکنی لٹاتا ہوں۔ عیش ہی عیش ہے۔ اسکول کھل گئے ہیں۔ میرا داخلہ لکھنؤ کے مشہور اسکول کالون تعلقدار کالج میں چھٹی کلاس میں کرا دیا جاتا ہے۔ پہلے یہاں صرف تعلقداروں کے بیٹے پڑھ سکتے تھے، اب میرے جیسے کم ذاتوں کو بھی داخلہ مل جاتا ہے۔ اب بھی بہت مہنگا اسکول ہے ——— میری فیس سترہ روپیہ مہینہ ہے۔ (یہ بات اچھی طرح یاد ہے، اس لئے کہ ...... جانے دیجئے) میری کلاس میں کئی بچے گھڑی باندھتے ہیں۔ وہ سب بہت امیر گھروں کے ہیں۔ ان کے پاس کتنے اچھے اچھے سوئیٹر ہیں۔ ایک کے پاس تو فاؤنٹن پن بھی ہے۔ یہ بچے انٹرول میں اسکول کی کینٹن سے آٹھ آنے کی چاکلیٹ خریدتے ہیں (اب بھگوتی کی چاٹ اچھی نہیں لگتی) کل کلاس میں راکیش کہہ رہا تھا۔ اس کے ڈیڈی نے کہا ہے کہ اسے وہ پڑھنے کے لئے انگلینڈ بھیجیں گے (کل میرے نانا کہہ رہے تھے ——— ارے کمبخت! میٹرک پاس کر لے تو کسی ڈاک خانے میں مہر لگانے کی نوکری تو مل جائے گی) اس عمر میں جب بچے انجن ڈرائیور بننے کے خواب دیکھتے ہیں، میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ بڑا ہو کر امیر بنوں گا......

سین نمبر ۲۔ مقام: علی گڑھ۔ کردار: میری خالہ —— دوسرے گھر والے —— اور میں —— میری خالہ کے گھر کے سامنے دور جہاں تک نظر جاتی ہے میدان ہے۔ اُس میدان کے بعد میرا اسکول ہے —— نویں کلاس میں ہوں، عمر چودہ برس ہے۔ علی گڑھ میں جب سردی ہوتی ہے تو چھوٹ موٹ نہیں ہوتی۔ پہلا گھنٹہ سات بجے ہوتا ہے۔ میں اسکول جا رہا ہوں۔ سامنے سے چاقو کی دھار کی طرح ٹھنڈی اور نکیلی ہوا آ رہی ہے۔ چھو کر بھی پتا نہیں چلتا کہ چہرہ اپنی جگہ ہے یا ہوا نے ناک کان کاٹ ڈالے ہیں۔ ویسے پڑھائی میں تو ناک کٹتی ہی رہتی ہے۔ پتہ نہیں کیسے 'بس' پاس ہو جاتا ہوں، اس اسکول میں، جس کا نام منٹو سرکل ہے' میرا داخلہ کرتے ہوئے میرے خالو نے ٹیچر سے کہا —— "خیال رکھئے گا ان کا۔ دل پڑھائی میں کم فلمی گانوں میں زیادہ لگتا ہے۔" دلیپ کمار کی 'اُڑن کھٹولہ'، راج کپور کی 'شری چار سو بیس' دیکھ چکا ہوں۔ بہت سے فلمی گانے یاد ہیں، لیکن گھر میں یہ فلمی گانے گانا تو کیا 'سننا بھی منع ہے۔ اس لئے اسکول سے واپس آتے ہوئے راستے میں زور زور سے گاتا ہوں (معاف کیجئے گا 'جاتے وقت تو اتنی سردی ہوتی تھی کہ صرف دیپک راگ ہی گائے جا سکتے تھے) میرا اسکول یونیورسٹی ایریا میں ہی ہے۔ میری دوستی اسکول کے دو چار لڑکوں کے علاوہ زیادہ تر یونیورسٹی کے لڑکوں سے ہے۔ مجھے بڑے لڑکوں کی طرح ہوٹلوں میں بیٹھنا اچھا لگتا ہے۔ اکثر اسکول سے بھاگ جاتا ہوں۔ اسکول سے شکایتیں آتی ہیں۔ کئی بار گھر والوں سے کافی پٹا بھی، لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔ کورس کی کتابوں میں دل نہیں لگا تو نہیں لگا، لیکن ناولیں بہت پڑھتا ہوں۔ ڈانٹ پڑتی ہے، لیکن پھر بھی پڑھتا ہوں۔ مجھے شعر بہت یاد ہیں۔ یونیورسٹی میں جب بھی بیت بازی کا مقابلہ ہوتا ہے، میں اپنے اسکول کی طرف سے جاتا ہوں، اور ہر بار مجھے بہت سے انعام ملتے ہیں۔ یونیورسٹی کے سارے لڑکے لڑکیاں مجھے پہچانتے ہیں۔ لڑکے مجھے پہچانتے ہیں مجھے اس کی خوشی ہے، لڑکیاں مجھے پہچانتی ہیں اس کی تھوڑی زیادہ خوشی ہے —— اب میں کچھ بڑا ہو چلا ہوں —— میں پندرہ سال کا ہوں اور زندگی میں پہلی بار ایک لڑکی کو خط لکھ رہا ہوں' ۔ میرا دوست بیلو میری مدد کرتا ہے۔ ہم دونوں مل کر یہ خط تیار کرتے ہیں۔ (دیکھا آپ نے، میں نے زندگی میں رائٹنگ کا پہلا کام بھی پارٹنرشپ میں کیا تھا!) دوسرے دن ایک خالی بیڈمنٹن کورٹ میں وہ لڑکی مجھے ملتی ہے اور ہمت کر کے میں یہ خط اُسے دے دیتا ہوں۔ یہ میری زندگی کا پہلا اور آخری پریم پتر ہے۔ اُس خط میں کیا لکھا تھا، یہ بھول گیا، لیکن وہ لڑکی آج تک یاد ہے۔ میٹرک کے بعد میں علی گڑھ چھوڑ رہا ہوں۔ میری خالہ بہت رو رہی ہیں اور میرے خالو انہیں چپ کرانے کے لئے کہہ رہے ہیں کہ 'تم اس طرح رو رہی ہو' جیسے یہ بھوپال نہیں، لام پر جا رہا ہو' (اُس وقت نہ وہ جانتے تھے نہ میں جانتا تھا کہ میں سچ مچ لام پہ ہی جا رہا تھا۔)

سین نمبر ۳۔ مقام: بھوپال۔ کردار: اَن گنت نمبر ۱ ..... بہت سے دوست اور میں —— علی گڑھ سے بمبئی جاتے ہوئے میرے باپ نے مجھے بھوپال یا یوں کہئے کہ آدھے راستے میں چھوڑ دیا ہے۔ کچھ دنوں اپنی سوتیلی ماں کے گھر میں رہا ہوں۔ پھر وہ بھی چھوٹ گیا۔ سیفیہ کالج میں پڑھتا ہوں اور دوستوں کے سہارے رہتا ہوں۔ دوست جن کی لسٹ بنانے بیٹھوں تو ٹیلی فون ڈائرکٹری سے موٹی کتاب بن جائے گی۔ آج کل میں بی اے سکنڈ ایئر میں ہوں۔ اپنے دوست اعزاز کے ساتھ رہتا ہوں۔ کمرے کا کرایہ وہ دیتا ہے۔ میں تو بس رہتا ہوں۔

وہ پڑھتا ہے اور ٹیوشن کر کے گزر کرتا ہے۔ سب دوست اُسے ماسٹر کہتے ہیں —— ماسٹر سے میری کسی بات پر

جھگڑا ہو گیا ہے۔ بات چیت بند ہے۔ اس لئے میں آج کل اس سے پیسے نہیں مانگتا۔ سامنے دیوار پہ ٹنگی ہوئی اس کی پینٹ میں سے نکال لیتا ہوں یا وہ بغیر مجھ سے بات کئے میرے سرہانے دو ایک روپے رکھ کر چلا جاتا ہے۔

میں بی۔اے فائنل میں ہوں۔ یہ اس کالج میں میرا چوتھا برس ہے۔ کبھی فیس نہیں دی ——— کالج والوں نے مانگی بھی نہیں۔ یہ شاید صرف بھوپال میں ہی ہو سکتا ہے۔

کالج کے کمپاؤنڈ میں ایک خالی کمرہ۔ وہ بھی مجھے مفت دے دیا گیا ہے۔ جب کلاس ختم ہو جاتی ہے تو میں کسی کلاس روم سے ٹوٹا پھوٹا کرسی کمرے میں رکھ لیتا ہوں اور اس پر اپنا بستر بچھا لیتا ہوں۔ باقی سب آرام ہے۔ بس، بنچوں میں کھٹمل بہت ہیں۔ جس ہوٹل میں کھانا کھاتا تھا وہ میرے جیسے مفت خوروں کو ادھار کھلا کھلا کر بند ہو گیا ہے۔ اس کی جگہ جوتوں کی دکان کھل گئی ہے۔ اب کیا کھاؤں بھائی لوگ! بھوکا ہوں! اکیلا ہوں۔ سنگار کافی ہے۔ بھوک اس سے بھی زیادہ ہے۔ کالج کے دو لڑکے جن سے میری معمولی سی جان پہچان ہے، میرے لئے ٹفن میں کھانا لے کر آتے ہیں ..... میری دونوں سے کوئی دوستی نہیں ہے، پھر بھی ..... عجیب بے وقوف ہیں! لیکن میں بہت چالاک ہوں۔ انہیں پتا بھی نہیں لگنے دیتا کہ ان دونوں کے جانے کے بعد میں روؤں گا۔ میں اچھا ہو جاتا ہوں۔ اور صغیر اور فتح اللہ میرے بہت اچھے دوست ہو جاتے ہیں ——— مجھے کالج میں ڈبیٹ میں بولنے کا شوق ہو گیا ہے۔ پچھلے تین برس سے بھوپال روٹری کلب کی ڈبیٹ کا انعام جیت رہا ہوں۔ انٹر کالج ڈیبیٹ کی بہت سی ٹرافیاں میں نے جیتی ہیں۔ وکرم یونیورسٹی کی طرف سے دلی یوتھ فیسٹول میں بھی حصہ لیا ہے۔ کالج میں دو پارٹیاں ہیں اور الکشن میں دونوں پارٹیاں مجھے اپنی طرف سے بولنے کو کہتی ہیں ——— مجھے الکشن سے نہیں صرف بولنے سے مطلب ہے۔ اس لئے میں دونوں کی طرف سے تقریر کر دیتا ہوں۔

کالج کا یہ کمرہ بھی جاتا رہا۔ اب میں مشتاق سنگھ کے ساتھ ہوں۔ مشتاق سنگھ نوکری کرتا ہے اور میں پڑھتا ہوں۔ میں اس کے کمرے میں رہتا ہوں۔ وہ کالج کی اردو ایسوسی ایشن کا صدر ہے۔ میں بہت اچھی اردو جانتا ہوں، وہ مجھ سے بہتر جانتا ہے۔ مجھے انگنت شعر یاد ہیں۔ اسے مجھ سے زیادہ یاد ہیں۔ میں اپنے گھر والوں سے الگ ہوں، اس کے گھر والے ہیں ہی نہیں ——— دیکھئے، ہر کام میں وہ مجھ سے بہتر ہے۔ سال بھر سے اس کے ساتھ رہتا ہوں اور وہ مجھ سے دوستی کھاتے کپڑے پر نبھا رہا ہے۔ یعنی کھانا بھی وہی کھلاتا ہے اور کپڑے بھی وہی سلواتا ہے۔ پکا سردار ہے، لیکن میرے لئے سگریٹ خریدنا اس کی ذمے داری ہے۔

اب میں کبھی کبھی شراب بھی پینے لگا ہوں۔ ہم دونوں رات کو بیٹھے شراب پی رہے ہیں۔ وہ مجھے پارٹیشن اور اس زمانے کے دنگوں کے قصے سنا رہا ہے۔ وہ بہت چھوٹا تھا، لیکن اسے یاد ہے کیسے دلی کے قرول باغ میں دو لڑکیوں کو جلتے ہوئے تارکول کے ڈرم میں ڈال دیا گیا تھا اور کیسے ایک مسلمان لڑکے کو ...... میں کہتا ہوں، "مشتاق سنگھ! تو کیا چاہتا ہے جو ایک گھنٹے سے مجھے ایسے قصے سنا سنا کر میری بدلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ظلم کی یہ تالی تو دونوں ہاتھوں سے بجی تھی۔ اب ذرا دوسری طرف کی بھی تو کوئی واردات سنا۔"

مشتاق سنگھ ہنسنے لگتا ہے ——— "چلو سنا دیتا ہوں۔ جگ بیتی سناؤں یا آپ بیتی؟" ——— میں کہتا ہوں۔ "آپ بیتی۔" اور وہ جواب دیتا ہے۔ "میرا گیارہ آدمیوں کا خاندان تھا ——— دس میری آنکھوں کے سامنے قتل کئے گئے ہیں ......"

مشتاق سنگھ کو اردو کے بہت سے شعر یاد ہیں۔ میں مشتاق سنگھ کے کمرے میں ایک سال سے رہتا ہوں۔ بس ایک بات

مجھ میں نہیں آتی۔" مشتاق سنگھ! تجھے اُن لوگوں نے کیوں چھوڑ دیا؟ تیرے جیسے بھلے لوگ چاہے کسی ذات کسی مذہب میں پیدا ہوں ہمیشہ سولی پر چڑھائے جاتے ہیں۔ تو کیسے بچ گیا؟ آج کل وہ گلاسگو میں ہے۔ جب ہم دونوں الگ ہو رہے تھے، تو میں نے اس کا کڑا اس سے لے کر پہن لیا تھا اور وہ آج تک میرے ہاتھ میں ہے۔ اور جب بھی اس کے بارے میں سوچتا ہوں، ایسا لگتا ہے کہ وہ میرے سامنے ہے اور کہہ رہا ہے ۔۔!

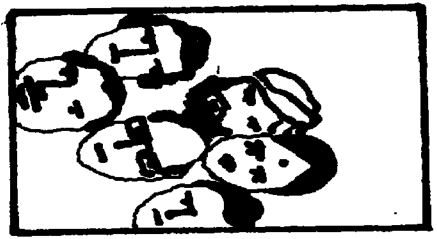
عبث ناکامیوں پر آپ اپنی ناز کرتے ہیں
ابھی دیکھی کہاں ہیں آپ نے ناکامیاں میری

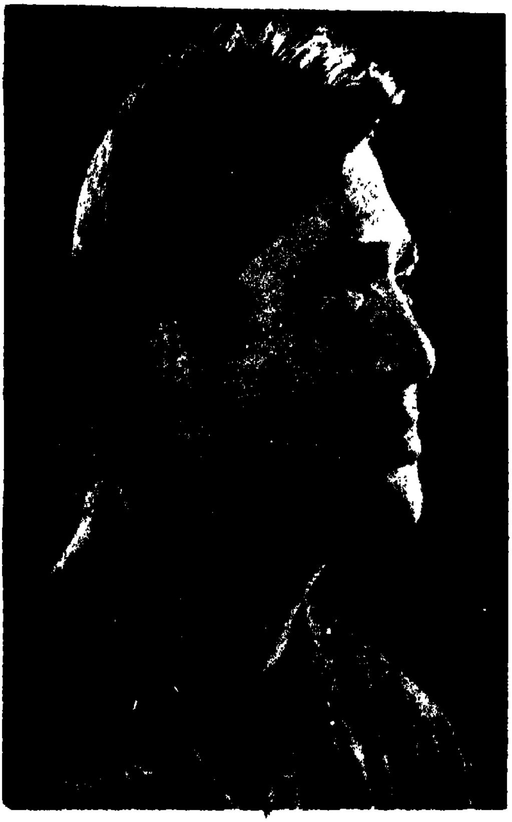
سین نمبر ۴۔ مقام: بمبئی۔ کردار: فلم انڈسٹری۔ دوست، دشمن اور میں —— ۲۴ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں بمبئی سنٹرل کے پلیٹ فارم پر اترا ہوں۔ اب اس عدالت میں میری زندگی کا فیصلہ ہونا ہے۔ بمبئی آنے کے چند دن بعد باپ کا گھر چھوڑنا پڑتا ہے۔ جیب میں ستائیس نئے پیسے ہیں۔ میں خوش ہوں کہ زندگی میں اگر کبھی اٹھائیس نئے پیسے بھی جیب میں آگئے تو میں فائدہ میں رہوں گا، اور دنیا گھاٹے میں۔ دن، ہفتے، مہینے، سال گزرتے ہیں۔ روٹی، ایک چاند اور حالات ایک بادل ہیں۔ چاند کبھی دکھائی دیتا ہے کبھی چھپ جاتا ہے۔ لیکن میں ناامید نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے، مجھے پورا یقین ہے، کچھ ہوگا، کچھ ضرور ہوگا، میں بس یونہی مر جانے کے لئے نہیں پیدا ہوا ہوں۔ پانچ برس یونہی گزر گئے، گر میرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے۔

نومبر ۱۹۶۹ء۔ میں سلیم صاحب کے گھر میں بیٹھا ہوں۔ اب ہم دونوں کو پہلا کام ملتا ہے...... اور اس کے بعد جو کچھ ہوا، بہت لکھا گیا ہے، بہت بار چھاپا گیا ہے۔ اُسے دوبارہ لکھنے سے کیا فائدہ۔ خدا کا شکر ہے۔ اب سب کچھ ہے میرے پاس۔ کام۔ نام۔ پیسہ۔ گھر۔ قسمت نے وہ ستائیس نئے پیسے بہت اچھے سود کے ساتھ واپس کئے ہیں——

سلیم صاحب، جو ایک بھائی سے بھی زیادہ ہیں۔ ہنی، میری بیوی، جو اگر نہ ہوتی تو پتا نہیں یہ اتنا سب کچھ جو قسمت نے دے دیا ہے، میں سنبھال پاتا بھی کہ نہیں؟ میں سچ مچ خوش ہوں، نہ صرف اپنے آج سے، بلکہ اپنے بیتے ہوئے کل سے بھی، اس زندگی کے پیڑ سے جو پھل میں نے توڑے ہیں اُن میں سے کچھ کڑوے تھے، کچھ میٹھے۔ جو کڑوے تھے اُن کی کڑواہٹ تو وقت کے ساتھ زبان پر سے چلی گئی، لیکن جو پھل میٹھے تھے، اُن کی مٹھاس آج تک ہونٹوں پر باقی ہے۔

چہرے





سُنیل دت

"......... میں ایسے بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں۔ جنکی شہرت کے غبار میں وہ آدمی گھٹ کر مر گیا ہے
جو مشہور ہونے سے پہلے ہوا کرتا تھا۔۔ سنیل دت نے اُس بلراج کو جلا رکھا ہے۔ اور اسی لئے
زندگی سے ان کا پیار کم نہیں ہوتا۔ اور ان کی شخصیت سے تازہ تازہ زندگی کی خوشبو آتی رہتی ہے ......"

"بلیا، ہونڑتے توئی ساڈا سہارا ہیں"

(سُنیل دت کی کہانی ڈاکٹر راہی معصوم رضا کی زبانی)

میں نے جان بوجھ کر سنیل دت کی ماں کے اس جملے کو سنیل دت کی اس مختصر داستانِ حیات کا عنوان قرار دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ مجھے وہ لوگ بڑے اچھے لگتے ہیں جو اپنی ماں سے پیار کرنا جانتے ہیں اور یہ جملہ سنیل دت کی ماں نے اُن سے ایک رفیوجی کیمپ میں کہا تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے کہ جب برصغیر فسادات کی آگ میں جل رہا تھا۔ جب نیزوں کی نوک پر بچّے اور عصمتیں اچھالی جارہی تھیں۔ جب کرشن چندر "ہم وحشی ہیں"، خواجہ احمد عباس "سردارجی"، عصمت چغتائی "دھانی بانکے" فیض احمد فیضؔ "داغ داغ اُجالا" وامق جونپوری "پنجاب" لکھ رہے تھے۔ جب یش پال کا "جھوٹا سچ"، ناگرجی کا "بوندیں اور سمندر" جنم لینے کی تیاری کر رہا تھا۔ جب ——— چاندنی چوک میں رات ہی رات تھی۔

مختصر یہ کہ یہ سن سینتالیس کی بات ہے۔ جب یکایک ہندوستانیوں کو یہ پتہ لگایا تھا کہ وہ ہندوستانی نہیں، ہندو، مسلمان اور سکھ ہیں...... ماں کی بے بسی میں ڈوبی ہوئی اس آواز میں نہ جانے کیسا جادو تھا کہ اُس دن سے آج تک سنیل دت فرقہ پرستی کے خلاف لگاتار لڑ رہے ہیں۔ رفیوجی کیمپ میں ماں کے اس ایک جملے نے سُنیل دت کے گال تھپتھپائے اور سنیل دت اُسی ایک پل میں بالغ ہو گئے۔ بڑے ہو گئے۔ تجربہ کار ہو گئے۔ اور انہیں پتہ چل گیا کہ انھیں کس میدان میں زندگی سے کشمکش کرنی ہے۔ اُن کی لڑائی اُ بھی تک جاری ہے۔ کئی مورچوں پر ان کی ہار ہوئی۔ پر کسی مورچے پر انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ زخموں کو انہوں نے رزم گاہ کے تحفے کی طرح قبول کیا۔ زخموں کو انہوں نے تمغہ کی طرح سینہ پر لگایا اور زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا نہ چھوڑا۔ میں اس جرأتِ رندانہ کی وجہ سے بھی ان کی عزت کرتا ہوں اور اسی لئے میں ان کی داستانِ حیات لکھنے پر راضی بھی ہو گیا ورنہ صاحب جینے سے کسے فرصت ہے کہ وہ کسی کی جیون کہانی لکھنے بیٹھے۔

یہ کہانی سنیل دت کی نہیں، بلراج کی ہے، بلیا کی ہے۔ اُس بیٹے کی ہے جو ایک رفیوجی کیمپ میں یکایک بڑا ہو گیا ——— وہ لڑکا سنیل دت تو بہت بعد میں بنا۔ گاؤں کا نام خورد۔ شاید اسی مناسبت سے اُن کی زندگی میں جنون کا پلّہ بھاری ہے۔ بلراج پانچ سال کا ایک کھلنڈرا بچہ تھا۔ زندگی اور موت کا فرق بھی نہیں جانتا تھا۔ جب باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ نہ جانے کتنی راتیں اس نے اپنے باپ کے انتظار میں، جاگنے کی کوشش کرتے گزاری ہوں گی؟ نہ جانے اُسے کتنی مشکل سے یقین آیا ہوگا کہ باپ اب نہیں آئے گا۔ ممکن ہے یہ بچّہ باپ کو بھول بھی گیا ہو؟ کیونکہ پانچ سال کے بچے کے پاس اور بہت سی باتیں ہوتی ہیں یاد رکھنے لائق۔ خورد ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ جہاں بلراج اپنی ماں اور اپنی بہن کے ساتھ رہتا تھا۔ وہی پانچ سال کا بچّہ جواب بھی سنیل دت

کو دن رات یاد آتا رہتا ہے۔ کیونکہ یہ بچہ تقسیم وطن کے اندھیرے میں نہ جانے کہاں گم ہو گیا۔

بلراج بڑا کھلنڈرا لڑکا تھا۔ اپنی ماں کو اماں، ماتا جی یا ماں نہیں پکارتا تھا۔ ان کا نام لیتا تھا۔ دودھ سے نفرت کرتا تھا، اور سواری کا شوقین تھا۔

باپ زندہ ہو یا نہ ہو، پڑھنے کی عمر تو آتی ہی ہے۔ بلراج بھی اُس عمر کو پہونچ گیا۔ پر خورد میں کوئی اسکول نہیں تھا۔ اسکول تھا سنگھوئی میں خورد سے آٹھ میل دور۔ بلراج گھوڑی پر بیٹھ کر اسکول جایا کرتا تھا۔

خورد اور سنگھوئی کے بیچ میں ایک منزل نوا لوک کی آتی تھی۔ اس نوا لوک میں یعقوب خان رہا کرتے تھے۔ باپ کے دوست اور باپ کے مرجانے کے بعد بھی باپ سے ان کی دوستی زندہ تھی۔ ان یعقوب کا ذکر بلراج کی کہانی میں آگے چل کے بھی آتا ہے۔ اسلئے انھیں یہیں دیکھتے چلنا مناسب ہوگا۔

بلراج کو سفر آتے جاتے یہاں رکنا پڑتا کیونکہ باپ کے دوست کو سلام کئے بنا وہ نوا لوک سے کیسے گزر سکتا تھا؟ چنانچہ وہ رکتا۔ یعقوب خاں اسے پیار کرتے، اسکے باپ کو یاد کرتے اور اُسے آتے جاتے دودھ کا ایک گلاس پلاتے۔ اور وہ بچہ جسے دودھ پلانے کے لئے ماں کو روز کبڈی کھیلنی پڑتی تھی، یعقوب خاں کا لمبا تگڑا گلاس چپ چاپ چڑھا جاتا۔ اُس دودھ میں یعقوب خاں کا نٹیا شکر کے ساتھ ساتھ اپنے پیار کی ایک آدھ چٹکی بھی ملاتے رہے ہوں گے کیونکہ جب سنیل دت مجھ سے اُن کا ذکر کر رہے تھے تو اُن کی آنکھوں میں ایک بے ساختہ چمک آگئی تھی .... گھوڑی پر دن گزرنے لگے اور اگر ملک تقسیم نہ ہو گیا ہوتا تو شاید اُس بچے کی کہانی کچھ اور ہوئی ہوتی ——— شاید وہ سنیل دت بنتا ہی نہیں ———

بلراج نے ہائی اسکول پاس کیا اور ملک میں مذہبی منافرت کے جھگڑے چلنے لگے۔ ہندو اور سکھ گھر چھوڑ کر جانے لگے۔ پر وہ لوگ کیسے جاتے؟ جن کے پاس زمینیں تھیں؟ چنانچہ تاؤ نہیں گئے اور تاؤ نہیں گئے تو بلراج کی ماں بھی نہیں گئی۔ اور بھائی بہن تو ماں کی پرچھائیاں تھے۔ یہ پورا کنبہ ٹکا رہا۔ ایک رشتہ دار جو فوج میں تھا۔ فوجی دستہ لے کر آیا انھیں نکال لے جانے کے لئے اور اس نے انھیں جانے پر مجبور کیا۔ تاؤ ضد نہ کر سکے۔ اور اس نے، خاندان نے اپنی جڑوں سے اکھڑنے کا فیصلہ کیا...... اُسے یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ یہی اُن دنوں کا چلن ہو گیا تھا۔ جڑیں اُداس روتی ہوئی کہیں پڑی تھیں۔ اور پیڑ روتے ہوئے اور سلگتے ہوئے اور زخم کھاتے ہوئے ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر بھٹک رہے تھے۔

جب جانے کی ٹھہر ہی گئی تو تاؤ اندر آئے۔ ماں اُن سے گھونگھٹ کرتی تھی۔ تاؤ نے پوچھا ——— "زیور رکھ لیئے؟" جواب میں ماں نے سر ہلا دیا اور چپ کے ذریعہ جواب دیا کہ زیور رکھنے سے کیا فائدہ۔ تھوڑے دنوں کے بعد تو لوٹ ہی آنا ہے۔ تاؤ نے پوچھا" ہیں کہاں ہیں۔ ماں نے کہا: "بھوسے کی کوٹھری میں" ——— تاؤ نے کہا: "تم لوگ چلو، میں بعد میں آؤں گا" ———

اور قافلہ روانہ ہو گیا۔ نہ جانے کہاں کیلئے؟ اُن دنوں منزلوں کا تو کوئی پتہ ٹھکانہ تھا نہیں۔

خورد میں صرف ایک ہندو رہ گیا۔ تاؤ۔ اس ہندو کے سارے دوست مسلمان تھے۔ گھر سے تاؤ کا تعلق یوں بھی

یوں ہی سا تھا۔ شادی انہوں نے کی نہیں تھی۔ تو وہ گھر میں صرف تین بار آیا کرتے تھے۔ صبح اور شام کو دودھ دوہنے اور رات کو کھانا کھانے پھر کنویں پر محفل جمتی اور گئی رات تک پرانی کہانیاں جاگتی رہتیں اور جگاتی رہتیں۔ تو اکیلے رہنے سے اُن کے معمول میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ وہ اسی طرح سویرے شام دودھ دوہتے اور رات کو ویسے ہی کنویں پر جا پہنچتے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ جیسے گھر والے گھر میں موجود ہوں……… کہ جمعہ آ گیا۔

مسجد کے مُلّا نے گاؤں کے مسلمانوں سے پوچھا کہ یہ ایک ہندو یہاں کیا کر رہا ہے؟ بلراج کی خاندانی حویلی کے پیچھے ایک بھشتی رہا کرتا تھا۔ وہ بھی مسلمان تھا۔ مُلّا کا سوال اُس نے بھی سُنا۔ دوڑا دوڑا آیا اور تاؤ سے بولا کہ مُلّا یہ پوچھ رہا تھا۔ آج جمعہ کی نماز کے بعد تاؤ نے سُن لیا ……… مگر رات کو وہ اُسی طرح ہاکو کے کنویں پر پہنچے۔ پرانی کہانیاں اُسی طرح جاگیں …… ایک ذرا سا تناؤ تھا۔ پر لوگ پھر بھی ہنسے بولے۔

ہاکو کے کنویں سے لوٹنے کے بعد تاؤ سیدھے بھوسے والی کوٹھری میں گئے۔ کیونکہ اب انھیں یقین ہو گیا تھا کہ بلراج کی ماں کا خیال غلط تھا۔ اب لوٹ کے نہیں آنا ہے۔ انہوں نے اُس حویلی کو آخری بار کیسے گلے لگایا۔ حویلی نے کیا کہا۔ کس کی آنکھ بھیگی؟ کس نے آنسو پونچھے۔ یہ تو پتہ نہیں۔ پر تاؤ زیوروں کی پوٹلی بغل میں دابے، کھیتوں کے بیچ سے گزرتے نوالوک پہنچ گئے۔

گئی رات کو یعقوب خاں کے گھر کی کنڈی بجی۔ یعقوب خاں باہر نکلے۔ تاؤ کو دیکھتے ہی سمجھ گئے۔ آدمی اور پناہ گزین میں فرق کرنا کیا مشکل کام ہے؟ تاؤ نے زیوروں کی پوٹلی انھیں دی۔ وہ بولے ”اس گھر میں مَیں ہوں اور میرے تین جوان بھائی ہیں۔ جب ہم مر جائیں گے تب تیری باری آئی گی۔ رہ جا۔“ تاؤ رہ گئے۔

دوسرے دن خورد والوں کو پتہ چلا کہ وہ اکیلا ہندو تو نکل گیا۔ نوالوک میں ہے۔ یعقوب خاں کے گھر۔ یہ بات انھیں بُری لگی۔ وہ یعقوب خاں پر چڑھ آئے۔ یعقوب خاں بھی بندوق تانے باہر نکل آئے۔ اُن کے ساتھ برابر کے تین بھائی بولے ”ہنسیا میرے گھر میں ہے اور میرے ہی گھر میں رہے گا۔“

شدہ شدہ یہ خبر پھیلی۔ سنگھوئی بھی گئی۔ سنگھوئی میں ایک درگاہ ہے۔ یعقوب خاں کے پیر کی۔ سجادہ نشین بولا کہ ”یعقوب ایسا نہیں کر سکتا۔ میں گھوڑا کس، نوالوک جاؤں گا۔“

یہ خبر جو یعقوب کو ملی کہ سجادہ نشین صاحب آنے والے ہیں تو انہوں نے تاؤ سے کہا کہ وہ دُنیا سے لڑ سکتے ہیں۔ پیر صاحب سے نہیں۔ میرا گھوڑا لے اور نکل جا۔“

تاؤ نے گھوڑا لیا اور نکل گئے۔ سویرا ہوتے ہوتے جہلم آ گیا۔ وہاں پناہ گزینوں کے ایک کیمپ میں ماں سے ملے۔ اُن کے زیور اُن کو دیئے۔ بھائی بہنوں کو پیار ملا۔ دوسرے دن یعقوب خاں یہ پتہ چلانے جہلم آئے کہ تاؤ پہنچے کہ نہیں پہنچے۔ کیونکہ وہ دن تو ایسے تھے کہ لوگ چلتے ضرور تھے۔ پہنچتے کم تھے۔

بلراج لکھنؤ میں تھا۔ اُسے یہ باتیں بعد میں معلوم ہوئیں۔

بلراج بڑا عجیب لڑکا تھا۔ اس کی کیسی کیسی باتیں، حرکتیں سُنیل دت کو یاد آتی رہتی ہیں۔ شریر تھا۔ روز ہی گاؤں ۔ بھر ؟ و پکار

نکل بھی آجاتیں۔ ماں ڈانٹنا شروع کرتی۔ وہ ترکی بہ ترکی لڑتا۔ اور لڑائی برابر پر چھوٹ جاتی۔ اور تب وہ اپنے آپ کو ماں سے لڑنے کی سزا دیتا۔ گھنٹوں تپتی ریت پر پڑا رہتا۔ لیکن اس سے معافی نہ چاہتا...... اسے یہ پتہ ہی نہیں تھا کہ اُسے اپنی ماں سے کتنی محبت ہے ——— ماں سے تو اُسے عشق تھا۔ لیکن اپنے عشق کا پتہ اُسے تب چلا جب ماں غائب ہو گئی۔

بلراج ایک رفیوجی کیمپ سے دوسرے تک پاگلوں کی طرح بھٹکتا رہا۔ اپنی اُس ماں کی تلاش میں جو مجبوبہ بھی تھی ——— ایک دن انبالا میں ایک رشتہ دار مل گیا۔ وہ بلراج کو اپنے باپ کے بنگلے پہ لے گیا اور بلراج کی نگاہ چھوٹے بھائی پر پڑی۔ سوم دت۔ نہیں، سوم دت کہاں تھا۔ اس کے سامنے ایک لڑکا کھڑا تھا۔ میلا بنیان۔ اُس سے زیادہ میلا کچیلا اور بٹن پڑتے ہوئے میل کی تہیں۔ پر جب وہ ناچنے لگا تو اس کی آواز سے ماں کے دودھ کی خوشبو آنے لگی۔ اس کی آواز سن کر بہن آ گئی۔ پھر ماں! بلراج کی آنکھیں اس بیچ کب کی بھیگ چکی تھیں۔ ماں نے لپٹا لیا اور بولی ——— "بب، ہونڈستے تو لئے ساڈا سہارا ہیں ——"

اور اُسی دن، اپنے ایک دوست کے بنگلے میں وہ ایک دم سے بڑا ہو گیا۔ اور اُس دن سے وہ اپنی ماں کو ماتا جی پکارنے لگا ——— پھر لکھنؤ ——— گنّے والی گلی ——— گلی میں ایک سیالکوٹی مسلمان کے ساتھ اختر نام کا ایک لڑکا بھی پیئنگ گیسٹ کی طرح رہنے لگا۔

گنے والی گلی لگ بھگ قصائیوں کی گلی ہے۔ ایک دن ایک قصائی نے اپنے اختر کو امین آباد کے مندر میں جاتے دیکھ لیا...... تو اختر لوٹ کے گنّے والی گلی میں گیا ہی نہیں ...... پر برسوں بعد جب بلراج 'سنیل دت' بن چکا تھا ...... یو۔پی جرنلسٹ ایسوسی ایشن کی ٹرافی لینے جب دت صاحب لکھنؤ گئے تو انھیں وہ بڑھیا یاد آئی۔ وہ گنّے والی گلی میں گئے۔ وہ نہیں ملی۔ پر جب اُسے پتہ چلا کہ اُس کا اختر سنیل دت بن کے اُس کے پاس آیا تھا تو وہ کالٹن ہوٹل میں سنیل دت سے ملنے آئی۔ پہلے جھجکی۔ اُس کے سامنے اختر نہیں تھا۔ اس کے سامنے تو ایک مشہور اداکار تھا ...... پھر اُس کا حجاب کھلا۔ سنیل دت کے خول سے اُس کے اختر نے جھانکنا شروع کیا اور وہ اپنے اختر کو پہچان گئی اور اُس نے برقعے کا نقاب اُٹھا دیا۔

مگر میں آپ کو سنیل دت کی کہانی نہیں سنا رہا ہوں۔ سنیل دت کی کہانی تو آپ کو زبانی یاد ہے۔ سنیل دت ——— ارے صاحب وہ دیوانہ آدمی، جو "ریشماں اور شیرا" جیسی فلم بناتا ہے ——— جو "یادیں" جیسی فلم بنانے کی دیوانگی دکھلاتا ہے۔ اکیلا ہیرو، جو ولین بننے سے نہیں ڈرتا۔ اکیلا ہیرو جو ایک اپاہج کی شکل میں تماشائیوں کے سامنے آنے سے نہیں ڈرتا...... سنیل دت کو تو سبھی جانتے ہیں۔ وہ بھی جو اُس کے دوست ہیں اور وہ بھی جو اُس کے دوست نہیں ہیں۔ میں تو بلراج کی کہانی سنا رہا تھا۔

یہ بلراج کرسچن کالج لکھنؤ میں پڑھ رہا تھا۔ اور اپنی تعلیم کا خرچ پورا کرنے کے لئے ایم ٹی سی آر میں نوکری بھی کر رہا تھا۔ پھر بمبئی آ گیا اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے ———

بلراج کے ایک چچا زاد بھائی بمبئی میں رہا کرتے تھے۔ پالی ہل پر اُن کا بنگلہ تھا۔ تو بڑے آدمی ہی رہے ہوں گے۔ بلراج کو "جے ہند کالج" میں داخلے کے لئے ۱۵۰ روپے نہیں دیئے۔ ہاں، پرتھوی راج مرحوم کے نام ایک سفارشی خط ضرور لکھ دیا کہ بلراج ایک پناہ گزیں لڑکا ہے اور یہ کہ وہ اُسے اچھی طرح جانتے ہیں ——— بلراج نے وہ خط پھاڑ دیا اور شاید وہی بات دل کے کسی گوشے میں پڑی رہ گئی تھی!

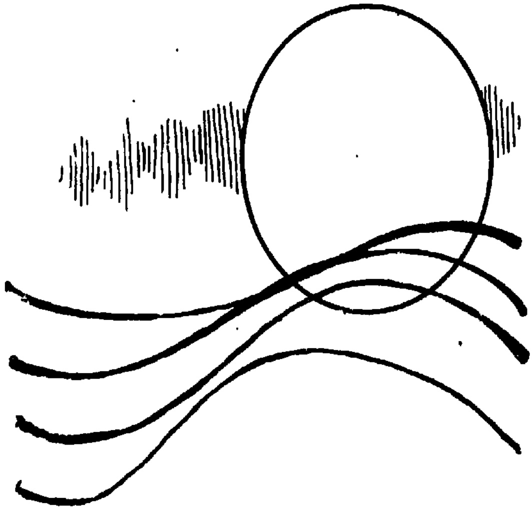
جس نے سنیل دت کو مجبور کیا کہ وہ اپنا عالیشان گھر پالی ہل پر ہی بنوائیں۔

..........اپنے ایک دوست کے باپ سے بلراج کو ۱۵۰ روپے ملے جس کی وجہ سے بمبئی کے "جے ہند کالج" میں ان کا داخلہ ہوا اور وہ اپنی تعلیم پوری کر سکے۔ تعلیم کا خرچ پورا کرنے کے لئے بلراج نے "بیسٹ" کمپنی میں نوکری بھی کر لی۔ ان دنوں بلراج کے پاس کھادی کے دو کرتے اور دو پاجامے تھے۔ رات کو آتے تو پہنا ہوا جوڑا دھوتے اور استری کر کے دوسرے دن کے واسطے رکھ دیتے۔

کھادی کے ان جوڑوں سے ایک عجیب واقعہ بھی وابستہ ہے۔

ہولی کا دن تھا —— رنگ والوں نے گھیر لیا۔ اب بلراج انھیں کیسے سمجھاتے کہ ان کے پاس کپڑے نہیں ہیں۔ لوگوں نے رنگ دیا۔ پر اس دن کے بعد سے آج تک بلراج نے ہولی نہیں کھیلی۔

میں ایسے بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں۔ جن کی شہرت کے غبار میں وہ آدمی گھٹ کے مر گیا ہے جو وہ مشہور ہونے سے پہلے ہوا کرتے تھے۔ سنیل دت نے اس بلراج کو جلا رکھا ہے —— اور اسی لئے زندگی سے ان کا پیار کم نہیں ہوتا۔ اور ان کی شخصیت سے تازہ تازہ زندگی کی خوشبو آتی رہتی ہے۔





دھرمیندر

"......... ۱۹۶۳ء میں میری زندگی میں ایک اہم موڑ آیا۔ جب فلم انڈسٹری کی سب سے بڑی اداکارہ مینا کماری میری زندگی میں داخل ہوئی ——— میناجی نے میرے اندر کی گھٹن، جھجک اور جھینپ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا...... میناجی سے مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ اُن کے بارے میں ...."

میرا ڈیل ڈول بچپن سے ہی مضبوط ہے۔ بچوں کی ٹولی پر میرا خاصا دبدبہ رہا کرتا تھا لیکن میں جھگڑے اور مار پیٹ سے ہمیشہ کتراتا تھا۔ شروعات تو کبھی میری طرف سے ہوتی ہی نہیں تھی۔ اُلٹے یہ ہوتا تھا کہ میری غلطی نہ ہونے پر بھی گھر پر مجھے ہی مار پڑتی تھی۔ کلاس میں تمام بچے مل کر خرافات کرتے تھے مگر میں اپنی پڑھائی میں لگا رہتا تھا۔ میرے پتا مجھے پروفیسر بنانا چاہتے تھے۔

ہیرو بننے کا خیال میرے دل میں بہت بعد میں آیا۔ ہیرو بننے کی خواہش میرے دل میں فلمیں دیکھ دیکھ کر اُبھری جو دھیرے دھیرے شوق بڑھتا گیا۔ مجھے آج بھی فلم "شہید" اور "انداز" میں یوسف صاحب (دلیپ کمار) کا، "برسات" میں راج صاحب اور "سمادھی" میں دادا مُنی (اشوک کمار) کے محبت کرنے کا انداز اچھی طرح یاد ہے۔

انٹر کرنے کے بعد میں نے ایک ٹریکٹر کمپنی میں کچھ دنوں کے لیئے نوکری کر لی تھی۔ وہیں ایک روز میں نے اپنے دفتر میں "فلم فیئر" دیکھا جس میں یونائیٹڈ پروڈیوسرز کانٹیسٹ (مقابلہ) کا اشتہار چھپا تھا۔ میں نے وہ فارم بھر کر بھیج دیا۔ پتا جی کو اس کا پتہ نہیں تھا۔ میں اپنی ماں اور بیوی سے کوئی بات نہیں چھپایا کرتا تھا اس لیئے انھیں اس بات کا علم تھا۔ میرے گھر والوں نے میری شادی ۱۹ سال کی عمر میں ہی کر دی تھی۔

ماں نے پہلے تو میرے فارم بھرنے پر اعتراض کیا مگر بعد میں انھوں نے خاموشی اختیار کر لی جسے میں نے ان کی اجازت سمجھا۔ پتا جی ٹیچر تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ میں خوب پڑھ لکھ کر پروفیسر بنوں گا۔ جب انھیں میرے ارادے کا پتہ چلا تو انھیں بہت افسوس ہوا۔ وہ عملی طور پر اپنے بیٹے کو فلموں میں دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ جب بہت روز تک فلم فیئر کی جانب سے میرے پاس کوئی انٹرویو لیٹر نہیں آیا تو میں مایوس ہو گیا اور میں نے سوچا کہ جب ماں باپ ہی مجھے فلموں میں بھیجنا نہیں چاہتے تو مجھے وہی کرنا چاہیئے جو میرے ماں باپ چاہتے ہیں۔ یہی سوچ کر میں نے اپنا سر منڈا دیا اور اپنی نوکری پر چلا گیا۔ مگر جب شام کو گھر واپس آیا تو میری بیوی نے مجھے ایک لفافہ دیا جو فلم فیئر کانٹیسٹ کا بلاوا تھا۔

سات آٹھ دن تک میں اس الجھن میں رہا کہ مجھے اس انٹرویو میں شرکت کرنی چاہیئے یا نہیں۔ آخر میں نے بمبئی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں انٹرویو میں شامل ہوا اور خوش قسمتی سے منتخب بھی کر لیا گیا۔ اسی دن فلموں کے لیئے میری جدوجہد کی ابتداء ہوئی۔

ایک دن مجھے فلمساز ایس مکرجی نے اپنی فلم "لو ان شملہ" کے لیئے بلایا۔ میرے پاس فلمالیہ اسٹوڈیو پہنچنے کے لیئے بھی پیسے نہیں تھے۔ پھر بھی میں جیسے تیسے کر کے فلمالیہ اسٹوڈیو پہنچا۔ ایس مکرجی اپنے کیبن میں بیٹھے تھے۔ میں نے ایک پرچے پر اپنا پورا نام دھرمیندر سنگھ دیول لکھ کر بھجوایا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد میں ان کے کمرے میں داخل ہوا۔ انھوں نے اس فلم میں مجھے یہ کہہ کر چانس دینے سے انکار کر دیا کہ تم ہیرو نہیں فٹبال کے کھلاڑی لگتے ہو۔ تمہیں فلموں میں نہیں فٹ بال ٹیم میں ہونا چاہیئے۔

میں ایس مکرجی کی باتوں سے ذرا بھی ہراساں نہیں ہوا اور بمبئی میں گردش کے دن گذارتا رہا۔ میری عمر ان دنوں تقریباً ۲۱، ۲۲

سال رہی ہو گی۔ کام کی تلاش میں دن بھر بھٹکنا اور شام کو بغیر کھائے پیئے سو جانا عادت سی بن چکی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں، کیا نہیں کروں، جیب بھی خالی تھی اور پیٹ بھی۔ ایسے میں میری ملاقات اتفاق سے ارجن ہنگورانی سے ہو گئی۔ وہ ان دنوں ایک فلم "دل بھی تیرا ہم بھی تیرے" ڈائرکٹ کر رہے تھے اور مجھے اس فلم میں بطور ہیرو لینا چاہتے تھے۔ مگر کہانی کے مطابق ہیرو کا ڈانسر ہونا بھی ضروری تھا۔ ارجن ہنگورانی مجھے ایک ڈانس ماسٹر کے پاس لے گئے تاکہ میں ڈانس سیکھ سکوں۔ چند روز بعد جب ارجن ہنگورانی نے اس ڈانس ماسٹر سے میری پروگریس کے بارے میں پوچھا تو ڈانس ماسٹر نے برجستہ جواب دیا۔

"آپ کسی پتھر کو تو تیرنا سکھا سکتے ہیں مگر اس لڑکے کو ناچنا نہیں سکھا سکتے۔"

لیکن اس ڈانس ماسٹر کی رائے سے نہ تو میں، ورنہ ارجن ہنگورانی دل برداشتہ ہوئے۔ اور انھوں نے کئی لوگوں کے کہنے کے باوجود مجھے اس فلم سے نہیں نکالا۔ اور میں نے ان کی فلم "دل بھی تیرا ہم بھی تیرے" میں کام کیا۔

اسی درمیان میری ملاقات فلم ساز، ہدایت کار رمیش سہگل سے ہوئی۔ میں نے ان کی فلم "شعلہ اور شبنم" میں کسی معاوضہ کے بغیر کام کیا تھا۔ ایک رات جب فلم کی شوٹنگ ختم ہوئی تو میں اپنے رین بسیرے جانا چاہتا تھا لیکن باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی جس کی وجہ سے میں رک گیا۔ جب بارش نے تھمنے کا نام نہیں لیا تو میں نے رمیش سہگل سے کہا۔

"رمیش جی۔ مجھے بہت دور جانا ہے۔ باہر بارش ہو رہی ہے۔ مجھے ٹیکسی کا کرایہ دلا دیجئے۔"

اس پر رمیش سہگل نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں نے کرایہ نہیں بلکہ قارون کا خزانہ مانگا ہو۔ مجھے ان کی نگاہوں کا انداز سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ میں بارش میں بھیگتا ہوا رات گئے اپنے گھر پہنچا۔ "دل بھی تیرا ہم بھی تیرے" کے پریمیئر پر بھی میری ایسی ہی حالت ہوئی تھی۔ اس وقت میرے پاس اپسرا سینما جانے تک کے پیسے نہیں تھے، جہاں میری پہلی فلم کا پریمیئر تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس رات بھی میں اس پریمیئر میں شامل ہونے کے لئے پیدل اپسرا سینما پہنچا تھا۔ مجھے اس وقت بے حد ہنسی آئی جب میں نے دیکھا کہ لوگ میری فلم اور مجھے دیکھنے کیلئے موٹر کاروں میں آئے ہیں اور میں خود پیدل چل کر سینما ہال پہنچا ہوں۔ میں شاید پریمیئر پہ نہ جاتا لیکن ارجن ہنگورانی نے مجھے پریمیئر پر ۵۰ روپیہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اسی غرض سے میں سینما ہال پہنچا تھا لیکن واہ ری قسمت اس دن پریمیئر کے ہنگامے میں ارجن ہنگورانی مجھے پیسے دینا بھول گئے اور میں پیدل ہی واپس آیا۔

ابتدا میں بڑی ہیروئنیں میرے ساتھ کام کرنے سے کتراتی تھیں۔ مگر مالا سنہا نے مجھے بھرپور تعاون دیا جسے میں آج تک نہیں بھولا ہوں۔ فلم "ان پڑھ" میں وہ میری ہیروئین تھی۔ ان دنوں کا ایک واقعہ ہے۔

فلم "ان پڑھ" کے لیے سہاگ رات کا منظر فلمایا جا رہا تھا۔ میں نیا نیا تھا اور اس فلم میں مالا سنہا کے شوہر کا رول ادا کر رہا تھا۔ لیکن گھبراہٹ کے مارے میرا برا حال تھا۔ میرے پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ بار بار ری ٹیک ہو رہے تھے۔ ہدایت کار موہن کمار میری ہمت بندھا رہے تھے۔ مگر میں ان کی تمام کوششوں کے باوجود سین کے مطابق مالا سنہا کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہیں کر پا رہا تھا۔

آخر مالا سنہا سے میری بے بسی نہ دیکھی گئی اور وہ مجھ سے بولی گھبرا رہے کیوں ہو۔ یوں سمجھو کہ میں سچ مچ تمہاری دلہن ہوں اور تم میرے ساتھ سہاگ رات منا رہے ہو۔ ابھی تک میں سہاگ رات کے خیال سے ہی پریشان ہو رہا تھا کہ مالا سنہا کے ان الفاظ نے میری رہی سہی ہمت

بجلی توڑ دی۔ جب مالا سنہا نے میری یہ حالت دیکھی تو اس نے خود میری طرف بڑھ کر میرے دونوں ہاتھ اپنے گالوں پر رکھ لیے۔ مالا سنہا کے گالوں پر ہاتھ لگتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے بجلی کے تاروں کو چھو لیا ہے۔ بڑی مشکل سے خدا خدا کر کے وہ سین اوکے ہوا۔

میری فلموں کا ابتدائی دور انتہائی مایوس کن تھا۔ میری فلمیں دلہا، ترا ہم بھی تیرے، بوائے فرینڈ، شعلہ اور شبنم، صورت اور سیرت، شادی، آپ کی پرچھائیاں اور بیگانہ کے بعد دیگرے ناکام ثابت ہوئیں۔ اس ناکامیابی کی وجہ سے میں دو بار بمبئی چھوڑنے پر مجبور ہوا اور اپنے گاؤں چلا گیا۔ لیکن بعد کچھ پروڈیوسر مجھے بلا لیا کرتے تھے اور واپس بمبئی آ جایا کرتا تھا۔

میرے نزدیک بندنی، دیور، آکاش دیپ اور انوپما نامی فلمیں چاہے باکس آفس پر ناکام رہی ہوں لیکن ان فلموں سے مجھے بحیثیت اداکار پہچانا جانے لگا اور یہی فلمیں میرے فلمی کیریر میں سنگ میل ثابت ہوئیں۔

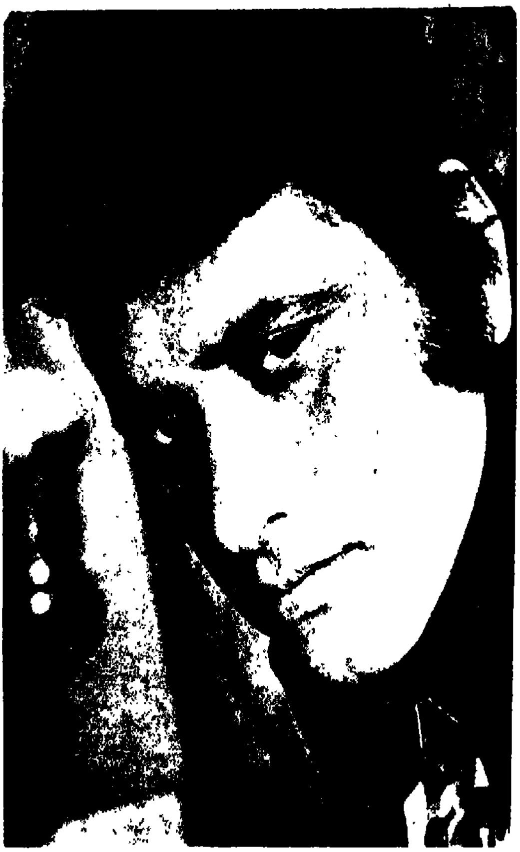
سنہ ۱۹۶۳ء میں میری زندگی میں ایک اہم موڑ آیا۔ جب فلم انڈسٹری کی سب سے بڑی اداکارہ مینا کماری میری زندگی میں داخل ہوئی۔ مینا جی نے میرے اندر کی گھٹن، جھجک اور جھینپ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

میں "پورنیما" سے "پھول اور پتھر" تک آتے آتے اپنی ایج بنا چکا تھا۔ "پھول اور پتھر" ہی وہ فلم تھی جس نے میری فلمی زندگی کو بدل دیا اس فلم میں میں نے شاکا کا رول کیا تھا۔ شاکا جو چور تھا، جو ہیروئین (مینا کماری) کے قریب آکر ایک دردمند انسان بن جاتا ہے۔ "پھول اور پتھر" جب ریلیز ہوئی تب مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ فلم باکس آفس پر کامیابی کا نیا ریکارڈ قائم کرے گی۔ اس فلم کی کامیابی نے مجھے راتوں رات اسٹار بنا دیا۔ ویسے تو میں ہیرو کیسے بنا کی کہانی یہیں ختم ہو جانی چاہیئے مگر اس فلم کے بعد بھی میرے فلمی کیریر میں کئی اڑچنیں آئیں۔ کئی بار مجھے ایسی ہیروئنوں سے واسطہ پڑ جاتا تھا جو مجھے کسی طرح کا تعاون دینے کو تیار نہیں ہوتی تھیں۔ میں ان ہیروئنوں میں وجینتی مالا کا نام خاص طور پر لیتا ہوں۔ فلم "پیار ہی پیار" میں میں نے وجینتی مالا کے ساتھ کام کرتے وقت کافی گھٹن محسوس کی تھی۔ "پھول اور پتھر" کے بعد میناجی کے ساتھ میری ایک فلم "ساحل" سپر ہٹ ہوئی۔ انہی کے ساتھ "میں بھی لڑکی ہوں"، "چندن کا پالنا"، "بہاروں کی منزل" اور "مجھلی دیدی" میں بھی میں نے ساتھ ساتھ کام کیا۔ میناجی سے مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ میں ان کے بارے میں اور کچھ کہنا نہیں چاہتا۔

میناجی کے بعد میں نے جس ہیروئن کے ساتھ سب سے زیادہ فلمیں کیں۔ اس کا نام آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ ہیما مالنی ہے ہیما مالنی میرے لئے لکی ہیروئن ثابت ہوئی۔ رمیش سپی نے ہماری جوڑی کی کامیابی سے متاثر ہو کر فلم "سیتا اور گیتا" میں ہمیں ایک ساتھ لیا۔ اس فلم نے باکس آفس پر جو شہرت حاصل کی وہ آپ سے بھی چھپی ہوئی نہیں ہے اس لئے میں فلم "پھول اور پتھر" کو اپنی کامیابی کا پہلا قدم مانتا ہوں تو "سیتا اور گیتا" کو اگلا قدم تسلیم کرتا ہوں۔

فلم "سیتا اور گیتا" کے بعد سے میری زندگی سے گردش کے بادل چھٹ گئے اور میں آپ کی دعاؤں سے ہندوستان کا مقبول ترین اداکار بن گیا۔

(روبی سے — شکریے کے ساتھ)



منوج کمار

"...... جب بھی لگتا ہے کہ کوئی انسان لوگوں کا اچھا سوچتا ہے، صرف اپنے ملک کا نہیں، بلکہ دُنیا کا اچھا سوچتا ہے، صرف اپنے مذہب ہی کا نہیں بلکہ دنیا کے ہر مذہب کا قدردان ہے تو اُس کے سامنے میری گردن اپنے آپ جُھک جاتی ہے ـــــ بھگوان کرے دُنیا میں ہر آدمی ایسا ہی ہو، اور میری گردن ہمیشہ ہمیشہ جُھکی رہے ...."

یقیناً ہر انسان کی طرح میری پہلی "آپ بیتی" میری پیدائش تھی۔ گھر والے کہتے بھی ہیں اور میں جانتا بھی ہوں کہ میرا جنم بروز ۲۴ جولائی ۱۹۳۱ء میں ہوا...... ایبٹ آباد (ضلع ہزارہ) جو آج کل پاکستان میں ہے .... خیر ـــــ جو بیت گئی سو بیت گئی۔

سُنتے ہیں کہ گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں۔ میدان تو نہ تھا، پر سوار ضرور تھا میں .... سائیکل سوار ـــــ گلی میں یا تو سائیکل مجھے چلا رہا تھا یا میں سائیکل کو ـــــ بات تب کی ہے جب میں بس چھ برس کا تھا۔ (کچھ مہینوں کا حساب اِدھر اُدھر۔ معاف کیجئے گا) یہ واقعہ مغل پورہ (لاہور) کے ساتھ لگے ہوئے رام گڑھ کی نانک گلی نمبر ۱ کا ہے ـــــ جی سائیکل پر سوار تھا میں ـــــ کہ ڈھلان کی وجہ میں نے بریک لگا دی۔ سائیکل آگے سے یوں اٹھی جیسے مہارانہ پرتاپ کا گھوڑا چیتک اٹھتا رہا ہوگا ـــــ فرق صرف اتنا ہے کہ مہارانہ اپنی مرضی سے گھوڑے کو اٹھاتے ہوں گے اور میرا سائیکل بغیر مرضی کے اٹھ گیا۔ سائیکل رُک سکنے کے لئے پیچھے کے پہیے کی بریک کی جگہ میں نے اگلے پہیے کی بریک کس دی۔ نتیجہ سائیکل کا اگلا پہیہ اوپر، میں نیچے ـــــ چوٹ .... جی ہاں پہلی بار بھی یاد ہے اب تک ... گھر دروازے پر کھڑے میرے والد صاحب نے سب دیکھا ـــــ دیکھ کر مسکرائے ـــــ اور کہنے لگے "بغیر گرے سائیکل چلانی آتی بھی نہیں۔"

یہ دوسری آپ بیتی معصومیت سے ذرا دور ہو کر بیتی ـــــ

ـــــ تیسری آپ بیتی ـــــ دن اور تاریخ تو یاد نہیں۔ مہینہ یاد ہے۔ جولائی ۱۹۴۷ء ـــــ ہم لاہور سے دلی آگئے یا آنا پڑا ـــــ خیر..... بہرحال آگئے۔ دیش آزاد ہو رہا تھا۔ آزادی جو پتہ نہیں انگریزوں نے ہم سے چھینی تھی یا خود ہم نے اُن کے قدموں پر رکھ دی تھی۔ وہ واپس مل رہی تھی ـــــ آزادی ملی۔ دیش آزاد ہوا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء میں اپنے والد صاحب کے ساتھ لال قلعہ پہ موجود تھا ـــــ بھیڑ کا عالم۔ توبہ۔ توبہ۔ لوگ ہم سے ٹکرا رہے تھے یا ہم لوگوں سے ٹکرا رہے تھے یا کوئی مستی بھرا آزادی کا جشن تھا جو کندھوں سے ٹکرا ٹکرا کر آزادی کے نغمے کو تال دے رہا تھا ـــــ لال قلعہ اور پھر آزادی کی پہلی ۱۵ اگست ـــــ اور پھر جھنڈا لہرانے والے جواہر لال نہرو ـــــ بھارت کے پہلے پردھان منتری ـــــ لال قلعہ جتنا اس دن لال تھا... پھر کبھی نہ ہوا ـــــ یا ہو سکتا ہے مجھے ویسا دکھائی نہ دیا ہو ـــــ خیر..... اس اتہاسک دن کی ایک خاص اور انوکھی قسم کی آپ بیتی اور بھی ہے ـــــ اُس دن بھیڑ۔ اوپر سے گرمی ـــــ پیاس بہت لگی تھی ـــــ ایک صاحب مٹکوں میں بھرا ہوا پانی پلا رہے تھے .... میں نے بھی پیا..... تین گلاس ـــــ میں چلنے لگا تو صاحب نے فرمایا "ارے بھئی پیسے تو دو۔" میں نے کہا: "پیسے کیسے!" ـــــ بولا: پانی کے ـــــ میں نے والد صاحب سے کہا......... اُن کے چہرے سے لگا کہ وہ کہنا تو بہت کچھ چاہتے تھے مگر آزادی کی خوشی میں جیسے میں نے پانی پیا ـــــ وہ اپنے جذبات پی گئے ـــــ دے دیئے انہوں نے پیسے ..... پانی کے ـــــ تیسری آپ بیتی آزادی کی لہروں میں بکنے والا پانی ساتھ لے آئی.......

پھر تو بہت کچھ بیتا ـــــ KINGSWAY CAMP TO SALWAN SCHOOL کنگزوے رفیوجی کیمپ سے لیکر سلوان ہائر سیکنڈری سکول تک۔ بیت گئی چوتھی بیتی...... جناب میں سکول سے نکل کر کالج پہنچ گیا..... کالج میں دل کس کمبخت کا لگتا تھا۔ مرحوم شیام۔ اشوک کمار۔ دلیپ کمار۔ راجکپور۔ دیوآنند صاحب کی فلمیں دیکھنا..... پرمت پوچھیے کہ کس کی فلم نہیں دیکھتے تھے...... سب دیکھتا تھا۔ فلم تو فلم ہی ہوتی ہے نا..... گھر والوں کو بتا کر کم۔ چوری چھپے بہت زیادہ..... جی ہاں مار بھی کھائی۔ گھر والوں سے بھی...... اور اسکول والوں سے بھی...... کہ ایک دن گھر پر میرے پھوپھی زاد بھائی سوہگیہ لیکھراج بھاکڑی صاحب تشریف لائے..... بدقسمتی سے میں اس وقت موجود نہ تھا ـــــ ان کی فلم "تانگے والی" کا پریس شو تھا۔ دلی کے ناولٹی سینما گھر پر ـــــ تو صاحب وہ گھر والوں سے کہہ گئے کہ کل گھلو کو (جی گھلو میرا وہ نام ہے جو میرے فلمی نام سے پہلے اصلی نام ہری کرشن سے بھی پہلے تھا) جی ہاں تو وہ کہہ گئے کہ کل صبح گھلو کو ناولٹی سینما بھیج دیجئے ـــــ واہ واہ جناب جنوری کا مہینہ۔ دلی کا سرد موسم۔ میں بن ٹھن کر (اپنی طرف سے) پہنچ گیا ناولٹی سینما پر ـــــ مجھے دیکھ کر لیکھراج جی کہنے لگے کہ تم تو ہیرو لگتے ہو۔ میں نے کہا تو لے چلئے بمبئی ـــــ میں..... بمبئی آگیا..... اار اکتوبر ۱۹۵۴ء۔ دہرہ دون ایکسپریس سے ـــــ واہ ری بمبئی..... دکھاتی ہے۔ سب کو رنگ دکھاتی ہے۔ "کبھی عرش پر کبھی فرش پر"........ یہ حقیقت ہے کہ والدین کے پاس تھوڑا بہت ہوتے ہوئے بھی میں بھی اوروں کی طرح فٹ پاتھ... ریلوے اسٹیشن... پر سویا ـــــ جی ہاں..... بھوکے پیٹ بھی سونا پڑا۔ ویسے روزی روٹی شروع ہونے کے بعد وزن ٹھیک رکھنے کے لئے کئی بار نہیں کھاتا۔ تب پیسے نہ ہونے کی وجہ سے بھوکے پیٹ سوئے..... شیر تو خیر میں نہ تھا نہ ہوں۔ مگر بھوکا ضرور تھا۔ شاید اسی لئے لڑ گیا حالات سے..... لڑائی جاری ہے۔ جیسے اوروں کی ہے...... کچھ فلمیں ریلیز ہوئیں...... فیل..... ایک کے بعد دوسری..... دوسری کے بعد تیسری...... بس فیل ہی فیل لکھا تھا میری فلموں کی قسمت میں ـــــ ایک چل گئی۔ ہٹ ہوگئی فلمی زبان میں۔ سلور جوبلی منائی اُس فلم نے ـــــ وہ فلم شری وجے بھٹ صاحب کی تھی۔ نام تھا۔ "ہریالی اور راستہ"۔ اتفاق یہ ہے کہ میری شادی کے بعد ریلیز ہونے والی یہ میری پہلی فلم تھی ـــــ ششی (میری بیوی کا نام) آج بھی کہتی ہے ـــــ میں آئی تو فلم چلی........ چلنے والی کو تو کوئی روک نہیں سکتا۔ فلم چلنے والی تھی چل گئی ـــــ شادی کا سہرا میرے سر تھا۔ اس کامیابی کا بیوی نے اپنے سر ڈال لیا........ سر کی بات چلی ہے سرفروشوں کی بات بھی ہو جائے ـــــ

آپ یقین کیجئے گا میں نے زندگی میں..... جسے کہتے ہیں ناول وہ نہیں پڑھا ـــــ بس یونہی دو صفحے ادھر۔ دو ورق اُدھر..... ہاں اتنا کہتا چلوں۔ یا تو تاریخ..... یا وہ کتابیں جن کا تعلق FICTION سے نہیں بلکہ FACTS سے ہے۔ انھیں کتابوں میں کچھ کردار میرے ذہن کو جھنجھوڑا کرتے...... شہید اعظم بھگت سنگھ نام شاید سب سے پہلا تھا۔ پہلی کہانی میں نے ان کے اور انکے ساتھیوں پر لکھی۔ اُس پر فلم بھی بنی "شہید"...... شاید پہلی ہندوستانی فلم تھی جسے ایک ساتھ تین NATIONAL AWARD ملے۔ اور شاید..... میں پہلا رائٹر تھا جسے شہید کی کہانی لکھنے کا ایوارڈ ملا........ کہانی تو حیر بھگت سنگھ اور ان کے ساتھی خود لکھ گئے تھے اپنے لہو سے..... میں نے تو شاید قلم سے بھی نہیں بلکہ پنسل سے نقل اتاری تھی.....

۱

پھر..... پھر..... مجھ پر اپکار کر دیا میرے دیش باسیوں نے ..... میری فلم اپکار کو پسند کر کے۔ اپکار کو بھی تین نیشنل ایوارڈ (NATIONAL AWARD) ملے...... اور فلم فیر کے شاید سات...... کبھی کبھی میرے چاچا شری راج نارائن پوچھتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا..... تمہیں ڈائرکٹر۔ ایڈیٹر۔ سٹوری رائٹر۔ سکرین پلے رائٹر۔ ڈائیلاگ رائٹر..... یہ سب ایوارڈ کیسے مل گئے۔ میں نے کہا آپ بھول گئے چاچا۔ مجھے ایکٹر کا ایوارڈ بھی ملا تھا۔ جواب میں کہنے لگے ہاں لیا۔ جتنے DEPARTMENTS میں تم نے ایوارڈ لئے ہیں شاید کسی اور نے نہیں لئے۔ مگر......

میں نے کہا —— چاچا یہ مگر کیا ——

کہنے لگے... "کچھ نہیں" ——

میں نے کہا... پھر بھی ——

سورگیہ محبوب خان صاحب کا جملہ چپکا گئے مجھ پر کہ "اللہ مہربان تو گدھا پہلوان" ——

...... چلئے یونہی سہی..... اب کون سمجھائے چاچا کو کہ گدھا بھی محنت تو کرتا ہے۔

بات بہت پرانی نہیں —— خیر میرے لئے تو آج بھی وہ آج ہی کی ہے —— شہید کے پریمیر پر ہمارے پردھان منتری شری لال بہادر شاستری صاحب میرے بار بار کہنے پر دس منٹ کے لئے آنے کو آمادہ ہو گئے۔ صرف ۱۰ منٹ بہت تھے ہمارے لئے —— مگر دل میں سے کہیں یہ آواز آتی تھی کہ اگر وہ آ گئے تو پھر جائیں گے نہیں فلم دیکھ کر ہی۔ اور یہی ہوا ..... جب وہ سینما گھر میں تشریف لائے تھے تو انہوں نے پردے کی طرف دیکھا۔ سچ سجا ہوا تھا۔ کہنے لگے "میں یہاں بھاشن کرنے نہیں آیا" —— بات تھی بھی ٹھیک —— اس لئے میں خاموش رہا ..... خیر صاحب فلم شروع ہوئی .... فلم شہید اعظم بھگت سنگھ اور اُن کے دوسرے ساتھیوں سے بھری ہوئی تھی۔ تو شاستری جی کیسے چلے جاتے ۱۰ منٹ میں ..... فلم دیکھتے دیکھتے نہ جانے وہ کتنی بار روئے .... فلم ختم ہوئی ..... بلکہ شو ختم ہوا..... شاستری جی نے تالی بجائی ..... ہال گونج اٹھا پھر تو تالیوں سے ..... پھر انہوں نے میری طرف دیکھا ..... میری آنکھوں میں دیکھا میں اُن آنکھوں کی تاب نہ لا سکا۔ ... اور میری گردن اسٹیج (STAGE) کی طرف گھوم گئی ...... کہنے لگے "اچھا اچھا... چلو..." پھر وہ منچ پر آئے اور تقریباً آدھ گھنٹہ بولتے رہے ...... جذبات سے بھرپور تھی وہ رات ..... رات کے دو بجے کے قریب شاستری جی کے ہاں سے ٹیلیفون آیا۔ سندیسہ یہ تھا کہ شاستری جی کہہ رہے ہیں کہ آج رات نیند نہیں آ رہی ہے۔ میں جواب نہ دے پایا ..... اور پھر ادھر سے اُن کے آدمی کی آواز آئی کہ کل صبح آپ چائے کے لئے آ جائیے .... کم بخت سویا اُس رات ...... صبح صبح ان کی کوٹھی پر حاضر ہو گیا —— کچھ نہ بولے ...... دیکھا ... مسکرائے ...... اور ہاں پھر بولے ... "جے جوان جے کسان پر فلم بناؤ" —— میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت انسان سمجھتا ہوں کہ انہوں نے مجھ جیسے سادھارن ناگرک کو کچھ کام سونپا —— وہ فلم بنی۔ اُس فلم کا نام تھا "اپکار" اس کا پریمیر بھی دلی میں ہوا ..... اور سورگیہ ذاکر حسین صاحب تشریف لائے تھے پریمیر پر..... تب وہ ہندوستان کے پریزیڈینٹ تھے۔ فلم کے بعد انہوں نے جو جملہ بولا۔ وہ آج بھی دل و دماغ میں شاباش کی گونج لگاتا ہے ..... انہوں نے

فرمایا تھا۔ "منوج کمار نے لال بہادر جی کے نعرے کا اتنا شاندار ترجمہ کیا ہے کہ.... یہ فلم صرف فلم ہی نہیں۔ قومی سرمایہ سا لگا مجھے۔" جواہر لال نہرو جی کے ساتھ نسبت۔ مجھے کچھ پل یاد ہیں۔ اچھی باتیں یاد ہیں۔ ۔ وہاں ایک بات ایسی بھی جو آج بھی دل کو دھکا سا لگاتی ہے۔ گھبرائیے مت کسی کی برائی نہیں کر رہا۔ کسی ایسے ویسے شخص کا ذکر نہیں بلکہ ذکر ہے اس انسان کا جس پر انسانیت ناز کرتی ہے۔ اور کرتی رہے گی۔ ان کا نام پنڈت جواہر لال نہرو ہے۔ .... جب وہ آخری بار بمبئی تشریف لائے تو میں اپنی بیوی کے ساتھ ان کے درشن کرنے راج بھون گیا۔

پنڈت جی ہمارا شٹر کے چیف منسٹر نائیک صاحب سے بات چیت کر رہے تھے وقت پر ہمیں اندر بلا لیا گیا۔ میری بیوی نے گلاب کے پھولوں کا گلدستہ تھا اور میرے ہاتھ میں ایک گلاب پہلے انہوں نے ایک ہاتھ سے گلدستہ لیا اور پھر دوسرے ہاتھ میں جب میں نے پھول رکھا۔ تو وہ گر گیا...... بیماری نے اسقدر کمزور کر دیا تھا ایک ہاتھ کا لرزا اٹھا تھا میں۔ کہ وہ انسان جو اپنے ہاتھوں سے اپنے دیش کو مضبوط بنا رہا ہے۔ اسی کا ایک ہاتھ کمزور ہو گیا۔ دیش کا کیا ہو گا......؟

"شاید" یہی تھی ہماری قسمت میں...... خیر اکثر لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں۔ کیا تمہارا اگلا قدم سیاست کی طرف ہے۔ سیاست والوں سے بھی تعلقات ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں اسی طرف جانے والا ہوں۔ .... لوگ پوچھتے ہیں مراد دوستوں سے ہے۔ ۔ ۔ آپ کا تعلق کس پارٹی سے ہے۔ ..... وہ شاید یہ اس لئے پوچھتے ہیں کہ میرا تعلق ہر پارٹی کے آدمی سے ہے۔ وہ بھی انسانی رشتے سے۔ جب بھی لگتا ہے کہ کوئی انسان لوگوں کا اچھا سوچتا ہے، صرف اپنے ملک کا نہیں بلکہ دنیا کا اچھا سوچتا ہے۔ صرف اپنے مذہب کا ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر مذہب کا قدر دان ہے تو اس کے سامنے میری گردن اپنے آپ جھک جاتی ہے ـــــ کاش اب کرے دنیا میں ہر آدمی ایسا ہی ہو۔ اور میری گردن ہمیشہ ہمیشہ جھکی رہے۔

گردن سے یاد آیا... ابھی کچھ دن پہلے جھکی تھی ـــــ جھکی تھی نہیں پھولوں کے ہار پہ ہار۔ بوجھ پیار کا تھا۔ گر بوجھ بوجھ ہی ہے گردن جھک جاتی ہے۔ ـــ پاکستان کی بات ہے یہ ـــــ ۱۹۴۷ء کے بعد اب جانے کا موقع ملا۔ اپنے گاؤں جنڈیالہ شیر خاں (ضلع شیخوپورہ) کی زیارت کی۔ اور اسی گاؤں میں پھرے۔ بزرگوں کے گھر سے صرف کچھ گز کے فاصلہ پر ہی ہے وارث شاہ کی درگاہ۔

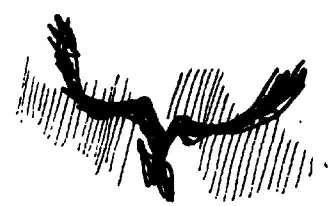
پیر وارث شاہ (ہیر کے خالق) کے مزار پر سجدہ کرنا نصیب ہوا۔ وہاں کے فنکاروں اور ادیبوں سے ملاقات ہوئی۔ استاد دامن صاحب اور احسان دانش صاحب جو والد صاحب کے پرانے دوست ہیں انہیں تو پیار سے ملنا ہی تھا۔ گر قتیل شفائی صاحب اور جناب جوش ملیح آبادی صاحب نے دقت کے ساتھ جو پیار دیا...... اسے کن الفاظ میں بیان کروں ـــــ

اور برسوں بعد دیوالی کی رات ـــ اور وہ بھی لاہور میں جناب آغا گل صاحب کے گھر ـــ اور محمد علی اور زیبا جیسے بھائی اور بھابی کے ساتھ ـــ مشہور فنکار کے ساتھ ساتھ محمد علی میری نظر میں مکمل انسان ہے ـــــ

——— پاکستان جسے میں بہت دُور سمجھتا تھا — کتنا قریب نکلا ——— اور پاکستان میں رہنے والے جو ہندوستان کو بہت دُور سمجھتے تھے — وہ بھی کتنا قریب نکلا ——— جب دونوں قریب ہیں تو پھر دوری کہاں کی۔ دوری کیسی .... میری پہلی "آپ بیتی" ایبٹ آباد سے شروع ہوئی تھی جہاں میرا جنم ہوا تھا ——— اور ختم بھی ایبٹ آباد میں ہوئی ..... جہاں دوری ختم ہو چکی تھی ———————

——————— آج کل فلم "کرانتی" بنا رہا ہوں۔ فلمیں بناتے ہوئے جو بیتا کرتا ہے، وہ بیت رہا ہے۔ کہانی لکھتے ہوئے جو بیتا تھا سلیم جاوید صاحب پر میں اس کا گواہ ہوں۔ اور معلوم نہیں جو کرانتی کی کہانی فلماتے ہوئے مجھ پر بیت رہی ہے اس کے یہ دونوں صاحبان "چشم دید" گواہ کیوں بننا پسند نہیں کرتے ——— دفتر سنبھالتے ہوئے جو والد صاحب اور بیوی پر بیت رہا ہے ..... میں اس کا گواہ نہیں، کیونکہ دفتر کا کام روپے پیسے کا حساب کتاب کا کام ہوتا ہے .... اور جو روپے پیسے گننے لگے وہ فلم نہیں بنا سکتا ——— جی ——— میں فی الحال فلم ہی بنا رہا ہوں ———"

اِس اُمید پر یہ "آپ بیتی" ختم کرتا ہوں کہ یہ پڑھ کر آپ پر بہت بھاری نہیں بیتی ہوگی ———





سنجیو کمار

"........ فلم انڈسٹری میں جن مشکلات کا سامنا میں نے کیا ہے میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اتنا کسی نے نہیں کیا۔ ذرا تصور کیجئے جس اداکار کی چھ سات فلمیں ریلیز ہو چکی ہوں اور جسے بحیثیت ہیرو فلم بینوں نے تسلیم نہ کیا ہو اور اتنی فلموں کی ریلیز ہونے کے بعد بھی جسے لوکل ٹرینوں میں سفر کرنا پڑتا ہو اس نے فلم انڈسٹری میں کس طرح کامیابی حاصل کی ہوگی..........؟"

میری پیدائش (جولائی ۱۹۳۸ء) سارے خاندان کے لیے خوشی کا باعث ہوئی۔ بچے اور وہ بھی لڑکے کی پیدائش پر ماں باپ اور گھر کے دوسرے افراد کا خوش ہونا قدرتی بات ہے۔ میرے والد زری کے کاروبار سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ مذہبی قسم کے آدمی تھے اس لیے انھوں نے میرا نام "ہری" رکھا۔ اس طرح میرا پورا نام ہری بھائی زری والا ہوگیا۔ میرے والد مجھ سے بہت محبت کرتے تھے انھوں نے مجھے بہت لاڈ پیار سے پالا۔ لیکن بدقسمتی سے ۱۹۴۴ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ یہ میرے خاندان کے لئے بہت بڑا صدمہ تھا۔ میری ماں میرے دو بھائی، میری ایک بہن اور تین سو روپے کرائے والا مکان، ان سب کی ذمہ داری بڑا ہونے کی وجہ سے مجھ پر آپڑی اور میں دس سال کی عمر میں جوان ہوگیا۔

دھیرے دھیرے جیسے تیسے وقت گذرتا رہا اور ۱۹۵۹ء میں میں نے انڈین پیپلز تھیٹر اسوسی ایشن IPTA جوائن کیا، وہاں سال بھر تک ایکٹنگ سیکھی۔ ۱۹۶۰ء میں بمبئی کے خالصہ کالج میں IPTA کی طرف سے "جمع" ڈرامہ کھیلا جانے والا تھا۔ اس ڈرامے میں ایک پارسی کردار تھا جس کو ایک دوسرا اداکار پیش کر رہا تھا مگر کئی دنوں سے ریہرسل میں شریک نہ ہوا تھا۔ اس بات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں اس ڈرامے کے ڈائرکٹر اے کے ہنگل کے پاس پہنچا اور میں نے ان سے یہ کیرکٹر کرنے کی اجازت چاہی لیکن اے کے ہنگل نے منع کردیا اور کہا "تم سنجیدہ رول کرتے ہو، یہ کامیڈی رول نہیں کرسکو گے۔" لیکن میں نے اصرار کرکے اُن سے یہ رول کرنے کی اجازت لے لی۔

خالصہ کالج میں جب وہ ڈرامہ کھیلا گیا تو میری اداکاری دیکھ کر ہنگل صاحب نے کہا: "تم تو چھپے رستم نکلے۔ تم تو پکے کامیڈین ہو۔" ہنگل صاحب کے الفاظ سن کر مجھے بے انتہا خوشی ہوئی تھی۔ اس ڈرامے میں میرے ساتھ شتین کپتو بھی تھے۔ انھوں نے بھی میرے رول کی بہت تعریف کی۔ اتفاق سے میرا یہ ڈرامہ فلمساز ایس مکرجی نے بھی دیکھا تھا۔ انہوں نے مجھے فلمالیہ اسٹوڈیو بلایا اور فلمالیہ اسکول آف ایکٹنگ میں مجھے داخل ہونے کا مشورہ دیا۔ میں نے فوراً ہی ہاں کردی۔ فلمالیہ میں پی ڈی سنہا ہمارے اُستاد تھے وہ مجھ سے اتنے خوش تھے کہ مجھے بہترین طالب علم کہتے تھے۔

کچھ دنوں بعد ایس مکرجی نے "ہم ہندوستانی" نام کی ایک فلم شروع کی میں نے اس فلم میں جونیئر آرٹسٹ کے طور پر کام کیا۔ وہاں مجھے دو روپے روزانہ ملتے تھے۔ پھر میں نے انھیں کی فلم "آؤ پیار کریں" میں اسی معاوضہ پر کام کیا۔ کئی بار یہ ہوتا تھا کہ گردش کے ان دنوں میں میرے پاس اسٹوڈیو پہنچنے کے لئے بس کا کرایہ تک نہ ہوتا تھا۔

جوائے مکرجی ان دنوں فلمالیہ کے ہیرو ہوا کرتے تھے، انھوں نے ایک فلم بنانی شروع کی جس کا نام "دیہاتی" رکھا تھا۔ یہ فلم وہ خود ہی ڈائرکٹ بھی کر رہے تھے۔ اس فلم میں ششی کپور، جیتندر، دیب مکرجی کے ساتھ میں بھی تھا۔ مشکلات کے دن آہستہ آہستہ گزر رہے تھے۔ ایک دن میری ملاقات ایس پی ایرانی سے ہوئی۔ انہوں نے مجھے ہومی واڈیا سے ملنے کو کہا وہ "نشان" شروع کر رہے تھے اور ایس پی ایرانی اس کے ڈائرکٹر تھے۔ میں گھبرایا ہوا ہومی واڈیا کے پاس پہنچا۔ اتفاق سے مجھے رول مل گیا اور پہلی بار کسی فلم کا ہیرو بنا تھا۔ ایس پی ایرانی نے اس فلم میں

میرا ... یہ دیکھ کر کہا تھا کہ تم ضرور ترقی کروگے پر اداکارانہ صلاحیتیں محدود رہیں گی۔ اور تم خاص قسم کے رول ہی کر سکو گے۔ میں نے ان کی اس پیشین گوئی کا کوئی خاص اثر نہیں لیا اور محنت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی "نشان" سے بھی کوئی خاص بات نہ بنی اس کے بعد ایس پی ایرانی کی فلم "علی بابا چالیس چور" میں کام کیا مگر نتیجہ کوئی خاص نہیں نکلا اسی درمیان میری فلم "اسمگلر" آئی۔ یہ بھی باکس آفس پر کوئی خاص مقام حاصل نہیں کر سکی۔

ایک دن فلم ہدایت کار نریش کمار (راجندر کمار کے بھائی) نے ایک دن اپنا ملازم بھیج کر مجھے اپنے دفتر بلایا اور اس طرح میں ان کی فلم "حسن اور عشق" کے لئے سائن ہو گیا اس وقت میں بہت خوش تھا۔ اپنی زندگی میں پہلی بار نریش کمار کے ساتھ اسکاچ چکھی اور ۵۵۵ کا سگریٹ پیا جو نریش کمار نے پیش کیا۔ مجھے پہلی بار اپنی فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں ہوائی جہاز پر بیکا بھیجے گئے۔ پھر میں نے ایک دوسری ایکشن فلم "بادل" میں کام کیا۔ ۱۹۶۶ء میں پہلی بار محمود نے مجھے ایک سوشل فلم میں چانس دیا۔ فلم کا نام تھا "پتی پتنی" فلم کی ہیروئن نندہ تھی اور اس کے ڈائرکٹر اکبر تھے جنھوں نے مینو ممتاز سے شادی کی اور آج کل کویت میں ہیں۔

مگر گردش کے دن ختم نہیں ہوئے تھے اور لوگوں نے مجھے ہیرو کے طور پر قبول نہیں کیا۔ ہیرو کے رول میں اپنی فلموں کو باکس آفس پر فیل ہوتے دیکھ کر میں نے سائڈ رول کرنے شروع کر دیئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے "سنسکار" میں دھرمیندر کے ساتھ اور "سنگھرش" میں دلیپ کمار کے ساتھ کام کیا۔

اسی درمیان مجھے ایس پی ایرانی مل گئے انھوں نے مجھ سے کہا کہ تم کیا بے وقوفی کر رہے ہو، ہیرو کے رول کرنے کے بعد سائڈ رول کرنے شروع کر دیئے۔ ان کی بات کا مجھ پر اثر ہوا اور پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ وہی فلمیں قبول کروں گا جن میں میرا لیڈنگ رول ہوگا۔ ادھر ۱۹۶۸ء میں سنگھرش ریلیز ہو چکی تھی اور اس فلم میں دلیپ صاحب کے کام کے ساتھ میرے کام کی بھی تعریف ہونے لگی۔ صحیح معنوں میں اس فلم کے بعد ہی مجھے فلم انڈسٹری نے بطور آرٹسٹ تسلیم کیا۔

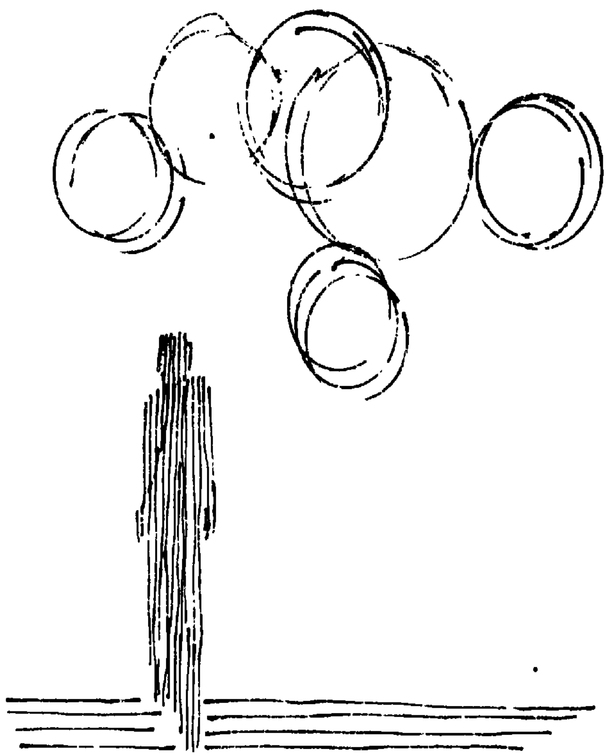
فلمساز ورل گوہا نے مجھے "جیوتی" میں کام دیا مگر بدقسمتی کہ فلم فلاپ ہو گئی۔ میرے سامنے پھر مشکلات آنے لگیں مگر میں بھی اس مٹی کا بنا تھا کہ جس نے مشکلات کے آگے جھکنا نہیں سیکھا تھا۔ میری ہمت رنگ لائی۔ مجھے پرساد صاحب کی فلم "کھلونا" میں ایک پاگل کا رول ملا اور میری اس اداکاری کی بڑی تعریف ہوئی۔ میرے لئے پھر راستے کھلنے شروع ہو گئے اس کے بعد میں نے کئی فلموں میں کام کیا جن میں "انوبھو"، "چندا اور بجلی"، "راجہ اور رنک"، "آشیرواد"، "دستک" جیسی فلمیں تھیں۔ ان فلموں سے فلمسازوں نے بھی مجھے بہترین اداکار کے خطاب سے نواز دیا۔ اور اسی درمیان خوش قسمتی سے جی پی سپی نے اپنی فلم "سیتا اور گیتا" میں مجھے ہیرو کے طور پر لے لیا۔ اس فلم کی کامیابی کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اس فلم کے بعد سے میں ہندوستانی فلموں کا "اسٹار" بن گیا۔

فلم انڈسٹری میں جن مشکلات کا سامنا میں نے کیا ہے میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اتنا کسی نے نہیں کیا۔ ذرا تصور کیجئے جس اداکار کی چھ سات فلمیں ریلیز ہو چکی ہوں اور جسے بحیثیت ہیرو فلم بینوں نے تسلیم نہ کیا ہو اور اتنی فلموں کے ریلیز ہونے کے بعد بھی جسے لوکل ٹرینوں میں سفر کرنا پڑتا ہو اس نے فلم انڈسٹری میں کس طرح کامیابی حاصل کی ہوگی۔ بس یہ میں ہی جانتا ہوں۔ آج جب میں نے کامیابی حاصل کر لی ہے۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ ایسی پریشانیوں اور مصیبتوں کا کسی دشمن کو بھی سامنا نہ کرنا پڑے۔

ابھی پچھلے دنوں جب میری فلم شعلے ریلیز ہوئی تو اسے دیکھ کر مجھے ایس پی ایرانی نے فون کیا "میں نے تمہارے لیے جو پیشن گوئی کی تھی کہ تمہاری اداکارانہ صلاحیتیں محدود رہیں گی۔ شعلے دیکھنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ میں غلطی پر تھا۔"

ایس پی ایرانی کا یہ کہنا میرے لیے ہزاروں ایوارڈوں سے بڑھ کر ہے۔ بس دوستو! یہی میری جدوجہد کی داستان ہے۔

(مرتب: سبھاش اندوری)





امیتابھ بچن

"........ سیٹھ جی نے پہلے اپنی عینک ناک پر رکھی، مسکرا کر طنزیہ انداز میں مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور پھر بولے "تمہیں ہیرو بننے کا خیال کیسے آیا۔ یہ خیال بالکل چھوڑ دو۔ تم جیسے لمبے اور بے ڈول آدمی کیلئے ہیروئین کہاں سے آئے گی؟ بہتر ہے کہ دلّی واپس جا کر کچھ اور کام دھندا کرو ...."

یہ بات ان دنوں کی ہے جب میں الہ آباد کے ایک نرسری اسکول میں پڑھتا تھا۔ اسکول کا سالانہ جلسہ تھا۔ اس جلسہ میں پیش کرنے کے لئے ہماری ٹیچر نے ایک ڈرامہ تیار کیا۔ اس میں مجھے بھی ایک پارٹ دیا گیا لیکن اسٹیج پر جاتے ہوئے مجھے بے انتہا شرم محسوس ہو رہی تھی۔ اس وقت میں اپنی ٹیچر کے حکم اور ممی (شریمتی تیجی بچن) کی حوصلہ افزائی سے اسٹیج پر گیا اور تتلاتے ہوئے میں نے اسٹیج پر اپنا رول بخوبی نبھایا کیونکہ مجھے ہکلانے والے بچے کا رول کرنا تھا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ بچپن میں عام طور پر ہر بچہ تھوڑا بہت ہکلاتا ہی ہے لہٰذا میری اداکاری کی بہت تعریف ہوئی اور میری ٹیچر نے ممی سے کہا کہ آپ کا یہ ننھا ایکٹر بڑا ہو کر ایک گریٹ ایکٹر بنے گا!

آپ یہ بھی جان لیں کہ اس وقت میری عمر صرف ۵ سال تھی اور اس ڈرامہ کا نام تھا "لال پری"۔ اس کے بعد میں ہر سال اسکول کے ڈراموں میں حصہ لیتا رہا۔ میری ممی جو اُن دنوں مشہور و مقبول اسٹیج اداکارہ تھیں مجھے ایکٹنگ کرنا سکھایا کرتی تھیں۔ اسی دوران میں نے اسٹیج پر "کوی سمیلن" نام کے ایک ناٹک میں جو کویتا پڑھی تھی وہ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ اس کویتا کی پہلی لائن تھی "تارہ کیوں ٹمٹماتا ہے۔"

انھیں دنوں کا ایک مزیدار واقعہ آپ کو سناتا ہوں جس کا تعلق بھی میرے ایکٹر ہونے کی پریشانی سے ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ننھے ایکٹر کی پریشانی تھی۔ ہوا یہ کہ مجھے اپنے والد کی لکھی ایک کویتا 'غبارے' اسٹیج پر پیش کرنا تھی۔ اس کے لئے مجھے کرنا یہ تھا کہ میں غبارہ ہاتھ میں لیکر کویتا پڑھوں اور جب کویتا کی آخری لائن آئے تو غبارے کو پھوڑ دوں۔ میں نے اسٹیج پر کویتا پڑھنا شروع کی مگر جب غبارہ پھوڑنے کا نمبر آیا تو پتہ نہیں ہوا کم تھی یا کوئی اور وجہ تھی غبارہ نہیں پھوٹا۔ میں نے غبارے کو بہت زور سے دبایا، ہاتھ مارا، نوچا، کھسوٹا مگر وہ نہیں پھوٹا۔ اب میری حالت خراب۔ ادھر میں غبارے سے اُلجھ رہا تھا اور اُدھر ہال میں تماشائی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ مجھے دیکھنے والوں کی وہ ہنسی آج تک یاد ہے اور مجھے یقین ہے کہ میں آج جو کچھ بھی ہوں اس میں اس ہنسی کا بہت گہرا ہاتھ ہے۔ کیوں اس ہنسی نے مجھ میں بھرپور خود اعتمادی پیدا کی اور میری جھجک ہمیشہ کے لئے جاتی رہی۔

اس کے بعد میرے والد نے مجھے اس اسکول سے ہٹا کر نینی تال کے شیرووڈ اسکول میں داخل کرادیا۔ یہاں بھی میں اسکول کے پروگراموں میں حصہ لیتا رہا۔ آپ کے لئے یہ بات شاید دلچسپی کا باعث ہو کہ اسی اسکول سے میں نے ،۱۹۵ء میں بہترین اداکاری کے لئے "کینڈل کپ" جیتا تھا۔ اسی اسکول میں میری دوستی کرشن مجمدار نام کے ایک لڑکے سے ہو گئی جو ایک بنگلہ فلم میں چائلڈ آرٹسٹ کا کام بھی کرچکا تھا۔ کرشن نے سب سے پہلے میرے دل میں ہیرو بننے کی تمنا پیدا کی۔ وہ مجھے اکثر اکساتا رہتا تھا اور کہتا تھا کہ میں جب تک کسی لڑکی سے محبت نہیں کروں گا میں ہیرو تو کیا زندگی میں کچھ بھی نہیں بن سکتا۔ اس کے علاوہ میرے ساتھی مجھ سے کہتے تھے کہ اس اسکول کی روایت ہے کہ ہر بریگیڈ کے اسٹوڈنٹ کو اپنی گرل فرینڈ چننی ہوتی ہے۔ میں اپنے ساتھیوں کی باتیں سن کر گھبرا جاتا اور بے حد شرمندہ ہوتا تھا کیونکہ میری کوئی گرل فرینڈ

نہیں تھی۔ پھر بھی میں نے ہمت نہیں ہاری۔ ایک لڑکی میرے ساتھ ڈراموں میں حصہ لیتی تھی اور ہمارے ہی اسکول کے تحت چلنے والے سسٹر مشن اسکول میں پڑھتی تھی۔ اسے میں نے "لو لیٹر" لکھا اور ایک دن موقع پاکر اس کے ہاتھ میں ہیلو کہہ کر تھما دیا اور وہ بائی کہہ کر گزر گئی۔ میں نے سوچا کام بن گیا اور ایک دن میں اس سے ملنے سسٹر مشن اسکول کے ہاسٹل جا پہنچا۔ مگر بدقسمتی سے مجھے وارڈن نے پکڑ لیا اور میرے پرنسپل سے شکایت کر دی۔ اس شکایت کے بدلے مجھے چار بیت کی سزا ملی۔ اس حادثہ سے میں نے سبق لیا کہ آئندہ کسی بھی لڑکی کو "لو لیٹر" نہیں لکھوں گا چاہے میں ایکٹر بنوں یا نہ بنوں۔

میں ایکٹر کیسے بنا؟ یہ بتانے سے پہلے آپ کو بتا دوں کہ میرے والد مجھے اپنی ہی طرح کوئی بائیلوجسٹ بنانا چاہتے تھے اور میں خود بھی یا تو ایکٹر بننا چاہتا تھا یا کسی کمپنی کا مینجنگ ڈائرکٹر لیکن میری ممی مجھے اسٹیج آرٹسٹ بنانا چاہتی تھیں اور میرا بھائی ابتیابھ مجھے فلم ایکٹر بنانا چاہتا تھا۔

جب میں نے نینی تال میں اپنی بی ایس سی کی پڑھائی مکمل کر لی تو میرے والد نے مجھے کلکتہ کی ایک فرم میں ایگزیکیٹو کی پوسٹ پر لگا دیا۔ وہاں میں نے تک بھگ دو سال کام کیا۔ ایک دن وہیں میرا بھائی ابتیابھ مجھ سے ملنے آیا اور اس نے مجھے فلم فیر میں چھپا ایک اشتہار دکھایا وہ اشتہار فلم فیر یونائٹیڈ پروڈیوسرس ٹیلینٹ کانٹسٹ کا تھا۔ ابتیابھ چاہتا تھا کہ میں اس کے لیے فارم بھر دوں۔ میں نے ابتیابھ کے کہنے سے وہ فارم بھر دیا۔ اس کی خبر ہمارے والدین کو بالکل نہیں تھی۔ میں فارم بھر کر سمجھ رہا تھا کہ اب میں فلمی دنیا کا مشہور اداکار ہو گیا ہوں۔ مگر بدقسمتی سے مجھے انٹرویو کے لیے بھی نہیں بلایا گیا۔ اس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ "بمبئی ٹاکیز" نام کی ایک انگریزی فلم کی شوٹنگ شروع ہوئی ہے۔ میں اس فلم کے پروڈیوسر اسمٰعیل مرچنٹ سے جا کر ملا۔ انھوں نے اس فلم میں ایک چھوٹا سا رول دے دیا۔ دوسرے الفاظ میں آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ میں نے "بمبئی ٹاکیز" فلم میں بطور ایکسٹرا کام کیا۔ اس کے بعد میں نے نوکری چھوڑ دی اور کلکتہ سے دہلی چلا آیا۔

یہاں آکر مجھے پتہ چلا کہ ایک فلم ساز مرزا غالب پر فلم بنانا چاہتے ہیں۔ میں اُن سے ملا تو انھوں نے میرا اسکرین ٹیسٹ لینے کی بات کی۔ اس لیے میں نے گھر پر ہی اپنے اوپر ایک فلم شوٹ کرائی۔ اس کا نتیجہ دیکھ کر مجھے غالب کے رول کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ میری ممی کی کوششوں سے فلم کا مہورت بڑی دھوم دھام سے مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین (صدر جمہوریہ ہند) کے ہاتھ سے ہوا۔ میں نے مہورت کی تصاویر اخباروں میں چھپوا دیں میرے لیے غالب کا رول ان دنوں بہت بڑی بات تھی۔ اس لیے میں غالب کی زندگی سے متعلق کتابیں پڑھنے لگا تاکہ اپنے کردار کو ٹھیک طرح سے نبھا سکوں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ فلم بنانے کا ارادہ ملتوی کر دیا گیا ہے۔ یہ خبر سن کر میرے پیروں کے نیچے کی زمین کھسک گئی اور مجھے کافی دنوں تک افسوس رہا۔

اس واقعہ کے بعد میں دلی سے بمبئی چلا آیا۔ یہ بات ۱۹۶۷ء کی ہے۔ مجھے پتہ چلا کہ ایک بہت بڑے فلمساز جو ڈسٹری بیوٹر بھی ہیں وہ اپنی نئی فلم میں ایک نیا ہیرو چاہتے ہیں۔ میں ان سے ملنے ان کے دفتر پہنچ گیا۔ آفس بوائے سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ سیٹھ جی ابھی بہت مصروف ہیں۔ میں نے ایک پرچی پر اپنا نام لکھا اور اندر بھجوا دیا۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا اور مجھے نہیں بلایا گیا۔ میں باہر بیٹھا بور ہو رہا تھا یاد دہانی کے لیے میں نے دوسری چٹ بھیجی۔ دو گھنٹے تک اس کا بھی کوئی جواب نہیں آیا تو میں اٹھا اور سیٹھ جی کے کمرے کا دروازہ کھول کر اور ان سے

اجازت مانگ کر سامنے بیٹھ گیا۔ سیٹھ جی نے پہلے اپنی عینک ناک پر رکھی مسکرا کر طنزیہ انداز میں مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور پھر بولے۔ تمہیں ہیرو بننے کا خیال کیسے آیا۔ یہ خیال بالکل چھوڑ دو۔ تم جیسے لمبے اور بے ڈول آدمی کے لئے ہیروئن کہاں سے آئے گی۔ بہتر ہے کہ دلّی واپس جاکر کچھ اور کام دھندہ کرو۔ مجھے سیٹھ جی کی باتیں سن کر غصہ تو بہت آیا لیکن میں کر ہی کیا سکتا تھا۔

۱۹۶۸ء کے آس پاس میری ملاقات خواجہ احمد عباس سے ہوگئی۔ وہ ان دنوں "سات ہندوستانی" کی تیاریاں کر رہے تھے۔ انھوں نے مجھے بغیر اسکرین ٹیسٹ لیئے اپنی فلم میں ایک رول دے دیا۔ یہاں میں اس افواہ کی تردید کر دوں کہ میں عباس صاحب کے پاس اندرا گاندھی کا سفارشی خط لے کر گیا تھا اس لیئے انھوں نے بغیر اسکرین ٹیسٹ لیئے مجھے فلم میں لے لیا تھا۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ عباس صاحب نے مجھے فلم میں ایک بے ڈھنگے اور لمبے نوجوان کی ضرورت کے تحت یہ رول دیا تھا۔ اور میں ان کی توقع پر پورا اترتا تھا۔ میں ان کے خوابوں کا تکملہ تھا (میں نے فلم سات ہندوستانی میں کلیور کا رول کیا تھا) مگر ۱۹۶۹ء میں جب یہ فلم ریلیز ہوئی تو باکس آفس پر بُری طرح ناکام ثابت ہوئی۔

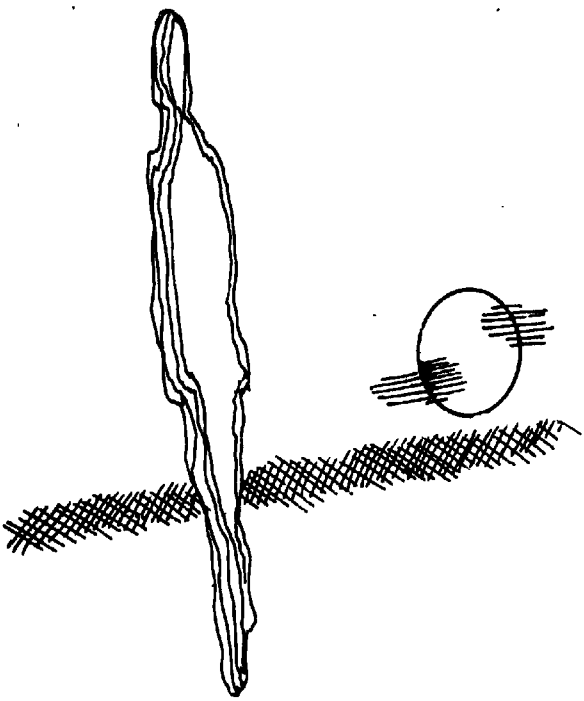
جن دنوں سات ہندوستانی زیر تکمیل تھی انھیں دنوں میری دوستی فلم اسٹار محمود کے چھوٹے بھائی انور علی سے ہوگئی اور فلم کے ریلیز ہونے کے بعد میں انور کے ساتھ ہی محمود کے گھر پر رہنے لگا۔ محمود بھائی کے پاس روزانہ پروڈیوسر آتے اور انھیں سائن کرتے اس کے علاوہ ان کے مداحوں اور پرستاروں کے ڈھیر سارے خط آتے۔ میرے پاس نہ کوئی آتا اور نہ ہی کوئی خط آتا۔ میں اپنا دل مسوس کر رہ جاتا۔ جب ڈاکیا ڈاک لاتا تو سب سے پہلے میں اس میں اپنا خط ڈھونڈتا مگر ڈاک چھاننے میں ہمیشہ مایوسی ہوتی۔ محمود صاحب نے یہ بات نوٹ کر لی۔ انھوں نے ایک دن پانچ چھ خط لڑکیوں کی طرف سے لکھ کر میرے نام خود ہی پوسٹ کر دیئے وہ خط میرے پاس لاکر بولے "لو امیت اب تو تمہارے بھی تو لیٹر آنے لگے۔" یہ سب کچھ انہوں نے میرا دل رکھنے کے لیئے کیا۔

۱۹۷۰ء کے آس پاس میری ملاقات رشی کیش مکرجی سے ہوگئی انھوں نے مجھے "آنند" اور "گڈی" دو فلموں کے لیئے سائن کیا مگر بعد میں مجھے "گڈی" سے نکال دیا ——— اور میرے پاس صرف "آنند" رہ گئی۔ آنند فلم ہٹ ہوگئی اور اس میں لوگوں نے میری اداکاری اتنی پسند کی کہ میں "بابو موشائے" کے نام سے مشہور ہوگیا اور میرا کام چل نکلا۔ اب تو باقاعدہ میری ڈاک آنے لگی اور ایک دن وہ بھی آیا کہ محمود صاحب خطوں کے دو بنڈل لے کر میرے کمرے میں آئے۔ میں نے معمول کے مطابق ہلکے بنڈل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ لیکن محمود صاحب نے میرا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا یہ ہلکا بنڈل میرے لیئے ہے۔ تمہارے لیئے بڑا بنڈل آیا ہے۔ میں نے دیکھا تو میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔

"آنند" کے بعد مجھے "پروانہ" ملی۔ اس میں میری اداکاری کی تعریف ہوئی مگر فلم فلاپ ہوگئی۔ پھر [illegible] والوں نے مجھے اپنی فلم "پیار کی کہانی" میں لیا مگر بدقسمتی سے یہ فلم بھی فلاپ ہوگئی۔ ۱۹۷۲ء میرے لیئے بہت سی پریشانیاں اور ناکامیاں لے کر آیا۔ میری تمام فلمیں مثلاً "ایک نظر" "بنسی برجو" "راستے کا پتھر" باکس آفس پر بُری طرح فیل ہوگئیں۔ میری پریشانیوں میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسی درمیان مجھے "گہری چال" میں کام مل گیا۔ یہ فلم بھی فلاپ رہی۔ میرے ستارے پوری طرح گردش میں آگئے تھے۔ پھر مجھے دو فلمیں راجندر کی "سوداگر" اور ادپی رلیھن کی "بندھے ہاتھ" ملیں مگر بدقسمتی سائے کی طرح میرا پیچھا کر رہی تھی۔ یہ دونوں فلمیں بھی فلاپ ہوگئیں اور میں نے دلی جانے کے لیئے سامان باندھ لیا۔ بُرے وقت میں پرکاش مہرہ میری زندگی میں آئے انھوں نے مجھے فلاپ ہیرو ہونے

کے باوجود اپنی فلم "زنجیر" میں موقع دیا۔ یہ فلم باکس آفس پر بے انتہا کامیاب ہوئی اور میں راتوں رات مقبول ترین اسٹار ہو گیا۔ پرکاش مہرہ کی اس فلم نے مجھے حقیقت میں ایکٹر کے ساتھ ساتھ فلم بینوں کا محبوب اداکار بنا دیا اور اس کے بعد آپ لوگوں کی بے پناہ محبت، اور خلوص نے مجھے ترقی کی ان منزلوں تک پہنچا دیا جہاں میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بس دوستو! یہی کہانی ہے میرے اسٹار بننے کی۔

("روبی" سے ۔ شکریے کے ساتھ)





ہیما مالنی

"......فلمیں ہی فلمیں، دولت ہی دولت، شہرت ہی شہرت، مگر دل میں بے اطمینانی اور سکون کا فقدان
کئی طرح کی افواہوں نے دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ کبھی کسی ہیرو کے ساتھ میرے رومانس کی خبر اڑا دی تو کبھی کسی
کے ساتھ۔ میرے بارے میں .... ———"

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جنوبی ہندوستان میں جو لڑکی تھوڑی بہت گوری چٹی پیدا ہو جاتی ہے وہ آگے چل کر فلموں میں ہیروئن بن جاتی ہے کیونکہ جنوبی ہندوستان میں زیادہ تر سانولی اور سیاہ لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں۔

میں ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو ترچناپلی میں پیدا ہوئی، تب میری خالہ سرجا دیوی نے میری ماں سے کہا کہ یہ لڑکی آگے چل کر فلموں میں ہیروئن بنے گی۔ میری ماں نے مجھے بتایا کہ میرے والد (آر۔ چکرورتی) اور میرے دادا دی۔ ڈی پارسارتھی کو سپنے میں بھی خیال نہیں تھا کہ میں کبھی ہیروئن بنوں گی۔ میری پیدائش کے صرف تین ماہ بعد ہی میرے والد کا تبادلہ دلی ہو گیا تھا اس طرح میں مدراس میں صرف تین ماہ ہی رہ سکی تھی۔ میرے والد ای۔ ایس۔ آئی کارپوریشن میں ڈائرکٹر تھے۔

دلی میں بارہ سال اور نو مہینے رہی۔ لہٰذا میری ابتدائی تعلیم دلی میں ہی ہوئی۔ جب میں اسکول میں پڑھتی تھی تب میری اُستانیاں کہتی تھیں: "کتنی سوئٹ ہے بے بی!" اور میرے ساتھ پڑھنے والی لڑکیاں اکثر چڑھایا کرتیں، "تیرا چہرہ وجینتی مالا سے ملتا جُلتا ہے تو فلموں میں ضرور کام کرے گی۔" ایسے ہی میں ایک دن اپنی سہیلی نندنی کے گھر گئی تو کھیل کھیل میں میری اس سہیلی نے بھی مجھ سے کہا تھا۔ "ہیمو تو بڑی ہو کر فلموں میں کام کرنا۔ تیرا چہرہ بالکل ہیروئن کے لائق ہے"۔ نندنی کی یہ بات سُن کر اس وقت ایسا لگا کہ جیسے کسی نے میرے مُنہ پر طمانچے جڑ دیئے ہوں۔ میں روتی ہوئی گھر واپس آئی تو ممی (جیہ چکرورتی) نے کہا تھا۔

"ارے تو کیا ہوا۔ تجھے کہنا چاہیئے تھا کہ ہاں میں ہیروئن بنوں گی۔ پاگلوں کی طرح روئے جا رہی ہے، چل مُنہ دھو لے۔"

یقین جانیئے، میری ہیروئن بننے کی کوئی خواہش نہیں تھی، ہاں میں کلاسیکل ڈانسر ضرور بننا چاہتی تھی۔ میرے بابا، میری ممی اور میرے ڈیڈی کی بھی یہی آرزو تھی، رقص کی بات چل نکلی ہے تو میں یہ بتا دوں کہ میں نے چھ برس کی عمر سے کلاسیکل رقص سیکھنا شروع کر دیا تھا۔ آپ کو شاید یہ جان کر تعجب ہو کہ میں نے دس سال کی عمر میں راشٹرپتی بھون میں صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد اور دوسرے بہت سے وزیروں کے سامنے رقص پیش کیا تھا۔ میرے اس پروگرام پر فلم ڈویژن والوں نے فلم بھی بنائی۔ یعنی ۱۹۵۵ء ہی میں کیمرے کے سامنے آ گئی تھی۔ صرف دس سال کی عمر میں۔

پھر ایک دن میری زندگی میں ایسا بھی آیا کہ میرے پتا جی کا تبادلہ مدراس میں ہو گیا اور مجھے اپنی پیاری دلی چھوڑنی پڑی۔ اس بار، جب میں مدراس پہنچی تب میری عُمر تیرہ سال ہو چکی تھی اور میں میٹرک پاس کر چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میرے پاس رقص سے متعلق بہت سے تمغے بھی تھے۔

میں ۱۴ دسمبر ۱۹۵۸ء کو آج تک نہیں بھول پائی ہوں۔ اُس دن ہمارے گھر پر تامل فلم کے ایک پروڈیوسر آئے تھے اور انھوں نے میرے والد سے کہا تھا کہ میں اپنی فلم میں ہیما کو ہیروئن لینا چاہتا ہوں، تب میرے پتا، میرے بابا نے یہ آفر ٹھکرا دیا۔ مگر میری ممی نے میرے پتا اور بابا سے کہا تھا کہ اگر ہیمو فلموں میں کام کرتی ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔

کئی دن کی بحث کے بعد گھر والے اس بات پر راضی ہو گئے کہ میں فلموں میں صرف کلاسیکل رقص کر سکتی ہوں، ایکٹنگ نہیں!
اور اس طرح میں تامل فلم "پانڈون پاس" میں راج نرتکی کے طور پر پردے پر پہلی بار پیش کی گئی۔ اسی فلم اور میرے رقص کی شہرت سے متاثر ہو کر بی۔ اننت سوامی ہمارے گھر آئے اور انھوں نے ہندی فلم میں مجھے ہیروئن بنانے کی پیش کش کی۔ پھر وہی مسئلہ سامنے آیا کہ میں فلموں میں کام کروں یا نہ کروں۔ پتاجی نے پھر منع کیا، لیکن اس بار میرے پاپا کو میری ممی کی ضد کے آگے جھکنا پڑا اور میری ممی نے بی۔ اننت سوامی کے پانچ سالہ معاہدے پر دستخط کر دیئے، کیونکہ میں نابالغ تھی۔

اصل میں یہیں سے میرے ہیروئن بننے کا قصہ شروع ہوا۔ میں اپنی ممی کے ساتھ بمبئی آ گئی۔ ٹھیک سے یاد نہیں لیکن جب بمبئی آئی تو اکتوبر ۱۹۶۲ء کا کوئی دن تھا۔ بی۔ اننت سوامی نے ہمارے رہنے کا انتظام باندرہ میں کر دیا تھا۔ یہیں مجھے معلوم ہوا کہ جس فلم میں میں کام کر رہی ہوں اس کے ہیرو مجھ سے تیس سال بڑے ہیں اور یہ ہیرو تھے راج کپور صاحب! اور تقریباً اسی عمر کے ڈائرکٹر سورگیہ مہیش کول تھے۔ مہیش کول صاحب ایک بہت بڑھیا انسان تھے۔ انھوں نے اپنی بیٹی سمجھ کر مجھے ایکٹنگ کی تعلیم دی۔ آج میں جس مقام پر پہنچی ہوں اس میں مہیش کول صاحب کی محنت کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اب سنئے وہ لمحات جو میرے دل و دماغ پر نقش ہیں۔

میں ممی کے ساتھ آر۔ کے اسٹوڈیو جا رہی ہوں۔ آج میری پہلی فلم "سپنوں کا سوداگر" کا مہورت ہے۔ بی۔ اننت سوامی نے دن بھی خوب چنا ہے آج میری سالگرہ ہے۔ میں تھوڑی گھبرائی ہوئی ہوں۔ راستے میں کار میں میری ماں مجھ سے کہتی ہے۔ "ہیمو گھبراؤ نہیں شروع شروع میں ایسا ہی ہوتا ہے۔" اور میں ممی سے کہتی ہوں۔ "ممی میں قطعی نہیں گھبرا رہی۔" میں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا جھوٹ ممی سے بولا۔ باتوں ہی باتوں میں آر۔ کے اسٹوڈیو آ گیا۔ بڑی بھیڑ ہے۔ کئی مشہور فلمی ہستیاں یہاں موجود ہیں۔ جیسے تیسے بھیڑ کو چیرتی ہوئی اندر سیٹ پر پہنچتی ہوں۔ میں سب سے پہلے مہیش کول صاحب کے پاؤں چھوتی ہوں۔ پھر راج کپور صاحب کے جیسے ہی پیر چھونے جاتی ہوں وہ مجھے پیر چھونے سے روکتے ہوئے گلے لگا کر کہتے ہیں۔ "تمہاری جگہ یہاں دل میں ہے۔" اور سیٹ پر اس دم گھوٹنے والے ماحول میں جیسے ایک ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد مہورت شاٹ لیا جاتا ہے خدا کا شکر ہے پہلا ہی شاٹ او کے ہو جاتا ہے۔ سب طرف سے مجھے مبارکبادیں دی جا رہی ہیں۔ ان مبارکبادوں میں میں اپنے دو بھائیوں آر کنام اور آر جگناتھن کی مبارکباد کو نہیں بھول سکتی۔ انھوں نے میرے کان میں کہا تھا۔ تم تو آج ہی سے ہندوستان کی مشہور اداکارہ ہو گئی ہو۔ دھیرے دھیرے فلم بنتی رہی۔ اس درمیان راج صاحب، جو فلم میں "سپنوں کے سوداگر" تھے، نے مجھے "ڈریم گرل" کے خطاب سے نواز دیا۔ میں ڈریم گرل بن گئی۔

فلم تقریباً مکمل ہے اور بمبئی شہر میں جگہ جگہ پوسٹر لگے ہیں۔ "ڈریم گرل ان ٹاؤن" "سپنوں کا سوداگر"۔ سچ کہہ رہی ہوں پوسٹروں اور ہورڈنگ پر اپنی شکل دیکھ دیکھ کر مجھے بے انتہا خوشی ہوتی تھی! انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور خدا خدا کر کے وہ دن بھی آ پہنچا جب مجھے فلم بینوں کی عدالت میں پیش ہونا پڑا۔

فلم کے ریلیز ہونے سے ایک دن پہلے کا واقعہ سناتی ہوں۔ النکار سنیما پر لگنے والا بہت بڑا بورڈ تیار ہو رہا تھا۔ اننت سوامی فلم کے پروڈیوسر نے مجھ سے کہا چلو چل کر بورڈ دیکھیں۔ جب میں نے بورڈ دیکھا اور راج صاحب کے ساتھ اپنی بڑی سی تصویر دیکھی تو میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک آئے۔

النکار سینما آج دلہن کی طرح سجا ہے۔ باہر فلم بینوں کی ایک بڑی تعداد میری ایک جھلک دیکھنے کو بیتاب ہے۔ میں پولیس والوں کی مدد سے سینما ہال میں داخل ہوتی ہوں۔ آج کا شو جسے فلمی زبان میں پریمیئر کہتے ہیں عام فلم بینوں کے لیے نہیں بلکہ خاص خاص لوگوں کے لیے ہے اس لیے باہر تماشائیوں کا بہت شور برپا ہے۔ وہ آوازے کس رہے ہیں۔ "ڈریم گرل! باہر آؤ۔" اور میں پروڈیوسر پی اننت سوامی کے کہنے پر پریمیئر کی رسم پوری کئے بغیر النکار سینما کے اس احاطہ میں آتی ہوں جہاں سے پبلک مجھے دیکھ سکے۔ پھر اپنے پیارے تماشائیوں سے اجازت لے کر اندر چلی جاتی ہوں۔ سینما ہال کے اندر بہت بڑا اسٹیج بنا ہوا ہے جہاں راج صاحب میرا تعارف ہال میں بیٹھے لوگوں سے کراتے ہیں۔ بعد میں پی اننت سوامی ڈائرکٹر مہیش کول اور آئے ہوئے خاص خاص مہمانوں کی تقریر ہوتی ہے۔ میرا پورا خاندان خوشی سے جھوم اٹھا ہے۔ اب پریمیئر ختم ہو چکا ہے۔ رات کے ایک ڈیڑھ بجے میں اپنے گھر لوٹتی ہوں۔ آپ کی اس ڈریم گرل کو ذرا بھی نیند نہیں آرہی ہے۔ میں اس سوچ میں ڈوبی ہوئی ہوں کہ فلم کامیاب ہوگی یا ناکام۔ دوسرے دن مجھے معلوم ہوتا ہے کہ دو ہفتے کے لیے میری فلم "سپنوں کا سوداگر" کے ٹکٹ بک ہو چکے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ فلم باکس آفس پر ہٹ ہو گئی ہے اور میں راتوں رات مشہور ایکٹریس بن گئی ہوں۔

لیکن بدقسمتی سے "سپنوں کا سوداگر" کے بعد میری دو تین فلمیں لگاتار فلاپ ہو گئیں اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ان ناکامیوں نے میری راتوں کی نیند حرام کر دی ایک بار تو میں نے ارادہ بھی کر لیا تھا کہ بمبئی چھوڑ کر واپس مدراس چلی جاؤں مگر میری ماں نے اس وقت میری ہمت بندھائی اور میرے حوصلے کو برقرار رکھا۔ ان ہی دنوں میری ملاقات فلمساز ہدایت کار رمن موہلا سے ہوئی جنھوں نے مجھے اپنی فلم "شرافت" میں دھرمیندر کے ساتھ پیش کیا۔ اتفاق سے یہ فلم باکس آفس پر بے انتہا کامیاب ثابت ہوئی اور ہر جگہ میری اور دھرم کی جوڑی کے چرچے ہونے لگے۔ "شرافت" کے بعد پرمود چکرورتی نے اپنی فلم "نیا زمانہ" میں ہم دونوں کو ایک ساتھ پیش کیا۔ اس فلم نے بھی کامیابی کے ریکارڈ قائم کئے اور یہ سمجھا جانے لگا کہ دھرم اور ہیما کی جوڑی فلم کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

اس فلم کی کامیابی سے متاثر ہو کر مجھے کئی فلمسازوں نے سائن کر لیا اور میں فلم انڈسٹری کی مصروف ترین اسٹار بن گئی۔ ان فلموں میں انداز، گورا اور کالا، لال پتھر، سیتا اور گیتا، شریف بدمعاش، چھپا رستم، جگنو، جوشیلا، جانی میرا نام، تیرے میرے سپنے، آنسو اور مسکان، وارث، راجہ جانی، بابل کی گلیاں، ہاتھ کی صفائی، گہری چال، دوست، پریم نگر، کسوٹی، امیر غریب، دُلہن، سنہرا سنسار، پتھر اور پائل، خوشبو وغیرہ شامل ہیں۔

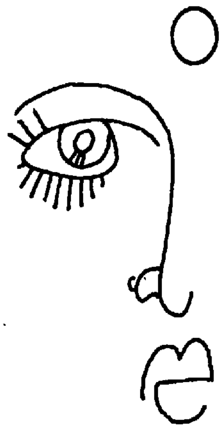
فلمیں ہی فلمیں، دولت ہی دولت، شہرت ہی شہرت مگر دل میں بے اطمینانی اور سکون کا فقدان، کئی طرح کی افواہوں نے دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ کبھی کسی ہیرو کے ساتھ میرے رومانس کی خبر اڑی تو کبھی کسی کے ساتھ۔ میرے بارے میں یہاں تک کہا جانے لگا کہ میں جو فلم سائن کرتی ہوں پہلے مجھے فلم کے ہیرو کو خوش کرنا پڑتا ہے۔ ہیرو کو خوش کرنے کا مطلب آپ اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے۔ یہ سب ایسی باتیں تھیں جو اس رنگ برنگی دنیا کے خلاف میرے دل میں نفرت پیدا کرتی تھیں مگر میں بے بس تھی۔ فلمی دنیا اور اس کے ناخداؤں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن چکی تھی۔

اس گھٹن اور بدنامی کے اندھیرے سے مجھے دھرمیندر نے نجات دلائی۔ میں دھرم کی ہمیشہ احسان مند رہوں گی کہ اس نے میرے فلمی کیریر کو ایک نیا موڑ دیا۔ اس کی دوستی کے بعد کسی نے بھی میری طرف انگلی اٹھانے کی ہمت نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ میری سب سے زیادہ فلمیں دھرم کے ساتھ ہیں۔

ان دنوں بھی میرے پاس کئی فلمیں ہیں جن میں آس پاس، آسمان، دیش پریمی، دلیو داس، دل کا ہیرا، دل لگی، سنتوش، دو دشائیں گردی کے دو ہاتھ، کرانتی، کرودھی، قدرت، پریم پجارن، میرا، پیا نگی امر کہانی، رضیہ سلطان، چانکیہ اور چندر گپت، راجپوت، سمراٹ دی برننگ ٹرین اور میری ذاتی فلم ایک دو تین چار۔ مگر میری زندگی میں دولت، شہرت اور ڈھیر ساری فلموں کے ہوتے ہوئے بھی سکون نہیں۔ آخر کیوں؟ اس کیوں کا جواب آپ کو معلوم ہی ہے۔ میرے اپنے ہی ایک مداح نے میری سب سے پیاری شئے میرے پتا کو مجھ سے چھین لیا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ مجھے اپنی شہرت کی اتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔

اس حادثہ نے میرے دل کو پژمردہ کر دیا ہے اور میں نے فلموں سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا — اور اب میں اپنے پتا کی آخری خواہش کے مطابق، ڈانسنگ سکول کھول کر ہندوستانی فنِ رقص کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔

(ادبی سے — شکریے کے ساتھ)



"آپ بیتی نمبر" کیلئے

شبھ کامنائیں
بندیا گوسوامی







بیگم اختر

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تیری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے

میں اپنی آپ بیتی میں جو کچھ لکھ رہی ہوں یا لکھوں گی وہ بے کم و کاست سچ ہے اور آئندہ بھی سچ کا دامن چھٹنے نہ پائے گا۔ میرے پرنانا ضلع فیض آباد کے ایک دیہات کے بسنے والے اور ذات کے برہمن تھے۔ ان کے کئی بچے ہوئے لیکن سب کے سب پیدا ہونے کی تھوڑی مدت کے اندر بہت کم سنی ہی میں مر جاتے تھے۔ چنانچہ میرے پرنانا اور پرنانی نے ایک تعزیے کے سامنے یہ منت مانی کہ اب اگر ہمارے کوئی اولاد ہوئی اور پانچ برس تک زندہ رہی تو ہم مسلمان ہو جائیں گے۔ یہ منت ماننے کے بعد ان کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا اور پانچ برس کا بھی ہو گیا تو یہ دونوں میاں بیوی مسلمان ہو گئے۔ لڑکے کا نام حسین بخش رکھ دیا گیا۔ اس لڑکے کے بعد ایک اور لڑکا پیدا ہوا جس کا نام امام بخش رکھا گیا۔ دو لڑکیاں بھی ہوئیں جن میں ایک کا نام حیدری اور دوسری کا نام مجراتن تجویز کیا گیا۔ حسین بخش کی آواز اچھی تھی کسی نے مشورہ دیا کہ باقاعدہ موسیقی کی تعلیم حاصل کر لو۔ انھوں نے اتر پردیش سے نکل کر مدھیہ پردیش میں کسی استاد کے شاگرد ہو گئے اور بعد میں خود استاد بن گئے ان کے کئی شاگرد ہوئے ہیں۔ معاش کا سلسلہ بھی خاصا اچھا رہا پھر انھوں نے اپنے بھائی اور دونوں بہنوں کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ بہنیں چھپ چھپ کر ریاض کرتی تھیں کیونکہ انھیں حسین بخش نے منع کر رکھا تھا مگر ایک دن جب یہ راز فاش ہوا تو بھائی نے انھیں بھی موسیقی کی تعلیم دینا شروع کر دی۔ مقامی تعلقدار کی مخصوص محفلوں میں یہ بھائی بہن گانے لگے۔ ان دنوں فیض آباد میں ایک قوال تھے جن کا نام تھا خیر اللہ۔ انھوں نے حیدری سے شادی کر لی۔ ان سے جو لڑکی ہوئی اس کا نام مشتری رکھا گیا۔ یہ میری ماں تھیں۔ ان سے ہم دو لڑکیاں پیدا ہوئیں ایک کا تین سال کی عمر میں انتقال ہو گیا دوسری میں یعنی اختری۔

گھر پر قرآن مجید اور اردو پڑھی بعد میں ایک اسکول میں نام لکھا دیا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد اسکول جانا ترک کر دیا لیکن گھر ہی پر رفتہ رفتہ ابتدائی درجات تک انگریزی بھی سیکھ لی۔ اردو سے دلچسپی شروع سے ہی رہی اور ماحول بھی ادبی ملتا رہا۔ بچپن ہی سے مجھے موسیقی کی تعلیم دی جانے لگی۔ استاد امداد خاں میرے پہلے استاد تھے۔ لیکن جب ان استاد نے مجھے شروع ہی میں ایک مشکل راگ سے تعلیم کی ابتداء کی تو میں گانے سے فطری رغبت رکھنے کے باوجود گھبرا گئی۔ اسی اثنا میں جب کہ میں نو دس برس کی تھی ایک رات ہمارے گھر میں آگ لگ گئی۔ بعد میں پتہ چلا کہ محلے ہی کے کچھ لوگوں نے جنھیں میری والدہ سے خدا واسطے کا بیر ہو گیا تھا، آگ لگا دی تھی۔ میری ماں اس آتش زنی کے واقعہ سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ انھوں نے ترکِ سکونت ہی میں عافیت جانی اور فیض آباد سے گیا (بہار) چلی آئیں۔ مگر محرم منانے کے لیئے پورا گھر فیض آباد آ جایا کرتا تھا۔

کچھ عرصے تک استاد غلام محمد خان سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی لیکن بعد میں میری والدہ نے پٹیالہ والے استاد عطا محمد خان (جن کا تعلق تان رس خان کے گھرانے سے تھا) باقاعدہ تعلیم دینے پر رضامند کر لیا۔ میری آواز سدھارنے میں استاد عطا کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ والدہ نے گیا (بہار) کی بھی سکونت ترک کر دی۔ اور سب کو ساتھ لیکر کلکتہ چلی آئیں۔ استاد عطا محمد خان لائیٹ کلاسیکل میوزک 'ٹھمری' دادرا اور غزل وغیرہ بدستور سکھاتے رہے۔

میں نے سب سے پہلے موسیقی کی جس محفل میں اپنا فن پیش کیا وہ اپنی طرز کا ایک انوکھا واقعہ تھا۔ پہلی دفعہ جب میں اسٹیج پر آئی تو بہار میں زلزلہ آیا تھا۔ یہ ۱۹۳۵ء یا ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ یہ زلزلہ بڑا بھیانک تھا۔ سارے ملک میں تہلکہ مچ گیا تھا۔ بہت تباہی پھیلی تھی۔ دراصل بہار

ریلیف فنڈ کے لئے کلکتہ میں ایک پروگرام منعقد کیا گیا۔ اس پروگرام میں شرکت کے لئے کلکتہ کے تمام بڑے فنکاروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ لیکن غالباً چیریٹی پروگرام ہونے اور معاوضہ نہ ملنے کے سبب کوئی آرٹسٹ نہیں آیا۔ آن گئی ساری مصیبت میرے سر آ پڑی۔ تمام ٹکٹ فروخت ہو چکے تھے۔ سامعین آ چکے تھے لیکن فنکار لاپتہ تھے۔ آخر میں منتظمین نے فیصلہ کیا کہ تنہا ہم اسٹیج پر جائیں۔ میں اس سے قبل کبھی اسٹیج پر نہیں گئی تھی۔ یہ سنکر تو میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں بتا نہیں سکتی کہ اس وقت میری کیا کیفیت تھی۔ میں رونے لگی۔ لیکن اسٹیج پر جانا ہی تھا۔ اُستاد عطا محمد نے حوصلہ افزائی کی اور کہا۔ "اللہ کا نام لیکر شروع ہو جاؤ۔" اس طرح اسٹیج پر پہلی مرتبہ آنے کے باوجود مسلسل ڈھائی گھنٹے تک سامعین مجھے سنتے رہے اور داد دیتے رہے۔ پہلی غزل جو میں نے سنائی اس کا مطلع ہے ؎

تو نے بُت ہرجائی کچھ ایسی ادا پائی
تکتا ہے تیری صورت ہر ایک تماشائی

میگا فون ریکارڈنگ کمپنی نے میرے کئی گانے ریکارڈ کیے۔ میری شہرت فلمی دنیا میں بھی پہنچ گئی۔ مدعو کیا گیا۔ اور ۱۹۳۶ء میں میں نے اس دُنیا میں داخل ہو کر متعدد فلمیں مثلاً ایک دن کی بادشاہت، ممتاز اور روپی وغیرہ میں خود کام کیا اور کئی فلموں مثلاً دل دمینتی، احسان، ناگ رنگ وغیرہ میں بیک گراؤنڈ میوزک دی۔ بہت بعد میں سینہ جیت رے کی بنگلہ فلم "جلسہ گھر" میں بھی کام کیا۔ بہرحال فلمی دُنیا سے میرا تعلق زیادہ دن تک نہ رہا۔ اسکے بعد میں نے کیرانہ گھرانے کے اُستاد عبدالکریم خاں کے بھائی اُستاد عبدالوحید خاں سے پکے گانے (دھرپد، خیال وغیرہ) کی تعلیم بھی حاصل کی۔ یہ تعلیم میرے بہت کام آئی لیکن میرا رجحان بہ دستور ہلکے شاستریہ سنگیت (لائٹ کلاسیکل میوزک) ہی کی طرف رہا اور اسی میں میرا نام بھی ہوا۔ مختلف ریڈیو اسٹیشنوں پر مختلف طرزوں میں گانے گائے اور ان لوگوں نے اپنے یہاں ان ٹیپوں کو محفوظ بھی رکھا اور بار بار بجاتے بھی رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ تقریباً چار سو گانے گراموفون کمپنیاں ریکارڈ کر چکی ہیں۔

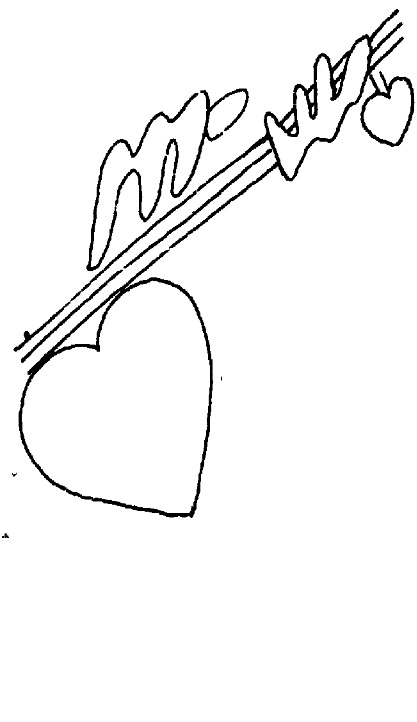
فلمی دنیا ترک کرنے کے بعد میں نے کچھ مدت تک رامپور میں قیام کیا اور پھر وہاں سے آکر غالباً ۱۹۳۵ء میں لکھنؤ میں مستقل طور پر مقیم ہو گئی۔ ۱۹۴۲ء میں ضلع لکھنؤ کے ایک ممتاز خاندان کے ایک ممتاز فرد قاضی اشتیاق احمد عباسی بیرسٹرایٹ لا سے شادی کر لی۔ یہ شادی بھی ایک اتفاقیہ بات ہے۔ ایک دن اشتیاق صاحب اُن کے ایک دوست کے گھر ملے، باتوں باتوں میں اُنھوں نے کہا کہ "آپ شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

میں نے کہا۔ "ہم تو آپ ہی سے شادی کریں گے۔"

یہ بات مذاق سمجھی گئی۔ لیکن اس بارے میں میں سنجیدہ تھی۔ کچھ دن بعد ہماری شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد اپنے شوہر کی خاندانی روایات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے میں نے سنگیت کی محفلوں اور ریکارڈنگ سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ پھر کچھ ہی زمانے کے بعد میرے شوہر کی اجازت سے مجھے ریڈیو اسٹیشن نے براڈکاسٹ کرنے کے لئے آمادہ کر لیا اور پھر اپنے مداحوں کے اصرار سے مجبور ہو کر اپنے شوہر کی اجازت سے سنگیت محفلوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ آزادیٔ ہند کے بعد میں نے حکومت ہند کے سرکاری وفود کے ایک رکن یا غیر سرکاری وفود کے رکن کی حیثیت سے پاکستان، افغانستان، روس، مشرقی یورپ اور نیپال کا دورہ کیا۔ افغانستان اور ازبکستان میں میں نے اُردو غزلوں کے علاوہ فارسی غزلیں گا کر حاضرین سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ میرے ذہن پر مذہب کا اثر بہت زیادہ رہا ہے۔ تین حج کر چکی ہوں۔ پہلا حج ۱۹۶۱ء میں کیا تو نماز روزے میں بڑی شدت پیدا ہو گئی خود بھی پنج وقتہ نماز اور قرآن پڑھا کرتی اور گھر بھر کو بھی ترغیب دیتی۔ گھر میں پہلی محرم سے تیجے تک

ایک کمرہ امام باڑے کے طور پر الگ ہوتا ہے۔ اس میں کثرت سے چاندی کے علَم ہیں۔ لیکن میں مذہب کے معاملے میں بڑی فراخ دل واقع ہوئی ہوں۔ میں ہر ایک مذہب کا احترام کرتی ہوں۔ ہر مذہب کے ماننے والوں سے یکساں سلوک کرتی ہوں۔ میرے شاگردوں میں ایک دو کو چھوڑ کر سبھی غیر مسلم ہیں۔ سبھی مجھے ماں سمجھتی ہیں۔ اور میں بھی سب کو اپنی بیٹیاں۔ اللہ نے مجھے دولت، شہرت، عزت سب کچھ دی لیکن اولاد سے محروم رکھا۔ میں نے اس کمی کو اس طرح پورا کیا کہ عباس صاحب کی بھانجی (عطیہ بانو شمع) کو اپنی بیٹی بنا لیا اور رشتے کی ایک بہن شمیم بانو کے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح پالا۔ یہ سب کے سب مجھے امّی کہتے ہیں۔ اور مجھے سچ پوچھیے تو امّی کہلانے کا شوق ہے۔ سو اب یہ کمی بھی پوری ہو گئی ہے۔ ہندوستانی موسیقی کی ماہر فنکار کی حیثیت مجھے سنگیت ناٹک اکاڈیمی نے ایوارڈ دیا۔ اور حکومت ہند نے پدم شری کے اعزاز سے نوازا۔

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے

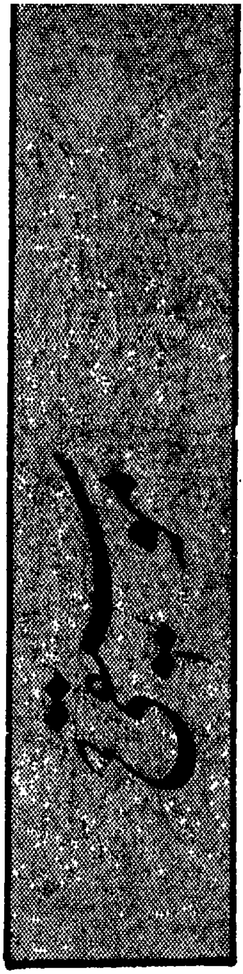


چلنا ہے چل پڑو نکل آئیں گے راستے
آندھی کسی کے نقشِ قدم دیکھتی نہیں

"فن اور شخصیت" کی مسلسل
پیشقدمی پر

نیک خواہشات کے ساتھ

راج کھوسلہ







جے دیو

"..... ... میری کامیابی میں ساحر کا جو حصّہ ہے۔ میں اُس سے مُنکر نہیں ہوں جبکہ میری ناکامیوں کا ذمہ دار بھی وہی ہے۔ لیکن باوجود ان ساری باتوں کے مجھے ساحر سے آج بھی وہی لگاؤ ہے۔ وہی پیار ہے۔ جو جگراؤں والے پُل پر گذرنے والی شاموں میں تھا............"

جسے لوگ کہتے ہیں زندگی وہ تو حادثوں کا ہجوم ہے
یہ تو کہئے میرا ہی کام تھا کہ میں درمیاں سے گزر گیا
یہ میرا کمال گناہ سہی مگر اس کو دیکھ میرے خدا..!
تو نے روکا مجھ کو جہاں جہاں میں وہاں وہاں سے گذر گیا

جس وقت میں اپنے عزیز دوست صابر دت کی تحریک پر "فن اور شخصیت" کے آپ بیتی نمبر کے لئے اپنی یہ آپ بیتی تحریر کر رہا ہوں۔ زندگی کے سفر کی ساٹھ منزلیں طے کر چکا ہوں۔

ساٹھ منزلیں ۔ ساٹھ برس ۔ جو ہزار ہا یادوں ۔ ہزار ہا باتوں اور بے شمار غم و خوشی کے لمحات و حادثات کا ہجوم ہیں۔

وہ ۳ اگست ۱۹۱۸ء کا دن تھا جب میں نے نیروبی (افریقہ) میں آنکھ کھولی۔ میرے پتا جی لالہ ملک راج افریقی ریلوے میں ملازم تھے بڑے بھائی رام دیو تھے۔ ان کے بعد میں تھا جے دیو۔ میرے بعد ایک چھوٹی بہن اور دو چھوٹے بھائی تھے دھرم دیو، ست دیو۔ میری عمر چھ سال کی ہوگی۔ جب میں نے ٹانگانیکا میں پہلی بار ہارمونیم دیکھا۔ لیکن بجانا نصیب نہیں ہوا۔ میرے پتا جی کے ایک دوست نے ان ہی دنوں مجھے ایک ماؤتھ آرگن تحفے میں دیا اور مجھے آج بھی یاد ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں آنے والے اس پہلے ساز پر بڑی جلد ہی ملکہ حاصل کر لیا تھا اور اُس پر افریقی دھنیں بجانے لگا تھا۔

افریقہ میں یوں تو تعلیم کا بندوبست ممکن تھا۔ لیکن پتا جی اور ماتا جی مطمئن نہیں تھے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اور میرے بڑے بھائی رام دیو کو اپنے حقیقی وطن لدھیانہ میں ماؤسی کے پاس چھوڑ دیا جائے جن کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں جب میری عمر ۹ سال تھی مجھے اور میرے بڑے بھائی کو لدھیانہ میں چھوڑ دیا گیا۔ جہاں میرا داخلہ دوسری جماعت میں ہوا۔ وہ ایک آریہ سماجی اسکول تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں آریا سماجی مندر میں صرف اس لئے جایا کرتا تھا کہ وہاں بڑے اچھے اچھے بھجن سنائے جاتے تھے اور مجھے بڑا لطف آتا تھا۔ اس لگاؤ کی وجہ دراصل میری ماتا جی تھیں جو اکثر لوک کہانیاں اور رامائن گا کر بڑے ہی پُر کیف انداز میں سنایا کرتی تھیں۔

اسکول کے دور میں پہلی بار جل ترنگ بجانے کا موقع ملا۔ یہ غالباً ۳۲-۱۹۳۱ء کی بات ہے جب میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اور اگر آپ اسے مبالغہ آرائی سے تعبیر نہ کریں تو میں ہر مقابلہ میں اوّل انعام لیا کرتا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں ماتا جی کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور پھر ۱۹۳۲ء میں وہ واقعہ پیش آیا جس نے میری زندگی کا محور ہی بدل دیا۔ ہوا یہ کہ میرے انکل مجھے لاہور لے گئے جہاں پہلی بار میں بولتی فلم "علی بابا چالیس چور" دیکھی۔ اس فلم کے ساتھ اداکارہ کجن کا ایک پکچرائزڈ گیت بھی تھا۔ "یہ بجلی دکھ کی گرتی ہے سدا اونچے میناروں پر" اس گیت نے نہ صرف یہ کہ تڑپایا بلکہ دل میں اداکار بننے کا شوق بھی جگا دیا۔

آخر ۱۹۳۲ء میں کتابیں پھینک پھانک کر جیب میں ۳۰ روپے لئے۔ میں اپنے ایک دوست پریم سود کے ساتھ بمبئی کے لئے

نکل پڑا۔ ہم دونوں کے پاس کوئی ساز و سامان نہ تھا۔ صرف بدن پر کپڑے تھے اور پاؤں میں نئی جوتی۔ دہلی اسٹیشن پر اچانک پھوپھا صاحب ٹکرا گئے جو وہاں ہیڈ ٹکٹ کلکٹر تھے۔ انھوں نے ہمیں دیکھتے ہی تاڑ لیا کہ ہم ضرور گھر سے بھاگے ہوئے ہیں۔ [illegible] بھی کان کھڑے ہو گئے لیکن وہ مجھے پہچان نہیں پائے اور میں نے انھیں یہ کہہ کر بے وقوف بنا دیا کہ ہم اپنے بڑے بھائی سے ملنے بمبئی جا رہے ہیں۔ بات بن گئی اور جان چھوٹی۔

جس ڈبے میں ہم سفر کر رہے تھے اس میں ایک ہمدرد قسم کے سردار جی بھی تھے۔ باتوں باتوں میں پوچھ بیٹھے۔ بمبئی میں کہاں جانا ہے؟ سوال تو چکرا گیا پر میں نے برجستہ کہہ دیا "گرگام روڈ"۔ دراصل اس زمانے میں ایک فلمی پرچہ "فلمکار" آیا کرتا تھا اور اس میں اکثر اداکاروں کے پتے ہوا کرتے تھے۔ جن میں گرگام روڈ کا تذکرہ ہوتا تھا۔ بمبئی سنٹرل پر اترے تو سردار جی نے ہمدردی جتاتے ہوئے ہمیں ساتھ لیا اور گرگام روڈ پر چھوڑ گئے۔ چلتے چلتے ہم دونوں امپیریل فلم کمپنی کے دروازے پر پہونچ گئے۔ ان دنوں اسی جگہ جیوتی اسٹوڈیو ہے۔ امپیریل کمپنی کی بڑی شہرت تھی۔ ہم نے اسی کے آگے ڈیرہ ڈال دیا۔

مجھے سلوچنا کو دیکھنے کی بڑی آرزو تھی اور خیال تھا کہ جب وہ ہمیں دیکھے گی تو فوراً اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر گھر لے جائے گی اور ہم ایکٹر بن جائیں گے۔ اس زمانے میں اکثر وہی ایکٹر ہوا کرتے تھے جو گانا بھی جانتے ہوں۔ پلے بیک اس زمانے میں شروع نہیں ہوا تھا۔ سلوچنا، جال مرچنٹ، اڈی بلی موریا وغیرہ سب اپنے گانے خود گاتے تھے اور ہم گانا تو اس قدر خوب گاتے تھے کہ شہر بھر میں مشہور ہو چکے تھے لیکن جب سلوچنا سامنے آتی تو کچھ بھی نہ ہوا۔ اس کی گاڑی زن سے گزر گئی۔ ہم بڑے پریشان ہوئے۔ کھانا پینا تو ویسے آنے آنے دو دو آنے کی بات تھی لیکن جیب میں اب صرف تین روپے بچے تھے اور دماغ پر یہ خوف سوار ہو چکا تھا کہ اگر یہ بھی گئے تو کیا ہوگا؟

آخر ہم نے اداکار ماسٹر ہادی کو گھیر لیا۔ ساری داستان درد دل سنائی۔ وہ بڑے عمدہ آدمی تھے۔ یو پی کے رہنے والے تھے۔ وہ ہمیں اپنے ساتھ اپنے گھر ناگپاڑہ لے گئے۔ سونے کا بندوبست کیا اور سویرے کی چائے بھی پلائی۔ اور پھر بڑے خلوص سے سمجھایا کہ فلم لائن ٹیڑھی کھیر ہے۔ یہاں دال گلنا آسان نہیں۔ اچھے اچھوں کو دانتوں پسینہ آ جاتا ہے اس لئے واپس چلے جاؤ۔ بوریا بستر سمیٹ لو۔" شاید اس لئے نہیں کہا کہ وہ بھاگی کہاں؟ لیکن ہم اتنی جلدی ہار ماننے والے کہاں تھے؟ ڈٹے رہے لیکن تیسرے ہی دن حالت خراب ہو گئی۔ کپڑے میلے کچیلے۔ چہرے پر ہوائیاں اور ادھر نئی جوتی نے کاٹ کاٹ کر پیروں کا ستیاناس مار دیا۔ سوچ میں پڑ گئے کہ کیا کریں؟

مجھے پتہ تھا کہ پتا جی افریقہ سے آنے والے ہیں اور خطوط میں اکثر مسز لال دیوی کا تذکرہ ہوا کرتا تھا جو جی پی او کے قریب کہیں رہتی تھیں۔ ان کے شوہر اس زمانے میں غیر ممالک جانے والوں کے ایجنٹ ہوا کرتے تھے اور اپنے شوہر کی موت کے بعد یہ کام خود مسز لال دیوی نے سنبھال لیا تھا۔ مسز لال دیوی بڑے طمطراق کی عورت تھیں۔ ہم ان سے ملے۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں باو ملک راج کا لڑکا ہوں۔ چونک پڑیں۔ انھیں یقین نہیں آیا۔ شاید میری حالت انھیں اس امر پر یقین کرنے سے روک رہی تھی۔ بہر حال انھوں نے اتنا ضرور کہا کہ "کل جہاز آ رہا ہے۔ ۱۵ نمبر اندرا ڈاک تم پہونچ جاؤ اور اپنے پتا جی سے مل لو۔" میں اپنے بارے میں چاہتے ہوئے بھی کچھ کہہ نہ پایا۔ ہم چلے آئے۔

دوسرے دن کسی طرح سے گھستے گھساتے میں ڈاک کے اندر پہونچ گیا۔ پتا جی اترے۔ لیکن سامنے جانے کی ہمت نہ ہوئی۔

دور ہی سے ہنستے کہا۔ وہ ٹال گئے، پہچان نہیں پائے۔ شاید ہماری حالت کچھ اتنی ہی زیادہ خراب ہوگئی تھی۔ ؟ اتنے میں لال دیوی آگئیں انھوں نے پوچھا" اپنے پتاجی سے ملے!" ؟ میں نے کہا "جی ہیں" نے ہنستے کہا، لیکن انھوں نے نہیں پہچانا" مسز لال دیوی نے پتاجی سے کہا "مسٹر لال، تمہارا بیٹا یہیں ہے ملو گے۔" ؟ وہ چونکے تو مسز لال دیوی نے مجھے آگے کر دیا۔

پتاجی نے غور سے دیکھا، پہچان گئے۔ تڑپ اُٹھے اور میری حالت دیکھ کر اس قدر بے ساختہ رونے کہ میں بھی ان سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ پتاجی کو لگا کہ دراصل ماتاجی کی ناگہانی موت نے ہم بچوں کی زندگی تباہ کر دی ہے۔ میں نے پتاجی کی مزید ہمدردی حاصل کرنے کے لئے گھر والوں کی الٹی سیدھی شکایتیں کر دیں تاکہ میرا جرم یا میری غلطی ڈھک جائے۔ پتاجی نے ہمارے سارے چھوٹے موٹے قرضے چکانے، دامن اور دوسرے سوٹ دلائے۔ لیکن نئی جوتی سے کاٹنے نے رنگ دکھایا، میری طبیعت خراب ہوگئی اور پتاجی کو تین چار دن رُکنا پڑا۔ انھوں نے گھر والوں کو اسی دوران میرے ملنے کی اطلاع دیدی تھی۔ میں نے کرنے کو تو گھر والوں کی الٹی سیدھی شکایتیں کر دی تھیں لیکن جانتا تھا کہ پول کھلنے پر وہ پڑے گی کہ چودہ طبق روشن ہو جائیں گے اس لئے پتاجی سے کہہ دیا کہ اگر کسی نے میری ایسی ویسی کی تو میں ٹرین کے نیچے لیٹ جاؤں گا۔ پتاجی نے وعدہ کیا کہ کوئی کچھ نہیں کہے گا۔

لیکن اس کے بعد میں نے کسی کو چین نہیں لینے دیا۔ بس یہی ضد کہ بمبئی جائیں گے۔ انہی دنوں میرے ایک دوست کیلاش سیٹھا کے مالک دیوکشن نے اداکارہ آرمیلن سے، جو بھگوتی پرشاد مصرا کی بیوی تھی اور جس نے پرتھوی راج جی جیسے اداکار کو منتخب کروایا تھا، شادی رچالی اور اُسے لدھیانہ لے آئے۔ میں ان دنوں باقاعدہ موسیقی سیکھ رہا تھا اور میرے پہلے گرو پروفیسر برکت رائے جی تھے۔ آرمیلن بھی انہی سے موسیقی کا درس لینے لگی اور یوں ہم ایک دوسرے سے متعارف ہوگئے۔ دیوکشن اور آرمیلن کی شادی زیادہ دن نہ چلی۔ چار ماہ کے اندر ہی ان میں علیحدگی ہوگئی اور آرمیلن واپس چلی گئی۔

ہماری بمبئی جانے کی ضد برابر جاری تھی۔ پتاجی چونکہ علم جوتش پر اچھی خاصی دسترس رکھتے تھے اس لئے انھوں نے حساب کتاب جوڑا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ مجھے روکنا محال ہے اس لئے مجھے میرے حال پر چھوڑ دینا ہی بہتر ہوگا۔

آخر ۱۹۳۳ء میں میں پھر بمبئی پہونچا۔ آرمیلن نے واقعی بڑا تعاون کیا اور مجھے کئی لوگوں سے متعارف کروایا۔ آرمیلن کی ایک فلم تھی جس کے ڈائرکٹر اے ایم ساقی تھے جنھیں ہم سب ساقی سیٹھ کہتے تھے۔ میں نے آرمیلن کے کہنے پر ساقی سیٹھ کو گانا سنایا۔ انھیں بے حد پسند آیا اور میں ساقی سیٹھ کے گروپ میں شامل ہوگیا۔ ———— اس وقت میری عمر ۱۵ سال تھی۔ اس گروپ میں فوٹوگرافر بدری پرشاد بھی تھے جن سے میرے گہرے دوستانہ تعلقات ہوگئے۔ بدری پرساد اور میرے ایک دوست سیالی آتش نے میرے لئے بڑی کوششیں کیں۔ مجھے جے بی ایس واڈیا سے ملایا۔ جو ان دنوں "لال یمن" بنا رہے تھے۔ ان کا اسٹوڈیو وہی تھا جو آج کل راج کمل ہے۔ دراصل یہ اسٹوڈیو پہلے کسی شپنگ بزنس کرنے والے واڈیا فیملی کی ملکیت تھا اور اُن سے جے بی ایس واڈیا نے لے لیا تھا۔

واڈیا موویٹون کی تیسری فلم "وامن اوتار" ان دنوں شروع ہونے جا رہی تھی۔ جے بی ایس واڈیا نے مجھے "وامن اوتار" میں نارد منی کے کردار کے لئے منتخب کرلیا۔ یہ ۳۴-۱۹۳۳ء کی بات ہوگی۔ ان دنوں بڑی سے بڑی فلم تین ماہ میں بن جایا کرتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا

جب پرتھوی راج جی، بے راج جی، ماسٹر وٹھل، زبیدہ، سلوچنا، بیتا دیوی اور جال مرچنٹ وغیرہ ٹاپ پر تھے۔ ایک اور ہیرو ہوا کرتا تھا۔ فیروز دستور جو میرا ہی عمر کا تھا۔ بے حد خوبصورت اور پُرکشش۔

اس دور میں یہاں دو گروپ تھے۔ ایک اعلیٰ معیار کی فلمیں بناتا تھا اور دوسرا اسٹنٹ فلمیں۔ اسٹنٹ فلموں کا دور "دیر بھارت" سے شروع ہوا۔ "دیر بھارت" میں میں نے سائیڈ رول کیا۔ اس کے بعد "ہنٹر والی" بنی۔ جس میں ناڈیا کو متعارف کروایا گیا اور وہ اسٹنٹ کوئین کہلائی۔ اس کے بعد تو پھر ایسی فلموں کا ریلا سا آ گیا۔ میں نے "کالا گلاب" "فرنٹیئر میل" اور "جوشِ وطن" میں کام کیا۔ جو ایک بڑی فلم تھی۔ لیکن اس کے باوجود میں عجیب سی الجھن محسوس کرتا تھا۔ فلمیں ویسی نہیں بن رہی تھیں جیسی میں چاہتا تھا۔ میں اکثر انگریزی فلمیں دیکھتا تھا اور ان کی حقیقت نگاری مجھے بہت متاثر کرتی تھی۔ دھیرے دھیرے میں یہ محسوس کرنے لگا کہ یہ وہ سحر نہیں ہے جس کا مجھے انتظار تھا۔

۱۹۳۶ء میں، میں نے اس بات پر آواز بلند کی کہ فیروز دستور کو ۵۰۰ روپے مہینے ملتے ہیں اور مجھے صرف ۵۰ روپے۔ آخر یہ کہاں کا انصاف ہے؟ میری بغاوت واڈیا مووی ٹون کو پسند نہیں آئی اور نتیجہ میں میں نے اور میرے ساتھی منچی ٹھوکلی نے واڈیا مووی ٹون چھوڑ دیا۔ لیکن بڑی سخت پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ طبیعت میں جو آزاد پسندی تھی اس نے اس میں مزید اضافہ کیا۔ اس دوران میں مسز لال دیوی کا گھر چھوڑ چکا تھا اور لال باغ میں ۱۳ روپے مہینے پر ایک کمرہ لے لیا تھا۔

میں کوشاں تھا کہ کسی دوسری فلم کمپنی میں قدم جم جائیں کہ لدھیانہ سے خبر ملی کہ انکل چل بسے ہیں اور سب پریشان ہیں۔ میں لدھیانہ پہونچ گیا۔ پتا جی افریقہ سے آئے۔ چند روز گزرے۔ پھر بمبئی یاد آنے لگی۔ آخر ۱۹۳۸ء میں پھر بمبئی پہونچا۔

اس بار اداکاری کے بجائے ہدایت کاری سے شروعات ہوئی۔ ساقی سیٹھ کے دوست عیسیٰ سیٹھ کی ہدایات میں ایک فلم بن رہی تھی "تھنڈر" میں نے انھیں بطور معاون جوائن کر لیا۔ لیکن یہ فلم چل نہیں پائی۔ میں نے موہن اسٹوڈیو جوائن کر لیا۔ پھر اداکاری۔ "جادوئی کنگن" میں سائیڈ رول کیا اور یہیں مجھے امیر بائی کرناٹکی اور موسیقار بھگت رام جی سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ کچھ نئی باتیں سیکھیں کچھ نئی باتیں جانیں۔

لیکن ۱۹۴۰ء میں پھر حالات نے کروٹ لی۔ میرے قدم پھر اکھڑ گئے۔ واڈیا مووی ٹون شباب پر تھا لیکن میں وہاں دوبارہ جانے کے حق میں نہیں تھا۔ بڑی زبردست گروپ بندیاں تھیں۔ صورتحال یہ تھی کہ اگر کوئی کسی کمپنی سے علٰحدہ ہو جاتا یا علٰحدہ کر دیا جاتا تو دوسری کوئی بھی کمپنی اُسے کام نہیں دیتی تھی۔ یہ آپسی ملی بھگت کا چکر تھا۔ یا اجارہ داری قائم رکھنے کا ایک بہترین طریقہ۔

اُدھر لدھیانہ میں بھی حالات یکسر بدل چکے تھے۔ آپسی مقدمے بازیاں شروع ہو چکی تھیں۔ پتا جی افریقہ سے لوٹ آئے تھے۔ آخر میں واپس لدھیانہ چلا گیا۔ پتا جی کو ہر روز اخبار پڑھنے کا شوق تھا۔ آنکھیں چونکہ کمزور ہو چکی تھیں اس لئے وہ مجھ سے یا میرے چھوٹے بھائی سے اخبار سنا کرتے تھے۔ اس زمانے میں "ٹریبون" "پرتاپ" اور "ملاپ" آتے تھے اور انھیں پہلی خبر سے آخری خبر تک سنانا ہوتا تھا۔ پتا جی اس دوران گاہے گاہے تلفظ اور قواعد کی غلطیاں درست کرتے جاتے۔ سمجھاتے۔ یہ دور کوئی دو سال جاری رہا۔ جو دراصل میری حقیقی تعلیم کا دور ہے۔

میں چونکہ فلم ایکٹر تھا اس لئے لدھیانہ میں میری بڑی شہرت تھی۔ مجھے یاد ہے کہ اداکاری کے زمانے میں جب ایک بار میں تین دن کے لئے لدھیانہ آیا تھا تو اسکولوں سے طالبعلم غائب ہو گئے تھے اور مجھے دیکھنے کے لئے ٹوٹے پڑے تھے۔ ان میں میرے دوست ساحر لدھیانوی بھی تھے۔ یہ بات ساحر نے مجھے کئی سال بعد خود بتائی تھی۔ کہاں، وہ دن تھے اور کہاں یہ کہ حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے ایک کنڈر گارڈن ٹائپ کے اسکول میں ۵۰ روپے ماہوار پر ملازمت کر لی۔ یہاں مجھے موسیقی اور ہندی کا درس دینا ہوتا تھا۔ یہاں ایک عرشی صاحب تھے جن کی معرفت مجھے یہ ملازمت ملی تھی۔

اس اسکول میں ریڈرز ڈائجسٹ کی تین کاپیاں آیا کرتی تھیں۔ عرشی صاحب نے مجھے اس کی طرف متوجہ کیا۔ اور جب پتاجی نے مجھے ریڈرز ڈائجسٹ پڑھوایا تو مزہ آگیا۔ اس روز سے آج تک میں ریڈرز ڈائجسٹ کا پابندی سے مطالعہ کرتا ہوں۔

میں نے زندگی میں دو چوریاں کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک بار انکل کی جیب سے ایک روپیہ چرایا تھا جسے بڑی مشکل سے خرچ کر پایا۔ اور دوسری یہ کہ ریڈرز ڈائجسٹ کی ایک کاپی اکثر چرا کر ہی لے جاتا۔ اس زمانے میں یہ جریدہ کیا بہی نہیں نایاب بھی تھا۔

۱۹۴۲ء میں ایک اور صدمہ یہ پہونچا کہ پتاجی چل بسے ۱۹۴۳ء کی جنوری میں میں نے چھوٹی بہن کی شادی کر دی۔ ان ہی دنوں ست دیو نے ایئر فورس جوائن کر لیا۔ اب میرے ساتھ صرف دھرم دیو رہ گیا۔ اور میں خود کو اکیلا اکیلا سا محسوس کرنے لگا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ساحر لدھیانہ میں مقبول ہو چکے تھے۔ ایک اور شاعر تھا اتم پرکاش جو پنجابی میں کلام کہتا تھا اور دونوں کے بڑے چرچے تھے۔ یہیں ساحر، حمید اختر (امروز لاہور کے ایڈیٹر) اور میں اکثر جگراؤں کے پل پر محفلیں سجاتے۔ میں چونکہ گھر میں سگریٹ نہیں پی سکتا تھا اس لئے یہیں بیٹھ کر دھوئیں کے کش اڑاتا۔ ان ملاقاتوں میں ہم نے ایک دوسرے کو بہت قریب سے جانا اور یہیں ساحر اور میں ایک دوسرے کے فین ہو گئے۔ میں نے لدھیانہ کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے موسیقی بھی سکھائی ہے۔ ۱۹۴۴ء ساری دنیا کے لئے زبردست معاشی بحران کا سال تھا۔ ساری دنیا میں یہیں سے مہنگائی اور قلت کا دور شروع ہوا۔ یہ جنگ کا زمانہ تھا اور میرے اندر بھی ایک جنگ جاری تھی۔ میں فنِ موسیقی پر عبور حاصل کرنا چاہتا تھا۔

ان دنوں الموڑہ میں "اودے شنکر انڈیا کلچر سینٹر" قائم تھا۔ جہاں پنڈت روی شنکر، استاد علی اکبر اور استاد علاؤالدین خان جیسے ماہرِ فن درس دیا کرتے تھے۔ مجھے لگن تھی کہ میں وہاں کچھ عرصہ گزاروں اور کمالِ فن حاصل کروں۔ میں الموڑہ پہونچا۔ لیکن سینٹر کے منتظم مسٹر کچرو نے جنھیں پنجابیوں سے شاید خدا واسطے کا بیر تھا بڑے روڑے اٹکائے۔ آخر میں نریندر شرما اور ساوتری نامی دو اسٹوڈنٹ کے مشورے سے شری وشنو داس شیرالی سے ملاقات کی۔ انھوں نے اودے شنکر جی سے ملانے کا وعدہ کیا۔ اور شام کو سات بجے ہال میں بلایا۔ میں پہونچا۔ یہیں میں نے پہلی بار بلراج ساہنی جی کو بھی دیکھا۔ جب اودے شنکر جی ہال میں داخل ہوئے تو وہ منظر دیکھنے جیسا تھا۔ ان کی حیثیت بھگوان جیسی تھی اور سب ان کی بڑی تعظیم اور عزت کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے مخصوص لباس میں کسی فرشتہ کی طرح وارد ہوئے۔ اب صورتحال یہ ہوئی کہ مسٹر کچرو چاہتے تھے کہ میری ملاقات نہ ہو اور شیرالی چاہتے تھے کہ ملاقات ہو جائے۔ اس کشمکش میں اودے شنکر جی نکلے جا رہے تھے کہ میں نے انھیں "دادا" کہہ کر آواز دی۔ اور مسٹر کچرو کی بے مروتی اور بیہودگی کا تذکرہ کیا۔ ایک ہنگامہ سا ہو گیا۔ دادا مجھے اپنے ساتھ کمرے میں لے گئے اور مسٹر کچرو کی چند قانونی دلائل کے باوجود مجھے روم الاٹ کر دیا گیا۔ الموڑہ

بڑی خوبصورت جگہ ہے۔ اور خاص طور سے جہاں یہ سینٹر قائم ہوا تھا۔ وہ بڑا ہی دلکش اور نظر فریب پہاڑی علاقہ تھا۔

لیکن یہاں میں نے صرف چند روز گزارے تو پتہ چلا کہ ساری لگن اور تڑپ بے کار گئی۔ اس لئے کہ سینٹر میں عشق بازی اور پھر شادیوں کا کچھ ایسا عجیب و غریب چکر چلا تھا کہ سارا نظام درہم برہم تھا۔ اور یہاں سے پنڈت روی شنکر، استاد علی اکبر اور استاد علاؤ الدین خان جا چکے تھے۔ پھر باقی ہی کیا رہ گیا تھا۔ اودے شنکر جی رقاص تھے اور رقص سے مجھے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ یہاں کا یہ ایک واقعہ ہے جس کے بعد میں نے سینٹر چھوڑ دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہاں ایک بنگالی سرود نواز تھے جو اکثر اپنے کاٹیج کے سامنے بیٹھ کر سرود بجاتے تھے۔ مجھے سرود کا بے حد شوق تھا۔ ایک دن وہ بیٹھے بجا رہے تھے کہ میں پہونچ گیا۔ انھوں نے دیکھا۔ قریب بلایا اور ڈانٹا کر "پتہ نہیں کہاں کہاں سے چلے آتے ہیں؟ یہاں کوئی تماشہ ہو رہا ہے؟... جاؤ... بھاگ جاؤ" مجھے جھٹکا سا لگا۔ اور ایک پھانس سی دل میں دھنس گئی۔ اس کے بعد شام کی میٹنگ میں اسی سرود نواز نے مجھے معمولی بات پر پھر الٹی سیدھی سنائی۔ ذہن تو میں پریشان تھا ہی، اب دل بھی اچاٹ ہو گیا۔ جس مقصد کے لئے میں یہاں آیا تھا اب اس کی تکمیل کسی صورت ممکن نہیں تھی۔ بہرحال میں یہاں ۴۵ دن گزار کر اودے شنکر جی کا ایک لیٹر لے کر استاد علی اکبر صاحب کے پاس لکھنؤ پہونچا۔ ان دنوں استاد علی اکبر صاحب لکھنؤ ریڈیو سے وابستہ تھے۔ انھوں نے بڑے خلوص اور تعاون کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے اپنی شاگردی میں لے لیا۔ میں یہاں دن کو نوکری کرتا تھا اور رات کو ان سے درس لیتا تھا۔

یہ ۱۹۴۳ء کی بات ہے کہ اودے شنکر جی کا ٹروپ لکھنؤ آیا۔ میں نے ان سے ملاقات کی، آشیرواد لیا اور ٹروپ یہاں سے احمد آباد پہونچا جہاں وہ آپسی پھوٹ اور انتشار کا شکار ہو گیا اور اودے شنکر جی نے سینٹر ہی کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا جس کے نتیجہ میں سارے ٹروپ کے لوگ اچانک نئی پریشانیوں سے دوچار ہو گئے۔ اسی سال کے دوران لکھنؤ ریڈیو سے میرے پروگرام شروع ہوئے اور میں نے سب سے پہلے دوست نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ساحر کو ریڈیو پر اس کی دو غزلوں "تنگ آچکے ہیں کشمکش زندگی سے ہم" اور "خودداریوں کے خون کو ارزاں نہ کر سکے" کے ساتھ متعارف کروایا اور اسی میرے عزیز دوست ساحر نے بعد میں میرے کیریئر کو سب سے زیادہ تباہ کیا۔ اس کا تفصیلی تذکرہ میں آگے چل کر کروں گا۔

لکھنؤ ریڈیو ہی پر میں نے ساحر کے علاوہ پہلی بار گوپال متل کو بھی متعارف کر دایا اور اس کی غزل "دل آگاہ کیا دیا تو نے۔ آفتوں میں پھنسا دیا تو نے" پیش کی۔ اس کے بعد میں مختلف مقامات پر گھومتا ہوا، ۱۹۴۴ء میں دہلی پہونچا۔ یہ سال آزادی کے ساتھ آنے والی بڑی آفتوں کا سال تھا جس سے سارا ملک واقف ہے۔ اسی سال میرا بھائی دھرم دیو چل بسا۔ اور میری اماں کا ایک اور زخم گھاؤ بن گیا۔ میں ذہنی طور پر بے حد پریشان تھا۔ سارے اپنے ایک ایک کر کے جدا ہو رہے تھے۔ لیکن پھر بھی بہرحال زندگی تو زندگی ہی ہے۔ میں دہلی ریڈیو پر برابر اپنے پروگرام دیتا رہا۔ وہاں مجھے یہ خبر ملی کہ پنڈت روی شنکر نیشنل آرکسٹرا کے ساتھ آ رہے ہیں جس میں وہ بنگالی سرود نواز بھی ہے۔ روی شنکر جی مجھ سے واقف تھے اور بے حد پیار کرتے تھے۔ یہ میرا وہ زمانہ تھا جب میں اپنے ریڈیو پروگراموں کے ذریعہ ایک مشہور سنگر بن چکا تھا۔ اس کا اندازہ آپ اسی امر سے لگا سکتے ہیں کہ جب ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو گاندھی جی کی شہادت پر سارے ملک میں صفِ ماتم بچھ گئی تو میں نے ہی ریڈیو پر وہ پُرسوز دوہے ریکارڈ کروائے جو آج بھی

اکثر اس طرح کے موقعوں پر بجتے ہیں۔

آل انڈیا ریڈیو کے ایکسٹرنل سروس پروگرام میں میری اُس بنگالی سرود نواز سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ دن الموڑہ میں اس کا تھا۔ پر اب میری باری تھی۔ میں نے اُسے بار بار ٹوکا اور آخر میں یہ کہہ دیا کہ "اگر بجانا آتا ہے تو بجاؤ، ورنہ بند کرو" اور پھر نوبت یہ ہوئی کہ میں نے اُسے نکلوا دیا۔ اُس نے میرے پاؤں پکڑ لئے۔ میں نے اُسے اُس کے پرانے طرز عمل کی یاد دلائی۔ خوب جھاڑا۔ وہ بار بار معافی چاہنے لگا۔ اور آخر کار میں نے اسے معاف بھی کر دیا۔ اس طرح کے چھوٹے موٹے بدلے میں اکثر و بیشتر اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر لیتا رہا ہوں۔

بہرحال حالات دہلی میں بھی ویسے نہ تھے جیسی آرزو تھی۔ تمنائیں پھر بھی بے چین و مضطرب تھیں۔ اسی موڑ پہ میری ملاقات دوبارہ استاد علی اکبر صاحب سے ہوئی۔ ارشاد ہوا کہ جودھپور چلو۔ چلے۔ لیکن جودھپور بھی راس نہ آیا۔ اور غالباً ۵۰-۱۹۴۹ء میں استاد علی اکبر صاحب نے کہا کہ کیوں نہ بمبئی جائیں اور فلمی دنیا میں مقدر آزمائی ہو۔ تو ہمارا قافلہ وہاں بمبئی پہونچا۔

اسی دوران ساحر لدھیانوی بمبئی آچکے تھے اور ایس ڈی برمن کے ساتھ "نوجوان" اور "بازی" کے نغمات لکھ کر مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔

بمبئی پہونچے۔ چیتن آنند سے ٹکرائے اور انھوں نے استاد علی اکبر صاحب کو اپنی فلم "آندھیاں" کی موسیقی سپرد کی۔ جس کے نغمات نریندر شرما نے لکھے۔ میں استاد علی اکبر صاحب کا معاون تھا۔ فلم بنی۔ لیکن چلی نہیں۔ اس کے بعد انھوں نے "ہمسفر" دی۔ یہ فلم بھی بنی لیکن اسے بھی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ استاد علی اکبر تو اس ناکامی کو برداشت نہ کر سکے اور کلکتہ چلے گئے لیکن میں چونکہ نوکیتن میں ۲۰۰ روپے ماہوار پر ملازم تھا اس لئے رک گیا۔ اس کے بعد نوکیتن میں ایس ڈی برمن کو پھر داخلہ ملا۔ چیتن آنند کی سفارش پر دادا نے مجھے اپنا اسسٹنٹ لے لیا۔ میں ابتدا میں ان کے ساتھ صرف نوکیتن کی فلموں میں کام کرتا تھا لیکن بعد باہر کی فلمیں بھی کرنے لگا اور یہ دور ۱۹۵۴ء میں بننے والی "ٹیکسی ڈرائیور" سے شروع ہوا تھا۔ "ٹیکسی ڈرائیور" ہٹ ہوئی لیکن اس کے ہٹ ہوتے ہی دونوں بھائی چیتن آنند اور دیو آنند علحدہ ہو گئے۔ چیتن آنند نے ہماشکتی فلمز کے نام سے اپنا ادارہ قائم کر کے "جورو کا بھائی" کا اعلان کر دیا۔ مجھے اس فلم کا میوزک ڈائرکٹر لیا گیا۔ گیت ساحر کے تھے۔ پہلا گیت "صبح کا انتظار کون کرے" ریکارڈ ہوا۔

لیکن پھر اچانک ساحر نے میرے سامنے ایک شرط رکھی کہ میں لتا منگیشکر سے گیت نہیں گواؤں گا۔ جانے کیوں ساحر اور لتا کے تعلقات یکبارگی کشیدہ ہو گئے تھے۔ میں نے ساحر کو سمجھایا لیکن جب وہ نہیں مانے تو میں نے اس شرط کو قبول کرنے سے کھلم کھلا انکار کر دیا۔ ساحر بگڑ گئے۔ بڑی تو تو میں میں ہوئی۔ میں نے کہہ دیا کہ اگر وہ گیت نہیں لکھیں گے تو میں کسی اور سے لکھوا لوں گا۔ اس پر ساحر اور زیادہ مشتعل ہو گئے اور پھر نہ صرف یہ کہ برا بھلا کہا بلکہ گالیوں پر اتر آئے۔

چیتن آنند کو جب ان باتوں کا علم ہوا تو انھوں نے ساحر کے بجائے دوسرے شاعر عادل سے گیت لکھوانے کو کہا۔ عادل نے دو گیت لکھے۔ "تاروں والی رات سہانی" "بات میری مان لے"۔ لیکن ان دو گیتوں کے بعد چیتن آنند نے محسوس کیا کہ

بات ہی نہیں۔ تو پھر ساحر آ گئے۔ ساحر نے جب دیکھا کہ میں جھکنے کو تیار نہیں ہوں تو وہ مان گئے۔ آخر تو پرانے دوست ہیں۔ انھوں نے شرط واپس لے لی۔ اس کے بعد یہ گیت۔ یہ

شرمتی رات ہے ستارے ہیں

آج دونوں جہاں ہمارے ہیں

صبح کا انتظار کون کرے

گانے کا یہ دوسرا حصہ لتا اور طلعت محمود کی آواز میں صدا بند ہوا۔ اور آج تک مقبول ہے۔

اس کے بعد مجھے مرحوم نیا کے شرما کی فلم "کنارے کنارے" اور "انجلی" ملی جس کے گیت میں نے بڑی محنت سے تیار کئے تھے۔ میں نے فیمس اسٹوڈیو میں ان دونوں فلموں کے گیت پروڈیوسر ڈائرکٹر آر چوپڑا صاحب کو سنائے اور وہ بے حد متاثر ہوئے لیکن ساحر نے نہ جانے کیوں ؟ ان گیتوں پر کچھ اس انداز سے تنقید کی کہ سارا کھیل بگڑ گیا۔ حالانکہ یہ گیت ہر لحاظ سے بے حد عمدہ تھے۔ پھر بھی ساحر کے اس طرز عمل کے باوجود چوپڑہ صاحب نے مجھے "سادھنا" کے لئے بلایا۔ ساری بات چیت طے ہو گئی میں نے مان لیا کہ ساحر اس کے گیت لکھیں گے۔ اس کے بعد ساحر میرے گھر آئے اور کچھ اس انداز سے گفتگو کرنے لگے کہ ہم دونوں میں ٹکراؤ ہو گیا۔ ساحر اپنے مخصوص انداز میں اٹھ کر چلے گئے اور پھر پتہ چلا کہ چوپڑہ صاحب نے مجھے کٹ کر دیا ہے۔

ادھر میری دونوں فلمیں "کنارے کنارے" اور "انجلی" باوجود اچھی موسیقی کے چل نہیں پائیں اور میرے پاس کوئی فلم نہیں تھی کہ ۱۹۶۱ء میں مجھے نوکیتن کی فلم "ہم دونوں" ملی۔ جس میں پھر ایکبار ساحر سے تعلقات استوار ہوئے۔ انھوں نے اس بار یا شاید ساری زندگی میں پہلی بار پوری طرح سے تعاون کیا فلم بنی، لگی اور ہٹ ہوئی۔ لیکن اس فلم کی تکمیل کے بعد ہی دیوآنند نہ صرف یہ کہ مجھ سے بلکہ ساحر سے بھی حسد کرنے لگے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے "ہم دونوں" کے پریمیئر پر "ہم دونوں" کو نہیں بلایا۔ اس بات کا انھوں نے بطور خاص انتظام کیا تھا کہ "ہم دونوں" تک "ہم دونوں" کے پریمیئر کا کوئی پاس یا ٹکٹ پہونچنے نہ پائے۔ دیو جیسے آدمی نے ایسا کیوں کیا یہ دیو ہی جانے۔

اسی دوران مجھے میرے اچھے دوست سنیل دت نے اپنی ایک فلم "مجھے جینے دو" کے لئے موسیقار لیا۔ ساحر کے گیت لئے گئے۔ چار گیت ریکارڈ ہوئے۔ لیکن شاید ساحر صاحب کو اچانک یہ محسوس ہوا کہ سب کچھ بے حد پُرامن طریقہ سے کیوں ہو رہا ہے ؟ اور جے دیو کی زندگی آخر کیوں سدھرتی نظر آ رہی ہے۔ شاید اسی لئے انھوں نے کسی اطلاع کے بغیر نوکیتن میں آنا بند کر دیا۔ جبکہ ہم دونوں یہیں ملتے تھے اور یہیں ریہرسل ہوتی تھی۔ میں نے جب دیکھا کہ ساحر آ نہیں رہے ہیں تو وجہ جاننے کے لئے دت صاحب کے آدمی کو بھجوایا۔ جواب میں ساحر نے کہلا بھیجا کہ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں جس میوزک ڈائرکٹر کے ساتھ کام کروں گا اس میوزک ڈائرکٹر کو باجہ طبلہ اٹھا کر میرے گھر آنا پڑے گا۔ میں بھی چونکہ اپنی خودداری کے ہاتھوں مجبور تھا اس لئے میں نے یہ شرط مسترد کر دی۔ ادھر دت صاحب مسلسل گیت ریکارڈ کرنے کا تقاضہ کر رہے تھے اور ادھر ساحر نے تنازعہ کھڑا کر دیا تھا۔ بات اس مرحلہ تک پہونچی کہ میرے دوست سنیل دت نے مجھے ہی فلم "مجھے جینے دو" سے علٰحدہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس نے اپنے ملازم ہنس چودھری کے

کے ذریعہ یہ اطلاع مجھے دی اور میں نے اُسی کے ذریعہ یہ کہلا بھیجا کہ آپ مجھے سائن کرنے کے لئے گھر آنے تھے اس لئے آپ گھر آکر "نوابجیکشن لیٹر" لے جائیں۔ ہنس چودھری نے دت صاحب سے یہ بات کہی اور اس کا علم بھابی جی (نرگس دت) کو ہوا۔ انھوں نے ساری بات سُنی اور مجھے بلا بھیجا۔ میں پہونچا۔ میں نے دت صاحب کو گانے کی سچویشن سمجھاتے ہوئے کہا کہ ڈاکو نہ تو فراق کو جانتے ہیں اور نہ ہی ساحر کو سنتے ہیں۔ وہ تو لوک گیت سنتے ہیں اور اگر کہو تو ایک لوک گیت سناؤں جو اس سچویشن پر پورا اترتا ہے۔ اور بھروت صاحب کے حامی بھرنے پر میں نے انھیں ایک لوک گیت "ندی نارے نہ جاؤ شیام پیاں پڑ دں" سُنایا۔ جو انھیں بے حد پسند آیا اور اسے ریکارڈ کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس لئے کہ میرے بھائی ساحر نے میری زندگی حرام کر رکھی تھی۔ لیکن جب انھیں پتہ چلا کہ دت صاحب نے ایسا فیصلہ کیا ہے تو وہ دوسرے ہی دن پہونچ گئے اور اپنے مخصوص انداز میں بڑے پیار کی باتیں کرنے لگے۔ ساحر صاحب پھر گانا لکھنے پر رضامند تھے۔ مگر اب یونٹ والوں نے ساحر صاحب کے گانوں کے بجائے لوک گیتوں کو ترجیح دی۔ اور "مجھے جینے دو" میں بعد کو دو لوک گیت لئے گئے۔

ان سارے واقعات کے بعد میں سمجھ چکا تھا کہ میرا میوزیکل کیریر ساحر صاحب کے عدم تعاون، ناقابلِ برداشت طرزِ عمل اور دیوآنند کی بے رُخی کی وجہ سے ٹھپ ہو گیا ہے اور اب جو کچھ مجھے کرنا ہے وہ نئے سرے سے کرنا ہے۔ دیو اور ساحر سے ساتھ تعلقات ختم ہو چکے تھے۔

اسی دوران مجھے نیپال کی پہلی فیچر فلم "ماتی گھر" مل چکی تھی۔ اس فلم کا کام کر کے مجھے حقیقی معنوں میں خوشی ہوئی۔ نیپال کے سورگیہ مہاراجہ مہندر بیر وکرم شاہ نے جو نیپالی زبان کے بہت اچھے شاعر تھے اور میری موسیقی کے دلدادہ تھے اپنے لکھے ہوئے دو گیت اس فلم کے لئے ریکارڈ کرنے کی اجازت دی۔ بمبئی کے تمام آرٹسٹوں نے بھرپور تعاون کیا۔ لتا جی اور آشا جی نے بلا معاوضہ اپنی آوازیں دیں۔ اسی سلسلے میں مجھے دوبار نیپال بھی جانا پڑا۔ جو مجھے بے حد پسند آیا۔

اب اس فلم کے بعد میرے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ حالانکہ ہندوستان بھر میں میرے گیت گائے جا رہے تھے۔ فلم "ہم دونوں" کے بھجن "اللہ تیرو نام" کو لتا جی نے دنیا بھر میں گا گا کر مشہور کر دیا تھا۔ پنڈت نہرو کے بلانے پر دہلی میں بھی انھوں نے یہ بھجن گایا۔ چینی حملے کے دوران۔ اور بمبئی میں جب دلیپ کمار صاحب نے وہی پروگرام آرگنائز کیا تو تب لتا جی اور آشا جی۔ ان دونوں عظیم فنکاروں نے میرے گیت گائے۔ وہ شام میری زندگی کی سب سے خوبصورت شام تھی اور غالباً ناقابلِ فراموش بھی۔ میری موسیقار بننے کی جو تمنا تھی وہ اس شام اپنے پورے عروج پر تھی اور یہ گیت ساحر نے لکھے تھے۔

میری کامیابی میں ساحر کا جو حصّہ ہے میں اس سے منکر نہیں ہوں۔ جبکہ میری ناکامیوں کا ذمے دار بھی وہی ہے لیکن باوجود ان ساری باتوں کے مجھے ساحر سے آج بھی وہی لگاؤ ہے۔ وہی پیار ہے جو جگر اور والے پُل پر گذرنے والی شاموں میں تھا۔

نوکیتن سے نکالے جانے پر جو بقایا جات مجھے ملے اُن سے میں نے ہوائی جہاز کا ٹکٹ کٹایا اور انگلینڈ چلا گیا۔ وہاں میری بہن بڑے بھائی کے بچّے اور چھوٹا بھائی ست دیو مستقل رہائش اختیار کر چکے ہیں۔ میں وہاں چار ماہ رہا۔ اسی دوران اپنی فلم "یادیں" کی لندن میں نمائش کے سلسلے میں دت صاحب، نرگس جی اور وحیدہ رحمٰن وغیرہ وہاں آئے۔ دت صاحب کو جب پتہ چلا

کرتے دیو انگلینڈ میں ہی ہے تو انھوں نے مجھے فوراً بلایا۔ بہت ساری باتیں ہوئیں اور دت صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ ایک نئی فلم شروع کرنے جا رہے ہیں جس میں وہ دوبارہ میرے ساتھ کام کرنے کے آرزومند ہیں۔ یہ فلم تھی "ریشماں شیرا"۔ یہ میری زندگی کی سب سے اچھی فلم ہے۔ اس کے گانے بال کوی بیراگی اور راج دھو کمار نے لکھے تھے۔ اس فلم کی موسیقی کے لئے مجھے "قومی ایوارڈ" بھی ملا ہے۔

لیکن بدقسمتی برابر میرا تعاقب کر رہی تھی۔ یہ فلم بھی باکس آفس پر پوری نہیں اتری۔ اب پھر زندگی نے جدوجہد کے اسی دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ کام بالکل نہ تھا۔ لیکن ایک عقلمندی نے بہرحال بہت سارے مسائل سے نجات دلادی تھی اور وہ عقلمندی یہ تھی کہ میں اکیلا تھا۔ میں نے شادی نہیں کی تھی۔ (آج بھی اکیلا ہوں) اس لئے میری خودداری قائم رہی اور میں کام مانگنے کسی کے دروازے پر نہیں گیا۔

اس دوران ایک فلم "آنگن" ملی۔ جس کے سلسلے میں مرحوم جاں نثار اختر سے ملاقات ہوئی۔ اور پھر ان کے ساتھ دو تین فلموں میں کام ہوا۔ "پریم پربت" ان میں سے ایک ہے۔ جس کا یہ گیت "یہ دل اور اُن کی نگاہوں کے سائے" بے حد مقبول ہوا اور آج بھی ہے۔ جاں نثار بھائی شاعر تو چوٹی کے تھے ہی لیکن انسان کے ناطے بھی وہ اتنے ہی بلند تھے۔ اُن کی یادیں مرتے دم تک میرے دل سے نہیں جا پائیں گی۔ نقش لائلپوری کے ساتھ بھی میں نے چند فلمیں کی ہیں۔ فلم چلے نہ چلے۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ میں نے جو بھی کام کیا اُسے عوام نے چاہا۔ سراہا۔ اور پسند کیا۔ میری اس "میں" میں کوئی غرور یا تکبر پوشیدہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ دراصل یہ "میں" "ہم" ہے۔

ہندوستان میں تین مقامات پر ساؤنڈ اور لائٹ کے شو ہوتے ہیں۔ لال قلعہ دہلی میں اپنے استاد علی اکبر صاحب کے ساتھ میری بھی موسیقی ہے۔ سابرمتی آشرم (احمد آباد) اور شالیمار گارڈن (سری نگر) ان دونوں مقامات پر بھی میری ہی موسیقی ہے۔

اپنے فرصت کے لمحات میں اردو۔ ہندی کی شاعری پڑھتا ہوں۔ کمپوز کرتا ہوں اور ریکارڈ کرتا ہوں۔ چونکہ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے ملک میں اور بھی کچھ نئی آوازیں آئیں اس لئے نئے فنکاروں کا میرے گھر کا تانتا بندھا رہتا ہے اور میں یہ بات پورے دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے زیادہ سے زیادہ نئی آوازوں کو متعارف کروایا ہے۔

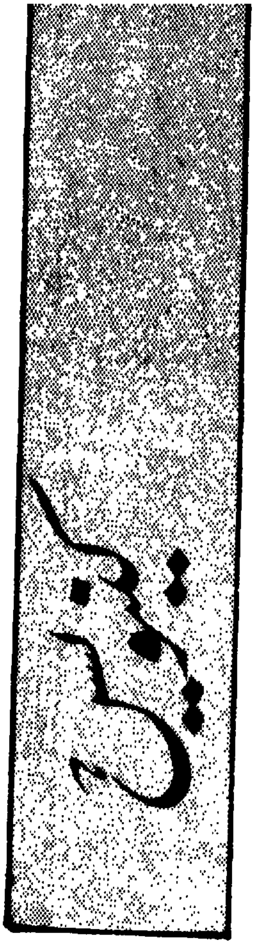
جب بھی میں اپنے ماضی پر نظر ڈالتا ہوں اپنی فلمی زندگی کی جدوجہد کے ۴۵ سالوں کو یکجا کرتا ہوں تو میرے دل میں کسی کے لئے کوئی ناراضگی یا کسی بات کا گلہ شکوہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر اقبال کے دو شعر مجھے بچپن سے یاد ہیں جو میں اسکول میں پڑھا کرتا تھا۔

تمنا آبرو کی ہے اگر گلزار ہستی میں
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے

یا

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

۱ (مرتبہ: کلیم راہی)







صادقین

خطاط کے شاعر کے مصوّر کے سوا
میں اور بہت کچھ ہوں مگر راز میں ہوں

"...... ...... اس فن میں خود ہی اپنا اُستاد اور خود ہی شاگرد ہوں۔ یہ جوہر امانتِ آسمانی ہے۔ اور میں اس جوہر کو خدا کی مخلوق تک پہنچانے میں اپنے رُوحانی فرض کی سبکدوشی کا ایک پہلو مدِنظر رکھتا ہوں........"

ماحول اور وراثت دو الگ چیزیں ہیں۔ پہلے وراثت کی بات کرتے ہیں۔ میں شمالی ہندوستان کے نجیب الطرفین سادات کے خانوادے سے تعلق رکھتا ہوں۔ قرآن لکھنا میرے اسلاف کا روحانی مشغلہ تھا اور آج جبکہ میں عالمِ مسافرت میں ہوں اور کوئی سامان سفر نہیں ہے مگر اس عالم میں بھی میری سات پشتوں کے لکھے ہوئے قرآن میرے پاس ہیں۔

میں نے دس سال پیشتر جب سنجیدگی کے ساتھ فنِ خطاطی کی پہلی نمائش کی تھی تو ان قلمی نسخوں کو شجرے کے حساب سے سجایا تھا۔ ان میں خواتین کے لکھے ہوئے پنج سورے بھی شامل ہیں۔ شعر و شاعری، فنِ عمارت، موسیقی اور دیگر فنونِ لطیفہ سے اسلاف کا گہرا تعلق رہا ہے۔ جہاں تک قرآنی آیات کے سلسلے کا تعلق ہے تو یہ میری وراثت ہے۔ میرا خط پیدائشی طور پر نظر نواز اور دل فریب ہے۔ اس فن میں خود ہی اپنا اُستاد اور خود ہی شاگرد ہوں۔ یہ جوہر امانتِ آسمانی ہے اور میں اس جوہر کو خدا کی مخلوق تک پہنچانے میں اپنے روحانی فرض کی سبکدوشی کا ایک پہلو مدِنظر رکھتا ہوں۔ پوچھتے ہو کہ آیاتِ قرآنی لکھنے کا شوق کہاں سے ملا تو سنو میں شاعر بھی ہوں شعر میں کہتا ہوں ؎

"اس منی منجلی سے ورثے میں ملا
اللہ کے اس ولی سے ورثے میں ملا
قرآن کی آیات کو لکھنے کا یہ شوق
مجھ کو حضرت علیؓ سے ورثے میں ملا"

جمالیاتی محسوسات کے اظہار کا سب سے بسیط و عمیق و عریض طریقہ فنِ نقاشی (مصوری) ہے۔ لیکن اپنے تاریخی پس منظر اور اپنے خون کی روانی کے انداز کے حساب سے میں کبھی کبھی اپنے آپ کو خطاطیاں کرتے ہوئے بھی پاتا ہوں۔ میرا بنیادی پس منظر اسلامی ہے اور میں دُنیا کے مختلف ممالک میں فنِ مصوری میں اہلِ دُنیا سے داد و تحسین وصول کر چکا ہوں۔ پیرس سے میں عارضی طور پر پاکستان آیا اور پھر مجھے واپس پیرس جانے کا موقع نہ مل سکا۔ ماحول کی خطاطیاں دیکھ کر اور اپنے بزرگوں کے قلمی نسخوں پر نظرِ ثانی کے گرد و پیش میں حروفِ ابجد کو صدیوں پرانے مطلق العنان بادشاہوں کے زمانے میں وضع کیے ہوئے قوانین و آئین و اصول کو سلطانی جمہور کے زمانے میں ان دیرینہ رسوم و قیود سے غیر مشروط طریقہ سے رہائی دلانے کی غیر شعوری کوشش کرنے لگا۔ جس میں فرد کی اہمیت اور رہائی کی بجائے جماعت کی عظمت اور وحدت کا پہلو نمایاں تھا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے کیوں؟ میں سمجھتا ہوں کہ اصول و قوانین اُستاد بناتے ہیں اور اُستاد کے قوانین کہنہ کے ماحول میں شاگرد کا فروغ جوہر ناممکن ہو جاتا ہے

اُستاد قوانین بنا دیتے ہیں
شہ دولا کے چوہوں کو ہوا دیتے ہیں
شاگرد کے جوہر کو بہت ہی کس کر
کنٹوپ اُصولوں کے لگا دیتے ہیں

دراصل زمانے کے حالات اور سماجی پس منظر بدلنے کے بعد جمالیاتی قدریں پیدا ہوتی ہیں اور ماحول کے ساتھ ساتھ اصول کو بھی بدلنا پڑتے ہیں۔

غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر میں نے غالب کے اشعار پر مشتمل پچاس تصویریں بنائی تھیں۔ یہ بات ۱۹۶۸ء کی تھی۔ میں ہر روز اپنے تازہ کام کی نمائش کرتا ہوں۔ میں چونکہ بعض معاملات میں قدامت پرست ہوں لہٰذا میں اپنی بنائی ہوئی تصویروں کے ایک کنارے اپنے دستخط کے ساتھ "عفی عنہ" لکھتا ہوں۔ جس کے معنی ہیں کہ خدا میرے گناہوں کو معاف کرے۔

میں حالات کے پیچ و خم اور تقویم کے فاصلوں سے گذر کر غالب کے اشعار کی خوش خطی کے دروازے سے مدینۂ خطاطی میں داخل ہوا۔ میں مصوری و نقاشی سے شہرِ خطاطی کی طرف پیدل چل پڑا تھا کہ غالب نے راستے میں لفٹ دے دی۔ مختلف دریاؤں کا پانی اور مختلف کا مزاج کسی خاص صنعت و حرفت، خاص فنون، یا کسی مخصوص زمانہ کے لیے موزوں ہوتا ہے۔ اس معاملے پر میرا خیال ہے کہ لاہور شہر کی آب و ہوا اور دریائے راوی کے پانی کا ذائقہ فنِ خطاطی کی تشکیل و تکوین و نشو و نما کے لیے موزوں ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے پیرس کا مزاج مصوری کے لیے بہت موزوں ہے۔

نقاشی کی اندر کا پانی پی کر
کی شاعری بجنور کا پانی پی کر
جب مرکز خطاطی میں آیا میں نے
خطاطی کی لاہور کا پانی پی کر

اگر میں پیرس سے نہ آتا تو نہ جانے تجریدی مصوری کی کسی منزل کو پہنچا ہوتا۔ میرے لاہور میں کیے ہوئے کام کی عالمِ اسلام نے بہت داد دی ہے۔

"جو فن کیا لاہور میں میں نے ایجاد
اس کی ملی کچھ مشرق وسطیٰ ہی میں داد
اس بات پہ لاہور کو کرتے ہیں سلام
شہراز و دمشق و قاہرہ و بغداد"

مصوری اور شاعری میں سے میں کسی ایک کا انتخاب نہیں کرنا چاہتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھ میں اللہ تعالیٰ نے اور بھی بہت صلاحیتیں عطا کی ہیں۔

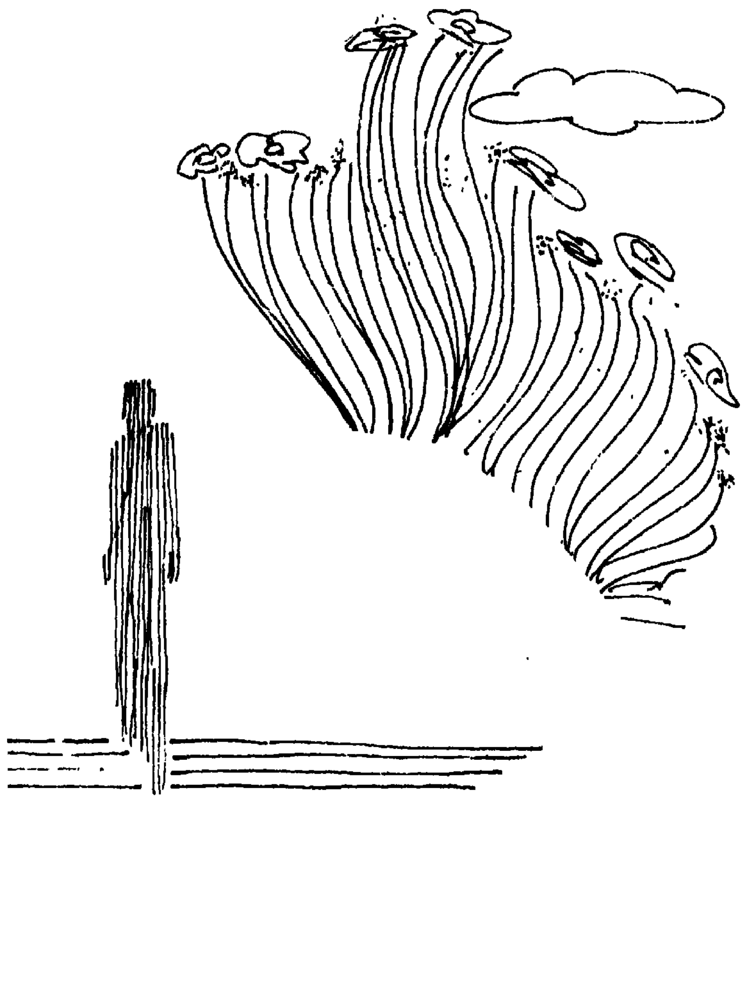
میں حسن کی جس انجمنِ ناز میں ہوں
جو کچھ بھی ہوں خود اپنے ہی انداز میں ہوں

میں سماجی ذمہ داریوں کا احساس رکھتا ہوں اور فنی ذمہ داریوں کو پہچانتا ہوں۔ شادی جو ہر خاص و عام کرتے ہیں میں کر نہ فنی فرائض انجام دے سکتا اور نہ ہی سماجی فرائض، چونکہ بنیادی طور پر حسن پرست آدمی ہوں اور فنِ مصوری احساسِ جمال کو الوان و خ

کی زبان میں صفحۂ قرطاس پر لانے کا نام ہے تو ظاہر ہے گیسوؤں والوں اور کاکل کے کمانداروں کے حسنِ جمال سے یہ دریدہ دامنوں اور پریشان گیسوؤں والا شدت سے متاثر ہوتا ہوگا۔

خطاط کے شاعر کے مصور کے سوا

میں اور بہت کچھ ہوں مگر راز میں ہوں





سیّد داؤد

(پس منظر کا مصوّر)

"........ دیو صاحب کا کہنا ہے کہ — "جو کچھ ہوا' اُسے بھول جاؤ' جو کرنا ہے' وہ سوچو" — بات بھی سچ ہے لیکن جب صبح صبح ہوٹل کا بیرا مجھے نیند سے جگا کر چائے کی پیالی میرے ہاتھ میں تھماتا ہے تو میں نہ چاہتے ہوئے بھی ماضی کی یادوں میں کھو جاتا ہوں۔ دراصل ماضی کی یادوں ہی نے مجھے اس منزل تک پہونچایا ہے ...."

۱۰ فروری ۱۹۴۴ء کو میں بنگلور کے ایک گاؤں چکبالاپور میں پیدا ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آزادیٔ وطن کی جنگ پورے شباب پر تھی۔ میرے دادا حضرت بنگلور کے بااثر اور معزز لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ اس لئے جب میرا عقیقہ منایا گیا تو بڑی دھوم دھام تھی۔ دادا حضرت کے تمام معزز دوست احباب اور رشتہ دار سب جمع ہوگے۔ شاعروں نے تہنیتی نظمیں پڑھیں اور وہاں کے مشہور شاعر عبداللطیف قریشی کا یہ شعر مجھے اب بھی یاد ہے۔ ؎

نورِ ہی نور ہوا، نورِ منور پیدا
مرحبا صلی اللہ آلِ پیمبر پیدا

میں اردو اسکول میں تعلیم پا رہا تھا۔ لیکن چونکہ دادا حضرت کو اردو اسکول کا ماحول بہتر نہیں لگا۔ اور انھوں نے یہ بھی محسوس لیا کہ زندگی میں نمایاں کامیابی اور ترقی کے لئے انگریزی تعلیم کا حصول ضروری ہے۔ اس لئے انھوں نے مجھے بڑے اہتمام سے اردو اسکول سے نکال کر سونتھ ڈے میڈل اسکول میں داخل کروادیا۔ لیکن مجھے تو پڑھائی لکھائی سے زیادہ فلموں میں دلچسپی تھی۔ اکثر چوری چھپے فلمیں دیکھتا۔ میرے دوست مجھے راج کپور کہا کرتے تھے۔ اور میں من ہی من پھولا نہیں سماتا تھا کیونکہ راج کپور میرا پسندیدہ اداکار تھا۔ بس یہیں سے مجھے اداکاری کا شوق پیدا ہوا۔ اسکول کے ڈراموں میں کام کرنے لگا۔ میری یہ خواہش تھی کہ راج کپور کی طرح مقبول اداکار بنوں۔ دیو آنند، دلیپ کمار اور راج کپور سے دوستی کروں۔ اُن کے درمیان رہوں۔

ان ہی دنوں راج کپور کی فلم "چھلیا" کا یونٹ بنگلور آیا۔ میں سُنا تو میری باچھیں کھل گئیں۔ راج کپور سے ملنے اُسے قریب سے دیکھنے کا اس سے اچھا موقع بھلا پھر کہاں مِل سکتا تھا؟ اس لئے میں اسکول کے لئے گھر سے تو نکلا لیکن اسکول کے بجائے "لال باغ" پہنچ گیا۔ جہاں "چھلیا" کی شوٹنگ چل رہی تھی۔ بڑی بھیڑ بھاڑ تھی۔ اس بھیڑ بھاڑ میں ایک چھوٹا سا لڑکا کیا کرتا؟ وہ دھکے کھاتا، لوگوں سے ٹکراتا ادھر سے اُدھر گھومتا رہا۔ لیکن نہ تو راج کپور سے ملاقات ہوئی اور نا ہی اُس کے دیدار۔ مگر اِس حماقت کی سزا یہ ملی کہ اسکول سے نکال دیا گیا۔ سارے لوگ آگ بگولہ تھے۔ دادا حضرت کی پھٹکار ہر روز مقدر بن چکی تھی۔ یوں بھی وہ بڑے غصیلے تھے اور مجھے اُن سے بہت ڈر لگتا تھا۔

آخر گھر والوں کی اس جلی کٹی نے مجھے تنگ کر دیا۔ مجھے یوں لگنے لگا جیسے یہ گھر گھر نہیں قید خانہ ہے اور مجھے اس کی دیواریں توڑ کر آزادی حاصل کرلینی چاہیئے۔ ایک دن دادا حضرت نے مجھے کچھ سامان لانے کے لئے ۸۰ روپے دیئے۔ اتنے روپے لے کر میں باہر نکلا تو میری نیت ڈانواڈول ہوگئی۔ ایک آواز گونجی "اتنے روپیوں میں تو بمبئی پہونچ جاؤ گے"؟ اور پھر اس آواز نے اس شدت سے میرا پیچھا کیا کہ میں بازار جانے کے بجائے اپنے ایک دوست ظہیر کے گھر پہونچ گیا "چل جلدی تیار ہوجا، بمبئی چلنا ہے — میرے پاس روپے ہیں" وہ فوراً راضی ہوگیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم بلا ٹکٹ سفر کریں۔ لیکن میں اس کے لئے تیار نہیں تھا اور نہ ہی مجھ میں ایسا کرنے کی جراءت تھی۔ لیکن وہ اڑا رہا۔ میں نے اپنا ٹکٹ لے لیا۔ اور اسے اس کے ٹکٹ کے بدلے بیس روپے دے دیئے۔

ہم دونوں پلیٹ فارم پر بڑی بے چینی اور اضطراب کی حالت میں ٹہلتے رہے۔ بڑی بھیڑ بھاڑ تھی اور میں اس لئے بھی کچھ زیادہ ہی بوکھلایا ہوا تھا کہ کہیں اس سفر کے شروع ہونے سے پہلے کوئی گھر والا نہ پہونچ جائے۔ اسی بے چینی، بوکھلاہٹ اور اضطراب میں ٹرین آگئی۔ میں نے ظہیر سے کہا: "چل بیٹھتے ہیں۔" وہ بولا: "نہیں ابھی نہیں، ٹرین چھوٹنے میں ٹائم ہے۔" اور اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ میری بے چینی اور تیز ہوگئی اور اسی دوران ٹرین نے سیٹی دی۔ میں لپکا۔ میں ظہیر کو بھی پکارتا رہا۔ جو بھیڑ میں پتہ نہیں کہاں نکل گیا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے ٹرین پکڑی۔ ظہیر کو شاید آنا ہی نہیں تھا اس لئے وہ مجھے بے وقوف بنا کر ۲۰ روپے لے گیا۔

لیکن ایک دوست چھوٹا تو دوسرا مل گیا۔ یہ رفیق تھا جو بمبئی ہی کا رہنے والا تھا اور وہاں اس کی بڑی جان پہچان تھی۔ رفیق کو پاکر مجھے لگا۔ سب اللہ میاں کا انتظام ہے۔ اس لئے کہ اب مجھے ایک ایسا ساتھی مل گیا تھا جو بمبئی کے چپے چپے سے واقف تھا۔ کچھ دیر بعد جب ہم دونوں ایک دوسرے سے گھل مل گئے، اُس نے بتایا کہ وہ چند مجبوریوں کی وجہ سے بغیر ٹکٹ سفر کر رہا ہے۔ میں نے سوچا یاری نبھانے کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ میں نے اُسے دلاسہ دیا کہ "تم فکر مت کرو، اسٹیشن آنے دو۔ میں تمہارا ٹکٹ لے آؤں گا۔" اُس نے خوش ہو کر کہا: "میں تمہیں بمبئی پہونچ کر پیسے دے دوں گا۔" اس کے بعد جب گلبرگہ اسٹیشن آیا تو میں اس کا ٹکٹ لے آیا۔ اس کے ساتھ سفر اچھا کٹا۔ دادر اسٹیشن آگیا۔ رفیق کے کہنے پر میں بھی اس کے ساتھ ہی اُتر گیا۔ ہم دونوں نائیگاؤں چال میں سامان رکھ کر چنندی گلی (چور بازار) پہونچے۔ تاکہ کچھ کپڑے خرید سکیں۔ یہ بات مجھے رفیق ہی نے بتائی تھی کہ وہاں استعمال شدہ نئے پرانے کپڑے سستے داموں مل جایا کرتے ہیں۔

ہم نے کچھ کپڑے خریدے اور نہانے کے لئے حمام گئے۔ میں نے رفیق سے بھنڈی بازار کا پتہ پوچھا۔ جہاں میری پھوپھی رہتی تھیں اور ان کا پتہ میرے پاس موجود تھا۔ رفیق نے کہا: "بس یہیں ہے اس کے پیچھے۔" میں نے رفیق کو وہیں ٹھہرنے کے لئے کہا اور بھنڈی بازار میں لوگوں سے پتہ پوچھتا پوچھتا پھوپھی کے گھر پہونچا۔ انھوں نے مجھے دیکھا تو خوشی سے اُچھل پڑیں اور بولیں: "جب بمبئی آگئے ہو تو یہیں رہو۔" لیکن مجھے لگا کہ یہاں رہنے میں خطرہ ہے کسی نہ کسی دن گھر والے پہونچ جائیں گے اور پھر مجھے اسی قیدخانے میں بند کر دیں گے جہاں سے میں بھاگ آیا ہوں۔ میں انھیں ٹال کر نکل آیا۔ جب چور بازار آیا تو وہ حمام بھول گیا جہاں رفیق کو چھوڑ آیا تھا اور جب دادر پہنچا تو وہ چال بھول گیا جہاں سامان رکھا تھا۔ ایک دوست وہاں دغا دے گیا تھا اور دوسرا یہاں بچھڑ گیا۔ اب چاروں جانب نئے لوگوں کا ہجوم تھا۔ بڑی بڑی فلک بوس عمارتیں، لمبی لمبی سڑکیں۔ تیز تیز چلنے والے لوگ۔ دوڑتی بھاگتی کاریں۔ کسی کو کسی کی پرواہ نہیں۔ یہ سب مجھے کاٹ کھانے کو دوڑنے لگا۔ اچانک مجھے یاد آگیا کہ میں اس شہر میں ایکٹر بننے آیا ہوں۔ میں نے یہ ساری مصیبتیں ایکٹر بننے کے لئے اُٹھائی ہیں۔ میں گھومتا گھومتا فلم اسٹوڈیو کے دروازے پہ پہونچ گیا۔ لیکن سارے خواب چند لمحوں ہی میں چکنا چور ہو گئے۔ جب اسٹوڈیو کے دربان نے دھکا دے کر اندر جانے سے روک دیا۔ میں تڑپ اٹھا لیکن ایک طرف کھڑا ہو گیا جہاں اور بھی بہت سارے فلموں کے مارے فلمی ستاروں کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ اتنے میں چند ستارے اپنی چمچماتی کاروں میں باہر نکلے۔ فلموں کے مارے اُن پر ٹوٹ پڑے۔ دروازے پر کھڑے پولیس حوالدار نے ڈنڈا چلانا شروع کیا۔ اور میرے سارے حوصلے پاش پاش ہو گئے۔ میں بہت اُداس اور رنجیدہ فٹ پاتھ پر کھڑا سوچ رہا

تھا کہ اب کیا کروں ؟ کہاں جاؤں ؟ دن کیسے گذرے ؟ رات کیسے بیتے ؟ کہ سب کچھ ہر کوئی میرے لئے اجنبی تھا کہ خدا خدا کر کے مجھے روپ تارا اسٹوڈیو کے بازو والی مسجد میں پناہ مل گئی ۔ شاید سید زادے کے لئے یہی جگہ تھی ۔؟

میرے پاس اب کل ۲۰ روپے بچے ہوئے تھے ۔ دن بھر کھاتا پیتا رہتا اور رفیق کو ڈھونڈتا رہتا ۔ رات کو مسجد میں آکر سو جاتا ۔ لیکن چوتھے دن خدا کے گھر سے بھی نکالا مل گیا ۔ مسجد کے متولیوں کا اصول تھا کہ کوئی بھی مسافر تین دن سے زیادہ نہیں رہ سکتا ۔

اب جو حالت ہوئی وہ بڑی قابلِ رحم تھی ۔ جیب خالی تو ہمت بھی غائب ۔ پاکٹ میں صرف دو روپے تھے اور مسائل بے شمار ۔ طرح طرح کے خیالات ذہن میں آنے لگے ۔ خاندانی شرافت بُرے کاموں سے روک رہی تھی ۔ چوری چکاری کے کام سے تو واقف تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ سب کیونکر ، کہاں اور کیسے ہوتا ہے ۔ سوچنے لگا کہ میں سب کچھ چاہتے ہوئے بھی یہ نہیں کر سکتا ۔ ہاں ، محنت کی عادت نہ ہونے کے باوجود یہ حوصلہ ضرور تھا کہ جو بھی کام ملے گا ضرور کر دوں گا ۔ مگر یہ شہر بڑا ظالم ہے ۔ یہاں کون کیسے کام دیتا ہے اور پھر مجھے تو سرے سے کچھ آتا ہی نہیں تھا ۔ آخر کرتا تو کیا کرتا ۔ ؟ اسی سوچ میں بے حد رنجیدہ بیٹھا ہوا تھا کہ ایک بوڑھا شخص میرے قریب آیا ۔ اس نے ہمدردی جتائی اور بس اس کے ساتھ ہی سارے بند ٹوٹ گئے ۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے ۔ میں نے اُس فرشتہ صفت شخص کو اپنی پوری داستان سنائی ۔ مجھے اُس شخص میں اجنبی پن کے باوجود اپنا پن لگا ۔ میں نے انہیں چاچا کہہ کر مخاطب کیا ۔ چاچا نے میری داستان سُن کر مشورہ دیا کہ میں اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بجائے حاجی ملنگ باباؒ کی پہاڑی پر چلے جاؤں ۔ وہاں میلا لگا ہوا ہے ۔ کوئی نہ کوئی کام ضرور مل جائے گا ۔ وہاں سے واپس آؤ تو مجھے اسی جگہ پر ضرور ملنا ۔ میں تمہارے لئے کچھ کروں گا ۔

میں کلیان پہنچا اور وہاں سے حاجی ملنگ باباؒ کے پہاڑ کی طرف پیدل چل پڑا ۔ اس لئے کہ بس میں جانے کے لئے ٹکٹ لینا پڑتا ہے اور ٹکٹ کے لئے پیسے لگتے ہیں ۔ جو تھے ہی نہیں ۔ اوپر سے بھوک نے بھی دھاوا بول دیا تھا ۔ راستے میں پاؤ پکوڑے کھاتے ہوئے برہمن واڑی پہنچ گیا ۔ جب پہاڑی پر چڑھنا شروع کیا تو جیب میں صرف چار آنے بچے تھے ۔ اور وہ لوگ دو آنے وصول کرنے پر تلے ہوئے تھے ۔ یہ دراصل سیڑھیاں چڑھنے کا ٹیکس تھا جو فی کس دو آنے کے حساب سے وصول کیا جا رہا تھا ۔ میں نے بڑی منت سماجت کی لیکن کوئی ماننے والا نہ تھا ۔ آخر مجبوراً دو آنے چکا کر اپنی جان چھڑائی ۔ اوپر پہونچا تو پھر ایک بار بھوک نے بڑی شدت سے گھیر لیا ۔ میں نے بچے ہوئے دو آنوں کی گرم گرم جلیبیاں کھائیں ۔ بڑا مزا آیا ۔ منہ ہاتھ دھو کر ننگے سر ننگے پاؤں حاجی ملنگ باباؒ کے دربار میں داخل ہوا ۔ میرے اندر سے ایک آواز نکلی "باباؒ آج پہلی بار آپ کے دربار میں پہونچا ہوں مگر سر پر ٹوپی ہے نہ ہاتھ میں پھول" فاتحہ پڑھی ، دُعا مانگی اور پھر بالا حصار کی طرف جانے لگا ۔ لیکن راستے میں ایک بوڑھی عورت نے یہ کہہ کر روک دیا کہ "بیٹا ! اُدھر مت جاؤ ، رات ہو رہی ہے ۔ اوپر ایک شخص مرا پڑا ہے ۔ اُسے چیل کوؤں نے نوچ ڈالا ہے ۔ اگر کچھ مانگنا ہی ہے تو بابا سے مانگ لو مل جائے گا ۔" میں نیچے لوٹ آیا ۔

نیچے آیا تو برہمن واڑی کی ایک ہوٹل میں گرم گرم پکوڑے بن رہے تھے ۔ سوندھی سوندھی خوشبو جب ناک کے راستے اندر

پہونچا تو میری بھوک پھر سے بیدار ہوگئی۔ میں نے سوچا "سید صاحب، اب تو آپ صرف خوشبو سونگھ کر ہی پیٹ بھر لیجئے کیونکہ جیب میں تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔"

اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ ہوٹل والے نے تاڑ لیا کہ میں مجبور رہی نہیں بھوکا بھی ہوں۔ ہوٹل والے بھوکوں اور بھیک منگوں کو تاڑنے میں ماہر ہوتے ہیں۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "بھوکے ہو کیا؟" خاندانی وقار نے کہا "نہیں، ہرگز نہیں ایسا بھوکا نہیں ہوں۔" لیکن دل نے کہا "سید زادے چھوڑ دو خاندانی وقار، ہمدرد آدمی ہے۔ اسی سے کام نکال لو۔" لیکن میں نے کچھ بھی نہیں کہا بس خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ اُس نے پوچھا "کام کروگے؟" اب میں بھلا کیا جواب دیتا؟ زندگی میں کام کیا ہی نہیں تھا۔ مگر پیٹ بولنے لگا "ہاں بول دو ہاں، ورنہ بات بگڑ جائے گی۔" چنانچہ میں نے "ہاں" کہدیا۔ سیٹھ نے کہا "پہلے پیٹ بھر کھا لو پھر کام کرنا۔" میں نے سر ہلادیا۔ کھانا سامنے آیا تو ساری شرم ہوا ہوگئی اور میں کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ خوب سیر ہوکر کھایا اور پھر کام پر لگ گیا۔ کام تھا بڑا ہی آسان۔ کلیان سے جو بھی بس آتی میں جھٹ پہونچ جاتا اور گاہکوں کو ہوٹل کی طرف لے آتا۔ "آؤ چاچا، آؤ بھائی، آؤ بھائی، آؤ خالہ، آؤ بہن، آؤ ماں جی۔" یہی الفاظ تھے جو ہونٹوں سے نکلتے اور گاہک میرے ساتھ کھنچے چلے آتے۔ سیٹھ بہت خوش تھا اور گاہک بھی۔ میری روزی چلتی رہی۔ سیٹھ کا دھندا چلتا رہا۔ لیکن چوتھے دن میلہ ختم ہوگیا۔ کھانے پینے کے علاوہ میری مزدوری کل دس روپے بنی تھی اور گاہکوں سے پانچ دس پیسوں کی شکل میں جو بخشش ملی تھی اُس سے آٹھ روپے بنے تھے۔ یعنی اب میری جیب خالی نہیں تھی۔ اس میں اٹھارہ روپے تھے۔ وہاں سے چلتے وقت سیٹھ نے کہا "سنو! جہاں کہیں بھی میلہ میں ہماری دکان لگے چلے آنا۔ کام مل جائے گا۔" لیکن پھر کبھی کسی میلہ میں کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔

میں جیب میں اٹھارہ روپے لے کر جب دادر پہونچا تو چاچا سے ملا۔ چاچا نے مشورہ دیا کہ اب یہاں وہاں سر کھپانے کے بجائے ان روپوں سے کوئی چھوٹا سا دھندہ شروع کر دو۔ میں نے بات مان لی اور بائیکلہ سے پھل لاکر فٹ پاتھ پر بیچنے لگا۔ چند دن مزے میں کٹے۔ لیکن پھر دادر کے داداؤں نے داداگیری شروع کردی۔ میونسپلٹی والوں نے بھی تنگ کرنا شروع کر دیا اور ایک دن فٹ پاتھ پر دھندہ کرنے کے جرم میں حوالات میں بند کردیا۔ جب میں حوالات سے باہر آیا تو میرے سارے پھل سڑ گل کر خراب ہوچکے تھے۔ یعنی سارا دھندا چوپٹ ہوچکا تھا۔

چاچا کو پتہ چلا۔ تو انھوں نے دادر کی ایک ہوٹل میں کام پر لگا دیا۔ یہ ہوٹل، مدینہ ہوٹل، آج بھی روپ تارا اسٹوڈیو کے پاس موجود ہے۔ میں نے سوچا چلو منزل کے قریب تو پہونچے۔ اسی بہانے اسٹوڈیو میں آنا جانا ہوجائے گا۔ اب میں باہر والا بن گیا تھا، ہر روز اسٹوڈیو میں چائے وغیرہ لے جاتا۔ شوٹنگ چل رہی ہوتی تو ایک کونے میں کھڑا ہوکر چپ چاپ دیکھتا رہتا۔ جب زیادہ دیر ہوجاتی تو ہوٹل والا طبیعت سے سناتا۔ پھر بھی مجھے موقع دیتا۔ لیکن ایک دن اس نے تنگ آکر مجھے کام سے نکال دیا۔

لیکن اب میری اسٹوڈیو کے دربانوں سے دوستی ہوچکی تھی۔ آنے جانے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ سب مجھے جانتے پہچانتے تھے۔ میں روز ہی اسٹوڈیو میں گھسا رہتا۔ اور کھڑا شوٹنگ دیکھا کرتا۔

ایک دن فلم شرابی کا ریلوے اسٹیشن کا سیٹ لگا ہوا تھا۔ میں دو دن کا بھوکا تھا۔ لیکن جب مدھوبالا اور دیو آنند

کر دیکھا تو بھوک پتہ نہیں کہاں غائب ہوگئی؟ میں بڑی دیر تک کھڑا شوٹنگ دیکھتا رہا۔ میں نے ایکسٹرا سپلائر سے کہا "بھائی مجھے بھی ایک چھوٹا سا کام دیدو۔" وہ چونک پڑا اور زور سے بولا "اپنا تھوبڑا آئینہ میں دیکھیلا ہے؟ دیو آنند کی پکچر میں کام کرنے آئے لا ہے۔ بھاگ جا۔" لیکن میں بھاگا نہیں۔ وہیں کھڑا رہا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر اُسے سمجھا تا رہا کہ بھائی ریلوے اسٹیشن کا سیٹ لگا ہے میری شکل اچھی نہیں ہے تو کیا ہوا مجھے قلی کا کام ہی دیدو۔ مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اور مجھے دھکّے دے کر باہر نکال دیا۔ پر اب مجھے بھی ضد آگئی تھی کہ کام کیسے نہیں ملے گا۔ ؟ میں کام حاصل کر کے ہی رہوں گا۔

چند دن بعد پھر شرابی کا سیٹ لگا۔ اب سیٹ شراب کے اڈّے کا تھا۔ میں نے فلم کے پروڈیوسر سے کہا۔ میری بات اس کی سمجھ میں آگئی اور اس نے مجھے ایک شرابی کا رول دیدیا۔ اور میں نے اسی سیٹ پر دیو آنند کے ساتھ شرابی کی اداکاری کی۔ اسی روز سے میں فلموں میں چھوٹے موٹے رول کرنے لگا۔ اور پردے پر آنے کی جو آرزو میرے دل میں تھی وہ پوری ہوگئی۔ مجھے ہر روز پانچ روپے مل جایا کرتے تھے۔ اس طرح میں نے کئی فلموں میں کام کیا۔ لیکن اب حالت یہ تھی کہ کام ہو تو پانچ روپے ورنہ بھوکے مرو" میں جلد ہی اس چکر سے تنگ آگیا اور میں نے روپ تارا اسٹوڈیو میں ۵۴ روپے مہینے پر نوکری کر لی۔ تین سال یہ نوکری چلی لیکن اچانک میں بیمار ہوگیا اور مجھے کے ای، ایم اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ تمہارا آپریشن ہوگا۔ یہاں تمہارا کوئی رشتہ دار ہے تو بلاؤ۔ لیکن میں نے فارم پر دستخط کر کے کہدیا کہ میرا کوئی نہیں ہے۔ ڈاکٹروں نے رات بھر بھوکا رکھا۔ رات بھر میں بیماروں کے درمیان پڑا رہا۔ اور یہ خوف میرے دل اور دماغ پر چھایا رہا کہ اگر میں واقعی مرگیا تو کیا ہوگا؟ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہا۔ حاجی ملنگ بابا کو یاد کرتا رہا۔ صبح سویرے میرے سارے بدن کے بال اتار دیئے گئے۔ اب تو وہ حالت ہوئی کہ پوچھو مت۔ کوئی ٹرالی نگاہوں کے سامنے سے گزرتی تو دل کانپ جاتا۔ اس کے بعد میرے معدے سے نلیاں نکال کر سب کچھ نکال دیا گیا اور میں اپنے آپ ادھ مرا ہوگیا۔ وہ ڈاکٹر آیا جسے آپریشن کرنا تھا۔ اُس نے چیک اپ کیا اور بولا "اسے آپریشن کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کو کھانا دو اور شام کو ڈسچارج کر دو۔"

میں چونک پڑا۔ مجھے لگا کہ یہ سب میری دعاؤں کا کمال ہے۔ ورنہ میری چیر پھاڑ ہونے میں دیر ہی کیا تھی؟ میں اسپتال سے نکل کر دوسرے دن حاجی ملنگ بابا کے دربار میں پہونچا۔ شکریہ ادا کیا۔ میں بے حد لاغر اور کمزور ہوگیا تھا۔ اس کے باوجود میں یہ پہاڑ کیسے چڑھ گیا۔ یہ خود میرے لئے حیرت اور تعجب کی بات ہے۔ میں وہاں بیمار پہونچا تھا اور اچھا ہو کر لوٹا تھا، یہ سب یقیناً خُدا کا فضل اور حاجی ملنگ باباؒ کی دعا کا اثر تھا۔

میں واپس روپ تارا اسٹوڈیو لوٹا تو منیجر نے مجھے ہیلپر سے نکال کر پینٹر ڈیزائنر کے ہاتھ کے نیچے لگا دیا۔ اس لئے کہ وہ میری بیماری اور کمزوری سے واقف تھا۔ اب میرا کام صرف کاغذ پر لئی لگانا ہوتا تھا۔ یہیں سے مجھے پینٹر ڈیزائننگ کا علم ہوا۔ دھیرے دھیرے تجربہ بڑھتا گیا اور میں نے اپنی لگن اور جستجو سے اس کام میں مہارت حاصل کر لی۔ مجھے باہر کا کام بھی ملنے لگا اور میں پینٹر ڈیزائنر کی حیثیت سے جانا جانے لگا۔ مجھے پینٹر ڈیزائنر کی حیثیت سے جو پہلی فلم ملی وہ "پھول اور پتھر" تھی۔ جس کے فلم ساز او۔ پی۔ رلہن تھے۔ یہ فلم خوب چلی اور اس کے ساتھ ہی میرا کام بھی چل گیا۔ اب فلم لائن کا ہر آرٹ ڈائرکٹر یہ چاہتا

تھا کہ میں اُس کے ساتھ کام کر دوں۔ یہاں تک کہ فلم "مغلِ اعظم" کے آرٹ ڈائرکٹر سیّد صاحب کے ساتھ بھی کام کرنے کا موقع ملا۔ اِسی زمانے میں میری ملاقات فلموں کے مشہور بیک راؤنڈ آرٹسٹ یوسف بھائی سے ہوئی۔ وہ بڑے کمال کے آدمی ہیں۔ وہ اسٹوڈیو میں لگے سیٹ کے بیک راؤنڈ میں نظر آنے والے مناظر پینٹ کرتے ہیں۔ جن میں قدرتی مناظر، عمارتیں اور شہر کی گلیاں ہوتی ہیں۔ وہ اپنے کام میں اس قدر مہارت رکھتے ہیں کہ وہ کسی بھی اسٹوڈیو میں اپنی بیک راؤنڈ پینٹنگ کے ذریعہ دنیا کے کسی بھی مقام کو جیتا جاگتا پیش کر دیتے ہیں۔ میں اُن سے مل کر بے حد خوش تھا اور وہ بھی میری لگن، میری محنت اور میرا کام دیکھ کر بے حد خوش ہوتے۔ انھوں نے مجھے ایک بار کہا: "سیّد کوئی ایسا کام کر دجو دوسرے نہ کر سکتے ہوں۔ وہ کام مت کر دجو ہر کوئی کرے۔" یوسف بھائی کی بات میری سمجھ میں آ گئی۔ میں نے انھیں اپنا گرو مان لیا۔ اور ان کے ساتھ کام کرنے لگا۔ وہ بڑے پیار سے مجھے بیک راؤنڈ پینٹنگ سمجھاتے اور سکھاتے رہے۔ میں نے بھی پوری دلچسپی سے وہ کام سیکھ لیا اور انھیں کے نقشِ قدم پر چلنے لگا۔ وہ مجھے اکیلے کام کرتے ہوئے دیکھ کر بے حد خوش ہوتے تھے۔

ایک بار یوسف بھائی اپنے گاؤں گئے۔ اس وقت "بیراگ" اُن کے ہاتھ میں تھی۔ انہیں لوٹنے میں دیر ہو گئی۔ "بیراگ" کا سیٹ تیار ہو گیا۔ اس کا بیک راؤنڈ مکمل کرنا تھا۔ یوسف بھائی کے نہ ہونے کی وجہ سے، ان کے اسسٹنٹ یعنی میں نے پہلی بار یوسف خان یعنی دلیپ کمار کا سامنا کیا۔ دلیپ صاحب نے پوچھا: "آپ نے گلمرگ دیکھا ہے؟" میں نے کہا: "نہیں۔" "شالیمار دیکھا ہے؟" میں نے کہا "نہیں"۔ "کشمیر تو دیکھا ہی ہوگا۔" میں نے کہا: "نہیں۔"

یہ سُن کر دلیپ صاحب چونک پڑے بولے: "بھئی تم نے گلمرگ نہیں دیکھا، شالیمار نہیں دیکھا، کشمیر نہیں دیکھا تو تم کام کیسے کرو گے؟" میں نے کہا: "یوسف بھائی، آپ مجھے سمجھا دیجئے کہ آپ کیا چاہتے ہیں بس میں کر دوں گا۔" میرے اعتماد کو دیکھ کر دلیپ صاحب نے مجھے گلمرگ کے حسین مناظر اور خوبصورت درختوں کے بارے میں بتایا۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ میں نے برش اٹھایا اور دلیپ صاحب کے تصور کو سارے بیک راؤنڈ میں پینٹ کر دیا۔ دلیپ صاحب آئے۔ انھوں نے جب اپنے تصوّر کے مطابق بیک راؤنڈ دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ شاباشی دی اور بڑے جوشیلے انداز میں پروڈکشن کے آدمی سے کہا: "بھئی ہم مفت نہیں مانگ رہے ہیں کام کر رہے ہیں دو کپ چائے لے آؤ، ایک میرے لئے اور ایک سیّد صاحب کے لئے۔"

چائے آئی، دلیپ صاحب نے ایک پیالی، میری جانب بڑھا دی۔ وہ لمحہ میری زندگی کا ایک یادگار لمحہ تھا۔ جو مسرت جو خوشی مجھے اُن چند لمحوں میں ملی تھی میں انھیں الفاظ کا روپ نہیں دے سکتا۔ اس واقعہ کے بعد میرے حوصلے جوان ہو گئے اور میرا اعتماد کئی گنا بڑھ گیا۔

جب ہمارے گرو یوسف صاحب لوٹے، انھیں یہ ساری بات معلوم ہوئی تو وہ سیٹ پر پہنچے اور میرے کام کی انھوں نے بھی بیحد تعریف کی۔

وسال بیت چکے تھے جب میرے ماموں اپنی بیوی اور بیٹی کو لے کر بمبئی آئے۔ میرے ماموں صاحب کے خالہ زاد بھائی

حج کے لئے جا رہے تھے۔ یہ لوگ انھیں الوداع کہنے آئے تھے۔ ان کی بیٹی وہی لڑکی تھی جس کو میں بچپن سے چاہتا تھا۔ اور یہ وہی ماموں صاحب تھے جنھوں نے سارے خاندان والوں سے یہ کہہ رکھا تھا کہ میں اپنی بیٹی کی شادی سیّد ہی سے کروں گا۔ بہرحال اُن سے ملاقات ہوئی اور پھر میرا دوبارہ بنگلور آنا جانا شروع ہوا۔ میرے ماموں صاحب ایک بار اور بمبئی آئے تب انھیں معلوم ہوا کہ میں کیا کرتا ہوں۔ پھر جب وہ بنگلور پہنچے تو انھوں نے اپنا فیصلہ تبدیل کر دیا اور گھر والوں سے کھلم کھلا کہدیا: "ایک پینٹر کے پیچھے رنگ کا ڈبہ لے کر گھومنے والے کو میں اپنی بیٹی ہرگز نہیں دے سکتا۔" اس طرح میری بچپن کی محبت بھی مجھ سے بچھڑ گئی اور اس کی شادی میرے بجائے کسی اور سے کر دی گئی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ایک بیک راؤنڈ آرٹسٹ بننے کے لئے مجھے اتنی بڑی قربانی دینی پڑے گی۔ اس واقعہ سے میرے دل پہ ایک گہری چوٹ لگی۔ آج بھی جب کبھی اُس کی یاد آتی ہے تو میں اُداس اُداس ہو جاتا ہوں۔

لیکن مجھ میں ایک تبدیلی ضرور آگئی تھی۔ میں پہلے سے زیادہ مستعد اور محنتی ہو گیا تھا۔ دل میں یہ لگن سمائی ہوئی تھی کہ میں ضرور کچھ کر دوں گا۔ کچھ بنوں گا۔ آخر کار میں بیک راؤنڈ پینٹر بن گیا۔ میری پہلی فلم دھرمیندر اور سائرہ بانو کی "جوار بھاٹا" تھی۔ آرٹ ڈائرکٹر سمتھیل صاحب نے مجھے یہ چانس دیا۔ جب فلم کی ٹیک لیسٹ پہ پہلی بار میرا نام ہیرو، ہیروئن کے ساتھ چھپا اور پردے پر ٹائیٹل میں میں نے اپنا نام دیکھا تو مجھے ازحد خوشی ہوئی۔ بمبئی میں جن حالات میں میں نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا یہ بات میرے تصوّر سے بہت دور کی بات تھی کہ کبھی پردے پر میرا بھی نام آئے گا۔

ڈی کے دیسائی آرٹ ڈائرکٹر ہیں۔ اپنے فن میں بڑا کمال رکھتے ہیں۔ انھوں نے مجھے دیو آنند کی فلم "شریف بدمعاش" میں موقع دیا اور تبھی سے میں نوکیتن اور دیو آنند دونوں سے قریب ہو گیا۔ دیسائی صاحب ان کی فلموں کے آرٹ ڈائرکٹر ہوتے ہیں اور میں بیک راؤنڈ پینٹر۔ دیو صاحب کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ یہ میرا دعویٰ ہے کہ اگر دیو صاحب سے کوئی عمر رسیدہ آدمی کچھ دیر بات چیت کر لے تو وہ کم از کم ایک دن کے لئے تو ضرور جوان ہو جائے گا۔

ایک بار میں "دیس پردیس" میں دیو صاحب کا ڈپلی کیٹ کر رہا تھا۔ ایک کھڑکی میں میں اور ٹینا منیم بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹینا میرا ہاتھ تھامے ہوئے تھی اور دیو صاحب اس سین کو ڈائریکٹ کر رہے تھے۔ اس وقت مجھے روپ تارا اسٹوڈیو کا وہ واقعہ یاد آیا جب سپلائر نے مجھ سے کہا تھا: "اپنا تھوبڑا آئینہ میں دیکھا ہے؟ دیو آنند کی فلم میں کام کرنے آیا ہے۔ بھاگ جا۔" میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

جس اداکار کا نام لے کر مجھے لوگ پکارا کرتے تھے، جس سے ملنے کے لئے میں تڑپا کرتا تھا، جس کی شوٹنگ دیکھنے کے جرم میں اسکول سے نکالا گیا تھا اُس اداکار کی فلم میں اب مجھے کام ملا ہے۔ میرا مطلب راجکپور سے ہے۔ میں ان کی ایک فلم "چور منڈلی" کی بیک گراؤنڈ پینٹنگ کر رہا ہوں۔

دیو صاحب کا کہنا ہے کہ "جو کچھ ہوا اُسے بھول جاؤ، جو کرنا ہے وہ سوچو۔" بات بھی سچ ہے لیکن جب صبح صبح ہوٹل کا بیرا مجھے نیند سے جگا کر چائے کی پیالی میرے ہاتھ میں تھماتا ہے تو میں نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے ماضی میں کھو

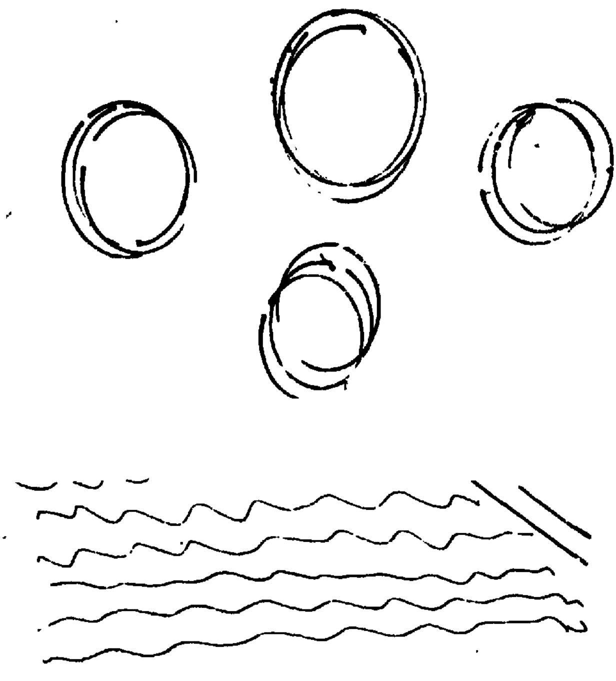
جاتا ہوں۔ دراصل ماضی کی یادوں ہی نے مجھے اس منزل پہ پہونچایا ہے۔

آج کے سارے ہی نامور آرٹ ڈائرکٹر فلم کے بیک گراؤنڈ پینٹر تھے۔ شاید میں بھی کبھی اس منزل تک پہونچ جاؤں۔

میرا سفر تو ابھی جاری ہے۔ اور بلاشبہ آخری سانسوں تک جاری رہے گا۔

منزل ملے ملے نہ ملے، اس کا غم نہیں
منزل کی جستجو میں میرا کارواں تو ہے

٭



زبانِ خلق



♦ "غزل نمبر" کے اجراء کے موقع پر صابر دت، فیض احمد فیض اور سردار جعفری کی موجودگی میں حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے۔

فیض احمد فیض کے ہاتھوں فن اور شخصیت کے غزل نمبر کا اجراء

مشہور فلم نگار جاوید (سلیم جاوید) کے دولت کدہ پر ۲۸ اگست ۱۹۸۱ء کی رات کو ایک پر تکلف اور حسین اجتماع میں بر صغیر کے ہر دل عزیز شاعر جناب فیض احمد فیض کے ہاتھوں "فن اور شخصیت" کے "غزل نمبر" کا اجراء ہوا۔ اس تقریب میں قرۃ العین حیدر، راجندر سنگھ بیدی، معین احسن جذبی، علی سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، اختر الایمان، حسن کمال، ڈاکٹر راہی معصوم رضا، سلمیٰ صدیقی، عزیز قیسی، ندا فاضلی، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی اور مدیر "فن اور شخصیت" صابر دت کے علاوہ فلمی دنیا کے درخشاں ستارے دلیپ کمار، جیا بہادری، امیتابھ بچن، سنیل دت اور رامانند ساگر بھی موجود تھے۔

حسن کمال (ایڈیٹر انقلاب بلٹز) نے اس تقریب کا افتتاح کرتے ہوئے کہا:

"آج ہم بمبئی سے نکلنے والے ایک رسالہ "فن اور شخصیت" کے "غزل نمبر" کے اجراء کے موقع پر یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ——— "فن اور شخصیت" کی کہانی ——— ایک ایسے بے وسیلہ اور بے سہارا نوجوان کی کہانی ہے جس نے نہایت حوصلہ شکن حالات میں ایک ایسے کام کا بیڑہ اٹھایا جس کے بارے میں ہم صرف سوچا کرتے تھے اور سوچ کر رہ جاتے تھے ——— بلا مبالغہ اس بے وسیلہ

نوجوان نے اس قدر ذمہ داری اور خلوص سے اتنا بڑا کام کیا ہے کہ اس کی تعریف نہ کرنا ایک طرح سے ناشکری ہوگی ——"

انہوں نے مزید کہا کہ —— آج تک ضخیم نمبر نکالنا صرف پاکستانی جریدوں کی اجارہ داری بھی جاتی رہی ہے —— لیکن "فن اور شخصیت" نے یہ بھرم توڑ دیا ہے۔ دو تین سال کے اندر اس نے اردو ادب کو تین ضخیم نمبر دیئے ہیں جن میں "جان نثار نمبر" بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ اس نے "غزل نمبر" پیش کرکے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ادب کسی زبان یا ملک کی سرحدوں کو نہیں مانتا۔ زبان کی سرحد کو اس نے اس وقت توڑا جب سرحد پار ہندی کے ایک خوبصورت اور مشہور افسانہ نگار و ادیب "کملیشور" کا نمبر نکالا۔ اور ملک کی سرحدوں کو اس نے اس وقت توڑا جب اس نے "فیض احمد فیض نمبر" کا اعلان کیا ——"

"غزل نمبر" کا اجراء کرتے ہوئے جناب فیض احمد فیض نے کہا ... "سب سے پہلے تو "فن اور شخصیت" کے بارے میں کہ مدیر صابر دت کے بارے میں اور جن حضرات نے اس تقریب کا اہتمام کیا ہے ان کے بارے میں مجھے اس کی تصریح کرنی ہے کہ بڑے بڑے نمبر نکالنا کوئی کمال کی بات نہیں ہے لیکن دقیع، جامع اور قابلِ قدر حیثیت کے نمبر نکالنا بڑی مشکل بات ہے اس کے لئے بڑی جانفشانی کی ضرورت ہے کیونکہ ان مسائل اور مشکلات کو سامنے رکھتے ہوئے جو یہاں کے ادیبوں اور وہاں کے ادیبوں کو بھی درپیش ہیں ایسے ضخیم نمبر نکالنے کا جو سلسلہ صابر دت نے شروع کیا ہے اس کے لئے وہ قابلِ مبارکباد ہیں۔ لیکن میں ایک بات کی تصحیح کرنا چاہتا ہوں کہ "فیض نمبر" کا اعلان کر کے ملک کی سرحد کو آپ نے نہیں توڑا بلکہ اس میں ہم پہل کر چکے ہیں۔ اس لئے کہ کرشن چندر نمبر ہم دو سال پہلے نکال چکے ہیں۔ تو یہ کوئی کمال کی بات نہیں کیونکہ زبانیں تقسیم نہیں ہوتیں۔ ادب کی سرحد جغرافیائی حدود سے ماورا ہوتی ہیں۔ قانونی طور سے نہ تو ہم دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ زبان ہماری ہے اور نہ ہندوستان والے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ زبان ہماری ہے۔

زبان تو ایک مشترکہ اثاثہ ہے۔ اس کا تحفظ، اس کا وقار، اس کی نگہداشت آپ لوگوں نے بہت اچھی طرح سے کی ہے۔ بہرحال صابر دت اور ان کے رفقاء جنہوں نے یہ کام کیا ہے وہ سب حضرات ہماری احسان مندی، شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں ——"

اس موقع پر دیگر حضرات نے بھی محفل کو مخاطب کیا اور "غزل نمبر" کے بارے میں اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا ——

٤

احمد ندیم قاسمی ــــــــــ لاہور (پاکستان)

صابر دت نے "فن اور شخصیت" کا غزل نمبر بہت سلیقے اور کاوش سے مرتب کیا ہے۔ غزلوں کے انتخاب کا بیشتر کام تو جاں نثار اختر نے کیا تھا مگر اس انتخاب کو مرتب کرنے کے بعد اس میں بعض ضروری اضافے کرنے اور اُسے شائع کرنے کی سعادت صابر دت کے حصے میں آئی۔ یہ غزل نمبر دراصل دورِ جدید کا ایک تذکرۂ سخنوراں ہے کہ اس میں شعراء کے حالاتِ زندگی بھی موجود ہیں۔ نمونۂ کلام بھی ہے جو پسندیدہ شعروں کی بجائے پسندیدہ غزلوں پر مشتمل ہے اور شعراء کی تصاویر بھی ہیں جن میں سے بعض تو خاصی نادر ہیں۔ اس طرح ولی سے لے کر دورِ جدید تک کے شعراء کو یکجا کر کے اُردو میں غزل کی عظیم روایت کو ایک ٹھوس اور مرئی صورت دے دی گئی ہے۔

"فن اور شخصیت" کا یہ غزل نمبر ہر لحاظ سے قابلِ تحسین ہے۔

احمد ندیم قاسمی

ڈاکٹر راہی معصوم رضا ــــــــــ بمبئی

پیارے صابر دت۔

تمہارے سارے نمبر شوق سے اور جی لگا کر پڑھے۔ سبھی نمبر اپنی اپنی جگہ بہت اچھے ہیں۔ غزل نمبر غزل ہی کی طرح ہے۔ کسی غزل میں ہر شعر تو بہت اچھا ہو نہیں سکتا۔ ایک آدھ شعر بھرتی کا بھی ہو جاتا ہے۔ پھر بھی غزل اپنے مجموعی تاثر کی وجہ سے یاد رکھی جاتی ہے۔ تمہارا یہ نمبر بھی ایک آدھ بھرتی کے "شعروں" کے باوجود اپنے مجموعی تاثر کے لئے یاد رکھا جائے گا۔ تم بڑے خوش نصیب ہو ان نمبروں کی وجہ سے لوگوں نے تم سے جلنا شروع کر دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم کام اچھا کر رہے ہو۔

تمہارا

راہی معصوم رضا

شری اِندر کمار گجرال ـــــــ ماسکو

مائی ڈیر صابر دت صاحب!

آپ کے خط اور تازہ شمارہ (غزل نمبر) کے لئے شکریہ۔ میں نے نمبر کا مطالعہ کیا اور اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ یہ یادگار کوشش کو آنے والے وقتوں میں ایک دستاویزی حوالہ بک کی حیثیت حاصل ہوگی۔ ابھی سے "فیض نمبر" کا منتظر ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ نمبر بھی اُس اعلیٰ معیار کو برقرار رکھے گا جو آپ نے اپنے لئے قائم کیا ہے۔

نیک خواہشات کے ساتھ

نیازمند:

آئی کے گجرال

فکر تونسوی ـــــــ نئی دہلی

پتّر جی عرف کئی نمبروں کے باپ جی!

اب کے تم نے "غزل نمبر" نکال دیا۔ تمہارا یہ فعل بُرا نہیں۔ ہمارا نصیب بھی بُرا نہیں۔ فعل اور نصیب کی یہ یک جہتی اگر ایک معجزہ نہیں تو تعجب خیز ضرور ہے۔

اس تعجب میں تم چاہو تو مسرّت کو بھی شامل کر سکتے ہو۔ جو تمہیں بھی حاصل ہوئی اور اہلِ اُردو کو بھی" جو نقط قول کے دشمن بنتے جا رہے ہیں۔" اور چاہتے ہیں کہ قول کی کھوکھلی رگوں میں سے ہی مسرت کا خون اخذ کر سکیں۔

لاہور میں محمد طفیل اور بمبئی میں صابر دت۔ دونوں ایک ہی منزل کے راہی ہیں۔ اُردو ادب کی آنے والی نسلیں، تم دونوں کو تاریخی ہیرو کے نام سے پکاریں گی۔ ہائے! تاریخ میں جگہ بنانے کے لئے کتنی دیوانگی اپنے اندر پیدا کرنا پڑتی ہے۔ مگر۔ ایک تکبّر سے ضرور بچ کر رہنا۔ کہ تم محمد طفیل کا سا قدِ آدم رکھتے ہو۔ وہ کمبخت بڑا کلاسیکل، پرفیکٹ (PERFECT) اور منجھا ہوا دیوانہ ہے۔ تمہاری خصوصیت یہ ہے کہ تم اُس کے شاگرد ہو۔ اگرچہ واحد شاگرد۔

"فیض نمبر" پاکستان سے بھی نکلا تھا۔ اب تم بھی نکال رہے ہو۔ مقابلہ ہندوستان اور پاکستان میں نہیں۔ فیض اور فیض میں ہے۔ دیکھنا چاہئے۔ فیض اور فیض کے اس فاصلے کو صابر دت کِس انوکھی چال سے عبور کرتا ہے ـــ؟ دہلی آؤگے تو مجھ سے ضرور ملوگے۔ اتنا تمہیں بھی یقین ہے اور مجھے بھی۔

فکر تونسوی

اختر جمال ـــــــ اسلام آباد (پاکستان)

بھائی صابر دت! تسلیم ـــ! "فن اور شخصیت" کا "غزل نمبر" موصول ہوا۔ بہت بہت شکریہ۔ اتنا جامع اور خوبصورت

نمبر نکالنے پر ہم سب کی طرف دلی مبارکباد قبول کیجئے۔ جاں نثار اختر کا حسنِ انتخاب ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ آپ نے ان کے انتخاب کا دائرہ اور وسیع کر دیا۔ پاکستانی ادب میں ۱۹۶۰ء کے بعد سے بہت سے اچھے اچھے شعری مجموعوں کا اضافہ ہوا ہے۔ جاں نثار اختر تک غالباً فیض کا آخری مجموعہ "سروادیٔ سینا" نہیں پہنچ سکا۔ اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اسی طرح عہدِ حاضر کے بہت سے اچھے غزل گو شعراء جو ہمارے ہاں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں "غزل نمبر" میں نظر نہیں آتے۔ غالباً اس کی وجہ یہی ہے کہ یہاں کی نئی کتابیں وہاں نہیں پہونچتی ہیں۔ بہرحال ان سب رکاوٹوں کے باوجود آپ نے ادب کی خدمت انجام دی ہے اور آپ کی یہ محنت قابلِ ستائش ہے۔

قرۃ العین حیدر نے خواتین کا ڈبہ "غزل نمبر" میں شامل کیا ہے۔ ان کا مضمون بہت بیش قیمت ہے۔ لیکن اب ہماری شاعرات اتنی آگے بڑھ چکی ہیں کہ وہ ڈبہ سے نکل کر عام شعراء کی صف میں مقام پانے کی مستحق ہیں۔ خصوصاً ہماری ادا جعفری، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر۔ ان میں سے اکثر شاعرات نظم زیادہ کہتی ہیں لیکن ادا نے غزل کو نکھارا سنوارا ہے۔ اور ان کا ایک انفرادی لب و لہجہ ہے۔ وہ اس بات کی مستحق تھیں کہ اردو شاعری کی پہلی منفرد شاعرہ کی حیثیت سے عصری دور کے شعراء میں آپ انھیں شامل کر لیتے۔

بہرحال ان باتوں سے قطع نظر "غزل نمبر" کی چکا چوند یہ بات منوا لیتی ہے کہ غزل آج بھی ترقی کی طرف جا رہی ہے نئی نسل کے شعراء سوچ اور احساس کے اظہار میں ایک نیا رنگ اختیار کر رہے ہیں۔

سلمان اختر کی غزلیں پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ سلمان مجھے بہت ہی چھوٹے سے یاد ہیں اور غزل میں ان کا منفرد لب و لہجہ دیکھ کر صفیہ آپا بے اختیار یاد آئیں۔ وہ مجاز اور جاں نثار کے اچھے اشعار بڑے پیار سے سُناتی تھیں اور سلمان کے شعروں پر کتنی خوش ہوتی تھیں۔ ع

ایک مصرعہ کی بند مٹھی میں
کتنی یادوں کا دل دھڑکتا ہے

یہ زندگی ذرا سی فرصت اگر نہیں دیتی
جواز ڈھونڈتے کچھ اپنی بے حسی کا بھی

خدا ان کی عمر دراز کرے۔ اور وہ اپنے خاندان کی اس عظیم وراثت کو ترقی دیں۔

نہ کسی کی آنکھ کا نُور ہوں
نہ کسی کے دل کا قرار ہوں

"فیض نمبر" کی اشاعت کی خبر سے خوشی ہوئی۔ اس نمبر کے سلسلے میں اگر پاکستانی لکھنے والوں کے مضامین کی آپ کو ضرورت ہو تو اس کے لئے کوشش کروں۔ انشاء اللہ میں خود بھی لکھوں گی۔

اختر جمال

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ـــــــ نئی دہلی

محبی صابر دت صاحب!

"غزل نمبر" مل گیا۔ مرحبا، آپ کی فتوحات میں ایک اور کا اضافہ ہوگیا۔ انتخاب اچھا ہے۔ خاص طور پر "اندازِ بیان اور" اور "خواتین غزل گو" "شاعرات کا حصہ"، "بیا اگل برافشانیم" اور یورپین شعرا کا انتخاب، "مئے از رنگ"، "اور" ہیں اور بھی دنیا میں"۔ ان مزید انتخابات نے "فن اور شخصیت" کے غزل نمبر کو جامع بنا دیا ہے۔ آپ کا انتخاب "آج کی غزل" بھی پسند آیا۔ اگرچہ اس میں چند نام آپ نے شاید بوجوہ شامل کئے ہیں۔ بہرحال پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا۔ شعروں کے انتخاب کا معاملہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ "غزل" پر یہ دستاویزی نمبر شائع کر کے آپ نے "فن اور شخصیت" کے تحت ایک صنف کا حق ادا کر دیا۔ خدا آپ کی ہمت بلند رکھے۔

تمہارا، گوپی چند نارنگ

ڈاکٹر قمر رئیس ـــــــ دہلی

برادرم صابر دت صاحب!

"فن اور شخصیت" کا "غزل نمبر" ملا۔ اُردو غزل کے عہد بہ عہد مطالعہ میں یہ نمبر ہمیشہ ایک دستاویزی حیثیت رکھے گا۔ ہر دور کے شعراء کے کلام کا انتخاب نہایت محنت اور خوش ذوقی سے کیا گیا ہے اور وہ اس دور شعری حیثیت کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔ البتہ ایسا لگتا ہے کہ عصرِ حاضر کے کچھ ممتاز شعراء کے ساتھ انصاف نہیں ہوا ہے۔ مثلاً وحید اختر۔ "فیض نمبر" کے لئے میں نے کئی بہت قیمتی تصویریں نکال رکھی ہیں۔ آپ جب کہیں گے بھیج دوں گا۔

آپ کا اپنا،

قمر رئیس

وارث علوی ـــــــ احمد آباد

پیارے صابر دت!

"غزل نمبر" کے لئے بہت بہت شکریہ۔ مجھے یاد رکھا نوازش ہے۔ سوائے اس کے کیا لکھوں کہ بڑی آن بان سے نمبر شائع کیا ہے۔ ـــــــ تصاویر بھی خوب ہیں۔ جاں نثار کی اپنی ایک نظر تھی۔ انتخاب منفرد ہے۔ بعض سیکشن مثلاً خواتین کی غزل گوئی میں چند غزلیں پہلی بار دیکھنے کو ملیں۔ تمہاری محنت واقعی

قابلِ داد ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جدید غزل میں ظفر اقبال، کماراشی، محمد علوی، باقر مہدی کے نام کہیں نظر نہیں آئے۔ ممکن ہے عجلت میں میری نظر نہ پڑی ہو۔ لیکن اگر واقعی نہیں ہیں تو یہ بڑی فروگذاشت ہے۔ ان لوگوں کی غزلوں کے بغیر غزل کا کوئی انتخاب مکمل نہیں ہو سکتا۔ چونکہ ایسے انتخابوں کی تاریخی اہمیت ہوتی ہے اور آئندہ نسلیں ان کی مدد سے یہ دیکھنے کی کوشش کریں گی کہ انتخاب کرنے والوں نے اپنے دور کے کون سے ستاروں کو درخورِ اعتنا سمجھا۔ اس لئے نمائندہ شاعروں کے نام نہ دیکھ کر ان کے دلوں میں شکوک کا پہلو پیدا ہونا لازمی ہے۔

تمہارا : وارث علوی

پرکاش پنڈت ـــــــ دہلی

پیارے صابر دت !

آج بڑے کروفر کے ساتھ غزل نمبر مل گیا ہے۔ ارے ظالم! آدمی تو تم منحنی سے ہو ایسے دبیز اور ایسے کمال کے نمبر کیسے نکال رہے ہو۔ خدا گواہ ہے کہ اس معاملے میں میں تمہارا حاسد بن گیا ہوں۔ اپنا مختصر تعارف اور فوٹو اسکیچ بھیج رہا ہوں۔ "آپ بیتی نمبر" کے لئے انہیں سے کام چلاؤ۔

شعراء کا انتخاب کب بھیج رہے ہو ؟ اور ہاں، یہ بھی لکھو کہ ؏

مدتوں بعد اٹھاتے تھے پرانے کاغذ
ساتھ تیرے مری تصویر نکل آئی ہے

کیا تمہارا شعر ہے ۔ ؟ تمہارا ہے تو میں مزید سر دھنوں۔

تمہارا : پرکاش پنڈت

شمس الرحمن فاروقی ـــــــ الہ آباد

برادرم صابر دت ! "غزل نمبر" مل گیا۔ ممنون ہوں ۔ لیکن میرے خیال میں تشنہ اور بے توازن انتخاب ہے۔ بہرحال جو بھی ہے غنیمت ہے۔

"فیض" کے لئے ضرور لکھوں گا۔ نارنگ سے بات ہو گئی ہے۔ آپ کوئی تاریخ مقرر کر دیں جس کے اندر اندر مضمون آپ کو مل جائے گا۔

آپ کا : شمس الرحمن فاروقی

نگار صہبائی ـــــ کراچی (پاکستان)

صابر بھائی ۔ آداب

فن اور شخصیت کا غزل نمبر دیکھا۔ آپ نے جس جاں فشانی سے یہ نمبر ترتیب دیا ہے آپ بے حساب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس نمبر کا سب سے اہم حصہ ان غیر معروف شعراء کے کلام پر مشتمل ہے جن کا کلام آپ نے ان کے پتوں کے ساتھ چھاپا ہے۔ اس ضمن میں آپ یقیناً پاکستان کے کسی بھی غزل نمبر سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں آپ نے کسی قسم کی بھی ادبی بددیانتی نہیں برتی ہے جو کہ ہمارے ہاں ایک خطے کا طرۂ امتیاز ہے۔

نیاز مند: نگار صہبائی

جیلانی بانو ـــــ حیدرآباد

محترم۔ تسلیم

آپ کا خط ملا۔ میں دہلی چلی گئی تھی۔ اس لئے جواب میں تاخیر ہو گئی۔ میں بمبئی آئی تھی۔ لیکن اتنے کم وقت کے لئے کہ سب سے نہ مل سکنے کا افسوس رہا۔ پھر بمبئی کے طویل فاصلے بھی حوصلہ شکن ثابت ہوتے ہیں۔

غزل نمبر تو اپنی جگہ ایک کتاب کی اہمیت رکھتا ہے۔ بڑی محنت اور توجہ سے آپ نے اسے ترتیب دیا ہے۔ اسی طرح آپ محنت اور تحقیق کے ساتھ "فن اور شخصیت" کے نمبر ترتیب دیتے رہے تو آپ کو کئی کئی بار ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی جا سکتی تھی۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ آج کل ڈاکٹریٹ کے لئے تحقیق اور محنت کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ غزل نمبر کے ٹائیٹل پر مغلیہ دور کے مشاعرے کا بڑا خوبصورت تصوّر پیش کیا گیا ہے۔ لیکن مشاعرے میں خواتین کی موجودگی پر تعجب ہوا۔ کیونکہ ان مشاعروں میں نہ طوائفیں شریک ہوتی تھیں اور نہ بیگمات۔ چلمن کے پیچھے سے نظارہ کر لیں تو دوسری بات ہے۔

غزل کے مزاج کے بارے میں مختلف حضرات کی رائیں اختصار کے باوجود ان کے خیال کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں۔ غزل کا سفر بھی اپنی جگہ مکمل ہے۔ کچھ شاعروں کی کمی البتہ کھٹکتی ہے۔ قلی قطب شاہ، خلیل الرحمن اعظمی، شکیل بدایونی اور کئی اہم نام۔ اگر دوسرا ایڈیشن شائع ہو رہا ہو تو ان ناموں کو شامل کر لیجئے۔ آپ کا آئندہ پروگرام سن کر خوشی ہوئی۔ فیض نمبر کا ابھی سے انتظار ہے۔ فیض کے فن پر مضامین کافی لکھے گئے ہیں پھر بھی اس کمی کا ابھی احساس ہے۔

مخلص: جیلانی بانو

ندا فاضلی ـــــــ بمبئی

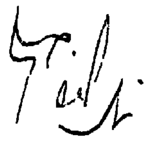
صابر صاحب

غزل نمبر کی ضخامت، طباعت اور نفاست نے متاثر کیا۔ تم اپنے ہر نمبر کے ساتھ ذہن پر ایک نقش چھوڑ جاتے ہو۔ ہندوستان میں ایسی آن بان کے جریدے کہاں تھے۔ تم نے ایک بہت بڑی کمی کو پورا کیا جس کے لئے تم واقعی مبارکباد کے مستحق ہو۔

غزل نمبر میں جن کوتاہیوں کی طرف تبصرہ نگاروں نے اشارہ کیا ہے ان کی ذمہ داری تم پر ہوتے ہوئے بھی تم پر نہیں ہے۔ یہ وہی لوگ جانتے ہیں جو تم سے قریب ہیں۔

دوسروں کی شہرت پسندیوں اور ادبی تعصبات کا بوجھ تم نے جس خندہ پیشانی سے اٹھایا ہے وہ تجزیہ طلب ہے۔

خدا کرے تمہارے حوصلے ان حوصلہ شکن حالات میں زندہ رہیں۔



مظہر امام ـــــــ سرینگر

برادرم صابر دت صاحب! سلام خلوص

"فن اور شخصیت" نے ابتک تین خصوصی ضخیم نمبر شائع کئے ہیں جو کسی مخصوص ادیب یا شاعر کی شخصیت اور فن کا احاطہ کرتے ہیں۔ ہندر ناتھ نمبر، جاں نثار اختر نمبر اور کملیشور، آپ کے جریدے کے نام سے ہی اس کے کردار کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اب آپ نے "غزل نمبر" پیش کیا ہے، جو اس سلسلے سے کٹا ہوا الگ معلوم ہوتا ہے لیکن دراصل ہے نہیں، کیونکہ اس نمبر میں بھی ہر غزل گو کی شخصیت اور فن کا تعارف (مختصراً ہی سہی) موجود ہے۔ اس سے پہلے بھی اردو رسائل نے "غزل نمبر" شائع کئے ہیں، جن میں سے "نقوش" کا غزل نمبر اپنی الگ اہمیت رکھتا ہے۔ "پگڈنڈی" امرتسر نے بھی ایک غزل نمبر چھاپا تھا۔ "فن اور شخصیت" کے "غزل نمبر" کی انفرادی حیثیت شاید اسی میں ہے کہ ہر شاعر کے حالات زندگی اور اس کے شعری مرتبے سے بھی تھوڑی سی آگاہی ہو جاتی ہے۔

غزل اردو شاعری کا بڑا عظیم سرمایہ ہے اور اس سلسلے میں کوئی کام حرف آخر کا درجہ نہیں رکھ سکتا۔ آپ کے نمبر میں بھی افراط و تفریط کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ لیکن آپ کی کوشش کی داد نہ دینا ایک طرح کی بددیانتی ہوگی۔ فیض احمد فیض

اور سردار جعفری کے سلسلے میں خصوصی نمبروں کے اعلان سے مسرت ہوئی۔ آپ کے اور کیا ارادے ہیں؟ اختر الایمان نمبر اور قرۃ العین حیدر نمبر بھی آپ ہی شائع کر سکتے ہیں۔ امید ہے آپ مع بخیر ہوں گے۔

آپ کا اپنا

مظہر امام

سہیل عظیم آبادی ـــــــ پٹنہ

برادرم! سلام و محبت!

آپ کا بھیجا ہوا تحفہ "غزل نمبر" ملا۔ بے حد شکریہ۔ بھائی آپ تو کمال کرتے ہیں۔ ایسے شاندار نمبر۔ مبارک باد۔ سرسری طور پر دیکھ رہا ہوں۔ ایک کمی نظر آئی۔ پرویز شاہدی کا نہ کلام ملا اور نہ ذکر۔ پر قرینہ مرحوم نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی۔ غزل میں اُن کا مخصوص رنگ تھا۔ آج کے غزل گو شعراء میں حسن نعیم کا ذکر نہ ہونا عجیب سا لگا۔ حسن نعیم نے بڑے اچھے شعر کہے ہیں۔

لیکن کیا کیجئے گا۔ آدمی، آدمی ہے بھول چوک ہو ہی جاتی ہے۔ بہرحال "غزل نمبر" کے لئے پھر ایک بار دلی شکریہ قبول فرمایئے۔

خیر اندیش:

سہیل عظیم آبادی

باقی ـــــــ دہلی

پیارے بھائی صابر۔ آداب!

"فن اور شخصیت" کا غزل نمبر مل گیا ہے۔ بے حد خوبصورت چھپا ہے۔ اب تم پروڈکشن کے ماہر ہو گئے ہو۔ یہ اچھا کیا کہ مختلف حصے تم نے مختلف احباب، کو ایڈٹ کرنے کو سونپ دیئے۔ اس طرح سے نا صرف یہ کہ کام ہلکا ہو گیا بلکہ اُس میں ورائٹی بھی پیدا ہو گئی۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کرو۔ سچی بات یہ ہے کہ جناب اختر کا لکھا ہوا مقدمہ جو ترقی پسندوں کی غزل پر ختم ہو جاتا ہے بڑی محنت اور بصیرت سے لکھا گیا ہے۔ ایسا ہی مقدمہ ہر سیکشن سے پہلے ہونا چاہیئے تھا۔ ممکن ہے تم نے کوشش کی ہو کسی سے لکھوانے کی۔۔۔۔ خود ہی کیوں نہ لکھ لیا۔۔!

بہر حال یہ نمبر بھی خوش اثر ہے۔ تمہارے دوسرے نمبروں کی طرح۔ جانِ من! بہت سے ممتاز غزل گو اس میں شامل نہیں۔ ایسا کیوں؟ جب کہ تم کھلے ذہن کے آدمی ہو اور مزاجاً سلیقہ مند۔ مثلاً راج نارائن رازؔ، حسن نعیم، دراب بدا نش، ممتاز راشد، پریم کمار نظرؔ، کرشن موہن، شمیم فاروقی، اس میں نظر نہ آئے۔ ممکن ہے میں خود بھی بہت سوں کو بھول رہا ہوں۔

تمہارا:
باقی

آزاد گلاٹی ـــــــ نابھا (پنجاب)

"فن اور شخصیت" کا غزل نمبر ملا۔ یہ شمارہ اُردو غزل کا ایک حسین اور جامع منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ گو کہیں کہیں عکس و نقش قدرے دھندلاتے ہوتے ہیں۔ جاں نثار اختر صاحب نے جو کام ادھورا چھوڑا تھا آپ نے اسے پورا کر کے نہ صرف ان کے تئیں اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے بلکہ غزل کے ایک نمائندہ انتخاب کو بھی ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا ہے۔

"بیا تا گل بر افشانیم" اور "مئے افرنگ در جام سفال ہندی" میں ایسا مواد ہے جو بہت کمیاب ہے اور اس طرح اُردو غزل کے وہ گمنام گوشے جن تک ہر شخص کی رسائی آسانی سے نہیں ہو سکتی۔ اب سب کی دسترس میں ہیں۔ "آج کی غزل" "اور" ہیں اور بھی...." کے سیکشن میں نئی اردو غزل کی چند جھلکیاں ہیں۔ انتخاب نمائندہ ہے اور اُردو غزل کی لگ بھگ چھ صد سالہ تاریخ اور اس کے بتدریج ارتقاء کے سمجھنے میں کافی حد تک معاون ہو سکتا ہے۔

آپ کی محنت اور لگن پر تو سچ مچ دل سے داد و تحسین ہی نکلتی ہے۔ گو آپ کی SINCERITY OF PURPOSE پر کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس نمبر میں مزید بہتر ہونے کے امکانات تھے۔ کئی شعراء کا تعارف دیا ہی نہیں گیا ہے۔ گر ان میں سے بیشتر کا تعارف حاصل کیا جا سکتا تھا اور نمبر معلومات کے لحاظ سے بھی جامع ہو جاتا۔ بہر حال یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کی کوئی مجبوری رہی ہو؟ اور پھر اتنا ضخیم نمبر نکالنے کے لئے جس یکسوئی اور توجہ کی ضرورت پڑتی ہوتی ہے۔ وہ بھی شاید حالات نے آپ کو مکمل طور پہ نہ دی ہو۔ اس میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے کہ آپ کی کوشش کامیاب ہے۔ اور اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سرورق سے اختتام تک آپ کی لگن اور خلوص کی مہک ذہن و دل کو معطر کرتی ہے۔ اب آپ فیض نمبر کے لئے پر تول رہے ہیں۔ خدا کرے یہ نمبر بھی "فن اور شخصیت" اور آپ کی محنت کی روایات کے مطابق ہی خوب اور خوبصورت ہو۔ یہ میری بدقسمتی رہی ہے کہ میں اس سے قبل "فن اور شخصیت" سے ناواقف رہا۔

آزاد گلاٹی

"آپ بیتی نمبر"

کے لئے

جو بلاشبہ

اردو ادب

کی تاریخ میں

سنگ میل

ثابت ہوگا۔

دھرمیندر

ہندوستان
کے اردو ادب میں

تاریخ ساز
پیش رفت پر

نیک خواہشات کے ساتھ

سنیل دت

نہ میرے پاس فن ہے نہ شخصیت اور نہ ہی آپ بیتی

پھر بھی
"فن اور شخصیت" کے آپ بیتی نمبر
کے لئے

نیک خواہشات

حاضر ہیں

ڈاکٹر راہی معصوم رضا

تکمیل کے آخری مراحل پر گامزن

فلمساز اور ہدایت کار **منوج کمار** کی عظیم ترین لازوال

انقلابی تخلیق

کرانتی

[illegible]

مکالمے: منوج کمار

کہانی اور منظرنامہ: سلیم جاوید

موسیقی: لکشمی کانت پیارے لال

فنکار:

دلیپ کمار

منوج کمار۔ ششی کپور۔ شترگھن سنہا۔

ہیما مالنی اور پروین بابی کے علاوہ بے شمار دوسرے

تیزی سے فلم بند کی جا رہی ہے

ڈی۔ کے۔ سود کی اچھوتی پیشکش

سلیم جاوید کے قلم کا نیا جادو

پتھر کے لوگ

اِسٹمین کلر

• ہدایات: راج این سپّی • موسیقی: راجیش روشن

• نغمات: ندا فاضلی •

ستارے: ششی کپور، امیتابھ بچن، پروین بابی، راکھی، بندیا گوسوامی

ڈاکٹر شری رام لاگو اور کنول جیت

صابروت!

"فنکار کو حیاتِ جاوداں
عطا کرنے کے لئے
ایک شاہکار کافی ہے

آپ بیتی نمبر
تو تمہارا پانچواں شاہکار ہے۔"

گلشن نندہ

"صابر دت"

"فن اور شخصیت"

اور

"آپ بیتی نمبر"
کے لئے

نیک تمناؤں کے ساتھ

منوج کمار

"فن اور شخصیت"
کی
پانچویں دستاویزی پیشکش

آپ بیتی نمبر
کے لئے

نذرانۂ خلوص

سورج سنیم

روایت شکن

صابر دت

اور

نئی روایتوں کے نقیب

"فن اور شخصیت"

کے لئے

خلوصِ دل کے ساتھ

ایس ایم ساگر

"آپ بیتی نمبر"
کے لئے
جو
صابر دت کے ہاتھوں
سنور کر
منظرِ عام پر
آ رہا ہے۔

آنند بخشی

"مانک ٹالہ"

موتی مانک کے بیوپاریوں کا لقب ہے

اس لئے

"آپ بیتی نمبر" کے ایسے ہیرے کی تراش پر

میری نیک خواہشات

مدیرِ فن اور شخصیت کو

مانک ٹالہ

نئے تدروں کے

ترجمان

"فن اور شخصیت"

کے لئے

"آپ بیتی نمبر"

کی آمد پر

نیک خواہشات کے ساتھ

راج کمار کوہلی

(فلمساز اور ہدایتکار)

نمّی اور علی رضا

کیجانب سے

"آپ بیتی نمبر" کی آمد پر

صابر دت

اور

فن اور شخصیت

کے لئے

نذرانۂ خلوص

فارم نمبر ۴ بابت ملکیت وغیرہ

۱۔ مقامِ اشاعت: ۱۵۔ چھپرا بلڈنگ، مادھوداس پاسترا روڈ، دادر بمبئی ۴۰۰۰۱۴

۲۔ میعادِ اشاعت: ششماہی		۳۔ پرنٹر پبلشر: صابر دت

۴۔ مالک وایڈیٹر: صابر دت		۵۔ قومیت: ہندوستانی

پتہ: ۱۵۔ چھپرا بلڈنگ، مادھوداس پاستہ روڈ۔ دادر۔ بمبئی ۴۰۰۰۱۴

میں، صابر دت، مالک "فن اور شخصیت" اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاع کے مطابق درست و صحیح ہیں

شرح دستخط: (صابر دت) پبلشر

کالیداس گپتا رضا کی دیگر تصانیف

شعلۂ خاموش
(مجموعۂ کلام)
قیمت: ۳۰ روپے

دعائے صباح
(غالب کی ایک نادر فارسی
مثنوی مبسوط مقدمے کے ساتھ)
قیمت: ۱۵ روپے

شورشِ پنہاں
(مجموعۂ کلام)
قیمت: ۲۰ روپے

ہندوستانی مشرقی افریقہ میں
قیمت: ۱۰ روپے ۵۰ پیسے

شاخِ گل
(مجموعۂ کلام)
قیمت: ۱۵ روپے

دی سائیلنٹ فلیم
THE SILENT FLAME
(انگریزی نظمیں)
قیمت: ۱۰ روپے

اجالے
(نعت اور سلام)
قیمت: ۱۰ روپے

متعلقاتِ غالب
قیمت: ۳۰ روپے

مکتوباتِ جوش ملسیانی بنامِ رضا
(مجموعۂ خطوط)
قیمت: ۲۵ روپے

منشوراتِ جوش ملسیانی
قیمت: ۲۰ روپے

شعورِ غم
مرتبہ: اعجاز سیمابی
قیمت: ۳ روپے

چکبست اور باقیاتِ چکبست
قیمت: ۴۰ روپے

انتخابِ آتش و غالب
از چکبست
قیمت: ۳۰ روپے

ساکار پبلشرز پرائیوٹ لمیٹڈ آفس نمبر ۲۳۲
دوسری منزل "پنج رتن" اوپیرا ہاؤس، بمبئی نمبر ۴۰۰۰۰۴

صابر دت

کے لئے

جس نے

ہندوستان کی

ادبی صحافت میں

نئے دور کا آغاز کیا

سبھاش سرور

صابردت

کے لئے

جو ہندوستان میں

آپ بیتی نمبر کے بعد

فیض احمد فیض، سعادت حسن منٹو اور قتیل شفائی

جیسے فنکاروں اور شخصیتوں پر

کام کر رہا ہے۔

راجندر کرشن

ھندوستان کے

محمد طفیل

کیلئے

خلوصِ دل کیساتھ

ویدراہی

نئی ادبی راہوں
کے متلاشی

صابر دت کے لئے

نیک تمناؤں کیساتھ

ستیش بھٹناگر



ہمارا اگلا شمارہ

فیض احمد فیض نمبر (باتصویر)

نگراں: پروفیسر گوپی چند نارنگ

• آفسیٹ کی دیدہ زیب طباعت • ۶۰۰ سے زائد صفحات تصویروں کے ساتھ۔ مجلّد • قیمت ۵۰ روپے

عالمگیر شہرت یافتہ قد آور شاعر' بیباک صحافی' بلند پایہ نثر نگار
فیض احمد فیض کی شخصیت پر ایک مکمل دستاویز' جو ادبی تاریخ کے
ارتقاء میں آنے والے زمانوں تک تمثیلی حیثیت کی حامل ہوگی۔
رسالہ "فن اور شخصیت" اسے ہندوستان میں پہلی بار پیش کر رہا ہے

غیر ملکی ادیبوں کے علاوہ چند لکھنے والے

پروفیسر آل احمد سرور	ڈاکٹر ملک راج آنند	مجتبیٰ حسین	پرکاش پنڈت
ڈاکٹر عبادت بریلوی	ڈاکٹر شوکت سبزواری	قرۃ العین حیدر	ظفر ادیب
ڈاکٹر مسعود حسین خاں	ڈاکٹر معین الدین عقیل	انتظار حسین	
پروفیسر رفیعہ سلطانہ	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید	احمد ندیم قاسمی	احتشام حسین
ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	پروفیسر حامدی کاشمیری	سردار جعفری	شاہد احمد دہلوی
ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ	جمیل جالبی	امرتا پریتم	کرشن چندر
پروفیسر عبدالقوی دسنوی	ڈاکٹر سلیم اختر	قتیل شفائی	علی عباس حسینی
ڈاکٹر سیدہ جعفر	شمس الرحمٰن فاروقی	کملیشور	شاد عارفی
پروفیسر عبدالمغنی	نظیر صدیقی	ایلس فیض	سجاد ظہیر
ڈاکٹر ثمینہ شوکت	ریاض صدیقی	خدیجہ بیگم	ابراہیم جلیس
پروفیسر سلامت اللہ خاں	باقر مہدی	فکر تونسوی	
ڈاکٹر ظ۔ انصاری	سحر انصاری	کشمیری لال ذاکر	تاریخ اشاعت:
ڈاکٹر قمر رئیس	اقبال مسعود	اختر جمال	ستمبر ۱۹۸۰ء